رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم



# الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

| جلد ۲۰ | یکم جنوری سنہ ۱۹۱۹ع | نمبر ۱۱۵ |
|---|---|---|

فہرستِ مضامین



الناظر پریس۔ چوک لکھنؤ

# مشہور مصنفین اُردو کی قابل دید کتابیں

### مرزا غالب مرحوم
- اُردوی معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب قسم اعلیٰ

### سر سید احمد خاں مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- سیرۃ فریدیہ
- اسباب بغاوت ہند
- مقالات سرسید
- آخری مضامین سرسید

### مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مجموعہ نظم حالی
- مسدس حالی
- رباعیات حالی
- قطعات حالی

### سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت
- لکچر

### مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- نیرنگ خیال
- نظم آزاد

### مولوی نذیر احمد مرحوم
- ترجمۃ القرآن متوسط
- الحقوق و الفرائض ۳ جلد
- اجتہاد
- مرآۃ العروس
- بنات النعش
- توبۃ النصوح
- مجموعہ نظم بے نظیر
- چند پند
- منتخب الحکایات
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا

### مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- فلسفہ امثال
- مکارم اخلاق

### مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی صلعم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- سوانح عمری مولانا روم
- بیان خسرو
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مضامین عالمگیر
- شعر العجم ۴ جلد
- مثنوی صبح امید
- مجموعہ کلام شبلی (اردو)

### نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تقلید و عمل بالحدیث
- مکاتبات الخلان
- کتاب المحبت و الشوق
- مجموعہ لکچر

### مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- مجموعہ رسائل

### مولوی عبدالرزاق
- نظام الملک طوسی
- البرامکہ مجلد

### مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- ادیب
- نور جہاں
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان
- مرہٹے تا جپوتی

### خلیفہ محمد حسین
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ ہر دو جلد

### مولوی سید احمد
- راحت زمانی
- رسوم دہلی
- تسخیر شوہر
- مہرافروز بیگم
- کنز الفوائد
- انشائے ہادی النسا
- تعلیم طبعی
- لغات النسا
- انشائے معتبر النسا
- محاکمہ مرکز زبان اُردو

### مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- میڈیکل جوریس پروڈنس
- عربوں کا فن تعمیر
- سفرنامہ سیوکیو
- جنگ ٹرنسوال

### مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق
- ذکر الحبیب
- ذکر جمیل

### مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس
- اقتصائے عرب
- افسانۂ حکیم

### مولوی شیخ احمد انصاری
- تحریر المراۃ
- المدنیۃ والاسلام

### مولوی عبداللہ عمادی
- کتاب المعارف
- حکمات
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث
- خاتم الکتاب

### مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

### مسٹر ظفر علی خاں بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس
- مستقبل ہیں ملکل
- سیر ظلمات
- ڈراما جنگ روس و جاپان

### مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- پولیسین
- نیلی چھتری

### خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامۂ سیاحت
- ایک فلسفیانہ لکچر اسلام پر
- طالب علم کی زندگی کا مقصد

### مفتی انوار الحق ایم اے
- اثبات واجب الوجود
- حقائق اسلام

### مسٹر عنایت اللہ
- دعوت اسلام
- تاریخ اشاعت علم در چین
- اشاعت اسلام بذریعہ تلوار

# مطبوعاتِ جدیدہ

## نبوّت

اس کتاب میں خان بہادر مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے اپنے خاص طرز بیان میں مسئلہ نبوّت کے اکثر پہلوؤں پر علمی رنگ میں بحث کی ہے - حجم ۱۰۰ صفحے - قیمت ۱۲ر

## جوہرِ قدامت

مولانا عبدالراشد الخیری مصنف صبح زندگی شام زندگی - طوفانِ حیات - بنت الوقت - وغیرہ کا جدید ناول - قیمت ۸ر

## مسلمانانِ اندلس

اسٹینلی لین پول کی مشہور کتاب "مورس ان اسپین" کا ترجمہ از جناب مولوی سید عبدالغنی مدنی مرحوم سابق صدر محاسب ریاست حیدرآباد دکن - یہ کتاب الناظر کے ساتھ قسط وار شایع ہو رہی تھی مگر بعض اسباب کی بناء پر چونکہ کتاب مکمل تیار کر لینا پڑی اسلیئے الناظر میں سلسلہ اشاعت موقوف ہوگیا - کاغذ سفید - قیمت ۲ر

نوٹ - جن خریداران الناظر کے پاس ابتداء سے لیکر ۸۸ صفحے تک یعنی جسقدر الناظر میں شایع ہو چکا ہے موجود ہو انکو بقیہ ۱۲۰ صفحے مع سرورق کے ۸ر میں بھیجے جائیں گے -

## سیرۃ الرسول

مرتبہ مرزا حیرت دہلوی - حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یہ ایک ضخیم کتاب ہے جسکی چھ جلدیں ہیں ۱۲۰۰ کے قریب صفحات ہیں - اور تمام حالات و واقعات نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں - قیمت مکمل سٹ ۵ر (علاوہ محصول جلدیں علیحدہ نہیں ملتی ہیں)

## کتاب شہادت

بڑی تقطیع کی چار جلدوں میں جو تقریباً ۱۲۰۰ صفحات پر پھیلی ہیں یہ کتاب ختم ہوئی ہے - اسمیں علاوہ دیگر مباحث کے جنکا تعلق شیعہ و سنی کے اختلافی مباحث سے ہے مرزا حیرت دہلوی نے ایک عجیب دعویٰ یہ کیا ہے کہ واقعہ شہادت سیدنا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام بالکل غلط اور بے بنیاد ہے - اور اس حیرت انگیز دعوے پر عجیب و غریب دلائل پیش کئے ہیں قیمت کل جلد ۸ر (علاوہ محصول جلدیں علیحدہ نہیں ملتیں)

**نورجہاں بیگم** - کی سوانحعمری از مرزا حیرت دہلوی قیمت ۸ر

**مضامین حیرت** - مرزا حیرت کے بعض دلچسپ مضامین جنمیں جنگ روم و یونان کے مکمل حالات اور شہر قسطنطنیہ کی صحیح کیفیت بھی ہے قیمت ۴ر

**کثرت ازدواج** - اس رسالہ میں مسئلہ زیر بحث کے علاوہ امہات المؤمنین کے بعض سچے واقعات زندگی اور معترضین کے دندان شکن جوابات ملیں گے - قیمت ۸ر

**فغانِ دہلی** - ہستم نصیب دہلی کی پُر درد کہانی - ہندوستان کے نامی گرامی شعراء کی زبانی - جنہوں نے اس عروس البلاد کے اُجڑنے پر نوحہ کیا اور اپنے کمال شاعری کے نمونے دکھلائے ہیں قیمت ۸ر

**سفرنامہ حجاز و مصر** - نواب احمد حسین خاں صاحب رئیس پرولی ضلع مرادآباد کا دلچسپ سفرنامہ - قیمت ۸ر

**غدرنامہ دہلی** - فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا قابل دید مخمس جسمیں مسدس شہر آشوب بھی شامل ہے - قیمت ا ر - **صوفی جنتری** - کاغذ - لکھائی چھپائی عمدہ اسپر مختلف متبرک یادگاروں اور مقدس مزاروں کے عکس اور نقشے مستزاد - قیمت ۵ ر

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۵ جلد ۲۰ — یکم جنوری سنہ ۱۹۱۹ء

## بغداد

**وجہ تسمیہ** بغداد کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بہت کچھ قیل وقال اور اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اور متعدد مبصرین نے اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لیے خامہ فرسائی کی ہے۔

بعض اصحاب کی رائے میں بغداد ایک پہلوی لفظ ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں اس مقام پر بغداد نام ایک ایرانی شہر آباد تھا۔ ایک دوسرے اور قابل تعظیم مستشرق بھی ہیں جنکے خیال میں ایرانی بغداد سے بھی پہلے بابلی اور کلدانی یا سامی کے زمانے میں بغداد موجود تھا۔ چنانچہ سر ہنری راولنسن[1] ایک معتبر محقق کی رائے ہے کہ یہ شہر بخت نصر بابلی کا آباد کیا ہوا ہے۔ جسکے ثبوت میں آپ فرماتے ہیں کہ آپ کو تفتیش اور تحقیق کرتے کرتے بغداد کے اندر ایک ایسا پشتہ ملا جسکی اینٹوں پر بخت نصر کا نام ثبت تھا۔

یہ سب کچھ صحیح ہوگا اور ہمیں ایرانی یا کلدانی بغداد کے ماننے سے کچھ انکار نہیں مگر ان باتوں کے ماننے میں احتیاط ضروری ہے۔ اسلیے کہ اول تو انتہائی قدیم زمانے کے آثار ثابت کرنے کے لیے کافی شہادتیں بھی کچھ بہت کڑے ثبوت کو چاہتا ہے۔ دوم ملک جات یہ ہی ہے کہ مستشرقین عموماً چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ موٹی اور معمولی چیزیں انکو سوجھائی نہیں دیتیں۔ اس قسم کی مثالیں

[1] تشریح۔ تاریخ بغداد۔

مغربی مستشرقین کی تصانیف میں بہت پائی جاتی ہیں۔

البتہ اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بغداد عربی لفظ نہیں۔ مگر اس نام کا شہر پہلے موجود تھا یا نہیں یہ فقط ایک قیاسی بات ہے۔ اسکا ذکر اسلامی تاریخ میں نہیں ملتا۔ قادسیہ کی لڑائی ۱۴ھ ہجری میں ہوئی اور مدائن کسریٰ ۱۶ھ ہجری میں فتح ہوا، مگر فتوحاتِ عجم میں بغداد کا نام نہیں پایا جاتا۔

**تاریخ اسلام** ارتقاء تمدن پر نظر ڈالنے سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ اکثر بادشاہوں اور حکمران خاندانوں کا تعلق خاص خاص شہروں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یعنی جب ان خاندانوں کو عروج ہوتا ہے تو یہ شہر آباد اور انکے سکان مرفہ الحال ہو جاتے ہیں اور جب ان خاندانوں کو زوال ہوتا ہے تو یہ شہر بھی ویران اور خستہ حال ہو جاتے ہیں۔

اسلام کی پیدائش مکہ میں ہوئی اور کعبہ کے متعلق جتنے مناصب تھے مثلاً شرافۃ، قیادۃ اور سفارۃ وغیرہ وہ سب قریش اور بطونِ قریش کے ہاتھ میں تھے۔ اسلام کے پیدا ہوتے ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ اور انھوں نے اہل مکہ سے تنگ آکر مدینہ میں جا کر پناہ لی۔

اسکے بعد مدینہ اسلام کا مامن اور دار الحکومت قرار پایا اور خلفاء راشدین یعنی ابوبکر صدیقؓ، عمر بن الخطابؓ اور عثمان بن عفانؓ کے زمانے میں اس شہر کو مصدر خلافت ہونے کا امتیاز رہا۔

**ابوبکر صدیقؓ** پیغمبر اسلامؑ کی وفات ۱۱ھ ہجری میں ہوئی۔ تو مسلمانوں کا پیغمبر کے بارے میں ایسا گہرا عقیدہ تھا کہ انکو انکے مرنے کا یقین نہیں آتا تھا اور کہتے تھے کہ رسولِ خداؐ ہو کر وہ کیونکر مر سکتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبرؐ کے مکان کے سامنے بہت بھاری بھیڑ جمع ہو گئی۔ ابوبکرؓ کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو انھوں نے آکر لوگوں کو یوں سمجھایا: "ایہا الناس من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت"

(فتوحات اسلامیہ صفحہ ۳۲)

خلیفہ ابوبکرؓ پہلے السنح میں رہا کرتے تھے جو مدینے سے کچھ فاصلے پر واقع ہے اور وہاں سے ہر روز مدینے جا کر لین دین کرتے جس سے انکی اور اہل و عیال کی گذران ہوتی تھی۔ خلیفہ ہونے پر انھیں معلوم ہوا کہ تجارت اور خلافت دونوں کام نہیں ہو سکتے اسلیے انھوں نے تجارت چھوڑ دی اور بیت المال میں سے ایک قلیل رقم اپنے احتیاج کے لیے مقرر کر لی۔ بلکہ مرنے سے پہلے اپنی زمین اور کل جائداد بھی اس نفقہ کے بدلے بیت المال میں داخل کر دی۔

انکو پبلک ڈیوٹی اور پبلک ذمہ داری کا بڑا بھاری خیال تھا یہاں تک کہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنا وہ دینی فرض سمجھتے تھے۔ روایت ہے کہ "ان زوجتہ اشتہت حلواً، فقال لیس لنا ما نشتری بہ، فقالت استفضل من نفقتنا بمدۃ ایام ما نشتری بہ، قال فعلی، ففعلت ذلک، فاجتمع فی ایام کثیرۃ شیئ یسیر، فلما عرفتہ ذلک لیشتری بہ حلواً، اخذہ فردہ فی بیت المال، وقال ہذا یفضل عن قوتنا واسقط من نفقتہ"۔

اسلام کے پانچ دینی فرائض ہیں جنکا ادا کرنا ہر مسلم پر واجب ہے۔ کلمہ شہادت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم رمضان، حج بیت الحرام۔

صحرائے اعراب کے اندر جب اسلام شروع میں پھیلا تو اسے قبول کرنے میں انھیں کوئی دقت معلوم نہ دی۔ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے کہنے میں اور نماز پڑھنے میں انکا کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ بیت الحرام انکے قریب ہی تھا جہاں پر تجارت اور زمین دین کے لیے انکو سال میں کم از کم دو بار جانا پڑتا تھا، اسلیے حج کرنا بھی انکے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔ بلکہ غزوات یعنی بدر الکبریٰ اور اسکے بعد یرموک اور قادسیہ کی لڑائیوں میں جب لوٹ بٹنے لگی اور انکو مال ملنے لگے تو اونٹ ہانکنے اور بھیڑی چرانے کی بہ نسبت مجاہد اور محارب بننا انکو زیادہ سود مند نظر آیا۔

ابوبکرؓ ایک متقی اور راسخ الاعتقاد مسلمان تھے۔ انھوں نے خلیفہ ہوتے ہی ہر ایک نو مسلم سے سخت گیری اور تشدد کے ساتھ دینی فرائض ادا کرانے شروع کر دیے۔ "فان اللہ لم یرض من عبادہ بالقول دون الفعل"۔ نو مسلم عرب اور تو سب کچھ کرنے کو طیار رہتے تھے فقط زکوٰۃ دینے سے انکو انکار تھا انکا خیال تھا کہ ہم لینے کے لیے مسلمان بنے تھے نہ کہ دینے کے لیے۔ چنانچہ بنی اسد، بنی تمیم، بنی یمام وغیرہ اسلام سے منحرف ہو گئے اور ان مرتدوں کو اسلامی حلقہ میں واپس لانے کے لیے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔

**عمر بن الخطابؓ** ابوبکر صدیقؓ نے ۱۳ھ ہجری میں وفات پائی اور مرتے وقت انھوں نے عمرؓ ابن الخطاب کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ ابوبکرؓ کے زمانے میں کوئی خزانہ تھا بلکہ زکوٰۃ اور غزوات کا

---

لہ فتوحات الاسلامیہ جلد دوم۔ ۲ہ فتوح البلدان و کتاب ابو یوسفیہ۔ ۳ہ فتوحات الاسلامیہ جلد دوم صفحہ ۲۱۷۔

جو مال آتا اُسکو فوراً بانٹ دیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ کے مرنے کے وقت فقط ایک درہم بیت المال
میں موجود تھا۔ اور ابو بکر صدیقؓ کے اپنے پاس صرف دو جوڑے کپڑے کے تھے جسکے متعلق اُنھوں نے
وصیت کی کہ " انظروا ثوبی ہذین واغسلوہما، فکفنونی فیہما، فان الحی احوج الی الجدید من المیت "

عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں سلطنت کے وسیع ہو جانے سے زکوٰۃ اور غزوات اور اسکے بعد خراج
اور جزیہ کی آمد اس قدر بڑھ گئی کہ تقسیم کرنے کے بعد بھی بہت سا مال بچ رہتا تھا۔ جسکو ذخیرہ کرنے کی
ضرورت ہوئی۔ اسکا نام بیت المال تھا۔ جس میں ہر مسلمان کا حق اور حصہ تھا۔

خلیفہ عمرؓ کی سخت دیانت داری اور اپنے عہدہ کی ذمہ داری کی ایک عجیب مثال مشہور ہے " قال
بعث عمر رضی اللہ عنہ رسولاً الی ملک الروم، فاستقرضت ام کلثوم (بنت علی رضی اللہ عنہما) امرأۃ عمر دیناراً
فاشترت بہ عطراً وجعلتہ فی قارورۃ وبعثت بہ مع الرسول الی امرأۃ ملک الروم، فلما اتاہا بعثت لہا شیئاً
من الجواہر، وقالت للرسول اذہب بہ الی امرأۃ عمر، فلما اتاہا فرغتہ علی البساط، فدخل عمر فقال ما ہذا،
فاخبرتہ، فاخذ الجواہر وخرج الی المسجد ونادی الصلوٰۃ جامعۃ، فلما اجتمع الناس اخبرہم الخبر واراہم الجواہر
وقال ما ترون فی ذلک، فقالوا انا نراہا تستحق ذلک لانہ ہدیۃ لہا اتتہا من امرأۃ لا جزیۃ ولا خراج علیہا
ولا یتعلق بہا حکم من احکام الرجال، فقال لکن الزوجۃ زوجۃ امیر المؤمنین والرسول رسول امیر المؤمنین
والراحلۃ رکبہا للمؤمنین وما جاء ذلک کلہ لولا امیر المؤمنین، فاری ان ذلک لبیت المال المسلمین ونعطیہا
راس مالہا، فباع الجواہر ودفع لزوجتہ دیناراً وجعل ما بقی فی بیت المال المسلمین "

دینی اور دنیوی اشتراک نے مسلمانوں کو مساوی اور ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ اس
مساوات الجمہور میں خلیفہ بحیثیت مسلمان دوسرے مسلمانوں کے برابر تھے۔ اور بحیثیت نبی اسلامؐ کے
سجادہ نشین ہونے کے نماز پڑھنے کے وقت اُنکے امام، آپس کے جھگڑوں میں اُنکے قاضی، بیرونی لڑائیوں
میں اُنکے جنرل، اور بیت المال کی تقسیم اور محافظت کے لیے متولی تھے۔

اُجڈ اور وحشی قوموں میں انصاف کرنا مشکل ہوتا ہے۔ انکے آپس کے جھگڑوں کے فیصل کرنے
میں اور مساوات کی ترازو کو ہموار رکھنے میں خلیفۂ اسلام کو نہایت احتیاط اور سخت گیری سے کام لینا
پڑتا تھا۔ اس سخت گیر انصاف کی ایک مثال جسکو بیان کی جاتی ہے " الثعلبی الذی ضربہ ابن عمرو

۵۱ فتوحات الاسلامیہ جلد ۲ صفحہ ۴۱۳ ۔ ۵۲ ایضاً صفحہ ۴۰۹ ۔ ۵۳ تاریخ تمدن اسلام جلد ۱ صفحہ ۹۸ ۔

ابن العاص، وذهب الی عمر ابن الخطاب فی المدینة فاستغاثه، فبعث عمر الی عمرو فاستقدمه فلما جاء أعطی الخلیفة ابن القبطی سوطًا، وامره ان یضرب ابن عمرو فضربه واراد ان یضرب اباه عمرًا، فقال عمرو انما ابنی الذی ضربه فقال له یا عمرو منذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارًا"

عمرو بن العاصؓ مصر کے فاتح اور مسلمانوں کے ایک بڑے جنرل گذرے ہیں جو لوگ رعب داب کو ہوا بنا کر رعایا کو ڈراتے ہیں اور اسکو قیام ریاست اور وجود حکومت کے لیے ضروری بتلاتے ہیں انکو اس مثال سے سبق لینا چاہیے۔ مگر باوجود اس سخت گیر انصاف اور دیانتداری کے عمر بیچارے سنہ ۲۳ ہجری میں فیروز ابن لولو کے ہاتھ سے مارے گئے۔

**عثمان بن عفانؓ** | خلیفہ عمرؓ نے اپنا جانشین کسی کو نامزد نہیں کیا مگر مرنے سے پہلے عثمان بن عفانؓ، علی ابن ابی طالبؓ، طلحہؓ بن عبیداللہ، زبیرؓ بن العوام، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، اور سعد بن ابی وقاصؓ، چھ کو وصیت کی کہ مشورہ کرکے آپس میں سے ایک کو خلیفہ چن لیں۔ اس انتخاب کی نسبت مسلمان مورخوں میں بہت بھاری اختلاف پایا جاتا ہے اور اسکے بارے میں مختلف مورخوں نے مختلف اور متضاد روایات بیان کی ہیں۔

ماسوا اسکے ۱۳ صدیوں کے بغض اور عناد اس مسئلہ کے گرد ایسے حائل ہیں کہ ایک غیر مسلم کے لیے اسکی نسبت رائے زنی کرنا اور حق کو ناحق اور راستی کو ناراستی سے جدا کرنے کی کوشش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ بعض مورخوں نے جو یہ لکھا ہے کہ "ان کلا من علی وعثمان وبقیة اصحاب الشوری کان لکل واحد منهم رغبة فی ان تکون الخلافة له" اس میں حقیقت کچھ ضرور ہے گو اس خواہش کو انھوں نے علانیہ طور پر ظاہر نہیں کیا۔ ورنہ عثمانؓ بن عفانؓ کی متابعت کے بعد اتنی جلد علیحدہ فرق اور پارٹیوں کے پیدا ہو جانے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بعض مورخوں نے ان مناقشات کو اس بات سے منسوب کیا ہے کہ عثمانؓ نے اپنے اقربا اور رشتہ داروں کی جانبداری کرکے پرانے والیوں اور عمال کی جگہ پر انھیں مقرر کر دیا جس سے لوگوں کے دل ان سے متنفر ہو گئے۔

المسعودی ایک معتبر مورخ ان خانہ جنگیوں کا ایک اور سبب بیان کرتا ہے "فی ایام عثمان اقتنی الصحابة الضیاع والمال فکان لعثمان یوم قتل عند خازنه خمسون ومائة الف دینار والف الف درهم وقیمة ضیاعه بوادی القری وحنین وغیرها مائة الف دینار وخلف ابلا وخیلا کثیرة وبلغ الثمن الواحد

من متروک الزبیر بعد وفاتہ خمسین الف دینار، و خلف الف فرس و الف امۃ، و کانت غلّۃ طلحۃ من العراق الف دینار کل یوم و من ناحیۃ السراۃ اکثر من ذلک، و کان علی مربط عبد الرحمن بن عوف الف فرس و لہ الف بعیر و عشرۃ آلاف من الغنم، و بلغ الربع من متروکہ بعد وفاتہ اربعۃ و ثمانین الفاً - الخ"

الغرض ان جھگڑوں کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، مصر، کوفہ، اور اہل بصرہ نے ملکر عثمانؓ کو خلافت سے دست بردار ہونے کیلئے مجبور کیا۔ اور جب انھوں نے انکار کیا تو ۳۵ھ میں انکو شہید کر ڈالا۔

خلیفہ ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ کے زمانے میں فتوحات کا دائرہ بہت جلد پھیل گیا۔ اس سرعت اور وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نبی اسلام کی وفات ۱۱ھ ہجری میں ہوئی اور اسکے دو سال کے اندر اندر مسلمانوں نے یرموک پر ۱۳ھ ہجری میں رومن فوجوں کو شکست فاش دیکر فاتح عالم بننے کا دعوے پیش کیا اور نیز یہ ثابت کر دکھایا کہ جو لوگ نیک نیتی اور راسخ اعتقاد کے ساتھ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں وہ اگر تھوڑے بھی ہوں تو کثرت تعداد پر غالب آ سکتے ہیں۔

اسکے بعد ۱۴ھ ہجری میں مغیرہ بن شعبہ نے مقام قادسیہ پر سلطنت ساسانیہ کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اُدھر عمرو بن العاصؓ نے مصر فتح کرکے شمال افریقہ اور ہسپانیہ کا راستہ صاف کر دیا۔ چنانچہ اسلام کی پیدائش کے چند سال کے اندر اندر "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی صدائیں حجاز سے اُٹھکر عراق، عجم، وادی نیل، اور صحارائے افریقہ میں گونجنے لگ گئیں۔ سلطنت کا دائرہ پھیلنے کے ساتھ خلافت کا مرکز محیط مقبوضات سے دُور پڑ گیا۔ اور جنگی اور سیاسی معاملوں کے حل و عقد کے لیے مقامی مرکزوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت نے کوفہ اور بصرہ کی بنیاد عراق میں اور فسطاط کی بنیاد مصر میں ڈالی۔ شروع شروع میں یہ مقامات عسکر یا چھاؤنیاں تھیں جہاں پر اسلامی فوجیں خیموں اور جھونپڑوں میں رہا کرتی تھیں۔ اور فسطاط کے معنی خیمہ یا جھونپڑا ہے۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن العاص سے پہلے اسکندریہ میں چھاؤنی ڈالی تھی اور سعد بن ابی وقاصؓ نے مدائن کسریٰ یعنی دیائے دجلہ کے اس پار ڈیرے ڈالے تھے۔ جب خلیفہ عمرؓ کو اس بات کی خبر ہوئی تو انھوں نے حکم بھیجا "لا تجعلوا بینی و بینکم ماء، متی اردت ان ارکب الیکم راحلتی حتی اقدم علیکم قدمت" اس حکم کے مطابق وہاں سے ہٹ کر فسطاط اور کوفہ کی بنیاد ڈالی گئی۔

علیؓ ابن ابی طالب[1]۔ عثمانؓ کے مرنے کے بعد خلافت کی خواہش جو اصحاب شوریٰ کے دلوں میں چھپی ہوئی تھی اب علانیہ طور پر نکل پڑی اور خلافت کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ مدینہ اور مصر کے لوگ علیؓ ابن ابی طالب کو چاہتے تھے، اہل بصرہ طلحہ بن عبید اللہ کے طرفدار تھے اور کوفہ کے باشندے زبیر بن العوام کے حامی تھے۔ چنانچہ بصرہ کے گرد و نواح میں جانبین میں لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی کا نام واقعہ جمل ہے۔ اس لڑائی میں علیؓ ابن ابی طالب ایک طرف تھے اور طلحہؓ و زبیرؓ ایک طرف تھے۔ طلحہ اور زبیر مارے گئے اور علیؓ نے مسند خلافت پر قدم رکھا اور اسکے ساتھ ہی انھوں نے مدینہ چھوڑ کر کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ اسلامی ریاستوں میں سے مصر، حجاز، خراسان اور عراق عرب نے علیؓ کی خلافت کو تسلیم کر لیا مگر دمشق اور شام کے لوگوں نے اسے منظور نہیں کیا۔

شام کے والی معاویہؓ بن ابی سفیان تھے جو دمشق میں بیٹھے دور سے خلافت کے تاک میں لگے ہوئے تھے۔ عثمانؓ کے قتل نے اب انھیں موقع دیا اور انھوں نے عثمانؓ کی خوں آلودہ قمیص جامع دمشق میں لٹکا کر اپنے حریف علیؓ ابن ابی طالب پر قتل کا الزام لگایا۔ اور عمرو ابن العاصؓ، ولید بن عقبہ، عتبہ بن ابی سفیان، المغیرۃ بن شعبہ اور دیگر اعیان اسلام کو اپنا ہم آہنگ بنا کر خلافت کے دعویدار ہوئے۔ مقام صفین پر جانبین میں لڑائی ہوئی اور اثنائے جنگ میں یہ قرار پایا کہ خلافت کا فیصلہ تحکیم سے کیا جائے۔ اس تحکیم سے بجائے فرو ہونے کے فساد اور بھی بڑھ گیا۔ یعنی ایک فرقہ خارجیہ پیدا ہو گیا جو اس تحکیم سے برخلاف تھا۔ ان خانہ جنگیوں کو دیکھ کر بہی خواہان قوم انکے فرو کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

خارجیہ فرقہ کے خیال میں یہ فساد علی ابن ابی طالب، معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص کی زندگی سے وابستہ تھا اسلیے انکو اگر کسی طرح سے صفحۂ ہستی سے دور کر دیا جائے تو اسلام کو امن چین نصیب ہو گا۔ چنانچہ تین شخصوں نے ان تینوں کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔ جمعہ کا دن قتل کا مقرر کیا گیا۔ ان میں سے علیؓ بیچارے تو مارے گئے، اور معاویہ زخم کھا کر جان سے بچ گئے، عمرو بن العاص اس دن خوش قسمتی سے نماز کو نہیں گئے۔ خارجیہ فرقہ معتزلہ مذہب کی ایک شاخ ہے جسکا آغاز بنی اسلام کے زمانہ سے بتایا جاتا ہے۔ مگر اس فرقہ کا اصل بانی، واصل بن عطا، ہشام کے زمانہ میں گزرا ہے۔

علیؓ نے گو چار سال حکومت کی مگر خانہ جنگیوں کے سبب سے خلافت ایسی مخدوش اور متزلزل حالت

[1] نہایت [illegible] سکمن۔ دی سیراحمر صفحہ ۲۸۲۔

میں بھی کہ کوفہ کو پایۂ خلافت کی شان و شوکت نصیب نہیں ہوئی۔ اس زمانہ تک اسلام ایک دینی ریاست تھی جسکی اساس زہد، تقویٰ، عدل اور انصاف پر رکھی گئی تھی۔

جب اسلامی فوجیں شام پر حملہ آور ہوئی ہیں تو خلیفہ ابوبکرؓ نے اسامہ کو مخاطب کرکے یوں نصیحت کی "لا تخونوا، لا تغدروا، لا تغلوا، لا تمثلوا، لا تقتلوا طفلاً ولا شیخاً کبیراً، لا تعقروا نخلاً، لا تحرقوا ولا تقطعوا شجرۃ مثمرۃ، لا تذبحوا شاۃ ولا بقرۃ ولا ابلۃ، وسوف تمرون باقوام قد فرغوا انفسہم فی الصوامع فدعوہم وما فرغوا انفسہم لہ" مسلمانوں کی زندگی اور طرزِ ماندوبود سادہ اور آزادانہ تھی اور انکی دنیوی ضرورتیں بہت تھوڑی تھیں۔ یہاں تک کہ امیرالمومنین[1] "کان یلبس الثوب من الکرباس الغلیظ وفی رجلیہ نعلان من لیف وحمائل سیفہ لیف ویمشی فی الاسواق لبعض المرمۃ او اذا احکم ادنی الناس سمع منہ اغلظ من کلامہ وکان طعامہم ادنی اطعمۃ فقرائہم وہم لم تعقلوا منہ لفقر آءد ونجز وکانو یفعلون ذلک مواساۃ للفقراء"

**بنی اُمیّہ** علیؓ کے قتل ہونے کے بعد معاویہؓ نے میدان صاف دیکھکر بے کھٹکے خلافت پر قبضہ کرلیا جسکے ساتھ خلافت کا محور بھی کوفہ سے نکل کر دمشق میں تحویل ہوگیا۔ اور ۴۰ھ سے لیکر ۱۳۲ہجری تک فرامین امیرالمومنین ہسپانیہ سے لیکر ہندوستان اور ترکستان تک دمشق سے جاری ہوتے رہے۔

بنی امیہ کے عہدِ حکومت میں دینی رعب اور حقوق تو برقرار رہے مگر دنیوی علائق یعنی ملک و مال کے بڑھ جانے سے اس میں شاہی شان و شوکت بھی بکثرت پیدا ہوگئی۔ اب تک تو خلافتِ شوریٰ تھی یعنی امیرالمومنین کو اتفاق رائے پر انتخاب کیا جاتا تھا، معاویہ نے خلافت کو موروثی بنا لیا۔

اس خاندان میں سے عبدالملک ابن مروان اور ولید ابن عبدالملک صاحب تدبیر خلفا گذرے ہیں[2]۔ انکے زمانہ میں قلمرو نے نظم و نسق حاصل کیا۔ مصلحتِ ملک کے لیے دیپارٹمنٹ (دیوان) مقرر ہوے سرکاری دفتروں میں عربی زبان برتی جانے لگی۔ نقود اور سکّے مضروب ہوے؛ اور اسلامی فتوحات نے کوہ پیرنیز سے عبور کرکے دول فرنگستان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہند، سندھ اور ترکستان ممالکِ محروسہ میں شامل ہوے۔ دور دراز مقبوضات میں والی اور عمّال، عالیشان سلاطین اور ذوی الاقتدار حکمران بن گئے۔ اور جہاں جہاں اسلامی جھنڈا لہرایا وہاں وہاں خوبصورت اور عالیشان شہر آباد ہوگئے۔ اندلس میں قرطبہ، غرناطہ، سرقوسہ، مالقہ، شمال افریقہ میں قیروان مشہور شہر تھے۔

---

[1] فتوحات اسلامیہ صفحہ ۲۲۲ [2] تاریخ تمدن اسلام جلد صفحہ ۔

ریاست کا تجمل بڑھ جانے کے ساتھ خلفاء کے اندر تن آسانی اور عیاشی آگئی۔ آخری خلفا شراب اور غنا کی رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر ایسے بادہ مست ہوئے کہ ملک داری کے فرائض بھلا کر دن رات زنڈیوں اور ہیجڑوں کی صحبت میں گذارنے لگے۔ یزیدؒ ابن عبدالملک کے پاس دو مغنیہ تھیں سلامہ اور حبابہ۔ ان دونوں کو سرکاری کاروبار میں اس قدر دخل تھا کہ امراء و وزراء میں سے جسے چاہتیں بنائیں جسے چاہتیں بگاڑ دیتیں۔ یہ حالت دیکھکر سلامہ نے یزید کو ملامت کی اور بہت سمجھایا۔ ان پند و نصائح کا اتنا اثر ہوا کہ چند روز تک یزید نے شراب پیا اور حبابہ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ایک دن یزید کی سواری صلوٰۃ جمعہ کے لیے جا رہی تھی سامنے میں حبابہ بن ٹھن کر کھڑی تھی۔ یزید کو دیکھ کر اس نے عود پر چوٹ لگائی اور یہ راگ گایا:۔

الا لا تلمہ الیوم ان یبتلدا فقد غلب المحزون ان یتجلدا

یہ سن کر یزید نے منہ ڈھانپ لیا۔ حبابہ نے پھر گایا

فما العیش الا ما تلذ و تشتہی وان لام فیہ ذو الشنان وفندا

اسکے بعد یزید سے نہ رہا گیا اور اسکے ساتھ ہو لیا۔ کہتے ہیں کہ حبابہ کے مر جانے کے بعد یزید نے کئی دن تک اسے گلے لگائے رکھا۔ اور لاش کے ساتھ بوس و کنار کرتا رہا حتیٰ کہ لاش سڑ اٹھی۔ آخر کھانا دانا چھوڑ کر اسی غم میں مرگیا۔ یہ شعر اسی کا ہے

انا الیسوم ما عندی من الترياق والراقی اور کا سا و نا ولہا الا یا ایہا الساقی

بنی عباس۔ گو علیؓ ابن ابی طالب کے بعد بنی امیہ نے خلافت لے لی تھی مگر علیؓ کی اولاد ابھی باقی تھی اور وہ اپنے آپ کو خلافت کا دعویدار برابر سمجھتے رہے۔ قتل حسینؓ کے بعد علویوں کے دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق تو کہتا تھا کہ حسنؓ اور حسینؓ کے بعد خلافت فاطمہؓ بنت النبیؐ کی اولاد کو ملنی چاہیے یعنی علی المعروف بہ زین العابدین، محمد باقر، جعفر الصادق، موسیٰ الکاظم، علی الرضا، محمد التقی، علی النقی، حسن العسکری، محمد المہدی۔ یہ فریق ائمہ اثنا عشریہ کہلاتا ہے۔ دوسرا فریق کیسانیہ ہے جنکا دعوے ہے کہ حسنؓ و حسینؓ کے بعد خلافت محمد بن الحنفیہ کا حق ہے، گو وہ فاطمہؓ کے بطن سے نہ تھے۔ اسی طور پر بنی عباس میں سے بھی چند ایک ایسے تھے جنکے دل میں خلافت کی ہوس موجود تھی۔

بنی امیہ نے اپنے ایام عروج میں ان دونوں دعویدار فرقوں یعنی علویوں اور عباسیوں کو تتر بتر

لہ ابو الفداء۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۷

کرکے پریشان حال رکھا۔ لیکن جب بنی امیہ کے عروج کے دن پورے ہوے تو ان دونوں فریقوں نے پھر سر اٹھایا۔ بنی عباس کی قسمت نے یاوری کی اور خلافت بنی امیہ کے ہاتھ سے نکلکر انکی طرف منتقل ہوگئی۔ بنی عباس کے اب دو دشمن ہوگئے۔ یعنی ایک تو بنی امیہ کے پسماندہ اولاد و احفاد، دوسرے علوی۔ عباسی خاندان میں ابو العباس پہلا خلیفہ گذرا ہے۔ جس نے ان دونوں دشمنوں کو چن چن کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کیا۔ بنی امیہ میں سے عبد الرحمن بن معاویہ بن ہشام نے بھاگ کر ہسپانیہ میں جا پناہ لی۔

اس خوں ریزی کے سبب مورخوں نے ابو العباس کو السفاح کا لقب دیا ہے۔ السفاح کا مکان انبار میں تھا۔ یہ مقام فرات کے کنارے پر بغداد سے چند میل مغرب کی جانب واقع ہے۔ السفاح نے انبار سے کچھ دور کوفہ کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا جسکا نام اس نے ہاشمیہ رکھا۔ اسکا خیال تھا کہ اس تدبیر سے عباسیوں اور علویوں کے درمیان جھگڑا مٹ جائیگا۔

ابو العباس چار سال حکومت کرکے مرگیا۔ اسکے بعد اسکا بھائی ابو جعفر المنصور ۱۳۶ھ ہجری میں مسند خلافت پر بیٹھا۔ مگر اسکے چند سال کے اندر ایک فرقہ راوندیہ اس علاقہ میں ایسا پیدا ہوگیا جسکے ڈر کے مارے منصور کو ہاشمیہ چھوڑنا پڑا۔ اور ۱۴۵ھ ہجری میں نے بغداد کی بنیاد ڈالی۔

بغداد | خلفاے عباسی کے عہد حکومت یعنی ۱۴۵ھ سے لیکر ۶۵۶ھ ہجری تک بغداد ممالک محروسہ کا تاج اور اسلامی دنیا کا پایۂ تخت اور مصدرِ حکومت بنا رہا

بغداد کا نام ابتدا میں مدینۃ المنصور تھا۔ بعد میں مسلمان مصنف اسکو بغداد اور دار السلام لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس زمانہ میں جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے اور بھی بڑے بڑے اور معتبر اسلامی شہر موجود تھے مگر جو شہرت اور مقبولیت خاص و عام کی زبان پر بغداد کو ہوئی ہے وہ دوسرے اور کسی شہر کو نصیب نہیں ہوئی۔

بغداد کا نام لیتے ہی الف لیلہ کی کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ دنیا بھر میں کوئی ایسی زبان نہ ہوگی جس میں الف لیلہ کی کہانیوں کا ترجمہ نہ پایا جاتا ہو اور کسی ملک میں کوئی ایسا بچہ نہ ہوگا جس نے علی بابا، الہ دین، اور سندباد بحری کی کہانیاں دلچسپی اور شوق کے ساتھ نہ سنی یا نہ پڑھی ہوں۔ یہ کہانیاں محض افسانہ نہیں ہیں بلکہ ان میں اُس زمانہ کے تمدنی اور اخلاقی زندگی کو نہایت مرغوب پیرایہ میں ایک زندۂ جاوید مرقع بناکر پیش کیا ہے۔ ہارون رشید کا جعفر برمکی کے ہمراہ بھیس بدلکر جانا۔ راتوں کو بغداد کے گلی کوچوں میں گھومنا۔

رعایا کی محفلوں اور مجلسوں میں شامل ہوتا، اُنکے ساتھ بیٹکر بے تکلفت اور بیجا با مناجلنا، اُنکے گھروں میں جانا اور رنج وراحت میں شریک ہونا یہ ایک ایسا دلکش نظارہ ہے جس سے یہ صدیوں کی مری ہوئی مورتیں زندہ ہوکر ہو بہو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہیں۔

مگر بغداد کی شہرت فقط خلفاے عباسی کے عظمت وشکوہ پر منحصر نہیں تھی۔ اسکے اسباب کچھ اور بھی تھے۔ بغداد کی سرزمیں دوآب دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس دوآب کے شمالی حصہ کو جو تکریت اور ہیت سے لیکر جبال آرمینیا تک واقع ہے عرب مصنف جزیرہ لکھتے ہیں۔ اس حصہ میں موصل، سنجار، نصیبین، الرقہ، قرقیسیا، الحدثیہ، ہیت، حران، تکریت اور الرہا مشہور شہر ہیں۔ دوآبکا جنوبی حصہ جو تکریت[سلہ] اور ہیت سے لیکر بصرہ اور عبادان تک واقع ہے سواد یا عراق عرب کہلاتا ہے۔ اس حصہ میں بصرہ، بطائح، واسط، کوفہ، نہروان، حلوان، حیرہ، اور بغداد مشہور شہر تھے۔ یہ علاقہ اس قدر زرخیز ہے کہ خلفاے عباسی اور ان سے بھی پہلے قباد بن فیروز اور خسرو پرویز کے زمانہ میں سواد کا محاصل تمام قلمرو کے محاصل کا ایک تہائی ہوا کرتا تھا۔

یہ ملک نہ صرف پیداوار کے لحاظ سے زرخیز تھا بلکہ مردم خیز بھی تھا۔ یہاں پر بڑی بڑی قومیں بڑے بڑے اولوالعزم فاتح اور کشورکشا پیدا ہوے اور اپنے جبروت اور جہانگیری کے کرشمے دکھاکر صفحہ ہستی سے غائب ہوگئے۔ کلدانی۔ سریانی۔ عبرانی۔ ساسانی۔ قومیں یہاں پر ربیع اور خریف کی فصلوں کی طرح یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں۔ پہلے پھلیں پھولیں اور پھر مرجھاکر تہِ خاک ہوگئیں۔

بغداد کے جنوب مغرب میں بابل کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں جہاں پر کئی گز مٹی کے تلے بخت نصر بابلی اور سارڈاناپلیوس کی عظمت وشان دبی پڑی ہے۔ وہیں پر ایک کونے میں سکندر اعظم کی ہوس جہانگیری خاک میں ملی ہوئی ہے۔ بابل کے کچھ فاصلہ پر کربلا اور نجف ہے۔ اس سے چند میل آگے قادسیہ کا رزمگاہ ہے۔ موصل سے کچھ دور نینوہ کے آثار حسرت کے ساتھ اُس شہر کی گذشتہ عظمت اورشان یاد دلاتے ہیں بغداد کے جنوب میں مدائن کسرے ہے۔

اس مُلک کی چپہ چپہ زمین گویا مدفن ہے جہاں پر استخوانِ رمیم انبار در انبار پائی جاتی ہیں۔ جہاں پر قدم رکھو تو تلے سے کسرٰے کی آہ اور قیصر کی صدا نکلتی ہے۔ اور معلوم نہیں ہوتا کہ کھوپڑی کسریٰ کی ہے

سلہ تکریت صلاح الدین ایوبی کی جاے پیدایش ہے۔ یہ مقام سامرہ سے ۳۰ میل فاصلہ پر لب دجلہ واقع ہے ۱۲

یا امیرالمومنین کی تسلیم کی ہے یا کافر کی۔ سب پہلو بہ پہلو آرام کی نیند ہوتے ہیں۔ تو تعجب نہیں کہ شاہان سلف کی گذشتہ عظمت وشان کی یادگار رہنے بھی بغداد کے شہرت دلانے میں مدد دی ہو۔

مدینۃ المنصور۔ یہ شہر دجلہ کے داہنی طرف لب دریا سے کچھ فاصلہ پر کاظمیہ اور زیارتِ معروف کے درمیان واقع تھا۔ اسکو منصور نے اپنی حفاظت اور تحصین کے لیے بنایا تھا۔ اسلیے شہر کی شکل گول بنائی گئی تھی اور اسکے گرد تین شہر پناہیں تھیں۔ سب سے باہر والی فصیل کے گرد ایک گہری خندق تھی۔ مدینۃ المنصور کے چار دروازے تھے۔ ایک دروازہ باب شام شمال میں کاظمیہ کے رُخ پر واقع تھا، جہاں سے شام اور موصل کی طرف راستہ شروع ہوتا تھا۔ دوسرا دروازہ جنوب کی جانب باب بصرہ تھا جہاں سے بصرہ کو سڑک جاتی تھی۔ مغرب کے رُخ بابِ کوفہ تھا جہاں سے حجاز اور کوفہ کی طرف قافلے جایا کرتے تھے۔ بابِ کوفہ کے مقابل مشرق کی طرف بابِ خراسان تھا۔ جہاں سے راہ شروع ہو کر اور دجلہ کے پل کے اوپر سے گذر کر خراسان اور ایران کو جاتی تھی۔ شہر کے اندر یہ چاروں سڑکیں چوسر کی طرح ملی ہوئی تھیں۔

مدینۃ المنصور کے عین وسط میں شاہی عمارات تھیں جنکا نام باب الذہب تھا اور انکے پاس ہی ایک عالیشان مسجد تھی جسکا نیلا گنبد دور سے دکھائی دیتا تھا۔ اس مسجد کو قبۃ الخضرا کہتے تھے۔ شہر پناہوں کے بیچوں بیچ اور شاہی عمارات کے اِردگرد دوکانیں آباد تھیں اور لوگوں کے گھر تھے۔ بازار اوپر سے پٹے ہوئے تھے۔ گلیاں تنگ اور پیچدار تھیں۔ مدینہ منصور کچھ بہت بڑا شہر نہیں تھا اسکا دَور زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ میل ہوگا۔ جس میں سے آدھی سے زیادہ جگہ شاہی عمارات اور سرکاری دفتروں کے تصرف میں تھی۔ جیسے جیسے ملک میں امن چین پھیلا ویسے ویسے آبادی بڑھنا شروع ہوئی۔ گر چونکہ شہر کے اندر گنجایش کم تھی لوگوں نے شہر کے باہر اور شہر کے گرداگرد مکانات بنانے شروع کیے۔ دوکانیں اور بازار کھل گئے۔ اسکے علاوہ خلیفہ نے امیروں اور رئیسوں کو شہر کے آس پاس زمینیں اور جاگیریں دے رکھی تھیں جہاں اُنھوں نے عمارات اور باغات نصب کیے تھے۔ اس طرح آبادی شہر کے گرد ونواح میں کوسوں تک پھیل گئی۔

بیرون شہر کی آبادی کا وہ حصہ جو کاظمیہ کی طرف پھیلا ہوا تھا اُسکا نام قطربل تھا۔ قطربل اور باب الشام کے آس پاس متمول اور آسودہ حال لوگوں نے مکانات تعمیر کیے تھے اس محلہ کا نام حربیہ تھا۔ باقی آبادی جو خارج از شہر مغرب کے رخ بابِ کوفہ سے لیکر باب بصرہ تک پھیلی ہوئی تھی اُسکا نام کرخ تھا۔ مشرق کی جانب مدینہ منصور اور دجلہ کے درمیان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے خراسان کو سڑک تھی۔ اس سڑک کے

شمال یعنی حربیہ کے رخ قصر خلد تھی جس میں کبھی کبھی المنصور اور اسکے بعد ہارون رشید رہا کرتا تھا۔ باب خراسان کے سامنے میدان تھا جہاں اسپ دوانی، فوجی مشق اور پریڈ ہوا کرتی تھی۔ سڑک خراسان کے جنوب کے طرف کا حصہ شرقیہ کہلاتا تھا۔ یہاں زبیدہ خاتون کا دارالقرار یا محل تھا۔ اور اسی حصہ میں سے نہریں گذر کر دجلہ میں گرتی تھیں جنکا ذکر بعد میں ہوگا۔ المہدی جب خراسان سے واپس آیا تو اسنے اپنی فوج سمیت دجلہ کے اس پار یعنی مشرق کی طرف اور قصر خلد کے مقابل رہایش اختیار کی۔ اس مقام کا نام معسکر مہدی تھا۔ رفتہ رفتہ امرا اور فوجی افسروں نے بھی وہیں پر مکانات اور باغات بنالیے اور اس محلہ کا نام الرصافہ ہوگیا۔

دریاے فرات میں سے کاٹ کر کئی نہریں دجلہ میں ڈالی گئی تھیں جنکے ذریعہ سے مابین دوآب کی کھیتی باڑیوں اور باغات کی آبپاشی بھی ہوتی ہے اور انھیں نہروں کے ذریعہ سے بڑی بڑی کشتیاں دمشق اور شام کا مال اور غلہ مقام محول پر فرات میں سے نکال کر بغداد میں لاتی تھیں۔ گویا یہ نہریں شمال مغرب میں سے آکر مدینۂ منصور کے ارد گرد شمالاً غرباً جال کی طرح پر شاخ در شاخ پھیلی ہوئی تھیں اور محلہ شرقیہ میں سے بہتی ہوئی دریاے دجلہ میں گرتی تھیں۔ ان میں سے مشہور نہریں الصراط۔ نہر کارخیا۔ نہر موسیٰ۔ اور نہر طاہر تھیں۔ شہر کے پھیلنے اور بڑھ جانے سے ان نہروں کے کنارے کنارے دوکانیں اور بازار بن گئے۔ عالیشان عمارات کھڑی ہوگئیں اور جابجا نہروں پر سے عبور کرنے کے لیے پل بنے ہوے تھے۔ باب بصرہ کے سامنے سوق بزازین۔ سوق دجاج۔ سوق طباخین۔ سوق نساخین وغیرہ کرخ کے مشہور بازار تھے۔

اراکین دولت اور متمول لوگوں نے المہدی اور ہارون رشید کے زمانے میں دریا کے پاس کنارے پر مکان اور باغات بنانا شروع کردیے تھے۔ جس کے سبب سے مدینۂ منصور کی رونق گھٹنے لگی تھی۔ ہارون الرشید کے وفات کے بعد جب مامون اور امین کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تو طاہر نے مدینۂ منصور کا محاصرہ کیا اور نہروں کو کاٹ دیا جس سے شہر کے اندر اور باہر پانی بھر گیا۔ اور ہزاروں مکانات گر گئے۔ اسکے سوا مجانیق اور پتھروں کی مار سے بھی بہت سی عمارات کو سخت نقصان پہونچا جس سے لوگ اور بھی گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اسکے بعد مامون کے عہد حکومت میں یہ نقل مکان کا سلسلہ جاری رہا اور مغرب سے نکل نکلکر آبادی مشرق میں بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ تیسری صدی

ہجری کے شروع میں مدینۂ منصور ویران ہوکر جغد و بوم کا آشیانہ بن گیا۔

الرصافہ کے شمال مشرق میں آبادی بڑھتے بڑھتے دُور دور پھیل گئی۔ اس محلہ کا نام الشماسیہ تھا۔ اس محلہ میں زیادہ تر یہود اور نصاریٰ آباد تھے۔ علیٰ ہذا القیاس الرصافہ کے جنوب میں بھی دریا کے کنارے شرقیہ محلہ کے محاذی المحرم اور میموئیہ بھی محلے آباد ہوگئے۔ جن میں ارکین دولت کے مکانات اور باغات تھے۔

ہارون الرشید اور المامون کے ایام میں زیادہ عالیشان عمارات تعمیر نہیں ہوئیں جسکا سبب غالباً یہ تھا کہ علم معماری اور ہندسی کو اس زمانہ میں چنداں ترقی نہیں ہوئی تھی یا شاید اُن خلفا کو تعمیرات کا چنداں شوق نہ تھا۔ اس زمانہ کی عمارتوں میں سے قصر الرشید۔ قصر الامین۔ قصور برامکہ۔ قصر الحسینی۔ کے نام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں مگر ان مکانات کی سجاوٹ، بناوٹ یا بڑائی کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ تیسری چوتھی صدی کے مورخوں اور سیاحوں نے جو بغداد کے حالات لکھے ہیں اور اس شہر کی رونق، آبادی، تموّل اور محاسن کو مفصل طور پر بیان کیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ اس شہر کو کمال عروج پچھلے خلفائے عباسی کے عہد میں ہوا ہے۔ اصطخری جسکی تاریخ میں ۳۴۰ ہجری تک کے حالات لکھے گئے ہیں بغداد کی نسبت یوں لکھتا ہے:۔ "تفترش قصور الخلافۃ وبساتینہا من بغداد الی نہرین الفرسخین علی جدار واحد حتی تتصل من نہر الی شط الدجلۃ حتی تتصل الیہا بدار الخلافۃ مرتفعًا علی دجلۃ الی الشماسیۃ نحو خمسۃ امیال وتحاذی الشماسیۃ فی جانب الغربی الحربیۃ، فیمتد نازلا الی آخر الکرخ"۔ پچھلے خلفاء خصوصًا المعتصم باللہ، المعتضد، المکتفی کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ انکے زمانہ میں آل بویہ اور سلاجقہ اور اتراک نے سلطنت کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور خلفاء کو کٹھ پتلی بناکر برائے نام تخت پر بٹھا رکھا تھا۔ اور یہ حضرات بیٹھے بیٹھے عمارات اور باغات بناتے رہتے تھے اور اُنکو آراستہ و پیراستہ کرنے میں کروڑوں روپیہ صرف کرتے رہے۔

اس زمانہ کی عمارتوں میں سے تین عمارات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنکی خوشنمائی، آراستگی اور مصارف کو سیاحوں اور مورخوں نے نہایت شرح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ دار الشجرہ کی نسبت صاحب معجم یاقوت یوں لکھتا ہے کہ اس محل کا نام دار الشجر اسلیے رکھا گیا تھا: "الشجرۃ کانت فیہا مصنوعۃ من الذہب والفضۃ فی وسط برکۃ کبیرۃ امام ایوانہا، وبین شجر قصبا تینًا لہا ثمانیۃ غصنا من الذہب والفضۃ۔ ولکل غصن منہا فروعًا کثیرۃ مکللۃ بانواع الجواہر علی شکل الاثمار وعلی اغصانہا انواع الطیور من الذہب والفضۃ۔ اذا ہزالریح علیہا ابانت عن عجائب من الضروب الصفیر والہدیر۔ وفی

جانب الدار من بین البرکۃ تماثیل خمسۃ عشر فارسا علی خمسۃ عشر فرسا وشلہ علے یسار البرکۃ، قد لبسوا انواع الحریر والمدیح، مقلدین بالسیوف وفی ایدیھم المطارد، یتحرکون علی خط واحد. فیظن الناظر الیھم ان کل واحد منھم یقصد صاحبہ" مفصلہ بالا بیان تاریخی ہے مگر الف لیلہ کی کہانی کی طرح معلوم دیتا ہے۔

اعداد کی غیر موجودگی میں اس عظیم الشان شہر کی آبادی کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔ بغداد ایک شہر نہ تھا بلکہ اسکے اندر کئی بڑے بڑے شہر ملے ہوئے تھے۔ ازانجملہ قطولیل۔ حربیہ۔ کرخ۔ شرقیہ دریاے دجلہ کے مغرب میں واقع تھے اور الرصافہ۔ الشماسیہ۔ المخرم۔ میمونیہ دریا کے مشرق میں آباد تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک بذاتِ خود ایک خاصہ شہر تھا۔

مغربی اور مشرقی حصوں کے درمیان میں دو کشتیوں کے پل تھے، ایک باب خراسان کے سامنے تھا دوسرا دریا کے چڑھاؤ کے رخ الشماسیہ اور حربیہ نامے محلوں کو ملاتا تھا۔ اس طور پر ساحت کے لحاظ سے بغداد کا رقبہ ۵۰ یا ۶۰ ہزار مربع جریب سے کم نہ تھا اور عباسی جریب ۳۶۰۰ گز کی ہوتی ہے۔ اس وسیع رقبہ میں سے اگر باغات، بساتین اور نہروں کو نکال بھی دیا جائے تب بھی خالص آبادی کا حصہ بہت زیادہ رہجاتا ہے۔ اسکے ساتھ اگر گنجان آبادی، تنگ گلی کوچوں اور مکانوں کے پاس پاس بنے ہونے کا خیال کیا جائے تو اس بڑے رقبہ کے اندر آبادی کی تعداد لاکھوں ہونی چاہیے۔

چند مورخوں نے بغداد کی آبادی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ صاحب سیر الملوک لکھتا ہے "کان عدد الحمامات فی ذلک الوقت ببغداد ستین الف حمام، واقل ما یکون فی کل حمام خمسۃ نفراً حمامی، قیم، زبّال، وقاد، سقاء، یکون ذلک ثلاثمائۃ الف رجل، وان یکون بازاء کل حمام خمسۃ مساجد یکون ذلک ثلاث مائۃ الف مسجد، وتقدیر ذلک ان اقل ما یکون فی کل مسجد خمسۃ نفراً یکون ذلک الف الف وخمسۃ مائۃ الف انسان"

چوتھی صدی کے شروع اور تیسری صدی کے آخر میں طبری لکھتا ہے "قیل ان عبر الجسر من العامۃ فی ذلک الوقت ۱۰۰۰۰۰ انسان فی زوارق" بہرصورت بغداد کی آبادی چوتھی صدی میں ۱۵ اور ۲۰ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانے میں شاہ قسطنطین ہفتم کی سفارت آئی تھی، اسکی نسبت ابوالفداء[۱] نے

---

[۱] دول اسلام۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۴۳۔

دول اسلام میں جو حالات لکھے ہیں اُن سے بھی اس زمانہ کے تمول اور شان وشکوہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔
ابو الفداء لکھتا ہے: "دار الخلافۃ کے سامنے میدان میں ایک لاکھ بیس ہزار سوار زرہ بکتر باندھے راستہ کے دو رویہ قطاریں باندھے ہوئے تھے۔ ایوانِ خلافت کے اندر سات ہزار غلام اطلس اور دیباج کی وردیاں پہنے ہوئے، زریں کمر، مرصع کلاہ، ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ۳۸ ہزار زربفت کے تھان، ۲۰ ہزار ابریشمی قالین اور ۱۰ ہزار فولادی جوشن نمائش کے لیے لٹکائے گئے تھے۔ دار الشجر کے باغات میں سیکڑوں شیر نر، زراف، آہو، اور شکاری چیتے ریشم کے نیلے پیلے جھولوں میں سجے ہوئے، سونے چاندی کے حمایل اور گھونگرو گلوں میں باندھے، کُتے بلیوں کی طرح بے دھڑک پھر رہے تھے۔ معتز باللہ خود تختِ عاج پر مسند نشین تھا جو سونے چاندی سے منڈھا ہوا تھا۔ تخت کے چاروں طرف دیواروں پر موتی اور جواہرات کے جڑاؤ زیور لٹک رہے تھے۔ جنکی چمک سورج کی روشنی کو ماند کرتی تھی"۔

پانچویں صدی میں بنجمین ٹاڈیلا نے اپنی سیاحت میں بغداد کے تمول اور خوشحالی کی بہت تعریف لکھی ہے۔ یہ تاریخی شہادتیں خلافت کے انحطاط کے زمانہ کی ہیں۔ تاہم اُن سے پایا جاتا ہے کہ خلافۃ عباسی تجمل اور شکوہ میں دربار قیاصرہ اور اکاسرہ سے کہیں بڑھ چڑھکر تھی۔ اس ناز و تنعم کے ساتھ ساتھ خلفائے عباسی علم دوست اور ہنر پرور بھی تھے۔ جسکے سبب سے عباسی دربار علمائے زمانہ اور فضلائے روزگار کا مامن اور مستقر بنگیا تھا۔ جہاں ہر ملک اور نواح کے طلبائے علوم اور جویائے فنون درس اور تعلیم کے لیے آتے اور شہرت اور کمال سے دامن بھر بھر کر لے جاتے۔

مقام جندیشاپور میں نسطورین فرقہ (العباد) آباد تھے جنھوں نے فلسفہ، حکمت اور طب کی کتابیں یونانی زبان سے سریانی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کردی تھیں۔ خلفا کی ہنر پروری کا شہرہ سنکر یہ لوگ بغداد میں آئے۔ المنصور کے زمانہ میں جارجیس بخت یشوع شاہی طبیب مقرر ہوا اور اسکے بعد بخت یشوع عشرہ ۱۴۸ھ ہجری سے ۴۵۰ھ ہجری تک خلفائے عباسی اور آل بویہ کا شاہی طبیب تھا اور اسلامی دنیا میں اسکا مطب درس و تدریس کے لیے چراغِ ہدایت بنا رہا۔

جو قدر و منزلت خلفائے عباسی علم طب اور طبیبوں کی کرتے تھے اسکا اندازہ ان روایات سے

ہوسکتا ہے جو خلفا نے اطبا کے لیے مقرر کیے تھے - ہارون[۵۱] الرشید کے زمانے میں جبرئیل بخت یشوع کے لیے مفصلہ ذیل رواتب مقرر تھے

| | | | |
|---|---|---|---|
| از بیت المالِ عام | ۱۰۰۰۰۰ درہم | از وزرائے ہارون | ۲۴۰۰۰۰۰ درہم |
| خاصہ | ۴۲۰۰۰ " | غلہ | ۸۰۰۰۰ " |
| اصحابِ ہارون | ۴۰۰۰ " | جاگیر | ۴۰۰۰۰۰ " |
| میزان | | ۴۹۰۰۰۰۰ درہم سالانہ | |

اس علمی سرپرستی سے بغداد میں مجلسیں قائم ہوگئیں اور علمی مناظروں اور مباحثوں کا چرچا دن رات رہتا تھا۔ الشماسیہ میں ابن ماسویہ الکبیر اور المنجم کی مجلسوں نے تاریخی عظمت حاصل کی۔ دربار خلافت میں محفلیں برپا ہوتی تھیں جن میں دینی مسائل پر علمی حیثیت سے ہر شخص کو رائے دینے کا موقع دیا جاتا تھا۔ ملک شاہ وزیر نظام الملک نے مدرسہ نظامیہ قائم کیا جس میں نامور علما درس اور تدریس کے لیے مقرر کیے گیے۔ چنانچہ امام غزالیؒ اس مدرسہ کے پروفیسر تھے۔ ابو[۵۲] نصر فارابی پہلے بغداد میں مالی کا کام کرتا تھا۔ بعد میں بغداد کے دارالعلوموں میں خوشہ چینی کرکے مشہور فلسفی بنگیا۔ مستشفیات (ہسپتال) اور دارمجانین (پاگل خانے) بنائے گئے جن میں غربا کا مفت میں علاج کیا جاتا تھا۔ محمد[۵۳] زکریا رازی ان شفا خانوں کے ناظر تھے - ابن بطلان[۵۴]، یحییٰ ابن[۵۵] عیسیٰ ابن جزلہ، اسحق ابن حنین، یحییٰ ابن یوحنا، حنین[۵۶] ابن اسحق، عبد[۵۷] اللہ ابن المقفع بغداد کے مشہور علما گذرے ہیں - غرضکہ ان علما نے لٹریچر اور تمدن اسلام کو جو عرستان کی طرح پہلے بنجر اور سنگلاخ تھا سرسبز اور مالا مال کردیا اور ایساغوجی اور مجسطی کے پریشان اوراق کو جمع کرکے مقدونیہ اور اسکندریہ کے بوسیدہ قالبوں میں نئی روحیں پھونک دیں -

**سقوطِ بغداد۔** عباسی حکومت کو کمال عروج ہارون الرشید اور المامون کے وقت میں ہوا ہے اور بلحاظ علمی ترقیوں اور وسعتِ سلطنت کے اس زمانے کو اسلامی تاریخ کا سُنہری ورق سمجھنا چاہیے۔ پر

۵۱ طبقات الاطبا۔ جلد ۱ صفحہ ۱۴۶ ۔
۵۲ مترجم افلاطون ارسطو، صاحب احیاء العلوم، الموسیقی۔
۵۳ صاحب الحاوی۔ منصوری۔ قانون۔ فصول الطب البقراط۔
۵۴ مصنف المدخل فی الطب۔ تقویم الصحۃ۔ مقالہ فی داء المسہل۔
۵۵ صاحب تقویم الابدان - منہاج البیان -
۵۶ مترجم ایساغوجی جالینس مسمی بہ مدخل فی الطب۔ فصول البقراط - اقلیدس الشہیر-
۵۷ مترجم ایساغوجی بافرفوریس مسمی المدخل فی المنطق و کلیلہ دمنہ-

افسوس کہ یہ زمانہ دیرپا نہ ہوا - عالم شباب میں ہی اس سلطنت کے اندر قبل از وقت انحطاط و زوال کی علامات نمودار ہوگئیں تھیں - ابراہیم بن اغلب اور طاہر بن الحسین نے خود مختار ہوکر مستقل اور علیحدہ سلطنتیں قائم کرلیں -

اسلامی حکومت کی بنیاد اشاعت دین پر رکھی گئی تھی اور اسکا بنیادی پتھر عربی قبائل کی شہامت اور جلادت تھی - بنی امیہ کے زمانے میں تمام قلمرو میں جتنے عمال اور والی اور فوجی افسر تھے سب کے سب عرب تھے - ابو العباس کو خلافت ابو مسلم اور اُسکے خراسانی متعلقین کی مدد سے ملی تھی - جسکے سبب سے عجمی عنصر کا بیج عباسی حکومت کے اندر بو دیا گیا -

ہارون الرشید کے زمانے میں وزراے برامکہ کا خلیفہ کے مزاج پر وہ تسلط تھا کہ سیاہ و سفید جو چاہتے تھے کرتے تھے - یہاں تک کہ رشید نے اپنی بہن میمونہ کی شادی جعفر کے ساتھ کردی تھی - المامون کی ماں مارجل ایرانی جاریہ تھی جسکے سبب سے خلیفہ کو عجمیوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی تھی - اس سے عرب اور عجم فریقوں میں کھلم کھلا مخالفت کی آگ سلگ اُٹھی - تو گویا المامون اور الامین کی باہمی لڑائیاں ان[1] متضاد فریقوں کی زور آزمائیاں تھیں - مامون کے فتحیاب ہونے سے اور اُسکے وزیر ابن سہل کی لگاتار کوششوں سے عجم فریق کا رسوخ دن بدن بڑھتا گیا اور آخر کو اس اختلاف نے شیعہ، سنی، کی صورت اختیار کرلی -

المامون کے بعد المعتصم باللہ کی تخت نشینی نے بدقسمتی سے نفاق کا ایک اور عنصر خلافت کے اندر پیدا کر دیا - معتصم باللہ کی ماں ماریہ، ترک جاریہ تھی - اور چونکہ "الولد کان من حیث الاخلاق اقرب الی امہ مما الی ابیہ" اسکو فطرةً ترکوں کے ساتھ زیادہ موانست تھی اور شاید عرب و عجم کے جھگڑوں سے علیحدہ رہنے کے لیے یا اپنی جان کی حفاظت کی غرض سے معتصم باللہ نے ترکی فوجیں بھرتی کرنا شروع کیں - جو ترک دربار میں آتا اُسکے ساتھ مدارات اور تلطف کے ساتھ سلوک کیا جاتا - رفتہ رفتہ نوازش خسروانہ اور مراحم شاہانہ سے ترکوں کے دماغ ایسے بگڑے کہ وہ راستہ چلتے لوگوں کی پگڑیاں اُتارتے اور شریفوں کی

---

[1] عرب اور عجم عنصروں کے باہمی رشک و حسد نے جو خلافت کو نقصان پہونچایا اسپر ہمیں تاریخی سوانح کے خیال سے افسوس آتا ہے مگر ایرانی عنصر کے دخل سے اسلامی تمدن کو جو فائدہ پہونچا ہے اُس سے کسی مورخ کو انکار نہیں ہو سکتا - ابو العباس کو خلافت ابو مسلم کی شمشیر نے دلائی، ہارون رشید اور مامون کے درباروں کی چمک دمک دنبلے برامکہ اور ابن سہل کے جود و سخا پر منحصر تھی (باقی بر صفحہ آئندہ)

بے عزتیاں کرنے لگے۔ اور دن دہاڑے لوٹ مار کرنے لگے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ معتصم باللہ کی سواری بغداد کے بازاروں میں سے جا رہی تھی، ترکی رسالہ ہمرکاب تھا، کہ ایک بوڑھا عرب سامنے سے گذرا۔ ترک نے شمشیر اٹھائی۔ بوڑھے نے معتصم باللہ کی طرف لپکا رکر کہا " لاجزاک عن الجوار خیرا، جاورتنا وجئت بھؤلاء العلوج من غلمانک الاتراک فاسکنتھم بیننا، فایتمت صبیاننا وارملت نساءنا وقتلت رجالنا"۔ معتصم باللہ کے دل پر اس بات سے ایسا اثر ہوا کہ اُس نے بغداد سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر سامرا (سُرّمن رأے) آباد کیا اور ترکوں کے وہاں علٰحدہ رہنے کے لیے معسکر بنا دیا۔ اسکے بعد ترکوں نے وہ زور پایا کہ خلفا کی ناک کے بال بنگئے۔ المنتصر کے اغوا پر انھوں نے سامرا سے آکر بغداد کا محاصرہ کیا اور المتوکل کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔

اس واقعہ سے ترکوں کو اپنی قوت کا احساس ہو گیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے بعد جسے چاہتے خلیفہ بنا دیتے جسے چاہتے معزول کر دیتے۔ کہتے ہیں کہ جب المعتز باللہ تخت پر بیٹھا تو ہیئت دانوں اور نجومیوں کو بُلا کر پوچھا گیا کہ خلیفہ کی عمر کتنی ہوگی اور کتنے سال حکومت کریگا؟ ایک ظریف نے کہا " مہما ارادالاتراک"۔

**آل بویہ** اس خاندان کا بانی ابوشجاع دیلمی گذرا ہے۔ ابوشجاع کے تین بیٹے تھے عماد الدولہ، رکن الدولہ، معزالدولہ۔ ان میں سے عماد الدولہ کرخ کا والی تھا۔ خلیفہ الراضی کے عہد میں اس نے فارس کے محاصل کا مقطع لیا۔ اسکے بروقت محاصل ادا کرنے پر بادشاہ ایسا خوش ہوا کہ اسکے دوسرے بھائیوں کو خوارزم اور شیراز کا حاکم بنا دیا۔ خلیفہ المستکفی کے عہد میں یہ تینوں بھائی ملکر بغداد گئے۔ خلیفہ نے انکو ترکی مظالم سے نجات دینے والا فرشتہ سمجھکر انکے ساتھ نہایت مہربانی اور تپاک کے ساتھ سلوک کیا اور عماد الدولہ کو امیر الامرا کا خطاب دیکر دربار میں جگہ دی۔ بیچارہ یہ نہ سمجھا کہ بکری بھیڑیے کے منہ میں سے بچکر آخر قصاب کی چھری سے ماری جاتی ہے۔ آل بویہ نے ۳۲۰ھ سے لیکر ۴۳۷ھ ہجری تک حکومت کی۔

معتصم باللہ کی عنایات نے بھوکوں مرتے ترکوں کو پیٹ بھر کھانا دیکر بغداد کا راستہ بتا دیا تھا۔ بخارا اور سمرقند سے ایلیات اور خانات کے غول کے غول ٹوٹ پڑے۔ بغداد کا تمول اور آسودہ حالی

---

بجیاں تک کہ حجۃ الاسلام امام غزالی، طوسی، بوعلی سینا، الشہرستانی، الطبری، الزمخشری، ابن سیبویہ، البیرونی، الرازی، جوہری وغیرہ ایرانی ناموں کا بار اسلام پر ہمیشہ کے لیے بار احسان رہے گا۔ ~~~ تاریخ تمدن اسلام

عراق کی سرزمین کی سرسبزی اور زرخیزی دیکھکر ترکوں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا - نیز وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ خلفاے عباسی کمزور ہیں، اپاہج ہیں، کاٹھ کی پتلی ہیں - ان باتوں کا چرچا بخارا اور سمرقند کے گلی کوچوں میں ہوتا تھا جسکے سبب سے ترکستان بغداد کے لیے طوفان کا مرکز بنگیا اور وہاں سے کئی خونخوار حملہ آور آندھی اور بھونچال کی طرح سے اُٹھے اور بادل کی طرح سے برسے - سلجوق، ہلاکو، چنگیز یکے بعد دیگرے الپیات اور خانات میں سے ٹڈی دَل لے لیکر خراب آباد بغداد پر جا ٹوٹے - اور بقول صاحب الکامل " وینفکون، وینہبون، ویحرقون، ویہدمون، ولا یجیلون وراہم الا الطلال البالیۃ ولم یسبق لہ مثل فی تاریخ الانسان "-

ابھی خلفاے عباسی آل بویہ کے پنجۂ مظالم میں تڑپ ہی رہے تھے کہ انکے اوپر ایک اور بلا

**سلاجقہ** نازل ہوئی - سلجوق بن تکاک قبائل والیات اتراک کو اکٹھا کرکے ایران و توران میں طوفان نوح کی طرح پھیل گیا اور ۱۵۵ھ ہجری میں سلطان محمد سلجوق نے بغداد کا محاصرہ کیا اور آل بویہ کو نکال کر اُنکی جگہ اپنا تسلط جمالیا -

آل بویہ اور سلجوق سلاطین کے زمانے میں سیاسی اور تمدنی لحاظ سے اسلام نے بہت سی ترقیاں کیں - عضد الدولہ اور نظام الملک کے وزیر ملک شاہ کے زیر سایہ مدرسہ اور دار العلوم قائم ہوے، رباطات اور تکایا بنے، مارستانوں کی بنیادیں ڈالی گئیں -

اس زمانے میں اسلامی دنیا میں تین بڑی ریاستیں تھیں - ایک سلاجقہ کی جو ترکستان سے لیکر بحر شام تک پھیلے ہوے تھے، دوسری فاطمیین مصر کی جو ممالک مغربی پر قابض تھے - تیسری بنی اُمیہ کی جو ہسپانیہ اور جزائر عرب میں حکمراں تھے - خلافت عباسی بیچاری کسی گنتی میں نہ تھی - بغداد کی چار دیواری میں محدود تھی اور وہ بھی شاہان سلاجقہ کے شکنجے میں -

**ہلاکو خاں** چنگیز خاں کی وفات کے بعد اُسکی سلطنت چار حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی - مغربی یعنی طلوی ریاست ہلاکو کے حصے میں آئی تھی - ہلاکو نے ۶۵۶ھ ہجری میں بغداد کا محاصرہ کیا - اس محاصرہ کی نسبت سید احمد ابن السید زینی وحلان یوں بیان کرتا ہے :- مستعصم باللہ فطرتًا ضعیف الرای آدمی تھا - اور اسکا وزیر مؤید الدین العلقمی شیعہ مذہب کا پیرو اور ایک مکار اور چالاک آدمی تھا - مستعصم باللہ کے لڑکے ابوبکر کو شیعوں سے سخت نفرت تھی - اتفاق سے اُن ایام میں بغداد کے اندر شیعہ اور سنیوں

کے مابین لڑائی ہوگئی - ابوبکر نے فوجی سپاہی سُنّیوں کی مدد کے لیے بھیجے - سپاہیوں نے شیعوں کے مکان لوٹ لیے اور اُنکی عورتوں کی بےعزتی کی - یہ حال سُنکر موید الدین کو سخت رنج ہوا مگر اُس نے ضبط کیا اور اپنا غصہ ظاہر نہیں کیا بلکہ خفیہ طور پر ہلاکو خاں کے پاس اپنے بھائی کو بھیجکر اُسے بغداد پر حملہ کرنے کا لالچ دلایا اور ساتھ ہی جنرل دو دار کے ساتھ سازش کرکے بغدادی فوج کا بہت سا حصہ شہر میں سے نکال کر کہیں دور بھجوا دیا - جب ہلاکو حملہ آور ہوا تو ابتداءً چند دن شہر میں محصور رہنے کے بعد مستعصم باللہ وزیر کی رائے پر عمل کرکے علماے دین اور اعیانِ مملکت کو اپنے ساتھ لیکر شہر کے باہر نکلا اور ہلاکو سے صلح کا ملتجی ہوا - بے رحم ہلاکو نے ان سب کو تہ تیغ کرکے شہر کو لوٹنے کا حکم دیدیا - کہتے ہیں کہ چالیس دن تک غارت و تاراج کا بازار گرم رہا اور قتل عام ہوتا رہا جس میں زن و مرد، پیر و جوان علف زار کی طرح کٹ گئے - اور شہر میں خون کی ندیاں بہ گئیں - کچھ مکانات تو گرا دیے گئے اور باقیماندہ جلا دیے گئے "وقیل ان عدة من قتل یزید الف الف وثلاثمین الف انسان" مستعصم باللہ کے قتل کے ساتھ دودمانِ خلافت کا چراغ گُل ہوا - مگر خلافت عباسی کا رشتۂ حیات اگرچہ ہلاکو کی شمشیر نے منقطع کر ڈالا پر بغداد کی مصیبتوں کی رام کہانی ابھی تمام نہیں ہوئی -

**تیمور لنگ** | ۷۹۶ھ ہجری میں تیمور بغداد پر حملہ آور ہوا - سلطان احمد والی بغداد تیمور کے آنے کے پیشتر ہی بھاگ گیا تھا - تیمور نے آکر "قتل خلقاً کثیراً، ثم امر عسکرہ بان یاتیہ کل واحد براسین من اہل بغداد فاتوا بالروس فجمعہا وامر ان یبنی منہا مآذن علی صور المنابر، وعجز لبعض الجنود عن مجی بروس الرجال فقطع روس النساء والاطفال"

**شاہ عباس** | ۱۰۳۲ھ ہجری میں شاہ عباس ایرانی نے کئی دن کے محاصرے کے بعد خون کی ندیاں بہاکر بغداد کو فتح کیا -

اسکے بعد ترکوں نے سلطان مراد کے زمانے میں ۱۰۴۸ھ ہجری میں محاصرہ کرکے اس شہر کو ایرانیوں کے قبضے سے نکالا - جس شہر پر اتنی آفتوں کے بھونچال آئے ہوں، اتنی مصیبتوں کی بجلیاں گری ہوں، جسپر اتنے خونخوار اور جہاں سوز حملہ آوروں کے حملے ہوئے ہوں اُس شہر کی زینت و شان، اُسکی عظمت و بزرگی کس طرح قائم و برقرار رہ سکتی ہے ؟

طاہر کے محاصرہ اور امین اور المامون کی لڑائیوں نے قطربل، حربیہ اور مدینہ منصور کو لگدکوب

کر کے ویران کر ڈالا تھا۔ المعتز کے زمانے میں ترکوں کے آشوب اور شوخی نے الشماسیہ اور الرصافہ کو خوانِ یغما بنا لیا تھا۔ اسکے بعد محمد شاہ سلجوق نے جو کچھ رہا سہا اُس سب کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ آخر ہلاکو نے ان دھجیوں کو آگ لگا کر اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی۔

اب پُرانے بغداد کا کوئی آثار موجود نہیں۔ کاظمیہ کے آس پاس کوسوں تک جابجا خاک کے ڈھیر پائے جاتے ہیں۔ یہاں پہلے قطربل تھا، حربیہ تھا، باب المذہب تھا، قبہ الخضرا تھا۔ زبیدہ خاتون کی دار قرار تھی۔ ہارون الرشید کا قصر الخلد تھا، عضد الدولہ کا مارستان تھا، طبی دار العلوم تھا۔ محفلیں گرم ہوتی تھیں، گلی کوچوں میں جمگھٹے لگتے تھے جن میں چین و فرنگ کا حُسن دھڑنے سے لٹتا تھا۔ اور منوں بکتا تھا۔ باغ لہلہاتے تھے جن میں زلفاء[لہ] اور ذات الخال[ٹہ] جیسی مہوشاں خرام ناز کرتی تھیں۔ آج وہاں کوسوں تک قبرستان ہی قبرستان نظر آتے ہیں۔ گنجی گنجی کھیتیاں اُگ رہی ہیں۔ جن گلِ اندام کے بدن نسیم سحری کے جھونکوں سے میلے ہو جاتے تھے، جن نبرد آزماؤں کے خوف سے زمین کانپتی تھی آج اُنکی مٹی سے کمھار اینٹیں بناتے ہیں! نہ گور ہے نہ نشانِ گور، آج وہاں گنوار گدھے چراتے ہیں۔ دریا کے دوسرے جانب جہاں الشماسیہ اور الرصافہ تھا اور دار شجر، قصر ثریا آسمان سے باتیں کرتے تھے وہاں آج گیدڑ روتے ہیں اور دُھول اُڑتی ہے۔ ع۔ مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

"این[عہ] الملوک الذین بنوا المدائن وحصنوہا بالحیطان این الذین کانوا یعطون الغلبۃ فی مواطن الحرب قد تضعضع بہم الدہر۔ فاصبحوا فی ظلمات القبور الوحا، الوحا، النجا، النجا"۔

بغدادِ جدید۔ شہر بغداد کو اگر مجموعی اور سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو ایک خراب آباد ویران کدہ دکھائی دیتا ہے۔ شہر کے باہر نہ تو چلنے پھرنے کو کوئی سڑک ہے اور نہ تفریح کے لیے کوئی خیابان ہے۔ اُجاڑ بیابان ہے کوسوں تک قبرستان ہی قبرستان دکھائی دیتے ہیں جہاں صدیوں کی لاشیں دبی ہوئی ہیں۔ یہ گویا ایک شہر خموشاں ہے جس میں سلسلے جہان کے مُردے لا کر دفن کر دیئے گئے ہیں۔

شہر کے اندر مکان ٹوٹے پھوٹے ہیں، کچی اینٹوں کے بنے ہوے۔ انکی ساخت میں پتھر لکڑی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ کہیں پہ محراب ایک ٹانگ پہ کھڑی ہے، کہیں مسجد جُھک کر سربسجود ہو رہی ہے۔

---

[لہ] سعید برادر سلیمان بن عبد الملک نے ۱۰ لاکھ درہم میں خریدا تھا۔ عقد الفرید صفحہ ۲۰۳ جلد ۳۔

[ٹہ] ہارون الرشید نے، جمال کا فارس کا خراج اسے لکھ دیا تھا۔ کتاب الاغانی صفحہ ۸۰ جلد ۱۵۔

[عہ] خطبۂ ابوبکر صدیق۔

بدرو اور موہریوں کا نام نہیں۔ کوڑے کرکٹ کے انبار جابجا لگے ہیں صفائی کا کوئی انتظام نہیں۔ کوئی عمارت ایسی نہیں جسکی خوبصورتی اور عظمت وشان کو ایک بار دیکھکر دوسری دفعہ اسکو دیکھنے کو جی چاہے۔ بازار تنگ ہیں۔ اوپر سے پٹے ہوے ہیں۔ گلیاں پیچ دپیچ ہیں دوکانیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ انھیں بازاروں کے اندر ہر ہفتہ سنیچر کے دن اندر کا اکھاڑا لگتا ہے اور پری رخان بغداد صید کرشمہ و ناز سج دھج کر اور دل لبھانے والے گلابی، دھانی، سُرمئی ہنیلے پیلے اریشمی لباس پہن پہن کر جھومتی جھامتی خرام ناز کرتی ہیں۔ یہ گل اندام خیابان بنی اسرائیل کے کھلے ہوے پھول ہیں جو چڑھتی جوانی کی باد نسیم سے جھومنے لگ گئے ہیں۔ اس گلزار حسن کی بہار میں لباسوں کی یگانگی گلابی رنگ کو خاص طور پر سہانا بناکر دکھاتی ہے۔ گلابی رنگ، گورے گورے بدن، اور لال لال گالوں کے ساتھ ملکر (خدّین کا نہا تفاحتان) اور موزوں ہوکر عجب جوبن دکھاتا ہے اور خون کی ندیاں بہاتا ہے۔ بقول شاعر:۔

احمرت وجنتیک کستک ہذا ام انت صبغتہ بدم القلوب

بازاروں میں جابجا قہوہ خانے ہیں، جہاں بنچوں پر بیٹھے ہوے ترک۔ عرب وعجم، دن بھر حقہ کے دم لگاتے اور قہوے کے فنجان پیتے ہیں۔ کہیں ایک سرو قد آہو خرام، سیاہ لباس پہنے سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے پنگھٹ سے چلی آرہی ہے۔ گو اُسنے "وجہ القمر" اور "جبین ازہر" کو آنچل کے اوٹ میں چھپایا ہے مگر نینوں کی کٹار آنچل کو پھاڑ کر "تاخذ القلوب بطرف کحیل"۔ یہ بنی عباس کے یادگار ہیں جو خلافت عباسی کے غم میں ابھی تک ماتمی لباس پہنے ہیں۔ بغداد انکو زبان حال سے کہتا ہے

وتوبک مثل شعرک مثل بختی سواد فی سواد فی سواد

شہر دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور ان دونوں حصوں کے درمیان کشتیوں کے ڈونگے بنے ہوے ہیں۔ اپنے کنارے والے حصہ میں کہیں کہیں پرانے حمام اور مکان لب دریا پائے جاتے ہیں۔ یہاں سے ٹریم لائن لب دریا کاظمیہ کو جاتی ہے۔ کاظمیہ شہر سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے زیارت کی جگہ اور بلا کشان محبت کے لیے تفرج گاہ ہے۔ کاظمیہ کو جاتے ہوے راستہ

---

لے جب سے اس شہر میں ہمارا دخل ہوا ہے ان خرابیوں کی اصلاح کی تدبیریں عمل میں لائی جارہی ہیں۔

ایک بڑا بھاری قبرستان ہے جسکے درمیان حضرت معروف کرخیؒ کی زیارتگاہ ہے یہ ایک معمولی چھوٹی سی عمارت ہے - معروف کرخیؒ کے مغرب میں چند قدم کے فاصلہ پر زبیدہ زوجۂ ہارون الرشید کا مزار ہے مگر اسکے اوپر کوئی نام یا کتبہ لکھا ہوا موجود نہیں - جنوب کے چند قدم دُور حضرت منصور حلاج کی خوابگاہ ہے - بغداد کا شرقی یعنی دریا کے بائیں کنارے والا حصہ بہت بڑا ہے - اسکا طول شمالاً جنوباً دو میل سے کچھ زیادہ ہوگا اور غرباً شرقاً یعنی لبِ دریا سے باب وسطانی تک دو میل سے کچھ کم ہوگا - متمول لوگوں اور تاجروں کے مکانات دریا کے کنارے کنارے پانچ چھ میل تک نیچے کے رُخ چلے جاتے ہیں -

شہر کے گرد کسی زمانہ میں شہر پناہ اور خندق تھی - خندق ابھی موجود ہے مگر شہر پناہ کا فقط نشان باقی ہے جسکو شہر والوں نے قبرستان بنالیا ہے - آدھے سے زیادہ شہر کا حصہ غیر آباد اور صاف چٹ میدان ہے جہاں بجائے زندوں کے مُردوں کی رہائش ہے - شمال میں قلعہ ارک ہے اور اسکے پاس ہی باب معظم ہے باب معظم اسکا نام اسلیے ہے کہ یہاں سے ۳ میل دُور دریا کے کنارے پر امام ابو حنیفہؒ کی قبر ہے - شہر پناہ کے مشرق میں قبروں سے گھرا ہوا باب وسطانی ہے - یہ دروازہ باب خراسان کی یادگار ہے دروازہ تو گر چکا ہے فقط ایک آدھ محراب کھڑی ہے - علیٰ ہذا القیاس جنوب کی طرف پُرانی دیوار کا چند گز ٹکڑا باقی ہے یہاں کسی زمانے میں باب شرق تھا

حال میں ناظم پاشا والی بغداد نے شہر کے بیچوں بیچ شمالاً جنوباً ایک سیدھی سڑک بنوائی ہے اسکا نام الشارع جدید ہے - اس سڑک کے بنانے میں بہت سے بازار توڑنا اور مکان گرانا پڑے - کسی کی آدھی دیوار گرائی گئی ہے اور کسی کا چوتھا حصہ - جس سے شہر کی ویرانگی اور خستہ حالی عریاں ہوکر راہگیروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہے -

الشارع جدید کے مشرق میں اور شہر کے جنوبی کونے میں حضرت عبدالقادر گیلانیؒ آرام کرتے ہیں - یہ قادریہ فرقے کے بانی اور صوفیہ کے قطب مانے جاتے ہیں -

بغداد کی آبادی دو لاکھ سے زیادہ ہوگی - جس میں یہود و نصاریٰ کا بہت بڑا حصہ ہے باقی ترک، عجم، کرد وغیرہ ہیں -

بدنصیب بغداد!! خدا جانے تونے کس منحوس گھڑی میں جنم لیا تھا - یا خلافت عباسی کی خونریزیاں تھیں یا بچارے یتیموں اور بیواؤں کی آہوں کے شرر تھے جس نے تیرے خانماں میں آگ لگا کر تیری

تیری ہستی کو خاک میں ملا دیا۔
تیری بیکسی اور پریشان حالی پکار پکار کر بتا رہی ہے کہ صدیوں کے مظالم اور بدانتظامیوں نے تیری رونق اور خوبصورتی کو برباد کر ڈالا ہے۔ تو ایک مصیبت زدہ بیوہ ہے جو خلافت عباسی کے ماتم میں ابھی تک نالاں اور پریشان حال ہے۔ تیرے ہر ذرۂ خاک پر لکھا ہے:۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

بھولا ناتھ۔ لفٹننٹ کرنل۔ ای، ایم، ایس۔
(از میسوپوٹیمیا)

# غزل جناب وحشت

ترا اندازِ خود بینی خطا بخش تماشا ہو؟ ترا نازِ خود آرائی روادارِ تمنا ہو؟

تماشا ہو گیا ہوں میں تماشا گاہِ حیرت میں تماشے کو اگر تم بھی چلے آؤ تماشا ہو

سوالِ وصل کرتا ہوں تو وہ حیرت سے کہتے ہیں کہ ایسے امرِ ناممکن کی کیوں تجھکو تمنا ہو

تمہیں اندازہ کر لو اپنے اندازِ تغافل سے نہ پوچھو اُسکے دل کا حال تم جسکی تمنا ہو

وہ چشمِ آشنا کہتی ہے یہ ہرگز نہیں ممکن کہ میں ہوں تجھسے غافل اور تو محوِ تماشا ہو!

تری طرزِ نگہ سے آرزوئے مردہ جی اُٹھے ترے رنگِ حنا سے عشقِ شیریں کار پیدا ہو

دلِ حرماں نصیب ارماں سے وحشت ہو گیا فارغ
کہ جسپر چھا گئی ہو یاس کیا اُسکی تمنا ہو

# موجودہ جنگ پر ایک نفسیاتی نظر

## گسٹولی بان کی معرکۃ الآرا تصنیف

فرانسیسی فلسفی مصنف موسیو لی بان کے نام سے اُردوداں اصحاب بہت کچھ آشنا ہیں - ونیز اُردو کے فاضل اہل قلموں نے جابجا اس مصنف کا ذکر کیا ہے اور حوالہ دیا ہے - اسلیے اس نام سے ازسرنو تعارف کرانا چنداں ضروری نہیں - لی بان کی مشہور کتاب دی کراوڈ (The Crowd) مولوی محمد یونس صاحب فرنگی محل لکھنؤ کے قلم سے ترجمہ ہوکر دارالمصنفین اعظم گڈھ کے دارالاشاعت میں جا چکی اور امید کی جاتی ہے کہ آئندہ فصل بہار تک شایع ہوکر مصنف مذکور کے خیالات سے اردوداں اصحاب کو زیادہ واقفیت کا موقع دیگی - لی بان کی ایک دوسری معرکۃ الآرا تصنیف موجودہ جنگ کے موضوع پر اُنھیں عالمانہ خیالات کو لیے ہوے تھوڑا عرصہ ہوا شایع ہوئی تھی جس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۶ء میں فشر اَنون کے یہاں سے (The psychology of the great war) کے نام سے موسوم ہوکر معرض اشاعت میں آیا مگر ابھی تک ہندوستان میں نہیں ہے -

لی بان کے انوکھے خیالات جس قدر مقبول ہوے اُسکا ثبوت اُسکی کتابوں کی ہردلعزیزی سے ملتا ہے جیسا کہ ہمنے اب تک دیکھا - اس کتاب کا انگریزی ترجمہ جو بہت موٹے ٹائپ میں چھپا ہے برطانیہ عظمیٰ کے اندر دس شلنگ چھ پنس کو ملتا ہے - درانحالیکہ اُسکا حجم پانچ سو صفحے بھی نہیں - ایسی صورت میں کیا امید ہوسکتی ہے کہ ہملوگوں کو اس سے عام طور پر مستفید ہونے کا کوئی موقع ہوگا - یہ خیالات میرے ذہن میں تھے کہ مجھے اسکے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا اور الحمدللہ کہ میں اسکے ترجمہ سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہوگیا ہوں - اور خیال کرتا ہوں کہ اُسکی طباعت میں صرف اتنی ہی دیر ہے کہ ولایت سے شایع کنندگان کی اجازت آجائے اور میں اپنا مجوزہ مقدمہ لکھکر تیار کرلوں -

لی بان نے اپنی اس تصنیف میں جو کچھ لکھا اور ثابت کیا ہے اُسکا اندازہ تھوڑے سے الفاظ میں کہاں تک کرایا جاسکتا ہے - تاہم مقدمہ کتاب جو مصنف کی تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے قارئین الناظر کی

خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس سے وہ نفس موضوع کو بہت کچھ سمجھ لیں گے۔

سطحی نظر کو جو اسبابِ جنگ کے اجرا اور قیام کے دکھائی دیتے ہیں، ٹی یان کے سامنے وہ بالکل ہیچ ہیں اور اُنکے سمجھنے کے لیے وہ اپنے چند اصول بتاتا ہے جو علم النفس کے خاص خاص مسائل پر مبنی ہیں اور کبھی ہٹ نہیں پڑ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھکر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو فلسفۂ تاریخ کا بہت ہی جچا تلا ہوا معیار نکل آئے۔ اس کتاب میں نفسیات کے مسائل تاریخی حقائق پر اس طرح منطبق کرکے دکھائے گئے ہیں کہ رسمی تعلیم و تربیت کے عادی دماغ دنگ ہوکر رہ جاتے ہیں اور سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ انسان کہاں تک دوسروں کی تربیت سے انسان بن سکتا ہے اور از خود انسان بنکر کس درجہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

آگے چلکر مصنف نے دکھایا ہے کہ جنگ کن نفسیاتی اصول پر جاری ہوتی ہے اور اُسکے نفسیاتی عناصر کیا ہیں و نیز یہ کہ جو واقعات فی الحقیقت گذرتے ہیں اور جو ہمیں دکھائی یا سُنائی دیتے ہیں وہ کس حد تک متفاوت ہوتے ہیں۔ جنگ کے پیش آنے اور جاری رہنے میں اختیار و ارادہ کو کہاں تک دخل ہے یا یہ کہ سرتاسر سب جبر ہی کے کرشمے ہیں۔ تاریخ کب اور کیونکر بنتی ہے اور اُسکی تدوین میں صحیح اور غلط کا معیار کیا مقرر کیا جائے۔

غرضکہ ان خیالات کے دیکھنے سے انسان اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ ہم کیا ہیں؟ کچھ نہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اس نگاہ سے تو صاف نظر ہی نہیں آتا اور جو دکھائی بھی دیتا ہے تو حقیقت سے اس قدر بعید کہ سپیدی پر سیاہی کا گمان ہے۔ گویا عالم ایک شعبدہ ہے جسکی حقیقت کچھ اور مظاہر کچھ۔ ٹی یان کہتا ہے کہ اگر اس حقیقت کی تلاش ہے تو میرے اصول کو سمجھو، جانچو اور غور کرو۔

## مقدمہ

میرا مقصد صفحاتِ ذیل میں جنگِ فرنگ کے واقعات کو جانچنا نہیں ہے، بلکہ اُن نفسیاتی مظاہر کو صاف کرنا ہے جو اُسکے قیام اور دوران سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس معرکہ کی قابلِ وثوق حالت بیان کرنا تو اس زمانہ میں ممکن ہی نہیں کیونکہ طرح طرح کے جذبات سے ہم مشتعل ہو چکے ہیں۔ علاوہ بریں وہ نسلیں جو تاریخ مدوّن کرتی ہیں خود اپنی مورخ نہیں ہوا کرتیں، اسلیے کہ انسان کے جذبات سے جو بڑے بڑے تماشے دیکھنے میں

آتے ہیں اُنھیں مرتب ہونے کے لیے واقعات کے بعد ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ تاریخ کے دربار میں زندوں کے لیے کوئی انصاف ہی نہیں اور غیر جانبداری اگر ہے تو فقط مُردوں کے لیے۔ اُن واقعات کی تہ میں جو ہماری آنکھوں کے سامنے آج پیش آرہے ہیں ایک مادّی قوتوں کی دُنیا موجود ہے اور وہی انکے وجود کا باعث ہے؛ کیونکہ ظاہری دُنیا کے مظاہر ایک باطنی دنیا میں مرکوز ہیں جہاں ہمارے محسوسات اور عقائد پیدا ہوکر کمال کو پہونچے اور اب ہم پر حکومت کررہے ہیں۔ اسی عالمِ اسباب میں مجھے اپنی تحقیقات جاری کرنا ہے۔

* * *

اس جنگ نے جس نے اتنی قوموں کو متصادم کردیا ہے ہمارے یورپ کو، جو کیفِ امن میں وجد کررہا تھا، قہرِ رعد بنکر یکایک دہلا دیا۔ گو وہ مجبوراً مسلّح تھا مگر دورانِ جنگِ بلقان کے کارگر سیاسی ٹنگوتوں پر یہ اُمید باندھے بیٹھا تھا کہ ذی اقتدار سر برستانِ امن تھوڑے دنوں تک تو تنازعات دبا ہی لیں گے۔ مگر بہر کیف، امن نہ قائم رہنا تھا نہ رہا، اور ایک ہفتہ بھر کی سیاسی گفت وشنید کے بعد سارے یورپ میں آگ لگی ہوئی تھی۔

اس قدر زبردست اور دل دہلا دینے والے واقعات کسی ایک شخص کی خواہشات پر محمول نہیں ہوسکتے۔ انکا وقوع پذیر ہونا مختلف اسبابِ نہانی پر مبنی ہے جو رفتہ رفتہ مدت سے جمع ہورہے تھے۔ یہاں تک کہ اب اُنکے نتائج دفعتاً نمودار ہوگئے۔

تاریخی واقعات کے اسباب اگر حسابی تسلسل کی تیز رفتار سے بڑھتے ہیں تو اُن کے نتائج تسلسلِ ہندسی کے مختصر قاعدے سے۔

جنگِ فرنگ کے حقیقی وجوہ سمجھنے کے لیے چاہیے کہ ماقبل کے واقعات پر نظر کی جائے اور ان تغیرات کا بھی مطالعہ کیا جائے جو نئے جرمن دماغ میں پیدا ہوے ہیں کیونکہ ہر قوم کا رویّہ، بلکہ اُسکی تاریخ، اُسکی ذہنیت سے مشتق ہے۔

* * *

موجودہ جنگ قوائے نفسانی کی اہم معرکہ آرائی ہے؛ شورہ پشتی کے اغراض ایک دوسرے سے متصادم ہوگئے ہیں؛ اور انفرادی آزادی اجتماعی غلامی کے مقابلے میں، شخصی افتخار اشتراکیت مُلکی

کے مقابل ۔ بین الاقوامی یگانگت اور عہد ناموں کی پاسداری توپ کے مقابلے میں نبرد آزمائی کر رہی ہے۔
"قوت محض" کا علم، جسکی سربلندی کے لیے جرمن کوشاں ہیں، کوئی نئی چیز نہیں، کیونکہ اگلے زمانے میں اسی کا عمل دخل تھا، اور اس کوشش میں کہ اُسکا بدل کیا جائے یورپ کو دو ہزار برسوں تک متواتر جد و جہد کرنا پڑی۔ متذکرۂ بالا المانی نظریہ کی فتح اقوام کو تاریخ ماضی کے سخت ترین ایام مصیبت میں گھسیٹ لے جائیگی، اور اسنے پچھلے عہد سرکشی میں لا کھڑا کر دے گی جبکہ انصاف کی بنا بجائے مطلق محض "قانونِ اقوی" تھا۔

لوگ اُس تاریک زمانے کو بھولنے لگے تھے جبکہ کمزور بے رحمی کے ساتھ کچل دیے جاتے تھے، بیکار بہیمیت کے ساتھ دبا دیے جاتے تھے اور اقوام کے اغراض غصب، قتل و غارت تھے۔ یہ خیال کہ تہذیب نے قدیم زمانے کی بربادانہ رسموں کو کتمِ نیست کو نابود کر دیا ہے ایک خطرناک غلطی تھا۔ کیونکہ نئے وحشیوں کے گروہ، جنکی آبائی خونخواری کو صدیاں بھی زائل نہ کر سکیں، دنیا کو غلام بنانے کا اس لیے خواب دیکھ رہی ہیں تاکہ اُس میں اپنے کارنامے نمایاں کریں۔ جرمنی کے تخیلات اسلیے اور بھی چونکا دینے والے ہیں کہ اُنھوں نے ایک مذہب کی شان پیدا کر لی ہے۔ اعرابِ عہدِ محمدی کی طرح اقوام المانیہ ایک ایسے خواب سے بیدار ہوئی ہیں جس نے اُنھیں جتا دیا ہے کہ وہ ایک ارفع قوم ہیں، جو دنیا کو پہلے فتح کرتے اُسکے بعد دوبارہ آباد کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔

کسی قوم کے خداوند نہ صرف اُس قوم کی غلط فہمیوں کا بلکہ اُسکی مادی ضروریات اور حسد اور تنفرات کا مجسمہ ہیں بلکہ اس کلیہ سے جرمنی کے نئے دیوتا بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ دیوتا اُن غائبانہ قوتوں کی قطار میں آتے ہیں جنکا حصہ تاریخِ عالم میں اس قدر عظیم الشان رہا اور جسکی فتح میں ہزارہا جانیں بیدردی سے ضائع کی گئیں۔ مردم خیز شہر ڈھائے گئے اور زبردست حکومتیں قائم ہو گئیں۔

موجودہ جدال و قتال پرانے زمانے کی مذہبی لڑائیوں سے متعدد حیثیتوں کے ساتھ مشابہ ہے: اسکی تہ میں بھی اُسی قسم کی غلط فہمیاں پنہاں ہیں اور اس سے بھی اُسی قسم کی نا اتفاقی، قہر اور حیوانیت کی بُو آتی ہے اور جہالت اس سرے سے اُس سرے تک چھائی ہوئی ہے، کیونکہ اگر بادشاہوں اور قوموں کی آرزوؤں پر عقل کا کچھ بھی اقتدار ہوتا تو آج کو یہ جنگ معرضِ وجود ہی میں نہ آتی۔

\+ + +

ان واقعات کا ارتباط بیان کرنے کے اثنا میں جن کو دنیا بھر نے لگاو حسرت و افسوس سے دیکھا ہے

یہ کوشش بالکل فضول سی معلوم ہوتی ہے کہ اُنکے وجوہ کو قرینِ عقل دلائل سے وابستہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص جنگ فرنگ کو خالصًا عقل کے معیار پر جانچتا ہے تو اُسکی اصل اور ترقی ایسے ناقابلِ وثوق حالات کا مجموعہ نظر آتی ہے جو کسی بڑے سے بڑے عقیلِ دور اندیش کے شان وگمان میں بھی نہ آتے ہونگے۔

اب وہ کون سے نکات ہیں جن تک ہمیں اس جنگ نے پہونچایا؟ اولًا وہ ہمکو ایک حکمران کا حوالہ دیتی ہے جس نے پچیس برس تک حالتِ امن کو قائم رکھا جیسا کہ اُسکی سلطنت کی خوشحالی کے لیے ضروری بھی تھا؛ مگر دفعتًا دیکھا گیا کہ وہ اپنی خواہشات کے بالکل خلاف ایک ہولناک نزاع میں گھسیٹا جا رہا ہے؛ ثانیًا ہمنے دیکھا کہ ایک قوم جو روز بروز اپنی تجارت اور صنعت کو ترقی دے رہی تھی اور جسکا منشأ یہ ہرگز نہ تھا کہ ایسی خوں ریزی میں کود پڑے جو اُسے ایک مدت تک کے لیے تباہی میں مبتلا کردے، بطیبِ خاطر اس ہولناک جنگ میں شریک ہوگئی اور بالآخر ہمنے بڑے بڑے تمدن پرستوں کو دیکھا جو شہروں اور صدیوں کے کتب خانوں اور نفیس ترین نمونوں کو جلا رہے ہیں؛ مسمار کر رہے ہیں۔ کون سا پیشین گوئی کرنے والا ہوگا جو ایسے متناقض امور کے پیش آنے کا کبھی خیال بھی کر سکا ہو؟ وہ بعید از وہم مظاہر جو اس جنگ میں رونما ہوے اُن میں جرمن قوم کے غائبانہ اشتعالِ غیظ کو بھی بامعانِ نظر دیکھنا چاہیے جس سے ذی شان اہل قلم بھی اپنے کو مستثنٰی نہ کرسکے، کیونکہ دماغی مرض کا زہر پھیل کر ہر خاص وعام میں اسدرجہ سرایت کر گیا ہے کہ جمیع حرکات ایک ورطہ جنون میں حل ہوکر رہ گئے۔ فرانسیسی رُخ کو لیجیے۔ وہاں بھی عجیب تبدیلیاں پیش آئیں اور وہ بھی اس عنوان سے کہ کبھی وہم وخطرے میں بھی نہ آئی ہوں: ایک نفاست پرست، خود رلے اور سبکی قوم کو دیکھیے اور اُسکا بدلکر ایک ذی ارادہ اور جفاکش گروہ بنجانا دیکھیے، جو مہینوں کے لیے خاصی نفس کُشی کرکے زمین اور خندقوں کی بے پناہ صعوبتوں کو اپنے جسم پر بے پروائی سے برداشت کر رہی ہے، اور اُسکے سر پر قضائے ناگہانی ہر آن کھیل رہی ہے! اور بالآخر تاریخ یقینًا اُن عجائبات میں چھوٹے سے بلجیم کی قربانی بھی درج کرے گی جبکے آتش زدہ شہروں، اور مقتول عورتوں اور بچوں کی لاشوں کے مناظر نے اُسکے قدموں کو اپنی عزت کی حفاظت سے ذرا متزلزل نہ کیا۔ دولِ عظمٰی میں سے کسی کو بھی (اور جرمنی کو تو ذرا بھی) ایسا گمان نہ تھا کہ اتنی کمزور قوم اور اس قدر قوی دشمن کے آگے تابِ مقاومت لاسکے گی!۔ ان حیرتناک حادثات کا سلسلہ عقل سے کیا مناسبت رکھے، کیونکہ یہاں تو عقل سے ایک کو بھی سروکار نہ تھا۔ اب

اب فرمایئے کہ ان واقعات کے اسباب تلاش کرنے کوئی کہاں جائے ؟

* * *

وہ ارباب علم، جنکی تحقیقات میں رہبری کرنے والی عقل ہی عقل ہوا کرتی ہے، اس عقیدہ پر مائل ہیں کہ دنیا ہمیشہ عقل ہی کے زیر نگیں رہتی ہے۔ مگر جب مظاہر اسکے اقتدار سے بعید ہو کر ظاہر ہوتے ہیں تو یہ بیچارے جھلا کر رہ جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بے بہرہ ہیں کہ سائنس داں کی تحقیقات اور فلسفی کے دریافت اصول میں عقلیت، جو شمع ہدایت بنائی گئی ہے تو اُسکے ساتھ قوائے موثرہ وغائیانہ و اجتماعیہ بھی موجود ہوتے ہیں، جنھیں عقل سے کوئی سروکار نہیں۔ بلکہ اُن میں سے ہر ایک کی منطق ہی الگ ہے۔ جو اُس عقلی منطق سے بالکل جداگانہ ہے جسپر سائنس کا پورا دارومدار ہے مگر تاریخ کا نہیں۔ منطق کی وہ صورتیں جو عقل سے لگاؤ نہیں رکھاتیں ہنت دنوں تک پردۂ خفا میں رہیں کیونکہ اُنکی کڑیاں بے حسے پن کی آڑ میں ابتک چھپی ہوئی تھیں جنھیں اب بعض اہل علم کے لوگوں نے سمجھنا شروع کیا ہے۔

وقائع نگاروں نے واقعات کو عقلی بنا پر قرار دیکر من مانی باتیں لکھدیں اور اس طرح تاریخ کی ساخت محض فرضی ٹھہری؛ حقیقت سے ایسی بعید شاید ہی کوئی چیز ہو۔

اب یہ خیالات اگرچہ اساسی ہیں، مگر بالکل انوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ پس جب میں نے انھیں اپنی مختلف تصانیف میں ظاہر کیا تو میرا یہ منشا تھا کہ اُنکی وجاہت کو علمی دلائل سے مستحکم بنانے کے واسطے اپنے اصولوں کو انقلاب فرانس کے ایک ایسی قریبی واقعہ پر منطبق کر کے دکھا دوں۔ جن لوگوں کی سرکردگی میں یہ سانحہ گذرا وہ ہمیشہ عقل ہی عقل چلاتے رہے بلکہ یوں کہیے کہ انھوں نے تو عقل کا معبود ہی بنا کر کھڑا کر دیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ تاریخ میں نام کو بھی کوئی ایسا واقعہ نہ نکلے گا جس میں لوگوں کو ان حضرات سے زیادہ عقل سے بیر رہا ہو۔

ملہ ان تینوں قوتوں کا ذکر مصنف نے اصل متن کتاب میں ضروری وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ قوت موثرہ اس قوت کا نام رکھا ہے جسکا خمیر انسان کے کل موروثی جذبات سے ہو۔ اور یہی قوت ہے جو انسان کی خاص روش کا اکیلا عنصر ہے۔ دوسری قوت غائیانہ قوت ہے جو انسان کے دل میں اعتقاد کی سی چیز مسلم الثبوت کلیات کی طرح راسخ کر دیتی ہیں اگرچہ عقلیت سے انھیں کوئی علاقہ نہیں۔ اور قوت اجتماعیہ وہ قوت ہے جو انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اغراض سے تعلق رکھتی ہو۔"

اس بڑے ناٹک میں کھیلنے والوں پر جن غائبانہ قوتوں کا غلبہ رہا اُن کا مصدر عقل تو نہی ہی نہیں جسکی طرف وہ متواتر اشارہ کرتے تھے۔ اب ان قوتوں کی حقیقت پر وثوق حاصل کرنا فقط علوم جدید کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے۔

واقعات جو آجکل رونما ہو رہے ہیں یہ بھی اسی قدر اہم نفسیاتی دقائق پیش کرتے ہیں جیسے کہ زمانۂ انقلاب فرانس سے وابستہ تھے۔ اگر ہمارے بنائے ہوئے اصول سچے ہیں تو انھیں قائم شدہ غلط فہمیوں ہی پر روشنی ڈالنا چاہیے جس میں آجکل مبتلا ہیں بلکہ اُن بہت سی باتوں کے اسباب کو بھی منکشف کر دینا چاہیے جو بظاہر غیر محسوس ہیں اور جن کا سلسلہ اُن مختلف آرا سے چلتا ہے جو نوعیتِ جنگ سے لیکر قتل عام اور نفاست سوزی تک کے واقعات پر ظاہر کی گئیں اور جنکی تائید دنیا بھر کی لعنت و ملامت نے کی۔

* * *

یورپ کی یہ جنگ ایک ایسے نئے عہد کی داغ بیل ڈالتی ہے جس میں ہمارا طریقِ زندگی، ہمارے جذبات اور ہمارے خیالات سب میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہو جائے گا۔ شاید ہم کسی ایسے تاریخی زمانہ تک پہونچ گئے ہیں جو زمانۂ انقلابِ فرانس کے مماثل ہے جبکہ نوع انسان کے نصب العین بدل گئے تھے اور ایک نئے قسم کے اعیان رونما ہوے تھے۔ قومیں ایک ایسے مستقبل کی طرف لپک رہی ہیں جو روشنی کی دھندلی سی شعاع سے منور نہیں ہوا؛ کوئی چیز ہے، جو اُنکے قیاس میں نہیں آئی؛ اُن پر قابو جمائے ہوے ہے؛ سیاسی اور اخلاقی تصورات جنھیں وہ غیر متغیر تسلیم کیے ہوے تھے اب فنا کے آثار دکھا رہے ہیں؛ نظریے اور کلیے یکے بعد دیگرے غائب ہو رہے ہیں اور مستقبل ذرا بھی متغیر نہیں۔ کیونکہ نفسیاتی قوے، جو ہمہ فتنۂ خونریزی میں نہاں ہیں اپنا کام کب کا شروع کر چکے۔

واعظین و مصنفین کی غلط فہمیوں پر عملی کارناموں نے پردہ ڈال دیا اور توپ کی آوازوں نے گونجکر مناظروں کی گرما گرمی کو ٹھنڈا کر کے رکھدیا۔

فرانس بلاشبہ پھر سے جنم لے گا اور یہ حادثہ اسے اب کے بہ نسبت قوی تر بنا دے گا۔ کیونکہ اُسکے بچانے والوں کے جوہرِ شجاعت نے یہ دکھا دیا کہ پہلے جو غدر کا اندیشہ پیدا ہو رہا تھا لا اصل محض تھا۔ اب تو خیر سے ہمارے نوجوانوں کی غیر متزلزل حالت ہماری متعجب آنکھوں کے سامنے، جو خدا جانے کیا کیا دیکھ رہی ہیں، ایک تسکین بخش منظر پیش کرتی ہے۔ یقیناً انھوں نے ایسے شاندار کارنامے صفحۂ تاریخ پر

لکھوا لیے ہیں، جنکی عظمت پر قیاس کرتے ہوے بڑے بڑے مشہور و معروف افسانوی معرکوں کا بھی یقین آجانا بعید نہیں ۔ ہومر کے تیغ آزماؤں کے کارنامے بھلا کیا شے تھے ؟ ان جنگوں کے مقابلہ میں، جن کے جاری ہوتے ہی جہان بھر ایک عالمِ حیرت بن گیا، چارلی میگنی[1] کے حلیفوں کی شہرۂ آفاق نبرد آزمائی اور سورماؤں کی جادوگروں سے لڑائی کیا چیز رہ گئی ۔؟

سوسائٹی کے بالکل دور افتادہ طبقوں کے لوگوں میں خوبیوں کا از خود جو نشو و نما ہوا وہ کسی کے گمان میں بھی نہ تھا ۔ یہ لوگ جو اپنے کھیت پر یا دفتر میں، کارگاہ یا مدرسہ میں ملکہ محل میں مزے سے زندگی بسر کر رہے تھے، دفعتًا اتنی دشوار گذار اور عظیم الشان مہم میں بے طرح گھس پڑے ہیں جسکی نظیر کبھی خواب میں نظر آئی ہو تو شاید!! یقینًا یہ نئی ہستیاں ہیں جنھیں دہشت زدہ فرانس نے اپنے تحفظ کے لیے لا کھڑا کیا ہے ۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنکے قالب میں آبائی روح نئے سرسے آکر جوان ہوئی ہے اور یہ وہ روح ہے جو کبھی کبھی خوابِ ناز میں مصروف ہو جاتی ہے مگر اُسکے لیے کبھی فنا نہیں ہے ۔ شجاعان ٹولبیک (Tolbiac) با وشینے (Bouvines)[2] اور مارنگو (Marengo)[3] کے فرزند بے تکان لڑنے والے لوگ تھے ۔ اُنکا ملک جب اُنھیں پہلی بار للکارتا تھا تو اُنکے شوکت والے باپ دادوں کا خونِ شجاعت اُنکی رگوں میں تلاطم برپا کر دیتا تھا ۔ مہیب معرکوں میں اکثر انھوں نے ایسے دلیرانہ نعرے بلند کیے جنھیں تاریخ لافانی بنا دیا کرتی ہے ۔ "اے مردو، زندہ ہو جاو!!" یہ کہکر ایک مرتبہ ایک آخری سپاہی اپنی خندق سے مجروح و مرحوم ساتھیوں کو مخاطب کر کے چلایا تھا جبکہ اُسے دفعتًا دشمن کی کلدار توپوں نے ٹھنڈا کر دیا!!

یونان نے اُس شخص کے لیے کوئی تاج کیوں نہ تیار کیا اور اُسکی یاد میں گیت کیوں نہ گائے ؟!!!

ایک متبرک مقصد پر جان نثار کرنے والے کی قسمت ہر اُس شخص کے لیے قابلِ رشک ضرور ہے جسکی سمجھ میں سوائے اسکے کچھ نہ آیا ہو کہ محض متنفس کی تنہا اور انفرادی ہستی کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے، کیونکہ زندگی وقفۂ ایام کے لحاظ سے زندگی کہلانے کے لائق نہیں بلکہ اُس کام کی مقدار کے لحاظ سے جینا جینا ہے جتنا کہ زندہ رہکر انجام دیا گیا،

[1] چارلی میگنی آٹھویں صدی میں فرانک کا بادشاہ گذرا ہے جس نے عبد الرحمن اول خلیفۂ اندلس کے زمانے میں اسپین پر لشکر کشی کی تھی جس میں اُسے سخت شکست کھا کر واپس ہونا پڑا۔ معرکے میں اُسکے کئی جاں نثار رفیق کام آئے ۔ ۱۲

[2] فرانس میں لیلی کے قریب ایک قصبہ ہے جہاں فرانسیسیوں نے ۱۲۱۴ء میں شاندار فتح حاصل کی تھی ۔ ۱۲

[3] اٹلی میں ایک قصبہ ہے جہاں ۱۸۰۰ء میں نپولین کو ایک فتح حاصل ہوئی تھی ۔ ۱۲

ہمارے اجداد کی پاک زمین پر قربان ہونے والے، ہمارے مستقبل کے کاریگر، وہ جنھوں نے قسمت کی نمائی پر ایک نیا فرانس بنایا ہے اور ہمارے پیشرو جو اب بھی غیر فانی ہی ہیں یہ سب کے سب اُن خداوندوں کے پہلو نشین ہیں جنھیں قومیں پوجتی ہیں اور جنکے دامن تک وقت کا ہاتھ پہونچ ہی نہیں سکتا۔

محمد احسن، قدوائی

---

# ہمتِ مردانہ

کشمکشہائے جہاں کی جو پریشانی تھی — رنج کی غم کی تفکر کی فراوانی تھی
کثرتِ حزن نے پژمردہ بنا رکھا تھا — فرطِ اندوہ نے افسردہ بنا رکھا تھا
ہر طرف سے تھا اُداسی کا اک عالم دل میں — شمع خاموش کے مانند تھا میں محفل میں
سوچتا تھا کہ سراپا یہ دنیا کیا ہے — جس نے ہر ایک کو مبہوت بنا رکھا ہے
ہے یہاں فرطِ مسرت بھی وفورِ غم بھی — کچھ عجب چیز ہے محشرکدۂ عالم بھی
لطفِ شادی ہے کبھی تلخیِ آلام کبھی — اک طرح رکھتی نہیں گردشِ ایام کبھی

---

وہ بھی اک دَور تھا جب عیش کی تصویر تھا میں — نہ گلہ مندِ دگرگونیِ تقدیر تھا میں
لذتِ عشرتِ اُمید سے مسرور تھا دل — آرزوؤں سے تمناؤں سے معمور تھا دل
میری امیدوں کو مطلق خطرِ یاس نہ تھا — کاہشِ صدمۂ حرماں کا کچھ احساس نہ تھا
یا وہی اب ہوں کہ مجبورِ پریشانی ہوں — جانگدازِ تپشِ آتشِ پنہانی ہوں
رنجِ واماندگیِ دل سے گھٹا جاتا ہوں — جادۂ مقصدِ ہستی سے ہٹا جاتا ہوں
یوں مرا موردِ اندوہ و بلا ہو جانا — نہیں معلوم مقدر میں ہے کیا ہو جانا

---

یوں ہی رفتارِ خیالات تھی یاس آلودہ — اور مستقبلِ پنہاں تھا ہراس آلودہ

کہیں ملتا نہ تھا قسمت کا سہارا مجھکو　　نظر آتا نہ تھا روشن یہ ستارا مجھکو
شش جہت سے تھی مرے واسطے ظلمت پیدا　　کہ یکایک ہوا اک نورِ ہدایت پیدا
دل پکار اُٹھا کہ یہ پست خیالی کیسی　　مائل ادنیٰ کی طرف فطرتِ عالی کیسی
تلخ بخشیٔ زمانہ سے قدح نوشی کیوں　　عالم ہوش میں کیفیتِ بیہوشی کیوں

---

کارفرمائے جہاں ہمتِ مردانہ ہے　　اسی قندیل سے روشن یہ سیہ خانہ ہے
ہر شبِ تار پُر انوار سحر رکھتی ہے　　ہر دعائے دلِ بیمار اثر رکھتی ہے
دردمنت کشِ تاثیرِ دوا ہوتا ہے　　بندہ الشکر کریوں فضلِ خدا ہوتا ہے
سعیٔ صادق سے ہر آئی ہوئی ٹلجاتی ہے　　حسنِ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے
مشکلوں ہی میں ہوا کرتی ہے آسانی بھی　　سازگاری ہے مگر سوختہ سامانی بھی
شاہدِ کام پسِ پردۂ ناکامی ہے　　یہ مثل سچ ہے کہ ہمت کا خدا حامی ہے

ارشد (تھانوی)

---

نازو ادا و شوخیٔ رفتارِ یار نے　　چھینا ہے میرے دل کو انھیں تین چار نے
بیتاب ہو کے خود وہ چلے آئے میرے پاس　　اچھا اثر دکھایا دلِ بے قرار نے
کاندھا سبھی نہ دنیا گوارا ہوا جنھیں　　کیا آئیں گے وہ قبر میں لاشہ اُتار نے
سارے جہاں کو رشکِ گلستاں بنا دیا　　پردہ اُٹھا کے رُخ سے کسی گلعذار نے
بربادیوں کے بعد یہ حاصل ہوا عروج　　پائی جگہ ہوا پہ ہمارے غبار نے
اشجار ہیں نہال تو غنچے ہیں باغ باغ　　کیا آ کے کہہ دیا ہے نسیمِ بہار نے
دو دن بھی ایک حال پہ رنگِ زمانہ کو　　رہنے دیا نہ گردشِ لیل و نہار نے

اخفائے رازِ عشق نہ حافظ سے ہو سکا
بدنام کر دیا دلِ بے اختیار نے

(حافظ) امام الدین، حافظ (رام نگری)

# حدیثِ عشق

سرِ قضا کہ در عشقِ غیب منزوی است مستانہ افگن نقاب زرخسارہ برکشیم

خدائے نیرنگ کار وکرشمہ ساز کا یہ ایک خاص انعام ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو عقل دیکر اُسکے دائرہ کو محدود نہیں کیا بلکہ اُسکی فضا اس قدر بسیط و وسیع قرار دی کہ از آدم تا ایندم برابر پرواز ہوتی رہی مگر طے نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ آج یورپ کے محیر العقل علمی وعملی انکشافات، اربابِ یورپ کی سائنٹیفک ترقیاں، دُنیا کے ادیان وملل کے غیر محصور سلاسل سب کے سب اسی کے نتائج مابعد ہیں۔ لیکن پھر بھی حقائق ودقائق کے کتنے دفائن ہیں اور کتنے ہی فنون ومعارف ہیں جو ابھی تک انسانی دسترس سے باہر ہیں، اور کتنے ہی علوم ہیں جن کی اسوقت تک تدوین نہیں ہوئی۔ اور اگر سب کے سب حضرت انسان کے زیر تسلط آجاتے تو ہمہ دانی کا ادعا کر بیٹھنا کیا بعید تھا۔ اسی کے ساتھ ہی وہ علوم وفنون بھی ہیں جو گو کہ مدون ہو چکے مگر اس طرح زاویۂ خمول میں پڑے ہیں کہ باستثنائے خواص عامۃ الناس اسکے علم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ کیمیا، اخلاق، اور اسی قسم کے کتنے ہی الفاظ ہیں جو بارہا ہماری زبان پر آتے اور آتے رہتے ہیں لیکن ہم اُن سے بالکل ہی بالا بالا گذر جاتے ہیں، حالانکہ یہی ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فن صبابت جسپر آج میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں اسکے مدوِن اہلِ ہنود ہیں اور باوجودیکہ اُردو کے ساتھ اُنکا نہایت قریبی تعلق ہے آج اسکے متعلق اگر کچھ واقفیت چاہو تو تمھیں اسکی کشکول خالی ملے گی۔ صبابت سے مراد وہ قواعد وضوابطِ کلیہ ہیں جن سے حالاتِ عاشقی وکیفیاتِ معشوقی کا بالکل وجوہ علم ہو جائے تاکہ اسی کے تناسب سے خیال آفرینی کی اختراع میں کافی مدد ملے۔

مجنوں کی لیلیٰ کے لیے صحرا نوردی، فرہاد کی شیریں کے لیے کوہ کنی، زلیخا کی یوسف کے لیے جانکاہی، حافظ کی شاخِ نبات کے لیے چلہ کشی، ماں کی اپنے بیٹے کے لیے تڑپ، زن وشو کا میل ملاپ، زمانے کی امارد پرستی، لعبتانِ فرنگ کی حیا پاش وابستگیاں، یہ باہمی تعلقات کیا تھے اور کیا ہیں؟ کیا یہ سب کا سب عشق ہے؟ نہیں۔ محبت ہے؟ نہیں۔ شوق ہے؟ نہیں جب

سب کا جواب نفی میں ہے تو اسکے سوا کیا کہوں کہ یہ عشق بھی ہے محبت بھی اور شوق بھی جسکی تفصیل سطور آئندہ میں آتی ہے۔

کسی چیز کو محدود اور محصور کرنے کے لیے سب سے پیشتر اسکی ضرورت ہے کہ اُسکی کماحقہ تعریف کر دی جائے اسی لیے میں پیشتر انکی تعریفات کرنا ازبس ضروری سمجھتا ہوں :-

**عشق** | حکما و علما اسکی ماہیت اور حقیقت کی تعیین میں متزلزل ہیں۔ صاحب قاموس کہتا ہے کہ عشق ازدیاد و افراطِ محبّت کا نام ہے جسکی وجہ سے قوّتِ حاسّہ اپنے عیوب کے ادراک سے نابینا ہو جاتی ہے۔ لیکن حکیم فیثا غورس کہتا ہے کہ عشق طبیعتِ ثانیہ ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے اور اُسی میں نشو و نما و پرورش پاتے پاتے حرص کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ اور یہی مادّہ جب ترقی کرجاتا ہے تو لجاجت و امتداد، فکر اور طلبِ مقصود کی ایک ایسی حرص پیدا ہوجاتی ہو جسکی وجہ سے انسان قلق و غم کا مورد بنجاتا ہے۔ اس سے خون میں سوزش ہوتی ہے اور یہی سوزش صفراویتؔ سوداویت سے بدل جاتی ہے۔ سوداویت کی افزایش کے ساتھ ہی ساتھ قوت فکریہ میں فساد پیدا ہو کر عقل زائل ہو جاتی ہے اور ایسی ایسی موہوم تمناؤں اور امیدوں کا ہجوم ہوتا ہے کہ آخرکار جنون ہوجاتا ہے۔ اور جب جنون ہوا تو عاشق بسا اوقات اپنی خودکشی کا درپے ہوتا ہے اور کبھی افراطِ غم سے جان دے دیتا ہے اور کبھی معشوق کو دیکھکر اُسے شادی مرگ ہو جاتی ہے۔ ارسطاطالیس کہتا ہے کہ کسی حسین وشکیل کے خیال میں محو و مستغرق ہو جانے کا نام عشق ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کرب، بھینپ اور درد امور کیفیّہ ہیں اسی طرح عشق بھی ایک کیفی امر ہے کہ بجز علائم و آثار کے ماہیت و حقیقت کے بیان سے زبان قلم عاجز ہے۔ یہی وجہ ہو کہ علما و حکما اسکی جامع و مانع تعریف نہ کرسکے۔

**محبت** | جس طرح عشق ایک کیفی امر ہے اسی طرح محبت بھی۔ بعض نفس کے میلان کو ایسی چیز کی طرف جو طبیعت کے بالکل ہی موافق ہو اور اسکے حصول سے لذت و ذوق پیدا ہونے کا نام محبت رکھتے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ سرگردانی دل کا کسی چیز کی طرف دائمی میلان محبت ہے کہ نہ تو لطف سے اس میں کچھ ترقی ہوتی ہے۔ نہ جور و جفا سے اس میں کسی قسم کا نقصان۔ بعض کہتے ہیں کہ راحت و آرام کا فقدان، عزلت گزینی اور نسیان ماسوی المحبوب محبت ہے۔ گر میری رسالے میں محبت

آتشدانِ دل میں ایک شعلۂ جوّالہ ہے جسکی بھڑکتی اور پھیلتی ہوئی لپٹیں سب کے لیے تو آتشِ نمرود اور اپنے ناز و انداز کے پُتلے کے لیے گلزارِ خلیل ہیں۔

**شوق** وصالِ محبوب کے لیے ہجومِ تمنا و غلبۂ آرزو کا نام شوق ہے۔ لیکن محبت و عشق وصالِ مقصو سے زائل نہیں ہوتے مگر شوق کی یہ حالت ہے کہ وصل ہوا اور یہ زائل ہوگیا۔ اور اصل یہ ہے کہ یادِ یار کے وقت دل کے اُمنڈ آنے کا نام شوق ہے۔ آجکل کی نام نہاد عاشقی و بوالہوسی سب اسی کے ماتحت ہیں۔

عشق و محبت کے آثار کچھ ایسے متحد ہوتے ہیں کہ عشق پر محبت اور محبت پر عشق کا شبہہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض حکما عشق و محبت کے اتحاد کا دعویٰ کر بیٹھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ منطقی نظر سے دونوں میں عام و خاص مطلق کی نسبت ہے۔ مجنون و فرہاد کو لیلیٰ و شیریں سے محبت بھی تھی اور عشق بھی۔ علی الاکثر ماں کو اپنے بیٹے، شوہر کو اپنی زوجہ کے ساتھ محبت ہوتی ہے مگر عشق نہیں ہوتا۔

سطور بالا سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ عشق ہو یا محبت یا شوق، یہ چند نسبتیں ہیں جنکا تحقق دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں سے اعظم مرتبہ یعنی جب عشق کی نسبت پائی جائے تو منتسبین میں سے ایک کو عاشق اور دوسرے کو معشوق کہتے ہیں۔ اور فطرتاً یہ نسبت مرد و عورت کے درمیان متحقق ہوتی ہے۔ پس عاشق مرد بھی ہوتا ہے اور عورت بھی۔ اسی طرح معشوق مرد بھی ہوتا ہے اور عورت بھی۔ مدنیت کا اثر کہا جائے یا معاشرت کا زور کہ اہلِ عرب اظہارِ عشق مرد کی طرف سے اور اہلِ ہنود عورت کی طرف سے کرنے لگے اور اہلِ فارس و ترک کی عجب اُفتاد ہے کہ اظہارِ عشق تو مرد کی طرف سے کرتے ہیں مگر اُنکی معشوقیت کا مدار امارد ہیں جو وضع الشئی فی غیر محلہ کی رُو سے یقیناً ظلمِ صریح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ فارس و ترک کا تغزل اگرچہ لطیف ہے مگر اہلِ عرب و اہلِ ہند کے مغازلہ کی سی حلاوت و چاشنی اس میں نہیں پائی جاتی۔

الغرض عشق مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، معشوق عورت ہو یا امرد، اظہارِ عشق جب ہی ہوگا کہ ان میں کوئی خوبی یا حُسن ہو۔ کوئی تو نرگسِ شہلا (آنکھوں) کا متوالا ہے کسی کے لیے تبسم زیرِ لب بجلیوں کا کام دیتا ہے۔

ہنس دیئے آپ تو بجلی تڑپی ۔ بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی

کوئی سادگی پر جان دیتا ہے کسی کے لیے شوخیاں خنجر ہیں اور اخیر میں یہ کہ

من دیتی فی حب الدیار لا هلها ولناس فیما یعشقون مذاهب

لیکن علماے صبابت کے یہاں حسن اسی میں ہے جس میں خوبیِ اندام اور تناسب اعضاء کے ساتھ ساتھ ملاحت اور نمک بھی ہو۔ ملاحت ایک ایسا حسی امر ہے جو حسن کو نکھار دیتا ہے۔ سید شریف جرجانی نے شرح مفتاح میں کلام الٰہی کو چہرۂ معشوق کی ملاحت سے تشبیہ دی لیکن ملاحت کے متعلق اتنا ہی لکھکر قلم روک لیا کہ

در لے حسن در روے تو چیز یست نمید اند کسے کاں را چہ نام ست

متقدمین شعراے عجم نے حسن کا تانا چیزوں میں انحصار کر دیا لیکن شعراے ہنود اور متأخرین شعراے فارس نے قید انحصار کو بالکل اڑا دیا۔ اور زفرق تا بقدم معشوق کی ہر ہر چیز کو پیش نظر رکھکر خیال آفرینی کی۔ میں بھی انھیں کی تقلید کرتے ہوے ہر ہر چیز کو علٰحدہ علٰحدہ تفصیل سپرد قلم کرتا ہوں۔

## جمال

معشوق کے محاسن میں سے جمال محبوب ترین چیز ہے۔ جمال کا اطلاق رنگ، قامت، اور بدن پر کیا جاتا ہے۔

**رنگ** ملیح شور انگیز ہوگا یا صبیح شکر ریز۔ پھر ملیح شور انگیز کی بھی چار اقسام ہیں۔ سیاہ، سبزہ یعنی جس میں سیاہی سپیدی کی طرف مائل ہو۔ گندمی جس میں سفیدی مائل بسیاہی ہو۔ سبزۂ گلگوں یعنی سبز رنگ جس میں سرخی موجیں مار رہی ہو۔ حسن برشتہ، حسن گلو سوز، حسن خاکستری یہ سب سبزے کے مختلف عنوان ہیں۔

صبیح شکر ریز کی بھی چار ہی قسمیں ہیں۔ حسن شکری،

آں شوخ کہ دی در نظرم جلوہ گری داشت پر شور ہمہ شہر ز حسن شکری داشت

مہتابی۔ اسی کا دوسرا نام حسن دہش ہے۔

ماہ ہر چند خوش آیند نیا شد در روز حسن مہتابی دلدار تماشا دارد

حسن طلائی۔ جس میں سفیدی زردی کی طرف مائل ہو۔ حسن آفتابی جس میں سفیدی سرخی کی طرف مائل ہو۔

بسکہ از نورِ جمالِ یارِ ما شرمندہ است پرتو خورشید تاباں سر بزیر افگندہ است

انھیں اقسام ! لا میں حسن ختنی یعنی سفیدی خالص بھی ہے گرچونکہ ملاحت یا نمکینیت نہیں ہوتی اسلیئے پسندیدہ نہیں - اگر ذراسی بھی نمکینی پیدا ہو جائے تو زاہدِ صد سالہ بھی مصلیٰ تہ کر دے -

ختنی است رنگ روئیت حبشی ست رنگِ مویت میان ایں دو کشور تو کجا مقام داری

حبشی سفید نبود ختنی نمک ندارد تو سپیدی و نہایت نمکِ تمام داری

قامت | یعنی قد - اسکی خوبی یہ ہے کہ : بہت لانبا نہ بہت چھوٹا بلکہ درمیانی ہو - اور خرام ناز کے وقت کبک دری کا شبہہ پیدا ہو۔

رعنا قدے چو سرو دلجو در دیدۂ دالهش لبِ جو

شعرائے فارس نے مختلف حیثیات سے قد کو باندھا ہے ۔ رفتار و خرام ، راستی، اعتدال۔

باعتدالِ قدِ او نگاہ کن لے سرو ز حد بر آمدہ تا کے بلند خواہی شد

نقش پائی جو خرام ناز کے وقت زمین پر معلوم ہو - اسلیئے کہ نقش پائی استواری قد کی دلیل ہوتی ہے۔

ندارد نقش پا کا ندر زمین است کہ تصویرِ خرامِ فتنہ این است

ز نقشِ پاے او می گفت افلاک چنیں نقشے نیفتادہ ست بر خاک

بدن | بدن کی بھی مختلف حیثیتیں ہیں - لطافت و نازکی -

نازکی بسکہ ترا در بدن است پیرہن بار دل و دوش و تن است

صفائی و نظافت -

زاں تنِ صاف کہ آئینہ بگردش نرسد بجہاں آمدن خویش بدنی بود غرض

فربہی معتدل - نہ اسقدر موٹا پا ہو کہ اُسکی بدولت انسان زندگی سے تنگ آجائے اور نہ ایسی لاغری ہو کہ ہوا کے جھونکے سے گر پڑنے کا احتمال ہو۔

جمال کے بعد چہرہ ہے - چہرے کا اطلاق فرق سے لیکر گردن تک کی تمام چیزوں پر کرتے ہیں

بال | ان کی تعریف یہ ہے کہ سیاہ و صاف و باریک ہوں - لیکن بالوں کے بھی مختلف اقسام ہیں زلف ، مو ، طرہ ، گیسو - زلف وہ بال ہیں جو اسقدر دراز ہوں کہ معشوق کے قدموں کو چوم کر اپنی خوش قسمتی پر سجدۂ شکر ادا کریں - مو وہ بال جو کمر تک پہونچیں - طرہ وہ جو دوش تک ہوں اور

گیسو وہ جو گردن تک ہوں۔ لیکن شعرائے فارس نے "مُو" کو اور بھی حیثیتوں سے دیکھا ہے۔ کاکُل جو آپس میں ایک دوسرے سے چمٹے اور لپٹے ہوئے ہوں۔

کاکلِ شکیں بر انداز از رخت چوں آفتاب    حیف باشد بر مہ روے تو از کاکل نقاب

مَعقد یعنی جن میں گرہیں پڑی ہوں۔ مُجعّد یعنی گھونگروالے بال۔ بعض علمائے صبابت نے فرق سر کو بھی بالوں کے متعلقات سے شمار کیا ہے لیکن بعض اُسے سر کے متعلق کرتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے اسلیئے کہ فرق اُس باریک اور سفیدی مائل خط کو کہتے ہیں جو آرائش وزیبائش کے وقت سر پر معلوم ہو۔

ز فرقش تا فراخوں در جگر خشک    کشیدہ خطے از کافور در مشک

**سر** | اسکی خوبی یہ ہے کہ کروی شکل کا ہو نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا۔

**جبین** | اسکی تعریف یہ ہے کہ دمک اور چمک کے ساتھ ساتھ بلندی اور صفائی ہو۔ شعرائے فارس نے اسکی بھی مختلف صفات لکھی ہیں۔ کشادگی، عرق، شکن چین۔

کسے کہ تشنہ لبِ نازِ تست میداند    کہ موجِ آبِ حیات است چین پیشانی

**ابرو** | اسکی خوبی یہ ہے کہ باریک و سیاہ بالوں سے بھری ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے

از سوادِ ابروش گیرد فزونی گریہ ام    ابر چوں از قبلہ خیزد سخت باراں می شود

انھیں مذکورہ صفات کے ساتھ اگر کجی، کشادگی، پیوستگی بھی ہو تو کیا کہنا۔

بہ سادہ لوحیِ آں ترکِ تُند خو نازم    کہ نیست چین بجبین وگرہ در ابرویش

**چشم** | ناظرِ معشوقی میں آنکھ محبوب و مشغوف ترین چیز شمار کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ شعرائے فارس نے مدارِ معشوقیت صرف خوبیِ چشم پر کیا ہے۔

در حُسن دو چیزست بلائے دل و دیدہ    چشم سیہ و گوشۂ ابروے کشیدہ

اسکی بھی مختلف اقسام ہیں۔ اور کیوں نہ ہوتے جبکہ انحصارِ معشوقیت اسی پر ٹھہرا تو یگانگت واتحاد کے ساتھ فزومباہات جو لازمہ عشق ہے کہاں باقی رہتا۔ چشمِ شہلا، یعنی نرگسی۔ اسی کو چشم عبہری بھی کہتے ہیں۔

در خراباتِ مغاں گوئی کہ مستاں غافل اند    از شرابِ شوق وجامِ نرگسِ شہلائے تو

چشمِ مخمور یعنی میگوں وخواب آلود۔ یہ اسی کا خاصہ ہے کہ چشم زدن میں ہزارہا فتنے سر اُٹھاتے ہیں۔

چشم مخمر، اسی کو چشم فتاں بھی کہتے ہیں۔ شوخی اور چلبلاہٹ میں تو اپنی نظیر نہیں رکھتی اور اگرچہ چشم مخمور کی طرح میگونیت اس میں بھی ہوتی ہے لیکن خونریزی اور فتنہ انگیزی میں کہاں چشم مخمور اور کہاں چشم مخمر، کہ وہ اسکے سامنے پانی بھرتی ہے۔

چشم اسود، سیاہ بڑی بڑی آنکھیں کہ ہزارہا دلریش عشاق اپنی اپنی جانوں کو اسپر سے صدقہ اُتارتے ہیں۔ مگر اسکی بے مروتی اور بے اعتنائیاں اسکو کبھی خاطر میں نہیں لاتیں۔

کدام دل کہ نشد صید ایں سیہ چشماں نفاں ز مہند و غزالان شیر انداز مش

چشم اصفر، مائل بہ زردی، دیکھنے والوں کو کچھ چھریرے اور لاغر بدن ہی پر زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے

از چشم دلبراں چہ تواں چشم داشتن یعنی ز ناتواں چہ تواں چشم داشتن

چشم پست، پامالی عشاق کے لیے اسی قدر بس ہے کہ صاف اور بے داغ ہو۔ یوں تو چشم مخمر ہو یا چشم مخمور یا اور کوئی قسم، دم زدن میں خود ہی جاں لیوا و جاں بخش اور ہزار محاسن کی ایک حسن ہیں لیکن اُسوقت کا کہنا ہی کیا جبکہ انکی پشت پر خدائے کرشمہ ساز ایک نقطۂ خال بھی دھر دے۔

حسنش یکے ہزار شد از خال پشت چشم بر عین نقطۂ کہ نہادی ہزار شد

**مژگاں** معشوقانہ آنکھ خود ہی کیا کم قاتل ہے لیکن جب مژگاں جیسا صیقل کیا ہوا حربہ ملجائے تو پھر کس میں دم ہے جو چون و چرا کرے۔ اسکی خوبی یہ ہے کہ سیاہ، دراز و سرکج ہوں۔

یکدل ز ناوک نگہ او رہا نشد ایں تیر کج ز ہیچ شکارے خطا نشد

**ناک** اگرچہ اسکا خیال اور محاسن کے ساتھ بہت کم ہوتا ہے مگر بالکل پس انداز ی کے قابل بھی نہیں۔ جب نظر پڑ جاتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ بلند و راست و صاف ہے کہ نہیں۔

**رُخ** تعریف کے قابل وہی ہیں جو پھولے پھولے، گوشت سے بھرے ہوے صاف ڈیے ہوں۔ پروانہ وار نثار ہو جانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے لیکن اگر شگفتگی اور عرق ہو تو سبحان اللہ۔

آئینہ پیش رو نہ و سیر بہشت کن با ایں رُخِ شگفتہ گلستاں چہ می کنی[1]

**لب** خوبی یہ ہے کہ سرخ و باریک، پتلے پتلے، نازک ہوں کہ دیکھتے ہی بیساختہ پیار آ جائے

یاقوت با لبِ تو دم از رنگ می زند ایں خوں گرفتہ بیں کہ چہ بر سنگ می زند (خوب)

---

[1] تعجب ہے کہ آتش رقابت کا کیوں خیال نہ آیا۔

**دہن** | اتنا مختصر اور چھوٹا ہونا چاہیے کہ اد. تو اور حرفِ وفا بھی نکلنے کی گنجایش نہ ہو۔

خلقے ز غمِ دہان تنگت — بر رہگذرِ عدم نشستہ

**دندان** | ننھے چھوٹے باریک صاف صاف سفید ایک دوسرے سے ملے جلے ہوں لیکن اہلِ عرب کی عجب طبیعت ہے کہ وہ اس ملاپ کو پسند نہیں کرتے۔ اگرچہ مُہرِ لب جب ٹوٹتی ہے تو اسکے بھی خرمنِ دل پر بجلیوں کا سا اثر ہوتا ہے۔ خستہ طبیعتوں نے جب اسی کو بھلا نہ سمجھا تو مسّی اور زردی کا نقاب انھیں کیوں پسند آنے لگا۔

**زبان** | معلوم نہیں اہلِ فارس نے اسکی مدامی ست کس بنا پر سکوت کیا۔ برگِ گل یا خارِ گل کہدیتے تو کیا بیجا تھا کہ جہاں گل ہوتے ہیں وہاں خار بھی اور برگ بھی۔ اگر وہ نیش زنی کرتے ہیں تو یہ کچھ نہ کچھ روک تھام کر ہی دیتا ہے۔ مگر اتنا تو ضرور ہے کہ تیکھے تیکھے چٹاخ پٹاخ ہوں معمولی کیفیت وصف سے تو کچھ اہلِ دل اور اہلِ ذوق ہی واقف ہیں وہی کچھ کہیں تو کہیں۔

**ذقن** | تعریف یہ ہے کہ صاف اور متوسط الخلقت ہو۔ چاہِ ذقن کوئی علحدہ چیز نہیں۔ عشاق کے لیے منزلِ مقصود پر پہونچنے میں شبِ فراق کی تاریکی اوہام و خیالات کی اندھیریاں، آتشِ رقابت کا دھواں اگر حائل ہوا تو مشعلِ رُخ پھر بھی ٹھوکریں کھانے نہیں دیتی۔ اور اگر کہیں گر پڑے تو فوراً ہی اُٹھ بھی بیٹھے لیکن یہ ایک ایسا گڑھا ہے جو سی قدر عمیق بھی ہے اور تاریک بھی۔ یہاں پر اگر ٹھوکر کھاکر گرے تو ماہِ رُخ بھی عاشق کی جانبری میں کچھ معاون نہیں ہوتا۔

**گوش** | حُسن یہ ہے کہ نازک و صاف و بے مو ہوں۔

**گردن** | تعریف یہ ہے کہ فربہی اور لاغری درازی اور پستی میں متوسط ہو۔

چہرے کا اطلاق جن جن چیزوں میں کیا جاتا ہے اُنکا ذکر تو ہو چکا۔ لیکن سراپاے معشوق میں ابھی اور ضروری اجزا بھی ہیں جن کا بیان ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اگر معشوق کے تین خیالی حصے کردیے جائیں تو ابھی گردن سے ناف تک اور ناف سے کفِ پا تک دو جزو رہ جاتے ہیں۔ جو اگرچہ جذباتِ عشقیہ کے توجہ کے لیے کچھ ایسے اسباب نہیں مگر عشاق کی نگاہیں پھسلتی ہوئی ان پر بھی پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماے فن صبابت اس سے خاموش نہیں۔

**دوش** | خوبی یہ ہے کہ صاف اور بے مو ہوں۔

**پشت** | خمیدہ نہ ہو، بلکہ سیدھی، صاف اور بے مو ہو۔

بہ پشتِ نازنیں جعدِ معطر بہ لوح سیم چوں سطرِ عنبر

**بغل** | سفید اور پاک و صاف بے مو ہو۔

قدش را گفتہ ام تیغ کشیدہ بغل را دیدہ ام چوں گُل دریدہ

**سینہ** | خوبی یہ ہے کہ صاف شفاف، نرم، بلند و فراخ ہو

سینہ اش دل برو درخوبی زحور در صفا سرچشمۂ آبِ بلور

**پستان** | تعریف یہ ہے کہ سخت و کوچک اور بلند ہوں۔

ہوے نمو دجو پستاں تو شرم کھا کے کہا یہ کیا بلا ہے جو اُٹھتی ہے میرے سینے سے

**شکم** | صاف اور سادہ، نرم اور بیداغ ہو۔

**ناف** | اسکے محاسن میں یہ ہے کہ صاف اور اندر گھسی ہوئی ہو۔

**دست** | یہ بذاتہ ایک علٰحدہ چیز ہے۔ اسکا اطلاق بازو سے لیکر سرانگشت تک کیا جاتا ہے۔ اجزا کی خوبی اسکی خوبی شمار کی جاتی ہے۔ اسکی تعریف یہ ہے کہ گوشت سے بھرے ہوے صاف، سفید اور سخت ہوں

میانِ آستیں بازوے پُرنور چو در فانوس روشن شمع کافور

ساعد یعنی کلائی صاف سادی پُر گوشت ہوا سے دیکھکر اگرچہ عشاق جان نہیں دیتے مگر تڑپ ضرور پیدا ہوجاتی ہے مصرعہ جب سے دیکھی یہ کلائی نہ کل آئی مجھکو۔ پشتِ دست، ناخن، انگشت وہ اشیا گنی جاتی ہیں جو بیداغ نازک نازک ہوں

**کمر** | تعجب ہے کہ علماے صباحت نے اسکے متعلق کیوں خاموشی اختیار کی حالانکہ شعرا نے خیال آفرینیاں کی ہیں باریک ہو نازک ہو، باد صبا کی ایک ہلکی لپٹ سے لچک جائے، رہروان عدم آباد کو راہ دکھائے۔ چتر سُرین اور ساق کی تعریف یہ ہے کہ پُر گوشت صاف بیداغ ہوں۔ لیکن پاؤں کے لیے چھوٹا ہونا بھی شرط ہے۔

**خال** | اگرچہ مناظرِ معشوق سے جدا چیز ہے مگر جب پایا جائے تو ہزار مصیبتوں کی ایک مصیبت ہوجاتا ہے اور تعریف یہ ہے کہ سیاہ اور چمکدار ہو۔ کوئی تخصیص نہیں جہاں ہوگا حسن میں چار چاند لگادے گا۔

خوش است خال بہر جا نند نمیدانم کہ ایں ستارہ کجا خانۂ شرف دارد

(بقیہ آئندہ)

فریاد۔ علوی ککوروی

# سیاسی رہنماؤں کے کارنامے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

یوں تو اسلامی جرائد میں سے شاید ہی کوئی اخبار ایسا ہو جسنے گذشتہ سالوں میں مسلم لیگ کی بے عملی اور اُسکے کارکنوں کی بے توجہی پر نوحہ خوانی نہ کی ہو۔ لیکن جس آزادی و قوت کے ساتھ راجہ غلام حسین مرحوم نے نیوایرا (اب وہ بھی مرحوم کہا جاتا ہے) کے کالموں میں اس اہم ترین قومی انجمن کی خفتہ سامانی اور اُسکے اربابِ حل وعقد کی بے حسی وانجماد کو عالم آشکارا کیا اُسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ نیوایرا کے پہلے ہی مضمون نے قیصر باغ کے پُرشکوہ ایوان کو متزلزل کر دیا۔ اور دُور کے بیٹھنے والوں تک بھی یہ خبر پہونچ گئی کہ "حملہ کیا گیا" مگر ایڈیٹر نیوایرا کے بیباک قلم کو کسی کے جبینِ نخوت پر بل پڑ جانے کی پروانہ تھی۔ وہ برابر اُسی لَے میں لکھتا رہا تا آنکہ مسلم لیگ کے معزز اعزازی معتمد کو یہ اعلان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مسلم لیگ کا قانونِ اساسی فرسودہ ہو گیا ہے اور اُس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور اُنھوں نے تمام قومی اخبارات اور عامۂ مسلمین کو ایک جدید ضابطۂ عمل مرتب کرنے کی دعوت دی۔ بدنصیبی سے انھیں ایام میں راجہ غلام حسین مرحوم نے ایک اتفاقی حادثہ کی وجہ سے انتقال کیا اور اصلاحِ لیگ کی تمام اُمنگیں مرحوم کے ساتھ پیوندِ زمین ہو گئیں۔ تاہم بعض اصحاب نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر قانونِ اساسی کی اصلاح پر توجہ کی اور اُنکے تحریری مشوروں کی بنا پر ایک جدید قانون مرتب کیا گیا۔ لیکن یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں کہ اچھے سے اچھے قانون اگر محض اسلیے بنائے جائیں کہ خوشنما الماریوں کی زینت افزائی ہوتی رہے تو اس سے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اصلاح کوش جماعت کا عام خیال یہ تھا کہ جب تک کارکنانِ لیگ کی شخصیتوں میں تبدیلی نہ کی جائے مسلم لیگ کی اصلاح ناممکن ہے۔ سید وزیر حسن صاحب نے اگرچہ اس اثنا میں اپنا استعفا پیش کر دیا تھا لیکن سب جانتے تھے کہ اس استعفے کا کیا حشر ہوگا۔

وسط نومبر میں جب وزیر ہند کی خدمت میں مسلم لیگ کا ڈیپوٹیشن جانے والا تھا تو اس بارے میں ضابطہ کی تکمیل کے لیے اور نیز شاہ آباد کے دردناک حادثہ پر اظہار رنج والم کرنے کی غرض سے مسلم لیگ کا ایک خاص جلسہ منعقد کیا گیا۔ چونکہ راقم الحروف کے نزدیک ذمہ دار کارکنانِ لیگ نے حادثہ شاہ آباد

کے متعلق اپنے فرض کی ادائی میں ناقابلِ معافی غفلت برتی تھی اسلیے ایک تجویز اس غرض سے پیش کی گئی کہ کارکنانِ لیگ کی غفلت پر اظہار ملامت کیا جائے۔ علم برادرانِ حریت میں سے جو اصحاب اُس جلسہ میں تشریف رکھتے تھے اُنکو اگرچہ کارفرمایانِ مسلم لیگ کی بے حسی و بدعنوانی کا پورا اعتراف تھا اور اُن میں سے اکثر افراد نے اسی موقع پر اس بات کا وعدہ کرلیا تھا کہ آئندہ جلسہ سالانہ کے وقت وہ منتظمین لیگ کو علٰحدہ ہوجانے پر مجبور کریں گے لیکن وہ اس عمل جراحی میں شریک کار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر ہم نے اپنے عزیز ترین احباب کی مصلحت آشامیوں کے علی الرغم اس تجویز کو پیش کردینا ضروری سمجھا۔ تجویز پیش ہونا تھی کہ سید وزیر حسن صاحب آنریری سکرٹری اور منشی اظہر علی صاحب جوائنٹ سکرٹری نے کہ یہی دو عہدہ داران لیگ اُس مجلس میں تشریف رکھتے تھے اپنے اپنے استعفے پیش کردیے۔ لیکن چونکہ مسٹر مانٹیگو کے پاس عین اُسی زمانہ میں لیگ کا ڈیپوٹیشن جانے والا تھا اور احباب کے وعدوں کی تکمیل کا زمانہ بھی کچھ دور نہ تھا اسلیے جب آنریبل سید آل نبی صاحب صدر جلسہ نے مشورہ دیا کہ یہ تحریک واپس لے لی جائے تو خاکسار نے اسے بطیب خاطر منظور کرکے اپنی تحریک واپس لے لی۔

اس موقع پر ایک واقعہ کا تذکرہ ہر چند کہ خلاف مصلحت ہو گر دلچسپی اور سبق آموزی سے خالی نہیں ہوسکتا: ایک تحریک بعض اصحاب نے جو عہدہ داران لیگ کے مخلصین خاص میں ہیں اور جنھوں نے ۱۴- نومبر کو قیصر باغ کے جلسہ میں واقعاتِ شاہ آباد کے متعلق مسٹر مظہر الحق کی روش خاص کی پردہ دری میں نمایاں حصہ لیا تھا اس مضمون کی مرتب کی تھی کہ جن لوگوں نے واقعاتِ شاہ آباد کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی اُنکے طرز عمل پر اظہارِ ملامت کیا جائے۔ مگر یہ اصحاب پسِ پردہ رہکر چاہتے تھے کہ اس تحریک کو کوئی ایسا شخص پیش کرے جو اُنکی جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اتفاق سے اس بارے میں اڈیٹر الناظر کو اُنکی رسلے سے اتفاق تھا لہذا اُنھوں نے اپنی تحریر اُسکے حوالہ کردی۔ لیکن خاکسار نے کارکنانِ لیگ کے متعلق ضروری الفاظ کا اضافہ کرکے جب اُس تحریک کو پیش کیا تو آنریبل سید رضا علی صاحب نے یہ ترمیم تجویز کی کہ کارکنانِ لیگ کے متعلق جو حصہ ہے اُسے حذف کردیا جائے۔ چند ماہ کے بعد ہمیں معتبر ذرائع سے خبر ملی کہ منکدۂ سیاست کے سب سے بڑے بُت نے مسٹر مظہر الحق سے جاکر کہا کہ ملامت کی یہ تحریک مسٹر محمد علی کے دوستوں نے اڈیٹر الناظر سے پیش کرائی تھی۔ باوجودیکہ مسٹر محمد علی کی عزت میرے دل میں بہت زیادہ ہے اور اُنکے رفقاء میں سے اکثر اڈیٹر الناظر کے عزیز ترین دوست تھے لیکن مسٹر مظہر الحق کی اطلاع کے لیے میں اس موقعہ پر اس صریح غلط بیانی کی تردید کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اسکے

بالکل برخلاف درحقیقت جو احباب اس باب میں سخت کوشاں تھے کہ یہ تحریک نہ پیش کی جائے وہ وہی تھے جن پر اسکی ساری ذمہ داری رکھی گئی۔

خیر اس جملہ معترضہ کو چھوڑ کر آگے بڑھیے۔ ۱۵ نومبر ہی کو جب یہ تحریک واپس لے لی گئی تو سید وزیر حسن صاحب کو اسپر اصرار شروع ہوا کہ وہ اپنا استعفا واپس نہ لیں گے۔ اور جب بعض ارکانِ لیگ نے اُنھیں استعفا واپس لینے پر مجبور کیا تو اُنکی خواہش یہ ظاہر ہوئی کہ وہ اس شرط سے استعفا واپس لے سکتے ہیں کہ ایڈیٹر الناظر یا تو معذرت کرے یا لیگ کی رکنیت سے خارج کیا جائے۔ ارکانِ لیگ نے آخری صورت کو تو قبول نہیں کیا البتہ اُن میں سے بعض ایڈیٹر الناظر پر زور دیتے رہے کہ وہ معذرت کرے۔ ان فہمائش کرنے والوں میں سب سے زیادہ آنریبل رضا علی صاحب نے خاکسار کو مرہونِ منت بنایا۔ باقی الحمد للہ کہ اُنکی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ جب کلکتہ میں اجلاسِ لیگ منعقد ہوا تو دیکھا گیا کہ جن لوگوں نے نومبر میں عہدہ دارانِ لیگ کو بیدخل کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا اُنکو ایفائے عہد کا ذرہ برابر خیال نہ تھا۔ اور باوجودیکہ معتبر ذریعہ سے یہ خبر ملی کہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں صاحب نے نواب ذو القدر جنگ صاحب سے سید وزیر حسن صاحب کی جگہ مسلم لیگ کے آنریری سکرٹری بننے کا عہد لے لیا ہے لیکن افسوس ہے کہ عین وقت پر ان نامور لیڈروں کی ہمت نے بھی جواب دے دیا۔

لکھنؤ میں مقیم ہونے کی بدولت دفتر لیگ کی ابتریوں کے متعلق جو خبریں وقتاً فوقتاً پہونچتی رہتی تھیں اُنکی وجہ سے دیگر اراکین مسلم لیگ کے مقابلہ میں ایڈیٹر الناظر کو اصلاحِ لیگ کے مسئلہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی بنا پر جب اطبائے حاذقین کے متعلق یقین ہو گیا کہ وہ اس مریض کی شفا کوشی سے دستکش رہینگے تو اُسنے خود کام کرنا شروع کیا۔ ایک بے مایہ ہستی کو اسکی تو جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ یکہ و تنہا معزز کارکنانِ لیگ کو اپنے عہدوں سے دستکش ہونے پر مجبور بنالے تاہم یہ ممکن العمل نظر آیا کہ خود ان معززین کو دفتر لیگ کی اصلاح پر آمادہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر آنریبل مسٹر محمد علی جناح اور آنریبل سید وزیر حسن صاحب سے گفتگو کرنے کا تہیہ کیا گیا اور دونوں صاحبوں سے وقت ملاقات معین ہوا۔

مسٹر محمد علی جناح اگرچہ لیگ کے عہدہ داروں میں نہیں مگر یہ کوئی راز نہیں کہ موجودہ کارفرمایانِ لیگ کی پارٹی کے وہ سب سے زیادہ لائق۔ سب سے زیادہ آزاد اور بہت ہی با اثر رکن ہیں۔ اور چونکہ اُنکی ہوشمندی، اُنکی معاملہ فہمی، اُنکی اعلیٰ قابلیت، اور اُن کے وسیع سیاسی تجربہ کی بنا پر اس بات کا یقین تھا کہ اگر تفصیل کے ساتھ اُنکو دفتر لیگ کی خرابیوں اور اُسکی بے عملی و بے حسی پر توجہ دلائی جائے گی

تو وہ بہت کچھ اصلاح کر سکیں گے اسلیے اُنکو خاص طور پر منتخب کیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اپنی غیر متوقع مصروفیت کے باعث وقت معینہ پر نہ مل سکے۔ سید صاحب سے جب گفتگو آئی تو اُنھوں نے نہ صرف اسکا وعدہ کیا کہ آئندہ سال وہ اپنا زیادہ وقت مسلم لیگ کے کاموں پر صرف کریں گے بلکہ اُنھوں نے اسپر بھی آمادگی ظاہر کی کہ اگر حاجی موسیٰ خاں صاحب جوائنٹ سکرٹری مسلم لیگ جو علیگڈھ میں قیام رکھنے کی وجہ سے قطعاً لیگ کے کاموں سے تعلق نہیں رکھتے، علٰحدگی پر آمادہ ہو جائیں تو نوجوان اراکین لیگ کی جماعت سے جس کسی کو ہم لوگ تجویز کریں اُسے حاجی صاحب کی جگہ جوائنٹ سکرٹری منتخب کرا کے دفتر لیگ کو بالاسکے تحت میں دینے کو تیار ہیں۔ اور دفتر کی بعض خرابیوں کے متعلق اُنھوں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عام طور پر شکایات سننے میں آتی ہیں وعدہ کیا کہ جدید جوائنٹ سکرٹری صاحب دفتر کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد جب ان نقائص کو محسوس کر کے کچھ اصلاحیں تجویز کرینگے تو اُنکا نفاذ کر دیا جائیگا۔ ساتھ ہی اُسکے اُنھوں نے یہ وعدہ کیا کہ لکھنؤ پہونچکر وہ مجھے اپنے دفتر کی جانچ کا موقع دیں گے تاکہ جو خبریں خارجاً سُنی جاتی ہیں اُنکی تصدیق یا تکذیب میں ذاتی علم کی بنا پر کر سکوں۔

یہ تمام روداد جب پنڈال میں پہونچکر بعض احباب سے بیان کی گئی تو سب سے پہلے خواجہ عبدالمجید صاحب نے حاجی موسیٰ خاں صاحب کی علٰحدگی سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ ارباب علیگڈھ کا تعلق مسلم لیگ سے جاتا رہیگا۔ دوسری مشکل یہ آپڑی کہ لکھنؤ کے نوجوان اراکین لیگ میں سے کوئی صاحب اس ذمہ داری کو اس طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ بہرحال چونکہ عہدہ داران لیگ کی میعاد میں صرف ایک سال رہ گیا تھا اور قطع نظر اسکے کہ لیگ کا قانون اساسی بہت کچھ بدلا جا رہا تھا۔ خود کارفرمایان لیگ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ عامۂ مسلمین اُنکی روش بے عملی سے سخت بیزار ہو گئے ہیں اور ایسی صورت میں کہ اس قسم کے اعزازی عہدوں سے جو عزت و عظمت حاصل ہو سکتی ہے اُس سے بھی یہ اصحاب کافی حد تک بہرہ مند ہو چکے تھے توقع بیجا نہ تھی کہ آئندہ انتخاب کے وقت یہ لوگ خود علٰحدہ ہو جائینگے۔ اسکے علاوہ جن لوگوں نے اس سال اُنکو جبریہ ہٹانے کی جرأت نہیں کی جدید انتخاب کے وقت اُنھیں بھی اپنی رائے کے اظہار میں پوری آزادی حاصل ہو گی، راقم الحروف مسلم لیگ کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوا۔

جدید قانون اساسی میں جن تبدیلیوں کی تحریک ایڈیٹر الناظر نے کی تھی اُن میں سے گو بعض جزوی اصلاحات منظور کر لی گئی تھیں پھر بھی کئی اہم باتیں ایسی رہ گئی تھیں جنکے متعلق اسکی ضرورت سمجھی گئی کہ اراکین کونسل کو توجہ دلائی جائے۔ چنانچہ اسی سبب سے جب اجلاس کلکتہ میں ایک سب کمیٹی مسودہ قانون

پر مزید غور و بحث کے لیے بنائی گئی تو خاکسار بھی اُس کمیٹی کا ایک رکن تجویز کیا گیا - اور لکھنؤ ہوکر اس کمیٹی میں شرکت کا جب موقع ملا تو وہیں سید وزیر حسن صاحب کو لیگ کے حسابات کی جانچ کرانے کا عہد یاد دلایا گیا۔ کہا گیا کہ بعد کو وقت فرصت نکال کر اطلاع دی جائے گی۔ مگر کئی ہفتے یوں ہی گذر گئے۔
بالآخر ایک موقع پر سید صاحب کو پھر توجہ دلائی گئی اور ساتھ ہی یہ بات اُنکے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی کہ کسی قوم کے لیڈروں کی قوت و عظمت اپنی قوم کی نظروں میں خواہ گورنمنٹ اور دیگر اقوام کی نگاہوں میں خود اُس قوم کی قوت و عظمت کے تناسب سے ہوا کرتی ہے۔ اسلیے قومی لیڈروں کو کم سے کم خود اپنی قوت و عظمت کے خیال سے قوم کے نشو و نما اور اُسکے اندر سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اسکے بعد [illegible] محمد یوسف خاں اسسٹنٹ سکرٹری نے اطلاع دی کہ وہ حسابات کی جانچ کرانے کو تیار ہیں۔ اور خاکسار نے کئی ہفتے صرف کرکے ۱۹۱۳ء سے لیکر اپریل ۱۹۱۶ء تک کے حسابات کو بہ غور دیکھا۔
اس جانچ پڑتال نے صاف طور پر یہ امر واضح کردیا کہ سید وزیر حسن صاحب آنریری سکرٹری نے جو چھ سال تک دفتر مسلم لیگ کے ذمہ دار کارکن رہے تھے اپنے فرائض متعلقہ کی اتنی بھی پرواہ نہیں کی جتنی ہمارے غیر ملکی حکام اہل ہند کی حقیقی خواہشات کی عموماً کیا کرتے ہیں۔
یہی نہیں کہ مسٹر یوسف خاں اسسٹنٹ سکرٹری نے جو خفتہ بخت مسلمانوں کی سب سے بڑی مجلس سیاسی کے سر دفتر اور ہمارے آنریبل آنریری سکرٹری صاحب کے منظور نظر تھے دفتر لیگ کے حسابات کو ایک ادنیٰ درجے کے کارخانہ دار سے بھی بُری حالت میں رکھا۔ بلکہ روپیہ کی نامعلوم تعداد مختلف طریقوں سے خود اُنکے شکم عریض کی نذر ہوگئی تھی۔
اس سے بڑھکر جو دردناک انکشاف ان حسابات کے دیکھنے سے ہوا وہ یہ تھا کہ متعدد رقوم خود آنریبل سید وزیر حسن صاحب آنریری سکرٹری کے نام پڑی ہوئی تھیں۔ اسکے علاوہ بعض رقوم ایسی بھی تھیں جنکا کوئی تفصیلی حساب نہیں ملا۔ حالانکہ جس دفتر میں تقریباً چار سو روپیہ ماہوار کا اخراج ہو اُسمیں چھوٹی سی چھوٹی رقموں کا بھی پورا حساب موجود ہونا ضروری تھا۔
جب ۱۹۱۳ء میں مولوی عزیز مرزا صاحب آنریری سکرٹری مسلم لیگ کا انتقال ہوگیا اور اس بدقسمت مجلس کی زمام انصرام مقامی جوائنٹ سکرٹری ہونے کی وجہ سے سید وزیر حسن صاحب کو عارضی طور پر تفویض کی گئی تو آنریبل موصوف نے اُسی سال تعطیل کلاں کے موقع پر ایک دَورہ کیا - اس دَورے میں سب سے پہلے پٹنہ کو آپ کے قدوم میمنت لزوم کے استقبال کی برکت حاصل ہوئی۔ پٹنہ کے بعد یہ شرف کلکتہ کو

نصیب ہوا۔ کلکتہ کے بعد مدراس نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ مدراس سے نکلکر آپ نے مملکت ہندوستان کے صدر دروازہ یعنی دلکش بمبئی کو سرفراز فرمایا اور بمبئی سے سیدھے لکھنؤ وارد ہوگئے۔ زمین کی گردیت کے ثبوت میں طالبعلم کو اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی اور اسلیے شاید کسی کو اس میں تامل نہ ہوگا کہ اس دورہ کی بابت غریب مسلم لیگ کو ۱۵۵۰ کی گراں بہا رقم سے محروم ہوجانا پڑا۔ مسلم لیگ کو اگرچہ ابتدا سے قوم کے صاحبان جاہ وثروت کی مجلس ہونے کا افتخار رہا ہے لیکن بدقسمتی سے اُسکا خزانہ کبھی پُر نہیں رہا۔ اور جس وقت یہ ۱۵۵۰ روپے صرف کیے گئے ہیں اُس وقت تو مسلم لیگ بالکل ہی دیوالیہ ہو رہی تھی۔ چنانچہ اسکے چند ماہ بعد ہی جب آنریبل میاں محمد شفیع صاحب کے زیر صدارت مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا ہے تو مجلس استقبالیہ کے صدر اخی محترم جناب منشی احتشام علی صاحب اور آنریبل سید وزیر حسن صاحب کو مشترکہ طور پر ایک پرونوٹ کے ذریعہ سے بنک سے روپیہ قرض لینا پڑا۔ لیکن ایک پر اُمنگ اور فیشن ایبل سکرٹری کو اسکی کیا پرواہ ہوسکتی تھی۔ چونکہ اس رقم کی کوئی تفصیل حسابات میں نہیں تھی اسلیے نہیں کہا جاسکتا کہ آنریری سکرٹری صاحب نے کس طور پر یہ کثیر رقم صرف فرمائی لیکن بعض دیگر مواقع پر سفر خرچ کی جو تفصیل درج ہے اُس سے واقف ہوجانے کے بعد اس بات کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہوسکتا کہ اتنی بڑی رقم کس طور پر صرف میں دکھائی گئی۔ ناظرین کی آگاہی کے لیے مناسب ہوگا کہ ایک مثال یہاں نمونۃً درج کردی جائے۔ وہو ہذا :-

نومبر ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا ایک مشترکہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ کی شرکت کے لیے ۱۵ ر نومبر کو آنریری سکرٹری صاحب کلکتہ تشریف لے گئے اور ۲۰ ر نومبر کو لکھنؤ واپس پہونچنے کے بعد سفر خرچ کی مد میں ۳۸۸ کی رقم درج حساب ہوئی۔ اسکی تفصیل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ علاوہ ٹکٹ کی قیمت، طعام و قیام کے مصارف اور کرایہ گاڑی وغیرہ کے حسب ذیل رقوم بھی شامل حساب ہیں :-

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۵ ر نومبر | نقد آنریری سکرٹری صاحب | کو لکھنؤ اسٹیشن پر | سہ |
| ۱۶ ر نومبر | " | بمقام کلکتہ | عہ |
| ۱۷ ر نومبر | " | " | مہ |
| " | " | " (بوساطت سید آل نبی صاحب) | عہ |
| ۱۸ ر نومبر | " | " | عہ |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۹ر نومبر | آنریری سکرٹری صاحب کو بمقام کلکتہ | عہ |
| | جملہ | ما عہ |

اسی حساب میں مندرجہ ذیل تفصیلات بھی موجود ہیں :—

| | |
|---|---|
| سگار کا بکس | للعہ |
| اسٹیشن ماسٹر | عہ |
| انعام خانساماں ڈائنگ کار | ۱۲ر |
| " | ۱۲ر |
| دھوبی | للعہ ۸ر |
| انعام ملازمین ہوٹل | عہ |
| حجام | عہ |
| جملہ | للوعہ ۸ر |

آنریبل سید وزیر حسن صاحب، اُنکے احباب کرام اور مسلم لیگ کے تعلیم یافتہ اراکین کونسل کو ان واقعات و حالات پر ندامت و انفعال نہ ہو تو کچھ مقام تعجب نہیں اس لیے کہ تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر ضمیر انسانی ان چھوٹی باتوں کو کبھی قابلِ التفات نہیں سمجھتا، لیکن کم سے کم اس عاجز کو تو ان انکشافات سے کمال درجہ رنج ہوا۔ چنانچہ حسابات کی جانچ ختم کرنے کے بعد ۳۰ مئی سنہ؁ کو ایک عریضہ جناب آنریری سکرٹری صاحب کی خدمت میں رجسٹری کرا کے بھیجا گیا۔ جسکا مضمون قریب قریب حسب ذیل تھا :—

بخدمت جناب آنریبل سید وزیر حسن صاحب آنریری سکرٹری آل انڈیا مُسلم لیگ لکھنؤ

جناب من۔ السلام علیکم۔ میں نے آپ کی اجازت سے فائدہ اُٹھا کر آپ کے دفتر کے حسابات کی جانچ کی اور اگرچہ میرا ارادہ تھا کہ جانچ کرنے کے بعد ایک تفصیلی رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا لیکن ایسی صورت میں کہ نہ صرف آپ کے اسسٹنٹ سکرٹری نے مسلم لیگ کے روپئے کو نہایت بُری طرح تباہ و برباد کیا ہے بلکہ اُن حسابات کے رُو سے خود آپ کا دامن آلودہ نظر آتا ہے میں آپکو رپورٹ بھیجنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ جو انکشافات ہوئے ہیں وہ میرے لیے حد درجہ المناک ہیں اور اس سے پیشتر میرے یا کسی دوسرے رکن مسلم لیگ کے وہم و گمان میں بھی یہ باتیں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن اب سوائے اسکے کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں نظر آتا کہ آپ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ آپ مع اپنے اسسٹنٹ سکرٹری کے فوراً اپنے اپنے

عہدوں سے مستعفی ہو جائیں ورنہ مجبور فرض ہوگا کہ میں ان واقعات کو اخبارات کی وساطت سے عام طور پر مشتہر کردوں۔

خادم قوم

اسحاق علی علوی (رکن آل انڈیا مسلم لیگ)

جس روز یہ عریضہ سید صاحب کو ملا صاحب موصوف اُسی رات کو غریب خانہ پر تشریف لائے مگر میں دفتر سے جا چکا تھا۔ دوسرے دن آپ پھر تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ آپ کا خط مجھے ملا میں ان امور کے متعلق آپ سے کسی قدر مفصل گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ بہتر ہوگا کہ آپ مسلم لیگ کے دفتر چلیں اور وہیں گفتگو ہو تا کہ میں اپنے لفظ لفظ کی تائید آپ کے رجسٹروں سے کرا دوں۔ مگر صاحب موصوف نے اسکے بجائے خواہش کی کہ میں اُنکے عشرتکدہ پر حاضر ہوں اور جب میں نے اسے منظور کر لیا تو دوسرے دن صبح کو سواری بھیجنے کا وعدہ کرکے سید صاحب رخصت ہوئے۔ دوسرے روز سید صاحب کے فرستادہ موٹر پر سوار ہو کر یہ فقیر سید صاحب کے قصر ٹیلر گنج پر حاضر ہوا۔ اتفاق سے مسٹر عبد الوالی جو اُس وقت آنریری سکرٹری مسلم لیگ کے مددگار خصوصی تھے اُسی وقت وہاں پہونچ گئے۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرکے صاحب موصوف رخصت کیے گئے مگر اس اثنا میں کچھ اور صاحب تشریف لے آئے تھے۔ بالآخر وہ بھی رخصت کیے گئے اور کمرہ کے دروازے بند کرا کے صاحب موصوف نے کامل تخلیہ میں گفتگو شروع کی۔ دوران گفتگو میں سید صاحب نے پہلے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ حسابات کے معاملہ میں نہایت درجہ غیر منتظم ہیں اور اپنا ذاتی حساب بھی کبھی مرتب صورت میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ جواب تھا اس اعتراض کا کہ کیوں بعض رقوم کا تفصیلی حساب نہیں رکھا گیا۔ لیکن جب یہ عرض کیا گیا کہ اول تو ایک مجلس قومی کے کارکن کی حیثیت سے اُنکا یہ جواب شافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے خود اس حساب کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر سید صاحب نے کبھی اپنی جیب خاص سے کوئی قلیل رقم بھی لیگ کی ضروریات پر صرف کی ہے تو برابر اُسکی رسید داخل کرکے رقم برآمد کرالی ہے۔ ایسی صورت میں کیا وجہ کہ لیگ کی بعض بڑی بڑی رقوم تک کا حساب نہیں دیا گیا۔ اب سید صاحب نے اظہار خجالت و انفعال شروع کیا اور اس بات کا اعتراف کرکے کہ یہ کل حالات اُنکے لیے نہایت شرمناک ہیں اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ چونکہ اسی سال اُنکے عہدۂ معتمدی کی میعاد سہ سالہ ختم ہوتی ہے لہذا اُس وقت تک اُنھیں سکرٹری رہنے دیا جائے اور دفتر لیگ کو اسی وقت سے میں اپنے تحت میں لے لوں۔ خاکسار نے عرض کیا کہ مجھے

آپ سے کچھ ذاتی عناد یا پرخاش تو ہے نہیں، اور اگر حسابات کی یہ حالت نہ ہوتی تو مجھے اس درخواست کی جرأت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بر انیہم اگر آپ میری تین شرطیں قبول کریں تو آپ کی علٰحدگی پر اصرار نہ کرونگا۔ وہ شرطیں یہ ہیں:۔ (۱) اسسٹنٹ سکرٹری کو فوراً علٰحدہ کیا جائے (۲) آپ قومی اخبارات میں فوراً اعلان کردیں کہ آپ دسمبر میں میعاد گذر جانے کے بعد پھر سکرٹری منتخب ہونا نہیں چاہتے (۳) جو رقوم حساب میں آپ کے نام پڑی ہوئی ہیں وہ واپس کی جائیں۔ سید صاحب نے ان تینوں شرائط کو قبول کیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اسسٹنٹ سکرٹری کا عہدہ قبول کرلوں۔ میں نے عرض کیا کہ میرا مشرب نیز میری ذاتی مصروفیتیں مجھکو اسکی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن جب سید صاحب نے باصرار یہ ظاہر کیا کہ مجھ سے دفتر کی نگرانی نہیں ہو سکتی تو میں نے وعدہ کیا کہ بعد ختم ماہِ صیام میں دفتر کو تا اختتام سال جبکہ جدید عہدہ داروں کا انتخاب ہو سکے گا اپنی نگرانی میں رکھوں گا۔

اسسٹنٹ سکرٹری کے متعلق یہ طے پایا کہ میں ایک رپورٹ سید صاحب کو لکھکر دوں تاکہ وہ اسکی بنا پر انکا استعفا لے سکیں۔ چنانچہ میں نے گھر واپس آکر اپنی نقشی یادداشتوں سے ایک رپورٹ مرتب کرکے سید صاحب کو بھیجدی۔

سید صاحب نے حسب وعدہ اپنی مستقل علٰحدگی کا اعلان اخبارات کے ذریعہ سے شایع کردیا۔ اور اسسٹنٹ سکرٹری صاحب سے استعفا بھی حاصل کرلیا۔ اور آخر جولائی میں جو جلسہ اراکین کونسل کا منعقد ہوا اُس میں یہ استعفا پیش ہو کر منظور ہوا۔ جلسۂ کونسل سے دو روز قبل سید وزیر حسن صاحب نے پھر غریب خانہ کو سرفراز فرمایا۔ غایتِ تشریف آوری یہ ظاہر ہوئی کہ اسسٹنٹ سکرٹری صاحب اپنی دس سالہ خدمات کے صلہ میں بونس (عطیۂ انعامی) کے خواہاں تھے۔ اور سید صاحب اس بارے میں میری اجازت چاہتے تھے۔ مگر میں نے یہ عرض کیا کہ آپ کے اسسٹنٹ سکرٹری نے نہ صرف اس تمام مدت میں اپنے فرائض متعلقہ کی انجام دہی میں سخت غفلت و بے توجہی ظاہر کی ہے بلکہ مسلم لیگ کا کثیر سرمایہ بھی برباد کیا ہے اور خود اُنکا مرتب کردہ حساب صاف طور پر انکو اسیا بددیانت قرار دیتا ہے کہ اگر آپ عدالتی چارہ جوئی کرنا چاہیں تو وہ کسی طرح جیلخانہ جانے سے بچ نہیں سکتے۔ اُنکے خلاف عدالتی کارروائی نہیں کی جاتی، یہ احسان کافی ہے۔ تو سید صاحب قائل ہوے اور فرمانے لگے کہ میں بونس کے لیے سفارش نہ کروں گا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب سید صاحب نے کونسل میں اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کا استعفا پڑھا تو اُنکے لیے بونس کی سفارش کی۔ ممکن تھا کہ میں اسی وقت اس کارروائی کے خلاف صداے احتجاج بلند کرتا لیکن اندیشہ تھا کہ اس غیر متوقع عہدشکنی پر جو ناگواری ہوئی تھی کہیں اس سے

متاثر ہو کر میں اپنے قول کے خلاف تمام واقعات کو بیان نہ کر جاؤں ۔ اسلیے میں نے براہ راست مخالفت سے احتراز کیا اور بعض احباب کو اشارہ کیا ۔ وہ یا تو اُن اشارات کو سمجھے نہیں یا اس سبب سے کہ سکرٹری صاحب نے استعفا کے وجوہ بیان کرنے سے اعراض کیا تھا خلافِ مصلحت سمجھے کہ مخالفت کریں۔ بالآخر ڈاکٹر انصاری صاحب تشریف لائے اور اُنھوں نے شریک بحث ہوتے ہی یہ تجویز کی کہ چھ ماہ کی تنخواہ اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کو دی جائے ۔ اور کونسل نے اسی کو منظور کر لیا ۔

میں نے گھر واپس آکر سید صاحب کو ایک عریضہ اس مضمون کا لکھا کہ میں سمجھوتے کے اصول کو ہمیشہ سے ناپسند کرتا رہا ہوں لیکن مسلم لیگ کی بدنامی کے خیال سے آپکے ساتھ ایک قسم کے سمجھوتے پر آمادہ ہو گیا تھا جسکی وجہ سے جلسہ کونسل میں مجھے خاموشی کی معصیت کا ارتکاب کرنا پڑا ۔ بہرحال چونکہ بونس کا مسئلہ کونسل کے اس جلسہ کے ایجنڈا میں داخل نہیں تھا لہذا آپ اسسٹنٹ سکرٹری کو علیحدہ تو کر سکتے ہیں مگر کوئی وجہ نہیں کہ آپ اُنکو بونس کا روپیہ بغیر ضابطہ کی کارروائی کے ادا کریں۔ ساتھ ہی اُسکے میں نے درخواست کی کہ آیندہ جلسۂ کونسل کے ایجنڈا میں بونس کی تحریک کو داخل کیجیے اور یا تو وہ رپورٹ ارکان کونسل کو پڑھکر سنایئے جو میں نے اسسٹنٹ سکرٹری کے متعلق آپ کو لکھکر دی ہے ۔ یا مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنا بیان کونسل میں پیش کروں۔ اس موقع پر سید صاحب کو میں نے یہ بھی یاد دلایا کہ ابھی تک اُنھوں نے حساب دیکھکر اپنے ذمہ کی رقوم جمع نہیں کی ہیں ۔ اسکے بعد جب سید صاحب پراونشیل کانگرس کے جلسہ میں بمقام رفاہ عام مجھے ملے تو اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے آپ کی تحریک کے بموجب آیندہ جلسۂ کونسل کے ایجنڈا میں بونس کی تحریک کو شریک کر دیا ہے ۔

۱۵ر اگست کو اسسٹنٹ سکرٹری صاحب نے میری موجودگی میں مسٹر عبد الوالی بی اے کو دفتر لیگ کا جائزہ دیا اور بعض ایسی رقوم جنکے متعلق یہ گرفت کی گئی تھی کہ دوبار صرف میں ڈالی گئی ہیں اُن سے واپس لیکر حساب میں درج کی گئیں ۔

آخر اگست میں مسلم لیگ کا اجلاس خاص بمبئی میں منعقد ہونے والا تھا ۔ اور تجاویز اصلاحات پر بحث کرنے کیلیے طے پایا تھا کہ کونسل کا خاص اجلاس جلسہ سے قبل وہیں ہوگا اسی موقع پر یہ بونس کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا۔ بمبئی جانے سے چار روز قبل جب حسب قرارداد میں بمعیت مسٹر عبد الوالی، سید وزیر حسن صاحب کے دولتخانہ پر حاضر ہوا ہوں تو میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آیا وہ میری رپورٹ متعلقہ اسسٹنٹ سکرٹری کونسل میں پیش کر دیں گے یا خود مجھے اپنا بیان پیش کرنے کی حاجت ہوگی ۔ سید صاحب نے

فرمایا کہ آپ نے جو رپورٹ دی تھی وہ تلف ہوگئی ہے لہذا آپ دوسری رپورٹ لکھدیں تاکہ میں اجلاس میں پیش کر دوں - میں نے وعدہ کیا کہ میرے پاس جو مسودہ اُس رپورٹ کا ہے اُسے میں نقل کرا کے اپنے ہمراہ بمبئی میں لیتا آؤں گا اور آپ کو دیدونگا - اُس وقت میں نے اُن سے پھر اُن رقوم کی واپسی کا تقاضا کیا تو سید صاحب نے کہا کہ آپ اُسکا حساب تیار کرادیں -

میں جلسۂ کونسل سے کئی روز قبل بمبئی پہونچ گیا تھا - اور سید صاحب سے صحیح تاریخ، وقت اور مقام جلسہ معلوم کرکے ایک ضرورت سے سورت چلا گیا - وہاں سے عین اُس صبح کو واپس آیا جس روز دوپہر کو کونسل کا جلسہ ہونے والا تھا - اور اپنے جائے قیام سے وقتِ مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے روانہ ہوا - راستہ میں خیال آیا کہ ڈاکخانے سے اپنے خطوط تو لیتا چلوں - دس منٹ کا کام تھا مگر اتفاق سے ڈاکخانہ میں بہت دیر لگی اور جب میں وہاں سے جلسۂ کونسل کے مقام پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ کانگریس کے پروگرام میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے صرف تھوڑی دیر جلسۂ کونسل منعقد رہا اور دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا - ساتھ ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ اسسٹنٹ سکرٹری کے بونس کا مسئلہ پیش ہو کر منظور کرلیا گیا - ناظرین خود اندازہ فرمائیں کہ اس غیر متوقع خبر نے کیا اثر پیدا کیا ہوگا - بہرحال چونکہ جلسۂ خاص دو دن بعد ہونے والا تھا اسلیے تہیہ کیا گیا کہ کونسل کی اس کارروائی کو منسوخ کرانے کی تحریک جلسۂ خاص میں پیش کی جائے - چنانچہ بمبئی کے ایک رکن سے جنکو سٹہ ؁ میں اجلاس بمبئی کے موقعہ پر اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کے ہتھکنڈوں سے پوری واقفیت کا موقع ملا تھا گفتگو آئی تو انھوں نے اس خیال کو بہت پسند کیا اور وعدہ فرمایا کہ وہ نہایت زور کے ساتھ اسکی تائید کرینگے - لیکن ۳۰ اگست کو دفعۃً شدید تپ میں مبتلا ہو جانے کے باعث میں مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں شریک نہ ہوسکا اور آخری اجلاس میں بھی جب قریب اختتام جلسہ حاضری کی نوبت آئی تو ضعف و ماندگی کی وجہ سے مقصد برآری نہ ہوسکی - سید صاحب نے وہیں بمبئی میں چونکہ اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کو بونس کا روپیہ بذریعہ چک ادا کر دیا تھا اسلیے کسی مزید کارروائی کا اب موقع نہ رہا -

آنریبل آنریری سکرٹری صاحب آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے خانگی مگر محبوب مددگار کو جتنے چالتے بونس دلا کر صرف اسی بات کا ثبوت ہم نہیں پہونچایا کہ انکو مفادِ قومی کے مقابلہ میں اشخاص کی نفع رسانی کا زیادہ پاس تھا بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اگر مسٹر یوسف خاں کو یہ رقم نہ دلائی جاتی تو سید صاحب کو اپنے مددگار کی تہیدستی کا خمیازہ ذاتی مالی نقصان کی صورت میں بھی برداشت کرنا پڑتا -

واقعات مذکورۂ بالا کی ذاتی واقفیت کے بعد اب سوائے اسکے کوئی چارہ نہ تھا کہ جلسہ سالانہ کے موقع پر تمام حالات کو اراکین مسلم لیگ کے روبرو ظاہر کر دیا جائے۔ خاکسار ۲۵ ردسمبر کو دہلی پہونچ گیا اور وہاں کونسل مسلم لیگ کے متعدد اراکین سے اس بارے میں گفتگو آئی۔ بعض احباب کا یہ خیال تھا کہ جب سید وزیر حسن صاحب علٰحدہ ہی ہوے جاتے ہیں تو کیوں اب سکوت سے کام نہ لیا جائے۔ بعض نے یہ بھی اندیشہ ظاہر کیا کہ ان واقعات سے جو بدمزگی پیدا ہوگی کہیں اُسکی ذمہ داری مسٹر محمد علی کے متبعین پر عائد ہو۔ لیکن جب احباب کی انفرادی فہمائش بے سود ثابت ہوئی تو کہا گیا کہ اچھا ایک جلسۂ شوریٰ منعقد کرکے طے کر لیا جائے کہ کیا کارروائی مناسب ہوگی۔ چنانچہ ۲۷ ردسمبر کو ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر جمع ہونا قرار پایا۔ اتفاق سے تعیین وقت میں کچھ ایسی غلط فہمی ہوئی کہ سب صاحب وقت واحد پر مجتمع نہ ہوسکے ہر حال جتنے اصحاب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اُنکی خواہشات کا احترام کرکے میں اسکے لیے تیار ہوگیا کہ اگر سید وزیر حسن صاحب اپنے ذمہ کی رقوم واپس کرکے اپنے عہدہ سے علٰحدہ ہو جائیں اور جلسۂ عام میں کوئی تحریک اُنکے شکریہ کی نہ پیش کی جائے تو میں ان واقعات کے متعلق سکوت اختیار کر لوں گا۔ چنانچہ ایک صاحب اس کام پر متعین کیے گئے کہ وہ سید وزیر حسن صاحب سے جاکر گفتگو کریں۔ لیکن دوسرے دن جلسۂ کانگریس میں اُنھوں نے مجھے اطلاع دی کہ سید صاحب اسپر آمادہ نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ میں پوری طرح ہر چیز کا حساب دے سکتا ہوں۔ لہذا ۲۸ ردسمبر کو جب کونسل مسلم لیگ کا پہلا جلسہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوا تو کارروائی شروع ہوتے ہی میں نے جناب صدر سے اسکی اجازت چاہی کہ مجھے ایک بیان پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اجلاس سالانہ کے لیے کثیر التعداد تجاویز پر کونسل کو غور و بحث کرنا تھا اسلیے عذر کیا گیا۔ چونکہ مجھے مسلم لیگ کے بعض سابقہ جلسوں اور نیز کئی دوسری مجلسوں کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اسلیے ان حالات کے متعلق چند تجاویز مرتب کرکے میں نے جناب صدر کی خدمت میں پیش کردیں تاکہ سماعت بیان سے قبل کہیں آخر میں جلسہ برخاست ہوجانے کا عذر نہ کر دیا جائے۔ ۲۹ ردسمبر کو میں پھر صاحب صدر کو توجہ دلائی مگر لب کشائی کی اجازت نہ ملی۔ بالآخر ۳۰ ردسمبر کو نصف شب کے قریب جب تقریباً تمام تجاویز پر بحث ہو چکی اور میں نے باصرار صاحب صدر سے ان تجاویز کو زیر بحث لانے کی درخواست کی تو چار و ناچار اجازت دی گئی اور میں نے نہایت اختصار کے ساتھ واقعات بیان کرکے درخواست کی کہ اگر یہ واقعات غلط ہوں تو سید صاحب ان کی تردید کر دیں۔ لیکن قبل اسکے کہ سید صاحب ایک حرف زبان سے نکالیں طبقۂ اُمرا کے معزز رکن مسٹر خلیق الزماں نے جواب سے دو سال قبل راجہ صاحب

محمود آباد کے مددگار معتمد تھے اور حال ہی میں جوائنٹ سکرٹری منتخب ہوئے ہیں۔ ایک مختصر تقریر فرمائی جسکا ماحصل یہ تھا کہ آنریبل سید وزیر حسن جیسے باثروت شخص کے متعلق باور نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ایسی خفیف رقموں کو اپنے ذاتی صرف میں لانا جائز رکھا ہوگا یہ دوسری بات ہے کہ انکا حساب مرتب و مکمل نہ ہو۔ ادھر مسٹر خلیق الزماں یہ دُر فشانی فرما رہے تھے اور اُدھر مجمع احرار ان باتوں پر مضحکہ اُڑا رہا اور سید وزیر حسن صاحب کی برأۃ پر اپنے طرز عمل سے گویا مُہر لگا رہا تھا۔ آنریبل سید وزیر حسن کو اب زبان ہلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ہاں جب بعض لوگوں کے اصرار سے وہ تقریر کے لیے اُٹھے تو سب سے پہلا جملہ جو اُنکی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ "میری ذات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اُسکا میں کچھ جواب نہیں دینا چاہتا"

---

آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل میں تعلیم یافتہ جماعت کے تقریباً بہترین افراد شامل ہیں اور گو اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ لیگ کی بے عملی نے بہت سے اصحاب کو اُسکی کارروائیوں اور اجلاسوں سے بے التفات بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو اراکین میں سے دہلی کے اس نہایت اہم اجلاس میں بھی جس میں ممالک اسلامیہ، مسئلۂ خلافت اور مقامات مقدسہ کے متعلق تجاویز پیش ہونے والی تھیں پچاس سے زائد اراکین کونسل اور پانچ سو معمولی اراکین میں سے سو اصحاب بھی شریک نہ ہوئے[1]۔ باانہمہ یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ جو جماعت ملک اور قوم کی سیاسی ترقی اور حقوقِ ملکی و قومی کے تحفظ کے خیال سے سال بسال دُور دراز مقامات کا سفر گوارا کرکے مسلم لیگ کی کارروائیوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا کرتی وہ اتنے بڑے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو ایسی سبک سری کے ساتھ نظر انداز کر دیگی۔ اور معزز اراکین طبقۂ احرار جو کانگریس اور لیگ کے چبوتروں پر کھڑے ہو کر نہایت آزادی و دلیری سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کرتے ہیں، خود اپنی انجمن کی بدنظمی و ابتری کے ساتھ ایسی سرد مہری برتیں اور اگرچہ ذہن فوراً اُن اسباب کی طرف منتقل ہو گیا جو اکثر اراکین کونسل کی اس روش کے ذمہ دار اور جنکی تفصیل آگے آئے گی۔ تاہم بعض احرار کی اخلاقی قوتوں اور حق پرستیوں کی طرف سے جو حسنِ ظن میرے دل میں باقی تھا وہ مشل کافور ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ اور مجھے نہایت دلی رنج کے ساتھ اس کا اعلان کرنا پڑا کہ یہ ناچیز ہستی اس معزز گروہ کے دوش بدوش کام کرنے کے لائق نہیں۔ اور تعلیم یافتہ احباب کے اس امتحان کے بعد مجھے ضرورت نہیں کہ اس بارے میں اپنی تجاویز کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش کروں۔ چنانچہ اسکے بعد نہ میں نے ۳۱ راگست کے اجلاس میں شرکت گوارا کی

---

[1] دہلی میں جو جدید اراکین نامزد کئے گئے تھے انکا شمار اس تعداد میں نہیں ہے ۱۲

انتخاب کی کارروائی میں کوئی حصہ لیا اور نہ انشاءاللہ آیندہ اس گروہ کے پہلو بہ پہلو کسی مجلس قومی وملکی میں بیٹھنے کی جسارت کروں گا۔

اسکے بعد بعض اصحاب نے صاحبِ صدر کو توجہ دلائی کہ معاملہ یہیں پر ختم نہ ہونا چاہیے۔اور اُنکے اصرار پر ایک کمیٹی حسابات کی جانچ کے لیے بنائی گئی۔ ان اصحاب نے مجھ سے بھی خواہش کی کہ اس کمیٹی کے لیے اشخاص کے انتخاب میں مدد دوں لیکن سابقہ اور موجودہ تجربات کی بنا پر یہ کارروائی ایک فعل عبث سے زیادہ نہ تھی اس لیے مزید تضیع اوقات گوارا نہ ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کتنے اصحاب اس واقعہ کی خبر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے اگر خود آنریری سکرٹری صاحب مسلم لیگ انکار کرنا چاہیں تو اسکی تائید میں خود اُنکی سابقہ سالانہ رپورٹ کے مطبوعہ اوراق کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے کہ اس سے پیشتر بعض اراکین کونسل کے سپرد یہ خدمت ہوتی رہی ہے کہ وہ حسابات کی جانچ فرمائیں اور انھوں نے الحمدللہ کہ اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کو حسن کارگذاری کی سند تک دینے میں دریغ نہیں کیا۔ حالانکہ اگر وہ کسی ایک سال کے حسابات دیکھنے کی مشقت گوارا کرتے تو اب سے بہت پہلے یہ حالات دریافت ہو جاتے۔

مسلم لیگ کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۹۱۳ء میں آنریری سکرٹری صاحب لکھتے ہیں:۔

صفحہ ۴۔ فقرۂ ۲۔ اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدہ پر ۱۵ اگست تک مسٹر یوسف خاں رہے۔ اسکے بعد اُن اسباب کی بنا پر جنکا ذکر فقرۂ ۱۱ بعد میں آئیگا اُن سے استعفا لے لیا گیا۔

" ۳۔ سال زیر رپورٹ کے وسط میں مولوی اسحاق علی صاحب رکن کونسل مسلم لیگ نے کامل طور پر اور خوب غور سے دفتر کی جانچ کی اور اُنکو معلوم ہوا کہ دفتر کا انتظام بہت بُری حالت میں ہے۔ حسابات اچھی طرح نہیں رکھے گئے۔ فائلوں کے رکھنے کا طریقہ حد درجہ خراب تھا۔ لہذا فوراً از سر نو دفتر کی تنظیم ضروری معلوم ہوئی اور اس بنا پر کارکن کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور جیساکہ اوپر ذکر ہوا ہے اسکے مطابق عمل کیا گیا (یعنی مسٹر یوسف خاں علحدہ کیے گئے)......"

اب ایک نظر اُن بیانات پر ڈالیے جو آنریبل آنریری سکرٹری صاحب نے اپنے دفتر کے متعلق سال ماسبق کی رپورٹ میں شایع کیے تھے:۔

رپورٹ ۱۹۱۲ء صفحہ ۶۔ لیگ کے حسابات اچھی حالت میں رکھے جاتے ہیں اور مقامی اراکین کونسل

وقتاً فوقتاً اُنکا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں منشی اظہر علی بی اے وکیل۔
ڈاکٹر ناظر الدین حسن ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا اور مسٹر علی محمد بی اے ایل ایل بی
وکیل کا خاص طور پر شکر گذار ہوں۔

" صفر۔ مستقل عملہ والوں کا کام قابلِ اطمینان رہا ہے

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ تمام سالوں کے مقابلہ میں مسٹر یوسف خاں کو سب سے زیادہ لیگ کے روپیہ کو برباد کرنے کا موقع اسی سال میں ملا۔ اسوجہ سے کہ دسمبر ۱۹۲۱ء کے جلسہ سالانہ کے حسابات اسی ۱۹۲۲ء میں مرتب ہوے۔ اور گو اُنھوں نے جملہ حسابات متعلقۂ جلسہ سالانہ کو ایسی نامکمل صورت میں رکھا ہے کہ کسی شخص کو صحیح گرفت کا موقع نہیں مل سکتا۔ تاہم اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کی چالاکی بعض مقامات پر اُنکی خواہشات کا ساتھ نہ دے سکی اور بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ ایک مثال ناظرین کی آگاہی کیلیے کافی ہوگی:-

بلغ ۱۷۱ عہ کا ایک بل شیخ واجد حسین جنرل مرچنٹ امین آباد پارک کا اُن اشیا کی بابت ادا کیا گیا ہے جو کرایہ پر نہیں آئیں بلکہ قیمتاً خرید کی گئی تھیں۔ جس میں علاوہ دیگر اشیا کے ایک میز۔ دو لیمپ۔ ایک آئینہ سنگار۔ ایک ریشمی چادر میز۔ ۴ دریاں اور متعدد ظروف مثل کیتلی، کشتی چاے وغیرہ شامل ہیں۔

سالانہ اجلاس میں پانچ سات دنوں کے استعمال کے بعد یا تو ان سب اشیا کو فروخت کرکے روپیہ دفتر لیگ میں جمع ہونا چاہیے تھا یا پھر یہ چیزیں دفتر میں موجود ملنا چاہیے تھیں۔ لیکن نہ تو حسابات میں کہیں ایک پیسہ اُن اشیا کی قیمت کا ملے گا اور نہ یہ اشیا ہی دفتر میں نظر آئیں گی۔

---

پھر وضع احتیاط سے رُکنے لگا ہے دَم — برسوں ہوے ہیں چاک گریباں کیے ہوے

آنریبل سید وزیر حسن کا استعفا قوم کے سامنے چند مہینے سے پیش تھا۔ آنریبل راجہ صاحب محمودآباد مستقل صدر نے بھی کئی مہینے ہوے اپنا استعفا شایع کرا دیا تھا۔ اور عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ لیگ اب عنقریب نیا چولا بدلنے والی ہے۔ دونوں معزز عہدہ داران لیگ نے پانچ برس تک ان اعزازی خدمتوں کو جس طریقے پر انجام دیا تھا اُسکا حال کسی سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ اور اگر مسلم لیگ کے تعلیم یافتہ ارکان میں ایک ذرہ کے برابر بھی حریت و آزادی کی وہ روح ہوتی جو اسلام کی اعلیٰ تعلیم کا طغرۂ امتیاز رہی ہے تو اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ وہ انکے دوبارہ انتخاب کا کبھی

خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے بھی ایک درجہ تنزل کرکے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام کی بتائی ہوئی راہ حریت ہمارے احباب کے لیے ایک ناقابل گذر ہفتخواں تھی تو زمانۂ حال کے مسلمہ اصول جمہوریت واشتراکیت (جنکی بناپر آج ہم اہل ہند حکومت خود اختیاری ـ ہوم رول اور حق انتخاب آئین یا Self determination کا مطالبہ کر رہے ہیں) کے معیار سے ان اصحاب سکرپنج سالہ کارناموں کو جانچا جاتا اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ معیار بھی پیش نظر ہوتا تو فیصلہ وہی ہوتا جسکے لیے عامۃ الناس چشم براہ تھے ـ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حریت وآزادی کے غلغلے بلند کرتے رہتے ہیں اور اپنی دردمندی وہمدردی کے لیے قوم میں خاص طور پر ممتاز ہیں اُنکے دل ودماغ پر مغرب کی سراپا تصنع تہذیب کو ایسا مکمل تسلط حاصل ہوگیا ہے کہ ہر قسم کی حقیقتوں اور صداقتوں کے لیے اُنکے دلوں اور زبانوں پر قفل لگ گئے ہیں ـــ یہی نہیں بلکہ بدقسمتی سے وہ اُن خوبیوں سے بھی محروم ہیں جنھوں نے مغرب کے مادّی تمدن کو اس قدر نظر فریب بنا رکھا ہے ـ

۲۰ دسمبر کی رات کو جو مناظر دیکھے گئے اُنکے بعد مجھے اس میں کوئی شبہہ نہیں رہا تھا کہ یہ دونوں معزز ومقتدر اصحاب پھر منتخب ہو جائیں گے ـ

راجہ صاحب محمود آباد کے روپئے، اور اُنکی وسیع جہاں نوازی نے یوں تو تمام اہل ملک کو اپنا مرہون منت بنا رکھا ہے مگر اُنکی فیاضیوں کی قدر وقیمت کا کبھی کسی کو اندازہ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہونا چاہیے ـ اسلیے کہ آم کھانے والوں کو گٹھلیاں شمار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ـ لیکن جیسا کہ تجربات نے ثابت کر دیا ہے اہم معاملات قومی کے تصفیوں کا جب کبھی نازک وقت آیا تو طبقۂ احرار کی رائیں ہمیشہ ترازو کے اُسی پلہ میں جاگریں جو راجہ صاحب کے حصہ میں آنے والا تھا ـ چنانچہ اس موقع پر جو غیر متوقع واقعات رونما ہوے اُنکا سبب بھی راجہ صاحب کی فیاضی ہی میں پوشیدہ تھا ـ

ایک زمانہ وہ تھا کہ مسٹر محمد علی اس بات کے لیے شکوہ سنج ہوے تھے کہ جناب راجہ صاحب محمود آباد اور جناب سید وزیر حسن صاحب اُنکے مراسلات کا جواب تک نہیں دیتے ہیں ـ یہ ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء کے واقعات ہیں ـ ۱۹۱۸ء میں جہاں یورپ کی کایا پلٹ ہوگئی وہاں دُنیا کے ہر حصہ میں کم وبیش انقلابات واقع ہوے ـ چنانچہ راوی معتبر کا بیان ہے کہ دسمبر ۱۹۱۸ء کے پہلے ہفتہ میں جناب راجہ صاحب محمود آباد کے مصالح اسکے مقتضی ہوے کہ ایک سابق سیکرٹری کی وساطت سے مسٹر محمد علی کی خدمت میں پانچ ہزار روپیہ

کا قدرانہ پیش کریں - یہاں اسکے بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ یہ روپیہ کس ذریعہ اور کن اغراض سے بھیجا گیا - بہر حال روپیہ گیا اور مسٹر محمد علی نے بدقسمتی سے اُسکو قبول کر لیا - جب ابتداءً اس واقعہ کی خبر پہونچی ہے تو قطعاً خیال اس طرف رجوع نہیں ہوا کہ جناب راجہ صاحب کے پیش نظر کیا مقصد عالی ہے - بلکہ اس ہدیہ کے قبول کیے جانے پر بھی مجھے اعتراض نہ تھا - لیکن میں شکر گذار ہوں مولانا حسرت کا کہ انھوں نے یہ فرمایا کہ مسٹر محمد علی کو یہ روپیہ ہرگز نہ لینا چاہیے تھا - مجھے اس غلطی پر جلد متنبہ کر دیا - اور جس وقت طبقۂ احرار کی وہ روش میں نے دیکھی جو اوپر بیان ہوئی ہے تو فوراً ہی ذہن اُس بڑی شین کی طرف منتقل ہو گیا جسنے اندر ہی اندر دلوں پر اپنا تصرف کر لیا تھا -

بعض اصحاب کا یہ بھی خیال ہے کہ آنریبل سید وزیر حسن صاحب چونکہ عنقریب جوڈیشیل کمشنری اودھ کے ممتاز عہدہ پر فائز ہونے والے ہیں اسلیے بہت سے نوجوانوں کو اپنے تعلقات اُن سے ہموار کرنے کی ضرورت تھی - ممکن ہے کہ اس میں بھی کچھ اصلیت ہو - باقی نقدرا اینسیہ گذاشتن کار خرد منداں نیست - جو پیش نہیں آیا اور ممکن ہے کہ پیش نہ آئے اُس سے قطع نظر کیجیے - لیکن جو وقوع پذیر ہو چکا وہ آپ کے سامنے ہے اور اُسی پر اعتماد کرنا چاہیے -

واقعاتِ حاضرہ کی بنا پر مجھے دو صاحبوں کے ساتھ خاص طور پر ہمدردی ہے - ایک تو نواب ذو القدر جنگ صاحب سے کہ اُنکو دو دفعہ طبقۂ احرار کی بدولت خواہ مخواہ کی مایوسی و بدنامی اُٹھانا پڑی - خدا کرے کہ وہ آیندہ ان اصحاب کے بلند و بالا دعوتوں پر بھروسہ نہ کریں - دوسرے طبقۂ احرار کے نہایت معتقد رہنما اور مسٹر محمد علی کی ذریات کے مسلمہ سالار ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب سے کہ وہ ہر دفعہ آزمایش و امتحان میں ناکامیاب ثابت ہوے - ہمدرد مسلم یونیورسٹی و آل انڈیا مسلم لیگ دونوں کا خون انھیں کے عدم استقلال اور ناعاقبت اندیشی کے سر رہا - خداے کریم معاملات قومی میں اُنکی ہمت کو بلندی اور اُنکے قدم کو ثبات عطا فرمائیں - آمین -

---

خاکسار ایڈیٹر الناظر کو دہلی ہی میں یہ خبر ملی کہ اب کے الناظر میں ایک حرف بھی جناب راجہ صاحب محمود آباد کے خلاف لکھا گیا تو فوراً عدالت میں مقدمہ دائر کرا دیا جائے گا - معلوم نہیں اس تہدید و تخویف کی کیا حقیقت ہے - ممکن ہے کہ جن دوست نے مجھے یہ اطلاع دی اُنکو غلط فہمی ہوئی ہو - لیکن اگر واقعی جناب راجہ صاحب کا بھی خیال ہے تو وہ شوق سے اپنے مال و منال و اسباب و اقتدار کی نمایش فرما سکتے ہیں - ناچیز ایڈیٹر الناظر نے اس سے

قبل جو کچھ لکھا ہے یا اب جو کچھ تحریر ہوا ہے اُس میں سے کوئی بیان ایسا نہیں جسکی صداقت کا یقین اُسکے دل میں موجود نہ ہو۔ اور جب کبھی اسکا وقت آئے گا کہ ان بیانات کی تائید پیش ہو تو انشاء اللہ تعالےٰ وہ پوری طرح اُسے آمادہ و تیار پائیں گے ــــ باقی دُنیا اور معاملات دُنیا کا جو تجربہ ابتک ہوا ہے، اُسکی بنا پر قدر تعجب نہ ہوگا اگر ان بیانات کی صداقت مسلّم ہو جانے کے باوجود بھی اندرونی تدابیر یا خارجی اثرات سے ایڈیٹر الناظر کو ایذا پہونچانے کی کوشش کامیاب ہو جائے۔ تو اُس صورت میں حضرت اللہ العالمین کی یہ ہدایت میری تسکین کے لیے کافی ہے اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون ہر چند کہ اپنی بے مائگی اور بے حقیقتی کی بنا پر دعویٰ نہیں کر سکتا کہ راہ حق و صداقت میں جو مصائب آلام برداشت کرنا ہوتے ہیں اُنکا تحمل اُسی صبر و سکون سے ہو سکے گا جو رضا جویان حضرت باری تعالیٰ کا شیوۂ خاص ہے۔ بایں ہمہ اس بات کا یقین کامل ضرور ہے کہ

جنابِ عشق را درگہ بسے بالاتر از عقل است   کسے آں آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد

اور خدائے ذوالجلال کے فضل عمیم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ایک مورِ ناتوان کو ایک فیل کوہ پیکر کا بارگراں برداشت کر لینے کی توفیق و ہمت عطا فرمائے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا شاید بے موقع نہ ہو کہ خاکسار ایڈیٹر الناظر متعدد کتابوں کی تیاری کا برابر کچھ عرصے سے تہیہ کر رہا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں 'تاریخ اشراز' کا خاکہ مرتب کیا گیا مگر مسلسل خرابی صحت اور ہجوم افکار کے باعث اُسکو ملتوی کرنا پڑا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں 'حسو کی فتح' لکھنا چاہی لیکن عدیم الفرصتی نے ہر قدم پر عناں گیری کی اور بالآخر اُسے بھی مناسب موقع کے لیے اُٹھا رکھنا پڑا۔ سال گذشتہ سے 'فطرت کا انتقام' لکھنے کے لیے سامان کر رہا ہوں مگر الناظر اور اُسکے متعلقہ کاروبار کی مصروفیتیں اتنی مہلت نہیں دیتیں کہ اس سب سے ضروری فریضے سے سبکدوشی حاصل کر سکوں مگر کل امر مرہون باوقاتہا۔ شاید راجہ صاحب کا لطف و کرم ہی حصولِ مدعا کا ذریعہ بن جائے اور جو فرصت و سکون ان کاموں کے لیے درکار ہے وہ اس بہانے مہیا ہو جائے۔ اگر ایسا ہُوا تو میں اور یقیناً میرے ساتھ ناظرین الناظر اور دیگر ہی خواہانِ اردو و محبانِ قوم بھی عالیجناب سر راجہ صاحب محمود آباد کی اس عنایت و توجہ کے کمال درجہ ممنون ہوں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

# نظرے خوش گذرے

مسلمانانِ اندلس کے نام سے جو کتاب مسلسل ایک سال سے شایع ہو رہی تھی، الناظر پریس نے بعض اسباب کی بنا پر اُسے مکمل چھاپ لیا ہے۔ لہذا الناظر سے یہ سلسلہ خارج کر دینا پڑا۔ ۸۸ صفحے تک خریداران الناظر کو پہونچ چکے ہیں۔ ۱۱۰ صفحے اور ہیں۔ جو مع سرورق کے ۸ر میں خریداران الناظر کو دیے جائیں گے۔ مکمل کتاب کی قیمت عہ رکھی گئی ہے۔ اور اگر ناظرین کرام کی عام طور پر یہ خواہش ہو کہ کتاب کے بقیہ اجزا برابر الناظر ہی کے ساتھ شایع ہوتے رہیں تو ہمیں اس میں بھی کچھ عذر نہیں ہے۔ ۳۱ جنوری تک اگر احباب کی رائے معلوم ہو جائے گی تو فروری کے پرچہ سے یہ سلسلہ شروع کر دیا جائیگا

الناظر کی ابتدا سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ وقت پر شایع ہوتا تھا۔ سالہا سال تک یہ انتظام قائم رہا مگر اب عرصہ سے اس انتظام میں خلل واقع ہو گیا ہے جس کا سب سے زیادہ قلق و افسوس خاکسار ایڈیٹر الناظر کو ہے۔ اسکے اسباب مختلف ہیں۔ ایڈیٹر الناظر کی مسلسل خرابیِ صحت کے علاوہ الناظر کے متعلقہ کاروبار کی توسیع اور سال میں متعدد سفر بھی اس اہم فریضہ کی ادائی میں حارج ہوا کرتے تھے۔ انسان کا جسم بجائے خود ایک نظامِ فطری کے تحت میں ہے اور ناممکن ہے کہ آئینِ فطرت کی خلاف ورزیوں سے اس میں خلل واقع نہ ہو۔ اور جب ایک دفعہ یہ مشین بگڑ جاتی ہے تو پھر اسکا قطعاً درست ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ خاکسار کی حالت بعینہٖ یہی ہے۔ سال کے ۶۵ دنوں میں بہت کم ایسے گذرتے ہیں کہ دوا ترک ہو۔ ایسی صورت میں اسکی توقع تو عبث ہوگی کہ اگلی سی تندرستی نصیب ہو۔ لہذا اس سے قطع نظر کر کے دوسرے موانع کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ بار کی توسیع الناظر کے بقا و قیام کے خیال سے کی گئی تھی۔ اور اگر جنگ کی وجہ سے الناظر پریس کو سخت مشکلات پیش نہ آتیں تو یقین ہے کہ یہ توسیع الناظر کی باقاعدہ اشاعت میں اور معین ہوتی۔ مگر ناموافق حالات نے خود اسی کو ایک بڑا مانع قرار دیدیا ہے۔ اب کہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور اسکی قوی امید ہے کہ سال رواں کے اندر اندر کاغذ کی معقول مقدار ممالکِ یورپ سے آ جائے گی جس سے بازار میں فراوانی کے ساتھ اور یقیناً موجودہ نرخ سے بہت ارزاں قیمت پر ملنے لگے گا۔ اور اس طریقہ پر پہنچا

کاروبار کی مشکلات میں انشاء اللہ خاطر خواہ کمی واقع ہو جائیگی - اسکے علاوہ پبلک لائف کے جو تلخ تجربات ہوتے رہے ہیں اُنکی بنا پر چونکہ ایڈیٹر الناظر نے اب اُن نام نہاد قومی مجالس کی شرکت سے قطعاً دست کش ہو جانے کا تہیہ کر لیا ہے - پس سفر میں جو وقت صرف ہوتا تھا وہ بھی آیندہ الناظر کی خدمت میں بسر ہوا کرے گا - اسلیے غالباً یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ الناظر آیندہ زیادہ پابندی کے ساتھ شایع ہو سکے گا - اور اسکی ترقی کا سامان فراہم کرنے میں خاکسار کو زیادہ انہماک کا موقع ملے گا - وما توفیقی الا باللہ -

---

الناظر کی اشاعت کبھی زیادہ نہ تھی اور نہ اپنی محدود و ناقص اہلیتوں کی بنا پر اسکے خلاف توقع کرنا چاہیے تھی - بارے الناظر کی آزادانہ روی نے جہاں بہت سے احباب کو اُسکا قدرداں بنا دیا ہے وہاں ایسے مخالف بھی پیدا کر دیے ہیں جو اسکی ہستی کا غذیں کو بحرِ فنا میں غرق کر دینے کے درپے ہو رہے ہیں - لیکن چونکہ جو کچھ لکھا گیا اُسکے نتائج پر پہلے ہی سے نظر تھی، اسلیے الحمد للہ کہ ان مخالفتوں کا کچھ غم نہیں - انسانوں کی موت و زیست جس طرح ایک قادرِ ذوالجلال شاہنشاہ کی مرضیِ مختار کے تابع ہے اسی طرح انسان کے بنائے ہوے گھروندوں کی بقا و ترقی بھی اُسی شاہنشہِ شاہنشاہاں کے فضل و کرم سے وابستہ ہے - لہذا اس ناچیز کو زیادہ فکر کرنے کی حاجت نہیں ہے - تاہم چونکہ اس دنیا میں فراہمیِ اسباب کے لیے سعی کرنا بھی فرض کیا گیا ہے اسلیے جو احباب الناظر کی اس روش کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے اور اپنی قدر افزائی کا اظہار فرماتے رہتے ہیں اُنکی خدمت میں یہ التماس بے موقع نہ ہوگی کہ الناظر کو جو متوقع نقصان اس ذریعہ سے پہونچا ہے اُسکی تلافی کی غرض سے توسیعِ اشاعت میں کوشش فرمائیں - واللہ المستعان -

---

دفتر الناظر میں متعدد کتابیں ریویو کے لیے آئی رکھی ہیں - ریویو کے دو مقاصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ کتاب کے متعلق اچھی یا بُری رائے ظاہر کی جائے، جو اُسوقت تک ناممکن ہے کہ کتاب اگر بالاستیعاب نہ دیکھی جائے تو کم سے کم جستہ جستہ ضرور پڑھی جائے - جسکے لیے فرصت درکار ہوتی ہے جو یہاں ابتک عنقا ہے - دوسری غرض یہ ہوتی ہے کہ کتاب کا اشتہار ہو جائے - مکرمی پروفیسر فیروز الدین صاحب مراد نے جنکی کتاب تحفۂ سائنس کئی مہینے سے آئی رکھی تھی اور ابتک ریویو کی نوبت نہیں آئی اپنے سفر علیگڑھ میں یہ رائے دی ہے کہ کم سے کم ہر مہینے ایسی کتابوں کی رسید کا اعلان تو الناظر میں کر دیا جائے جو ریویو کی غرض سے آیا کریں - پروفیسر صاحب کے اس مفید مشورہ کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور انشاء اللہ آیندہ اسکے مطابق عمل ہوا کرے گا -

# رسالۂ معلومات

جو مسٹر عبدالوالی بی اے کی اڈیٹری میں پندرہ مہینے نکلکر بعض اسباب کی بنا پر بند ہوگیا تھا جنوری ۱۹۱۹ء سے انشاءاللہ تعالیٰ پھر جاری ہوگا۔

ارباب ذوق نے 'معلومات' کی تھوڑی سی زندگی میں جس عنایت و قدردانی کا ثبوت دیا تھا اُسکے بھروسے پر توقع کیجاتی ہے کہ معلومات کو دوبارہ جاری کرنے کا خیال پسند کیا جائے گا۔

معلومات کی خصوصیات جو دورِ قدیم میں تھیں جدید زندگی میں بھی اُنکو حتی الامکان قائم رکھنے کی پوری کوشش کی جائیگی۔

'بت شکن' کے نام سے جو فسانہ آخر زمانے میں شروع کیا گیا تھا وہ اب پھر مکمل کر دیا جائیگا۔ اور جدید خریداروں کی آسانی کے لحاظ سے ابتدائی اوراق از سرِنو چھاپ دیے جائینگے۔

معلومات کی قیمت بدستور صمہ رسالانہ لیجائیگی۔ جملہ قدرداناں قدیم اور نیز دیگر اصحاب ذوق جو معلومات جیسے رسالہ کے خواہاں ہوں ۱۹۱۹ء کے لیے اپنا اپنا سالانہ چندہ ارسال فرماکر ممنون بنائیں۔

جو صاحب نمونے کا پرچہ ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ ۸ر کے ٹکٹ بھیجدیں۔

المعلن

مینیجر رسالۂ 'معلومات' لکھنؤ

# ضرورت ہے

ایک شریف، خوش مزاج، منتظم، باسلیقہ، دیانتدار ہوشمند، پابند صوم و صلوٰۃ اور پڑھی لکھی منتظمہ کی، جو ایک خاتون محترمہ کے جملہ امور خانہ داری اور بچوں کی دیکھ بھال کی اہم خدمات بہ احسن وجوہ انجام دے سکیں معاوضہ معقول دیا جائےگا۔ تمام درخواستیں ایڈیٹر الناظر لکھنؤ کے نام آنا چاہیئں۔

## ہندوستانی صنعتی نمائشوں میں طلائی و نقرئی تمغہ جات

حاصل ہو چکے ہیں

ملیریا، نزلہ و بخار، اور معمولی طاعون میں باٹلی والا کی بخار کی دوائی کلاں یا بخار کی گولیاں استعمال کرنا چاہیے قیمت عمہ

**باٹلی والا کا بالم روت** ۔ بچوں اور کم طاقتوں کا روح پرور ہے۔ قیمت ہ ر

دوسری مشہور ادویہ

**باٹلی والا کی خالص کنین کی گولیاں** ۔ ایک یا دو گرام والی۔ ہر شیشی میں سو گولیاں۔

**بخار کی دوا** (خورد) قیمت ۸ر

**کالیرول** ۔ ہیضہ اور قے دست کے واسطے۔ قیمت عمہ

**مقوی گولیاں** (ایمپرل مارکہ) کمی خون اور اعضائے رئیسہ میں ضعف و اختلال کیلیے۔ قیمت عہ

**کیڑوں کا مرہم** کیڑوں کیلیے۔ ۴ر۔ دانتوں کا منجن ۴ر

یہ ادویہ ہر جگہ ملتی ہیں اور نیز پتہ ذیل پر بھی مل سکتی ہیں: —

ڈاکٹر ایچ ایل باٹلی والا سنس اینڈ کمپنی لمیٹڈ واسلی لیبوریٹری بمبئی

تار کا پتہ: — باٹلی والا — ورلی، بمبئی۔

## مرزا رجب علی سرور

- فسانۂ عجائب
- شگوفۂ محبت
- گلزار سرور
- انشائے سرور

## منشی امیر احمد مینائی

- امیر اللغات ۲ جلد
- محامد خاتم النبیین
- خطوط امیر احمد

## جلال لکھنوی مرحوم

- مضمون ہائے دلکش
- ظم لطائف
- رسالۂ تذکیر و تانیث

## منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- طرحدار لونڈی
- میٹھی چھری
- کایا پلٹ

## منشی جوالا پرشاد برق

- عرفانی
- مار آستین
- بنگالی دولھن
- معشوقۂ فرنگ

## مولانا عبد الحلیم شرر

- فتنۂ بغداد
- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین
- عصر قدیم
- دو بہن ہسپانیہ عرب ۲ جلد
- حروب صلیبیہ
- آغا صاحب
- مخدرات
- تذکرۂ شاہ عالم
- مقدس نازنین
- قیس و لبنی
- ایام عرب
- ملک العزیز ورجنا
- یوسف و نجمہ
- رومۃ الکبریٰ
- فلورا فلورنڈا
- فردوس بریں
- آغا صادق کی شادی
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- خوفناک محبت
- الفانسو
- قلپاترا
- فاتح مفتوح
- جویائے حق
- بابک خرمی
- تاریخ بغداد
- حسن بن صباح
- افسانۂ قیس

## پنڈت رتن ناتھ سرشار

- ہشو
- بچھڑی دلھن
- کامنی
- خدائی فوجدار
- فسانۂ آزاد
- سیر کہسار
- جام سرشار

## مرزا محمد ہادی رسوا بی اے

- امراؤ جان ادا
- لیلیٰ مجنوں

## پنڈت حکیت بی اے

- صبح وطن
- گلدستۂ پنچ
- کملا

## سید برکات احمد

- حمیلہ
- بیوفا
- یادگار سلف ۲ حصہ

## خواجہ عشرت

- زباندانی
- اصلاح زبان اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- تذکرۂ آب بقا
- گلدستۂ ظرافت
- ہجو لی

## منشی احمد علی شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- گنجینہ
- قاسم و زہرہ

## ڈاکٹر اقبال

- ملت بیضا
- شکوہ
- جواب شکوہ
- مکمل ترانہ
- رموز بیخودی
- اسرار خودی
- اکبری اقبال

## منشی محمد حسن خاں

- ہاجرہ
- ترکوں کی معاشرت

## مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ
- حیات جامی
- علوم عرب
- نوادر

## مولوی سید سلیمان

- ارض القرآن ۲ حصے
- حیات امام مالک
- لغات جدیدہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- اہل السنۃ والجماعۃ

## خواجہ حسن نظامی

- سی پارۂ دل
- روزنامہ با تصویر
- روزنامچہ
- …ء مرد قہر
- نوحہ نامہ
- تالیق خطوط نویسی
- یزید نامہ
- بیوی کی تعلیم
- سینا نامہ
- کرشن بیتی
- اردو دعائیں
- … نامہ
- غدر دہلی کے افسانے
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- جگ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- خطوط حسن نظامی
- اکبر نامہ
- سیر دہلی

## مولانا راشد الخیری

- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی زیر طبع
- طوفان حیات
- سراب مغرب
- سات روحوں کے اعمالنامے
- بنت الوقت
- جوہر قدامت

## نیاز فتح پوری

- ایک شاعر کا انجام
- جذبات بھاشا
- مرنے والی پاپ کی دنیا
- اکیوڈا انیڈ سائکس
- گہوارۂ ادب

## سیماب اکبرآبادی

- خدیجۃ الکبریٰ
- بنت الرسولؐ
- سیرۃ الحسین
- جام کوثر

## مسٹر سلطان حیدر جوش

- ابن مسلم
- صبر کی دیوی

## صفدر مرزا پوری

- بزم خیال
- مرقع ادب
- مشاطۂ سخن

## مولانا حسرت موہانی

- حیات تسلیم
- شرح دیوان غالب
- دیوان حسرت

## منشی پریم چند

- پریم پچیسی ۲ جلد
- سیر درویش

## مولانا اشرف علی
- نشر الطیب فی ذکر الحبیب ۱ر
- تعلیم الدین ۸ر
- اکسیر فی اثبات التقدیر ۸ر
- الانتباہات المفیدہ ۱۲ر
- اصلاح الرسوم ۱۲ر
- کلید مثنوی ۲ جلد ۱ر
- مناجات مقبول ۶ر
- بہشتی زیور ۱۰ حصے ۳ر
- بہشتی گوہر ۸ر
- تربیت السالک ۲ حصے ۱۲ر
- سبقت اختر ۱ر

## علامہ سیاب احمد
- حمایت الاسلام ۲ حصے ۱۲ر
- فن ہیئت ۹ر
- فن کیمسٹری ۶ر

## پروفیسر محمود علی
- دین و دانش ۱ر
- الایمان ۱۲ر

## پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفیٰ ۱ر
- معارج الدین ۱۲ر

## مولوی عبد الحق بی اے
- قواعد اردو ۱ر
- انتخاب کلام میر ۱ر

## منشی احد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد ۳ر
- شباب لکھنؤ ۱ر

## مسٹر عبد الماجد بی اے
- تاریخ اخلاق یورپ مجلد ۱ر
- فلسفہ جذبات ۱ر
- فلسفہ اجتماع ۱ر
- زود پشیمان (ڈرامہ) ۸ر

## مولوی بشیر الدین احمد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد ۱ر
- حرز طفلاں ۱ر
- نشاط عمر ۱ر
- عصائے پیری ۱۲ر
- اقبال دلہن ۱ر
- حسن معاشرت ۱ر
- اصلاح معیشت ۱ر

## منشی سعید احمد مارہروی
- آئینہ اکبری ۱ر
- حیات خسرو ۱۲ر
- حیات صالح ۴ر

## مطبوعات انجمن ترقی اردو
- فلسفۂ تعلیم ۳ر
- رہنمایان ہند ۱ر
- نپولین اعظم ۱ر
- امرائے ہنود ۱ر
- القمر ۸ر
- تاریخ تمدن ۳ر
- مبادی سائنس ۱ر
- فلسفۂ جذبات ۱ر
- فلسفۂ اجتماع ۱ر
- مقدمات الطبیعات ۱ر
- طبقات الارض ۱ر
- البیرونی ۱ر
- مشاہیر یونان و روما ۳ر
- تاریخ یونان قدیم ۱ر
- تاریخ اخلاق یورپ ۱ر
- علم المعیشت ۱ر
- دریائے لطافت ۱ر
- انتخاب کلام میر ۱ر
- اردو کا نیا قاعدہ ۲ر
- کلید قاعدہ ۲ر
- اسباق النحو ۲ حصے ۱ر
- القول الاظہر (زیر طبع)

## مولانا عبد الغفور
- مصباح الکلام ۱ر
- حدائق البیان ۱ر

## مولانا عبد الشکور
- اسد الغابہ ۶ جلد عہ
- علم الفقہ ۶ حصے ۱ر

## مولانا خلیل احمد اسرائیلی
- آیات اللہ الکاملہ ۱ر
- کارنامہ ترک ۱ر

## مولانا عبد الغنی
- جوار العرب ۱ر
- ارمغان اصفی ۱ر
- تذکرۃ الشعرا ۱ر
- خلافت اندلس مجلد ۱ر

## مرزا حیرت دہلوی
- سیرۃ الرسول کامل ۱ر
- کتاب الشہادت کامل ۱ر
- مضامین حیرت ۵ر
- نورجہاں بیگم ۲ر

## حافظ عبد الرحمن امرتسری
- سفرنامہ بلاد اسلامیہ ۱ر
- الصدیق ۱ر
- سیاحت ہند مجلد ۳ر
- عربی بول چال ۲ حصے ۱ر

## مولوی محمد حلیم انصاری
- تمدن اسلام ۲ جلد ۱ر
- الاسلام و العلوم ۱ر
- اسلام اور سوشل ریفارم ۸ر
- فتح اندلس ۱ر

## خواجہ عباد اللہ اختر بی اے
- دمشق ۳ر
- حضرت زید ۱۲ر
- ام القریٰ ۹ر

## منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر ۱ر
- اورنگ زیب ۱ر

## سید راحت حسین بی اے
- القمر ۸ر
- النخل ۱ر

## سید ہاشمی فرید آبادی
- مشاہیر روما ۳ر
- تاریخ یونان قدیم ۱ر

## خواجہ غلام الحسنین
- فلسفۂ تعلیم ۳ر
- دستور المعلمین ۸ر
- معیار الاخلاق ۶ر
- تربیت اولاد ۴ر

## مرزا سلطان احمد
- فنون لطیفہ ۱ر
- خیالات ۱ر
- امثال ۱ر
- فن شاعری ۱ر
- نبوت ۱۲ر

## مولوی ابو الحسن فرید آبادی
- علم السیاسات ۳ر
- تاریخ مصر جدید ۱ر

## مطبوعات الناظر پریس
- میلاد النبی ۲ر
- محاربات صلیبی ۱ر
- تسخیر فرانس ۸ر
- الاحسان ۸ر
- حیات نظامی ۴ر
- تذکرہ غزین ۱ر
- جمیل و نفیسہ ۳ر
- معشوق شوہر ۲ر
- اتفاقات زمانہ ۱ر
- مسکفرن ادبی ۲ر
- شوکیا اور مظلوم جنین ۱ر
- ایک نادان خدا پرست ۱ر
- سادات ۱ر
- محبت اور جاہ و ثروت ۱ر
- انسان ۸ر
- ترقی زبان بذریعہ تراجم ۴ر
- نوبہار ۲ر
- تسوی اسید و بیم ۴ر
- سلطان اندلس ۱ر
- اصول نسخ ۶ر
- کلیات نعت ۱ر
- واقعات کربلا ۱ر
- بچوں کی تعلیم کے اصول ۴ر
- اکنولا ۱ر
- خیابان ۴ر
- عورتوں کی انشا ۱ر
- اساس التعلیم ۳ر
- ازواج الانبیا ۱ر
- رموز فطرت ۱ر
- تاریخ ہند کی کہانیاں ۴ر
- خوان دعوت ۱ر
- اسرار رنگون ۱ر

ناظرین! ایک سو سے زیادہ مصنفین اردو کی کل تصانیف کی فہرست الگ ۲ کا ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔

**الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ**

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

| | | |
|---|---|---|
| نمبر ۱۱۷ | یکم مارچ سنہ ۱۹۱۹ء | جلد ۲۰ |


فہرست مضامین



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر۔ اسحاق علی علوی

# مشہور مصنفین اُردو کی قابل دید کتابیں

## مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلی
- عود ہندی ۱۲/
- دیوان غالب قسم اعلیٰ
- معہ شرح نظم طباطبائی

## سر سید احمد خاں مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- کمل مجموعہ لکچر
- سیرۃ فریدیہ ۱۰/
- اسباب بغاوت ہند
- آخری مضامین سرسید

## مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مجموعہ نظم حالی
- مسدس حالی ۸/
- رباعیات حالی
- تفعات حالی

## سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت
- لکچر ۸/

## مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- نیرنگ خیال ۱۰/
- نظم آزاد ۱۲/

## مولوی نذیر احمد مرحوم
- ترجمۃ القرآن متوسط
- الحقوق والفرائض ۲ جلد
- اجتہاد
- مرآۃ العروس ۱۰/
- بنات النعش ۹/
- توبۃ النصوح
- مجموعہ نظم نذیر
- چند پند
- منتخب الحکایات
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ ۱۲/
- فسانۂ مبتلا
- لکچروں کا مجموعہ

## مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- فلسفۂ اشتمال ۱۲/
- محاربات عظیم ۸/

## مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی صلعم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- سوانح عمری مولانا روم
- موازنۂ انیس و دبیر
- سفرنامۂ مصر و روم و شام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مضامین عالمگیر ۱۰/
- شعر العجم ۵ جلد
- مثنوی صبح امید
- مجموعہ کلام شبلی اُردو ۱۲/
- زیب النساء بیگم ۱/

## نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تقلید و عمل بالحدیث ۸/
- آیات بینات الشوق ۸/
- مجموعہ لکچر

## مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- مجموعہ رسائل

## مولوی عبد الرزاق
- نظام الملک طوسی
- البرامکہ مجلد

## مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- انتہائی شاعری
- ادیب ۸/
- نورجہاں ۸/
- ٹیپو سلطان ۸/
- حیدر علی سلطان ۱۲/
- مرقع تا چونچہ

## خلیفہ محمد حسین
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ بربرہ ۲ جلد

## مولوی سید احمد
- راحت زمانی
- رسوم دہلی
- تسخیر شوہر ۱۰/
- مہر افروز بیگم ۱۰/
- کنز الفوائد ۸/
- انشائے ہادی النساء ۸/
- تعلیم لبیبی ۸/
- لغات النساء
- انتخاب تحریر النساء
- محاکمہ مرکز زبان اُردو ۵/

## مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- میڈیکل جورسپروڈنس
- عربوں کا فن تعمیر
- سفرنامہ موسیو تھیونو

## جنگ ٹرنسوال

## مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق ۸/
- ذکر الحبیب ۲/
- ذکر جمیل ۵/

## مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس
- اقصائے مغرب

## مولوی شبیر احمد انصاری
- تحریر المرأۃ
- المدنیۃ والاسلام
- کتاب الصدق ۳/
- کتاب التوحید ۶/

## مولوی عبد اللہ عمادی
- کتاب المعارف
- محکمات
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث ۸/

## مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

## مسٹر ظفر علی خاں بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- ڈراما جنگ روس و جاپان

## مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- لیسین ۸/
- نیلی چھتری

## خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامۂ سیاحت
- ایک فلسفیانہ لکچر اسلام پر ۴/
- طالب علم کی زندگی کا مقصد

## مفتی انوار الحق ایم اے
- اثبات مذہب الٰہی
- حقائق اسلام

## مسٹر عنایت اللہ خاں
- دعوت اسلام
- اشاعت اسلام چین ۴/
- اشاعت اسلام بذریعۂ تجارت

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

شائقین الکتب ایک کارڈ لکھ کر مشہور مصنفین اردو کی کل تصانیف کی فہرست طلب فرمائیں

# مطبوعات جدیدہ

## برکلے اور اُسکا فلسفہ

(از پروفیسر عبدالباری ندوی - دکن کالج پونہ)

اس مجموعہ میں برکلے کی سوانحمری، اسکی تصنیفات کا ذکر اور اُسکے فلسفہ پر بحث اور تبصرہ ہے۔ برکلے کی لاجواب کتاب "مبادی علم انسانی" جس میں اُس نے اپنے مثالیت کا اعلان کیا ہو چھپ کر شائع ہو چکی ہے اس کتاب میں اُسکے مرکزی مطالب کو بھی ایک بڑی حد تک سریع الفہم بنا دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

## شرح دیوان اردو مرزا غالب

مرزا غالب کا کلام جیسا لاجواب ہے ویسا ہی اسکا سمجھنا بہت مشکل ہے اسی وجہ سے متعدد اصحاب نے اسکی شرح لکھی ہے جن میں سب سے بہتر شرح جناب مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے اسی سال ہی میں دوبارہ چھپی ہے قیمت ۱۲ر

## پریم پچیسی حصہ دوم

پریم چند کے دلچسپ افسانے اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ محتاج بیان نہیں - پریم پچیسی حصہ اول کئی بار چھپ کر شائع ہوا تھا - دوسرا حصہ بھی چھپ گیا ہے قیمت ۱۲ر

## نصائح چانکیہ

جناب ہمت راو صاحب نے مشہور ہندو فلسفی چانکیہ کی کتاب موسومہ نیتی کا ترجمہ کیا ہے قیمت ۴ر

## نیرنگ سحر

مثنوی گلزار نسیم کے تتبع میں منشی ... حسنا سحر ... نے لکھنؤ کے مشہور قصہ کو گلزار نسیم ہی کی بحر میں بطور مثنوی لکھا ہے قیمت ۶ر

## روشنی رامائن

منشی ... جو ایک مشہور ... ہیں ... اسم فرضی سکھ دیو ... رہتے ہیں ... قیمت ۱ر

## کلام خسرو

یعنی حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی لاجواب تصانیف جو حضور نظام کی فیاضانہ امداد، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی نگرانی دلچسپی و ہمدردی اور نواب حاجی محمد اسحاق خاں مرحوم سابق آنریری سکرٹری مدرسۃ العلوم علیگڈھ کی سعی و اہتمام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔ - اب تک اس سلسلے کی حسب ذیل کتابیں تیار ہو چکی ہیں جو ناظرین الناظر کیلئے خاص طور پر منگائی گئی ہیں :-

**مثنوی مجنون لیلی - مثنوی آئینہ سکندری - دولرانی خضرخاں یا عشقیہ - جواہر خسروی - ہشت بہشت - قران السعدین**

ان میں سے ہر جلد کی قیمت عام ہے، ۔
قسم متوسط ... قسم اعلیٰ ...

## قواعد میر

اس مختصر رسالہ میں خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے اردو زبان کے بعض ضروری قواعد لکھے ہیں اور انکے متعلق انکا یہ دعوی ہے کہ یہ قواعد سب انھیں ملک الشعراء اردو حضرت میر تقی میر سے ہیں - صاحبان فن اور قدردانِ زبان کو ایک ایک جلد خرید کر استاد میر کے کمال قدرت کے نمونے ملاحظہ فرمانا چاہیں۔ قیمت صرف ۴ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

# لال شربت     لال شربت     لال شربت

یہ بچوں اور پرسوتی کےلیے نہایت طاقت بخش دوا ہے - قیمت فی شیشی ۱۲ار محصولڈاک ۶ر
دیکھیے تحریر ش-م صاحبہ بنت مجاہد حسین صاحب ضلعدار نہرا خبار تہذیب النسواں مورخہ
۱۲ ار جولائی ۱۹۱۳ء میں کیا کہتی ہیں - پیاری بہن عباسی بیگم صاحبہ تسلیم - کل کے پرچہ اخبار تہذیب
سے آپ کا استفسار معلوم ہوا - گو اشتہاری دنیا میں قدم رکھنے اور اشتہاری ادویات کے استعمال کرنے
سے میں بھی سخت متنفر تھی - اور میں ہمیشہ انکو نقصان مال اور صحت کا زوال بر عکس نہند نام زنگی کافور
خیال کیا کرتی تھی - مگر اس لال شربت نے واقعی لال رنگ کرکے لال ولال کردیا - میں آپ بیتی
سناتی ہوں جو تازہ تجربہ اور حال کا مشاہدہ ہے - برخورداری نجم النساء بیگم جسکی عمر اب پونے دو سال کی ہے
عرصہ تین ماہ سے نصیب اعداء ایسی لاغر ہوتی گئی کہ کوئی اُسکے دشمنوں کو اثر غلش - اوپر والیوں کا
سایہ اور کوئی سوکھا بیر بتانے لگیں - پرانے خیالات کی بزرگواروں نے گنڈہ - تعویذ - حاضرات کا کوئی دقیقہ
اُٹھا نہ رکھا - بعض ضعیف الاعتقاد بہنیں اس معصوم بچی کے سایہ سے حذر کرنے لگیں - میں چونکہ بھوت
پریت کی قائل گنڈے تعویذ کی معتقد نہ کبھی ہوئی اور نہ ہوں - آخر کار ڈاکٹر ایس کے برمن صاحب کا یہ
لال شربت مایوسی میں استعمال کرایا - جس کے فوری اثر نے دن بدن برقی اثر کا نمایاں کرشمہ دکھایا -
بفضال الہیٰ اب عزیزہ اپنی پوری طاقت اور اصلی حالت پر تین ہفتے ہی کے استعمال سے ہو چکی -
گویا - ایس کے برمن صاحب کا شربت بھوت - پریت - سایہ - پرچھاویں کے دور کرنے کیلیے مجرب تعویذ
اور سوکھے بیر کیلیے سریع التاثیر نسخہ ہے - میں نے قصد کیا ہے کہ متواتر بارہ سال تک باناغہ شربت استعمال
کراؤں گی - اسلیے اپنی کرم بہن کی پریشانیوں کے دور کرنے کیلیے ترغیب دیتی ہوں کہ وہ بھی برخورداری
علیہ ! لو بیگم کو کم از کم دو شیشیاں ضرور پلائیں اور قدرت الہیٰ مشاہدہ کرائیں اور نتیجہ سے اطلاع
بخشیں -

راقمہ     ش - م - بنت مجاہد حسین ضلعدار نہر

ملنے کا پتہ

## ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۱ جلد ۲ — یکم مارچ سنہ ۱۹۱۹ء

## راسخ عظیم آبادی

### تمہید

**تذکرۂ آبِ حیات** آبِ حیات ہماری قلیل المایہ زبان کے خزانے میں ایک گراں بہا پونجی سمجھی جاتی ہے۔ اسکی اشاعت سے آج تک اسی ایک تذکرے پر عام طور پر بھروسا کیا جاتا رہا ہے۔ مگر زبان اور بیان کی حلاوت و لطافتِ عارضی سے قطع نظر کرنے کے بعد اگر واقعات پر نظر کی جائے تو اس میں بہتیری غلطیاں ملتی ہیں جن سے اہلِ نظر کی نظر تو نہیں چوک سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ آزاد مرحوم کی سحر نگاری کے سامنے واقعات کی صحت و عدم صحت کا احساس ناظر کے لیے ایک دشوار امر ہے۔ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس توڑ اور ہنگامے کے ساتھ جیسے کوئی لکھنوی داستان گو داستان سُنا رہا ہو۔ وہ اپنی طلاقت سے بعض دفعہ نہ صرف رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں بلکہ محض اپنے تخیل اور قیاس کے ہیولے سے ایک پُتلا کھڑا کر دیتے ہیں جو دیکھنے والے کو ایک جیتی جاگتی صورت نظر آنے لگتی ہے۔

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی اب سے سات برس پہلے مخزن میں میر تقی کے لکھے ہوئے تذکرہ شعرا کے باب میں آزاد مرحوم کی سحر کاری کی حقیقت کھول کر اسکا طلسم توڑ چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولوی محمد حسین آزاد کی تحریر سے میر صاحب کے تذکرے کی یہ شان معلوم ہوتی ہے کہ جن شعرا کا تذکرہ ہے ان میں سے ایک بھی طعنہ اور ملامت سے نہیں بچا۔ یہاں تک نہ دیکھی کہ یہی نوع شعرا کے آدم ہیں اسکے حق

میں فرماتے ہیں "شاعریست از شیلان مشہور تر"۔ میر صاحب کی بد دماغی جو مشہور عالم ہے اس بیان کو قرین قیاس ثابت کرتی تھی مگر سخت حیرت ہے کہ صورت حال برعکس ہے۔ میر صاحب مرحوم نے کسی کے متعلق بھی طعن و ملامت سے کام نہیں لیا۔ ہر موقع پر اساتذہ کی نسبت کمال نیازمندی اور ہمسروں کے ساتھ پورے حفظ مراتب کا پاس اور لحاظ رکھا ہے۔ اول سے آخر تک میر صاحب کی محبت و قدردانی کا جلوہ ہر شاعر کے حال میں عیاں ہے۔"

اسی تذکرۂ میر کا (جسکا آزاد نے آب حیات میں ذکر کیا ہے) ایک قلمی نسخہ مولوی حبیب الرحمان کے ہاتھ آگیا جسکا مطالعہ آزاد سے مندرجۂ بالا اختلاف کا باعث ہوا۔ آزاد کے بیان کے بالکل برعکس میر صاحب اپنے اس تذکرے میں ولی کی نسبت فرماتے ہیں۔

"شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد است۔ میگویند کہ در شاہجہان آباد دہلی نیز آمدہ بود...... از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد و احوالش نیز کماینبغی معلوم من نیست۔"

اسی طرح سودا، خواجہ میر درد، میرزا مظہر وغیرہ اساتذۂ عصر کی تعریفیں دل کھول کر کی ہیں۔ سودا کو ان لفظوں میں یاد فرماتے ہیں

"سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید۔ از نغمات روزگار است۔"

میر درد کی شان میں کلمات مدح فرمانے کے بعد اپنی نیازمندی یوں ظاہر فرماتے ہیں "فقیر را بخدمت او بندگی خاص است"۔ آزاد مرحوم نے خان آرزو سے میر صاحب کی کشیدگی و بدمزگی کا ذکر بھی کیا ہے مگر اس تذکرۂ میر کی تصنیف تک تو پوری نیازمندی قائم تھی"۔ الغرض تذکرۂ میر پڑھو پھر تذکرۂ آب حیات میں میر تقی کی تصویر دیکھو۔ تم کبھی پہچان نہیں سکتے کہ یہ وہی میر ہے جو اپنے تذکرہ اور کلام سے جھلکتا ہے۔

میر و مرزا، اور ذوق و غالب کے موازنہ میں صاحب آب حیات نے اپنے دعاوی کی تائید میں جس فسوں سازی سے کام لیا ہے وہ اب کافی طور پر عالم آشکارا ہے مگر اس سے تجاوز کرکے انھوں نے بعض اساتذہ کے متعلق حق و انصاف کا جس بے جگری اور قساوت سے خون کیا ہے اُسے دیکھکر حیرت رہ جاتی ہے۔ آب حیات کو پڑھو۔ طرز بیان کہتا ہے کہ مصنف کو ولی سے لیکر غالب تک ہر ایک ممتاز شاعر کی خبر ہے۔ متاخرین کے تذکرے میں تو کوئی بھی چھوٹا بڑا، بے حقیقت یا ممتاز نظر انداز نہ ہوا۔ میاں زعمی، عیشی، خلیل، ویران، عیش، ہدہدالشعرا کوئی بھی تو نہیں چھوٹا۔ تفصیلیں ہیں، نقلیں ہیں، لطیفے

ہیں، سب کچھ ہے مگر مومن خاں کی نسبت یہ عذر ہے کہ باوجود تقاضاے عام کے مومن کے تلامذہ نے ان کے حالات ہم نہ پہونچائے۔ پچھلے اڈیشن میں اعتراضات کی بوچھاڑ سے تنگ آکر انکے تذکرے میں جو دو چار ورق سیاہ بھی کیے ہیں اُن میں انکی تاریخ گوئی، سجع گوئی، اصلاح کلام، شطرنج بازی، نجوم، طب کی مہارت کی داد دی گئی ہے۔ اور میر صاحب کی طرح بلکہ اس سے زیادہ بُری طرح ان پر بد دماغی کا اتہام باندھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ لطیفہ کی ذیل میں (جس کی آب حیات میں حیرت انگیز بہتات ہے) فرماتے ہیں :-

"انکی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ یہ قول انکا مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں۔ اُس میں ہے کیا؟ گفت گفت گفتہ اند کہتا چلا جاتا ہے۔ اگر ان لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا۔"

بجز اسکے اور کیا کہا جائے کہ ھٰذا بُھتَانٌ عظیم۔ مومن خاں کی شاعری کے بارے میں صاحب آب حیات کے پاس کوئی رائے نہیں۔

## راسخ عظیم آبادی

**تلمذ**　صاحب آبحیات کے تغافل یا تجاہل سے جو بے بہا موتی قعر گمنامی میں پوشیدہ رہ گئے ہیں انمیں ایک راسخِ عظیم آبادی بھی ہے۔ اسکی نسبت مؤلف موصوف جو کچھ کہتا ہے یا دوسرے لفظوں میں دُنیاے اُردو جسقدر جانتی ہے وہ صرف اسی قدر ہے :-

"راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ بہت سنجیدہ کلام ہے۔ پُرانے مشاق تھے اور سب اُدھر کے لوگ اُنھیں اُستاد مانتے تھے۔ میرزا (سودا) کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے۔ اُنھوں نے پڑھا ؎

ہوے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　　پلک پہ اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

مرزا نے اُٹھکر گلے لگا لیا۔"

ناواقفیت کوئی جرم نہیں۔ مگر ناواقفیت کے ساتھ ادعاے واقفیت ایک ناقابلِ معافی جرم ہے خصوصًا ایک مورخ یا سوانح نگار کے لیے۔ اگر راسخ کے نام یا کلام سے مولف بیخبر ہوتا اور اپنی

کتاب میں سرے سے اسکا ذکر ہی نہ کرنا تو کوئی حرج نہ تھا۔ مگر دعویٰ یہ ہے کہ اسکو جانتے ہیں۔ اسکے متعلق لطیفے بھی معلوم ہیں اور اسکا دیوان بھی دیکھا ہے۔

اگر راسخ کا دیوان آزاد کی نظر سے کبھی گذرا ہوتا تو وہ ہرگز اسے میرزا کا شاگرد نہ بتاتے۔ کیونکہ راسخ ایک دو جگہ نہیں بیسیوں غزلوں کے مقطعوں میں میر صاحب کی شاگردی کا بانگِ دہل اعتراف و اعلان کرتا ہے۔ اور میر صاحب کے سوا کہ یہ محض تقاضائے آدابِ تلمذ ہے وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میرزا یا کسی اور معاصرِ میر کی شاگردی درکنار تقابل بھی اُسکے لیے باعثِ ننگ ہے۔ ہم پہلے میر صاحب سے تلمذ کے ثبوت میں راسخ کے چند مقطعے نقل کرتے ہیں۔ اسکے بعد ہم دکھائیں گے کہ وہ کس پایہ کا شاعر تھا۔ کہتا ہے :-

راسخ کہ ہے میر سے تلمذ — یہ فیض ہے اُنکی تربیت کا

نسبت تو اُسی سے تھی راسخ کو تلمذ کی — وہ میر جو اُستاد اس اشعار کے فن کا تھا

شاگرد ہیں ہم میر سے اُستاد کے راسخ — اُستادوں کا اُستاد ہے اُستاد ہمارا

کروں کیونکر نہ میں راسخ مباہات — کہ ہیں اُستاد میرے حضرتِ میر

شاگردی کے متعلق مولانا آزاد کی مندرجۂ بالا روایت کے مقابلہ میں ہم نے جناب اُستاد مولانا شاد عظیم آبادی سے جنکا سینہ کملائے عظیم آباد کے سوانح کا خزینہ ہے یوں سُنی ہے کہ شیخ راسخ مرحوم ایک فقیر منش اور قلندر وضع بزرگ تھے۔ اچھی خاصی مشقِ سخن کے بعد میر تقی میر کی زیارت کو گئے۔ میر صاحب اُن دنوں خانہ نشین تھے اور کسی سے ملتے جُلتے نہ تھے۔ مگر راسخ خالی ہاتھ پھرنے والا سائل نہ تھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے سرِ راہ بیٹھ گیا۔ اتنے میں اندر سے ایک چھوکری نکلی۔ راسخ کی درخواست سُنکر اُس نے جواب دیا کہ میر صاحب کسی سے نہیں ملتے۔ راسخ نے ایک ٹھیکرا اُٹھایا اور ایک کنکری سے یہ مطلع لکھ کر لونڈی کے حوالہ کیا ؎

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشمِ رہرو راہ کا — آنکھ والا رُتبہ دیکھے اس غبارِ راہ کا

اس شعر نے میر صاحب کو اُنکے خلوتکدے سے باہر نکال چھوڑا۔ ملے۔ کلام سُنا۔ محبت اور قدردانی سے پیش آئے۔ تلمذ کی درخواست پر فرمایا "تم خود اُستاد ہو۔ تمھیں اصلاح کی کیا حاجت؟" راسخ نے عرض کی "شوقِ استفاضہ عظیم آباد سے یہاں کھینچ لایا ہے۔ تبرکاً قلم لگا دیں"۔ الغرض میر صاحب

نے انکی درخواست پوری کردی۔

**حالاتِ زندگی** راسخ کے حالاتِ زندگی مولانا ممدوح چاہتے توجمع ہو سکتے تھے۔ بلکہ مشاہیر بہار کی ایک جامع تاریخ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مسودہ کی صورت میں آپ کے پاس موجود ہے مگر دُنیا ے اُردو کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ایک اہلِ قلم جب تک خود مصنف، خود پبلشر، خود مصحح، خود پرنٹر، خود مشتہر اور خود کتاب فروش نہ بنے کوئی عمدہ لٹریچر شایع نہیں ہو سکتا۔ ایک اہلِ قلم کو اگر وہ ہوسِ نام و نمود سے آزاد ہو اور لغوی معنی میں بھوکوں نہ مرر ہا ہو کیا پڑی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے یہ دردِ سر مول لے۔ اُردو پریس کی یہ رسمِ قبیح ہمارے علوم و فنون کی راہ میں ایک سنگِ عظیم ہے۔ مولانا شاد نے یہی کیا کم احسان کیا ہے کہ ایک بار ۱۳۱۱ھ میں اپنے اہتمام سے کلیاتِ راسخ چھپوا کر شائع کر دیا۔ گو اب یہ کمیاب بلکہ نایاب ہے۔

حضرت اُستاد کی زبانی سُنی سنائی جو کچھ اب یاد رہ گئی ہے، یا کلامِ راسخ سے ان کے ذاتی حالات پر جسقدر روشنی پڑتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شیخ غلام علی راسخ ایک صوفی منش، قیدِ فرقہ بندی سے آزاد بزرگ تھے۔ گیروا لباس زیبِ تن فرماتے تھے۔ اور بالکل فقیروں کی سی وضع و ہیئت رکھتے تھے۔ بعض قصائد و قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ کلکتہ میں گذار دیا آخر عمر میں وطن واپس آئے اور یہیں ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی۔

**کلام** راسخ کا کلام دیکھکر حیرت رہ جاتی ہے کہ اب سے سوڈیڑھ سو برس پہلے زبان کی یہ صفائی، مذاق کی یہ پاکیزگی، یہ سنجیدگی، یہ نازک خیالی، جذبات کی یہ مصوّری یہ تاثیر کہاں سے آئی! انصاف تو یہ ہے کہ زبان کی اتنی صفائی خود میر صاحب کو بھی حاصل نہ تھی۔ میر صاحب جذبات میں سے جذبہ دردِ عشق کے بادشاہ تھے مگر بلندیِ تخئیل اور رسائی فکر جس درجہ تک راسخ میں پائی جاتی ہے میر صاحب کے ہاں نظر نہیں آتی۔ راسخ کی ذات میں میر کی سادگیِ بندش اور شعرائے عجم کی نزاکتِ تخئیل مجتمع ہے۔ اوروں نے جن بلند خیالات کو مغلق یا پیچیدہ فارسی ترکیبوں سے ادا کیا ہے راسخ نے اُنھیں کو سیدھی سادی اُردو ترکیبوں سے ادا کر دکھایا ہے۔ ان کا طرزِ سخن انکے تمام پیشرو اور معاصر شعرا سے بلکہ متاخرین سے بھی بالکل علیحدہ ہے۔ اُردو شعرا اور اُردو دواوین ان کا ماخذ نہیں۔ بقول خود وہ نظیری اور شفائی کے خرمنِ سخن کے خوشہ چین ہیں۔ اس ساقیِ بادۂ سخن نے ساغرِ ہندی میں وہ وہ

شرابیں بھربھر کر پلائی ہیں جنکی لذت سے محفلِ اُردو کے پُرانے پُرانے میخوار ناآشنا تھے۔ اگر وہ اپنی غزلوں میں باربار آپ کو نظیری اور شفائی کا بدل بتاتے ہیں اور کسی معاصر کو اپنا مقابل نہیں سمجھتے تو چنداں مبالغہ نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں

وہ بزمِ شعر کیا جس میں نہ آئیں حضرت راسخ؟ کہ آنا انکا آنا ہے شفائی اور نظیری کا

سخن سنجان صاحبدل ہی قدر اسکی سمجھتے ہیں بدل ہے یہ مرا دیوان دیوان نظیری کا

راسخ شعرا میں ہیں نظیری یعنی ہے بے نظیر ہیں اب

تلمذانہ نیازمندی کچھ عرصے تک اُستاد کے مقابلہ میں اظہارِ حقیقت سے باز رکھتی ہے۔ مگر شاعرانہ خلقِ خودنمائی کہیے یا حق و انصاف کی جرأتِ بیباکانہ جو میر کی جانشینی کے دعوے سے تجاوز کر کے تقابل اور تقابل سے تفوق و یکتائی کے اعلان تک مجبور کر چھوڑتی ہے:۔

اُستادِ فنِ ریختہ راسخ ہیں بعدِ میر اب شاعروں میں ہند کے ایسا کہاں ہے اور

زندہ ہے نامِ میر راسخ سے کون ہے شاعروں میں ایسا آج؟

مایہ دارِ سخن اب کون ہے ہم سا راسخ شاہِ اقلیمِ معانی ہوئے ہم میر کی طرح

ہیں سرآمد ریختے کے فن میں جیسے میر ہم مبدءِ فیاض نے کی ہمکو اُستادی نصیب

نظیری اور شفائی کا ہے بدل راسخ یہ اُسکا فخر نہیں گر نظیرِ میر ہوا

جو لوگ راسخ کے کلام سے ناآشنا ہیں وہ ان دعاوی کو شاعرانہ مبالغہ اور خود پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر چشم انصاف کے سامنے نمونۂ کلام ایک شاہدِ عادل موجود ہے جو اس دعوے کی شہادت آپ دیگا۔ اس غرض سے ہم پہلے بعض اُن غزلوں کا انتخاب پیش کرتے ہیں جو میر اور راسخ نے ایک ہی طرح میں لکھی ہیں۔ میر صاحب فرماتے ہیں:۔

کب مصیبت زدہ دل مائلِ آزار نہ تھا کون سے درد و ستم کا یہ طرفدار نہ تھا

آدمِ خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ آئینہ تھا یہ گر قابلِ دیدار نہ تھا

صد گلستاں تہِ یک بال تھے اسکے جبتک طائرِ جاں قفسِ تن کا گرفتار نہ تھا

حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتلِ ناداں ورنہ بے گنہ مارنے قابل یہ گنہگار نہ تھا

عشق کا جذب ہوا باعثِ سودا ورنہ یوسفِ مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا

نرم تر موم سے بھی ہمکو کوئی دیتی تھی سنگ چھاتی کا تو یہ دلِ ہمیں درکار نہ تھا

راسخ حیران ہوں کچھ چپ سی مجھے لگ گئی میر — درد پنہاں تھے بہت پر لب اظہار نہ تھا

راسخ فرماتے ہیں :—

شوق کی باتوں کا کس نامے میں اظہار نہ تھا — ہمنے کب خط اُنھیں لکھا کہ وہ طومار نہ تھا
شوقِ دیدار نے کی روکشیِ مدتِ حشر — صبر کا ورنہ یہ اندازہ و مقدار نہ تھا
شکر یہ ہے کہ ہوئی جنس نیاز اپنی قبول — ورنہ ناز انکا تو اسکا بھی خریدار نہ تھا
تھی اُنھیں وسعتِ رحمت کی نمائش منظور — قابلِ عفو وگرنہ یہ گنہگار نہ تھا
اُنکے تیروں کا ہدف غیر وہاں تھا لیکن — کون سا تیر کہ یاں دل کے مرے پار نہ تھا
اپنی اُفتادگی سے رفعتِ قدر اپنی ہوئی — ورنہ یہ عجز ہمارا اُنھیں درکار نہ تھا
سبحہ گرداں رہے ناا ہلی سے اپنی راسخ — کیا کروں آہ کہ شایستۂ زنار نہ تھا

میر صاحب فرماتے ہیں :—

جھوٹے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر — انجان اتنے کیوں ہوے جاتے ہو جان کر
وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے — پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر
کہتے نہ تھے کہ جان سے جاتے رہینگے ہم — اچھی نہیں ہے آنہ ہمیں امتحان کر
افسانے ما و من کے سنیں میر کب تک — چل اب کہ سوویں منہ پہ دوپٹہ کو تان کر

راسخ فرماتے ہیں :—

اشکوں پہ میرے مت منسو بتیدہ جان کر — پائے ہیں ہم نے یہ دُرِ تر خاک چھان کر
اوجھل نہ آنکھ سے ہو کہ اسکی نہیں ہے تاب — پھر جا ہے جس طرح تو مجھے امتحان کر
تکلیں تو دیکھو۔ ہو گئی جب یاں زبان بند — تب بولے یوں کہ حال ٹک اپنا بیان کر
آمادۂ وداع ہیں راسخ شتاب آؤ — دورِ خصت سفر اُنھیں اب جلد آن کر

میر فرماتے ہیں :—

سب ہوے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت — تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت
تنگ ہو جاویگا عرصہ خفتگان خاک پر — گر ہمیں زیر زمیں سونپا دلِ نالاں سمیت
اُٹھ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میر — پھاڑ ڈالا ئیں گریباں رات کو داماں سمیت

راسخ فرماتے ہیں :-

ہمنے پھاڑا ہے گریباں دشت کے داماں سمیت | تھا جنوں مجنوں کو بھی لیکن نہ اس طغیاں سمیت
سوزشِ دل کی حقیقت خامہ لکھ سکتا نہیں | جی میں ہے بھیجیں ہم اُنکو خط دلِ سوزاں سمیت
کرتے ہیں وے جستجوے عشق منسر و طِ وصال | درد کے طالب تو ہیں راسخ دلے درماں سمیت

ان اشعار کے متعلق ہم اپنی طرف سے کوئی رائے زنی کرنا ضروری نہیں سمجھتے - اہل مذاق خود رائے قائم کر لیں گے - اور اگر اب بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکیں تو آگے چل کر نمونۂ کلام مواد دے گا کہ بقول غالب

ہر کہ سطے کرد ایں موا قعت را | او چہ داند تعین و واقف را

## خصوصیات و تصرفات

(۱) زبان | راسخ کے زمانے تک شرفاے عظیم آباد میں دلی کی زبان جاری تھی - اسکی کئی وجہیں تھیں - ایک تو یہ کہ یہ شہر سیکڑوں برس تک عمالِ دہلی کے ماتحت رہا - دلی کے شاہزادے اور امراء یہاں اقامت گزیں ہوے - مگر دوسری خاص وجہ یہ تھی کہ جن امراء کو قلعۂ معلّٰی دہلی سے آل تمغا یا جاگیریں صوبۂ بہار میں ملتی تھیں وہ زیادہ تر اپنے تمام بال بچوں بلکہ شاگرد پیشہ سمیت یہاں آ بستے تھے - چنانچہ آج خاص عظیم آباد پٹنہ کے جمہور شرفا انھیں امرا و اعیانِ دولتِ مغلیہ کی نسل سے ہیں - اور آج تک اُسی خوان کرم کا بچا کھچا ٹکڑا کھا رہے ہیں - بعد کو جب لکھنؤ کے جاہ و جلال نے دلی کو ماند کر دیا بالخصوص قلمروِ اُردو میں اپنا سکہ جمانا شروع کر دیا تو یہ شہر بھی اس انقلاب سے متأثر ہوے بغیر نہ رہا - دلی اور لکھنؤ کے محاورات کا عظیم آباد میں عجب طرح پر قوام ہوا ہے جسکی دلچسپ تشریح کے لیے جداگانہ مضمون درکار ہے - خلاصہ یہ ہے کہ امتزاجِ محاورات کا یہ اثر راسخ ہی کے زمانہ سے نمایاں ہے - راسخ میر تقی جیسے متعصب دہلوی اہل زبان کے شاگرد تھے اور دلی کی زبان بولتے تھے مگر فکر اور سانس کو مؤنث نظم کیا ہے جو آج تک عظیم آباد کی خصوصیاتِ زبان سے ہے -

(۲) فارسی محاورات و ترکیبیں | راسخ کے کلام سے ہر جگہ صاف نمایاں ہے کہ اس شاعر نے اساتذہ عجم سے کس قدر استفادہ کیا ہے - تاہم علی العموم اسکی بندش سیدھی، ترکیبیں سلیس ہوئی اور زبان شستہ ہوتی ہے -

مگر جابجا اسکے کلام میں مخصوص فارسی طرز ادا نمایاں طور پر جھلک ہی جاتا ہے۔

وا ہے در بسکہ مری چشم پہ حیرانی کا
تو سمجھے چشم مری دیدہ ہے قربانی کا

گو کیا طاؤسِ آتشبازی اس گلشن میں ہوں
پرفشاں ہوں تو گرے گل میرے بال و پر سے آگ

خوابِ دشمن ہے مرا افسانۂ عبرت فزا
جسنے یہ قصہ سنا نیند اُسکو پھر آئی نہیں

بے بقا ہے یہ گلِ سست وفا اے بلبل
دل اُسے دیجیے جو رنگِ وفا رکھتا ہے

بیقراری سے ہم آتش تہِ پا تھے تم بن
ایک جا دل کی تپش نے نہ بٹھایا ہم کو

پردہ کب آسان روئے دلستاں سے اٹھ گیا
تب اُٹھا واں پردہ جب میں درمیاں سے اٹھ گیا

ہوا ہوتی نہیں دو دو پہر داں صبائے ناصح
تو مجھ وحشی کی خاک افشانی صحرا میں تماشا کر

راسخ کی فارسی ترکیبیں ہمیشہ نہایت صحیح اور مکمل ہوتی ہیں۔ میر صاحب کی طرح اس نے کبھی بیڑۂ پان کی سی ترکیب جائز نہیں رکھی ہے

جب وہ کھاتے ہیں بیڑۂ پاں کو
رو نہیں دیتے لعل و مرجاں کو

(۳) **عربی الفاظ کا طریق استعمال** | راسخ کے کلام سے صرف فارسی ہی پر کامل عبور ظاہر نہیں آتا بلکہ بعض عربی الفاظ کی ترکیبوں اور طریق استعمال سے انکی اعلیٰ عربیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ مثلاً انکا یہ مطلع:۔

کیوں نہ جی جسم سے جانے کو مہیا ہووے
جُدا ہوتے ہیں اب جیسے یاں کیا ہووے

اُردو میں مہیا کا لفظ صرف اشیائے غیر ذوی العقول کے لیے مستعمل ہے۔ حالانکہ عربی میں یہ لفظ تیار کے معنی میں ذوی العقول کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ تاہم کسی اُردو شاعر کو آج تک یہ لفظ اس طرح استعمال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ راسخ کی جرأت انکی ادبیت عربی کی خبر دیتی ہے۔ اسکے علاوہ اپنی مثنویوں میں انھوں نے براہِ راست اصمعی کی روایتوں کا ترجمہ کیا ہے جو انکی عربی دانی کی کافی شہادت ہے۔

(۴) **تصرفاتِ لفظی** | اُردو میں بہت سے ایسے لفظ جاری ہیں جو ہیں تو عربی الاصل یا عجمی مگر ہندی خراد پر چڑھکر انکی ہیئت میں کم و بیش تغیر ہو گیا ہے۔ جو لوگ ایسے الفاظ کی اصل اور اشتقاق و ماخذ سے واقف ہیں وہ انکو اصلی تلفظ اور ہجاء کے ساتھ ادا کرنے پر مُصر ہیں۔ تحریر میں اصلی تلفظ کے ساتھ لکھتے اور نظم کرتے ہیں مگر تقریر میں عام و خاص سب کی زبانوں سے بیساختہ منقلب شکل میں نکل آتے ہیں۔ میر صاحب نے اپنے مذاق صحیح سے کام لیکر اس تکلف کو برطرف کر دیا اور ایسے الفاظ

روزمرۂ عام کے مطابق نظم کردیے۔ مثلاً قلابہ بجاے قُلّابہ، بچارا بجاے بیچارہ، پلیت بجاے پلید، قرار کرنا بجاے اقرار کرنا، نشہ بجاے نشّہ، دوانہ بجاے دیوانہ، گر میر صاحب نے اس اجتہاد میں حد سے زیادہ آزادہ روی کو راہ دی ہے۔ یہاں تک کہ وہ غلطی کو سکون لام کے ساتھ، بندۂ درگاہ کو بلا اضافت، اور المضاعف کو بغیر عین کے المضاف نظم کر گئے ہیں۔

راسخ نے بھی آزادیاں برتی ہیں مگر ذرا اعتدال کے ساتھ۔ دوانہ، بچارا، نشہ، انھوں نے بھی نظم کیے ہیں مثلاً:—

اے مئے عشق زہے تیرے نشے کی آمد    بس ہمیں لے ہی گیا آپ سے۔ آیا ایسا

جو الفاظ عام طور پر آن پڑھ لوگوں کی زبانوں پر نہیں ہیں اور صرف خواص اور تعلیم یافتہ استعمال کرتے ہیں راسخ نے ان میں تصرف و تحریف کبھی روا نہ رکھی نہ یہ کسی طرح مستحسن ہے۔

(۵) حدودِ تغزل میں وسعت | ریختہ گو آج تک غزل کے لیے مضامینِ عاشقانہ کی قید لازمی قرار دیتے ہیں۔ رندی، میخواری، شاہد بازی سے باہر وہ کسی مضمون کو غزل میں روا نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ ایسی تعریفِ غزل (با معشوق سخن گفتن) کے منافی سمجھتے ہیں۔ اگر معرفت، تصوف، اخلاق وغیرہ کے حقائق بیان کرنا چاہتے بھی ہیں تو رندول اور شہد وال کی زبان میں۔ اساتذۂ عجم نے جو اس صنفِ سخن کے بانی ہیں کبھی یہ لزوم ما لا یلزم جائز نہیں رکھا۔ شیخ سعدی صنفِ غزل کے پیغمبر بتائے جاتے ہیں۔ مگر انکے دیوانِ غزلیات میں اخلاقی مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں ؎

اُستا: کیمیا را بسیار زر بباید    در خاکِ تیرہ کردن تا آنکہ زر باشد

غافل مباش ار عاقلی دریاب گر صاحبدلی    باشد کہ نتواں یافتن دیگر چنیں ایام را

بالاے خاک ہیچ عمارت نکردہ اند    کز وے بدر نرود و نباشد تحولے
گر دہ طفلے ست جہانِ فریب ناک    بر باد داد گرد بہ شوخی تجملے
دے بوستانِ خرم و صحرا و لالہ زار    وز بانگِ مرغ در چمن افتادہ غلغلے
و امروز خارہاے مغیلاں کشیدہ تیغ    گوئی کہ خود نبود دریں بوستاں گلے
دنیا پلے ست رہگذرِ دارِ آخرت    اہلِ تمیز خانہ نگیرند بر پلے

گنجِ آزادگی و کنجِ قناعت ملکے ست    کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را

طلبِ منصبِ فانی نہ کند صاحبِ عقل — عاقل آنست کہ اندیشہ کند پایاں را
جمع کردند و بنا دند و بحسرت رفتند — دیں چہ دارد کہ بحسرت گذارد آں را
سعدیا عمر عزیز ست بغفلت مگذار — وقتِ فرصت نشود فوت مگر نادان را

یہ کچھ اخلاقی نظمیں نہیں بلکہ عاشقانہ غزلوں سے انتخاب ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ حافظ نے صنفِ غزل کو معراجِ کمال پہ پہونچا دیا۔ آج تک ایران و ہندوستان میں فارسی یا اُردو میں حافظ کی سی عاشقانہ غزل کسی سے بن نہ آئی۔ وہ حُسن و عشق، گُل و بلبل، رندی و بدمستی کے مضامین کا بادشاہ ہے۔ وہ اسی زبان میں معرفت کے حقائق بھی بیان کر دیتا ہے۔ اسپر بھی اسکے دیوان میں کثرت سے ایسے اشعار بلکہ غزلوں کی غزلیں موجود ہیں جن میں اخلاقی مضامین با پیرایۂ مجاز نظم کیے ہیں:—

دہ روزہ مہرِ گردوں افسانہ ایست و افسوں — نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا
آسایشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است — با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
آئینۂ سکندر جامِ جم است بنگر — تا بر تو عرضہ دارد احوالِ ملکِ دارا
بحسنِ خلق تواں کرد صیدِ اہلِ نظر — بدام و دانہ نگیرند مرغِ دانا را
گرہ ز دل بکشا وز سپہر یاد مکن — کہ فکرِ ہیچ مہندس چنیں گرہ نکشاد
ز انقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ — ازیں فسانہ و افسوں ہزار دارد یاد
قدح بشرطِ ادب گیر زانکہ ترکیبش — ز کاسۂ سرِ جمشید و بہمن ست و قباد
کہ واقف ست کہ جمشید و کے کجا رفتند — کہ واقف ست کہ چوں رفت تختِ جم برباد
فردا کہ پیشگاہِ حقیقت شود پدید — شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد
تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من — پیادہ میروم و ہمرہاں سوارانند
اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی — تا راہ بیں نباشی کے راہبر شوی
از پائے تا سرت ہمہ نورِ خدا شود — در راہِ ذوالجلال چو بے پا و سر شوی
بنیادِ ہستیِ تو چو زیر و زبر شود — در دل مدار ہیچ کہ زیر و زبر شوی
وجہِ حقیقت از شود منظرِ نظر — زیں پس شکے نماند کہ صاحب نظر شوی

ہمتا ذریست از نظرِ خلق در حجاب     بہتر ز طاعتے کہ بروے ریا کنی

حافظ وفا نمی کند ایام سست عہد     ایں پنجروزہ عمر بیا تا وفا کنیم

مجو درستئ عہد از جہان سست نہاد     کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

نشانِ مہر و وفا نیست در تبسمِ گل     بنال بلبل مسکیں کہ جائے فریاد است

زراعِ برسرِ دنیائے دوں کسے نکند     بآشتی برائے نوردیدہ گوسے فلاح

دلا تو فارغی از کارِ خویش و می ترسم     کہ کس درت نگشاید چو گم کنی مفتاح

بعض پوری پوری غزلیں ہیں جنکے مضامین سرتاسر اخلاقی ہیں اور عشق و مے کا ذکر نہیں۔ مثلاً ایک مشہور غزل جسکا مطلع یہ ہے :-

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم     ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

یا وہ غزل، جسکا مطلع یہ ہے :-

روضۂ خلدِ بریں خلوتِ درویشان است     مایۂ محتشمی خدمتِ درویشان است

متاخرین شعرائے لکھنؤ جن کے روز افزوں تکلفات، موشگافیاں اور غیر ضروری پابندیاں زبان اور فن کی وسعت کو کم کرتے کرتے اسے مٹائے ڈالتی ہیں اُنکی نظر میں تو ان اشعار پر اشعارِ غزل کی تعریف صادق نہیں آسکتی۔

راسخ عظیم آبادی کے مذاقِ سلیم اور وسعتِ نظر نے ان ناجائز قیود کو قبول نہ کیا۔ شعرائے عجم کے طرز پر اس نے اپنی غزلوں میں عاشقانہ مضامین کے ساتھ اخلاقی یا عارفانہ مضامین بلا پردۂ مجاز کثرت سے نظم کیے ہیں۔ اور کلامِ راسخ کے خصوصیاتِ امتیازی میں سے یہ بھی ایک نہایت ممتاز خصوصیت ہے۔ لہٰذا ہم ایسے اشعار کا ایک انتخاب پیش کرتے ہیں یقین ہے کہ دلچسپ ثابت ہوگا :-

نقصِ عرفان ہے افراطِ تحیر کا علم     علمِ حیرت نہ ہو کر ایسی تو حیرت پیدا

کیا بیاں ہو صاحبانِ ظرف کی تاثیرِ قرب     آب کا قطرہ صدف تک آ نکہ گوہر ہوا

بے مدعا ہوں۔ یہ بھی ہے اک مدعائے دل     اس قیدِ مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

مرد ہے تو تو نہ کھا لوبیِ دنیا کا فریب     گو دکھایا کرے یہ فاحشہ جوبن اپنا

اُٹھنا اس پردے کا باقی ہے ابھی او غافل     یہ جو کہتا ہے کہ پردہ کوئی حائل نہ رہا

رشک کی جا گہ تھی جاناں اس سبکرو کا ندیم    جو کہ شبنم کی روش اس گلستاں سے اٹھ گیا
طاعت کا بدل چاہیے جنت تمہیں راسخ    تم مزد کے خواہندہ ہو مزدور ہو صاحب
راسخ اس عہد میں متاعِ وفا    کیمیا کی طرح سے ہے نایاب
روشن دلوں کا رنگ تصرف ہے دیدنی    خورشید کی نظر سے ہوا لعل ناب سنگ
راسخ وہ سعی کر کہ یہ دل آئنہ بنے    کب تک بغل میں رکھیگا خانہ خراب سنگ
فقط ہے ظلمتِ تن ہی صفاے روح کی مانع    یہ گرد اڑ جاے تو کیا آب اس گوہر میں پیدا ہو
آدمی صورت بہت ہیں لفظ بے معنی کی طرح    لیکن انساں وہ ہے جو سیرت میں بھی انساں ہو
وقتِ رفتہ کی نہ سمجھے قدر تم اے غافلو    حاصل اب افسوس سے کیا بیٹھے پچھتایا کرو
روغن ہے بہر آتشِ خشمِ خدا یہ آب    وارفتہ آبِ تاک کا تو اس قدر نہ ہو
یارو یہ سرا رہنے کی جا گہ نہیں ہرگز    کیا بیٹھے ہو دل یاں کے علاقوں سے اٹھاؤ
بہت ڈروں ہوں میں تجھ سے تو لے زبانِ دراز    مبادا شمع صفت سر مرا کٹا دے تو
ہے کارگاہِ دلکشِ عالم عجب جگہ    بے کاریاں رہا نہ کرو۔ کچھ کیا کرو
دل کی کرو سیر آنکھ کو تم موند کے راسخ ۲    اس گھر میں پھرا چاہو تو دروازہ لگا دو
وہ سعی کر کہ تجھ کو حاصل ہو دولتِ دیں    منعم متاعِ دنیا کتنی ہے؟ کس قدر ہے؟
مجھ بد رہ روش سے لی عبرت اکثروں نے    گمراہی اب تو میری یاروں کی راہبر ہے
اے غافل اس سرا کی کیا مدتِ اقامت؟    ہشیار وہ جو ہر دم آمادۂ سفر ہے
صفرا یہ وہ ہے سودا ہی جسکا ہے نتیجہ ۲    کیونکر سیہ نہ ہو دیں دل طالبانِ زر کے
فرصت یہ ہمیں کب ہے کہ ہوں بت شکن اے شیخ    در پیش ابھی اپنی رعونت شکنی ہے
محتاج کسو شے کے نہیں اہلِ قناعت    جس پاس یہ دولت ہے وہ بالطبع غنی ہے
رہ پیرو نکویاں لے قربِ حق کے طالب    ذیقدر ہو طفیلی خاطر سے میہماں کی
گنہ اک جنس ہے رہ کردہ بازارِ قبول ۲    کرم اُنکا ہے کہ وے اسکے خریدار ہوے
خار پا ہو کے نہ رہ اس چمنِ عالم میں    چاہیے یہ کہ تو سب کا گل دستار بنے
وہ کوشش کر کہ جس سے گور رشکِ قصرِ جنت ہو    نہ رکھ وارفتگی اس خاکداں کے قصر و ایواں سے

افعال ناسنجیدہ کیوں سرزد ہوں گر حاصل ہو سے    فہمِ درست اے ہمنشیں اک اور ہی میزان ہے
بخشے ہے ہر موجود کو روزی۔ کریم ایسا ہے وہ    خوانِ وسیعِ آسماں اُسکے کرم کا خوان ہے
جُرم کیونکر نہ ہو سرزد بشر آخر ہیں ہم    یہ خطا تو ہے وہ میراث کہ آبائی ہے
ہو اک جیسے قافلۂ رفتہ کا نشاں    یوں دل میں میرے داغِ غمِ رفتگاں رہے
جز خامشی ملا نہ مخاطب کوئی صحیح    ہمکو اسی سے حرف و سخن درمیاں رہے
خرد کو جانیں علتِ معرفت کیونکر ہم [illegible]    کہ کشف ایسی حقیقت کا ورائے عقلِ دانا ہے
اُٹھاویں کس روش اس بارشِ بخشش سے [illegible]    کہ ہر کانٹے سے یاں الجھا ہوا اپنا تو دامن ہے

بعض غزلیں تو ساری کی ساری اخلاق یا معرفت کے رنگ میں شرابور ہیں، مثلاً

جانیں کامل ہم اُسی عارفِ ربانی کو    واجبی سمجھے جو ماہیتِ انسانی کو
کاسۂ فقر بنا دے تو کچھ اعجوبہ نہیں    انقلابِ فلکی افسرِ سلطانی کو
روشنی [illegible] رہِ معرفت [illegible]    بلد اس راہ میں کر کثرتِ حیرانی کو
گذری کس لطف سے بے منتِ مخلوق اپنی    ہم نے سرمایہ کیا بے سروسامانی کو

---

اے وائے حزن و غم پہ اس باغ [illegible]    سروِ چمن کو دیکھیے اک آہِ بے صدا ہے
شایانِ آشنائی کوئی نہیں جز اس [illegible]    بیگانگی ہی اپنی اب ایک آشنا ہے
ہو پشت پا ہماری دنیا کی کیوں نہ [illegible]    کوتاہ دست تو ہیں ہمت ولے رسا ہے
دیتا ہے مزدِ خدمت کے نقشے [illegible]    مولا سے بندہ پرور کیا کامل العطا ہے
یہ محفلِ جہاں ہے گو عیش گاہِ غافل (ق)    عبرت سے دیکھیے تو اک مجلسِ عزا ہے
اسبابِ عیش یاں کے اسبابِ تعزیت ہیں    اُن کی نظر میں جنکی کچھ چشمِ ہوش وا ہے

---

جز درِ کعبۂ دل سر نہ جھکایا ہم نے    بابِ سجدہ اسی دروازے کو پایا ہم نے
سیمیا سازیِ اوہام سراسر ہے یہاں    اعتبارات سے دل کو نہ لگایا ہم نے
نہ چڑھی ٹک بھی نظر قحبۂ رعنائے جہاں    مبتذل تھی اسے آنکھوں سے گرایا ہم نے

[illegible]

وقت چلنے کے علاقوں کی خلش تا نہ رہے — اس لیئے ہی کو ہر اک شے سے اٹھا یا ہمنے
خواہشیں جمع تھیں دل میں سو کیا انکو وداع — کوچ سے آگے ہی اسباب لٹا یا ہمنے

---

طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں — ایسے گم گشتہ ہیں جیسے سو راہ ہے منزل نہیں
کامل اب اس عہد کے اعجوبہ رکھتے ہیں کمال — کہتے ایسے ہیں جو اپنے نقص میں کامل نہیں
عقل والوں ہی کو ہے جلوے سے اسکی رفتگی ۴ — اُس کا دیوانہ نہ ہوا ایسا کوئی عاقل نہیں
کفر ہے علمِ وجودِ غیر پیشِ حق شناس — یہ نہ ہو اسے شیخ تو پھر کفر بھی باطل نہیں
مت خیالِ این وآں کو اپنے دل میں دے جگہ — یہ تو خلوت خانۂ معشوق ہے محفل نہیں
نقش ہے آئینۂ حسنِ صورتِ نقاش کا — حیف مجنوں ہو سے لیلیٰ آفریں مائل نہیں
مرگئے ہیں طالعِ خوابیدہ راسخ کے مگر ۴ — ورنہ انکی دیدہ خوابی خواب میں داخل نہیں

---

راستی یہ ہے کہ آمر نہیں مامور ہوں میں ۴ — اس پہ مختار کہو مجھکو تو مجبور ہوں میں
جستجو میں مری مت اتنا پریشان ہو کہ آہ — تجھسے صد بادیہ اسے صوتِ جرس دور ہوں میں
اس دل سوختہ کی یہ جو ہے اک مٹھی راکھ — زور شے ہے اسی اکسیر پہ مغرور ہوں میں
نقطہ ہوں دائرۂ چرخ کا گویا راسخ ۴۴ — کیونکر اس دائرے سے نکلوں کہ محصور ہوں میں

## انتخابِ دیوان غزلیات

ہوے سب منتفع تقسیم قسامِ ازل سے پر — وہ جائے رشک ہے جس نے دل دردآشنا پایا
وہ بت آیا جو انکے پاس ایسا خوش ہوئے راسخ — انھوں نے آپ کو یوں گم کیا گویا خدا پایا
بیانِ شیشہ گر ہم سانس بھی آہستہ لیتے ہیں — کہ کارِ عشق نازک ہے بہت ان نازنینوں کا
جو تجلی ہے تری قابلِ تکرار ہے وہ — دیدۂ رغبتِ دل کاش ہو احول میرا
کب میرا خریدار ہو موجد وہ جفا کا — بندہ تو ہوں پہ ہے عیب ملے مجھ میں وفا کا
اس باغ میں ہوں میں شجرِ صفحۂ تصویر — کیا پوچھ ہو احوال مری نشو و نما کا

کیا رنگ حنا؟ نازکیِ اُس پا کی تو دیکھو — جس کے سبب اس حُسن پہ ہے رنگ حنا کا
پیری میں نہیں قابلِ تزئینِ تنِ لاغر — تہ ہوتا ہی اوسلے ہے اب اس کہنہ قبا کا
اس آب کا سائل ہے لبِ تشنۂ کوثر — رکھتا ہے گرہ میں جو یہ چھالا مرے پا کا
منظور[۵۱] نہ ہوئی دل میں کبھی میرے تمنا — اک شوق اجابت کو رہا میری دعا کا

---

دل فشارِ غم سے میرا آب سا ہو جائیگا — اسکو پانی مت کرو ورنہ ہوا ہو جائے گا
ہاں کسو کا دستگیر اب ہو کہ آخر اکدن — بے حس و بیکار یہ دستِ رسا ہو جائے گا

---

گستاخی سے بھی اپنی نکلتا ہے اک ادب — بندے نے گر قدم چھوے صاحب تو کیا ہوا

---

لاگ اُس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ — کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چُبھا ہُوا
برسوں رہا ہے صدرہ کشِ اشک واہ دل — یہ نسخہ ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہُوا

---

دل کی قیمت شکستگی سے بڑھی — قلب تھا کامل العیار ہُوا
ہے گنہ حسنِ شاہدِ رحمت — اس لیے میں گناہگار ہُوا

---

ہُوا[۵۲] دیوانہ ہر فرزانہ تیرا — بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

---

ادھر توجہ اُن کی تک اک وقتِ خشم تھی — موقوف ہے سو خشم بھی۔ اب یہ غضب ہوا

---

دل قیمتی ہوا جو شکست آشنا ہوا — یہ شیشہ ٹوٹنے سے جواہر بہا ہوا

---

۵۱ یہ مضمون شاعری میں نادر معلوم ہوتا ہے۔
۵۲ کیا زبان ہے!

بے مدعا ہوں۔ یہ بھی ہے اک مدعا دل | اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا
رکھتا ہوں دور آفت مرہم سے داغ کو | اس واسطے کہ ہے یہ تمھارا دیا ہوا
عقل والوں سے نہ آیا پیچ میں راسخ کبھی | یہ بھی اس کی ذی شعوری تھی کہ سودائی رہا
اے طبیب آہ مری رنجگی پہونچی ہے دور | میں کہاں ہوں کہ مداوا کرسے اب تو میرا (سبحان اللہ)
ٹپکے پڑتے ہیں آنسو راسخ | دل ہے کتنا گداز تیرا

اللہ ری بیساختہ رعایت

دل تو مجھ ست سے غم کا ہے دُکھ پایا ہوا | اک شیشہ یاں ہے سو بھی ٹھیس کھایا ہوا
جاؤ راسخ کی طرف صاحب کہ اب تم ہی وہ آہ | دست بر دل ہر طرف پھرتا ہے گھبرایا ہوا
جی میں ہے لاکے دکھا دیں کوئی بجھتا سا چراغ | اُنہیں احوالِ زبوں کچھ تو ہو روشن اپنا
سحاب و برق کی صحبت رہی ہم برسوں | میں اُسکے سامنے روتا تو وہ ہنسا کرتا
مرتا ہوں آہ منہ پہ کیے ہو نقاب کیا | اس واپسیں نگاہ سے میری حجاب کیا
برسوں دل و جگر کو نچوڑا ہے جبکہ آہ | آساں ہمیں ملی ہے یہ چشمِ پُرآب کیا
حیرت کی وجہ پوچھو ہو منہ کو چھپاکے تم؟ | حیراں ہوں اس سوال کا دوں میں جواب کیا
ہیبت حسن اسکا مشتاقِ نظر ہے کیسی ستوری؟ | دکھایا آپ کو اُن نے جہاں صاحب نظر پایا
ہوسے راسخ کی از خود رفتگی کے رات در پے ہم | بہت وہ دُور تھا اُسکو دو عالم سے اُدھر پایا
دلِ آباد کو دشت آنکھوں کو دریا دیکھا | اک نظر دیکھ تجھے سب نے ہی کیا کیا دیکھا
سیو مت جیبِ صد چاک اس بیاباں گرد رسوا کا | بنے تو سی دو دامن سے مرے دامانِ صحرا کا
چراغِ خانہ مت سمجھو چراغِ عشق کو راسخ | کہ اُس میں چاہیے روغن بجائے خونِ تمنا کا

میر صاحب نے بھی قریب قریب اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

چاہیے روغن دیا کیسے ہے عشق | خونِ بلبل چراغ میں گل کے

مگر راسخ اور میر کی بندش اور طرزِ بیان میں آسمان زمین کا فرق ہے۔

بڑھی ٹوٹنے سے مرے دل کی قیمت | یہ شیشہ وگرنہ بہت کم بہا تھا
نہ لاتا تھا شاہوں کو خاطر میں راسخ | سبب اسکا یہ تھا کہ تیرا گدا تھا

راسخ حجاب ہم ہی تو تھے روئے یار کے — جب بیچ سے ہم اُٹھ گئے تب وہ عیاں ہوا
ہو کے آزاد ہم آزادی کے پابند ہوئے — کیا ہوا بار علائق کا جو سر پہ نہ ہوا
بیخبر ہو، کہ دیوانوں سے نہیں کچھ پرسش — ہے وہ ناخوذ جو مغلوب ہے دانائی کا
ممتحن ہوئے اگر وہ تو قیامت ہے پھر — دعوے تم کیجو راسخ نہ شکیبائی کا
ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے — گو زمانے کو انقلاب رہا
دل پہ کیا کو فت تھی نہیں معلوم — دیدہ اپنا سدا پُر آب رہا
اس باغ میں واشد ہو کیا دل کو مرے راسخ — ہوں غنچۂ پژمردہ میں آخرِ موسم کا
کل بے نقاب دن کو وہ نازک دماغ تھا — مہر اُسکے سامنے شبِ مہ کا چراغ تھا
کیا دن تھے وے کہ مجھ سے گلِ تازہ کی روش — تم ہنس کے بات کرتے تھے میں باغ باغ تھا
ہو ضبط آب ٹوٹے ہوئے ظرف میں کہاں — دل چاک ہوگیا ہے جو آنسو رواں ہے اب
تکرار ہے فسانۂ ایام وصل کی — ہر رات ہم ہیں اور یہی داستاں ہے اب

اہل دل سے اسکا مزا پوچھو۔

بے بیچ جانیو نہ ہماری یہ رفتگی — اک جذب ہے کہ وہ طرف اپنے کشاں ہے اب
تم ہو پردوں میں بسے گل کی روش — ہم ہیں یاں در بدر صبا کی طرح
شکارِ لاغر و صیدِ زبوں ہیں ہم راسخ — عجب ہے ہوئے ہمارا کوئی اگر صیاد
ہوے مانع گر یہ راسخ کو ہم — سو وے اور روئے نصیحت کے بعد

جذبۂ حقیقی کی مصوری اسی کا نام ہے۔ سبحان اللہ!

تا خوابِ مرگ ذکر تھا اُن کا زبان پہ — نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پہ
مت کر غم بادہ کا دہن بند — ساقی دیر تو بہ ہے ابھی باز
عشق ہے حُسن طلب۔ حُسن ہے مشتاقِ نظر — ہم کو در کار ہو اب تم، تمھیں درکار ہیں ہم

کیا مضمون ہے اور کیا بندش!

کس قدر بیخودی آورد ہے تھا را آنا — جوں ہی یاں آتے ہو تم آپ سے جاتے ہیں ہم
سرسے پا تک وفا ہوئے ہو تم — کسو پہ مبتلا ہوئے ہو تم

عذر خواہی کا اب دماغ نہیں خوش رہو گر خفا ہوئے ہو تم
خاک چھنوا کے ہاتھ آئے ہو نسخۂ کیمیا ہوئے ہو تم

نقشِ قدمِ مورِ ضعیفِ سرِ رہ ہیں پامال نہ کر تو ہمیں اے چرخ کہ کیا ہم!

کیا خوب! اچھوتی بندش۔

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنسِ وفا ہم
آنے میں سدا دیر لگاتے ہی رہے تم جاتے رہے ہم جان سے آتے ہی رہے تم
خوش آتی ہیں آنسو بھری آنکھیں مگر اس کی راسخ کو جو ہر آن رلاتے ہی رہے تم

خوش ہیں ہم اس سے کہ باہم درمیاں وعدہ تو ہے یہ جو محشر کا کرو ہو وعدۂ دیدار تم
تمھاری التفاتِ خاص ہی وجہِ جنوں تھی یاں تماشا ہم نہ بنتے گر تماشائی نہ ہوتے تم
دلیلِ فہم و دانش ہے یہی دیوانگی راسخ نہ عاقل ہم تمھیں کہتے جو سودائی نہ ہوتے تم
مجھ سے وابستہ ہے جلوے کی تمھارے رونق میں سیہ بخت بھی ظلمت ہوں اگر نور ہو تم

نادر کلام ہے!

ہنروالوں ہی سے یہ کارگہ پُر ہے مجھے لیکن یہی دو کام آتے ہیں کہ روؤں یا رلاؤں میں

خوب!

بازارِ حسن میں کوئی خواہاں نہیں مرا بکتا ہوں اک نگاہ پہ تسخیر گر ہوں میں
دل جس نے لیا اور تھا وہ دیکھنے کا ڈھب وے ڈول نکلتے نہیں اب تیری نگہ میں
دل خانۂ صنعت ہمارا فضا ہے کیا کیا رکھی ہیں وسعتیں تھوڑی سی جگہ میں

جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں
نالے محشر بدوش ہیں اب شورہ ان کا ہے چرخِ ہفتمیں میں
راسخ کو تم نے مار رکھا بس ایک نگاہِ شرمگیں میں

شیخ تیرے فہم کے تارِ عقد کی گرہ گر کھلے تو سبحہ و زنار دونوں ایک ہیں
دیکھ کر زخمِ جگر میرا سراہیں ہیں لوگ میں سراہوں ہوں تمھاری نمک افشانی کو
قتلِ موعود کی حسرت میں تھے اہلِ نیاز ہمنشیں شکر تو کر ناز کی طغیانی کو

جانیو سہل نہ اس رونے لگانے کے تئیں قلب پانی ہوا تب یہ ہنر آیا ہم کو

کب سرد کنِ آتشِ دل آہ حزیں ہو ڈرتا ہوں ہوا وجہ ترقی نہ کہیں ہو

بے لطف حیات اسکی ہے عشاق میں جو آہ نے قہر کی شایاں ہو نہ شایستۂ کیں ہو

راسخ ہمہ تن ذوق ہیں وے جنکے پھنسے دل لذت ہے اسیری کی تم آگاہ نہیں ہو

تن لاغر میں تپِ عشق چھپاؤں میں بھی خس میں آتش کو اگر کوئی چھپا رکھتا ہو

لذتیں غم کی ترے ہوجیو راسخ پہ حرام دل میں کچھ اور اگر غم کے سوا رکھتا ہو

ہے سبب طولِ امل کا یہی اک تارِ نفس سارے الجھاؤ ہیں وابستہ اسی تار کے ساتھ

وہ تو پابندِ وفا ہے نہ لڑو راسخ سے ہر دم الجھا نہ کرو اپنے گرفتار کے ساتھ

ہمیں تحریکِ آہِ سرد نے اکثر رلایا ہے چلی ہے جب یہ ٹھنڈی باؤ تب مینھ خوب آیا ہے

دلِ تنگ اپنا وسعت کتنی رکھتا ہے یہ کیا جانوں پر اتنا جانتا ہوں میں کہ تو اس میں سمایا ہے

پڑی ہے چشمِ سوزن بھی نہ زخمِ تیغ پر اس کے اسے نامحرموں کی آنکھ سے ہم نے چھپایا ہے

طرزِ نگہ تمہاری جوں سحر کارگر ہے ٹک اس طرف تو دیکھو صاحب یہ کیا نظر ہے!

مغلوبِ عقل کب ہوں مجنونِ عشق تیرے جو لٹ گئے انہوں کو رہزن کا کیا خطر ہے

لے میرا شیشۂ دل پھر اور مانگتے ہو پہلوے بیدلاں کیا دکانِ شیشہ گر ہے؟

یاقوت ہیں یہ ٹکڑے مرے جگر کے نکلے ہیں کیا جواہر کیسہ سے چشمِ تر کے!

ہم مشتِ خاک گویا بازیچۂ یار کے ہیں اکثر ہمیں بنایا اکثر مٹا دیا ہے

بنیاد ہے قیامت حسن افسانۂ عاشقی کا سنے والے اکثروں کو اپنے سلا دیا ہے

سبحان اللہ!

کوئی وجہ نہ زباں پر جو موجود دل میں راسخ اس آئینہ نے کچھ تو انکو دکھا دیا ہے

دل وا نہ ہو گر آہوں کی تکرار نہ ہووے وہ خانۂ قفس ہے جو ہوادار نہ ہووے

جنس وہ ہوں پہ ہے حیف کہ مجھ میں بھی راسخ اغلب ہے مرا کوئی خریدار نہ ہووے

حالِ دلِ شکستہ تم بن یوں ہے کہ جیسے ہیئت بگڑ گئی ہو ٹوٹے ہوئے مکاں کی

نزدیک ہے کہ ہووے بے طاقتی بھی رخصت طاقت ہے ایسی زائل اب تیرے ناتواں کی

[illegible]

جنس اعلیٰ ہو دل اور اُسکا خریدار افسوس — مفلس ہے، مرتبہ نافہم ہے، بازاری ہے
ہے وہ بہر تو پتھر اُسے چاہو ہو واہ — راسخ ایسا یہ تمھیں شیشۂ دل بھاری ہے؟

قابلیت ہی ذاتی کفر کے رتبے کی ہیں — سعی کی لیک نہ شائستۂ زنار ہوئے
ہو کیا نقش محبت ہو کہ ارباب وفا — جتنے مٹتے گئے اُتنے ہی نمودار ہوئے

ہوئی منزل رساں شور جنوں کی رہبری آخر — پہونچ سکے تا در دل ہم رہ چاک گریباں سے

شوق چاہے ہے بنے افسانہ راز عاشقی — حکم غیرت ہے کہ دل سے بھی چھپایا چاہیے
آپ کو کھو بیٹھے راسخ جستجوئے یار میں — وے گئے گذرے اب اُنسے ہاتھ اٹھالیا چاہیے
کچھ کمی سوزش دل میں تھی سو گریہ سے بڑھی — آگ بجھتی ہوئی اس پانی نے سلگائی ہے

دل میں غموں کا جوش ہے۔ کیا حزن کیا طغیان ہے! — دریا چڑھا آتا ہے کچھ تم بن تو اک طوفان ہے
ہے اس میں فوت مدعا۔ وجہ حصول مدعا — یہ کار عشق و عاشقی سخت بھی آسان ہے
حسن سراپا بھی ترا ہرچند دلکش ہے بہت — پر جی کی جس سے لاگ ہے وہ اور ہی کچھ آن ہے
اے دیدۂ خونبار ہو کس رنگ تیر اشکر ادا — لالہ کا تختہ جیب ہے صحن چمن داماں ہے
نام دوا راسخ نہ لو گر چاہتے ہو درد عشق — یہ درد وہ اُسے دیتے نہیں جو طالب درماں ہے

اپنا جو مایہ ہے سو یہی دل جلا ہوا — اک چٹکی راکھ پاس ہے اس خاکسار کے
نازک بہت ہیں گرچہ وہ تار نگہ ولے — چھوٹے چھڑے ہوسے نہ کبھی ایسے تار کے

ہے آرزو کہ چاہت سرگرم کار ہووے — ہوں لب پہ سرد آہیں چشم اشکبار ہووے
اندھیر ہے اگر ہم اس مہر کو نہ دیکھیں — ہر ذرہ جس کے رُو کا آئینہ دار ہووے
دل کا ثمر رکھے ہے کیا کیا نہ قابلیت — ان تربیت کر اسکو تا داغدار ہووے
گلہائے داغ جاناں لے جاؤ ساتھ راسخ — تا گور میں تمھاری باغ و بہار ہووے

شب جو وہ آئے تو آنکھیں نیچی شرمائے ہوئے — بات کیسی اسکی تو گویا قسم کھائے ہوئے
خوف ہے افشائے راز عشق کا ہم کو زبس — آنسو پی جاتے ہیں ہم پلکوں تلک آئے ہوئے

حقیقت دیدہ و دل کی مرے پوچھیں جو شے قاصد — تو رو رو کر یہ کہیو ایک صحرا ایک وادی ہے

قرب اپنے دل کا اسکی چشم سے ہے دیکھ دلجوں — پاس اسکے جیسے بت کے خوار دوری ہے

مورد رحمت تو اے راسخ خراباتی ہی ہیں  مے سے تو بچنے کیوں کی؟ پارسا تم کیوں ہوئے؟

لبریز مئے عشق ہو ا ٹوٹ گیا جب  تھا ورنہ بغل میں مرے دل شیشۂ خالی

ہے محل عشق کے بوکرنے میں تاثیر عجب  روح بالیدہ ہو تن سوکھکے کانٹا ہووے

ہوئے ہیں پیر ہم اب وہ نئی رونا ہمارا ہے  پلک پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارا ہے
خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ  خوشا وے اہل دل جن پر نہاں بھی آشکارا ہے
شروع عشق راسخ کہتے ہو جاتا ہے جی ڈوبا  کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے

تمہیں گل کی جنے بنایا یوں کہا اسنے مجھسے صبا ہے تو  رہے تم تو پردہ نشیں سدا مجھے آہ دربدری رہی
نہیں ہوش مالوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہو تو انھوں پہ پر  جنھیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بیخبری رہی
مجھے سونپ داغ فراق وے ہوئے یوں جدا کہ نہ پھر ملے  مرے دل میں تا دم واپسیں وہ امانت انکی دھری رہی
نہ تھا چشم راسخ خستہ دل کبھو خالی اشک سے دوستاں  شب و روز جام پر آب کی روش آنسوؤں سے بھری رہی

خودی میں انکی رفتہ ہی سے ہر زماں رہے  وے جو گئے تو ہم بھی گئے۔ ہم کہاں رہے
کیا جانیں دیکھکر انھیں کیا ہوتی اپنی شکل  کچھ مصلحت ہی تھی جو وے ہم سے نہاں رہے
ہو آنکھ جیسے قافلۂ رفتہ کا نشان  یوں دل میں میرے داغ غم رفتگاں رہے
کیا چوٹ دل پہ تھی کہ موئے پر بھی دیر تک  راسخ کی آہ آنکھوں سے آنسو رواں رہے

مجھے سن فسردہ مزاج ساتھ بہار کی روش آ گئے  دلِ آگ کرگئے مشتعل گھٹی سوزشوں کو بڑھا گئے
کوئی عضو اس سے لذیذ تر : تھا میرے جسم نزار میں  ہے یہی سبب کہ تمہارے غم دل دردمند کو کھا گئے
ہے بیخودی کا نشا ہو بلند آستانۂ یار کا  بہت آپ سے گئے دور ہم و لے شکر ہے کہ بچا گئے
مجھے ایک جھلکی سی کچھ دکھا ہنسے اس طرح کہ رلا دیا  نظر آنے کیوں مجھے برق ساں نمط ابر کی جو رلا گئے
عبث اس سے بیٹھے ہو دل لگا چلو راسخ اب کہیں یاں سے تم  روش ان عزیزوں کی خوب تھی جو دل اس چمن سے اٹھا گئے

اس شہر نگیں نگر سے جگر سب فگار ہے  واں تیر نگہ کش ہے پیکاں دل کے پار ہے
دل پہ جو چوٹ ہے اسے کیونکر دکھاؤں میں  آنکھیں تو اشکبار ہیں یہ آشکار ہے
ملے جا تو آنکر مجھے پیش از وداع یار  ملے بیخودی پہونچ کہ تر انتظار ہے
دم ہی فقط رہا ہے تن ناتواں میں آہ  جامے میں اپنے ایسے ہیں ایک تار ہے

عشق میں ہے آبرو اس دیدۂ تر سے مجھے — ہے عزیز آنسو کا اک اک قطرہ گوہر سے مجھے
اے بے صبری تو دیکھیو ہی جو دوری کے سبب — اُن سے کہتا ہوں ملا دو میرے دلبر سے مجھے
سربازارِ وجود آپ سے آیا نہیں میں — جلوہ دکھلانے کو اپنا کوئی لایا ہے مجھے

جو بندہ کہ رحمت کا سزاوار نہیں ہے — اُسکا یہ گنہ ہے کہ گنہگار نہیں ہے
مت ہمکو ڈرا اس سے گذر جائیگا زاہد — دن حشر کا فرقت کی شبِ تار نہیں ہے
کس طرح یقیں آئے مجھے آنے کا تیرے — اک بار اگر ہاں ہے تو سو بار نہیں ہے
ہوں شعلۂ تصویر و چراغِ شبِ مہتاب — جلنے سے مرے کوئی خبردار نہیں ہے
اے شیخ حرم فرقۂ پندار سے تیرے — وہ کون سا ہے تار جو زنار نہیں ہے
تھی دید کی رخصت تو نہ تھی طاقتِ دیدار — طاقت ہے تو اب رخصتِ دیدار نہیں ہے
ہیں پست و بلند اس میں بہت دیکھیو راسخ — رہ عشق کے ویرانے کی ہموار نہیں ہے

آنکھوں میں نور آگیا یوں دیکھ اُسکا نور — روشن چراغ جیسے کہ ہووے چراغ سے
راسخ گدا ہے یا یہ کوئی بادشاہ ہے؟ — بیٹھا ہے خاکِ کو پہ ترے کس فراغ سے

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے — دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے
ہونٹھ ہیں سوکھے تر ہیں آنکھیں زرد ہے چہرہ راسخ آہ — بندے سے صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہے

مقیم کعبہ کب ہوں جانے والے کعبۂ دل کے — اقامت راہ میں کرتے نہیں مشتاق منزل کے
کروں کیا شرح محرومی کو اپنی آہ میں وہ ہوں — کہ ڈوبی ہے مری کشتی پہونچکر پاس ساحل کے
وہ مایہ دار اے ابرِ تر اپنی چشم گریاں ہے — کہ ہے جو اشک کا قطرہ گرہ میں اسکی طوفاں ہے
کسو سے مجھکو فنِ شعر میں دعوے نہیں راسخ — کسو کو مجھسے گر ہووے تو یہ گو ہے یہ میداں ہے

(باقی آئندہ)

محمد مسلم (عظیم آبادی)

# شب غربت میں چاند سے دو دو باتیں

اے خوبرو شناور دریا بیکراں کے — اے دائمی مسافر صحرائے آسماں کے

اس دہر کے شبستاں کا اک چراغ ہے تو
یا محفلِ فلک کا سیمیں ایاغ ہے تو
شاہنشہِ جہان حسن و جمال ہے تو
حسن ازل کا نقش لا یزال ہے تو
چشمِ جہاں کی ٹھنڈک ملے ماہتاب ہے تو
بس مہر گرم خو کا پورا جواب ہے تو
لہرا رہا ہے جو میں اک نور کا سمندر
محفل میں چل رہا ہے تیرے کرم کا ساغر
تیری ضیا کی بارش ہے مزرعِ جہاں پر
جوبن برس رہا ہے کیا خاک گلستاں پر
ہے جلوہ ریز تیرا نور جمال کیا کیا
ہر ذرہ باغِ عالم کا ہے نہال کیا کیا
ساقی ہے تیری مے کا اک تشنہ کام ادھر بھی
صدقے ترے کرم کے۔ ہاں ایک جام ادھر بھی

رہتا ہے اسے جہاں گرد پاؤں میں تیرے چکر
ہوتا ہے تیرا پھیرا ہر ایک بحر و بر پہ
ہاں اے رفیقِ شب۔ اے بیتابیوں کا شاہد
اے چاند تو ہی بجا پیغام دل کا قاصد
اے چاند تو نے دیکھا ہے منہ کا اُٹھنا
دیکھا ہے تو نے میرا مرمر کے صبح کرنا
اُس ماہرو سے اپنی اللہ رے بُعدِ منزل
آہوں کی بھی رسائی اُس تک ہے سخت مشکل
مرغِ صبا کی ہرچند مشہور ہے روانی
بھولا ہوا ہے وہ بھی یاں اپنی پرفشانی
کیونکر اُسے دکھاؤں سوزِ غمِ نہانی؟
کیونکر اُسے سناؤں دُکھ درد کی کہانی؟

ہے کون اپنا محرم اور اس حصۂ جہاں میں
اک ذاتِ مشترک بس تو ہی ہے درمیاں میں
تو چشم دور بیں سے عالم کو دیکھتا ہے
تو اُسکو دیکھتا ہے، تو ہم کو دیکھتا ہے
وہ ماہرو بھی مائل تیری طرف۔ سبب کیا؟
وہ دیکھتا ہو تجھکو میری طرح۔ عجب کیا؟
منہ دیکھتے ہیں دونوں اک آئینہ میں گویا۔
ہے تیرے دم سے ہم میں شکل خطاب پیدا

اے جانِ تیرے لب پر ہرچند ہے خموشی
ظاہر ہے لیکن آنکھوں سے دل کی گرمجوشی
ضبطِ فغاں کی کوشش چہرے سے ہے ہویدا
بیتابی تکلّم جنبش سے لب کی پیدا
چہرے پہ ہے جو تیرے چھائی ہوئی اُداسی
آتی ہے اس سے مجھ کو شکوے کی کچھ صدا سی
بس بس وہ دیکھ مجھ کو حسرت بھری نظر سے
بس بس نہ چھین میرا صبر اپنی چشمِ تر سے
آنکھوں پھرے ہے گھڑیاں گننے سے کام مجھکو
ہجرِ تیرے زندگی ہے حبسِ دوام مجھکو
وہ پاسے بندِ تبدیل و نسا رہوں میں
بے بس ہوں، مضطرب ہوں، سب تجھیا ہوں میں
قسمت کی یاوری سے مینا اگر یہ ٹوٹے
پھر دستِ آرزو سے مقصد اپنی تمنا چھوٹے
اب تجھ سے دُور ہر گز گشت آزمانہ ہونگے
رہنا گواہ اے چاند پھر ہم جدا نہ ہونگے

محمد مسلم (عظیم آبادی)

# زار زار

(سلسلہ ماہ گذشتہ)

۱۵- مارچ ۱۹۱۷ء سے اخباروں میں رویٹر روس کے متعلق متوحش خبریں دینے لگا- ۱۱ لغایتہ ۲۵ مارچ کے تاروں کا خلاصہ یہ ہے کہ "زیادہ برف باری سے سامان خوراک کا قحط پڑ گیا اور اس سے پتروگراڈ یعنی سینٹ پیٹرز برگ کے باشندوں میں خوف پھیل گیا اور اُنھوں نے خوراک کے ذخائر پر حملہ کرکے اُنھیں لوٹ لیا - اس گڑبڑ کو روکنے کا کافی انتظام کیا گیا - سرکاری اطلاعات مُظہر ہوئیں کہ روس میں خوراک کی کمی نہیں ہے صرف اُسکی روانگی کے انتظامات میں فرق پڑ گیا جس سے رسد میں بیقاعدگی واقع ہوگئی اور وہ بھی خاصکر پایۂ تخت میں جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بےچینی پھیل گئی - لیکن یہ بھی انقلابی تحریک کے آثار نہیں معلوم ہوتے - لیکن رعایا سخت مصیبت میں تھی - تین دن رات برابر تندوروں کے سامنے بھوکے مرد و عورت اور بچوں کے گروہ جمع ہوتے رہے - سخت کُہر میں ان لوگوں کو پانچ پانچ گھنٹے برابر کھڑا رہنا پڑا لیکن اُنھیں خوراک نصیب نہ ہوسکی اور اکثر بے نیل مرام گھروں کو واپس ہوے - آلو پہلے سے آٹھ گُنی قیمت پر فروخت ہو رہے تھے - یہی حال دیگر ضروریاتِ زندگی کا تھا وزیر داخلہ ایم پروٹوپوپاف اس بےچینی کی طرف متوجہ نہ ہوا - ایم روڈزیانکو نے رسد کے متعلق ایک کانفرنس منعقد کی جس میں وزیر داخلہ کی موجودگی ضروری تھی لیکن وہ حضرت غیر حاضر تھے اور زارینہ کے محل میں کشف و کرامات کے شعبدوں میں دل بہلا رہے تھے جب یہ حالت ہو تو کچھ عجب نہیں کہ رعایا میں بدظنی اور سرکشی کا جذبہ سرایت کر گیا - یہ چنگاری ۱۰ مارچ کو پیدا ہوئی ۱۱ مارچ کو سُلگتی رہی، اور ۱۲ مارچ کو بھڑک کے لپٹیں نکلیں گلیوں میں سپاہی سپاہی اور رعایا سے لڑنے لگے - حتیٰ کہ محافظ اور بحری فوجیں انقلاب پسندوں سے جا ملیں - پولیس نے لوگوں کے مجمع پر آتشباری کی لیکن فوجوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ وہ اس بات سے بگڑ گئے اور دونوں میں خون ریز لڑائیاں ہوئیں - پولیس کے بہت سے تھانے اور سراغرسانی کے مقامات جلا دیے گئے - اور اُن مقامات کے ساتھ اچھے اچھے کتبے اور بڑے بڑے آدمیوں کی یادگاریں سب آگ کی نذر ہوگئیں - ڈوما اور سلطنت کی کونسل کے اپریل تک ملتوی کیے جانے

کے شاہی احکام صادر ہوئے لیکن ڈوما اتوار اور پیر کو ان احکامات کی پرواہ نہ کر کے منعقد ہوتی رہی۔ صدر ایم روڈزیانکو نے زار کو مفصل حالات سے بذریعہ تار مطلع کیا اور درخواست کی کہ گورنمنٹ تبدیل کیجائے اور کوئی معتمد شخص وزیر اعظم مقرر کیا جائے۔ اور آخر میں اُس نے لکھا کہ اب دیر ناممکن ہے، ذرا سی دیر موت کا حکم رکھتی ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ ذمہ داری جو خالص ہم لوگوں کی ہی ہے تاجپوش سر (یعنی خود زار) پر نہ پڑے۔ اسی طرح صدر نے میدان جنگ کے سپہ سالاروں کو تار دیے جنھوں نے ڈوما سے اتفاق رائے کیا جنرل بروسیلاف اور جنرل رسکی نے جواب دیے کہ اُنھوں نے کُل حالات کی اطلاع زار کو کردی ہے۔ صدر نے زار کو پھر تار دیا کہ حالت نازک ہوتی جا رہی ہے اور سخت تدابیر کی فوری ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ کار پیغروا بعد از وقت ثابت ہوگا۔ آخری ساعت آگئی ہے جس پر ملک اور حکمران خاندان کی آیندہ قسمتوں کا فیصلہ منحصر ہے"۔ فوج کا ایک ڈیپوٹیشن مسلح شہریوں کے ہمراہ ڈوما کی عمارت پر حاضر ہوا اور سرکاری عمارات اور قید خانے سب رعایا نے قبضہ میں کر لیے۔ سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے قلعوں پر بھی وہ متصرف ہوگئے۔ اور ایم نوم، ایم سخالیناف، ایم پروٹوپوپاف وغیرہم وزرائے سابق گرفتار کر لیے گیے۔ کیونکہ رعایا کو انپر اشتباہ تھا کہ ملک میں قحط خوراک اور جنگ کی شکستیں انھیں کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ ایک قومی کیبنٹ بنائی گئی جسکے وزیر پرنس لواف قرار دیے گئے۔ ڈوما کے نقیبوں نے ڈوما کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو ہو کے فوج کو اتحاد اور جوش کی ہدایات کیں۔ انقلابی تحریک پایۂ تخت سے نکل کے ماسکو، کرانسٹاٹ، خارخاف، نجنی نوگراڈ، غرضکہ سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ گرانڈ ڈیوک نکولس نے بھی زار سے درخواست کی کہ وہ وزارت کو تبدیل کر دیں اور ملک اور خاندان کو تباہی سے بچا لیں کیونکہ اسی میں فتح و نصرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ جب اُسے وزراء کی گرفتاری اور اُنکے استعفوں کا حال معلوم ہوا تو اُسنے جنرل الگزیف کو حکم نیا کے بھیجا۔ لیکن اب واقعات و صورت حالات میں وہ سرعت رونما ہوتی کہ زار کو ڈوما کا آخری حکم تسلیم کرنا اور تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ایم ملیوکاف وزیر خارجہ نے جسکے بھیس میں بغاوت کی تقریر کرائی گئی تھی اعلان کیا کہ تخت برداری قطعی ہے اور محض عارضی طور پر امور سلطنت کا انتظام گرانڈ ڈیوک مائیکل الگزنڈروچ کو تفویض کیا گیا ہے۔ ۱۴ مارچ کو زار پسکاف میں آیا اور ۱۵ کی صبح کے ۱۰ بجے جنرل رسکی سے کہا کہ میرا ارادہ اب ملک کو ایک ذمہ دار گورنمنٹ دینے کا ہے اور اسکا اعلان میز پر رکھا ہے۔ ۲ بجے جنرل رسکی نے ایم روڈزیانکو سے

تار میں بات چیت کی۔ جسنے جواب دیا کہ زار کو تخت سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ اسی طرح اُسے گرانڈ ڈیوک نکولس اور بڑے بڑے سپہ سالاروں کے پیام موصول ہوئے۔ جنرل رسکی نے یہ پیغامات زار کو پہونچا دیے اور ملک کی فلاح اور جنگ کی فتح کی خاطر اُسنے زار سے عمل پیرا ہونے کی درخواست کی۔ زار نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا لیکن ایم روڈ زیانکو کی موجودگی کی ضرورت ظاہر کی۔ جس نے تار دیا کہ وہ پٹروگراڈ سے نہیں آسکتا۔ زار نے تیسرے پہر جنرل رسکی کو طلب کرکے دست برداری کا تار دیا تاکہ وہ پٹروگراڈ روانہ کردے۔ جنرل رسکی نے اُسکی روانگی میں اسلیے تاخیر کی کہ ایک قدامت پسند قائم مقام وہاں آنے والا تھا۔ اسپر زار کو بہتری کی کچھ صورت نظر آئی۔ سفراء نے رات کے ۱۰ بجے حالات کی اطلاع کی۔ زار کو اپنے باڈی گارڈ کے بھی باغیوں سے مل جانے کا بڑا رنج ہوا۔ اسپر اُسنے گرانڈ ڈیوک مائیکل کے مقابل دست برداری پر آمادگی ظاہر کی اور ایک نیا کاغذ لکھنے لگا۔ دس منٹ تک خاموشی رہی۔ اس عرصہ میں ٹائپ کا مسودہ طیار ہوتا رہا۔ زار نے اُسپر دستخط کیے اور اسکے بعد اُسکے ایڈیکانگ بیرن فریڈرکس نے کیے۔ آدھ گھنٹے بعد زار کی ریل صدر مقام کو روانہ ہوئی۔ دست برداری ایک تار کے فارم پر گنجان ٹائپ شدہ تھی۔ زار دریائے نیپر پر موگیلف میں آیا۔ وہاں کچھ عرصہ تک رہا۔ یہاں اُسکی بیوہ ماں اُس سے آکر ملی اور پھر خیف کو چلی گئی۔ زار کی دستکشی کا اعلان عوام اور فوج کو سنایا گیا اُسکا مضمون حسب ذیل تھا:۔

"دشمن کے خلاف سخت جنگ کے دَوران میں جو تین سال سے ہماری آزادی اور ہمارے ملک کے سلب و غصب کرنے کی اُدھیڑ بُن میں لگا ہوا ہے، خدا نے ہماری آزمایش کے لیے ایک جدید سلسلہ اندرونی بےچینی اور تکالیف کا پیدا کر دیا ہے۔ جس سے جنگ کے آخری فیصلہ اور رُوس کی قسمت پر بُرا اثر پڑنے کا اشتباہ ہے۔ روس کی دلیر سپاہ کی عزت، اُسکی رعایا کی فلاح، اور ہمارے پیارے وطن کا مستقبل اسکا متقاضی ہے کہ لڑائی بہرطور فتح پر ختم کی جائے۔ ظالم دشمن اپنی آخری کوشش کر رہا ہے اور وہ وقت قریب ہے جبکہ ہماری بہادر قومیں بلند پایہ اتحادیوں سے مل کے دشمن کو ہمیشہ کیلیے مغلوب کرلیں گی۔ روس کی زندگی کے ان فیصلہ کن ایام میں ہم اپنی رعایا کی خاطر فتح عاجل کے حصول کیلیے تمام شعبوں اور انتظاموں میں ربط و اتحاد قائم کرنا اپنا فرض منصبی تصور کرتے رہے۔ اسلیے ڈوما کی خواہش پر ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں کہ تخت سے دست بردار ہوکے اپنے اختیارات سے عاری ہو جائیں۔ ہم

پایۂ تخت جگر سے جدا ہونا نہیں چاہتے اس لیے اپنے بھائی مائیکل کو اپنا تخت و تاج بہترین دعاؤں اور برکتوں کے ذخیرہ میں وصیت کرتے ہیں۔ ہماری یہ بھی اپنے بھائی کو نصیحت ہے کہ وہ اس ملک پر قومی قائم مقاموں کے ساتھ مل جل کے حکومت کریں اور اسکے لیے قسم اٹھالیں۔ ہم کو ملک کے کل وفاشعار فرزندوں سے امید ہے کہ قومی آزمائشوں کے تکلیف وہ وقت میں زار کی اطاعت کرنے اور اسکو قومی قائم مقاموں کے ساتھ روسی حکومت کو فلاح و بہبود کے منازل میں رہبری کرتے ہوئے مدد دینے کو اپنا مقدس فرض اور حب الوطنی تصور کریں گے۔"

زارینہ اپنے خاص محل زارسکو سیلو میں تھی جب کارنیلاف اسکی نظربندی اور معزولی کی خبر کے لیے گیا۔ زارینہ سیاہ لباس میں اپنے پرائیوٹ کمرہ میں تھی۔ اُسنے کارنیلاف سے قدم رنجہ فرمانے کی وجہ دریافت کی اُس نے جواب دیا کہ میں عارضی حکومت کا فیصلہ آپ کو سنانے آیا ہوں۔ وہ بولی کہ آپ کہے جائیے میں سن رہی ہوں۔ اسپر کارنیلاف نے وہ فیصلہ پڑھ کے سنایا جس میں اُسکی آزادی سلب کیے جانے اور پہلے محافظ پہرہ کو ہٹا کے محل پر سخت فوجی پہرہ قائم کیے جانے کا حکم درج تھا۔ زارینہ نے اُس سے التجا کی کہ اُن نوکروں کو جو اُسکی عادات سے واقف ہیں علٰحدہ نہ کیا جائے کیونکہ اسکے بچے بھی ہیں خاصکر زارو چ سرجنٹ بریونکو سے پلا ہوا ہے۔ کارنیلاف نے جواب دیا کہ اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ یہ کہکے وہ رخصت ہوا۔

گلیلاف میں زار اپنی ٹرین میں آرام کر رہا تھا کہ ایلچی پہونچے۔ اور اُنھوں نے جنرل الگزیف کو زار کی گرفتاری کا فرمان حوالہ کیا۔ اُسنے زار کو اسکی اطلاع کی۔ جس نے جواب دیا کہ میں ہر جگہ جانے اور ہر فیصلہ سننے کے لیے طیار ہوں۔" بہت بڑا مجمع زار کی روانگی کو سکون و حسرت سے دیکھتا رہا۔ اُسکی بیوہ ماں اور افسروں نے اسے الوداع کہی۔ صبح کے ۹ بجے ریل سوسا سینو میں آئی۔ وزار جگایا گیا۔ دس بجے وہ کھانے کے کمرہ میں گیا۔ جہاں اپنے ہمراہیوں کو اس نے شریک قہوہ ہونے کو کہا۔ گھنٹہ بھر کی گفتگو کے بعد اس نے اپنے جلو کے ہمراہیوں اور ملازموں کو کہا کہ میں آپ لوگوں کی خدمات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" لو خدا حافظ!"

اس نے ان سب کو بوسہ دیا! آہ! یہ پُر درد ناک نظارہ تھا۔ زار کو کندھا دیکے ریل میں چڑھایا گیا۔ وہ کاسک کی وردی میں تھا۔ جب وہ زار اسکو سیلو پہونچا اُسکے چہرہ پر نقاہت برستی تھی۔

یہ داستان بے شک عبرت انگیز ہے، سادہ واقعات لفاظی اور رنگینی کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہیں - زار خواہ قوتِ فیصلہ میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو لیکن حب الوطنی کا جذبہ اس میں بدرجہ اتم تھا۔ اگر وہ چاہتا تو محمد علی شاہِ ایران کی طرح ملک میں فتنہ و فساد پھیلنے دیتا اور انقلاب پسندوں کا بھی توڑ کے مقابلہ کرتا - دست برداری کا جو اعلان اُس نے شایع کیا ہے وہ اور دیگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ وہ جنگ کا خاتمہ فتح پر چاہتا تھا اور دل سے جنگ کا حامی تھا - لیکن عیار دشمن نے اُس کے ارد گرد دغاباز وزیروں کا مجمع کر دیا تھا - جس نے بلطائف الحیل زارینہ کو گانٹھ کے زار پر اثر ڈالنا چاہا۔ دوسری طرف رعایا میں انقلاب کی تحریک پیدا کی - اور کرنسکی، ٹراٹسکی اور لینن کو بڑھاوے دیئے کہ وہ قومی ترقی کی گاڑی کو ایسی رفتار اور ایسے طریقے سے چلانے لگے جس سے اُسکا پُرزہ پُرزہ ہوجانا یقینی تھا - زار کے عزل سے جرمن کو مسرت ہوئی - چنانچہ چانسلر نے رشٹاگ میں اس واقعہ کے بعد ہی جو تقریر کی ہے، اسکی کافی تائید کرتی ہے - اُس نے کہا کہ موجودہ جنگ میں روس کے واقعات سب سے زیادہ نمایاں ہیں - جہاں تک ہمیں علم ہے زار اپنے ہی الم خیز جرم کا شکار ہوا ہے - زمانہ قدیم سے روس اور پروشیا قابل یادگار اتحاد و یکجہتی کی رسیوں میں مربوط رہے ہیں لیکن روس کے حکمراں خاندان میں یہ اتحاد الگزنڈر ثانی کے ساتھ دفن ہوگیا - موجودہ زار نے پچھلے سو سال کے دوستانہ مراسم کو جو دونوں ہمسایہ ملکوں میں قائم تھے اور اُن فوائد کو جو دونوں کے اتحاد سے وابستہ تھے قطعاً فراموش کر دیا اور اتیلاف ثلاثہ کے پیچھے پیچھے لگ لیا اور آخر میں حکمراں جنگی پارٹی کے ہاتھوں میں ایسا آ رہا کہ جولائی ۱۹۱۴ء کے اہم دنوں میں اس نے قیصر کے سالہا سال کی پرانی دوستی یاد دلانے کے اپیل کو بالکل نہ سنا - ہمارے دشمنوں کا یہ ایک خاص مشغلہ ہے کہ وہ جرمن گورنمنٹ کے متعلق مشہور کرتی رہی ہے کہ وہ رجعت پسندانہ اور شخصی حکومت کی مؤید ہے - حالانکہ سال بھر ہوا میں نے رشٹاگ میں صاف صاف کہدیا تھا کہ یہ الزام مطلق واقعات کے خلاف ہے - جب ۱۹۰۵ء میں روس بوجہ جنگ جاپان اور ملکی بغاوتوں کے سخت رنج و اندوہ میں مبتلا تھا تو یہ قیصر ہی تھے جنھوں نے زار کو نصیحت کی کہ وہ رعایا کے جائز مطالبہ کی مخالفت نہ کریں - موجودہ جنگ میں زار نے وہ رویہ اختیار کیا جس سے نہ ہمارے ملک کو اور نہ اُسکی سلطنت کو کچھ فائدہ پہونچ سکتا تھا - اگر روس اپنے اندرونی انتظامات میں ہی مصروف رہے تو اُسکو اتنی فرصت نہ ملے کہ وہ توسیع سلطنت کے خواب دیکھے جس نے اُسے موجودہ عالمگیر محاربہ میں ایسا مبتلا کیا کہ برا انجام

نظام حکومت از سرتا پا اس طرح بدل گیا کہ آدمی معزول خاندان شاہی کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کے لیے کافی طریقہ نہیں پاتا۔ کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ روس کے متعلق ہمارا طرزِ عمل بالکل صاف اور مقرر ہے۔ ہم دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کا طریقہ جاری رکھیں گے (نعرۂ مسرت) بد باطن طبقے ایسی فرضی خبریں مشہور کرتے پھر رہے ہیں کہ جرمنی روسی قوم کی حاصل کردہ آزادی کو ملیامیٹ کرنا، اور قیصر زار کو تخت واپس دلانا چاہتا ہے۔ میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ یہ سراسر کذب و دروغ ہے۔ روسی قوم اپنے ملک کا کیسے انتظام کرتی ہے، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں (نعرۂ مسرت) ہماری خواہش تو صرف یہ ہے کہ معاملات وہاں ایسی صورت اختیار کریں جس سے وہ ملک صلح و امن کی مضبوط فصیل بن سکے ...... ہم نے روس قدیم کے گناہوں اور جرموں سے سخت تکلیف اٹھائی ہے جس نے جولائی ۱۹۱۴ء میں آسٹریا ہنگری پر سرویا کے قاتلانہ حملے کو جائز ٹھیرایا۔ خود اجتماعِ سپاہ میں ابتدا کی اور دسمبر ۱۹۱۶ء کی ہماری تجویزِ صلح کو سب سے پہلے ناک بھوں چڑھا کر مسترد کردیا۔"

بہرحال زار کے متعلق غیر جانبداروں کی مختلف رائیں ہیں۔ ان میں مدح گو بھی ہیں اور عیب جیں بھی! ابتدا میں عام طور پر زار کی ہر شخص تعریف کرتا تھا اور جس نے ایک دفعہ اس سے شرفِ ملاقات حاصل کیا وہ تو کبھی اسکی تعریف و مدح سے نہیں تھکا۔ اُس میں کچھ ایسا جادو تھا کہ ملنے والے پر فوراً پڑتا تھا اور وہ اسے ستھرے مذاق اور نازک احساسات والا زیرک، فیاض اور عالی ہمت بادشاہ یقین کرتے تھے۔ اسکو کچھ ایسا ملکہ حاصل تھا جس سے ملنے والا یہ فرض کرلیا کرتا تھا کہ زار کو اس سے خاص دلبستگی پیدا ہوگئی ہے اور وہ اسے قدر و محبت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے۔ اور یہ قدر شناسی مصنوعی یا موضوع نہیں ہے بلکہ قدرتی اور بلا ارادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملنے والوں کو ذراسی دیر میں گہرا دوست بنالیتا تھا۔ اصل میں یہ اخلاق و تصنع ایک قسم کا نہایت عمدہ روغن تھا جسے اسکی تعلیم نے اچھی طرح جلا دے دی تھی۔ لیکن سچ پوچھو تو اس روغن کی تہ کے نیچے کوئی بات ایسی نہ تھی جو اس بیرونی چمک دمک کے ساتھ مطابق ہوتی ہو۔ دماغ و اخلاق میں وہ اوسط درجے کے مغربی آدمی سے کسی طور بالاتر نہ تھا۔ بیشک اسکا ذہن نہایت تیز تھا اور اُسکو وہ حیرت انگیز طریقے سے استعمال کرتا تھا۔ لیکن وہ خیالات کی بلند پروازی جو ایک حوصلہ مند آدمی کا خاصہ ہوا کرتی ہے اُس میں بالکل نہ تھی۔ اُسکے خیالات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ عام اصولوں اور اخلاقی صداقتوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے وہ بالکل نابلد تھا۔ زندگی کا

وہ تنگ ہو لیتا تھا اور اُسکی مختلف صورتوں سے وہ بے اعتنا تھا اور اسکے جذبات فوق البھڑک اور پیچیدہ معنیٰ آفرینی اور اصول سازی سے متنفر تھے۔ وہ غیر مستقل مزاج آدمی تھا جیسا کہ ۱۹۰۵ء کے فسادات اور رعایا کے مطالبات اور مارچ ۱۹۱۷ء کی بغاوت سے ثابت ہے کہ اُس نے قوم کی اُن شرائط سے بالکل بے پروائی برتی جنکی وجہ سے وہ اپنے تخت اور اپنے خاندان کو ذلتِ عزل سے بچا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اتنی تاخیر واقع ہوئی کہ پھر اُسکا ارادہ اور رضامندی کام نہ آسکی حقیقت یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت کی بُرائیاں جسقدر نمایاں طریقہ سے نکولس کے زمانۂ حیات میں عالم آشکارا ہوئیں، کسی دوسرے شخص کی زندگی میں نہ ہوئی ہونگی۔ وہ ایک تنگدل لیکن نیک نیت فرمانروا کا بیٹا تھا جس نے اپنے طرز حکومت کو مضبوط کرنے اور رعایا کے مختلف و متضاد عناصر کو رُوسی بنانے اور اپنی سرکاری پالیسی کو قومیت کا رنگ دینے اور اپنے آپ کو دنیا کا امن قائم کرنے والا کہلانے کی سخت ترین کوششیں کی تھیں۔ نکولس نے گو اپنے باپ کے کام کو مکمل کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا لیکن وہ اپنی رعایا کے مختلف طبقوں، مختلف سیاسی گروہوں، اور مذہبی فرقوں میں اتحاد قائم نہ رکھ سکا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے خاندان اور سلطنت کے خلاف ہمیشہ سازشوں کا بازار گرم رہا۔ اور اس نے اصلاحات کو ناممکن ظاہر کرکے اپنا خاتمہ کرلیا۔ بہت سے بادشاہوں کی طرح اسے اپنی زیر حکومت قوموں کے مستند حالات معلوم نہ تھے اور نہ اُسے ان مسائل کی خبر تھی جو درپیش تھے۔ اور اس میں اخلاقی جرأت جو خلقِ خدا کے ٹکراؤں میں حکومت ہی کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہے نام کو نہ تھی۔ نکولس زندگی کی حقیقتوں سے ناآشنا تھا۔ سرکاری کاغذات میں جو حالات وہ پڑھتا اُن سے غلط نتائج اخذ کرتا تھا۔ مفروضات اور تصنع کی چاردیواری میں رہتا تھا اور اپنے سلطنت کے کاموں میں پیش بینی اور تدبر کی حیرت انگیز کمی کا اظہار کرتا تھا۔ سب سے بڑی کمی اُس میں تلطف اور باہمی احساس کا فقدان تھا۔ جو سچی دوستی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ یہ فقدان اُن لوگوں کی نظروں سے پنہاں رہتا تھا جو تھوڑی دیر کے لیے اُس سے ملنے کا موقع پاتے تھے۔ لیکن جنکو اُس سے مسلسل سابقہ پڑا وہ اُسکے اس نقص سے حیران رہ جاتے تھے۔ اسکا اظہار اس قحط سالی میں بخوبی ہوا جس میں اُسکی رعایا میں سے لاکھوں نفوس فنا کے آغوش میں آگئے۔ اور اسی قسم کے دیگر مصائب عامہ میں اسکا تجربہ ہوا۔ اس میں یہ صرف ظرف و تحمل کی خاص [illegible] سے اس تصور کی تائید ہوتی ہے کہ

وہ اپنے اقتدار کے خاتمہ کے زمانے میں اپنی مصیبت کو خفیف طور سے محسوس تو کرتا تھا لیکن آجکل کے سے توکل کرنے والوں کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلا بیٹھا، خاموش تکتا رہا اور صرف قسمت کی امداد کا انتظار کرنے لگا۔ "اکروڑ نفوس کے حکمراں کی باطنی زندگی سادہ اور عبرت انگیز ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر فرمانبردار بیٹا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ابتدائے حکومت میں اپنی مرضی اور فیصلہ کو اپنی والدہ ماجدہ کا مطیع بنا رکھا تھا۔ وہ نہایت نازبردار شوہر تھا۔ اپنی بیوی کی خواہشات اور عارضی جذبات کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا، اگرچہ بعض دفعہ انکی تکمیل میں رعایا کی جانب سے بہت بڑی قربانیاں لازم ہو گئیں۔ بعض دفعہ اسکی پسندیدگی اور ناپسندیدگی قوانین کی محرک ہوتی تھی جنکی حماقت صاف ظاہر تھی چنانچہ ایک مرتبہ نیک نیت خاتون نے ایک پیچیدہ مسئلہ کے حل کرنے کے لیے صبح کے وقت ایک سنسنی خیز حکم جاری کرا دیا جسکو کاؤنٹ وٹ اور وزراء نے اُسکے شوہر سے بعجز والحاح درخواست کرکے رات کے وقت منسوخ کرا دیا۔ نکولس شفیق باپ تھا، اپنے بچوں کی پرستش کرتا تھا۔ اس نے خاصکر اپنے لڑکے کو اپنا مدار زندگی بنا رکھا تھا یہ محبت اپنی شدت میں ماؤں کی محبت سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے مطالعہ اور دربارداری کے اوقات اکثر اپنے بچے کی دیکھ بھال میں صرف کر دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ بے انصافی ہوگی اگر یہ نہ کہا جائے کہ اس سے رعایا کی فلاح و بہبود میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ اس سے زیادہ موثر بات کیا ہو سکتی ہے کہ جب امیرالبحر راشد جسٹونسکی نے برطانوی ماہی گیروں پر آتشباری کرکے برطانیہ اور روس کے درمیان کشیدگی پیدا کردی تھی تو اُسکی نزاکت کو اس نے اپنے بچے کو اپنے ہاتھوں سے نہلانے کے بعد محسوس کرنا مناسب تصور کیا۔ بیڑۂ بالٹک کی روانگی کے وقت جو اہم گفتگو امیرالبحر سے ہو رہی تھی اور جسکا مقصد شہنشاہ کو ہوش میں لانا تھا زار یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا " اسکا وزن ۱۴ پونڈ ہے۔ سمجھے؟

مخاطب نے حیرت سے پوچھا" حضور! کس کا؟

خوش و خرم باپ نے جواب دیا، تخت کے وارث کا"۔

اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھی اُسکا ملاطفت کا برتاؤ تھا۔ اور خاصکر اسکی اپنے وحشی مزاج عزیزوں کی دلداری حیرت خیز تھی۔ گرانڈ ڈیوک ولاڈیمیر کے لڑکے نہایت آوارہ مزاج تھے لیکن اس کا سلوک اُنکے ساتھ نہایت مروت کا تھا۔ اور جب اُنھیں سزا دینے پر مجبور بھی ہوا تو نہایت لطیف پیرایہ میں ملامت کی سنہ ۱۹۰۹ء کے آخر تک شہنشاہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو مالی حیثیت سے فائدہ پہونچاتا رہا۔ فوج، جنگی بیڑہ،

تجارتی بیڑے میں انکو جگہ دے رکھی تھی۔ صنعتی و حرفتی رعایتوں میں انکی درخواستوں کو منظور کرلیا تھا اگرچہ بعض مرتبہ اس سے رعایا کو نقصان پہونچتا تھا۔

ڈاکٹر ڈلن کی رائے ہے کہ ذاتی حیثیت سے وہ تعریف کا مستحق ہے کیونکہ وہ وفاشعار اور مہربان شوہر، شفیق باپ، نیک نیت محب الوطن تھا۔ جس نے اپنی رعایا کی فلاح کی ہمیشہ خواہش کی اور بادشاہ کی حیثیت سے بھی بعض اوقات اسپر کیاب دلیری اور بلند خیالی کے دَورے پڑا کرتے تھے۔ جیسے اُس نے الکحل کی ممانعت کردی جس سے اُسکی رعایا کے نشو و نما میں فرق آرہا تھا۔ اسنے مالیات کے اسکی وجہ سے بہت کم رہ جانے کی ملامت کی پروا نہ کی۔ اسکی ذہنی قابلیتیں سوا سے یادداشت کی عمدگی کے کمزور اور اس عظیم الشان کام اور پیچیدہ مسائل کے مقابلہ کے لیے ناکافی تھیں جو اُسکے باپ کے مرنے پر اُسے پیش آئے۔ اسکی قوتِ فیصلہ کی کمزوری کا ثبوت ذیل کے واقعہ سے ملتا ہے: ایک مرتبہ وہ اپنے خاص کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ زارینہ داخل ہوئی اور جھنجلا کے بولی "پیارے نکولس! آپ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ آپ بغیر سوچے سمجھے ہر شخص کی ہاں میں ہاں ملادیتے ہیں۔ آج صبح ایم سٹولی پن ایک کار خاص سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپنے اُسے جواب دیا کہ موسیو سٹولی پن، آپ بجا کہتے ہیں۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ پانچ منٹ کے بعد ڈرنووو آیا اُس نے سٹولی پن کی تقریر سے بالکل مختلف تجویز و مشورہ پیش کیا، آپنے اُس سے بھی یہی کہا کہ مائی ڈیر ڈرنووو۔ آپ درست کہتے ہیں اور میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ایم شانباس آئے اور آپ کو دونوں شخصوں سے جداگانہ لیکن متضاد رائے دی آپ نے اُس کو بھی یہی کہا کہ میں آپ کی بات مانتا ہوں، آپ کا خیال درست ہے" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد زار نے ملکہ سے جو اپنے شوہر سے معقول جواب پانے کی منتظر تھی کہا "پیاری جان! تم سچ کہتی ہو۔ مجھے تم سے اتفاق ہے"۔

برعکس اسکے زار کے معترفوں کی یہ رائے ہے کہ صرف وہ لوگ زار نکولس کو مختلف الزام دیتے ہیں جن کو پہلے روس کا حال معلوم نہ تھا اور صرف چند ماہ سے انھیں یہ محسوس ہوا ہے کہ روس میں بھی خلق خدا آباد ہے۔ جن لوگوں کو اندرونی حال کا کافی علم ہے وہ ان الزامات کو بالکل بے بنیاد اور لغو قرار دیتے ہیں۔ ۲۵ سال کے عرصہ میں جو روسی شہنشاہوں کی مدتِ حکومت

کی اوسط سے زیادہ ہے کوئی حکم رجعت پسندی کا نہیں بتایا جا سکتا جو نکولس کے ہاتھوں سے جاری ہوا ہو۔ بخلاف ازیں اسکے تمام افعال ترقی و اصلاح پر مبنی تھے۔ جو باتیں آج خراب، قابل نفرت اور وحشیانہ قرار دی جاتی ہیں اور جنکی مذمت کے لیے سخت سے سخت زبان بھی کافی نہیں سمجھی جاتی خود نکولس ثانی یا اسکے زمانہ کے کسی اور آدمی کے پیداکردہ نہیں ہیں۔ مثلاً پھانسی، گولی سے مارنا، کوڑوں سے ہلاک کرنا، قیدخانوں میں ناواجب سختیاں، قطب شمالی کو عام جلاوطنیاں اور اسی قسم کے دیگر ہزاروں مظالم اتنے ہی قدیم ہیں جتنا خود روس۔ یہ سختیاں روسی فطرت کی تندی کا مظہر ہیں۔ مدۃ العمر کی مطلق العنانی کے بعد رعایا کو آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن جرائم اور بغاوت کی سازشیں برابر جاری تھیں اسکے انسداد کے لیے اگر کچھ سختی کی گئی تو یہ نظم سلطنت ہے، اور روسی سرشت کو دیکھتے ہوے وہ کچھ برائی نہیں۔ اگر یہ حالات کسی دوسری سلطنت میں ہوتے تو یقیناً اس سے کم سختی سے جرائم کی روک تھام نہ کی جاتی۔

نکولس ثانی روس کے لیے نئی وضع کا بادشاہ ہے۔ روس تو کارگزار بادشاہوں کا عادی رہا ہے۔ نکولس علم دوست ہے۔ شرمیلا، سادہ، غائرنظر اور صاف آدمی ہے۔ اُسے قوتِ فیصلہ اور جرأت سے عاری کہا جاتا ہے۔ اسکی وجہ موجہ یہ ہے کہ اس میں فی الواقع وہ قوتِ فیصلہ اور وہ دلیری نہیں ہے جو اس سے پہلے کے روسی مطلق العنان شاہنشاہوں نے ہمیشہ ظاہر کی ہے لیکن تاریخ مختلف مزاج کے بادشاہ پیش کرتی ہے۔ اور دلیری کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ وہی دلیری نہیں جو تمام روس کے سابق بادشاہ دکھاتے رہے ہیں۔ نکولس نئی قسم کی جرأت رکھتا ہے۔ اس نے تخت نشینی کے بعد ہی اپنی رعایا کو آزادی دے دی تھی قبل اسکے کہ وہ جمہوریت، اور قومی نیابت کے مسئلہ کو سمجھ سکیں۔ بیشک انارکسٹ فرقہ کا وہ دشمن رہا، کیونکہ یہ بدامنی کا آلہ تھا۔ اس فرقہ کے ساکت کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے وہ نئے نہیں ہیں روس میں وہ صدیوں سے مروج ہیں۔ روسی رعایا انکو خاموشی سے برداشت کرتی رہی ہے۔ اگر نکولس پہلے زاروں سے عشر عشیر مطلق العنان رہا ہوتا تو اسکی رعایا میں سے کسی کو ان مروجہ رسم ورواج کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہوتی اور اگر کسی کو یہ ہمت ہوتی بھی تو باہر والوں کو ایک لفظ بھی اسکا نہ سنائی دیتا۔ یہ نکولس کی مہربانی ہے کہ اُس نے اپنی رعایا کو اتنی آزادی دی کہ آج دُنیا اس

اس سلطنت کے سخت سے سخت اور مکروہ سے مکروہ انکشافات کے سیلاب میں غرق ہے - اور دنیا ان نئی باتوں کو اُسی بادشاہ سے منسوب کرتی ہے جس نے روسیوں کو اتنی آزادی دی کہ وہ حق و ناحق میں تمیز کر سکیں - نکولس تعلیمیافتہ ہونے کی وجہ سے اچھا مدبر ہے - جو اُسکی خدمت میں باریاب ہوا ہے مطمئن رخصت ہوا لیکن کوئی بھی یہ نہ کہہ سکا کہ اُسکے آملک کے دل میں کیا خیالات موجزن ہیں - اسکے ایک خاص ملازم کا قول ہے کہ میں ہز مجسٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں اور یقین جانو باوجود اسکی نرم و ملطف آگیں نگاہوں کے اسکا دل چالاک و عیار ہے - روس جیسے ملک کو مطلق العنانی کی خوفناک چٹانوں اور دلدلوں سے نکال کے آئینی حکومت کے بحر الکاہل میں پہونچانا غیر معمولی زبردست اور دلیر آدمی کا کام ہے - نکولس کے کندھوں پر جو بار آکے پڑا اُسکی تخفیف میں اُس نے بڑی لیاقت دکھائی - ایسی حالت میں کہ فساد کا زور ہو اور روزمرہ نئی مخالفتوں کا ظہور ہو ایسے مدعا کو جو ابھی دُور ہو نصب العین بنائے رکھنا نکولس ہی کی ہمت اور دلیری کا کام تھا اور یہ ہمت اور دلیری اس سے بہت اچھی ہے جو رُوس کے پچھلے شہنشاہ اپنی فتوحات اور نظم و نسق میں دکھایا کرتے تھے - اُس نے اپنی رعایا کو اختیارات دیدیے اور وہ ہرگز مطلق العنان نہیں - لیکن اگر روسی ہی اپنے آپ کو قومی مجلس کے استعمال کے لائق نہ ثابت کریں تو یہ نکولس کا قصور نہیں بلکہ تاریخ یہ فیصلہ صادر کریگی کہ نکولس اپنے زمانہ سے کئی قدم آگے تھا، اور اسکے خیالات قبل از وقت تھے - صرف وہی جنھیں کبھی نصف درجن آدمیوں پر بھی حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا اسکا اندازہ کرنے سے محروم ہیں کہ کروڑوں بندگانِ خدا پر حکومت کسقدر مشکل کام ہے یہ صرف نکولس کا ہی کام تھا کہ ۱۷ کروڑ آبادی کو جو تقریبًا سو مختلف مذاہب اور مختلف اقوام پر مشتمل ہے اور کرۂ ارض کے $\frac{1}{6}$ حصہ پر چھائی ہوئی ہے، اس نے مطلق العنانی کی تاریکی سے نکال کے آزاد اور ذمہ دار حکومت کی چکاچوند میں لا ڈالا "

ناظرین نے ہر دو راؤں کا ملاحظہ کرلیا ہوگا - دونوں پر غور کرنے سے نتیجہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو، نکولس نیک نیت ضرور تھا - آزاد اور مطلق العنان حکومتوں کی طرح وہ کسی وقت معاملات سے بے پروا ہوجاتا ہو جیسا کہ وہ اپنے عزل سے پہلے آخری شرائط کا جن پر اُسکی اور اُسکے خاندان کی سلامتی منحصر تھی جواب دینے کے وقت ہوا - لیکن ہمیں برطانوی رعایا کو اُسکا ضرور ممنون ہونا چاہیے اور اتحادی متردد اُسکے اس بار احسان کو محسوس کرتے ہیں کہ زار نے موجودہ جنگ میں حصہ لے کے

بیشک اتحادیوں کے نصب العین کو تقویت دی۔ یہ اسکی کمزوری تھی کہ اُسکا دربار جرمنوں کی بزدلانہ اور اور مغویانہ سازشوں کا مرکز بنگیا اور آخر یہی امر اُسکے اور اُسکے خاندان کے شاہی اختیارات سے محروم کر دیے جانے کا سبب بنگیا!

رعایا نے اسکو معزول کرکے اپنے کندھے پر ایسے بارِ عظیم کو رکھ لیا جسکے اُٹھانے کی قابلیت اسمیں نہ تھی۔ بیشک اپنی کوششوں کے زار کے معزولی کی صورت میں بارآور ہونے سے اُسے بہت خوشی ہوئی جیسا کہ خود عارضی حکومت کے اعلانِ عام سے ظاہر ہے جس میں ذکر تھا کہ موجودہ صورت سالہا سال کی کشمکش کا نتیجہ ہے، اور ۱۹۰۵ء کے اختیارات دیئے جانے کے وعدہ کی یاد تازہ کرتی ہے جو بعد میں واپس لے لیا گیا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک و رعایا پھر استبداد اور شخصی سلطنت کے حضیض نکبت میں جا پڑا اور چاروں طرف شرمناک بُرائیاں منڈلانے لگیں۔ لیکن اب ہمارا مدعا ہر ایسے ممکن ذریعہ کو کام میں لانا ہے جس سے فتح حاصل ہو۔

اتحادیوں کو بھی کسی ملک کے اندرونی جھگڑوں سے تعلق نہ تھا۔ یہ روسیوں کا کام تھا کہ وہ شخصی سلطنت پسند کریں یا جمہوریت قائم کریں۔ انکا تعلق صرف اتنا تھا کہ روس کی خاطر اتحادیوں نے ہتھیار اُٹھائے کہیں ایسا نہ ہو کہ خود وہی میدانِ جنگ سے کنارہ کش ہو جائے۔ چنانچہ سب اتحادی ممالک کو اسکا اطمینان ہوگیا۔ اسی لیے سب طرف سے عارضی گورنمنٹ کے نام اس جدید طرزِ حکومت کے متعلق پیامِ تہنیت آنے لگے۔

شاہی خاندانِ رومانوف کے کُل ممبروں نے اپنے آپ کو نئی گورنمنٹ کے سپرد کر دیا کہ ان سے جس طرح چاہے کام لے۔ نئی حکومت مشکلات کے بھنور میں پھنس گئی۔ زار کو معزول تو کر دیا لیکن جو نظامِ حکومت قائم تھا۔ اس کے پُرزے الگ الگ ہوگئے۔ انقلاب نے روسی تمدن کی سینکیں بکھیر دیں۔ کسی طرح انھیں وہ راستہ نہیں نظر آتا تھا جس سے وہ اُس منزلِ مقصود تک جسکا نام عظیم الشان اور آزاد روس تھا صحیح و سالم پہونچ سکیں۔ سپاہ کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا اُسکا جنگی جوش مفقود ہوگیا اور اُسکے افسروں اور سپاہیوں کی اختلاف آرائی نے آسٹریا کے صلح کے ڈیپوٹیشن کو ملک میں سے گذر کے پایۂ تخت میں پہونچ جانے دیا۔ مختلف جماعتیں مختلف سمتوں کی طرف رُخ کر رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عارضی حکومت قدرۃً اس قوت فیصلہ اور جوش کے ساتھ کام نہ کر سکی جیسی وہ حکومت

جو مضبوط زمین پر کھڑی ہو کر کر سکتی ہے۔ صلح پسندوں نے ملک میں ایک اُدھم مچا رکھی تھی۔ کرنسکی وغیرہ نے بہت زور لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ آخر اُسے بھی مستعفی ہو کر ملک سے بھاگنا پڑا۔ اسکے ساتھ ہی رُوس نے اتحادیوں کے منشا اور نصب العین کے خلاف دشمن سے صلح کر لی۔ لیکن اسکا نتیجہ اُسکے لیے اچھا نہ ہوا۔ کئی صوبے خود مختار ہو گئے اور فنلینڈ، پولینڈ، کریمیا، بحیرۂ اسود، بحیرۂ بالٹک، صوبجات بالٹک وغیرہ سب پر جرمن قبضہ ہو گیا اور ان عقل کے اندھوں کو یہ نظر نہ آیا کہ وہ جرمن کے کہنے سے جسکو صلح کہ رہے ہیں وہ حقیقت میں اُنکے لیے ایک ذلیل غلامی ہے۔ آہ! کیا سلطنت تھی اور کچھ بھی نہ رہی۔

نکولس کے روزنامچہ کے کچھ خلاصے جرمن کے اخبارات میں نکلے ہیں جنکو انگریزی اخبارات نے شایع کیا ہے۔ نہایت دردناک اور حسرت بار الفاظ ہیں۔ سوچنے والے کے دل پر رنج والم غالب آجاتا ہے اور ہفتوں اُسکا اثر برقرار رہتا ہے۔ یہ اندراجات تخت سے دستکشی کے فوراً ہی بعد کے ہیں جبکہ زار سیکاف سے گلیلاف کو جا رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ فی الواقع زار ایک ناچیز تھا اور اُسکی ہمت کمزور تھی۔ ان اندراجات سے یہ بھی واضح ہوگا کہ ۵۔ اپریل کو زار انگلستان کے سفر کی طیاریاں کر رہا تھا۔ اسکے متعلق وشس زٹینگ لکھتا ہے: ۔ بلا روک ٹوک انگلستان روانہ ہو جانے کا امکان لواف اور کرنسکی کی حکومت سے پیدا ہو گیا تھا۔ رومانوف کا غذات میں شہزادہ لواف کا زار کے نام ایک خط خفیہ طرز تحریر میں لکھا ہوا ملا ہے جس میں شہزادہ نے زار کو مرمان پہونچانے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ چٹھی چھاپی جائیگی۔ کرنسکی نے اس سازباز مزدوری کی کونسل سے پوشیدہ رکھا۔ ذیل کا روزنامچہ دل کو سنبھال کے پڑھیے۔ لیکن اس موقعہ پر میں یہ بتاتا ہوں کہ روزنامچہ کی تاریخیں روئٹر کی تاریخوں سے مطابق نہیں ہیں ؛ ۔

۴ مارچ ۔ اطمینان سے خوب سویا۔ ڈونسک سے دُور آنکھ کھلی۔ کہر پڑ رہی ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کے کل واقعات پر بحث کی۔ میں جولیس قیصر پڑھتا رہا۔ آٹھ بجکے بیس منٹ پر میں گلیلاف پہونچا جہاں تمام اسٹاف اسٹیشن پر منتظر تھا۔ ۹ بجکے ۲۰ منٹ پر میں اپنے مکان پر گیا۔ الگزیف رووڈزیانکو کی طرف سے تازہ خبریں لیکے آیا۔ آج میکا (گرانڈ ڈیوک مائیکل) نے استعفا دیدیا۔ اسکا اعلان نیابتی مجلس کے خوشامدانہ اور عاجزانہ ذکر پر ختم ہوتا ہے جو تین مہینے میں مجتمع ہونے والی ہے۔ خدا ہی کو علم ہے کہ اُس نے ایسی لچر تحریر پر اپنے دستخط کیسے کر دیے۔ پیٹرز برگ میں بے چینی ختم ہو گئی ہے۔ کاش یہ کچھ عرصہ اور رہتی!

۵ مارچ سنہ ۔ سندھور رکھنا شروع کر دیا ہے لیکن اسکا آغاز مسرت سے نہیں ہوا۔ دوپہر کے بعد

عشائے ربانی۔ کرنسکی یہاں آیا اور ملتجی ہوا کہ ہمیں صرف کھانے کے وقت ملنا اور بچوں سے الگ بیٹھنا چاہیے۔ یہ اصل میں اسکے لیے مناسب بھی ہے تاکہ اس سے سپاہیوں اور مزدوروں کی مشہور کونسل مطمئن رہے۔ سختی سے بچنے کے لیے ہر شخص کو حالات کے مطابق بن جانا چاہیے۔

مارچ ۔ ۱۷۔ خوب سویا۔ ۱۰ بجے نیک الکس (ایک گرانڈ ڈیوک کا نام) آیا۔ اسپر ہماری مجلس گرم ہوئی۔ ۱۱ بجے اسٹیشن پر اپنی پیاری ماں کو لینے گیا جو خیف سے آئی ہیں۔ میں اُنھیں ساتھ لایا اور ہم دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ وہ ٹھیریں اور دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ آخر کار مجھے ایلاٗنس (زار ینہ) کے دو تار ملے۔ سیر کو گیا۔ موسم بہت خراب ہے۔ سردی اور برفباری ہے۔ چائے کے بعد الگزنیڈ اور فریڈرکس مجھ سے ملے۔ شام کو اماں جان کے ساتھ کھانا تناول کیا اور رات کے ۱۱ بجے تک اُنکے پاس بیٹھا رہا۔

مارچ ۔ ۱۸۔ دن صاف اور کہر دار ہے۔ ۱۰ بجے سے دوپہر تک عشائے ربانی۔ اماں جان بعد میں آئیں۔ اُنھوں نے میرے ساتھ کھانا کھایا اور شام کے چار بجے تک میرے پاس رہیں۔ چائے پر جنرل ایوانف ملا جو پارلیمنٹ کی امیدواری سے واپس آیا ہے۔ وہ زارسکوسیلو گیا تھا اور وہ ایلاٗنس سے ملا ہے۔ بیچارے کاونٹ فریڈرکس اور کاونٹ وجیلاف کا کیا ہوا جنکو دیکھ کے ہر ایک جوش میں بھر جاتا ہے؟ وہ فریڈرکس کو جائداد پر جو پینسا کے نزدیک ہے لیگئے ہیں۔ شام کا وقت اماں جان کے ساتھ گذرا۔

(گلیلاف کا آخری دن)

مارچ ۲۱۔ گلیلاف میں آخری دن۔ پونے گیارہ بجے سپاہ کو الوداعی پیام سنایا۔ افسرِ وقت کے مکان پر گیا جہاں میں اشاف اور حکام سے رخصت ہوا۔ مکان پر اپنے محافظ کاسکوں، افسروں اور آزاد رجمنٹ کو الوداع کہی۔ میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ۱۲ بجے اپنی ماں کے ساتھ اُن کی گاڑی میں گیا جہاں ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ انکے اور انکے طلبکے ہمراہیوں کے ساتھ چار بجے تک رہا۔ اُن سے، سنڈرو، سرگی اور ایک سے مرخص ہوا۔ بیچارے نیلو کو میرے پاس نہیں آنے دیا گیا۔ پونے پانچ بجے گلیلاف سے روانہ ہوا۔ یہ نظارہ حسرت بار اور موثر تھا۔ لوگوں کے گروہ میرے ہمراہ تھے۔ پیٹرزبرگ سویٹ کے چار ممبر میری گاڑی میں تھے۔ میں دلگیر، رنجیدہ اور آرزومند ہو رہا ہوں۔

مارچ ۔ ۲۲۔ ساڑھے گیارہ بجے میں جلدی اور صحیح وسالم زارسکوسیلو میں پہونچ گیا۔ خدایا! کتنا فرق ہے۔ گلیوں میں محل کے گرد، اور باغ میں بھی سنتری ہی سنتری! دروازے کے آگے چند فوجی افسر ازینہ سے

اور گیا اور اپنی جان الالیس اور پیارے بچوں سے ملا۔ اس نے واقعات کا دلیری اور عافیت سے مقابلہ کیا ہے۔ تمام سیاہ کمرے میں ہیں کیونکہ کھسرہ نکلی ہوئی ہے۔ لیکن سوائے میری کے جسکے کھسرہ نکلنی شروع ہوئی ہے۔ سب کو آرام ہے۔ الیکسس (زار وچ) کے کھیلنے کے کمرہ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اچھے بکین ڈارف سے ملاقات ہوئی۔ اسکے ساتھ سیر کو گیا اور باغ میں اسکے ساتھ کام کیا کیونکہ مجھے زیادہ آگے نہیں جانے دیا گیا۔ چائے کے بعد اپنے کاموں کو درست کیا۔

مارچ ۲۳۔ بیرونی حالات جن میں ہم رہتے ہیں اور یہ خیال کہ ہم دونوں ساتھ ہیں مجھے خوشی دیتے اور میری تسلی کرتے ہیں۔ صبح کے وقت بکین ڈارف سے ملاقات ہوئی۔ کاغذات پر نظر ڈالی۔ بہت سے درست کیے اور بہت سے جلا دیے۔ ڈھائی بجے تک بچوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ڈولگوروکی کے ساتھ سیر کو گیا فوجی ہمراہ تھے۔ آج وہ زیادہ خوشگوار تھے۔

مارچ ۲۶۔ صبح کو بکین ڈورف سے ملاقات ہوئی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ ہم یہاں کچھ زیادہ عرصہ رہیں گے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ دوبارہ خطوط اور کاغذات جلائے۔ اناس ٹیسیہ کے کان میں درد ہے جیسے اوروں کے ہے۔ تیسرے پہر ڈولگوروکی کے ساتھ سیر کو گیا اور باغ میں کام کیا۔ پونے سات بجے رات کے عشائے ربانی میں گیا۔ بعد ازاں انیا (دربار کی ایک لیڈی اور زارینہ کی منظور نظر) اور ہی کے پاس گیا۔ اسکے بعد سو گیا۔

## سفر انگلستان

مارچ ۳۰۔ دس بجے ہم عشائے ربانی میں گئے۔ کچھ دیر ٹیٹی آنا کے ساتھ ٹہلا۔ الگزنڈر ہلیس کے وسط کے بالمقابل ہمارے باغ میں آج انقلاب کے شکار دفن ہوئے۔ ماتمی باجہ اور مارسیلز گیت کی آواز قابل غور تھی۔ چھ بجے ہم نماز میں شریک ہوئے۔

اپریل ۵۔ صبح کے وقت تھوڑی سی چہل قدمی۔ چیزیں اور کتابیں درست کیں۔ وہ چیزیں ایک طرف رکھنا شروع کیں جنکو اپنے ہمراہ لیجاؤنگا اگر انگلستان کے سفر کا موقع مل سکا۔ باغ میں کام کیا۔

اپریل ۸۔ ہماری منگنی کی تیئسویں سالگرہ خاموشی سے گذری۔ الیکسس کے ساتھ دیر تک صبح ٹہلتا رہا۔

اپریل ۲۸۔ باہر آج یکم مئی ہے۔ اسلیے ہمارے گدھوں نے اس دن کو منانے کے لیے گلیوں میں باجے اور سرخ جھنڈوں کے ساتھ جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بظاہر وہ ہمارے باغ میں گئے

اور بخار چڑھ جائے۔ ڈیڑھ گھنٹہ ٹہلا۔ شام کو بچوں کو "ایک لکھ پتی لڑکی" (کتاب کا نام) سنانا شروع کی۔

یکم مئی - صبح کے وقت سیر کو گیا۔ ۱۱ بجے الیکسس کو جغرافیہ کا سبق دیا۔ دن میں پھر اپنے نباتات کے باغ میں کام کیا۔ شام کو معلوم ہوا کہ کارنیلاف پیٹرزبرگ ملٹری ڈسٹرکٹ کی اعلیٰ کمان سے دست بردار ہوگیا ہے اور گچکاف نے استعفا دیدیا۔ ہمیشہ وہی وجوہات یعنی مزدوروں کے قائم مقاموں کی کونسل یا کسی جماعت وغیرہ کی فوجی حکام کے احکامات میں غیر ذمہ دارانہ دخل اندازی۔

جون ۳- صبح کی چاے کے بعد کرنسکی شہر کی طرف سے یکایک خود چلنے والی گاڑی میں نمودار ہوا وہ میرے پاس زیادہ دیر نہیں رہا۔ اُس نے درخواست کی کہ ایسی دستاویزات جنکا تعلق اندرونی پالیسی سے ہے تحقیقاتی کمیٹی کے پاس بھیجدی جائیں۔

جولائی ۹- جب سے میں گلیلاف سے یہاں آیا ہوں ہمیں تین ماہ گذر گئے ہیں۔ اور ہم قیدی ہیں۔ پیاری اماں کا حال معلوم نہ ہونا غضب ہے اور تمام باتوں کی مجھے مطلق پروا نہیں!

کون ایسا سخت دل ہے جو اِن خلاصوں کو پڑھے اور دست تاسف نہ ملے۔ یہ وہی زار ہے جسکے ماتحت دنیا کا ۱/۶ حصہ رہا اور جسکے ذرا سے اشارے پر بڑے سے بڑا کام آنِ واحد میں ہوجاتا۔ تمام سلطنتوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ مہتم بالشان! جسکی ہر بات قانون تھی آج اتنا بے بس ہے کہ اسکی تحریر کو پڑھ کے رونا آتا ہے۔ آپ بیتی سے زیادہ بیتاب کرنے والی اور کوئی چیز نہیں۔ واقعات کی روشنی میں اس روزنامچہ کے اندراجات قیامت ہیں! تعزمن تشآءُ وتذل من تشآء۔

زار کو بعد میں سائبریا میں بھیجدیا گیا۔ ملک میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ آخر ۱۶ جولائی ۱۹۱۸ء کو یورال کونسل نے یہ بہانہ کرکے کہ اسے اندیشہ ہے کہ سازشی زار کو چھڑا لے جانا چاہتے ہیں موت کا حکم صادر کیا۔ غیر کمیشن یافتہ افسروں اور سپاہیوں کے ایک دستہ نے ۵ بجے صبح کے زار کو جگایا اور اُسے لباس پہننے کے لیے کہا گیا۔ ایک کمرے میں لے جاکے اُسے سرخ گارڈ کا یہ فتویٰ سنایا گیا کہ "زارِ معزول کو قتل کردیا جائے!" موت کی طیاری کے لیے زار کو دو گھنٹے کی مہلت دی گئی۔ زار نے اس حکم کو استقلال اور سکون سے سُنا۔ اپنی خوابگاہ میں آیا اور ایک آرام کرسی میں گر پڑا۔ اس نے پادری کو بُلایا جسے اسکے پاس رہنے کی اجازت دی گئی۔ زار نے کئی خط لکھے۔ نو بجے صبح ایک فوجی دستہ اُسے لینے آیا۔ نکولس نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس سے اُٹھا نہ گیا۔ پادری اور

ایک سپاہی کے سہارے سے وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا لیکن پھر گر پڑا۔ کیونکہ اُس سے قوت سلب ہو گئی تھی اور وہ بلا سہارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسکو ایک ستون کے سہارے کھڑا کیا گیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا تاکہ کچھ کہے لیکن نشانچیوں نے باڑھ ماردی اور نکولس مُردہ زمین پر آپڑا۔

یہی نہیں۔ غوغائیوں نے زارینہ اور اُسکے بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ سب کو بندوق کا نشانہ بنایا۔ آہ! کیسی زبردست ٹریجڈی ہے!

محمد ظفر۔ وکیل۔ (گرگاؤں)

# نعت سرورِ کائنات

ایک ایک حرف نعتِ جنابِ رسول کا
دیتا ہے مژدہ مقصدِ دل کے حصول کا

مضمون ڈھونڈھتا ہوں میں نعتِ رسول کا
بلبل بنا ہوں روضۂ رسول کے پھول کا

صلِ علیٰ کا سینے میں اک شور مچ گیا
دل میں خیال آیا جو نعتِ رسول کا

مانگی جو دو سرے کو چۂ احمدؐ کا واسطہ
رستہ دعا کو مل گیا بابِ قبول کا

روزِ ازل سے شوق ہے دل میں بھرا ہوا
یارب دکھا دے روضۂ انور رسول کا

سرمہ ہو میری آنکھوں میں اُس راہ کا غبار
چہرے پہ غازہ ہو در احمدؐ کی دھول کا

جاگ اُٹھتے بخت خفتہ ہمارے یقین ہے
دیدار خواب میں بھی جو ہوتا رسول کا

بس آسرا حضور کا ہے اے شہِ رسُل
ہے اور کون حشر میں محبوب دل ملول کا

تنہا بچا تا مجھکو عذاب جحیم سے
صدقہ علی کا اور تصدق بتول کا

دونوں جہان کے مکین ہیں عزت کے ماریا
انکا ہے جو عدو وہ عدو ہے رسول کا

حوریں بھی اُسکی دید کا رکھتی ہیں اشتیاق
آفاق جسکو شوق ہے نعتِ رسول کا

عاصی آفاق بنارسی

# تاج محل

سنہ ۱۶۰۷ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے خُرّم (شاہ جہاں) کی نسبت نورجہاں کے بھائی آصف خاں کی لڑکی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) سے کی۔ اسکے پانچ سال بعد سنہ ۱۶۱۲ء میں شادی کی۔ اُس وقت دولہا بیس سال تین مہینے کا تھا اور دُلھن اس سے ۱۴ مہینے چھوٹی تھی۔ شادی کے اُنیس سال بعد چودہ[۱۴] بچوں کی ماں نے دردِزہ میں ۳۰ گھنٹے مبتلا رہ کر، دوشنبہ ۷ جون سنہ ۱۶۳۱ء (۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۴۰ھ) کو اس دُنیا کو الوداع کہا۔

شاہجہاں کو اس سانحہ جانکاہ کا اسقدر صدمہ ہوا کہ وہ ایک ہفتہ تک دربار میں نہ آیا اور امورِ سلطنت ترک کر دیے۔ اُس نے کہا کہ "اگر بادشاہت کے فرائض جن سے تادمِ مرگ نجات نہیں، مجھپر فرض نہ ہوتے تو میں تارک الدنیا ہو جاتا"۔ اس نے لباسِ فاخرہ، عطریات، جواہرات کا استعمال ترک کر دیا۔ اور تاج پوشی و ولادت کی سالگرہوں پر جو محفلِ رقص و سرود منعقد ہوتی تھیں بند کر دیں۔ بیگم کی وفات کے وقت اسکی ڈاڑھی کے صرف چند بال سپید تھے، لیکن اب تمام بہت جلد سفید ہو گئے۔ جب کبھی مقبرہ کی زیارت کے لیے جاتا تو دریاے اشک آنکھوں سے رواں ہوتا۔ اور بصد آہ و بکا کہتا "حکومت کی دلچسپیاں ختم ہو گئیں، اور خود زندگی بے مزہ ہو گئی"۔ اور جب کبھی حرم میں جاتا تو با دیدۂ نم واپس آتا اور کہتا کہ "اب کوئی حسین مجھے خوش نہیں کر سکتا"۔

شاہجہاں کی دو اور بیگمیں تھیں (۱) مرزا مظفر حسین کی بیٹی (سنہ ۱۶۱۰ء) (۲) شاہ نواز خاں کی لڑکی (سنہ ۱۶۱۷ء) لیکن یہ دونوں شادیاں نتیجۂ محبت نہ تھیں بلکہ "باقتضاے مصلحت"۔ ممتاز محل نے اس طرح شاہجہاں کے دل میں جگہ بنائی تھی کہ اب کسی اور کی محبت کی جگہ اُس میں نہ رہی تھی۔ شاہجہاں ہر وقت اور ہر جگہ سفر میں ہو یا اقامت میں، تکلیف میں ہو یا آرام میں کبھی نظروں سے جدا نہ کرتا۔

ممتاز محل کی موت کا قصہ جو ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، ایک نادر فارسی نسخے میں جو خدابخش خاں کی لائبریری (بانکی پور) میں موجود ہے، درج ہے۔ یہ کتاب قاسم[۱] علی خاں آفریدی

---

[۱] قاسم علی خاں آفریدی سنہ ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۲۷ء میں مرا۔ اسکے باپ کا نام برہان خاں اور دادا کا نیکنام خاں تھا۔

کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے جو اس نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے۔ یہ قصہ آگرہ میں بہت مشہور ہے اور یہی قصہ خدا بخش خاں کی لائبریری کے ایک دوسری قلمی کتاب میں بھی موجود ہے:۔

"شاہجہاں کے چار لڑکوں کے علاوہ چار لڑکیاں بھی تھیں (۱) انجمن آرا (۲) گیتی آرا (۳) جہاں آرا (۴) گوہر آرا (دہر آرا) یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چھوٹی لڑکی کی ولادت کے چند گھنٹے قبل پیٹ سے بچہ کے رونے کی آواز آئی! اس آواز کے سنتے ہی بیگم اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی۔ اور اس نے بادشاہ کو طلب کیا اور ہر ہر لفظ پر زور دیکر کہنا شروع کیا" یقینی بات ہے کہ جب بچہ کی آواز ماں کے پیٹ سے سنائی دیتی ہے تو عورت کی موت لازمی ہے۔ میرے سرتاج! اب میری قسمت میں اس دنیا کی بہار نصیب نہیں اور عنقریب دوسرے عالم میں قدم رکھنے والی ہوں۔ میری باتوں کو جس سے آپ کے دل کو صدمہ پہونچا ہو معاف کیجیے اور میرے قصور کو اپنے دل سے معاف کر دیجیے کہ آخری سفر درپیش ہے۔ میرے مالک! میں قید میں آپ کے ساتھ، مصائب میں آپ کی دمساز تھی۔ لیکن اب جبکہ خدائے عزوجل نے آپ کو تخت و تاج کا مالک بنایا ہے، آہ مجھے آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونا پڑتا ہے۔ وعدہ کیجیے کہ آپ میری دو خواہشیں پوری کریں گے"

شاہجہاں نے جان و ایمان کی قسم کھائی اور آرزوئیں دریافت کیں۔ بیگم نے کہا "خدا نے آپکو چار لڑکے اور چار لڑکیاں دی ہیں، وہ آپ کی بقائے سلطنت و شہرت کے لیے کافی ہیں اور اب میری خواہش ہے کہ اب دوسری بیگموں سے کوئی اولاد نہ ہوتی کہ اُن سے اور میرے بچوں سے خانہ جنگی برپا ہو کر سلطنت تباہ و برباد ہو جائے۔ اور میری دوسری تمنا یہ ہے کہ میری قبر پر ایک ایسا مقبرہ بنایا جائے کہ دنیا میں جسکی کوئی مثال نہ ہو"۔ اسکے چند لمحوں کے بعد گوہر آرا (دہر آرا) پیدا ہوئی اور بیچاری بیگم اس دنیا سے سدھاری"

لیکن مذکورہ بالا بیان ایک افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس زمانہ کا مشہور مورخ عبدالحمید لاہوری اس معاملہ میں بالکل خاموش ہے۔ وہ اس واقعہ جانگداز کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتا ہے

"جب بیگم کو اپنی موت کا یقین کامل ہو گیا تو اس نے جہاں آرا کو بادشاہ سلامت کے بلانے کو بھیجا۔ وہ غمگین و افسردہ، بیمار بیگم کے پاس آیا۔ اور بیگم نے اپنی ماں اور اولاد کو شاہ کے سپرد کیا اور سفر آخرت کر گئی"

پہلے اُنکا جسد خاکی برہمپور کے ایک باغ میں جو دریاے تاپتی کے کنارہ پر واقع ہے سپرد خاک کیا گیا۔ یکم دسمبر کو اُسکی نعش وہاں سے نکال کر شہزادۂ شجاع کے زیر اہتمام آگرہ روانہ کی گئی اور ۲۰ کو وہاں پہونچی۔

ایک وسیع حصۂ زمین شہر آگرہ کے جنوبی طرف مقبرہ کے لیے کہ کہ اُسکے مالک راجہ مان سنگھ کے پوتے راجہ جے سنگھ سے خرید اگیا۔ عمارت کے چند نقشے تیار کر کے شاہجہاں کے سامنے پیش کیے گئے۔ ان میں سے ایک منظور ہوا۔ اور اُس نقشہ کے بوجب پہلے ایک لکڑی کا ڈھانچہ تیار کیا گیا۔

عمارت کی تعمیر ابتدائے سنہ ۱۶۳۲ء میں شروع ہو کر جنوری سنہ ۱۶۴۲ء میں ختم ہوئی۔ اُس وقت کے دو مشہور انجنیر (۱) مکرمت خاں اور (۲) میر عبدالکریم کے زیر نگرانی یہ عمارت پچاس لاکھ روپے کی لاگت پر تکمیل کو پہونچی۔ دیوان آفریدی کے دیباچہ میں عمارت کی لاگت کا اندازہ ۹ کروڑ ستر ہ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ اور ذیل کے اشخاص کا نام دیا گیا ہے جو عمارت کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔

(۱) امانت خاں شیرازی، قندھار سے بلا کر طغری کی کتابت پر مامور کیے گئے۔

(۲) اُستاد عیسیٰ، آگرہ سے معماری کے لیے طلب کیے گئے۔

(۳) اُستاد پیرو، دہلی کا ایک نامور نجار بھی موجود تھا۔

(۴) جوہر
(۵) چاٹ مل } دہلی کے مشہور سنگتراش بھی اس میں کام کرتے تھے
(۶) زوردار

(۷) اسمٰعیل خاں۔ معمار خاص گنبد و مولا

(۸) رام مل کشمیری باغبان۔

حال کی ایک اُردو تصنیف میں اور آدمیوں کے نام بھی گنائے گئے ہیں لیکن نہ معلوم اُنکے ذریعہ معلومات کیا ہیں۔

ذیل کے بیس قسم کے قیمتی پتھر اس میں لگائے گئے تھے۔

| | |
|---|---|
| (۱) عقیق از قندھار | (۳) سنگ احمر، از لنکا |
| (۲) سنگ سلیمانی از اقصاے عرب | (۴) سنگ پونچہ، از دریاے نیل |

(۵) سنگ ذہب، از بصرہ و بحر احمر
(۶) سنگ خاتو، از کوہ جودھ پور
(۷) سنگ عجوبہ، از دریاے نوہی کوماؤ
(۸) سنگ مرمر، از مکرانہ
(۹) سنگ مریم، از شہر بصرہ
(۱۰) سنگ بدل، از دریاے نباس
(۱۱) سنگ یمن، از یمن
(۱۲) مونگا، از بحر اطلانٹک
(۱۳) سنگ غوری، از غور
(۱۴) سنگ ترہ، از دریاے گنڈک۔
(۱۵) فیروزہ، از کوہ ابابدھان
(۱۶) سنگ موسیٰ، از کوہ سیناء
(۱۷) سنگ گوالیری از گوالیر
(۱۸) سنگ اخضر از اطراف دریا و ملک
(۱۹) سنگ یشب از ایران
(۲۰) سنگ وحیں از دریاے آسان

بیگم مرحومہ کی بارہویں سالگرہ وفات ۲۷ رجنوری ۱۶۴۳ء کو شاہجہاں نے مقبرہ کا معائنہ کیا۔ اور ۳۰ گانوں جو پرگنہ آگرہ و نگرچن میں تھے اور انکی آمدنی ایک لاکھ روپیہ تھی، اور سرائیں اور دوکانیں جو مقبرے کے اردگرد تھیں اور جن کے کرایہ سے تقریباً ایک لاکھ روپیہ آتا تھا، اسکے قیام اور حافظوں کے مشاہرہ کے لیے وقف کر دیا۔ مصنف بادشاہ نامہ نے ان گانوں کی فہرست بھی دی ہے۔

سید نجیب اشرف دسنوی (متعلم پٹنہ کالج)

نسیم صبح گلشن میں نہایت عطر بار آئی — چٹک کر کہتے ہیں غنچے بہار آئی بہار آئی
گئی بلبل سو مینا اور جا کر پکار آئی — چلو بادہ کشو گلزار میں فصل بہار آئی
ہمارے رنج میں حصہ لیا سب اہل گلشن نے — نسیم آئی پریشاں اور بلبل بیقرار آئی
وہ آئے فاتحہ پڑھنے تو استقبال کرنے کو — ہماری روح باغ خلد سے سوے مزار آئی
گریباں چاک گل، شبنم ہے گریاں، بلبلیں نالاں — ریاض دہر میں غم آفریں اب کی بہار آئی
گلوں کا جذب الفت کھینچ لیجائیگا گلشن میں — قفس میں رہ نہیں سکتے اگر فصل بہار آئی
محبت میں ہے انکی وصل سے انکا خیال اچھا — کہ وہ آئے نہ آئے یاد انکی بار بار آئی
پریشاں ہے جگر دل مضطرب آنکھیں اتی ہیں — قیامت کی گھڑی آئی کہ شام انتظار آئی
چڑھانے پھول کی چادر جو وہ رشک چمن آیا — تو بلبل بھی تصدق ہونے کو سوے مزار آئی
ادھر آؤ گنہگارو اگر بخشش کی خواہش ہے — بروز حشر ہر سو رحمت حق یہ پکار آئی
قفس والوں سے کیوں کہتے ہو اظہر قصۂ گلشن — انھیں کیا گر خزاں آئی انھیں کیا گر بہار آئی

# فلسفۂ حیات

جہاتِ اربعہ میں خوفناک خاشی، ہر طرف سناٹا، ہولناک سین، دہشت ناک منظر۔ انسان کی ہوا بھی ان خاردار جھاڑیوں تاریک جنگل کے منوس ہیڑہ میں کبھی نہ گذری ہوگی۔ جہاں دریائی کھادر بے رحم درندوں کے مامن تھے۔

ہزاروں کوس لمبا جنگل ایسا لامحدود ومند رتھا جسکی تھاہ کے لیے ہزاروں غوّاص تہ نشیں ہو چکے ہوں۔ تنادر درختوں کا سلسلہ اندازہ وقیاس سے افزوں تھا۔

نسیم عنبر کے مقابل آندھی کے غبار آلود گرم جھکّڑ تھے، گلہائے تر کے عوض زرد رو خزاں رسیدہ خشک پتے تھے۔ روح پرور خوشبوؤں کے بدلے، درندوں کے کچھار کی شامہ شکن بوتھی۔ سیب انار اور نارنگی کے بجائے، کیڑی، دھتورا اور بیسیوں قسم کے تلخ و زہریلے پھل تھے۔ بامرہ نوار نظارت و تازگی کی جگہ، تیرگی خیز و نفرت انگیز مناظر اور خس وخاشاک تھے۔ مینو سواد زمردیں سبزہ کی جگہ خارِ مغیلاں اور گوکھروؤں کا فرش تھا۔ ستھری روشوں کے مقابلہ میں جلے بھنے سیاہ پتھروں کے بدنما ڈول تھے اور غلغلہ شادمانی کے بجائے موت آسا خاشی تھی۔ ہاں اگر آوازِ حیات تھی تو شیروں کی دھاڑ کی اور پکار تھی تو ہرن وبارہ سنگھے کی دوڑ کی۔

مئی کا مہینہ، تپتی ہوئی دوپہر کا وقت، آسمان آتش فشانی کر رہا تھا اور زمین اپنے دلی بخار کو جلتی ہوئی بھاپوں کی صورت میں شکم خاک سے نکال رہی تھی۔ جنگل کے ایک خاموش کونے سے صدائے نغمہ بلند ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ خدایا اس عالم ویرانہ میں، اس ہو کے مقام میں کون معروف ترانہ ریزی اور نغمہ سنجی ہے؟ بے اختیار دل کھنچا۔ روح میں ایک تلاطم تجسس برپا ہوا اور میں بندوق لیے، آہستہ آہستہ اس روح نواز کشش کی طرف چلا۔ میں نے اگرچہ مغربی تعلیم پائی ہے اور مشرقی علوم وخیالات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ (ملے وسلے ہماری گمراہی) مگر میں بعض پرانے توہمات کو بالکل نہ چھوڑ سکا ہوں، قدم معًا اس واہمے سے رُک گئے کہ جب انسان کا وہم وگمان بھی اس وحشت کدۂ ظلمت میں نہیں آسکتا ہے، تب تو یہاں ضرور کوئی عفریت، کوئی چھلاوہ یا کوئی بھوت ہو

جو میری ہستی برباد کرنے کے لیے موسیقی سے مجکو لبھا رہا ہے آواز پُر ذوق و پُر نشہ ہوتی چلی جاتی تھی اور میں خود کو اُس میں جذب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ قوتِ احساس کو اُس نے ایسا مغلوب کر دیا کہ میں اپنے پہلے خیال پر قائم نہ رہ سکا۔ بے اختیار قدم اُٹھ گئے اور میں مست و مدہوش ایسی جگہ پہونچ گیا جہاں سے یہ دلکش نغمہ چھوٹے آبشار کی طرح بانسری سے رِس رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک پیرمرد اپنی خس پوش جھونپڑی کے آگے پتھر کے ایک اونچے ٹکڑے پر پالتی مارے مست الست بیٹھا ہے۔ واللہ حیرت اور حیرت بھی کیسی پاگل کر دینے والی حیرت، مبہوت کر دینے والی حیرت۔ شکار کی دھن میں ساتھیوں سے بچھڑکر راستہ بھولکر صبح سے پاپیادہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ نہ راہ ملتی تھی نہ ساتھی، نہ شکار ملتا تھا نہ ہاتھی (کیونکہ شکاری خبط میں ہاتھی سے اُتر کر پیادہ ہو لیا تھا) ایک انسانی صورت دیکھکر جیسی ڈھارس بندھی ناقابلِ اظہار ہے۔ اگرچہ اب تک پورا یقین نہ تھا کہ وہ دراصل انسان ہے اور میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں۔ اسلیے از روے احتیاط میں نے دُور ہی سے "علیک سلیک" کی ٹھیرائی۔ اور اس خیال سے کہ اگر وہ واقعی کوئی بھوت چڑیل ہے تو فوراً گولی مار دوں گا، بندوق میں کارتوس رکھکر میں نے کسی قدر فاصلہ سے باآواز "السلام علیکم" کہا۔ ہاے! میری اس مداخلت نے اُسکے دلچسپ مشغلہ کو بُری طرح توڑ دیا۔ اچانک چونک کر اُس نے میری طرف دیکھا اور جواباً "وعلیکم السلام" کہا۔ میں نے اپنی عقل کے موافق اُن سے سب سے پہلا جو سوال کیا وہ یہ تھا

میں۔ یا حضرت آپ کون ہیں جو اس ظلمت کدہ میں اقامت گزیں ہیں؟

بزرگ۔ اور بیٹا تم کون ہو جو یہاں مارے مارے پھر رہے ہو؟

میں۔ حضرت میں تو ایک شکاری ہوں کہ راستہ بھولکر ادھر آ نکلا ہوں

بزرگ۔ اور میں خدا کا ایک گناہگار بندہ ہوں کہ دُنیا کے جھگڑوں کو چھوڑ کر اُسکی یاد میں یہاں آ بیٹھا ہوں۔

میں۔ بھلا شیروں کی خوفناک چیخیں، بھیڑیوں کی غرغراہٹ آپ کو خوف زدہ کرکے اُسکی یاد و عبادت گزاری میں خلل انداز نہ ہوتی ہوگی؟

بزرگ۔ بیٹا۔ جب تم کچہری، دفتر یا اور کہیں اپنے فرائض منصبی جو تم پر عائد کیے گئے ہوں پورے کرنے جاتے ہو تو کیا بازار کا تماشہ، دوستوں کا ہجوم، بال بچوں کا خیال اُسکو بھلا دیتا ہے؟

میں ۔ نہیں تو ـــــ لیکن اگر ہمکو اُن فرائض میں اتلافِ جان کا خوف ہو تو ہم واقعی اُنکو بُھلا دیں۔

بزرگ ۔ اسی طرح اگر ہمکو بھی ایمان کے جانے کا خوف نہ ہوتا ضرور تمہاری ہی دنیا میں آبستے

میں ۔ آپ کا فلسفۂ حیات تو عجیب ہے۔

بزرگ ۔ ہاں جس طرح تمہاری منطقِ زندگانی نرالی ہے۔

میں ۔ ذرا انصاف کیجیے گا اگر میں صاف کہوں ـــــ روح کو، جو خدا کی ایک بیش بہا نعمت ہے، اس طرح گھونٹ گھونٹ کر رکھنے اور عقوبت کے ساتھ عبادت پر مجبور کرنے کا نام عبادت طاعت نہیں ہے نہ اسکا حکم ہے۔ اور کیا خدا کی نعمتوں اور بندوں سے کنارہ کر کے جنگلوں ویرانوں میں آبیٹھنا کفرانِ نعمت نہیں ہے؟

بزرگ ۔ تمہارے نزدیک میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہوں۔ لیکن آؤ ذرا اپنی اور میری حالت کا اندازہ کرلو۔ جسمانی حالت لو۔ تم نفضلہ جوان ہو، لطیف غذائیں لذیذ فواکہات کھاتے ہو۔ اور میں بوڑھا ہوں جنگلی پھلوں اور شکار کے گوشت پر گذر کرتا ہوں تب بھی تم مجھسے زیادہ قوی و تندرست نہیں ہو۔ تم شاندار محلوں، آسائش بخش قصروں میں رہتے ہو سواریوں میں پھرتے ہو اور میں غلیظ گرد و غبار اور صورت بگاڑنے والی آلودگیوں میں زندگی کاٹتا ہوں پھر بھی تمہارا رنگ مجھسے زیادہ صاف نہیں۔ شام کے وقت فرحت بخش ہوائیں، مسرت انگیز دل لبھانے والی چیزیں تمہارے گردوپیش ہوتی ہیں پھر بھی تمہارے چہرے پر وہ تر و تازگی نہیں جو مجھ بادیہ نشیں پر ہے۔

"روح کو گھونٹ گھونٹ کر رکھنے کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا ادھر دیکھو جب مجھکو پیاس لگتی ہے تو اس (سامنے اشارہ کر کے) ندی کی ٹھنڈی روانی میں سے دو چُلّو بھر کر پی لیتا ہوں، روح خوش و تازہ ہو جاتی ہے۔ بھوک لگتی ہے تو میری جھونپڑی میں تیر و کمان موجود ہے کسی ہرن یا بارہ سنگے کا شکار کرتا ہوں اُسکا تازہ گوشت خشک کباب بنانے کے بعد جس قدر لذت بخش ہوتا ہے وہ تمھارے اطعمۂ لذیذہ کو بھی نصیب نہ ہوگا۔

کھانے پینے کا مسئلہ تو یوں طے ہوا۔ اب لو مسرتِ روح کا سامان، تو جب کبھی عبادت کے اوقات سے فرصت ملی اور روح نے شگفتگی چاہی تو اس (بانسری کو دکھا کر) نغمۂ سیال کو

لے بیٹھا ہوں جس سے میری روح تحیّت و جہالت رقص کرنے لگتی ہے ——— اور یہی (بامعنی انداز سے) وہ چیز ہے جس سے تم کھنچے چلے آئے ———

اب ذرا اپنی زندگی کا حال سنو۔ تم دنیا کے جھوٹے بیکار قصوں میں دن رات گھرے رہتے ہو تمھارے دروازوں پر قرض خواہوں کا ہجوم رہتا ہے۔ تم دوستوں کے اژدہام میں خدا و رسول کو بھولے رہتے ہو۔ دنیاوی لہو و لعب، آخرت کے عذاب و ثواب سے تم کو بے خبر رکھتا ہے۔ تو پریشانیوں و مکروہ افکار میں مبتلا رہتے ہو۔ جسمانی بے اعتدالیاں تم کو امراض و آلام کا نشانہ بنائے رکھتی ہیں۔ آپس کا بغض و عناد تم کو بنی نوع انسان کی فائدہ رسانی سے محروم رکھتا ہے۔ باہمی ناچاقیاں تمھارے خاندانوں کو برباد کر دیتی ہیں۔ اور تم محض ذاتیات و نفسانیت سے مذہب کو پامال اور ملک و قوم کو برباد کر دیتے ہو اور ———

پیر مرد کی تقریر آدھی رہ گئی کیونکہ مجھکو تھوڑی دور پر اپنے ساتھیوں کی آواز معلوم ہوئی جو شاید میری ہی جستجو کر رہے ہوں گے ——— میں بے تحاشا اٹھکر بھاگا کہ کہیں یہ موقع بھی نہ نکل جائے اور میں یہیں مر رہوں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تو پالیا مگر افسوس کہ اس بزرگ کے نصیحت بخش اقوال کھو دیے ——— اب یاد آتا ہے اور میں تاسف سے ہاتھ ملتا ہوں۔ خدا معلوم وہ خضرِ طریقت کون تھا؟

خاکسار عبدالحی ہالک (علیگ)

کسی کا روئے تبسم شعار یاد آیا — گلاب پھول چکا تو انار یاد آیا
غضب کی دیدۂ نرگس میں آ گئی مستی — کسی کی آنکھ کا اسکو خمار یاد آیا
ہماری آہ سے دل میں کسی کے ٹھنڈک ہو — ہمارے رونے سے ابرِ بہار یاد آیا
غبار ہو کے نہ آتا کبھی قریب اپنے — یقین ہے انھیں یہ خاکسار یاد آیا
قفس کے خانے یوں منہ نہ موڑتا صیاد — ہمارے طائرِ دل کا شکار یاد آیا
نکل کے ہاتھ سے قاتل کے وہ گلے لگنا — پسِ فنا بھی مجھے خنجر کا پیار یاد آیا
یہی محبت و الفت کے اصل معنے ہیں — کبھی نہ آپ کو یہ جاں نثار یاد آیا
نشاں مٹانے کو آئے ہیں آج تربت پر — خدا کی شان ہمارا مزار یاد آیا

بہار آئی تو بیکس کو جنگِ ہستی میں
خراب تھا نہ پہ درد کا رشتہ یاد آیا

بیکس (بکاکوری)

# لیڈیز کانفرنس کلکتہ کی حقیقت

شخصیت پرستی کا سودا، کم سے کم مسلمانوں میں اب اس پیمانے پر پہونچ گیا ہے کہ اگر اسکی اصلاح میں پوری سعی نہ کی گئی تو اندیشہ قوی ہے کہ مسلمانوں کی جو تھوڑی بہت عزت دوسری قوموں کی نگاہوں میں باقی ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی۔ ہماری مشہور و معروف قومی مجلسوں کا نظم و نسق اسی تاپاک مرض کی وجہ سے ابتر و برباد ہو رہا ہے اور اسکی تمام تر ذمہ داری ہمارے ہی سروں پر ہے مگر حال میں جو واقعات کلکتے میں آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کے سلسلے میں پیش آئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا مردوں سے گذر کر عورتوں کے طبقے تک پہونچ گئی ہے اور وہ شخصیت ایک ہی وقت میں دونوں جنسوں کی بربادی کے درپے ہے۔

آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کا چھٹا سالانہ اجلاس ۱۰ ر ۱۱ اور ۱۲ ر فروری کو کلکتے میں منعقد ہونے والا تھا۔ انجمن خواتین اسلام کلکتہ نے ابتداءً کانفرنس کو مدعو کیا تھا اور جب اس انجمن کی دعوت کو جناب نفیس دولھن صاحبہ سکرٹری کانفرنس نے قبول کرلیا تو حسب دستور عام کلکتے میں ایک مجلس استقبالی قائم ہوئی جسکی صدر بیگم صاحبہ سیٹھ عبداللطیف احمد صاحب اور سکرٹری مسز سخاوت حسین مرحوم منتخب ہوئیں۔ ان محترم خواتین نے شہر کی دوسری معزز بیبیوں کے ساتھ مل کر جملہ انتظامات انجام دیے اور مسز عارف جام کے مکان واقع نمبر ۵ رپن اسٹریٹ میں ایک وسیع تختۂ اراضی انعقاد جلسہ کیلیے منتخب کیا گیا۔ ۱۴ر اور ۱۵ر فروری کو تقریباً ۶۰۰ دعوتی کارڈ جاری کیے گئے جن میں بیگمات کلکتہ سے اسی مقام پر شریک جلسہ ہونے کی درخواست کی گئی تھی۔ ۱۶ر فروری کو نظیر نذر بیگم صاحبہ (اہلیہ مسٹر سلیمان قاسم مٹھا) نے سکرٹری صاحبہ مجلس استقبالی کو ایک تحریر اس مضمون کی بھیجی کہ جو مقام انعقاد جلسہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ ایسا ہے جہاں بعض اراکین انجمنِ خواتین اسلام شریک نہیں ہوسکتیں۔ جسکے جواب میں انکو لکھا گیا کہ سوائے اُنکے کسی دوسری رکن نے جلسے میں شرکت سے انکار نہیں کیا ہے اور یہ درخواست کی گئی کہ یہ ایک قومی جلسہ ہے جسکے لیے مسز جام نے اپنی زمین از راہ عنایت عطا کی ہے اور انکو بلالحاظ ذاتی مخالفت کے قومی کام میں شرکت کرنا چاہیے۔ ۱۰ر فروری کو نفیس دولھن صاحبہ سکرٹری کانفرنس اور جناب بیگم صاحبہ نواب فرید جنگ بہادر جو جلسہ سالانہ کی صدر منتخب ہوئی تھیں کلکتے پہونچیں اور مسٹر غلام حسین عارف کے مکان پر مقیم ہوئیں۔

۸ر فروری کو نفیس دولھن صاحبہ نے سکریٹری صاحبہ مجلس استقبالیہ سے مل کر انکو اطلاع دی کہ چونکہ بعض خواتین مجلس استقبالی کے منتخب کردہ مقام پر اجلاس منعقد ہونے کی صورت میں شریک نہ ہونگی اسلیے وہاں جلسہ نہیں منعقد ہو سکتا - مسز سخاوت حسین (سکریٹری مجلس استقبالی) کے یہ کہنے پر کہ جب تک مجلس استقبالیہ کی دیگر اراکین سے مشورہ نہ کیا جائے اسکا قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا طے پایا کہ شام کو پھر نفیس دولھن صاحبہ اُنکے گھر پر آئیں گی - چنانچہ بموجب قرارداد شام کو مجلس استقبالی کی بہت سی بیبیاں جمع ہوئیں اور نفیس دولھن صاحبہ نے اُن سب کی موجودگی میں اس امر پر اصرار کیا کہ جلسہ دوسری جگہ منعقد کیا جائے مگر جلسہ میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا -

۹ر تاریخ کو نفیس دولھن صاحبہ مسز سخاوت حسین کے اسکول میں آئیں جہاں انجمن خواتین اسلام کی دیگر اراکین جمع تھیں - اور اُنکو مطلع کیا کہ اُنھوں نے گلستان پارک میں انعقاد جلسہ کا انتظام کیا ہے اور مقررین کو اسکی اطلاع کر دی ہے - جسکے جواب میں یہ کہا گیا کہ اُنکی یہ کارروائی بالکل خلافِ ضابطہ ہے اور مقام اجلاس کا انتخاب اور انعقاد جلسہ کے متعلق جملہ انتظامات کرنا مجلس استقبالی کا کام ہے اور اُنکو کوئی حق نہیں ہے کہ جہاں جی چاہے جلسہ منعقد کریں اور اس طرح مجلس استقبالی کے تمام انتظامات درہم برہم کرکے اراکین مجلس کے جذبات کو پامال کریں - مگر نفیس دولھن صاحبہ نے ایک نہ سُنی اور اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ رہیں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۱۱ بجے رات کو جلسہ برخاست ہوا اور نفیس دولھن صاحبہ مع ہمراہیان رخصت ہوئیں تو بقیہ حاضرین نے اس مسئلے پر دیر تک غور و خوض کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ سکریٹری صاحبہ کانفرنس کی خود رائی اور بے ضابطہ کارروائی قطعًا ناقابلِ برداشت ہے اسلیے مجلس استقبالی کی اراکین اُس کانفرنس میں شرکت نہ کرینگی جو گلستان پارک میں منعقد کی جا رہی ہے - اور دوسرے دن اسکی اطلاع نفیس دولھن صاحبہ کو بذریعہ ٹیلیفون کر دی گئی -

ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۰ر فروری کو ۱۱ بجے جب تقریبًا دو سو خواتین نمبر ۸ پن اسٹریٹ میں کانفرنس کی شرکت کی غرض سے پہونچیں اور اُن کو ان تمام حالات کی اطلاع ہوئی تو سب بجائے اسکے کہ گلستان پارک جا کر شریکِ کانفرنس ہوتیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں - خواتین کلکتہ کی تعداد کثیر میں جو بددلی ان حالات سے پیدا ہوئی تھی اور جسکی بنا پر اُنھیں کانفرنس کی شرکت سے احتراز کرنا پڑا اُسکو رفع کرنے کی غرض سے انجمن خواتین اسلام کے زیر اہتمام ۱۲ر فروری کو اسی مقام پر ایک جلسۂ عام خواتین کلکتہ کا منعقد ہوا جسمیں بیان کیا جاتا ہے کہ چھ سو سے زیادہ بیبیاں شریک ہوئیں - بخلاف اسکے گلستان پارک میں جو جلسہ

آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کے نام سے منعقد ہوا تھا اُس میں پہلے دن ۴۵ دوسرے دن ۲۵ اور تیسرے دن صرف ۲۰ خواتین شریک ہوئیں۔

واقعات بالا اُس تحریر سے مقتبس ہیں جو مسز سخاوت حسین آنریری سکرٹری انجمن خواتین اسلام وسکرٹری مجلس استقبالیہ کے دستخط سے اخبار مسلمان کلکتہ مورخہ ۱۷ فروری میں شائع ہوئی ہے اور جس میں اُنھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اگرچہ اخبارات میں لیڈیز کانفرنس منعقدہ گلشان پارک کے شرکا کی تعداد ۴۰۰ ظاہر کی گئی ہے مگر حقیقتِ حال وہی ہے جو اُنھوں نے لکھی ہے اور جسکی عینی شہادت منجملہ دیگر خواتین شریکِ جلسہ کے بیگم صاحبہ شیخ عبداللہ صاحب وکیل علیگڈھ اور فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ ہمشیرہ مولانا ابوالکلام آزاد (یہ غالباً آبرو بیگم صاحبہ کا پورا نام ہے جو سال گذشتہ لیڈیز کانفرنس کی صدر ہو چکی ہیں) دیتی ہیں۔

مسز سخاوت حسین اپنی نیک نفسی سے نفیس دولھن صاحبہ اور بیگم صاحبہ نواب خدیو جنگ بہادر کے اس طرزِ عمل کی ذمہ داری اُنکے سر نہیں رکھنا چاہتی ہیں بلکہ قاسم عارف اور عارف عمام کے دو بڑے گھرانوں میں جو خاندانی منازعت عرصے سے چلی آرہی ہیں اُنکو اسکا سبب قرار دیتی ہیں اور یہ خیال کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے بعض اپنے میزبانوں کی خاطر یہ تمام کارروائی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نفیس دولھن صاحبہ اگر لیڈیز کانفرنس کی مستقل سکرٹری اور بیگم صاحبہ نواب خدیو جنگ بہادر اجلاس کی منتخبہ صدر نہ ہوتیں تو یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ یا اُنکی میزبان بیبیاں جہاں چاہتیں کانفرنس کا اجلاس منعقد کرلیتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی طرف سے جو اقتدار ان دو مقتدر خواتین کو حاصل تھا اُسکا نہایت بیجا استعمال کیا گیا۔ اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ تمام خواتین کی اس خود رائی اور بیجا دخل کے خلاف سیدھے احتجاج بلند کریں اور انکو متنبہ کردیں کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے کارکنوں کی خواہش اقتدار اور خودرائی نے جو نقصان کانفرنس اور لیگ کی منزلت کو پہونچایا ہے آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کو اس سے کہیں زیادہ صدمہ پہونچنے کا احتمال ہے۔ اسلیے کہ ابھی تک ملک میں اس کانفرنس کو وہ مقبولیت بھی میسر نہیں ہو سکی ہے جو مردوں کی ان دو بدنام مجالس کو حاصل تھی۔

آخر میں بارگاہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ میں التجا کی جاتی ہے کہ خدائے کریم ہمارے اُن بھائیوں اور بہنوں کو جو جاہ و حشمت اقتدار و دولت و مناصب سے سرفراز کیے گئے ہیں معاملات قومی میں ان نعمتوں کے بیجا استعمال سے محترز رہنے کی توفیق دے تاکہ اسلام نے جس مساوات و اخوت کی تعلیم دی ہے اُسپر غیر اقوام و مذاہب کے لوگوں کو مضحکہ کرنے کا موقع نہ ملے اور مسلمانوں کا شیرازہ قومیت ایک کتاب پارینہ کے اوراق کے مانند بکھرنے سے محفوظ رہے۔ آمین

# نظرے خوش گذرے

جنوری نمبر میں "سیاسی رہنماؤں کے کارنامے" کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ دو مہینے سے قوم کے روبرو پیش ہے۔ کارفرمایان لیگ کی طرف سے جیسی کہ توقع تھی اسکا جواب خاموشی سے دیا گیا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ ارکان لیگ جو ابھی تک دوسروں کی مصلحتوں پر اپنے ایمان و یقین کو قربان کرنا نہیں سیکھ سکے ہیں ۹ اپریل کے جلسہ میں اسپر کیا کارروائی کرتے ہیں۔

اخبار قوم دہلی مورخہ ۱۰ر جنوری میں مسلم لیگ کے ایک ممبر نے جو طویل تحریر شائع کرائی ہے اسکی حسب ذیل سطور ملاحظہ فرمائیے:۔

"اسی اثناء میں مولانا ظفر الملک صاحب ایڈیٹر الناظر نے لیگ کی کونسل کے ایک جلسہ میں سید وزیر حسن صاحب پر چند ناقابل ذکر الزامات لگائے۔ لیکن ممبران کونسل نے ان الزامات کو قابل یقین نہیں سمجھا۔ تاہم جبکہ کونسل کے سامنے باضابطہ طور پر یہ الزامات لائے جاچکے تھے تو یہ ضروری معلوم ہوا کہ حسابات کی جانچ کیلیے ایک آڈیٹر مقرر کیا جائے۔ چنانچہ کونسل نے اسی مضمون کا ایک رزولیوشن پاس کر دیا۔ البتہ دوران بحث میں ایک حقیقت بخوبی واضح ہوگئی۔ یعنی خود سید وزیر حسن صاحب اور انکے احباب نے اس امر کا اعتراف کیا کہ انکی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے لیگ کا کچھ روپیہ ضائع ہوا اور اسکے حسابات نہایت ابتر حالت میں رہے۔"

ایڈیٹر الناظر نے جو کچھ جلسہ لیگ میں عرض کیا تھا بجنسہ وہی معنی [illegible] الناظر میں لکھا جا چکا ہے اور اگر آڈیٹر صاحبان حسابات کی جانچ کرتے وقت یاد فرمائیں گے تو وہ اپنے بیانات کی تائید مسلم لیگ کے [illegible] رجسٹروں سے کرادیگا جنکو دیکھکر [illegible] یہ حالات معلوم ہوئے تھے [illegible] ارکان مسلم لیگ اس قدر مرعوب ہیں کہ وہ بات کی تہ تک [illegible] مگر انشاءاللہ وہ زمانہ دور نہیں جب ارکان لیگ کی آنکھیں کھلیں گی [illegible] حقیقتوں کے اعتراف پر مجبور ہوں گے۔

اخبار قوم کی ایک دوسری اشاعت میں اعلان کیا گیا ہے کہ اراکین مسلم لیگ نے اپریل کے جلسہ

میں پیش ہونے کے لیے ایک رزولیوشن دفتر لیگ میں لیگ کے حسابات کی ابتری اور آنریری سکرٹری صاحب کی غفلت پر اظہار افسوس کی غرض سے بھیجا ہے جو "تجویز ملامت" کی ایک دوسری صورت ہے — اگر یہ رزولیوشن ہاتھی کے دانتوں کی طرح محض نمایش حریت کا ذریعہ نہیں بننے والا ہے اور اپریل کے جلسہ میں واقعتہً پیش کیا جائے گا تو اُسوقت غالباً تمام حالات منظر عام پر آجائیں گے۔

راقم الحروف کا قطعی ارادہ تھا کہ ان مجالس سے اب ہمیشہ کے لیے دستکش ہوجائے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ احباب جن کی آزادی و حریت پر اعتماد تھا تجربے سے ثابت ہوا کہ اس اعتماد کے اہل نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اپنی خرابیِ صحت کے باعث میں اُس سخت ہیجان کی تاب نہیں رکھتا جو قومی تھیٹروں میں ایسے المناک واقعات کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ مگر اکثر احباب پُروزن دلائل کی بنا پر اسکے خلاف چاہتے ہیں اسلیے میں اُنکے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ الٰہ العالمین اسکی ہمت عطا فرمائیں کہ ان ہیجانات کی برداشت ہوسکے اور اس ذریعہ سے جس خدمت کی احباب توقع باندھتے ہیں وہ انجام پاسکے۔

---

مسلم لیگ کے کارکنوں کی بے اتفاقی و غفلت کا اس سے کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر صدارت کے متعلق حکومت ہائے پنجاب و صوبہ متحدہ نے ضبطی کے احکام صادر کیے جن کے خلاف ہندوستان کے بڑے شہروں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے مقامات تک میں مسلمانوں نے جلسے کرکے صدائے احتجاج بلند کی لیکن لکھنؤ جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر دفتر ہے اور جہاں . . . . لیگ کے رفیع القدر عہدہ دار تشریف رکھتے ہیں وہاں کسی کو شاید اسکا خیال تک نہیں ہے کہ اس قسم کی کارروائی کی جائے۔

بے شک سیاسی لیڈروں کو پورا حق حاصل ہے کہ اپنی سنہری روپہلی مصلحتوں پر قوم کی منفعتوں کو نثار کرکے مسلم لیگ کی عزت بھی خاک میں ملادیں لیکن اُن احباب سے کیا کہا جائے جو ان کارناموں کے باوجود مسلم لیگ جیسی گراں قدر متاعِ قومی کو پھر ان خانہ برانداز جمن کے حوالہ کردینے پر طیار ہوگئے اور اگر موقع آئے گا تو آئندہ بھی انشاء اللہ پھر انھیں بتوں کے سامنے جبینِ نیاز جھکائیں گے۔

---

قومی اخبارات میں غلط ہے کہ کار فرمایان لیگ اپریل میں مسلم لیگ سے پھر علٰحدہ ہوجائیں گے۔ الناظر

کا موقر انگریزی اخبار "لیڈر" اس خبر کا ذمہ دار ہے۔ اور اسکو اسپر اس درجہ وثوق ہے کہ باوجود اسسٹنٹ سکرٹری صاحب مسلم لیگ کی طرف سے تردید کیے جانے کے وہ لکھتا ہے کہ "ہماری اطلاعات بالکل صحیح ہیں"۔ بے شبہ یہ استعفے باضابطہ طور پر مسلم لیگ کے دفتر میں ہنوز نہیں وصول ہوئے ہیں اور اس وجہ سے اسسٹنٹ سکرٹری صاحب کی تردیدی تحریر بھی بجائے خود صحیح ہے۔ لیکن واقعہ وہی ہے جو "لیڈر" بیان کر رہا ہے۔* بلکہ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ "لیڈر" نے جس ذریعہ سے یہ معلومات حاصل کی ہیں ہمیں بھی اُسکا حال معلوم ہو گیا ہے اور اگرچہ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ نہایت خوش آیند خبر ہے مگر ڈاکٹر انصاری صاحب اور ہمارے دیگر احباب کو یہ معلوم کر کے یقیناً افسوس ہوگا کہ اُنکی کوششوں اور جلسۂ لیگ میں اثر آرائیوں کے باوجود یہ سنہری چڑیاں پھر پر تول رہی ہیں۔
اس سے زیادہ یہ امر اُس جماعت کے لیے خاص طور پر اور مسلمانوں کے لیے عام طور پر تشویش انگیز اور قابل افسوس ہے کہ مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کی اُن تجاویز کو بھی کمزور کرنے کی کوشش ہو رہی ہے جو ممالک اسلامیہ اور مسئلۂ خلافت کے متعلق مسلم لیگ میں بر طرز شد و مد پیش کی گئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک نہایت سخت آزمایش کا زمانہ ہے۔ سیاسی معاملات سے اگرچہ اب گہری دلچسپی کا اظہار ہونے لگا ہے مگر ایک سیاسی مجلس کو باقاعدگی اور انضباط کے ساتھ اور مفید و کارآمد طریقہ پر چلانے کی دقتیں اب ایسی ہیں کہ اگر مسلمانوں نے پوری قوت و استقلال سے کام نہ لیا تو عجب نہیں کہ ہمیں اپنی دس سالہ کوششوں کا ماتم کرنا پڑے۔ وہ اصحاب جو اپنے تئیں گروہِ معتدل میں شمار کرتے ہیں، لیگ سے عرصہ ہوا کہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اور جو لوگ ابتک اُسپر قابض و متصرف تھے وہ اب اس بنیاد پر ساتھ چھوڑ رہے ہیں کہ مسلم لیگ پر پان اسلامزم کا بھوت سوار ہے۔ کیا ایسے نازک وقت میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کی اس واحد سیاسی انجمن کی رہنمائی کر سکے۔

قابضین لیگ کی قبا ... حریت ... پارہ ہو چکی ہے اور قوم پر اچھی طرح منکشف ہو چکا ہے کہ اس سنہری جھول کے اندر جو پیکر نمود پنہاں تھا وہ کیسا نازنین اور حقیقی قوت سے عاری تھا۔ کیا اب بھی لیگ کو کسی ایسی ہی پُر فریب ہستی کے دامن ہی سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جائیگی؟ اپریل کے جلسہ میں مسلمان اہل الرائے اصحاب کو جہاں مسلم لیگ کا نظام اساسی درست کرنا ہے وہیں اس اہم ترین صورتِ حال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ہمارے احباب میں کچھ لوگ بھی ایسے ہیں جو خلوص کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی ترقی میں کوشش کرنا چاہتے ہیں تو انکو اپنی ساری توجہ مسلم لیگ کی بنیادوں کو مضبوط و استوار کرنے پر صرف کرنا چاہیے۔ اور اسکی بہترین صورت ہماری ناقص رائے میں یہ ہے کہ عہدہ داران لیگ کے جدید انتخاب میں فرقہ بندی کو دخل نہ دیا جائے بلکہ ...

* اب راجہ صاحب کا استعفا شایع بھی ہو گیا ہے۔

اور طبقۂ احرار دونوں میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جائے جو مسلم لیگ کے اصولوں سے پوری طرح متفق ہوں اور بلند پروازیوں کے بجائے خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

راقم الحروف نے کچھ عرصہ ہوا جب بعض احباب سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اعزازی عہدہ داروں کے علاوہ کم سے کم ایک ایسے درد مند مخلص کی خدمات بھی حاصل کی جائیں جو مناسب معاوضہ لیکر اُن تمام فرائض کو انجام دے سکیں جو اعزازی عہدہ داروں کے ذمے از روے قانون اساسی عائد ہوتے ہیں اور جنھیں وہ اپنی ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے نظر انداز کیے ہوے ہیں۔ اگر مولوی عزیز مرزا مرحوم جیسا کوئی شخص اب ہم میں نہیں ہے تو کیا ایسے لوگ بھی میسر نہیں آسکتے جو مناسب معاوضہ کے عوض میں اپنا سارا وقت اور اپنی تمام قوتیں چند سال کے لیے اس نہایت ہی اہم قومی مجلس کی نذر کر سکیں۔ ہم نے صرف اسی تحریک پر قناعت نہیں کی بلکہ مسٹر عبد الرحمن صدیقی ایم اے ایل ایل بی جیسے پُرجوش نوجوان قوم کو اس خدمت کے لیے نامزد بھی کر دیا تھا اور ڈاکٹر انصاری صاحب ایک وقت میں اسکے لیے بھی طیار ہو گئے تھے کہ صاحب موصوف کو اس خدمت کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیں گے مگر افسوس ہے کہ آجتک یہ اُمید بر نہ آئی۔ اور آج ہم مجبوراً اس تجویز کو دوبارہ الناظر کی وساطت سے پیش کرتے ہیں اور بصد ادب اپنے نوجوان دوست سے التجا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس نے جو قابلیتیں اُنکو عطا فرمائی ہیں اُنکو رائگان کرنے کے بجاے وہ اس مفید ترین خدمت کے لیے برسلے چندے وقف کر دیں۔ ہمیں یقین و ثوق ہے کہ اس تجویز پر اگر عمل کیا جائیگا تو ایسے مفید ثمرات اُس سے حاصل ہوں گے کہ مسٹر صدیقی کو اپنی خدمات پر ہمیشہ فخر و ناز کرنے کا موقع ملیگا۔ اور مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی اگر کبھی کوئی تاریخ مرتب ہوئی تو انکا نام نامی اُس میں زریں حروف سے لکھا جائیگا۔ وما علینا الا البلاغ

## رسید کتب

**قوم العظیم** — مصنفہ خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ اُردو بُک ایجنسی لکھنؤ

**المفرد والمرکب** — از مولوی عبد اللطیف صاحب منشی فاضل مدرس مدرسہ افرہ اندرون دروازہ چار گھاٹ

**سبیۃ الکل** — قیمت ۸ر

**ایجوا ایم بیگ** ایضاً ایضاً قیمت ۸ر

**حسینیہ کلا تعلوا** — مصنفہ مولوی الطاف حسین۔ قیمت ۵ر ملنے کا پتہ سید علی ... محلہ ... امروہہ

بنارس کے مشہور ڈاکٹر گنیش پرشاد بھارگو کا بنایا ہوا

# نمک سلیمانی

قیمت فی بوتل ۔ قیمت فی شیشی

محصول ڈاک ۔ فی دو شیشی

محصول ڈاک وغیرہ ۔ محصول ڈاک وغیرہ

واضح ہو کہ نمک سلیمانی عرصہ ... سال سے تمام ہندوستان اور دیگر ممالک میں استعمال کیا جاتا ہے ہزاروں معزز اصحاب نے اس کے مفید ہونے کا اقرار کیا ہے سب سے بڑی خوبی اس نمک سلیمانی میں یہ ہے کہ ہر مزاج اور ہر عمر کے لوگوں کے موافق آتا ہے حالت تندرستی میں اس کے استعمال سے بھوک خوب لگتی ہے اور جو کچھ کھائیں وہ پوری طور سے ہضم ہو کر خون صالح پیدا کرتا ہے جس سے ہر شخص کی طاقت انسان کے بدن میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان بیماریوں میں جو کہ معدہ کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں جیسے کمی اشتہا۔ پیٹ میں درد۔ کھٹی یا جلی ہوئی ڈکار نکلا آنا۔ کھانا کھانے کے بعد پیٹ کا پھولنا یا حرارت معلوم ہونا۔ اسہال۔ پیچش۔ بدہضمی۔ قبض۔ بواسیر۔ متلی۔ ابکائی وغیرہ کے دفع کرنے میں بہت مفید ثابت ہوا ہے اس کے علاوہ ریاح کا درد۔ بائو گولہ۔ اور مستورات کے ایام کی خرابیوں کے دور کرنے میں بھی بہت ثابت ہوا ہے استسقا کی کھانسی اور دمہ جو کہ غذا کے ہضم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس میں بھی یہ نہایت مفید ثابت ہوا ہے

# سفوف مقوی قلب

قیمت فی بکس ... محصول ڈاک ...

یہ سفوف مقوی قلب و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ وغیرہ کو طاقت بخشتا ہے اور اس کے باقاعدہ کھانے سے معلوم ہوتا ہے کہ خون کے سرخ ذروں کو بڑھاتا ہے جس کی وجہ سے چہرہ پر ... سرخی آ جاتی ہے اگر کام ... سستی اور کمزوری دور ہو جاتی ہے اور قویٰ ... طاقتور ہو جاتے ہیں یہ ... جڑی بوٹیوں کی یہ خاص دوا ہے سب سے بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ جس طرح مردوں کے واسطے مفید ہے اسی طرح مستورات کے واسطے ... ہے جس کی وجہ سے ایام میں خرابی پیدا ہو کر آخر میں ... نوبت پہنچتی ہے ... مفید ثابت ہوا ہے۔

## یہ جگہ کم ہونے کی وجہ سے صرف چند خطوط کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

جناب خان بہادر شمس العلماء مولانا محمد ابوالخیر صاحب نقشبندی خلف الرشید جناب اکمل العلماء مولانا سید ولایت اسد صاحب مرحوم و مغفور سجادہ نشین خانقاہ ... تحریر فرماتے ہیں کہ فقیر کو عرصے سے معدہ کی شکایت نہایت سخت تھی ... علاج کرتا رہا مگر کسی دوا سے افاقہ نہ ہوا ... آپ کا نمک سلیمانی ... بہت ہی افاقہ ہوا واقعی بات یہ ہے کہ آپ کا ایجاد کردہ نمک سلیمانی ایسے امراض کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے ... ایک شیشی نمک سلیمانی ... ضرور ... فرمائیے ... زیادہ ... جناب ... صاحب ... تحریر فرماتے ہیں ... ایک شیشی نمک سلیمانی ... اس کے استعمال سے ... [illegible]

... نمک سلیمانی ... اکسیر کا اثر رکھتا ہے اس کے استعمال سے قریب قریب ... [illegible]

... لہٰذا آپ ... مہربانی فرما کر ... بھیج دیجئے ...

## چند معززین کے خطوط کا خلاصہ

جناب ... صاحب جج ہائیکورٹ ... تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کا سفوف مقوی قلب مرکب ایک ہفتہ استعمال کیا بہت مفید معلوم ہوا براہ مہربانی ... بکس اور بھیجئے مشکور فرمائیے

جناب بابو رام سرن لال صاحب ... تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے یہاں سے ایک بکس سفوف مقوی قلب مرکب ... استعمال کیا جس سے کہ بہت زیادہ فائدہ ہوا ... آپ کا سفوف ... میں ... فوائد رکھتا ہے ... سفوف مقوی قلب ...

جناب بابو کشن پرشاد صاحب ... تحریر فرماتے ہیں ... آپ کے سفوف مقوی قلب مرکب سے بہت زیادہ فائدہ ... آپ کا سفوف ... [illegible] ... مشکور فرمائیے۔

**دوا ملنے کا پتہ:۔** نونہال سنگھ بھارگو منیجر کارخانہ نمک سلیمانی محلہ گائے گھاٹ شہر بنارس

## مرزا رجب علی سرور

- فسانۂ عجائب ۱۲ر
- الف لیلہ ۲ر
- گلزار سرور ۸ر
- انشائے سرور ۶ر

## منشی امیر احمد مینائی

- امیر اللغات ۲ جلد ۴ر
- مثنوی نور تجلی عشق ۱ر
- خطوط امیر احمد ۱ر

## جلال مرحوم لکھنوی

- مضمونہائے دلکش عمر
- نغمۂ نگار ہیں عمر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۱ر

## منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۱۰ر
- پیاری دنیا ۱۰ر
- طلسمی فانوس ۸ر
- طرحدار لونڈی عمر
- میٹھی چھری ۶ر
- کایا پلٹ ۱۲ر

## منشی محمد الاسلام رشاد برق

- مزالنی ۱۰ر
- ما و تستین ۱۰ر
- بنگالی دولھن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۸ر

## مولانا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی عمر
- ابوبکر شبلی عمر
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- مصر قدیم ۱ر
- دولت مغلیہ کی تاریخ ۲ جلد ۲ر
- حروب صلیبیہ ۱ر
- آغا صادق کی شادی عمر
- تذکرۂ شاہ نہ عالم ۱ر
- مقدس نازنین ۱ر
- قیس و لبنیٰ ۱ر
- ایام عرب ۱ر
- ملک العزیز ورجنا ۱ر
- یوسف و نجمہ ۱ر
- رومتہ الکبریٰ ۱ر
- فلورا فلورنڈا ۱ر
- فردوس بریں ۱ر
- آغا صادق کی شادی ۱۰ر
- مسٹر گلی ڈاکو ۱ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- خوفناک محبت ۱ر
- الفانسو ۱۲ر
- فلپانا ۱ر
- فاتح مفتوح ۱ر
- جویائے حق ۱ر
- بابک خرمی ۱ر
- لعبت چین ۱ر
- تاریخ بغداد ۴ر
- حسن بن صباح ۶ر
- افسانۂ قیس ۴ر

## پنڈت رتن ناتھ سرشار

- ہشو ۶ر
- چھڑی دلھن ۸ر
- کامنی ۱ر
- خدائی فوجدار ۱ر
- فسانۂ آزاد ۱ر
- سیر کہسار ۱ر
- جام سرشار ۱ر

## مرزا محمد ہادی بی اے

- امراؤ جان ادا عمر
- لیلیٰ مجنوں ۸ر

## پنڈت چکبست بی اے

- صبح وطن ۱ر
- گلدستۂ پنچ ۱ر
- ... ۸ر

## سید برکات احمد

- جمیلہ ۱۲ر
- بیوفا ۱۲ر
- یادگار سلف ۶ر

## خواجہ عشرت

- زباندانی ۱ر
- قواعد میر ۶ر
- ہجولی ۷ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- تذکرۂ آب بقا ۱ر
- گلدستۂ ظرافت ۶ر

## منشی احمد علی شوق قدوائی

- ترانۂ شوق عمر
- گنجینہ ۸ر
- قاسم و زہرہ ۱۲ر

## ڈاکٹر اقبال

- ملت بیضا ۱۲ر
- شکوہ ۲ر
- جواب شکوہ ۳ر
- مکمل ترانہ ۲ر
- اکبری اقبال ۳ر
- رموز بیخودی ۱ر
- اسرار خودی ۱ر

## منشی محمد حسن خان

- ہا زہرہ ۱ر
- تذکرۂ معاشرت ۱ر

## مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ ۱ر
- حیات جامی ۸ر
- علوم عرب ۱ر
- خواتین ۱ر

## مولوی سید سلیمان

- ارض القرآن ۲ جلد ۱۲ر
- حیات امام مالک ۱ر
- لغات جدیدہ ۱ر
- مکاتیب شبلی ۲ جلد ۱ر
- اہل السنۃ والجماعۃ ۸ر

## خواجہ حسن نظامی

- سیپارۂ دل ۱ر
- روزنامہ با تصویر ۱ر
- روزنامچہ ۸ر
- سخن مہر و قہر ۸ر
- محرم نامہ عمر
- آداب خطوط نویسی ۸ر
- یزید نامہ ۱ر
- بیوی کی تعلیم ۱۲ر
- میلاد نامہ عمر
- کرشن بیتی ۱ر
- اردو دعائیں ۶ر
- محفل نا گریہ رہوں ۸ر
- غدر دہلی کے افسانے ۱ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۰ر
- جگ بیتی ۶ر
- بچوں کی کہانیاں ۶ر
- خطوط حسن نظامی ۱۲ر
- کرم تو موت عمر
- سیر دہلی ۱ر

## مولانا راشد الخیری

- صبح زندگی ۱ر
- شام زندگی عمر
- شب زندگی (زیر طبع)
- طوفان حیات ۱ر
- سراب مغرب ۱ر
- ستارۂ صبح کے آنسو ۱ر
- نبت الوقت ۸ر
- جوہر قدامت ۱ر

## نیاز فتح پوری

- اکتشاف کلام ۱ر
- مرنجی سیاہ کی ڈائری ۱ر
- کیوپڈ اینڈ سائکس عمر
- گیتان جلی ۱ر

## سیماب اکبرآبادی

- خدیجۃ الکبریٰ ۱ر
- بنت الرسول ۵ر
- سیرۃ الحسین ۱ر
- جام کوثر ۸ر

## مسٹر سلطان حیدر جوش

- ابن مسلم ۱ر
- صبر کی دیوی ۴ر

## صفدر مرزاپوری

- بزم خیال عمر
- مرقع ادب ۱ر
- شاطرۂ سخن عمر

## مولانا حسرت موہانی

- حیات تسلیم عمر
- شرح دیوان غالب عمر
- دیوان حسرت عمر

## مولوی مصباح الدین احمد

- الطاف ... ۱ر
- معاہدہ فرانس در... عمر
- ... ادب ۱ر

شائقین ایک سو سے زیادہ مصنفین کی کمل تصانیف کی مکمل فہرست ایک کارڈ لکھ کر منگائیں۔

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

## مولانا اشرف علی

- نشر الطیب فی ذکر الحبیب ۱۲ر
- تعلیم الدین ۸ر
- اکسیر فی اثبات التقدیر ۸ر
- الانتباہات المفیدہ ۱۲ر
- اصلاح الرسوم ۴ر
- کلید مثنوی ۲ جلد ے
- مناجات مقبول ۶ر
- بہشتی زیور ۱۱ حصے ۵ر
- بہشتی گوہر ۸ر
- تربیت السالک ۲ حصے ۱۲ر
- ہفت اختر ۸ر

## مولانا عبد الغفور

- مصباح الکلام ے
- حدائق البیان ے

## مولانا عبد الشکور

- اسماء الفقہاء ۲ جلد عہ
- علم الفقہ ۴ جلد للعہ
- تاریخ طبری ے

## مولانا خلیل احمد سرکری

- آیات اسما کاملہ عہ
- سفرنامہ ترک عہ

## مولانا عبد [illegible]

- [illegible]
- ارمغان فرنگ
- تذکرۃ الشعرا

## علامہ سید احمد

- حمایت الاسلام ۴ جلد ۱ر
- فن ہیئت ۸ر
- فن کیمسٹری ۶ر

## پروفیسر محمود علی

- دین و دانش ے
- الایمان ۱۲ر

## پروفیسر نواب علی ایم اے

- تذکرۃ المصطفیٰ عہ
- معارج الدین ۱ر

## مرزا حیرت دہلوی

- سیرۃ الرسول کامل عہ
- کتاب الشہادت کامل عہ
- مضامین حیرت ۵ر
- درجان بیگم ۴ر

## حافظ عبد الرحمن امرتسری

- سفرنامہ بلاد اسلامیہ عہ
- الصدیق عہ
- سیاحت ہند مجلد ۲
- عربی بول چال ۲ حصے ۱ر

## مولوی محمد حلیم انصاری

- [illegible] اسلام ۲ جلد ے
- [illegible]
- [illegible]
- تاریخ اندلس عہ

## مولوی عبد الحق بی اے

- قواعد اردو ۱ر
- انتخاب کلام میر عہ

## منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد ۱ر
- شباب لکھنؤ عہ

## مسٹر عبد الماجد بی اے

- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد ے
- فلسفہ اجتماع عہ
- زود پشیماں (ڈرامہ) ۸ر

## منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری ۱ر
- حیات خسرو ۱۲ر
- حیات صالح ۴ر

## خواجہ عباد اللہ اختر بی اے

- دمشق ۱ر
- حضرت زید ۴ر
- ام القریٰ ۸ر

## منشی محمد لطیف بی اے

- اکبر عہ
- اورنگ زیب عہ

## سید احمد حسین کاظمی

- القمر عہ
- النخل ۱۲ر

## مولوی بشیر الدین احمد

- تاریخ بیجاپور ۳ جلد ے
- حرز طفلان عہ
- اشاعت علم عہ
- عصائے پیری ۱۲ر
- اقبال دولہن عہ
- حسن معاشرت عہ
- اصلاح معیشت ۱۲ر
- اپنے بچے کو دودھ پلاؤ ۱۲ر

## سید ہاشمی فرید آبادی

- مشاہیر یونان و روما ۱ر
- تاریخ یونان قدیم عہ

## خواجہ غلام الحسنین

- فلسفہ تعلیم ۱ر
- دستور المعلمین ۸ر
- معیار الاخلاق ۶ر
- تربیت اولاد ۴ر

## مرزا سلطان احمد

- فنون لطیفہ عہ
- خیالات عہ
- امثال عہ
- فن شاعری عہ
- نبوت ۱۲ر

## مولوی [illegible] آبادی

- علم السیاست ۱ر
- تاریخ مصر جدید ۱ر

## مطبوعات انجمن ترقی اردو

- فلسفہ تعلیم ۱ر
- رہنمایان ہند عہ
- نپولین اعظم عہ
- امرائے ہنود ۱ر
- القمر ۸ر
- تاریخ تمدن ۱ر
- مبادی سائنس ۱ر
- فلسفہ جذبات عہ
- فلسفہ اجتماع عہ
- مقدمات الطبیعیات عہ
- طبقات الارض عہ
- البیرونی عہ
- مشاہیر یونان و روما ۱ر
- تاریخ یونان قدیم عہ
- تاریخ اخلاق یورپ ے
- علم الہیئت ے
- دریائے لطافت عہ
- انتخاب کلام میر عہ
- اردو کا نیا قاعدہ ۲ر
- کلید قاعدہ ۴ر
- اسباق النحو ۲ حصہ ۸ر
- القول الاظہر ۱۰ر

## مطبوعات الناظر پریس

- میلاد النبی ۴ر
- محاربات صلیبی عہ
- تسخیر فرانس ۸ر
- الاحسان ۸ر
- حیات نظامی ۴ر
- تذکرہ حزیں ۴ر
- جمیل و بثینہ ۴ر
- مصنوعی شوہر ۱ر
- اتفاقات زمانہ ۱ر
- مسکین نادر روسی ۱۲ر
- شوکت آرا و مظلوم حبیب ۱ر
- انگلستان اور اس کے مذاہب ۱ر
- سادات ۱ر
- محبت الٰہیہ و جاذبیت ۲ر
- انسان ۵ر
- ترقی نابالغ بچہ مترجم ۴ر
- نوبہار ۲ر
- مثنوی مبدیم ۴ر
- سلطانان اندلس عہ
- اصول تشریح ۶ر
- کلیات نعت عہ
- واقعات کربلا عہ
- بچوں کی تعلیم کے صحیح اصول ۲ر
- کنول ۵ر
- خیابان ۴ر
- عورتوں کی انشا عہ
- اساس التعلیم ۱ر
- ازدواج الانبیا عہ
- رموز فطرت ۱ر
- تاریخ مغلیہ کمانیاں ۴ر
- خوان دعوت عہ
- اسرار زندگی عہ

شائقین ادب ایک سو سے زائد مصنفین اردو کی تصانیف کی مکمل فہرست بلا قیمت طلب فرمائیں۔

الناظر بک ایجنسی ـ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۱۸ | یکم اپریل سنہ ۱۹۱۹ء | جلد ۲۰

فہرست مضامین



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر:- اسحاق علی علوی

# مشہور مصنفین اُردو کی قابل دید کتابیں

**مرزا غالب مرحوم**
- اردوئے معلی
- عود ہندی
- دیوان غالب قسم اعلی
- شرح نظم طباطبائی

**سرسید احمد خاں مرحوم**
- مضامین تہذیب الاخلاق
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- سیرۃ فریدیہ
- اسباب بغاوت ہند
- آخری مضامین سرسید

**مولانا حالی مرحوم**
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مجموعہ نظم حالی
- مسدس حالی
- مناجات بیوہ حالی
- تفقات حالی

**سید محمود مرحوم**
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت
- لکچر

**مولانا آزاد مرحوم**
- آب حیات
- دربار اکبری
- نیرنگ خیال
- نظم آزاد

**مولوی نذیر احمد مرحوم**
- ترجمۃ القرآن متوسط
- الحقوق والفرائض
- اجتہاد
- مرآۃ العروس
- بنات النعش
- توبۃ النصوح
- مجموعہ نظم بینظیر
- چند پند
- منتخب الحکایات
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- لکچروں کا مجموعہ

**مولانا ذکاء اللہ مرحوم**
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- فلسفۂ امثال
- محاربات عظیم

**مولانا شبلی مرحوم**
- سیرۃ النبی مجلد
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- موازنۂ انیس و دبیر
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مقالات شبلی تنقیدیہ
- شعر العجم
- مثنوی صبح امید
- مجموعہ نظم شبلی اردو
- زیب النساء

**نواب محسن الملک مرحوم**
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت والشوق
- مجموعہ لکچر

**مولوی چراغ علی مرحوم**
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- مجموعہ رسائل

**مولوی عبد الرزاق**
- نظام الملک طوسی
- البرامکہ مجلد

**مولانا شرر مرحوم**
- حیات انیس
- انیس کی شاعری
- ادیب
- نور جہاں
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان
- مرقع تاجپوشی

**خلیفہ محمد حسین**
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ مصر ۲ جلد

**مولوی سید احمد**
- ساحت زمانی
- رسوم دہلی
- تسخیر شوہر
- مہر افروز بیگم
- کنز الفوائد
- انشائے ہادی النساء
- تعلیم طبی
- لغات النساء
- افشاء تحریر النساء
- محاکمہ مرکز زبان اردو

**مولوی سید علی بلگرامی**
- تمدن ہند
- میڈیکل جورسپروڈنس
- عروج کا فن تعمیر
- سفرنامہ موسیو تھیونو
- جنگ ٹرانسوال

**مولوی عبد الرحمن خاں شروانی**
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق
- ذکر الحبیب
- ذکر جمیل

**مولوی حامد علی صدیقی**
- تاریخ اندلس
- اقتضائے غرب

**مولوی سید احمد انصاری**
- تحریر المرآۃ
- المدنیۃ والاسلام
- کتاب الصدق
- کتاب التوحید

**مولوی عبد اللہ عمادی**
- کتاب المعارف
- تحکمات
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث

**مولوی عزیز مرزا مرحوم**
- خیالات عزیز
- ذکرِ م... [illegible]

**مسٹر ظفر علی خاں بی اے**
- معرکۂ مذہب و سائنس
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- ایا جنکٹ ...

**مسٹر ظفر عمر بی اے**
- مستقبل ...
- ...
- ... جپیری

**خواجہ غلام الثقلین مرحوم**
- روزنامچہ سیاحت
- ایک فلسفیانہ لکچر اسلام پر
- تعلیم کی زندگی کا مقصد

**منشی انوار الحق ایم اے**
- اثبات واجب الوجود
- حقائق اسلام

**مسٹر عنایت اللہ خاں**
- دعوت اسلام
- اشاعت اسلام ...
- اشاعت اسلام بذریعہ ...

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

شائقین ادب کے ... مصنفین اردو کی کل تصانیف کی فہرست ... طلب فرمائیے

# مطبوعات جدید

## تاریخ التعلیم

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج جنھوں نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کیلیے وقف کر رکھی ہے اور فن تعلیم کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانان ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو اس قدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو - یہ کتاب انھیں کے رشحات قلم سے نکلی ہے اور اس قابل ہے کہ وہ تمام اصحاب جو اہل ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اسکا مطالعہ فرمائیں قیمت ایک روپیہ

## آہنگ عمل

یہ لاجواب نظم میر غلام بھیک صاحب نیرنگ وکیل انبالہ نے گذشتہ اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی تھی اور اسکا حق تصنیف کانفرنس کو اس غرض سے معاف کیا ہے کہ اسکی فروخت سے جو آمدنی ہو وہ نادار و غریب طلباء کی امداد پر صرف کیجائے - شائقین اسے خرید کر ہم خرما و ہم ثواب کے پورے مصداق ہو سکتے ہیں قیمت ۸ر

## سیاحت زمین

ایک جرمن کا نامور جغرافیہ ریاضی اور دیگر علوم کے مختلف مسائل کو حل کرنے والا ناول ہے - حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویروں نے اور سونے پر سہاگہ کر دیا ہے - اسکی مقبولیت عام کی ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی مہذب زبانوں میں اسکا ترجمہ ہو چکا ہے - قیمت عہ

## بیگمات بنگال

مرشد آباد و بنگال کی بیگمات کا ایک نہایت مستند اور سبق آموز تذکرہ ہے مصنف نے بڑی دماغ سوزی اور تاریخی احتیاط سے مرتب کیا ہے اپنی نوعیت و موضوع پر پہلی اور ایک کتاب ہے - قیمت صرف ۶ر

## انسانی قربانیاں

اصلاحی معاشرتی مضامین کا ایک پاکیزہ اور اثر میں ڈوبا ہوا مجموعہ ہے اسکی ادبیت اسکی اچھوتی اور اعلیٰ ہے کہ آج تک اردو میں نظر سے نہیں گذری - اسکے متعلق زیادہ عرض کرنیکی ضرورت نہیں حضرت عزیز قیصر اور تیاگی نے اس میں اسکی خوبیوں پر کافی روشنی ڈالی ہیں جو کتاب کے ساتھ شائع کیجاتی ہیں قیمت ۸ر

**سنہری زلفیں** - مولوی ظہور احمد وحشی سب ایڈیٹر ہمدم نے یہ دلچسپ ناول ترجمہ کیا ہے جسمیں افسانہ کے رنگ میں جنگ کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں - قیمت ۱۰ر

**معرکۂ فرانس** - یہ بھی مولوی ظہور احمد وحشی کا ترجمہ کیا ہوا ناول ہے جسمیں جرمنی کے جاسوسوں کی شرارتیں وغیرہ دکھائی گئی ہیں - قیمت ۸ر

**طلسمی محل** - منشی موہن لال فہم کا تازہ ناول جسمیں بہت پُر اسرار طریقوں کا بیان نہایت دلچسپ ہے قیمت عہ

**اعجاز محبت** - ایک اکیلا دوشیزہ کے حالات زندگی جو اپنی خداداد ذکاوت و ذہانت سے اعلیٰ ترین مراتب زندگی حاصل کرتی ہے - نہایت دلچسپ فسانہ - قیمت ۸ر

**سرلا دیوی** - مرزا فدا علی خنجر نے یہ ضخیم ناول ترجمہ کیا ہے جسمیں اصول معاشرت اور جذبات انسانی سے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے حجم ۲۶۰ صفحے قیمت عہ

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

# دوائیون کے تیل

ہمکو روغنیل دوائیون کے تیل نے دو تین بوند پاؤ آدھ سیر دوا کے فائدہ دیتے ہیں اور کوٹنے پیسنے کی تکلیف سے بچے ہیں اور آسانی سے پی سکتے ہین۔

(۱) **روغن صندل** - سوزاک کیلیے نہایت درجہ مفید ہے۔ قیمت ۱۶ محصول ۵
(۲) **اجوائن کا تیل** - قے بدہضمی کی ایک ہی دوا ہے ” ۶ ” ۵
(۳) **روغن سونٹھ** - یہ بھوک بڑھاتا ہے اور ریاح کو خارج کرتا ہے ” ۸ ” ۵
(۴) **روغن سونف** - پیٹ پھولنا اور دست وغیرہ کیلیے مفید ثابت ہوا ہے قیمت ۸ محصول ۵
(۵) **روغن دال چینی** - یہ دال چینی کے نام چھلکون سے بنا ہے اور یہ چیز نہایت خوشبودار ہے قیمت ۸ محصول ۵
(۶) **روغن لونگ** - متلی اور ریاح کو دفع کرتی ہے اور درد شکم اور بدہضمی کو مفید ہے قیمت ۸ محصول ۵
(۷) **روغن لیمو** - ہرے گویا ابھی درخت سے توڑتے ہوے لیمون کا خوشبو دیتا ہے۔ قیمت ۴ محصول ۵
(۸) **روغن پپرمنٹ** - پیٹ کے درد بدہضمی اور ریاح کے علاج کرنیمین ایک بہت شہرہ دوا ہے قیمت [illegible] محصول [illegible]
(۹) **روغن الائچی** - متلی اور ہچکی کو بند کرتی ہے اور بھوک بڑھاتی ہے قیمت ۶ محصول ۵

# پلیگ سے کیوں ڈرتے ہو

سب سے پہلے اور سب بیماریون سے اس سے ڈرنے کا سبب یہ ہے کہ آجتک لاکھوں انسان اس موذی عارضہ کے پنجہ ظلم سے ہلاک ہو چکے ہیں گاؤن کے گاؤن اجاڑ ہو گئے شہر کے شہر تباہ ہو گئے یہی وجہ ہے اسکے نام ہی سے دہشت معلوم ہوتی ہے پلیگ مین مبتلا ہونیکے بعد پھر کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن بطور حفظ ماتقدم ڈاکٹر ایس کے برمن کی پلیگ سے بچانے والی گولیان منگواکر ضرور رکھیں ان گولیون کے استعمال سے جسم کے خون میں کچھ ایسا اثر ہوتا ہے جس سے پلیگ کے زہر ٹھہر سکتے ہیں اور زہر اثر نہیں کرتا۔ کلکتہ میں اس وقت بڑا اثر ان گولیون کے استعمال سے ہزارون انسان پلیگ سے محفوظ رہتے ہیں ۔ سب کیلیے فی دن تین مین ایک گولی روزانہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ نگل جانا چاہئیے بچے کو نصف یا چوتھائی [illegible] ۳۶ گولیون کی ڈبیہ [illegible] ۲۰ گولیون کی ڈبیہ ۱۲ محصول ڈاک ۵

پتہ ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ - تاراچند دت اسٹریٹ - کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم


# الناظر

نمبر ۱۸ جلد ۲۰ — یکم اپریل سنہ ۱۹۱۹ء


## سرقہ کا دورِ مختیرہ

سرقہ کی رسم قبیح عہد عتیق کی یادگار ہے۔ اس رسم کی قباحت مسلم ہے، ہر قوم ہر ملک، ہر وقت اور ہر زمانے میں اسکو مذموم و قبیح سمجھتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ خداوند قدوس نے بھی اسکے سدباب کرنے کو ضروری سمجھا چنانچہ منجملہ اور مذائم و جرائم کے سزا و حدود مقرر فرمانے کے سرقہ کی بھی ایک حد یعنی سزا مقرر فرمائی چنانچہ قانون الٰہی کے اصل الفاظ یہ ہیں:- السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیہما - یعنی عورت و مرد جو کوئی بھی سرقہ کرے اُسکے ہاتھ قطع کردو - لیکن اس دنیا میں جو بدی و برائی کا بیج ایک مرتبہ بو دیا جاتا ہے پھر ہزار سعی کیجیے کہ وہ نہ اُگے اور بالکل تباہ و برباد ہو جائے بالکل بے سود ہے اور یقیناً اُس میں برگ و بار آئیں گے چنانچہ بدی کی یہ رسم بھی باوجود تدابیرِ ممکنہ کے نہ رک سکی اور نہ مٹ سکی بلکہ زمانے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ بھی تدریجی ترقی کرتی رہی۔ اس رسم مذموم کا سب سے پہلا قدم جو پڑا وہ شعراء کی طرف سے تھا۔

مجھکو یہ تو معلوم نہیں کہ اس گروہ میں سب سے پہلے اس رسم کی کس نے پذیرائی کی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ایران کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور ایران میں سب سے پہلے جس نے سرقہ کیا وہ شاید امیر معزی تھا جو سلطان سنجر کا ملک الشعراء تھا جس نے سیف الدولہ کے خیالات متعلق بہ قوس قزح کو بالکل اپنا بنا کر پیش کیا۔ پھر تو رفتہ رفتہ اس طبقے میں یہ رسم عام ہو گئی۔ چونکہ اردو شاعری فارسی کے

زیر اثر عالم وجود میں آئی تھی اس لیے جب یہاں شعراء حشرات الارض کی طرح پیدا ہوگئے تو یہاں بھی یہ رسم وباء کی طرح عام ہوگئی۔ چنانچہ آپ ایسے شعراء کا کلام اُٹھا کر دیکھیں سرقے سے مملو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے نے انکو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ لیکن پہلے سرقہ کا یہ طریقہ تھا کہ غیر معروف اور گذشتہ لوگوں کے خیالات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے تھے۔ ایک عرصے تک یہی دستور رہا۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ معاصرین کے خیالات و نتائج افکار کو تھوڑے اضافہ کے بعد اپنا بنا کر پیش کیا جانے لگا۔ چنانچہ میر انیس مرحوم کو کہنا پڑا کہ

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار    خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لیکن یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ اسکا اثر صرف نظم کے اندر محدود رہا۔ ستم تو یہ ہوا کہ نثر بھی نہ بچی اور اسپر بھی بغیر کسی زحمت کے قبضہ ہوگیا۔

ہندوستان کی صحافت کی جب کبھی تاریخ مدون کی جائیگی تو سرقہ کا ایک مستقل باب قائم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں کی صحافت کی ترقی کا دار و مدار اسی ایک صنعت پر رہ گیا ہے۔ جرائد و اخبارات کی کثرت کے ساتھ مضمون نگاروں کی بھی کثرت ہوگئی۔ جس شخص کو کاغذ پر دو چار اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچنی آگئیں وہ بھی انشا پرداز ہوگیا۔ حالانکہ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مولانا صاحب کا اپنا ایک حرف نہیں ہے۔ کسی دوسرے کا مضمون سامنے رکھا اور اسکی صورت مسخ کر کے ایک مضمون تیار کر لیا؛ اور ایک یا چند خریدار بنا کر کسی رسالہ میں بھیجدیا اور توسیع اشاعت کا وعدہ کر لیا۔ ایک ایڈیٹر کے نزدیک کسی شخص کے معقول اور شریف ہونے کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسکے اخبار کی توسیعِ اشاعت میں کوئی حصہ لے خود خریدار بنے دوسروں کو بنائے آیندہ کے لیے امید دلائے۔ اب بھی انکی قابلیت میں شبہ باقی رہے تو اس سے زیادہ کافر نعمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ غرضکہ ایڈیٹر صاحب نے بغیر اس زحمت کے کہ اسپر ایک نظر ڈالیں فوراً کاتب کے حوالے کر دیا اور وہ شایع ہوگیا۔ مضمون نگار صاحب کے پاس پرچہ پہونچا تو انکی خوشی و مسرت کا عالم ہی دوسرا تھا قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جائے مگر خدا نے خیر کی کہ آیندہ کی توقع نے جان بچالی۔ ایڈیٹر صاحب کو شکریہ کا خط لکھا اور دو تین خریدار اور فراہم کر دیے۔ اسکے بعد جسارت بڑھی پھر اگر آپ آرزو کریں کہ کوئی پرچہ ان حضرت کے مضمون سے خالی ہو تو کبھی آپ اپنی کامیاب نہ ہوں گے البتہ فرق اسقدر ہوگا کہ جس پرچے میں جو مضمون آپ دیکھیں گے ایک دوسرے سے بالکل متباین و متضاد پائیں گے اس سے آپ خیالات کا تنوع نہ مراد لیں طرز تحریر انداز روش میں بھی کبھی

یکسانیت آپ نہ پائیں گے۔ قاعدہ ہے کہ ہر شخص کا ایک مخصوص رنگِ انشا ہوتا ہے یعنی تحریر کی روش
ہر شخص کی پیدا ہوتی اور ایک خاص اسٹائل ہوتا ہے جس میں وہ ہر قسم کے مضامین لکھتا ہے۔ مگر گروہِ
سارقین میں یہ بات نہیں ہوتی۔ کیونکہ ذاتِ خاص کا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جیسے مضمون سے سرقہ کیا اسی کا
رنگ آگیا۔ ایسی صورت میں کوئی خاص رنگ کیونکر قائم ہو سکتا ہے۔ ایک زمانے میں میں ہندوستان
کے ایک مشہور رسالہ کو ایڈٹ کرتا تھا اس قسم کے اہلِ قلم کا مجھکو اُس وقت خوب تجربہ ہوا ہے۔ کوئی
صاحب مضمون کے ساتھ منت و سماجت کا خط لکھتے ہیں کہ ع ۔ بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے!
کوئی صاحب رسالہ اور ایڈیٹر کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اس ہی کے معاوضے میں مضمون شائع
کرانا چاہتے ہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ حضرات ایڈیٹر ایسے کچے تاگوں میں نہیں گُندھے ہوتے کہ زبانی
جمع خرچ میں آجائیں، البتہ توسیعِ اشاعت یا اندھا علیہ... معاملہ آن پڑتا ہے تو خشک جواب دیتے
ہوئے اک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے۔

غرضکہ اس قسم کے مضامین نگار آج اس کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں کہ انکا استقرا نا ممکن ہو گیا
ہے اور مجھے اس کہنے میں کوئی حجاب نہیں کہ اس خرابی کے باعث خود ایڈیٹر صاحبان ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میری طرح اور لوگ بھی ملک کی اس نئی ترقی سے واقف ہیں یا نہیں مگر میں ایک
عرصے سے واقف تھا۔ چنانچہ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسوقت میرے سامنے ایک طویل فہرست ایسے فاضل
مضمون نگاروں کی موجود ہے جن کی کارگاہِ شہرت کا دارومدار سرقہ کے رسمِ قدیم پر ہے۔ اس معاملے میں جب
میری معلومات اس قدر وسیع ہو گئیں تو میں نے خیال کیا کہ بعض دیگر ہمدردانِ ملک و قوم کو اس سے
آگاہ کر دوں۔ اتفاق سے جن جن بزرگوں سے میں نے ذکر کیا وہ بھی اس سے واقف نکلے چنانچہ
اس اہم معاملہ کی نسبت دیر تک گفتگو رہی اور یہ طے پایا کہ ایک آل انڈیا اصحاب کانفرنس قائم
کی جائے جس کا منشا یہ ہو کہ پہلے خفیہ طریقے سے ان حضرات کو متنبہ کیا جائے اگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے تو
انہی گروہ میں سے کسی ایک ایسے شخص کو پبلک میں لے آئیے تاکہ دوسروں کو اس سے عبرت و تنبیہ ہو
چنانچہ زیرِ نقاب کارروائی ہو چکی مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسلیے آج حسب قرارداد کانفرنس اس قوم
کے ایک فرد کا حال مع اسناد و ثبوت پبلک پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ بعض خیالات کی
یکسانیت سے یہ بدظنی ہمیشہ قائم کر لی گئی۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ سرقہ صرف خیالات کا ہوا بلکہ الفاظ

اور عبارت کا سرقہ کیا گیا ہے۔ پورے پورے پیراگراف نقل کیے گئے ہیں بلکہ جس مضمون سے سرقہ ہوا ہے اُسی کی صورت مسخ کرکے جابجا سے حذف و اضافہ کرکے پیش کیا گیا ہے۔ اس حیرت آباد عالم میں جرأت و جسارت کی ایسی ملعون مثالیں آپ کو کم ملیں گی جیسی آپ آگے چلکر ملاحظہ فرمائیں گے۔ کانفرنس کے سلسلے جو طویل فہرست ہے اُسکے سرخیل جناب ادیب جلیل حضرت مولانا مولوی منشی محمد الدین صاحب المتخلص بہ خلیقی وسابق الملکنی بابی الآزاد وبعدہ بابی المعانی وحال کنیتہ ابو المعالی۔

حضرت مولانا ابو الآزاد صاحب خلیقی کی نسبت ہمکو صرف اسقدر معلوم ہے کہ نظام المشائخ، اسوۂ حسنہ، خطیب، القمر وغیرہ رسالے آپ کے رشحاتِ قلم سے ایک عرصہ دراز سے فیضیاب ہورہے ہیں۔ آپ کے اسم گرامی کے ساتھ "دہلوی" لکھا جاتا ہے لیکن نام کی ترکیب اور ساخت سے پنجابیت کی بو آتی ہے۔ حال کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ آپ خیر سے تاجر بھی ہیں۔ ذوقِ ادبی کے ساتھ اس کام کا بنا بنا آپ ہی کا کام ہے۔ دہلوی سے معلوم ہوا کہ آپ بہت ذی اخلاق ہیں۔ گفتگو بہت تیز کرتے ہیں اور اسکو فخر سمجھتے ہیں۔ تشبیہ استعارہ کے اسقدر دلدادہ ہیں کہ معمولی گفتگو بھی بغیر اسکے نہیں کرتے۔ الفاظ روزمرہ میں نہایت شاندار، ترکیبیں عالی و بلند کہ ہر کس و ناکس کی رسائی بھی وہاں تک ناممکن ہے۔ غرضکہ مجموعی حیثیت سے گفتگو بہت شاندار نہایت فصیح اور بہت ہی بلیغ و مرعوب کن ہوتی ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی اور مہمل ہوتی ہے سو یہ کوئی عیب نہیں۔

یہ واقعات دہلوی نامہ نگار کی رپوٹ کی بنا پر لکھے گئے ہیں ہمارا عینی وذاتی مشاہدہ نہیں، البتہ بلِ مضمون نگاری کے متعلق ہم جو کچھ لکھیں گے اسکا بارِ ثبوت ہمارے ذمہ ہے جسکو آپ خود ملاحظہ فرمالینگے مجھکو۔ حضرت مولانا ابو الآزاد خلیقی صاحب کی تاریخ مضمون نویسی معلوم نہیں لیکن نظام المشائخ اور اسوۂ حسنہ میں اکثر مضامین نظر سے گذرے پہلے آپ کے نام کے ساتھ ابو الآزاد کی کنیت ہوا کرتی تھی۔ ابو الآزاد کی ترکیب آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ "آزاد" ایک فارسی لفظ ہے اور "ابو" عربی۔ یہ عربی و عجمی الفاظ کا عقد کچھ عجب اٹل بے جوڑ سی بات ہے جیسے گول خانے میں چوکھنٹی چیز۔ پھر یہ الف لام اور بھی عجیب الخلقت مخلوق بنا دیتے ہیں۔ غرضکہ آپ نے پہلے تو اسقدر استعمال کیا کہ کوئی مضمون بغیر کنیت کے آپ کو نہ ملیگا۔ لیکن خدا معلوم کیوں دوسرے دور کے مضامین میں یہ کنیت نہیں ملتی بلکہ بجائے اسکے ابو المعانی رکھی گئی لیکن تھوڑے دنوں کے بعد یہ بھی ترک کردیگئی اور اب شاید ابو المعالی پر فی الحال قناعت کر لی گئی ہے۔ آئندہ کا

حال ہمیں معلوم نہیں اور نہ ہم اُسکا ذکر کرتے ہیں کہ کیا ہوگی۔ بہرحال مختلف کنیتوں کے ساتھ مختلف مضامین آپ کے مختلف رسالوں میں شایع ہوتے رہے اور اسوقت تک جسقدر مضامین ہماری نظر سے گذرے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکثر و بیشتر صنعت سرقہ میں لکھے گئے ہیں اور چونکہ ہمیشہ ایک ہی شخص کے مضامین پر چشم عنایت مبذول نہیں رہی اسلیے ہمیشہ ہر دور میں آپ کا اسٹائل بدلتا رہا۔ آپ نظام المشائخ اور اسوۂ حسنہ کی جلدیں اُٹھا کر دیکھیے آپ یہ فرق بہت جلد محسوس کرلیں گے۔ لیکن دور آخر میں چونکہ الہلال پیش نظر رکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ الہلال ہی کے کسی نہ کسی نمبر سے ماخوذ و مسروق ہے اسلیے ابوالکلامیت ہر جگہ بول رہی ہے۔

آل انڈیا احتساب کانفرنس سرقہ کی اسقدر شدید مخالف نہیں کہ محض ایک آدھ خیال کے سرقہ پر کسی کی پگڑی اُتار لے بلکہ حقیقت میں اُن لوگوں کی مخالف ہے جو اس فن کی بحیثیت فن کے توہین کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرقہ ایک مرتب فن ہے اسکے جو اصول و ضوابط ہیں اگر انکو ملحوظ رکھکر پوری رازداری کے ساتھ یہ کام انجام دیا جائے تو چنداں عیب نہیں۔ اب مولانا خلیقی کا عجیب و غریب توارد ملاحظہ فرمایئے۔

رسالہ نظام المشائخ رسول نمبر ۱۳۳۳ھ جلد ۱۲ نمبر ۳ و ۴ بابت ماہ ربیع الاول و ربیع الثانی صفحہ ۳۶ لغایت ۴۴ ملاحظہ فرمایئے اسکے بعد الہلال جلد ۲ نمبر ۲۰ بابت ماہ ذیحجہ ۱۳۳۱ھ صفحہ ۵ سے ۱۱ تک غور سے پڑھیے۔ پھر اگر آپ پر حیرت و استعجاب کی گھٹا نہ چھا جائے تو ہمارا ذمہ۔ یقین کیجیے کہ جرات و جسارت کی ایسی بے مثل و بے عدیل مثال آپ کو نیلگوں آسمان کے نیچے نظام المشائخ کے ان صفحات کے سوا کہیں نہ ملیگی۔ جناب خلیقی نے اپنی عبارتِ محیرہ کا عنوان اعلاے کلمۃ اللہ رکھا ہے اور مولانا ابوالکلام کے مضمون یوم الحج کی صورت جا بجا سے مسخ کرکے نظام المشائخ کے اوراق کو اپنے نام نامی سے مزین فرمایا ہے۔ خیالات بالکل وہی ہیں، الفاظ وہی ہیں، انداز بیان تک وہی ہے جو مولانا ابوالکلام کے لیے مخصوص ہے البتہ مضمون کی ترتیب کی سلیقہ شعاری مفقود ہے اور کہیں کہیں مہمل فقرے اضافہ کیے گئے ہیں جو فوراً محسوس ہوجاتے ہیں کہ یہ ایجاد بندہ ہے۔ بعض بعض جگہ صرف ایک ایک دو دو لفظوں کا تغیر تبدل کرکے پورے پورے پیرے نقل کردیے ہیں۔

اب ہم جا بجا سے دونوں مضمونوں کو بالمقابل نقل کرتے ہیں۔ جو الفاظ انڈر لائن ہوں اور وہ مولانا ابوالکلام کے مضمون میں نہ ہوں تو سمجھیے کہ یہ اختراع ہے اور بیان پر خداوند ذوالجلال کی عطا کردہ قوت بیانیہ

سے حضرت خلیقی نے کام لیا ہے بعض ایسے نذر لائیع الفاظ آپ کو ملیں گے کہ وہ صرف مرادف اور بدل واقع ہونگے خلیقی اسی مضمون میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

**خلیقی**

کفر کی پرورش تھی، اور توحید نزع میں تھی، عصمت مایوس تھی، درد دنیا اور دنیا کی خوشی، دنیا کی حقیقت مرجھا گئی تھی جمال صداقت پژمردہ ہوگیا تھا اسکا روئے ہدایت زخمی ہوگیا تھا، وہ پیمان رہتی، وہ مواثیق قلبیہ جو اولاد آدم نے برگزیدہ ہادیوں اور مقدس رسولوں سے اسکے پاک پیماں کو سنکر باندھے تھے، جو سعادت کے رشتے، ضمیر و ایقان کے تاروں سے کبھی نہ ٹوٹنے کے لیے، کبھی نہ ٹوٹنے کے قابل باندھے تھے ٹوٹ گئے تھے، خدا کی رحمت و رافت زمین کے بسنے والوں سے اٹھ گئی تھی، اُسکا جمال ازلی و ابدی جس سے بارہا پردے اٹھا دیے گئے تھے پھر محجوب ہوگیا تھا، پھر مستور ہوگیا تھا، اس میں اور اسکے بندوں میں کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا کوئی ربط نہ رہا تھا۔

**ابوالکلام**

دنیا کی خوشی مرجھا گئی تھی۔ اسکا جمال صداقت پژمردہ اور اسکا چہرۂ ہدایت زخمی ہوگیا تھا، وہ پیمان و مواثیق جو اولاد آدم نے مقدس رسولوں کے ساتھ اُنکے پاک پیغاموں کو سنکر خدا سے باندھے تھے، ایک ایک کر کر عصیان و تمرد سے توڑ دیے گئے تھے۔ اور خدا کی رحمت و رافت زمین کے بسنے والوں سے اٹھ گئی تھی اسنا وہ جمال ازلی و ابدی جس سے بار بار پردے اُٹھا دیے گئے تھے تاکہ اسکے ڈھونڈھنے والوں کو محرومی نہ ہو اب پھر محجوب و مستور ہوگیا تھا اور اس میں اور اسکے بندوں میں کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔

حضرات مضمون کے دونوں ٹکڑوں کو بہ غور ملاحظہ فرمائیے گا مگر شرط یہ ہے کہ ابھی سے محو حیرت نہ ہو جائیے گا کہ ابھی بہت کچھ سامان حیرت اندوزی کا باقی ہے۔

**خلیقی**

ہاے کوئی نہ تھا جو اسکو ڈھونڈے، کوئی قدم نہ تھا جو اُسکی سمت مضطربانہ بڑھے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو اُسکے عشق اُسکے لیے اشکبار ہو کوئی دل نہ تھا جو اُسکے لیے بیقرار ہو۔ کوئی روح نہ تھی جو اُسکو پیار کرے، اُسکی

**ابوالکلام**

ہاے کوئی نہ تھا جو اُسکو ڈھونڈھے، کوئی قدم نہ تھا جو اُسکی طرف دوڑے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو اُسکے لیے اشکبار ہو، کوئی دل نہ تھا جو اُسکی یاد میں مضطرب ہو، کوئی روح نہ تھی جو اُسے پیار کرے، اُسکی دنیا اُس سے

اُس سے بیخبر تھی، دنیا، دنیا والے کو بھول گئی تھی، اسکے بندے اس سے غافل تھے، انسانی ضمیر مرچکا تھا فطرت کا حسن حقیقی عصیان عالم کی تاریکی میں چھپ گیا تھا تمرد و سرکشی کے سیلاب بہ رہے تھے جو خشکی و تری میں امنڈ آئے تھے اور جنکے اندر خدا کے رسولوں کی بنائی ہوئی عمارتیں بہ رہی تھیں۔

بیخبر تھی اسکے بندے اس سے غافل تھے انسان کا ضمیر مرچکا تھا، فطرۃ کا حسن حقیقی عصیان عالم کی تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ طغیان و سرکشی کے سیلاب سے جو خشکی و تری دونوں میں امنڈ آئے تھے اور جن کے اندر خدا کے رسولوں کی بنائی ہوئی عمارتیں بہ رہی تھیں۔

---

جبکہ یہ حالت تھی تو دنیا بگڑ کر پھر سنوری، انسانیت مرکر پھر زندہ ہوئی، خدا نے پھر چہرہ کو بے حجاب کر دیا، خدا پھر دنیا میں آگیا۔ ہاں وہی جو شام کے مرغزاروں اور یروشلم ہیکل کے ستونوں سے روٹھ گیا تھا اب پھر آیا تاکہ دشت حجاز کے رگستان کو پیار کرے ور اپنے راز و نیاز محبت کیلیے اپنی عشوہ نواز محبت کیلیے ایک نئی قوم کو چن لے دنیا کن سے بعد کے اضطراب جس کو اپنے چلے ہجان سعی کو جو پہلا ورثہ تھا اور اسے کام میں لاتی رہی پھر کام میں لائی، صدیوں سے جسکو بھلا چکی تھی پھر اُسکی تلاش پر اُتر آئی۔

جبکہ یہ حالت تھی تو دنیا بگڑ کر پھر سنوری، انسانیت مرکر پھر زندہ ہوئی، اور خدا نے اپنے چہرہ کو بے نقاب کر دیا۔ وہ جو شام کے مرغزاروں اور یروشلم کے ہیکل کے ستونوں سے روٹھ گیا تھا تاکہ دشت حجاز کے ریگستانوں کو پیار کرے اور اپنے راز و نیاز و محبت کے لیے ایک نئی قوم کو چن لے۔ دنیا جو صدیوں اُسکو بھلا چکی تھی پھر اُسکی تلاش میں نکلی اور انسان نے اپنے محبوب و مطلوب کو کھو کر پھر دوبارہ پالیا۔

---

اب سے ہزاروں برس پہلے اسی سرزمین پر خدا کے جس مخلص بندہ نے درد و اضطراب کے لہجہ میں رَبِّ اِنِّی دَعَوتُ قَومِی لَیلًا وَنَہَارًا کہا وہ وہی کامیاب تلاش تھی، تخت گاہ فراعنہ کے قید خانہ میں کنعان کے قیدی نے جس شے کا وعظ کہا تھا وہی چیز تھی جسکا

جبکہ اسی زمین پر اب سے ہزاروں برس پہلے خدا کے ایک مخلص بندہ نے اسکو درد و تڑپ کی آواز میں پکارا تھا (آیۃ) تو وہ بھی اپنی قوم کو اسی کی تلاش کا پتہ دے رہا تھا جبکہ تخت گاہ فراعنہ کے قید خانہ میں کنعان کے ایک قیدی نے دین الٰہی کا وعظ کہا (آیۃ) تو اُسکی

وہ سراغ دے رہا تھا وہ بقعہ مبارکہ کا چرواہا جو کوہ سینا کے کنارے انی انا اللہ رب العالمین کی ندا سے مخاطب ہوا وہ تلاش کا نمایاں وجود تھا جبکہ ایک جابر اور ظالم حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کیلیے اس یکہ وتنہا نے فرمانروائے عہد کے سامنے بے خوف کہا ربی عالم الخ ناصرہ کا وہ اسرائیلی نوجوان جو پچھلی بشارتوں کے موافق آیا تھا تاکہ عہد اسرائیلی کے خاتمہ اور دورِ اسماعیلی کے آغاز کا اعلان کرے اس نے بھی اس تلاش کی محویت کا اعلان کیا۔

نظر بھی اُسی کی طرف تھی اور اُسی کی تلاش تھی جسکا وہ سراغ دے رہا تھا وہ شاطی وادی ایمن اور بقعہ مبارکہ کا مقدس چرواہا جبکہ کوہ سینا کے کنارے انی انا اللہ رب العالمین کی ندا سے مخاطب ہوا تھا اور جبکہ ایک جابر و ظالم حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے اُس نے یکہ وتنہا فرمانروائے عہد کے سامنے حریفانہ کھڑے ہوکر پیشین گوئی کی تھی کہ ربی عالم الخ وہ ناصرہ کا نوجوان اسرائیلی جو پچھلی پیشین گوئی کے مطابق آیا تھا تاکہ عہد اسرائیلی کے خاتمے اور دور اسماعیلی کے آغاز کا اعلان کرے

مرقومہ بالا اقتباسات کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ توارد یا جرأت وجسارت کی ایسی عجیب وغریب مثالیں آپکو مشکل سے ملیں گی۔ جناب مولانا ابوالآثار خلیقی اور مولانا ابوالکلام کی عبارتیں بالمقابل درج کی گئی ہیں اور حضرت خلیقی نے جو پیوندکاریاں اخفاے سرقہ کی غرض سے کی ہیں اُنپر نشان لگا دیا گیا ہے تاکہ ناظرین کو کوئی زحمت تلاش کی نہ ہو۔

یہ جو نمونۂ کلام جناب خلیقی کے 'توارُد' کا دکھایا ہے گو وہ صرف ایک مضمون سے دکھایا گیا ہے لیکن مولانا موصوف کی تمام تحریریں جو الہلال کے بعد نظام المشائخ میں شایع ہوئی ہیں سب اسی رنگ کی ہیں اور سب میں صنعت سرقہ سے کام لیا گیا ہے۔ ہم خوفِ طوالت سے اسکو نظرانداز کرتے ہیں اگر اس تحریر کے بعد بھی اس گروہ نے اپنی چالاکدستیوں سے کنارہ کشی نہ کی تو پھر ہم آیندہ نہایت تفصیل سے اس بحث پر گفتگو کریں گے۔ فی الحال ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ خدا کرے یہ مذموم رسم دور ہو جائے

اللھم اصلح قومی

راقم

آنریری سکرٹری آل انڈیا احتساب کانفرنس

# راسخ عظیم آبادی

(سلسلۂ ماہ گذشتہ)

## دیگر اصنافِ سخن

کلیاتِ راسخ کم و بیش تمام اصنافِ سخن سے معمور ہے۔ دیوانِ غزلیات کے علاوہ قصیدے ہیں، رباعیاں ہیں، غزلیاتِ میر تقی پر تضمینیں ہیں، واسوخت ہے، شہادتِ امام حسینؑ کے مراثی ہیں، مثنویاں ہیں۔ ان تمام اصناف میں راسخ نے اپنی پاکیزگیِ مذاق کا کچھ نہ کچھ ثبوت دیا ہے۔ اور اُسکا خاص رنگ ہر صنف میں جھلکا پڑتا ہے۔ راسخ کے عہد تک واسوخت نے نہ تو قبولِ عام حاصل کیا تھا نہ اس نفاست و لطافت کے درجے تک پہونچی تھی جسپر امانت نے بعد کو اُسے پہونچا دیا۔ تاہم اُس عہدِ اولیں میں اس تختۂ چمن میں راسخ کے مذاقِ لطیف نے ایک ایسی قلم کاری کی جسکی تمیز زمانۂ مابعد میں امانت تک کو حاصل نہ ہوئی۔ جو اس صنف کا اگر موجد نہیں تو اُستاد کیا ضرور مانا جاتا ہے۔ امانت اور دوسرے واسوخت گویوں نے غزل گویوں کی طرح اپنے ہیرو ئن کے لیے باوجود تمام زنانہ لوازمات کے مؤنث ضمیریں اور صفتیں استعمال نہیں کی ہیں۔ یہ فروگذاشت ذوقِ سلیم پر سخت ناگوار گذرتی ہے۔ راسخ نے اپنے مختصر مگر مہذب واسوخت میں اپنی محبوب کے لیے بے تکلف مؤنث ضمیریں اور صفتیں استعمال کی ہیں۔

## مثنوی

یہی حال مثنویوں کا ہے اُردو شاعری کی قدیم امرد پرستی کے موافق میر تقی سے لیکر داغ دہلوی تک سب نے صرف غزل ہی میں زلف اور پستان کے ذکر کے ساتھ معشوق کو مونث ضمائر اور صفات سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ اُن مثنویوں میں بھی یہی حُسن تمیز صرف کیا گیا ہے، جو حسن و عشقِ جنسی کی داستانیں اور معشوق کے تمام زنانہ سراپا اور زنانہ جذبات و خصائل کی کامل تصویریں ہیں۔ راسخ اپنی غزلوں میں بیشک معشوق کے لیے مذکر ضمیریں و صفات لایا ہے مگر نہایت سلیقے اور ہنر کے ساتھ۔ اوّل تو وہ ایسی صفتیں لاتا ہی نہیں جنسے تعیینِ جنس ہو اور ضمیرِ مذکر طبعِ سلیم کو مکروہ معلوم ہو۔ دوسرے وہ غزل کی زبان [illegible]

جیسے بلند مضامین معرفت و اخلاق نظم کرتا ہے انکے لیے کچھ مذکر ضمیریں ہی زیادہ موزوں بلکہ ضروری ہیں۔ اور یہی خصوصیت میر صاحب کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ مگر تمام شعرائے اُردو اور خود میر صاحب کے خلاف راسخ نے مثنویوں میں جہاں جنسی عشق و محبت کی داستانیں بیان کی ہیں محبوبہ کے لیے بے تکلف مونث ضمائر اور صفات استعمال کی ہیں۔ اور یہ انکے اعلیٰ فطری مذاق شاعری کی ایک زبردست دلیل ہے آج بھی جبکہ اُردو شعرا کا مذاق سخن انگریزی شاعری کی سادگی سے بہت کچھ متاثر ہو چکا ہے کسی کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اپنے نامعلوم الجنس معشوق کو مونث ضمیروں سے مونث بناتا۔ اب سے سَو سوا سو برس پیشتر کفر شکنی کی یہ جرأت معمولی دل و دماغ کا کام نہیں۔

راسخ کے زمانے میں صنف مثنوی کا بلند سے بلند معیار میر کی مثنویاں تھیں۔ سو انکا حال یہ ہے کہ میر صاحب نے اس کوچے میں پہونچکر اپنی دستارِ فضیلت و متانت، عبائے شرافت و شائستگی اور پیراہنِ درویشی تہ کرکے الگ رکھ دیے ہیں۔ اور بیباکی، بوالہوسی، بغض و حسد، پستی و دناءت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ ہجو، مسخرگی، گالی گلوج، کوسنا پیٹنا، فحش، غرض سب کچھ بک کر دل کا پورا پورا غبار نکالا ہے۔ اور یہی اُس زمانے کے شعرا کی عام تہذیب تھی اور اُنکے لیے یہ فعل مذموم نہ تھا۔

راسخ نے جہاں اپنے اُستاد کے طرز تغزل سے استفادہ کیا ہے اُسکی طبع سلیم انکے ہنروں کی تقلید و تتبع سے کنارہ کش اور منکرہ رہی۔ انکا سارا کلام ایسے داغوں سے پاک ہے۔ جیسا کہ آغاز مضمون میں عرض کیا جا چکا ہے وہ ایک فقیر تھا، نہ صرف وضع و قطع، لباس اور طرز معاشرت کے لحاظ سے بلکہ سیرت و خصلت کے اعتبار سے بھی۔ وہ صرف زبان کا فقیر نہ تھا بلکہ دل کا بھی درویش تھا۔ اس کی سیرت کا یہ پہلو بھی سب سے زیادہ اسکی مثنویوں سے نمایاں ہے۔ میر صاحب کی مثنویوں میں سے تیرہ[۱۳] مذمتوں اور ہجووں میں ہیں۔ راسخ کی چودہ[۱۴] طولانی مثنویوں میں سے ایک بیت بھی کسی کی ہجو میں نہیں۔

کلیات راسخ میں حصۂ مثنوی کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مقدار کے اعتبار سے غزلوں کے دُونے کے قریب ہے اور قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی غزلوں سے کم نہیں۔ ان میں زیادہ تر عارفانہ رنگ کی عشقیہ داستانیں، اخلاقی یا صوفیانہ مسائل پر بعض مستقل رسالے ہیں۔ بعض ذاتی واقعات کا دلچسپ بیان ہے۔ اور ایک شہر آشوب عظیم آباد ہے۔

حمد | حمد و نعت پر کس کمبخت مصنف نے طبع آزمائی نہیں کی؟ مگر با مذاق ناظرین بد انصاف سے بتائیں

کہ تصانیف کا یہ حصہ جس میں انتہائی فصاحت و بلاغت اور صنائع و بدائع صرف کرنے کی کوشش کیجاتی ہے کبھی اسکے دامنِ شوق کو اپنی طرف کھینچتا ہے؟ چند ڈھلے ہوے صفتی الفاظ و فقرات اور پرانی تشبیہات و استعارات ہیں جنکو ہر شاعر طرح طرح سے صرف کرتا ہے۔ یہ مضامین خواہ نفسہٖ کیسے ہی نفیس ہوں مگر انکی فرسودگی مذاقِ جدت پسند کو خاک مزا نہیں دیتی۔ اگر کسی نے بڑا زور مارا تو انھیں خیالات کو زیادہ باریک اور بعید استعاروں میں آلودہ کرکے مسخ سا کر دیا اور وہ رائج گئی۔ خوش عقیدگی کی اور بات ہے مگر اس بد مذاقی کی بدولت اب کسی صاحبِ ذوق کی طبیعت حمد و نعت سے اگر کارہ نہیں تو مسرور بھی نہیں ہوتی۔

راسخ عظیم آبادی کی طبعِ سلیم نے اس وادیِ پُرخار میں بھی اپنے لیے ایک نئی راہ نکال ہی لی۔ اربابِ ذوق اسکے فلسفیانہ حمد کو پڑھیں۔ ایک ایک لفظ اور مصرعے پر غور کریں اور سر دُھنیں۔ جہاں تک میری محدود نظر کی وسعت ہے اُردو شعرا تو درکنار فارسی اساتذہ کی حمد میں بھی یہ نُدرت، یہ رسائیِ فکر، یہ قدرتِ وسعتِ نظر، اور بلاغت کے ساتھ یہ سادگی اور صفائیِ بیان جو فصاحت کی جان ہے نظر سے کم گذری۔ راسخ خدا کی حمد سے پہلے اُسکی مخلوقات کی نیرنگی اور حیرت افزائی کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ان مقدمات سے وہ اُنکے خالق کی ہستی اور قدرت و جلال کا فلسفیانہ ثبوت دیکر اُسکی حمد کا ترانہ یوں گاتا ہے کہ پڑھنے والوں کو بے اختیار ہم آہنگ بنا لیتا ہے۔ ایک لامذہب اور دہری بھی اسکے طرزِ استدلال کو ماننے یا نہ ماننے مگر مجرد شاعری سے لطف اندوز ہوے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور دلِ مُسلم کے تلذّذ کا کیا کہنا! ملاحظہ ہو۔

وہ قابلِ مدحت و ثنا ہے — جو فرطِ ظہور سے چھپا ہے
شایستۂ حمد ذات اُس کی — مظہر ہے یہ کائنات اُس کی
ہر فرد کو اُس سے فی الحقیقت — ہے معنی و لفظ کی سی نسبت
حاضر نہ تھے اُسکے علم میں کب — علمیہ صُوَر اسی کے ہیں سب
رنگیں یہ مرقعِ پر اشکال — یہ آئینۂ عجیب تمثال
یہ صفحۂ گونہ گونہ تصویر — یہ نازکیِ قلم یہ تحریر
یہ کارگہِ غریب و دلکش — یہ نادرہ نقش بہت منقش
جانے ہے جسے ہے عقل سے ساز — برہانِ وجودِ نقش پرداز
ہے مستیِ دلیل بود صانع — صنعت نہ ہو ہے وجودِ صانع

کیا صورتیں دلفریب ہیں یاں		بے ہیچ نہیں یہ یوسفستاں

* * * * * * * * * *

* * * * * * * * * *

یہ صنع بہت ہے فہم سے دور		ظلمت کو ہوتا طبیعت نور!
ہو مادّہ نور کا سیاہی!		اللہ ری حکمتِ الٰہی!
کیا شے ہے وہ جسکو کہتے ہیں جاں		ہیں یاں تو قیاس و فہم حیراں
ہے سرِ عظیم اس میں مستور		ہے گنج سے یہ طلسم معمور
اس دُرج میں ہے وہ گوہرِ تر		ہیں جسکے پرکھنے والے کمتر
وہ ہُور اسی خاک میں ہے روپوش		جاں جس کو کہیں ہیں صاحبِ ہوش
جاں وہ کہ ہے جس سے زندگانی		جاں زور ہی راز ہے نہانی
اس راز سے کس کو آگہی ہے		یاں مبتدی ہے جو منتہی ہے
ممکن نہیں جب کہ جاں کا عرفاں		کب فہم میں آوے خالق جاں

* * * * * * * * * *

نادرا کُ کا عجز یاں ہے ادراک		ہے دال یہ قول ما عرفناک
کیا پاسکے اُس کو عقل والا		ما اعظم شانہ تعالےٰ

**عشقیہ داستانیں** راسخ کی عاشقانہ مثنویاں صرف زبان، بیان، یا اخذ نتائج کے لحاظ سے نہیں بلکہ پلاٹ کے اعتبار سے بھی فلسفیانہ اور عارفانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان میں سے اکثر اصمعی کی روایتوں سے ماخوذ ہیں۔ پلاٹ میں راسخ نے جس حسنِ تلاش اور لطافت مذاق سے کام لیا ہے اُسکا نمونہ ملاحظہ۔

اصمعی وہ ہمہ تن عجز و نیاز		دل تھا جس کا صدف گوہرِ راز
یوں ہے ناقل کہ پئے قطعِ راہ		وادیِ کعبہ میں اک دن ناگاہ
ایک پتھر نظر آیا مجھکو		اُس کا کچھ دیکھنا بھایا مجھکو
سطح سے اُس کی صفا جاں افروز		رقم اس پر کئی بیتیں پُر سوز
اُنکے مضموں سے ٹپکتا تھا خون		ہی حسرت زدہ اُن کا مضموں

کم سے کم مرتبۂ حجاجِ کرام — حاضرِ طوف و درِ بیتِ حرام
شک ہے پاس دل شکستہ ضرور — غافل اس سے نہ رہو تا مقدور
کعبۂ دل نہیں کعبے سے کم — شرفِ کعبہ ہے پیشِ محرم
ہے جو ترتیب دو عرشِ عظیم — سو ہے ٹوٹے ہوئے دل ہی کا عظیم
ہاں خبر لو کہ شکستہ دل ہوں — جگر افگار ہوں خستہ دل ہوں
دل و جاں سے ہو فدائے کعبہ — تم کو سوگندِ خدائے کعبہ
پوچھوں ہوں تم سے میں آفت دیدہ — کہ کوئی غمزدہ دل رنجیدہ
گر کہیں آنکھ لڑا بیٹھا ہو — دل پہ کچھ چوٹ سی کھا بیٹھا ہو
قید غم سے نہ رہائی ہو اُسے — اپنے دلبر سے جدائی ہو اُسے
حد سے گذری ہو گرفتاریِ دل — طول کو پہونچی ہو بیماریِ دل

اُس گرفتار کی کیا ہے تدبیر؟
ایسے بیمار کی کیا ہے "تدبیر؟"

سمجھا ان بیتوں کا حاصل میں نے — پائی ردا قسم کی تو دل میں نے
کرکے موزوں کئی بیتیں اُس دم — کیں اُسی شک پہ یوں میں نے رقم
کہ "کوئی گر کہیں مائل ہووے — عشق کے صدموں کا حامل ہووے
واجب اُس پر ہے اگرچہ ہو جبر — ہاتھ سے دیوے نہ سررشتۂ صبر
ہمہ غم ہووے و لیکن رہے شاد — دے نہ ناموسِ محبت برباد
حشر فریاد سے برپا نہ کرے — عشق کے راز کو رسوا نہ کرے
ضبط آہیں کرے۔ رو کے نالے — آمدِ گریہ کو ہنس کر ٹالے
بے تہی سے نہ رہے گرمِ خروش — جیسے تصویر سدا ہو خاموش
چاک کرنے سے گریباں کے ڈرے — رازِ پوشیدہ نہ بے پردہ کرے
زندگی گو ہو پہ ہشیار رہے — بے خبر ہوکے خبردار رہے

کہ یہ آیات ہوا واں سے رواں / پہونچا منزل پہ میں اپنی حیراں
حیرت افزا تھی یہ روداد عجیب / تھا تحیر کہ وہ مہجور غریب
کس کا اس درجہ تمنائی ہے / کس طرف ہائے وہ شیدائی ہے
شب اسی فکر میں بیتاب رہا / تا دمِ صبح میں بیتاب رہا
صبح کے ہوتے نہ کی کچھ بھی درنگ / پا برہنہ ہی گیا تا سرِ سنگ
سطح پر سنگ کی جوں ہی نگاہ / اپنی تحریر کے نیچے کچھ آہ
تازہ بیتیں لکھی دیکھیں دو چار / اُن کا مضمون یہ تھا "کہ اے غمخوار
صبر سے ہووے ہے مشکل آساں / پر جہاں عشق ہے واں صبر کہاں
صبر صد مرتبہ ہے عشق سے دور / وہ تو عاشق نہیں جو ہووے صبور
عرصہ بے صبری سے جس پر ہو تنگ / عاشقوں کی ہے وہ مجلس کا ننگ
صبر ہے پنبہ و آتش ہے عشق / آہ اک شعلۂ سرکش ہے عشق
صدمۂ عشق کہاں صبر اُٹھائے / کاہ کب کوہ کے عہدے سے برآئے
جو سپند سر آتش ہووے / تپِ ہجراں کا ستم کش ہووے
آہ وہ حسرتی سیمابی / کیا کرے گر نہ کرے بیتابی
صبر کا عشق میں ٹھیرے نہ قدم / ہوں کہاں آتش و سیماب بہم
عشق تو صبر کا کھینچے ہے پوست / عشق ہے صبر کا دشمن اے دوست
عشق میں صبر سے جو ہیں منسوب / سہل ہے اُن کو فراقِ محبوب

جس کا بے صبری جگر پارہ کرے
کیا دوا اُس کی وہ بیچارہ کرے"

خوں چکاں جوں ہی پڑھے یہ اشعار / ہوئیں آنکھیں مری ووں ہی خونبار
ان کے مفہوم نے بیتاب کیا / زہرۂ طاقتِ دل آب کیا
پھر اسی سنگ پہ میں از سرِ درد / گرمِ تحریر ہوا بھر دمِ سرد
کہ کوئی دل زدہ مہجور غریب / نیم کشتۂ الم و ہجر نصیب

تعب ہجر سے ہو بے طاقت　　صبر پر اُس کو نہ ہووے قدرت
تنگیِ حوصلہ سے گھبراوے　　مصلحت یہ ہے کہ وہ مر جاوے
شکر جو رنج و بلا پر نہ کرے　　صبر جو جور و جفا پر نہ کرے
دوریِ یار ہو ناسازِ مزاج　　اپنے نزدیک ہے مرگ اُسکا علاج
ابتلا عشق کی جو سہہ نہ سکے　　ثابت اس راہ میں جو رہ نہ سکے
جسکو بیتاب رکھے دردِ فراق　　عشق میں ہووے شکیبائی شاق
صبر کے کام میں جو ہووے خام　　مارے اپنا ہی کرے کام تمام

جس کا ٹھیرا ہے نہ اس رہ میں قدم
چاہیے اُسکو کہ لے راہِ عدم"

کارِ تحریر سے فارغ ہو کر　　اپنی منزل کو گیا میں رو کر
رات ساری مجھے گریاں گذری　　گذری پر سخت پریشاں گذری
صبح جانے میں نہ کی کوتاہی　　پھر سوئے سنگ ہوا میں راہی
واں جو پہونچا تو گئے میرے حواس　　دیکھتا کیا ہوں کہ اُس سنگ کے پاس
ایک نازک تن و رعنا سا جوان　　ہے پڑا خاک پہ لیکن بے جان
رنگ رخسار کا اُسکے کاہی　　سینہ نوچا ہوا پشتِ ماہی
روئے خوب آفتِ ناخنِ تیز　　بہ بر کاکل مہِ نو سے لبریز
جدول اک خون کی ہر تازہ خراش　　سرِ پنہانِ محبت سب فاش
بیکسی لاش پہ اُس کی گریاں　　حسرتیں سینہ زن و نوحہ کناں
آرزو مُنہ پہ ملے اپنے خاک　　چاؤ ارمان گریباں کیے چاک
ننگے سر ہاے تمنائے وصال　　پا برہنہ الم و حزن و ملال
فرق پر اپنے وفا خاک افشاں　　بال نوچے ہوئے محزون گریاں
مو پریشان امیدوں کی صف　　ہاے افسوس کناں کف بر کف
صبر کے تن پہ فقیری کا لباس　　غم غم بیکسی سے اپنے اُداس

ورد کو اُس کے نہ ماتم سے فراغ
داغ کرتے تھے سیہ پوشی داغ

دیکھ یہ رنگ عجب رنگ ہوا — عرصہ بیتابیوں سے تنگ ہوا
میں ہوا اسکے فنوں کا مغلوب — گلے اُس لاش کے لگ رویا خوب
دفن اُس کا ہُوا واجب مجھپر — زیر خاک اُسکو رکھا رو رو کر
فارغ اس کام سے ہو کر دلخواہ — پھر جو اُس خاک پہ کی جا کے نگاہ
نظر آئے مجھے۔ تھے گرچہ بعید — تحتِ ابیات یہ دو شعر جدید

شعر اول

شعر اول کے یہ معنی ہیں خموش — بات تیری ہوئی آوازۂ گوش
تو نے مرنے کو مجھے فرمایا — تیرا ارشاد بجا میں لایا
زندگانی تھی مری یہ مرنا — فرض تھا تیری اطاعت کرنا
کر اب اُس تک مرا ابلاغ سلام — وصل کا اپنے جو مانع تھا دام
کہہ طرف سے مری یوں" کاے طناز — تو رہے اور رہے تیرا ناز
جی گیا میرا غموں کے مارے — کیا گیا ناز کا تیرے بارے
میں تو لے واسے ہر حال ہُوا — پر خجل تیری تمنا سے ہُوا
وصل کا مژدہ کہا تھا اُس کو — ہاے یہ وعدہ دیا تھا اُس کو
میں تمنا کو تری کھو نہ سکا — ہاے پر تجھ سے بھی یہ ہو نہ سکا
گرچہ کہنے کو کہا - ہو نہ سکا — یعنی یہ وعدہ وفا ہو نہ سکا
اب خجالت سے سرافگندہ ہوں میں — آرزو سے تری شرمندہ ہوں میں
کاش یہ وعدہ نہ اُس سے کرتا — کاہے کو منفعلانہ مرتا
کاش کرتا تو مرے دل سے کہیں — مو اس اپنی تمنا کے تئیں"
اے مقیم دلِ اصحاب کمال — آگے یہی تھا مری قدرت سے محال

## شعرِ دوم

دل کو میرے نہ کیا اس شعر نے خوں — شعرِ ثانی کا ہی تھا مضموں
کہ خوشا طالعِ اربابِ نعیم — نعمتیں جن کو ہوئی ہیں تقسیم
عاشقوں کو نہیں پر کچھ بھی تلاش — ان کی تو خونِ جگر پہ ہے معاش
ہو مبارک انھیں خوشحال جینا — ان کو غم کھانا لہو کا پینا

---

اس کے ادراک سے ہے عقل بھی تنگ — آنکھیں میری ہوئیں ناسور کی رشک
مدتوں میں نے تو یہ غم رکھا — کشتۂ عشق کا ماتم رکھا
زہے یہ عشق سراپا نیرنگ — کیا کہوں اسکے ہیں کیا کیا نیرنگ
دل جلے اس کے ہیں ظاہر میں بھلے — باطنا راکھ کی ڈھیری ہیں وہ سے
چپ رہے ہیں کوئی آگاہ نہیں — قیمہ ہیں، لب پہ ولے آہ نہیں
مت کرو عشق کا دعوےٰ راسخ — عشق تم کو نہیں زیبا راسخ
سایہ ہی ڈھونڈھو ہو سونے کیلیے — دلِ خوش چاہو ہو رونے کیلیے
زعفرانی ہے گلے میں کفنی — رنگ یہ کیا ہے؟ یہ کیا جی میں ٹھنی؟
ہو اگر عشق کے تم در کے فقیر — تو مناسب نہیں صاحب تزویر
باندھو اپنے سرِ عریاں سے کفن — کرو عریانی کو تم پیراہن
تنِ خاکی پہ نہ یوں جی توڑو — اس کفِ خاک کی الفت چھوڑو
اک کفِ خاک کی زیبائش کیا؟ — اس کی یہ حسرتِ آرائش کیا؟

**صنعتِ عشق** | شعرا نے مثنویوں میں صنعتِ عشق میں بڑی بڑی لن ترانیاں ہانکی ہیں اور آسمان زمین کے قلابے ملائے ہیں۔ اسی مضمون کو راسخ نے جس فلسفیانہ اسلوب سے نظم کیا ہے اور اس زمین میں جو دلچسپی پیدا کر دی ہے قابلِ دید ہے۔ مولانا روم کے بعد یہ سائنٹفک شاعری راقم کی نظر سے کبھی نہیں گزری

گذرا ہے نظر سے یہ سراسر — اس نسخۂ نہ ورق کے اندر
تیری ہی کہانیاں رقم ہیں — تیرے ہی فسانے کیف قلم ہیں

قصہ ہے بہت دراز تیرا | سمجھا نہیں کوئی راز تیرا
ٹوٹا ہوا دل ہے تخت تیرا | وارفتہ ہوں میں تو سخت تیرا
وارفتۂ کفر تجھ سے دیندار | تسبیحں بنائیں تو نے زنار
سجادوں سے خلوتی اٹھائے | صحرا میں برہنہ پا پھرائے
تیرے ہی ہنر سے اے ہنرمند | نالوں کو کیا اثر سے پیوند
محرم ترے بر ملا کہیں ہیں | تیرے ہی تئیں خدا کہیں ہیں
عالم ہے تجھی سے آشکارا | تیرا ہی ہے یہ ظہور سارا
افلاک و عناصر و موالید | نجم و مہ وابر و باد و خورشید
ہے ان کی نمود کا سبب تو | ہے ان کے وجود کا سبب تو
وابستہ ہے کائنات تجھ سے | روئیدگیِ نباتت تجھ سے
تو نور ہے ارض کا سما کا | ہے جاذبہ تو ہی کہربا کا

---

عشق کا مرتبہ ہے بسکہ بسیط | کب قیاس و خرد اسیر ہوں محیط
جس نے کچھ بھی اسے پچانا ہے | وہ سڑی خبطی ہے دیوانا ہے
بے زباں محرم اسرار اس کے | سب سے آزاد گرفتار اسکے
وجہ وارستگی ہے بند اسکا | سببِ قطع ہے پیوند اسکا
عشق میں جیتے وہی جو ہارے | عشق اٹھاوے ہے تعین سارے
جس نے چکھا ہی نہ وہ کیا جانے؟ | چکھنے والا مزا اس کا جانے
عشق اک لذتِ روحانی ہے | عشق کیفیتِ وجدانی ہے

اخلاقی وصوفیانہ مثنوی | عشقیہ داستانوں کے علاوہ جن سے ہمیشہ عارفانہ نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ راسخ نے جامی کی مثنوی سبحۂ ابرار کے طرز پر کوئی سوا سو بیتوں کا ایک رسالہ لکھا ہے جو صفاتِ عباد، بندگی، ادب، عفو، عیب پوشی، یقین شکر، تصفیۂ قلب، عشق حقیقی وغیرہ متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر ایک بیان بوستاں کی طرح ایک یا زیادہ حکایات کے ذریعے سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے،

ان خاص خاص مضامین و دقیقہ کو صفائی سے نظم کرلینا ہر غزل گو کے بس کی بات نہیں۔ ورنہ آج ہر کس و ناکس اپنے دیوان کے دفتر کے ساتھ ایک مثنوی از قسم بوستان، مثنوی رومی، وپندنامہ عطار بھی ضرور چھوڑ جاتا۔ یہاں ایک باب در صفتِ یقین بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔ اُردو میں پند و نصیحت کے مضامین کو کسی شاعر نے اس صفائی اور دلآویزی کے ساتھ شاید نظم نہیں کیا ہوگا۔

وے جو تھی قوم بنی اسرائیل　　صاحبِ مرتبہ و قدرِ جلیل
اُن میں درویش تھا اک نامہ سیاہ　　جُرم سے کارِ معاد اُسکا تباہ
فعلِ بد ہی میں وہ مصروف مدام　　روز و شب جُرم ہی سے اُسکو کام
جب تلک اک اُسکو ندامت ہوتی　　فرطِ عصیاں سے خجالت ہوتی
توبہ کرتا تھا گناہوں سے تب　　لیک صبر اسکے تئیں توبہ پہ کب
نفس و ابلیس کا پیرو وہ دنی　　تو اماں توبہ و توبہ شکنی
تاکہ اک بار دیا جی میں قرار　　کہ نہ اب توبہ شکن ہو زنہار
وحی آئی وہیں موسیٰ کے تئیں　　جا کہہ اُس مُذنب و رسوا کے تئیں
کہ گر اب عہد شکن ہوگا تو　　جرم و عصیاں ہمہ تن ہوگا تو
توبہ تیری نہیں ہووے گی قبول　　کبھو اے زبدۂ اربابِ فضول
پاس درویش کے موسیٰ آئے　　حکمِ حق سیتے بجا وے لائے
جو خداوند نے تھا فرمایا　　گوشِ درویش تلک پہونچایا
کہ نہ اب توبہ شکن تو ہونا　　رائگاں وقت نہ اپنا کھونا
ورنہ شایانِ جہنم ہوگا　　حالِ تعذیب سے درہم ہوگا
کیں جو ہیں اُس نے یہ سب باتیں گوش　　آہ جاتا رہا درویش کا ہوش
اُسکو اک خوفِ خداوند رہا　　صبر اُس توبہ پہ یک چند رہا
آخر ابلیس نے کی راہ زنی　　پھر ہوئی اُس سے یہ توبہ شکنی
لے گیا راہ سے شیطاں اُسکو　　کر کے آلودۂ عصیاں اُسکو
وحی نازل ہوئی یہ بار دگر　　کہ کہہ اُس توبہ شکن سے جاکر

وا ہوا تجھ پہ عقوبت کا باب / ہے تو اب موردِ صدگونہ عذاب
آہ درویش تلک آئے کلیم / لائے پیغام پہ از خوف و بیم
اُس نے جس وقت یہ پیغام سُنا / دیکھ کر سوے فلک سر کو دھنا
ہوکے مبہوت وہ دیوانہ وار / لب پہ لایا یہ پریشاں گفتار
کہ اے خداوندِ جہاں ذی اکرام / کیا جگر سوز یہ بھیجا پیغام!
طرفہ اس سے مجھے حیرانی ہے / کہاں دل کو پریشانی ہے
ہاں یہ پیغام نہ کیوں جی مارے / اسکو کیا کہتے ہیں یارب بارے؟
ہردم افزوں ہے تحیر میرا / بحرِ بے ساحلِ رحمت تیرا
ہوگیا خشک سراسر شاید؟ / عفو دشوار ہے تجھ پر شاید؟
یا سیہ کاریوں سے اب میری / رُو بنقصاں ہوئی بخشش تیری؟
یا خزانے وہ ترے عفو کے سب / تھے جو معمور - تہی ہوگئے سب؟
یا وہ تیرا کرم اے جملہ عطا / نہ رہا - بُخل سے تبدیل ہوا؟
غالب آیا گنہ بندہ مگر / اس ترے عفو خداوندی پر؟
اے گنہ بخشِ عبادِ برہ را / اے پذیرندۂ عذر، اے غفّار
تجھ کو بخشندہ نہ جانوں کیونکر؟ / تو نہ بخشے مجھے۔ مانوں کیونکر؟
کرم و رحم صفت ہے تیری / حسد و بُخل ہے سیرت میری
تجھ میں ہے شانِ کریمی بالذات / تو قدیم اور قدیمی یہ صفات۔
میں ہوں حادث، مری ذہنی ہے نمود / اصلِ ہر اصل ہے تیرا ہی وجود
جود محمود ہے - جو تجھ میں ہے / بُخل مذموم ہے۔ سو مجھ میں ہے
میں ہمہ نقص ہوں۔ تو جملہ کمال / تجھ کو دائم ہے بقا - مجھ کو زوال
یہ صفت ہے جو رویّہ ہے مری / آوے غالب نہ صفت پر تیری

٭ ٭ ٭

میں کہ عصیاں ہی ہوں سرتا سر / تیرا شایستۂ رحمت ہیں مگر

تو گنہ سارے گنہگاروں کا　　قبحِ اعمال سیہ کاروں کا
کر مری جانِ الناک سے ضم　　مجھ کو اس کا نہیں ہرگز کچھ غم
آپ کو لے شہِ تسلیم و فا　　تیرے بندوں پہ فدا میں نے کیا
کیں اُس آشفتہ نے یہ باتیں سب　　عرض درگاہِ خداوند میں جب
وحی پھر آئی کہ اے موسیٰ ہاں　　کہہ یہ اُس بندے سے میرے تو واں
کاے جگر خستہ الم کش درویش　　ہیں جرائم ترے گو بیش از بیش
لیک غمگیں نہ رہ اب تو بارے　　ہم نے بخشے وہ جرائم سارے
وجہ یہ ہے کہ یقیں کامل تر　　ہے ہماری تجھے آمرزش پر
ہے یقیں تیرا خوش آیا مجھ کو　　قہر سے رحم میں لایا مجھ کو
قطع کی ہم نے نہ تیری اُمید　　کی عطا تجھ کو بہشتِ جاوید
تیرا ایقان ترے کام آیا　　ہم کو یہ شیوۂ احسن بھایا
اے ہمہ علم، زہے تیرا علم!　　اے ہمہ علم، زہے تیرا علم!
گو گنہگار رہے راسخ - لیکن　　ہے یہ تیرا کرم اُس کا ضامن
تیری رحمت پہ یقیں ہے اُسکو　　خوفِ عصیاں کا نہیں ہے اُسکو

**مثنوی شہر آشوب**　راسخ نے ایک مثنوی شہر آشوب عظیم آباد بھی لکھی ہے - شہر آشوب ایک عبرت خیز اور پُر درد موضوعِ سخن ہے مگر راسخ نے اسے صنائعِ شاعرانہ اور ظرافت سے ایک نہایت دلچسپ کلام بنا دیا ہے - اس مثنوی سے ظاہر ہے کہ راسخ کی طبیعت ہجو اور مذمت نگاری کے ہنر میں بھی کسی طرح بند نہ تھی - وہ کبھی کبھی معتدل ظرافت کی آمیزش سے اپنے خوانِ سخن میں عجب چاشنی پیدا کر دیتے ہیں مگر یہ ہنر من حیث پیشہ کے اُس نے پیشہ ورِ سخن فروشوں ہی کے لیے چھوڑ دیا کہ وہ اس ٹھیکرے میں اپنی روٹی مانگ کھائیں - چنانچہ مثنوی مذکور میں اور پیشہ وروں کی نالائقی یا قدر دانی کی شکایت کے بعد وہ فنِ شعر اور شعرا کا تذکرہ یوں کرتا ہے :-

جو ہیں شاعر کامل نامدار　　ہے اُن کا وہی وقر اور اقتدار
قناعت میں ان کی نہ آیا خلل　　نظر میں کسو کی نہیں مبتذل

انھیں غیرتِ شاعری ہے زبس نہیں ہے دراز ان کا دستِ ہوس
ہے اب تک یہ زمرہ ڈُربے بہا پر ان کا شناسا نہ کوئی رہا
ہوے کامل اس فن میں جو دو سہ یاں یہ ہے وقر و عزت کا اُنکی بیاں
نہ وے جن پہ ہے تہمتِ شاعری کہاں وے، کہاں دولتِ شاعری؟
گدا الطبع، دوں ہمت و نا سزا حریص و شکم بندہ و بے حیا
ہیں اکثر یہی در بیاں آج کل کوئی فرقہ اتنا نہیں مبتذل

عظیم آباد کے انقلاب کا ماتم کرتا ہوا ہنرمندوں اور باکمال پیشہ وروں کی موجودہ افسوسناک حالت کا خاکہ یوں کھینچتا ہے:۔

معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے فقط مفلسی برسرِ کار ہے
گدا ایُ کا کاسہ لیے در بدر ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر
مشائخ جو ذی عز و تعظیم ہیں دل اُن کے بھی صدمہ کش بیم ہیں
غمِ قوت سے یاں تلک ہر زماں کہ ہیں رشتۂ سبحہ ساں ناتواں
گئے سارے ورد و وظائف کو بھول کیا ایسا فکرِ شکم نے ملول
لبوں پر اُنھوں کے اگر کیجیے غور بجز نان و حلوا نہیں ذکر اور
وظیفہ ہے ہر آن اب حرفِ قوت کیے دانے تسبیح کے صرفِ قوت
لکھوں خوشنویسوں کا میں حال کیا نوشتے یہ اپنے ہیں گریاں سدا
کہیں ہیں بچارے کہ کس اور جائیں لکھا اپنی قسمت کا کیونکر مٹائیں
معلم ہُوا ناظمِ وقت اگر کوئی پوچھتا ہی نہیں اُس کو پر
پڑھا دے اسے دو صد طفل کو وہ مدام ملے گر اُسے یک رکابی طعام
زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے دُرِ مدعا یاں تو نایاب ہے
کرے کب یہ پیشہ کسو کو نہال کہ سرسبز ہونا بہت ہے محال
خطر اس میں خشکی کا ہر آن ہے اگر ہووے غرقی تو طوفان ہے
تجارت کا مایہ کسو میں کہاں کہ باقی نہیں کچھ بجز نقدِ جاں

ہوئی تختہ دوکان سوداگری ؛ کوئی فروشندہ نہ مشتری
طبابت میں بھی اب نہیں کچھ حصول　　اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول
ہر اک کو مرض مفلسی کا ہے آج　　طبیب اب بچارے کریں کیا علاج
سپاہی کی مٹی بھی اب ہے خراب　　کہ تیغا ہوا نوکری کا تو باب
جو اشرف ہیں اب انکا یہ رنگ ہے　　کہ قسمت سے اپنی انھیں جنگ ہے
ہیں افلاس سے ایسے اندوہگیں　　کہ مٹی کا گھوڑا میسر نہیں
نہ شمشیر پاس انکے نہ ہے سپر　　نہیں رکھتے قبضے میں اک مشت زر
نہ ترکش ہے نے تیر ہے نے کمان　　خدنگ الم کے نشاں ہر زمان
کہاں کی کماں ہو رہے ہیں تباہ
اگر تیر ہے تو فقط تیر آہ ؛

---

**عُذر** | مجھے پورا احساس ہے کہ اس ناقص مضمون سے راسخ جیسے مجتہد فن کے تبصرہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ یہ خدمت کیا بلحاظ فراہمی مواد اور کیا بلحاظ صلاحیت و فراغت کسی طرح میرے بس کی نہیں۔ بایں ہمہ میں یہ جرأت کر بیٹھا اور اس لیے کر بیٹھا کہ اولاً اپنے اُس جذبۂ تحسین کو تسکین دوں جو کسی عمدہ کلام کے پڑھنے یا سننے سے دل میں اُبلنے لگتا ہے۔ ثانیاً اگر راسخ کا کما حقہ تبصرہ و تذکرہ نہ آئے جب بھی اس گمنام سخنور کو سخن شناسوں سے روشناس کرنا شاید تغزل کا ایک بہتر اور اعلیٰ نمونہ موجودہ اُردو تغزل کی بدمذاقیِ عام کی اصلاح کا باعث بھی ہو۔ ثالثاً جو بزرگ راسخ کے سوانح زندگی لکھنے اور اُس کے کلام پر رائے زنی کرنے کی واقفیت اہلیت رکھتے ہوں اُنکے لیے یہ ایک تحریک اور چھیڑ ہو۔

محمد مسلم عظیم آبادی

# حمد

از جناب عابد، صدیقی (امراوتی)

خدایا ہے کلیمِ آیۂ لاتقنطو تو ہی
دلِ مایوس میں کرتا ہے پیدا آرزو تو ہی

اگر چشمِ مبصر ہو دماغِ روح پرور ہو
گلِ فطرت سے ظاہر ہو مثالِ رنگ و بو تو ہی

عیاں ہر ذرہ ذرہ سے ترا اک کرشمہ ہے
نہاں ہر پتہ پتہ میں ہوا بن کر نمو تو ہی

ترے نورِ مقدس کی جھلک ہر شے سے ظاہر ہے
رگِ کون و مکاں میں پھر گیا بن کر لہو تو ہی

صدائے نحن اقرب دے کے چھپ جاتا ہے نظروں سے
ہمیں رکھتا ہے مصروفِ خیالِ جستجو تو ہی

حکومت تیری ہے سب پر مشیت تیری ہے برتر
ہوا مشہور شہرِ کن فکاں میں کو بکو تو ہی

نسیمِ باغِ ابراہیم کا جھونکا تھا یا تو تھا
ضیائے برقِ ایمن تھی کہ تھا اے شعلہ رو تو ہی

تری درگاہ سے امید بندھتی ہے غریبوں کی
دلِ صد چاک کو رحمت سے کرتا ہے رفو تو ہی

برے ہوں یا بھلے امت ترے محبوب کی ہیں ہم
بچانا دین و دنیا میں ہماری آبرو تو ہی

ترا دریائے رحمت کم نہ ہوگا ایک قطرہ بھی
مرے دامانِ آلودہ کی کر دے شست و شو تو ہی

کہاں کی طاعتِ عابد کہاں کا تقوئ زاہد
نبیؐ کے صدقے رکھ لے حشر میں بس آبرو تو ہی

# اطلبوا العلم ولو کان فی الصین

## (سنسکرت اور ہندی)

: اُس ذات اقدس کا قول ہے جو بظاہر اُمّی اور بباطن علم کے فدائی تھے۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ چاہے علم کی خاطر چین میں ہی جانا پڑے پھر بھی مسلمانوں کو جانا چاہیے۔

مسلمانوں نے بہ تبعیت اس قولِ محترم کے جس شوق اور ہمت سے مختلف علوم و فنون کا خیر مقدم کیا وہ دُنیا سے مخفی نہیں۔ اگرچہ وہ قوم اس وقت مختلف مصائب کا نشانہ ہو رہی ہے لیکن اُسکی ہمت گذشتہ پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اُسکے اسلاف اور بزرگانِ ملت نے اس میدان میں جو جوہر دکھائے ہیں وہ فخر کے قابل ہیں۔ ہندوستان جب مسلمانوں کے نقطۂ گرفت اور نظر تصرف سے دُور تر تھا اور اُنکے سامنے صرف تاریخی صفحات اُسکو پیش کرتے تھے۔ اُن وقتوں میں مشاہیر بغداد نے جس ذوق و شوق سے ایک طرف یونان اور دوسری طرف ہندوستان کی دھرتی سے علوم و فنون کا اکتساب شروع کیا وہ زمانے کی تاریخوں میں جلی قلم سے لکھا ہے۔

اس سے ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں کے علوم و فنون اور ادبیات سے کوئی حسد اور خبگ نہ تھی۔ اوپر کی حدیث ظاہر اور ثابت کر رہی ہے کہ علم کی خاطر بانی اسلام چین تک جانا بھی ضروری اور لازمی بتاتے ہیں۔

بغداد کے مشاہیر کا نمونہ پیشِ نظر رکھکر ہم سوچتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ خود ہندوستان میں صدیوں رہ کر مسلمانوں نے ہندی علوم و فنون سے نہ سہی، ہندی زبانوں سے ہی علمی رنگ میں کہاں تک اور کیا کچھ کام لیا۔

اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اُسوقت علوم سنسکرت بوجہ زبان سنسکرت کے کمزور پڑنے کے قریباً گم ہو چکے تھے۔ اگر کچھ باقی ہوں تو دیا کرن اور ہندو دھرم کی مذہبی روایات اور مذہبی عقائد کی کتابیں کچھ تو اس واسطے مسلمانوں نے اس طرف توجہ نہ کی کہ ایک حد تک ہنود کے

اعتقاد میں کم سے کم اُسوقت کے اعتقادیات میں ہندو دھرم کی پستکوں کا کسی شودر یا غیر مذہب کے لوگوں کو سکھانا ناواجب تھا۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ چھوت نے بھی اس راہ میں روڑے اٹکائے۔ اگرچہ چند مسلمان علما نے اس طرف توجہ کی اور گیتا جی ایسی کتابکا ترجمہ کردیا مگر پھر بھی یہ روکیں عام طور پر مزاحم ہی رہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کی جانب سے بھی شوق اور ہمت سے کام نہ لیا گیا۔ مسلمانوں نے عموماً زبانوں کے سیکھنے میں بھی توجہ نہ کی۔ جس طرح کہ ہندووں نے فارسی کے سیکھنے میں شوق دکھایا۔ اگرچہ اُنکے واسطے یہ وجہ بھی موجود تھی کہ اُنھیں نقش قدم حکومت لینے کے لیے اس طرز آنا ضروری تھا لیکن اگر مسلمان بھی یہ کوشش جاری رکھتے تو کوئی بات اور کوئی مشکل نہ تھی۔ دیکھو بعضوں نے جب ہندی راگ کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ نے اس میں ایجادات کی بنا ڈالی ہے۔ فقیر اللہ ملقب بہ سیف خاں نے کتاب مانکت سوہل راگ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ امیر خسرو علیہ الرحمہ چونکہ فارسی اور ہندی دونوں راگوں سے واقف تھے اس واسطے اُنھوں نے ہندی اور فارسی راگوں کو ملاکر ایک تیسرا رنگ پیدا کردیا۔ اسی طرح اور نظیریں بھی دی جاسکتی ہیں۔ اس سے اسقدر تو ثابت ہے کہ مسلمانوں نے دوسری اقوام اور زبانوں سے کام لینے کو کبھی قومیت یا مذہب کے خلاف نہیں خیال کیا۔ اگر اُس زمانے میں سنسکرت زبان مروج عام ہوتی تو ضرور مسلمان بھی اُسے سیکھتے اور کچھ نہ کچھ اُس میں کمال بھی حاصل کرتے۔

وہ زمانہ گیا۔ اگر اُسوقت مسلمان بر سر اقبال اور ہندو گرچکے تھے تو اِس وقت دونوں کی حالتِ موجودہ برابر ہے بلکہ مسلمان اُن سے بھی زیادہ تر موردِ ادبار ہیں۔ اسوقت نہ فارسی ہے اور نہ سنسکرت اور نہ عربی انگریزی۔ اُردو اور ہندی کا چرچا ہے۔ انگریزی کی تعلیم دونوں کے لیے لازمی ہے۔ کیونکہ حکومت موجودہ کی قومی اور سیاسی زبان ہے۔ اُردو اور ہندی سے بھی علی قدر ضرورت دونوں قومیں کام لیتی ہیں اور چپقلش اُردو اور ہندی بھی مخاصمانہ رنگ میں زیر بحث آچکی ہیں بعض وقت دونوں کے الفاظ کا سکھنا گویا ایک قومی اور ملکی جرم خیال ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں قوموں میں سے کوئی قوم بھی ہند کی سرزمین میں سے باہر نہیں جاسکتی مگر زبانوں کے الفاظ کو باہر نکالا جاتا ہے۔

ہم اسوقت یہ بحث نہیں چھیڑینگے کہ کون سی زبان رواج پارہی ہے اور علم ضروریات کے تحت میں کس کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم اپنے نقطۂ خیال سے یہ ضرور کہیں گے کہ اب مسلمانوں کا یہی فرض ہے کہ

جہاں تک ہو سکے ہندوستان کی موجودہ زبانوں بالخصوص سنسکرت اور ہندی سے شناسائی پیدا کریں چونکہ عام طور پر سنسکرت مروج نہیں ہے ایک حد تک ہنود بھی اس سے اتنی قدر نامحرم اور بے پرواہیں جتنا کہ مسلمان ہیں، اور مسلمانوں کے واسطے بھی اُسکا سیکھنا اُسی قدر مشکلات رکھتا ہے جس قدر خود ہنود کے واسطے ۔ کیوں ہندی، سنسکرت زبانوں اور گورمکھی حروف اور الفاظ کا ہمیں حاصل کرنا ضروری ہے؟ اس واسطے کہ "علم شے بہ از جہل شے" ہے ۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے لسانی رنگ میں ہم ہنود کے اور بھی قریب ہوں گے ۔ تیسرے یہ کہ ان زبانوں کے ادبیات اور حسن و قبح سے واقف ہو کر ہم عملی رنگ میں کچھ ترقی کر سکتے ہیں، اور بعض عیوب اور سقموں سے محفوظ بھی رہ سکتے ہیں ۔

اور سب سے بڑھکر یہ کہ مسلمانوں میں اشاعتِ مذہب کی ضرورت اس وقت خاص طور پر محسوس کی جا رہی ہے ۔ غیر قوموں اور غیر مذاہب میں اشاعت اسلام یوں بھی ہو سکتی ہے مگر اُنکی زبانوں کے جاننے سے اور بھی سہولت ہو سکتی ہے ۔ کیا اس سے مسلمان انکار کر سکتے ہیں ؟

واجب تو یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں بھی یہ شرط ایزاد کر دی جائے اور اگر ابھی اسکا وقت نہیں آیا تو پھر بعض مسلمانوں کو بطور خود یہ کام کرنا زیبا ہے ۔ ہندی اور سنسکرت زبان کے حاصل کرنے کے واسطے ہنود میں سے بعض صاحبان نے بہت ہی آسان اور پاکیزہ قواعد شائع کیے ہیں اُن سے کام لینا چاہیے ۔

حروف اور الفاظ گورمکھی کا سیکھنا کچھ مشکل نہیں ہے ایک قابل اندیشی ہی حروف اور الفاظ کا پڑھنا سکھا سکتی ہے ۔ ایک دفعہ سقراط نے کسی سے پوچھا کہ تمہارے محلہ میں کوئی نئی یا انوکھی ہوئی ہے ؟ اُسنے افسوس سے کہا کہ ہمارے محلہ میں اس وقت ایک ایسا بیوقوف مسن آدمی ہے کہ جو اسّی سال کی عمر میں اطالی زبان سیکھتا ہے ۔ سقراط نے سنکر کہا کہ اگر وہ اسّی سال کا بھی ہو کر کوئی غیر زبان نہ سیکھتا تو اُس سے زیادہ تر اور کون شخص بے وقوف ہو سکتا تھا ۔ شکر ہے کہ اُسے اسّی سال کا ہو کر یہ خیال تو آیا !

اگر مسلمانوں نے اس طرف پہلے توجہ نہیں کی تو اب ہی کریں ۔ سارے نہیں کچھ تو اس طرف آئیں خصوصاً وہ لوگ جو مذہبی پرچار اور واعظ بننے کا ارادہ کر رہے ہیں ۔

میں کہتا ہوں مسلمانوں کو اس وقت ان زبانوں کی کیا حروف انڈیا اور بہاری کے سیکھنے کی بھی

ضرورت ہے۔ اور کچھ نہیں دُکان داری اور بنج بیوپار میں تو یہ حروف کام دے ہی جائیں گے۔ پنجاب میں بعض دُکانداروں نے حروف سندھ سیکھ کر بہت اچھا کام چلایا ہے۔ خواجہ قوم کے دُکاندار عموماً انھیں حروف میں لین دین کرتے ہیں۔ اسی طرح گجرات، احمدپور، سورت، بمبئی میں بھی حروف گجراتی وغیرہ میں کام کاج کرتے ہیں۔ کیا انھیں یہ حروف کسی نہ کسی رنگ میں مفید کام نہیں دے رہے ہیں۔

سنسکرت ایک علمی زبان ہے اور اُس میں مذہب ہنود کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اُس کا سیکھنا مسلمان واعظین کے واسطے ازحد ضروری ہے۔ ہمیں یہ سنکر خوشی ہوئی کہ ایک واعظ صاحب نے چند دنوں سے سنسکرت کا سیکھنا شروع کیا ہے۔ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ تھوڑے سے عرصہ میں ہی اُنکی ذہانت اور محنت یقین دلا رہی ہے کہ کچھ عرصہ تک اُنکے معلومات کسی حد تک بڑھ جائیں گے۔ بایں نظیر بالخصوص واعظین کے واسطے غیر زبانوں کا سیکھنا اور اُنکے معلومات مذہبی سے آگاہ ہونا لازمی ہے —

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

سلطان احمد (گوجرانوالہ)

---

نِت نئے مجنوں نظر آتے ہیں یاں فرہاد بھی
ہے عجب ہنگامہ آرا حُسنِ آدمزاد بھی

وہ زمانہ ہے کہ ہے بیغا نُدہ فریاد بھی
اے خوشا وقتیکہ ملجاتی تھی چُپ کی داد بھی

ہمکو نازیبا شکایت بھی ہے اور فریاد بھی
تجھکو سب زیبا ہے قاتل ظلم بھی بیداد بھی

تیرے ہوتے لیلیٰ و شیریں پہ مائل ہو گئے
قیس ہی مجنوں نہ تھا دیوانہ تھا فرہاد بھی

اسکو کیا نسبت بھلا خوشبوے جسمِ یار سے
بوے گُل سرگشتہ بھی آوارہ بھی برباد بھی

التماسِ شوق پر کیونکر کرے گا التفات
وہ ستمگر جو نہیں سُنتا مری فریاد بھی

شوق سے جائیں جہاں چاہیں اُنھیں ہے اختیار
لیکن اپنے ساتھ لیتے جائیں اپنی یاد بھی

کس قدر اُنکے شہید ناز کا ہے احترام
موت بھی حاضر ہے استقبال کو جلاد بھی

ایک حالت پر نہ آجائے کہیں مجھکو قرار
شاد کرتے ہیں تو کر دیتے ہیں وہ ناشاد بھی

نغمہ سنجی سے نکالا کرتے ہیں دل کا بُخار
کر نہیں سکتے رقمؔ دل کھول کر فریاد بھی

امیر علی رقمؔ لکھنوی

# حدیث عشق

محاسن ذاتیہ ہوں یا عرضیہ، اگر کالبد انسانی سے علٰحدہ کر لیے جائیں تو فی نفسہ کوئی چیز نہیں رہتے۔ کسی سرگردان و ژولیدہ حال کی زیست کا اندازہ اُسوقت کرو جب اُسکے دل پر کسی حسین ماہرو کے خنجر عشق سے کچوکے لگ چکے ہوں اور اُسکے کمان ابروے سیکڑوں بلکہ ہزاروں تیر نکل نکل کر اُسکے کلیجے کو چھلنی بنا چکے ہوں اسپر مستزاد یہ کہ اُس کافر ظلم ناشناس کی سرد مہری، بے اعتنائی، سفاکی، فراق کی ٹیسوں سے اُس مجروح محبت کے زخموں کو ملتئم بھی نہ ہونے دے۔ اسی سراسیمگی اور کشمکش کے عالم میں کوئی حالت شناس اُسکے حال زار پر رحم کھا کر اور خاکم بدہن اُن پر از فتنہ آنکھوں کو نکال کر ایک طبق بلوریں میں رکھ کے بزعم خود ترحم آمیز لطف کے ساتھ اُس خود رفتہ عاشق کے سامنے مرہم کی صورت میں پیش کرے۔ یا کسی سہی قد کے جامۂ زیب تن کو علٰحدہ رکھا ہوا دیکھو تو یہ اندازہ ہو جائے کہ جامہ پوش اور ملبوس دونوں میں کتنا تفاوت ہے۔ کہ نہ اس میں پہلے کی طرح کوئی اثر کہ اور نہ اسیر پنجہ جیسی تاثیر ہر چند کہ طبائع انسانی کا اختلاف ہر جگہ رہتا ہے لیکن صورت اولی الذکر کسی کو بھی پسند نہ آئے گی بلکہ جسقدر پہلے اُنس تھا اُتنا ہی اب تنفر ہوگا جتنا پیشتر اقدام تھا اب اُتنا ہی بلکہ اُس سے زائد احتراز ہاں جب مجنوں کو لیلٰی کے کوچے کا کتا تک عزیز و محبوب تھا تو اور کچھ نہ سہی تو سرمگیں آنکھوں والے سرو قد محبوب کے ملبوسات ہی دیکھ کر کسی عاشق دلریش کے دل میں گدگدی ضرور پیدا ہو جائیگی۔

---

حُسن بذاتہ تو کسی تزئین کا محتاج نہیں۔ جو حقیقت میں ہے وہ اس لباسی تزئین کو کبھی خاطر میں بھی نہیں لاتا۔ اُسکے نزدیک نگاہوں کے انداز، طاؤس جیسی رفتار، تبسم زیر لب، خود ہی حسن ہیں اور خود ہی حُسن کی زینت۔ لیکن کوئی ان سب کے ساتھ ساتھ مرئیات کو بھی دیکھتا ہے۔ الغرض حسن سادہ ہو یا ملبوسات میں لپٹا ہوا، دونوں اُس مضغۂ گوشت کے لیے جسے دل کہتے ہیں قاتل ہیں۔ خواہ وہ دل عبائے تقوی و زہد میں پنہاں ہوں یا جامۂ رندی و خراباتی میں۔ کسی سپاہی کی وردی میں پوشیدہ ہو یا کسی دہقانی کی میلے گنے میں۔ کسی جنٹلمین کے کوٹ میں چھپا ہوا ہو یا کسی فقیہ یا کسی مولوی کی شیروانی میں، حسن ہر طرف سے اُسپر

زخمی کرتا ہے۔ گاڑی کی جھلملیوں سے، مکانوں کے جھروکوں سے، کمروں کی کھڑکیوں سے، دوشالے کی گھونگھٹ سے، دوپٹوں کے آنچلوں سے اور کبھی دستی پنکھیوں کی آڑوں سے۔ پھر ان مظالم اور جور کی کہیں پرسش نہیں۔ اگر رحم کی التجا کریں تو خشک جواب دیکر منہ پھیر لیا جاتا ہے کہ اُوب خدمہ۔ لیکن یہ تمام مظالم کبھی پیشتر سے اطلاع دیکر بھی ہوتے ہیں کہ ہم حملہ آور ہوتے ہیں سینہ سپر ہو۔ اگر پوچھیں کہ کیوں تو جواب ملتا ہے کہ "ہماری مرضی"

---

علمائے صباحت نے مزینات کے بیان سے اعراض نہیں کیا۔ مزینات سے مراد وہ چیزیں ہیں جو تناسبِ خلقی سے زائد اور از دیادِ حُسن کا باعث ہوں۔ اگرچہ جیسا کہا گیا حُسن بذاتہ کسی زیور یا لباس کا محتاج نہیں ہوتا، تاہم اگر اس میں کسی قسم کا عیب ہو تو یہ اُسکی تکمیل کر دیتا ہے۔ مثلاً سُرمہ کہ سرگیں آنکھ کے لیے تو عبث اور بیکار چیز ہے مگر وہ جو مجموعہ محاسن ہو مگر آنکھ سرگیں نہ رکھتا ہو تو سرمہ اُسکی تکمیل کر سکتا ہے۔ شعرائے فارس کے دلوں میں جب اس قسم کے ملبوسات اور مزینات دیکھکر گدگدی ہوئی تو وہ اسے منضبط نہ کر سکے۔ اس لیے علمائے صباحت نے اسکی مختلف حیثیات قائم کی ہیں۔

## لباس

<u>کلاہ</u> اگرچہ عرب و ہند میں امارد کے ساتھ مخصوص ہے مگر اہلِ فارس و فرنگ میں کنواری لڑکیاں اور عورتیں بھی پہنتی ہیں تاکہ ان کو امارد کے ساتھ جو انکے معشوق ہوتے ہیں مشابہت حاصل ہو جائے۔

اے شاخِ گل شکستہ طرفِ کلاہِ تو
پیچ و خمِ بنفشہ زخطِ سیاہِ تو

<u>دستار</u> : یعنی اگرچہ عام طور سے مردوں کا لباس ہے مگر اہلِ فارس کی عورتیں بھی دستار پہنتی ہیں۔ البتہ باعتبار رنگ کے کسی قدر اختلاف ہوتا ہے۔ سفید، رنگین بیک رنگ، رنگین بالوان مختلف

سیرِ شب تنہا پوشتے خرامم ایں گلستاں شد
تا بزنجیر ہائے غنچہ بردہ پیچ دستارش

دستار کے متعلقات میں کئی ضروری چیزیں بھی ہیں "طرہ"

پرستانیاں باہم گفتگو با کردہ اند
سایۂ بالِ ہما و طرۂ دستارِ او

"پر" جسے طرہ کے بجائے استعمال کرتے ہیں

دمی کہ در خیلِ بتاں پرزدہ بودی بچسر
ظاہرا سرزنشِ خیلِ پری بود غرض

تحل ۔ اسے بھی کبھی کبھی طرہ کی جگہ استعمال کرتے ہیں

جلوہ گاہ گل کمن آں گوشۂ دستار را　　در دسر خواہی کشیدن از ہجوم بلبلاں

سرپیچ ۔ اسکو اہل فارس جیغہ اور آتا قہ بھی کہتے ہیں ۔ جیسے مختلف صورتوں کا نام کر دستار کے اوپر لگتے ہیں

اتا قہ نیز زخم سکند پریشانم　　بلاسے کاکل رو بس نبود بر جانم

چادر اور معجر دونوں ایک ہی چیزیں ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ چادر موٹی اور طویل و عریض ہوتی ہے لیکن معجر جسے دوپٹہ کہتے ہیں باریک اور مختصر

کردہ سے رادر قفس با ابر ہمکار آمدہ　　آں چادرش ہیں کز ہوس مائل شدہ از پیش و پس

چک ۔ یہ بھی ایک قسم کی چادر کہی جاتی ہے جو رنگین اور پرتکلف ہو

سرآغوش ۔ یہ ایک معجر کی قسم ہے اسے گیسو پوش بھی کہتے ہیں

برقع ۔ برقع برخ افگندہ بردناز بہ باغش　　تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

نقاب ۔ یہ بھی روشنی کے کام آتی ہے

نقاب را رخست آئینۂ دردہ باشد　　بہار را چمنت مست رنگ و بوساز د

دامن ۔ شاید اسی کا دوسرا نام ساڑی ہو ۔ ہند میں تو عام طور سے اہل ہنود ذاتو پہنتے ہیں مگر اہل فارس میں اسے ہر شخص اسے متعلقاتِ قبا و پیراہن میں شمار کرتا ہے ۔

چو پشتِ چشم خوبان خطائی　　مسخف دامن از نازک ادائی

درخشاں ہمچو برقِ نو بہارے　　شعاع مخمل و موج کنارے

پیراہن ۔ جامہ ۔ قبا ۔ یہ سب لباس ہی کے اقسام ہیں

تا گل مخمل زباغ گریزد برہنہ پا　　لے سرو خوش خرام قبا پوش من مدا

انھیں قبا و جامہ و پیراہن کے بیشتر لوازمات بھی ہیں کہ جن پر شعرائے فارس نے طبع آزمائیاں کی ہیں

چاکِ گریباں　　زعشق ہیچ آں چاک گریباں　　بیتابی بود خورشید لرزاں

آستیں　　من بتو شاد و تو غمیں با من　　من چناں با تو تو چنیں با من

دیدہ میگفت پاسبانش را　　آستاں با تو آستیں با من

تکمہ ۔ تو از تکمۂ لعل بست در قبائے حریر　　شدہ است قطرۂ خون بست گریباں گیر

یک‌تہی میاں کشودہ دریں باغ پیش ما منش     ہوا خوش است چو گل یک‌تہی قبا بنش

ملبوسات کا استقصا ممکن نہیں۔ انسان کی طبیعت تلون ہے ہر آن ایک نئی وضع تراش سکتی ہے ابھی کتنی ہی چیزیں باقی رہ گئیں جنکی سند شعراء کے کلام سے نہ مل سکی۔ انکا ذکر بھی خشک و بے ذائقہ ہوگا گر وہ سب اہل فارس کے استعمال میں ہیں۔

## زیور

جس طرح ملبوسات محصور نہیں ہوسکتے اسی طرح زیور کے انواع و اقسام کا شمار بھی دشوار ہے۔ لیکن مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ پر عمل کرکے مختصراً چند چیزیں جو اہل فارس کے استعمال میں ہیں اُنکے ذکر پر کفایت کیجاتی ہے۔

سلک مروارید۔ موتیوں کا ہار۔ قدرتی حسن کیا کم تھا۔ اس نے اور چار چاند لگا دیے۔

گلوبند۔ صراحی دار گردن خود کیا کم قاتل ہے۔ لیکن یہ اُسکے لیے مددگار بنجاتا ہے۔ گوشوارہ، آویزہ، طوق گلو، بازوبند، انگشتری، خلخال، زنگولہ، حلقہ بینی و مثل ذالک یہ سب زیور ہیں جو طوالت کے خوف سے نظرانداز کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح اور بھی چند چیزیں ہیں جو اگرچہ نہ ملبوسات میں داخل ہیں نہ زیورات میں مگر اُنکا استعمال بھی دل میں ہلکی سی گدگدی پیدا کر دیتا ہے۔

وسمہ اگر بال بالکل سیاہ نہ ہوں تو یہ اُنھیں سیاہ کر دیتا ہے۔

می شود از وسمہ ابروے بتاں خونخوار تر     در نیام ایں تیغ خونریز است بے زنہار تر

سرمہ۔ آنکھوں کو زینت دیتا ہے اور حسن کی تکمیل کر دیتا ہے۔

غازہ۔ کہ سرخی اور سفیدی کی خاطر بدن اور منہ پر ملتے ہیں

حنا۔ یعنی مہندی۔ ہاتھ اور پاؤں میں لگاتے ہیں سیکڑوں دلوں کا خون ہو جاتا ہے

اے حنائی پنجگاں فریاد از دستِ شما     داد از دستِ شما، بیداد از دستِ شما

مہندی پستی تھی تری جسپہ وہی سل ہے مجھے     خون جب تھوکتا ہوں بوے حنا آتی ہے

عطر۔ گر ز عطرِ زلف خود بوئے نگردد دور نیست     مشک بو کمتر دہد در خانہ صاحب خانۂ

---

اگرچہ یہ سب غیر فطری مزینات اور متعلقات ہیں تو ناز و انداز، کرشمہ و ادا فطری زیور بھی موجود

ہیں اور طبیعتوں کا اختلاف یہاں بھی نمودار ہے۔ کسی نے سادگی پہ جان دی

خود جوانی ہے جوانی کا سنگار　　سادگی زیور ہے اس سن کیلیے

کوئی شوخیوں پر مرمٹا

خود جوانی ہے جوانی کا سنگار　　شوخیاں زیور ہیں اس سن کے لیے

لیکن شوخیاں کیا کیا ہیں، نازو انداز کسے کہتے ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار خوبہاست بتاں را کہ نام نیست

ناز و انداز سے مراد خوبیٔ حرکات اور افعال معشوقانہ ہیں۔ شعرا نے بال کی کھال نکالی ادائیں ادا پیدا کی۔ نازمیں بھی ایک ناز سمجھے پھر محصور اور محدود ہو تو کس طرح۔ علماے صبابت نے جتنی تلاش کی ہمت کی۔

جلوہ و تجلی۔ جمال روے تو در چشم من چو جلوہ کند　　نگار خانۂ چیں در نظر فرود آید

غنج و دلال۔ یعنی کرشمہ و ناز۔

تا نازِ تو زہ کرد کمانے بہ کمینے　　یک صید نیا سود زمانے بہ زمینے

غمزہ و عشوہ۔ انکا اطلاق اشاراتِ چشم و ابرو پر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے معرکے جہاں تیغ و سناں بھی کُند ہوں وہ انھیں سے سر ہوتے ہیں۔ راز و نیاز کی باتیں جنکے لیے خلوت درکار ہے، جلوت میں اور سب رقیبوں کا خطرہ آن کی آن میں ہو جاتی ہیں

کردی بہ نگہ ادائے مطلب　　زانگونہ ادا نساز د بش لب

نازش ہر چند صد زباں داشت　　یک یک نگہ او ہزار جاں داشت

چینِ جبیں و گرہِ ابرو۔ دل میں سیکڑوں اُمنگیں بھری تھیں۔ معشوق کی نگاہ التفات کا انتظار تھا۔ خدا خدا کرکے بصد احسان و امتنان توجہ کی حرف مطلب زبان سے نکلتا تھا کہ چین بجبیں ہو گئے۔ ایسے وقت میں آرزوؤں سے بھرا دل پیوند خاک نہ ہو تو کیا ہو۔

شوخی اور بیباکی۔ یہ کبھی تو چشم و مژگاں کی صفات ہوتی ہیں اور کبھی دوسرے اعضا و افعال کی بھی۔ جہاں اور جس جگہ پائی جائیں عاشقِ جانباز کے لیے آبِ حیات بھی ہیں اور زہر کا ایک بھرا ہوا پیالہ بھی۔

حیا اور شرم۔ عاشق صادق نے انھیں رقیب بھی سمجھا اور دوست نما دشمن بھی

نرگس مستانہ اش از سرمۂ شرم و حیا　　شوخ چشمان ہوس را از زباں افگندہ بو

مستی اور خمیازہ - خواب و غنودگی، خندہ و تبسم جان میں جان ڈالتی بھی ہیں اور نکالی بھی لیتی ہیں۔ شکستہ
دماے دلی پوچھا جان میں جان آگئی، حرفِ مطلب زبان سے نکلا ہنسکر ٹالدیا رہی سہی جان بھی رخصت ہو گئی۔

گہ تبسم از لبت گاہے سخن گل می کند زیں ادا ہا دردِ لم داغِ کہن گل می کند

عتاب، سنگدلی، ترحم و مہربانی

عتاب از حد گذشت اکنوں تبسم میتواں کردن براحوالِ کہ من دارم ترحم میتواں کردن

رفتار و خرام - اسکا ذکر اگرچہ متعلقاتِ قامت کے ضمن میں آچکا مگر علماے صباحت نے اسے بھی ایک ادا سمجھکر اس موقعہ پر ذکر کیا ہے

سنبھل سنبھل کے چلو تم ذرا خدا کے لیے قدم قدم پہ کوئی پائمال ہوتا ہے

ہنگامِ خرامِ آں پری زاد در و دیوارِ گلشن آب میداد

تغافل و تمکیں - منزلِ عشق میں بہت بڑے دھچکے ہیں - توجہ ہو تو جان میں جان رہے، بالکل اعراض ہو تو جان رخصت ہو - مگر یہاں نہ تو جان ہی ہے نہ لے جانی ایک بسمل بنجاتا ہے

اے ہلاکِ خویتن این ہمہ تغافل چیست اے اسیرِ چشمت من این چہ سرگرانہاست

تجاہل - ہزاروں جانباز عاشق بازارِ عشق میں ہتھیلیوں پر زخمی دل لیے بیٹھے ہیں کہ اگر ادھر سے گذر ہو تو مرہم کی التجا کریں ہاں تو سر اٹھائے چلے گئے گویا کہ دیکھا ہی نہیں۔

قربانِ این تجاہل و آں پرسشم کہ دوش فریاد می شنیدی و گفتی فغانِ کیست؛

فریبِ خلفِ وعدہ - ہزاروں منتوں اور التجاؤں کے بعد وعدہ وصل کیا - اختر شماری کرتے کرتے فراق کی راتیں کٹیں جب وقت آیا تو پھر کل کہکے ٹالدیا۔

از فریبِ وعدہ فردا تسلی چوں کنم چوں بیاد آرم خلافِ وعدۂ امروز را

تلوین - مظالم کی ایک ہی نوعیت ہو تو مدافعہ کی کچھ تدبیریں کریں یہاں کیا خاک کریں۔

گہ عشوہ گہے ناز و گہے لطف و گہے جور غیر از تو چہ داند دگرے این ہمہ فن را

غرور و خود نمائی - معشوق کی سب ادائیں تو کچھ نہ کچھ برداشت ہو جاتی ہیں مگر اس ناقابلِ کیب ادا کا تحمل دشوار ہو جاتا ہے اندازِ ادا و قامت او سیر گشت چو گل ز شاخ پر ہو بیباکی و خود نمائی و ناز معشوقی و دلبری و انداز

انجا ہمہ او ہزار چنداں در پردۂ شرم و شست پنہاں

# عباسہ

دوسری صدی سنہ ہجری کے آخری قرن کا زمانہ ہے، عروس البلاد بغداد چاروں برن سولھوں سنگار کرکے جوبن نکھار رہا ہے اسکی عشوہ گری پر خلقت کا اژدہام ٹوٹ رہا ہے۔ دمشق سے تخت خلافت کو منتقل ہوئے گو زیادہ دن نہیں گذرنے پائے تھے تاہم خلیفۃ المنصور کی اولوالعزمانہ ہوس ناکیوں اور رفعت پسندانہ خواہشات کو پورا کرنا ممالک مفتوحہ و محروسہ کے ہر باشندہ کا فرض تھا۔ خیر یہی تخت و تاج کا مدار بھی تھا۔ ملک و قوم کی خیر سگالی اسی میں تھی، اس شہر کے بسانے اور اسکے آباد کرنے کی خدمت خالد برمکی جیسے یگانۂ روزگار و بلند پایہ شخص کے سپرد ہوئی تھی جس نے بد نظامی دربار کے برباد آثار و مستہلک، فریب کارانہ اختلاط خواہ آداب و لوازمات، ملمع کارکردہ فر، اور ظاہر فریب جاہ و جلال کے پس بھرے جراثیم لاکر عرب کی سادہ سوسائٹی میں رائج کردیے تھے۔ سچ پوچھو تو اس مرض کی ابتدا امام معاویہ ہی کے ایام حریت شکن میں ہو چکی تھی یہ زمانہ عین بہار کا زمانہ تھا۔ جو کشش گھاس کے تنکے کو کہربا سے اور لوہے کو مقناطیس سے ہوتی ہے اور جو فریفتگی چکور کو چاند پر یا پروانہ کو شمع کی صنوبر پر ہوتی ہے وہی کشش شہر بغداد میں جملہ باشندگان عالم کے لیے پیدا ہوگئی تھی۔ سلطانوں کے اقبال کا دریا چڑھاؤ پر تھا نصیب بلند اختری کررہا تھا، خراسان و سمرقند، دمشق و یمن، ہندوستان ایشیای کوچک کی دولت اُمڈی چلی آرہی تھی۔ دربار خلافت کی شان؟ رومۃ الکبریٰ کے قیصران، اہل دنیوا کے تاجداران کے چونچلے، جم و کسریٰ کے دربار کے خیرہ چشم و ہوشربا شان و شکوہ، جاہ و حشم اسکے اذکار افسانوں قصہ کہانیوں میں سنتے چلے آرہے تھے لوگوں کی آنکھوں نے سچ مچ دیکھ لیا ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا

اگر فردوس بر روے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

شخصی حکومتوں کی کارروائیاں بھی بوالعجب واقعات اور حیرت زا حرکات سے لبریز رہتی ہیں جس طرح ایک غیر ملکی قوم کسی دوسری سیہ بخت، واژوں مقدر، برگشتہ تقدیر، قوم کی گردنوں میں محکومیت کا طوق پہنا کر قانون کے نام سے ہر ناجائز کارروائی کو بزور شمشیر یا نوک سناں جائز منوایا کرتی ہے اور انصاف کے پردہ میں چیرہ دستیاں ہوتی رہتی ہیں بعینہ اسی طرح اور اسی اداسے چنگیز خانی سے ایک خود مختار تاجدار و مطلق العنان کارفرما کروڑہا خلق خدا کی آزادیوں کو اپنی خواہشات نفس کی دیوی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا کرتا ہے۔

بیشک ایسی آب و ہوا میں، ایسی سختیوں اور ایسی بندشوں میں انسانی کیرکٹر اپنے قدرتی نشو ونما کے مدارج ہرگز نہیں طے کر سکتا۔ شریعت غرۂ محمدی اور اسکی عین سوشلسٹ تلقینات و اصول دین متین کا ذرا مقابلہ ان متکبر و متنعم تاجداروں کی نت نئی کارروائیوں سے مقابلہ کرو تو تخالف و بیگانگی کا ایک بحر ذخار نظر آتا ہے۔ انکی ستم ظریفی کی داد دیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ ایسی کارروائیاں شریعت کے پردہ میں علمائے عصر و مجتہدین روزگار و ائمۂ زماں سے فتوے حاصل کر کے کی جاتی تھیں

کسی سوسائٹی مذہب یا برادری میں جب کوئی رسم قبیح عود کر آتی ہے یا اسکی بنا پڑ جاتی ہے تو اسکے چھڑانے میں لوہے لگ جاتے ہیں تقریباً ہر نوع کی کوشش رائگاں جاتی ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! بانی اسلام کے جمہوریت ریز طریق حکمرانی کی تعلیمات اور ناخلفوں، قابوچیوں، متمردوں اور جباروں کی دھینگا دھینگیاں!! فقط باقی رہ گیا تھا اصل جوہر مفقود تھا۔ رسم ہی رسم رہ گئی روح بلالی غائب تھی۔

ہارون کو مسند حکومت بغداد پر متمکن ہونا کیونکر نصیب ہوا؟ ایک پُردرد داستان ہے اور دلدوز کہانی۔ زمانہ کی روش تو بدل ہی چکی تھی خانہ جنگیوں، مصارعات، فرزندوں کو عام انتخاب پر ترجیح دینے اور زہر ہلاہل سے رقیب روسیاہ کو عدم پار اتار دینے کے طریقے رواج پکڑ چکے تھے۔ مصیبت کے بعد دنیا میں راحت ملتی ہے استقلال کا پھل میٹھا ہوتا ہے، خلیفہ ہادی کا زمانہ ہارون کی جان کے لیے پُرخطر تھا۔ خلیفہ ہادی اپنے فرزند دلبند و جگرپارہ کو ولیعہد تسلیم کرانے کے درپے تھا، ہارون جان لیے لشکر اسلام کی سرکردگی کرتا پھرتا تھا، مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹ رہی تھیں، پر استقلال کی چٹان پر اسکے پیر نہ ڈگمگاتے تھے۔ خیر وہ دن بھی آیا، ہارون الرشید تخت بغداد پر متمکن ہوا اس نے اپنے محسن دیرینہ یحییٰ برمکی کو قلمدان وزارت سپرد کیا۔ یحییٰ کے بیٹوں فضل، موسیٰ و محمد کو صوبوں کی گورنریاں تفویض ہوئیں۔ ہارون سا قاآن و خوش مزاج مدبر و مردم شناس، متقی و پرہیزگار، پابند شریعت و صوم و صلوٰۃ، علم دوست، ہنرپرور، جب رونق دہ سریر مملکت ہوا اور اسکو یحییٰ سا با تدبیر کارداں مل جائے تو سلطنت کی فیروزمندی میں کیا کسر باقی رہ گئی تھی۔ بغداد کی گلیوں میں دن عید رات شب برات کا نظارہ رہتا تھا۔ باشندے خوش فعلیوں میں مصروف رنگ رلیاں کر رہے تھے، عیش و مسرت مرفہ الحالی و شکم سیری کا دور دورہ تھا ہارون جیسے کارفرما و مطاع کے دست فیض پرور رعایا کی آبیاری پر تلے ہوئے تھے۔ مثل مشہور ہے "راجہ کا دان پرجہ کا اشنان" مستمند ابر کرم سے بہرہ ور، منکوب و رنج کشیدہ کے دل حزیں نگاہ کرم بلیغ باغ باغ، ستمزدہ و ستم دیدہ دادگستری محتسب سے مطمئن تھے، رعایا کی دلجوئی و خوشحالی کا

خیال حکومت کا فرض اولیں ہے۔ انسان محبت کرنے والا چوپایہ ہے، ہارون الرشید و جعفر کی موافقت اس حد تک پہونچگئی تھی کہ حقیقی بھائیوں میں بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ خلوت میں جہاں غیر کا پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا جعفر وہاں مدعو شدہ مہمان تھا بلا روک ٹوک وہ داخل ہو جاتا تھا۔ ادھر اپنی حقیقی بہن عباسہ سے بھی ہارون کی محبت کا درجہ مشغوفیت تک پہونچ گیا تھا۔ غرضکہ ہارون کو بلا ان دو ہمازدون مصفیوں کے ایک گھڑی چین نہ پڑتا تھا۔ شدہ شدہ یہ خبر کوچہ و برزن میں مشہور ہوگئی۔ خلق کا حلق کس نے بند کیا ہے؟ کچھ دنوں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں بعد کو سر راہ و علی الاعلان لوگ ہارون کی اس نادانی پہ حرف گیری کرنے لگے اور کیونکر نہ ایک غیر محرم شخص کی صحبت میں عباسہ کے بے نقاب بیٹھنے پہ اعتراض کیا جاتا۔ مانا جعفر کا دامن عامیانہ الائشات اور سفہیانہ خواہشات سے بالکل پاک و صاف تھا خصوصاً ہارون الرشید جیسے متشرع و پاک باطن شخص کے حضور میں اسکا ایک اشارۂ ابرو بھی پیام موت لے آتا تاہم جو فعل ناجائز ہوتا ہے اُسپر قانون زبان بندی کارگر نہیں ہوتا۔ اس گرہ کی عقدہ کشائی ہارون کو مشوش و متفکر بنانے لگی۔ ذہن اسپر منتقل ہوا کہ اگر عباسہ کو جعفر کی مناکحت میں دیدیا جاوے تو یہ اعتراض خلق کا جاتا رہے۔

گو الرشید ذی علم تھا، روشن خیال تھا، تنگدلی و فرسودگی کا الزام بھی اسپر ہم نہیں رکھ سکتے، مساوات اخوت و حریت اسلامی کی تعلیمات و اسباق اسکو کتب عقائد میں دیئے گئے تھے، قرآن عظیم ہر روز اسکی تلاوت میں رہتا تھا؛ بلال حبشی اور یحیٰی ابن یحیٰی بربری کو جو رتبہ دنیائے اسلام نے عطا کیا تھا اس سے وہ فاقد البصر نہ تھا با اینہمہ ہاشمی النسب ہونے کا طمع کا رگھمنڈ عارض آتا تھا۔ مراسم دیرینہ کا توڑنا بڑی جرأت کا کام ہے، زبان سے کہدینا آسان ہوتا ہے عمل دشوار، حقیقی مصلح وہ ہے جو ان بندشوں کی بیڑیاں کاٹکر آزادانہ روش اختیار کرے۔ دل کڑا کرکے ہارون الرشید نے عباسہ اپنی ہمشیر کا ہاتھ جعفر کے ہاتھ میں دیدیا قدغن یہ تھا کہ دونوں میاں بی بی علاوہ اُسوقت کے جبکہ وہ ہارون کے حضور میں بیٹھے ہوں ایکدوسرے سے نہ ملیں گے۔ چھوت چھات کے جھگڑوں، ذات پات کی قیود کی لغویت، عقد بیوگاں کے فوائد کو کون تعلیمیافتہ ہے جو نہیں سمجھتا ہے لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو آج تقدیم کر چکے ہیں یا اس منزل کی طرف رواں ہیں؟

سچ کہا ہے بادشاہوں اور دریا کا کسی نے بھید نہیں پایا۔ جو شرط الرشید نے لگائی تھی کس درجہ غیر فطری، لچر اور پوچ تھی۔ شرعاً روا جاً قانوناً ہر نہج سے جعفر کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیاہتا بی بی جہاں

سے زن و شو کے تعلقات رہتا لیکن سلطانی عتاب و جاں ستانی کا خوف گلوگیری کے لیے قضائے معلق کی طرح ہر وقت حلقہ کناں رہتا تھا۔ اس سپنجی سرا کی ہر شے آنی جانی ہے، فانی ہے، زوال پذیر ہے، قانون کون و فساد بھی کچھ ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ تغیر سے اسکو الفت انقلاب سے رغبت جس طرح گردش میں اجرام فلکی اور کرۂ زمین رہا کرتے ہیں اسی طرح قومیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ قوموں سے ہٹ کر افراد میں آئیے وہی شادی و غم، عروج و زوال کی لکیر پیٹی جا رہی ہے۔ اس زال کشیدہ خالے چند کی عشوہ گریوں میں حیرت آفریں نشیب و فراز دیکھنا نصیب ہوتے ہیں، قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں میٹ سکتا، بدبخت جعفر کا اس میں جرم ہی کیا تھا کہ اس نے اپنی منکوحہ بی بی سے مباشرت کا جائز لطف اٹھایا اور اپنی ننھی سی یادگار کو آغوش مادر میں دیکھ کر مسرت و انبساط قلبی کے مزے لوٹے۔ کہتے تھے بادشاہوں کی دوستی اچھی نہیں ہوتی۔ جعفر فارسی النسل تھا اس زبان کا مقولہ ہے "قرب سلطاں آتش است از وے بترس" ایک وہ دن تھا کہ ہارون کو بھائی جعفر کی جدائی ایک لحظہ شاق گذرتی تھی، ملبوسات شاہی میں دو کالر رکھے جاتے تھے بدیں غرض کہ انکو گاہے بگاہے جعفر بھی استعمال کر سکے۔ ہارون کے بجائے جعفر کبھی کبھی عام تقریبات شاہی میں بھی جلوہ افروزی کیا کرتا تھا۔ زمانہ کی نیرنگی دیکھیے کہ ہارون اپنے خواجہ سرا بسیر کو جعفر برمکی کے سر لانے کا حکم دیتا ہے وہ بھی عین آدھی رات کو۔ بسیر جب سر لاکر حاضر کرتا ہے تو اس کی خوں آشام و انتقام خواہ نگاہیں محض جعفر ہی کے خونِ ناحق پر ٹھنڈی نہیں ہو جاتیں بلکہ اسکا جوشِ غضب اس درجہ بھڑک اٹھتا ہے کہ وہ اپنے سچے خیر اندیش خیر خواہ، دیرینہ نمک خوار و محسن، بلکہ جسکی آغوش محبت میں ہارون کے بال و پر نکلے تھے، یحییٰ برمکی، جسکو وہ "پیارے باپ" سے مخاطب کیا کرتا تھا اُسکو زندانِ زندقیاں میں ڈلوا دیتا ہے، برمکی خاندان کے جملہ افراد قید کر لیے جاتے ہیں اُنکو طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں، مال و دولت، زر و زمین ضبط کر لیے گئے۔ معاندانِ خاندانِ برمکی کی چڑھ بنی، انکی تذلیل میں اور انپر تظلم و شدائد کی بجلیاں گرانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ عید قرباں کا یوم ہے۔ محمد ابن عبدالرحمن اپنے گھر گئے تو ایک ضعیفہ سن رسیدہ کو دیکھا کہ میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی ہے جسپر شبہہ کسی بالا اصیل کا کیا جا سکتا تھا لیکن جوہر اگر خلاب میں گر جاتا ہے تب بھی جوہر ہی رہتا ہے۔ دُر یکتا چھپائے نہیں چھپتا۔ عبدالرحمن کی مادر مہربان تھیں ان سے پوچھا کہ تم نے ان نیک بی بی کو پہچانا؟ یہ جعفر برمکی کی ماں ہیں۔ اُسی وقت عبدالرحمن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ عظمت آب

جعفر کی ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ ایک پردرد لہجہ میں ہمکلام ہوئیں "ایک زمانہ تھا کہ میں اسی روز سعید کو میں جعفر کو دیکھنے اُسکے گھر گئی تھی میری پیشوائی کے لیے چار سو کنیزیں اور خادمائیں صف بستہ کھڑی تھیں وہ میری نظر میں نہ آئیں اور میں نے جعفر سے شکایت کی کہ اُس نے میری کافی عزت و توقیر نہیں کی۔ آج میں پھوٹی کوڑی کو محتاج ہوں"

ہم نے مانا کہ سدا امر کسی کا زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ دریا کے لیے مدوجزر ہے۔ خزاں کے بعد بہار آتی ہے، راحت کے بعد تکلیف کا آنا ضروری ہے اور زوال کے بعد عروج ہر قوم کو نصیب ہوتا ہے تاہم شخصی حکومتوں میں جس بھونڈے طریق پر یہ چیزیں آئے دن رونما ہوتی رہتی ہیں انکا خیال کرکے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں قلب کانپ اُٹھتا ہے۔ ہارون کا زمانہ فخر و مباہات کے لائق کہا جا سکتا ہے اور حقیقتاً اسکا عہد حکومت دیگر سلاطین مطلق العنان کے مانند خونریزی و غارتگری، کربت و مصیبت، فرس افگندگی و ایذا رسانی؛ درباری سازشوں اور دعویداران تخت کی بغاوتوں کی آلائشات سے ایک حد تک پاک صاف رہا تھا۔ تاہم انسان کی طبیعت ہمیشہ ایک رنگ پر نہیں رہتی۔ اور کتنا ہی وہ مستقل مزاج اور اپنی دھن کا پکا ہو کسی نہ کسی وقت اُسپر جذبات کا اثر ہو ہی جاتا ہے۔ کہتے ہیں غصہ، غیظ و غضب میں انسان سے شیطانی افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ جس شخص کے افعال پر قوم کی نگرانی نہ ہو وہ ان کمزوریوں سے کیونکر دامن بچا کر نکل سکتا ہے؟ خوف خدا اور معاد کے محاسبہ کا خیال اثر ضرور رکھتا ہے تاہم کتنی ہستیاں ہیں جو اس سے متاثر ہوتی ہیں؟

---

## عزیز (اسیونی)

کیا بگاڑا ہمنے اُنکا وہ خفا کیوں ہوگئے
آشنا ہو کر بھلا نا آشنا کیوں ہوگئے

کیوں ہوا ملکِ عدم سے سیرِ ہستی کا خیال
ہو کے تم خلوت نشیں جلوہ نما کیوں ہوگئے

یہ بجا ہے کچھ نہیں تھا۔ لیکن ایسا کیوں ہوا
میری صورت دیکھکر وہ آئینہ کیوں ہوگئے

ایک ہو کر تم نے اظہارِ دو رنگی کیوں کیا
آرزو دشمن کی، میرا مدعا کیوں ہوگئے؟

ہنستے ہنستے کیوں مجھے تقدیر کو رونا پڑا
بیٹھے بیٹھے آپ پہلو سے جدا کیوں ہوگئے

حضرتِ دل کیوں ہوئے عاشق کسی بیرحم پر
آپ اپنے ہاتھ سے اپنی قضا کیوں ہوگئے

تم پہ شاید نام کا واثق اثر پڑنے لگا
ورنہ مشتاقِ غم و رنج و بلا کیوں ہوگئے

واثق بدایونی

# رشک

روسو کا قول ہے "ایمیل کو دوسرے بچوں پر رشک کرنے اور حسد کی آگ سے مشتعل ہو کر مقابلہ کرنے کی عادت نہ ڈالنی چاہیے۔ برخلاف اسکے اُسکی گذشتہ اور موجودہ حالت کا تفاوت بتا کر اُس میں ترقی کا شوق پیدا کرنا چاہیے" کیونکہ روسو کو اندیشہ تھا۔ اگر ایمیل اپنی حالت کا دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا عادی ہو گیا تو ضرور ہا ہمی (ہمچو من دیگرے نیست) کی پلید عادت اُسکو خراب کر دیگی۔ برعکس اسکے ولیم جیمس کی رائے ہے "ایجاد و تقلید ہی ایسی دو ٹانگیں ہیں جنکے بل پر اقوام انسانی زمانہ تاریخ سے اس وقت تک چل رہی ہیں"۔ انسان خاص طور پر بنی نوع کی صحبت کا طلبگار پایا جاتا ہے۔ اور قدرتی طور پر تقلید پسند طبیعت رکھتا ہے۔ ہر ایک شخص کی اخلاقی حالت کا اندازہ اُسکے جلیسوں کی روش سے کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ انگریزی زبان کی ایک ضرب المثل ہے "تقلید اعلیٰ درجہ کی خوشامد ہے" جب کسی شخص کی خاص بات یا خصلت کی ہم تعریف کرتے ہیں تو اُسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے میں بھی وہی صفت پیدا کرنے کی کوشش کریں بلکہ اس سے برتر ثابت ہوں:۔

تقلید کا مادہ دوسروں کی برابری پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ رشک و حسد کی چنگاری صاحب مقابلہ کو نیچا دکھائے بغیر نہیں بجھتی چنانچہ تقلید کا دائرہ رشک کے حلقہ میں ضم ہو جاتا ہے۔

اطفال مدرسہ پر ان دونوں انسانی جذبات کا گہرا اثر ہوتا ہے اور مدرسین پر بھی یہ بڑی ذمہ داری عائد کرتے ہیں۔ مدرسہ کی عام شہرت و روایات کا انحصار مدرس کی رفتار و کردار پر ہے۔ مزید براں اسکی قدرتی دکاوت جو مدرسہ کی ترقی و بہبودی کا دار و مدار ہے۔ پس وا تفیتِ حالات کے سبب اساتذہ کو طلبا کے ساتھ چونکہ عموماً شفقت و ہمدردی ہوا کرتی ہے لہٰذا وہ انکو حسب حال ستودہ خصائل و پسندیدہ افعال کا عادی و خوگر بنا سکتے ہیں۔

رشک کا دائرہ وسعت پا کر اولوالعزمی، ضد و خود نمائی کے دائروں تک پہونچ جاتا ہے۔ جو حدِ اعتدال تک یقینی مفید و کارآمد صفات ہیں۔ کیونکہ انکے باعث دنیا میں اعلیٰ درجہ کے دلیر۔ سنجیدہ و فرض منصبی سے خبردار اشخاص نمبر آتے ہیں تاہم صغیر سن طلبا میں مقابلہ کا شوق اور برتری کی ترغیب دلانا ضرر سے

خالی نہیں۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس قسم کے حاسدانہ خیالات سے بچوں کے ظاہر و باطن کو پاک صاف کر دیا جا
طبقہ ابتدائی میں اول اور دوم اور سوم کے لحاظ سے طلبا کو بٹھانے اور ان میں قابلیت کے لحاظ سے روزانہ
رد و بدل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بشرطیکہ اس امر کی احتیاط کی جائے کہ بچوں میں غرور و نخوت و خودنمائی
کی بری عادتیں جاگزیں ہونے نہ پائیں۔ اوسط لیاقت کے طالب علم کی یہ خواہش کہ وہ بہترین طالب علم کی برابری
کی کوشش کرے مفید و کارآمد ہے۔ لیکن جب یہ خواہش اس مذموم درجہ پر پہونچ جائے کہ طالب علم اپنے
کو سب سے اعلیٰ بنانے میں کوشاں پایا جائے تو پھر ہر صورت سے اس خیال کو روکنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اخلاق کا مضرت
رساں ہے اور بدترین جذبۂ انسانی ہے۔

سامن کہتا ہے " یہ جذبہ فاتح میں غرور اور خودنمائی کا باعث ہوتا ہے اور مفتوح میں حسد و کینہ کی آگ
بھڑکاتا ہے اور اس میں بودنی اور دشمنی پیدا کرتا ہے۔" مزید براں اس آتشِ رشک کے باعث دماغی جسمانی
ہر دو قوتوں پر ناجائز بار پڑتا ہے۔ مسلسل اور متواتر حاسدانہ خیالات کے باعث حریفوں میں دوستی و اتحاد کا رشتہ
ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک شخص کی بہتری دوسرے کی ابتری خیال کی جاتی ہے۔ اور باطل مقاصد نگاہ کے
پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ یعنی بجائے اسکے کہ حصول علم و راستی مطمح نظر ہو کامیابی جملہ کوشش و غور و فکر کا مقصد اعظم
قرار دی جاتی ہے۔ مدرسین بھی اس مضر اخلاق رشک کی تحریک سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ صرف انہیں طلباء
پر جو مقابلہ کی کوشش میں شریک ہوتے ہیں اپنی خاص توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ دوسری قطار میں بیٹھنے والے طلبہ کے ساتھ بالکل لاپروائی برتی جاتی ہے۔ اور اس طرح اساتذہ میں انکے
فرائض منصبی کا غلط خیال اور ایک ناقص نصب العین پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض مقابلہ کی تعلیم ایک مفید انعام پسند
تعلیم نہیں ہے بلکہ اس قسم کی تعلیم کا مقصد نہایت اسفل ہے۔

یوں تو ہر ملک و قوم کے موجودہ ماہرانِ فن تعلیم نے رشک کے نقائص یا فوائد کے بارے میں کچھ نہ کچھ
اظہار رائے کیا ہے جو ہر ایک کے نقطۂ نگاہ سے صحیح و بجا ہے لیکن اس موقعہ پر مجھکو جیسوئٹس کی رائے کا اظہار
مقصود ہے۔ گو اس مذہبی فرقوں کے بانیوں نے اپنے زیر اثر طلباء میں اس تحریک کا انتہائی شوق دلا کر بجائے
فائدہ کے طلباء کو سخت نقصان پہونچایا۔ تاہم انکے طریقۂ عمل میں جو باتیں موجودہ مدارس میں عمل پیرا ہونے
کے علاوہ کارآمد ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسوئٹس ہر جماعت کے طلباء کو انکی استعداد و قابلیت کے لحاظ سے
آٹھ دس حصوں میں تقسیم کیا کرتے تھے اور ہر حصۂ جماعت کے لیے ایک یا دو انعام مقرر ہوتے تھے۔ جماعت

کا تقسیم شدہ ہر حصہ صرف اپنے ہی فریق یعنی ہم استعداد وہم لیاقت طلباء کے ساتھ مقابلہ میں کوشاں پایا جاتا تھا جس سے یہ فائدہ متصور تھا کہ جماعت کے بہت سے طلبا حصولِ انعام کی خاطر کوشاں و سرگرم رہتے تھے اور تعلیمی شوق میں اضافہ ہوتا تھا۔

برعکس اسکے ہمارے مدارس میں ہر جماعت کے لیے دو چار انعامات مقرر ہوتے ہیں اور وہ صرف انھیں ہونہار و محنتی طلبا کو دیے جاتے ہیں جو کل جماعت میں لیاقت کے لحاظ سے اول و دوم و سوم رہتے ہیں۔ اسکا عام نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حصول انعام کی خاطر زیادہ سے زیادہ چوٹی کے آٹھ دس طالب علم ہی کوشش کرتے ہیں اور باقی ماندہ مدرسین کی کم التفاتی کے باعث اپنی کم لیاقتی کا اندازہ کر کے اس جد و جہد کے لیے ہاتھ پیر ہلانا یا محنت کرنا عبث خیال کرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ وسلے ہے کہ اگر مدرسین ہر جماعت کو جیسوئٹس کی طرح کئی حصوں میں اس طرح تقسیم کریں کہ تقسیم شدہ حصہ میں مساوی لیاقت کے طلبہ ہوں اور پھر ہر حصۂ جماعت کے لیے ایک یا دو انعام یا صرف نشستوں کی ترتیب یا اظہارِ خوشنودی معیار مقرر کر کے امتحان لیں تو یقینی طور پر طلبہ کے تعلیمی شوق میں اضافہ کا موجب ہو۔

مگر رشک کے حد اعتدال کے دائرہ سے متجاوز ہو جانے کے سبب جو مضرت رساں نتائج اوپر درج کیے گئے ہیں وہ درست و بجا ہیں: تاہم اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ زندگی کے ہر حصہ میں آتش رشک ہی جملہ کوششوں کی اولیں افتاد ہے۔ اسلیے تعلیم کے ہر شعبۂ جسمانی، دماغی، اخلاقی میں اس سے مدد حاصل کرنی چاہیے۔ یعنی نشانات، تمغوں، نشستوں کی تبدیلی، تعریف و تحسین۔ الغرض ہر ایسے غیر مضرت رساں طریقے سے جو مدرسین کے ذہن میں وقتاً فوقتاً آئیں طلبہ میں رشک کی حقیقی تحریک کرائی جائے۔ اور خاص طرفداری یا رعایت کا شبہ اس طرح دور کیا جائے کہ بار بار مختلف مضامین امتحانِ مقابلہ لیے جائیں تاکہ مختلف استعداد کے طلبہ کو انکے بہترین مضمون میں اپنی لیاقت کے اظہار کا موقع ملے اور ان امتحانات میں اعلیٰ کامیابی کا صلہ تحسین و شاباش کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ "ایک مدرس" (از ملگندہ ریاست حیدرآباد دکن)

## رباعی

(حضرت اکبر کے رنگ میں جناب ایڈیٹر صاحب کے مضمون بعنوان "سیاسی نبرد کے کارنامے" مطبوعہ الناظر جنوری سنہ ۱۹۱۹ء کو دیکھ کر)

راجہ صاحب کا راج دیکھ لیا
اور ان کا سماج دیکھ لیا
ظفر الملک کے تصدق میں
جو نہ دیکھا تھا آج دیکھ لیا

([illegible])

# قند پارسی

## غزل جناب منشی اظہر علی آزاد کاکوروی

درد تو درد نیست و درمان نیز هم　　عشق تو کفر است و ایمان نیز هم
حالِ دل بر ما ازمن مسکین مپرس　　کاشکارا هست و پنهان نیز هم
چشم ظاهر بین چه بیند حالِ کس　　کو اگر گریانست خندان نیز هم
خرقهٔ زهد ار ترا حاجت رواست　　خرقه پوشی باز عریان نیز هم
گرچه آزادیم آزادم مخوان
زانکه هستم پا بزندان نیز هم

## غزل جناب سید جلال الدین از دہرہ دون

رخنها در دینِ من زد تیرِ مژگانِ کسے　　برد ایمانم بغارت چشمِ فتانِ کسے
می خورم چون افعیِ سرکوفته صد پیچ و تاب　　تا بدیدم پیچ و تابِ زلفِ پیچانِ کسے
بر رویتِ گلها بگلشن خارِ غم در دل زند　　زانکه یادم میدہد از روے خندان کسے
سر بدوشم بست بارے گر بکدوشم کند　　تا ابد ماند بگردن بارِ احسانِ کسے
حرف از جنت و رضوان بس کن اے زاہد که من　　حرف در کوے کسے دارم بدربانِ کسے
شد فراموشم ز لذت آرزوے وصل هم　　ہے چہ شیرین است یارب صد ہجرانِ کسے
بعد مرگم میگذشت از تربتم خندان و بود　　پر ز گلہاے تمنا جیب و دامانِ کسے
چشم خواب اے ہمنشیں از طالبِ بیدل مدار
خواب از چشمش ربودہ یادِ چشمانِ کسے

# شیاما

(مترجمہ مرزا احمد اللہ بیگ آہر حیدر آبادی)

شاہی خزانے میں چوری ہونے کی خبر فوراً تمام شہر میں مشتہر ہو گئی۔ اگر چور جلد گرفتار نہ ہوا تو افسر محافظت کی خیر نظر نہیں آتی۔

واجراسن ایک غیر ملکی شخص تھا جو گھوڑے بیچنے کے لیے اس شہر میں آیا تھا۔ جو کچھ اس نے کمایا وہ بدقسمتی سے چوروں نے لوٹ لیا۔ اور اب اس شہر سے باہر ایک ٹوٹا ہوا مندر اسکا مسکن تھا۔ افسروں نے اس غریب کو چوری کا الزام دیا۔ اور گرفتار کر کے قید خانہ کو لیچلے۔

مغرور اور ستم ڈھانے والی حسین شیاما اپنے برآمدہ میں بیٹھی ہوئی اس مجمع کو گذرتے ہوئے بے پروائی سے دیکھ رہی تھی۔ یکایک وہ کانپ اٹھی اور اس نے اپنے آدمیوں کو بھرائی ہوئی آواز میں کہا " افسوس! یہ معصوم نوجوان کون ہے جسکے چہرے پر شرافت برستی ہے اور جسکو معمولی لوگوں کی طرح قید کرکے لیے جارہے ہیں؟ افسر کو میری طرف سے کہو کہ اسکو میرے پاس لے آئے "

افسر قیدی کو لیے ہوے آیا اور شیاما کو مخاطب کرکے کہنے لگا " خاتون! تمھاری یہ مہربانی بے موقع ہے۔ مجھے جلد سے جلد شاہی حکم کی تعمیل کرنا چاہیے"

واجراسن نے اپنا سر اٹھایا اور کہا " خوبصورت خاتون! یہ تم نے کیا کیا کہ مجھکو گلی سے بلوایا اور اپنے ظالمانہ تجسس سے میری تحقیر کی "

شیاما بےصبری سے کہہ اٹھی "کیا کہا۔ میں نے تمھاری تحقیر کی! اگر ممکن ہوتا تو میں خوشی سے تمھاری زنجیریں اپنے زیور کے عوض پہن لیتی " پھر اس نے روے سخن افسر کی طرف پھیرتے ہوے کہا " میری تمام دولت لے لو اور اسکو چھوڑ دو "

افسر نے تعظیماً اپنی گردن جھکائی اور کہا "ناممکن! قطعی ناممکن!! اگر ایسا ہوا تو ہم شاہی غصہ کا شکار ہو جائینگے" پھر شیاما نے کہا " تو اچھا دو روز کے لیے اسکا چالان ملتوی رکھو " افسر مسکرایا اور اس بات پر اسنے سر تسلیم خم کیا۔

واجراسن نے اپنے قید کی دوسری رات کے اختتام پر دعا مانگی اور آنے والے مصائب کو جھیلنے

کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ دفعتہً دروازہ کھلا اور شیاما ہاتھ میں لیمپ لیے ہوئے نمودار ہوئی۔ اور اسکے ایک اشارے پر محافظ نے قیدی کی زنجیریں کھولدیں۔

واجراسن نے کہا "رحمدل خاتون! تم اس طرح ہاتھ میں چراغ لیے ہوئے آئیں جس طرح صبح کا ستارہ تمہارے بیہوش کر دینے والی رات کے بعد چمکتا ہے"۔

شیاما نے جواب میں کہا "فی الحقیقت رحمدل!" پھر اسنے ایک حشیانہ قہقہہ مارا۔ اور ساتھ ہی آنسوؤں کا ایک سیلاب اسکی آنکھوں سے بہ گیا اور اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "اس قیدخانے کی دیوار میں کوئی اینٹ اتنی سخت نہ ہوگی جتنا میرا دل سخت ہے۔" پھر اسنے قیدی کا ہاتھ پکڑا اور اسکو قیدخانے سے باہر لے گئی۔

دریائے وارونا کے کنارے آفتاب نے موجوں کے ساتھ ملکر انکا خیرمقدم کیا۔ ایک کشتی لب ساحل انکا انتظار کر رہی تھی "اجنبی نوجوان!" شیاما نے کہا "آؤ میرے ساتھ کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے تمہاری خاطر اپنے تمام رشتے توڑ دیے۔ اور اس کشتی میں تمہارے ساتھ سفر کروں گی"۔

کشتی جلدی سے چل پڑی۔ پرند خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ گویا ان دو مسافران دریا کو الوداع کر رہے تھے۔ "مجھ سے کہہ میری پیاری"۔ واجراسن نے شیاما سے کہا "تونے کسقدر دولت کی عوض میری آزادی خریدی ہے"۔ شیاما نے جواب دیا "خاموش رہو۔ یہ کہنے کا وقت نہیں ہے"۔

دوپہر ہوگئی۔ قصبے کی عورتیں پانی بھرے ہوئے گھڑوں اور دھوئے ہوئے تر کپڑوں کو لیے ہوئے گھروں کو واپس ہوئیں۔ خرید و فروخت بند ہوگئی تھی اور قصبے کا راستہ سنسان پڑا تھا کیونکہ آمد و رفت بند تھی۔ دوپہر کی تند و گرم ہوا کے جھونکوں نے شیاما کے چہرے سے اسکا نقاب گرا دیا۔ واجراسن نے شیاما کے کان میں کہا "تمنے مجھے ایک ایسی قید سے رہائی دلائی جو مختصر تھی۔ اور پھر کبھی نہ ختم ہونے والی قید میں پھنسا دیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمنے یہ کام کس طرح انجام دیا"۔ نوجوان عورت نے اپنا نقاب منہ پر ڈالتے ہوئے کہا "نہیں میرے پیارے ابھی کہنے کا وقت نہیں آیا"۔

دن ختم ہوگیا۔ تاریکی چھا گئی۔ باد تند کے جھونکے موقوف ہوگئے اور ہلال نیلگوں پانی کے افق پر چمکا۔ شیاما تاریکی میں اپنے سر کو نوجوان کے کندھے پر رکھے ہوئے بیٹھی تھی اور اسکے بال بازو پر بکھرے پڑے تھے۔ اب اسنے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا "میرے پیارے! میں نے جو کچھ تمہارے لیے کیا وہ میرے لیے تکلیف دہ تھا اور اب اسکا تم سے بیان کرنا اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لیکن میں چند لفظوں میں

کھدوں گی۔ میرے پیارے محبت او مشیانے قید خانے میں تمھاری جگہ لی اور چوری کا الزام اُسنے اپنے سر لیا۔ اس طرح اپنی جان میری نذر کی۔ میری جان سے پیارے میں نے یہ عظیم ترین گناہ تیری ہاں صرف تیری محبت کی وجہ سے کیا۔"

جب وہ اس طرح گفتگو کر رہی تھی تو ہلال غروب ہو گیا۔ بیشتار پرندوں کے پیچھے بند ہو جانے سے جنگل کی خاموشی سخت وحشت افزا تھی۔ نوجوان نے شیاما کی کمر سے اپنے ہاتھ آہستہ سے ہٹائے۔ اسکے چاروں طرف خاموشی دل گداز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شیاما یک بیک اُسکے پاؤں پر یہ کہتی ہوئی گرپڑی "میرے پیارے مجھے معاف کر دو اور یہ بات خدا پر چھوڑ دو کہ وہ مجھے میرے گناہوں کی سزا دے۔"

واجراسن نے اپنے پیر کھینچ لیے اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "تو میری زندگی ایک گناہ کے عوض خریدی گئی ہے۔ میری ہر سانس تجھپر لعنت کرے گی۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ کود کر کنارے پر جا پہونچا اور جنگل میں چلا گیا۔ وہ آگے کی طرف بڑھا چلا گیا یہانتک کہ اب اور آگے جانے کے لیے راستہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں گنجان درختوں نے جن پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اسکے سامنے ڈرا دینے والی خیالی تصویریں پیش کرکے اسکو روک دیا۔ اور وہ تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ کون تھا جو اس ہوشربا خاموش تاریک راستہ میں بھوت کی طرح اسکے پیچھے کھڑا تھا؟

واجراسن نے چلا کے کہا "کیا تو مجھے نہ چھوڑے گی؟" ایک لمحہ میں عورت بوسوں کے شدید طوفان کے ساتھ اسپر جا پڑی۔ اسکے بال کھرے ہوے تھے اور اسکے کپڑے بے ترتیب ہو رہے تھے جبکہ اُس سے چمٹی ہوئی اسکے رخساروں پر پے درپے بوسے دے رہی تھی۔ اور رُکی ہوئی آواز میں بمشکل آنسو روکتے ہوے اُس نے جواب دیا "نہیں۔ نہیں۔ میں تمھیں کبھی نہ چھوڑوں گی۔ میں نے تمھارے لیے گناہ کیا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر دو۔"

ایک لمحے کے لیے رات کی تاریکی کم ہوتی ہوئی معلوم ہوئی اور خوف نے بیجان درختوں تک کو بیخ و بُن سے ہلا دیا۔ رات کی تاریکی میں خشک پتوں پر کسی جسم کے گرنے کی آواز آئی۔

* * * * * *

آفتاب چمکا جبکہ واجراسن جنگل سے باہر نکلا۔ وہ تمام دن تیز دھوپ میں دریا کے ریتیلے کنارے پر ایک لمحہ قرار لیے بغیر گھومتا رہا۔

شام کو وہ بغیر کسی خاص مقصد کے کشتی کی طرف گیا - وہاں بستر پر ایک پازیب پڑا تھا - اسنے اُسکو اُٹھا لیا اور اُس سے یہاں تک عتیہ کوبی کی کہ سینہ زخمی ہوگیا - پھر وہ ایک نیلے لبادے پر گر پڑا جو ایک گوشے میں لٹکا ہوا تھا اور اپنے منہ کو اُسکی تہوں میں چھپا لیا - اُسکی نرمی کا احساس کرکے اور اُسکی دلفریب خوشبو سونگھکر اُسنے اپنے کو کسی لطیف جنس محبت کی یاد میں کھو دیا -

رات کی خاموشی خوفناک تھی - چاند بھی درختوں کی آڑ میں چھپا ہوا تھا - واجراسن کھڑا ہوگیا اور جنگل کی طرف دیوانہ وار ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا " آ - میری پیاری آ "

دفعتہً تاریکی میں لب ساحل ایک سایہ نمایاں ہوا

" آ - میری پیاری آ "

" میرے پیارے میں آگئی - تمھارے پیارے ہاتھ میری جان لینے سے قاصر رہے - اور شاید ابھی زندہ رہنا میری قسمت میں ہے "

شیاما آئی اور نوجوان کے سامنے کھڑی ہوگئی - واجراسن نے اسکے حسین چہرے پر نظر ڈالی اور اس نے ہم آغوش ہونے کے لیے ایک قدم آگے بڑھا - پھر رُک کر دونوں ہاتھوں سے ڈھکیلتے ہوے اسنے کہا " کیوں ....... تو یہاں کیوں آئی "

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور منہ پھیرتے ہوے کہا " جا چلی جا - مجھے چھوڑ دے " وہ ایک منٹ تک خاموش کھڑی رہی - قبل اسکے کہ اسکے پاؤں پر جھکے اور الوداع کہے - پھر وہ اُٹھی اور دریا کے کنارے چلی گئی اور بے پایاں جنگل میں گم ہوگئی - اُس خواب کی طرح جو نیند سے چونکتے ہی غائب ہو جاتا ہے - واجراسن دھڑکتے دل سے کشتی میں گیا اور خاموش بیٹھ گیا -

ذرے ذرے نے پریشاں قلب عالم کر دیا　　اُس نے اجزاے دلِ مضطر کو برہم کر دیا
روح پرور بنکے آئے ، جانستاں ہوکر چلے　　محفلِ عشرت کو تم ہی نے بزم ماتم کر دیا
میں پریشاں تھا ، سرِ شوریدہ بارِ دوش تھا　　آپ نے اچھا کیا سلطے تعتعۂ غم کر دیا
جو نہ کہا تھا وہ ان اشکوں نے دکھلا یا مجھے　　جو نہ کرنا تھا وہ تم نے دیدۂ نم کر دیا
حال انکی پردہ داری کا تعین معلوم تھا　　دیدۂ گریاں کو پھر کیوں دل کا محرم کر دیا
آج وہ کہتے ہیں یہ قطرے کسی کے اشک ہیں　　میں نے کل شب روکے افشا رازِ شبنم کر دیا
ذرے ذرے میں دکھا کر جلوۂ حسن و جمال　　آپ نے مشتاق کو مشتاق عالم کر دیا

[illegible]

# خمسہ بر غزل حسرت موہانی

## از مولانا مولوی عبدالماجد صاحب بدایونی

---

بے کس و بے بس و نادار ہوں شیئاً للہ　　جورِ اعدا سے دل افگار ہوں شیئاً للہ　　ایک ناکردہ گنہگار ہوں شیئاً للہ
دستگیری کا طلبگار ہوں شیئاً للہ　　میرِ بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ

آپ کا لطف ہے جستہ طلبوں کا ضامن　　آپ کی ذاتِ مبارک ہے جہاں کی محسن　　سو دفعہ آپ سے تھی عرضِ تمنا ممکن
حالِ دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن　　آج میں برسرِ اظہار ہوں شیئاً للہ

آپ سے ہوگا نہ سرکار گوارا یہ کبھی　　کہ رہے مشقِ ستم آپ کا خادم کوئی　　میں ہوں مظلوم مدد کیجیے للہ مری
کرمِ خاص کے لائق تو نہیں میں پھر بھی　　آپ کا فاتحہ بردار ہوں شیئاً للہ

در بدر جاؤں کہاں ٹھوکریں کھانے کے لیے　　کس کو ہے درد جو مظلوم کی امداد کرے　　کون غمخوار ہے میرا جو مری عرض سنے
آپ ہی سنیے کہ اب دکھ کہوں میں کس سے　　بستۂ دامنِ سرکار ہوں شیئاً للہ

جرم ہے تذکرۂ حفظِ شعائرِ دینی　　وجہِ الزام ہے اظہارِ ولائے قومی　　میں کہ ہوں تابعِ احکامِ رسولِ عربی
مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی　　غلبۂ کفر سے بیزار ہوں شیئاً للہ

راز ہے میری خموشی تو خطا ہے شیون　　میں ہوں پامالِ جفا کاریِ اربابِ وطن　　وقت کڑا ہے کچھ ایسا کہ جہاں ہے دشمن
پائے رفتن ہے نہ ہے نہیں جائے ماندن　　سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئاً للہ

اے میں قرباں ترے اورنگ نشینِ بغداد　　ہے ترقی پہ ترے حسنِ خداداد کی یاد　　حسرتِ دید میں کرتا ہوں کب تک فریاد
جلوۂ پاک نظر آئے تو بر آئے مراد　　تشنۂ شربتِ دیدار ہوں شیئاً للہ

کیوں دعا یوں نہ تمنا ہو دلِ زار و ملول　　کام بن بن کے بگڑتے ہیں خلافِ معمول　　اب ترے ہاتھ مری لاج ہے اے ابنِ بتول
کیا کروں میری دعا بھی تو نہیں ہے مقبول　　میں کہ اک فردِ گنہگار ہوں شیئاً للہ

شہِ جیلاں کو بخشی ہے خدا نے قدرت　　کہ وہ بر لاتے ہیں حاجت طلبوں کی حاجت　　عام ہے ان کا کرم عام ہے ان کی رحمت
غوثِ اعظم سے جو مانگو گے لیکن حسرت　　بس کہو حاضرِ دربار ہوں شیئاً للہ

# ارتقاے رشک

منشی محمد مہدی صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال نے مرزا غالب کی اردو شاعری پر ایک تفصیلی ریویو لکھا ہے۔ جس کا ایک ٹکڑا آپ کے پاس بغرض اشاعت بھیجا جاتا ہے۔ پورا مضمون عنقریب کتابی صورت میں شایع ہوگا۔ (ناظر لکھنؤ)

---

رشک پر شعراے فارسی نے خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے بھی تمام شعرا نے یہ مضمون باندھا ہے۔ اور بعض نے اچھے اچھے اسلوب پیدا کیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مضمون میں کوئی جدت اور تازگی نہ پیدا کر سکے۔ مرزا صاحب کی ایجاد و خیز طبیعت نے جو جو لطیف اور نازک مضامین پیدا کیے ہیں انکے لحاظ سے وہ نہ صرف شعراے اردو پر تفوق رکھتے ہیں بلکہ شعراے فارسی سے بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں بالکل اچھوتے اور نئے نئے پہلو نکالے ہیں کہ ان سے ایک پورا سلسلۂ ارتقا مرتب ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ شاعرانہ تخیل اور بھی درمیانی کڑیاں پیدا کر سکے لیکن مرزا غالب کے کلام میں رشک کے تمام مراتب ابتدا سے انتہا تک موجود ہیں۔ ذیل میں وہ اشعار ترتیب وار لکھے جاتے ہیں۔

رشک کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ محبوب کی بے مہری دیکھکر یہ تو اطمینان ہے کہ اسکو غیر کے ساتھ بھی کوئی حقیقی ربط نہیں لیکن ظاہری برتاؤ میں احتیاط کی شان پائی جاتی ہے جو شاعر کو گوارا نہیں۔

رشک کہتا ہے کہ اسکا غیر سے اخلاص حیف      عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگرچہ بد آموزی کا خوف نہیں لیکن دشمن محبوب سے ہمکلام کیوں ہوتا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے      وگرنہ خوف بد آموزیِ عدو کیا ہے

پھر اس بات کا رشک ہوتا ہے کہ محبوب غیر کا تذکرہ کرتا ہے اگرچہ وہ بر سبیل شکایت ہے

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ      ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

اسکے بعد یہ صورت ہے کہ گو محبوب سے غیر کے دوستانہ مراسم نہیں پیدا ہو سکتے لیکن غیر کے دل میں اسکی آرزو بھی کیوں ہے۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے      نہ دی ہوتی خدایا آرزوے دوست دشمن کو

۔ تمام مدارج رشک خود معشوق کے طرزِ عمل سے پیدا ہوتے تھے خواہ ظاہری اخلاص رشک کا سبب ہو یا ہمکلامی کا شرف یا غیر کا تذکرہ شکایت کا موجب ہو۔ لیکن شاعر اب اس سے آگے ترقی کرتا ہے اور اگرچہ معشوق کے طرزِ عمل اور رسم و راہ میں کوئی ایسا امر نہیں جو رشک پیدا کر سکے لیکن شاعر اپنے زورِ تخیل سے خواہ مخواہ وجوہِ رشک پیدا کرتا ہے۔ کہتا ہے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

یعنی معشوق، عاشق سے کہہ رہا ہے کہ تمہارا رشک خلافِ واقع ہے اور اسکو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن عاشق اُسکے تبسم پنہاں سے پھر بدگمان ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اطمینان دہی تصنع سے خالی نہیں۔ ورنہ تبسم پنہاں کی کیا وجہ۔ یہ مراتبِ رشک غیر سے تعلق رکھتے تھے، اسکے بعد دوستوں اور ہوا خواہوں کی باری آتی ہے چنانچہ قاصد پر رشک کرتے ہیں۔

گذرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال و جواب ہے

یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی اُسے دیکھے۔ اگرچہ خود بھی اُسکے دیکھنے والوں میں ہیں:۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جاے ہے مجھسے

"دیکھا جانے" کی تکرار نہایت لطف دے رہی ہے۔ اور یہ مرزا صاحب کی مخصوص طرزِ بندش ہے۔ قاصد کی ہمکلامی، اغیار سے مخاطبت، اپنی محرومی اور غیروں اور دوستوں کا دیکھنا اگر وجہ رشک ہو تو چنداں تعجب نہیں لیکن اس سے بھی ترقی کرکے اب یہ پہلو نکالا ہے کہ اغیار کے ساتھ ظلم وستم، جَور و جفا اور عداوت ودشمنی بھی موجبِ رشک ہے، اس مضمون کو نئے نئے اسلوب سے باندھا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

اور کہتے ہیں۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلاے آفتِ رشک بلاے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلیے

یہی مضمون واضح پیرایہ میں نہایت ہی خوبی سے اس طرح ادا کیا ہے۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاشکے تم مرے لیے ہوتے

رشک کی بنا محبت پر ہے اس لحاظ سے اغیار پر رشک بجا تھا، قاصد اور دوستوں تک کے پہلو میں بھی دل تھا اس لیے اگر ان پر بھی رشک ہو تو کچھ بیجا نہیں لیکن ایسی چیزوں پر رشک شروع ہوتا ہے

جن میں صلاحیتِ رشک موجود نہیں - فرماتے ہیں۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آئے

اب تک جسقدر اشعار نقل کیے گئے ہیں اُن میں یہ خواہش تھی کہ معشوق کی تمام حرکات اور اداؤں کا مرکز صرف ہم رہیں - اور جہاں کہیں ذرا عمومیت پیدا ہوئی وہ موجب رشک ٹھیری - یہاں سے اب اور ترقی شروع ہوئی - شاعر اب خود اپنی مختلف حیثیتوں کا لحاظ کرکے خود اپنے کو غیر تصور کرتا ہے اور اب اُسے یہ بھی گوارا نہیں کہ معشوق کا نام بھی اُسکی زبان پر آئے - کہتے ہیں -

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اس میں بھی ترقی کی ہے کہ خود بھی وصل محبوب کی تمنا نہیں کرتے - چنانچہ کہتے ہیں

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں ولے اُنکی تمنا نہیں کرتے

اسکی بھی آخری حد یہ ہے کہ وصل ایک طرف اُسکا دیکھنا بھی نہیں چاہتے - چنانچہ فرماتے ہیں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

اب اس درجے سے بھی ترقی کرکے، اس بات کی خواہش کرتے ہیں کہ خود معشوق بھی اپنی اداؤں سے لطف نہ اُٹھائے - حتیٰ کہ آئینہ میں بھی اپنا عکس رخ بھی نہ دیکھے - فرماتے ہیں -

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

یہاں تک بھی غنیمت تھا اب فرماتے ہیں

رشکِ ہمطرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں نالۂ مرغِ سحر تیغِ دودم ہے مجھ کو

یعنی عاشق جدا معشوق جدا صرف اشتراک محبت ہی موجب رشک ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ کیوں محبت کرے اور کیوں کسی کی آواز میں سوز وگداز ہو -

اب پورا سلسلہ مکمل ہوگیا اور کوئی پہلو رشک کا باقی نہیں رہا - لیکن شاعر کی جدت آفریں طبیعت کو اب بھی قناعت نہیں ہے چنانچہ کہتا ہے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے

اسی ایک مضمون سے مرزا صاحب کے مرتبہ شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے انکی جدت آفرینی اور قوت تخیل پر حیرت ہوتی ہے -

محمد مہدی

# نظرے خوش گذرے

الناظر اب کے پھر کسی قدر تاخیر اور نیز قدرے نامکمل حالت میں حاضر ہوتا ہے۔ میری طبیعت ہمیشہ سے برابر مضمحل ہے، اور امپیریل رولٹ بل کی مہیب بلا نے سارے ملک کو سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مہاتما گاندھی صاحب نے جنکی عظمت سے شاید ہی کسی انسان کا دل معرا رہ سکے، کمال اولوالعزمی، ایثار علی النفس کے ساتھ مقاومتِ صابرانہ شروع کر دیا ہے۔ اور گو میں اس قابل نہیں کہ مہاتما گاندھی جیسے فرشتہ صفت رہنما کی تابعیت کا پورا حق مجھسے ادا ہو سکے، تاہم تائید ایزدی پر اعتماد کر کے میں نے مقاومتِ صابرانہ کا حلف لے لیا ہے۔ اور اب مجھے جلد سے جلد الناظر اور اسکے متعلقہ کاروبار کی خدمت سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔

میں نے جو تجویز الناظر اور اُسکے متعلقہ کاروبار کے بقا و قیام کی سوچی ہے اُسکا ایک ضروری عنصر یہ ہے کہ الناظر کے قدردانوں میں سے کوئی ایک صاحب مناسب معاوضہ لیکر رسالہ کی ترتیب و دوسرے شعبوں کی نگرانی کا کام اپنے ذمہ لے لیتے۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی جیسی کہ مجھے بعض احباب کی عنایت سے توقع ہے تو مجھے یقین ہے کہ الناظر کی زندگی پر کوئی مضر اثر نہ پڑے گا بلکہ جن نوجوان دوست کی میں راہ دیکھ رہا ہوں وہ آجائیں گے تو کم سے کم الناظر تو اب سے بہت بہتر حالت میں ہو جائیگا —— آئندہ نمبر میں غالباً ناظرین کو تفصیلی طور پر بتا سکوں گا کہ کیا انتظام تجویز پایا ہے اور اُنکی خدمت کی ذمہ داری اب کس کے سر رہے گی۔

## رسید کتب

جاپان کی [illegible] تعلیمی۔ از مولوی محمد اسد اللہ حیدرآبادی۔ سائنٹفک سوسائٹی مدرسۃ العلوم علیگڈھ۔ قیمت ۸ر

نیرنگ سحر۔ از منشی اقبال ورما سحر ہنگامی قیمت ۶ر | نصائح چانکیہ۔ از جناب [illegible] صاحب قیمت ۲ر

سعدی [illegible] "[illegible]" قیمت [illegible] | پریم پچیسی (حصہ دوم) از منشی پریم چند قیمت ۱۲ر

اُردو کی پہلی۔ پرائمری کی دوسری جماعت کیلئے ۳ر | اُردو کی پہلی۔ مدارس اسلامیہ کے طلبا کیلئے [illegible] ۲ر

اردو کی دوسری " تیسری " ۵ر | اردو کی دوسری " " ۳ر

اُردو کی تیسری پرائمری کی چوتھی " ۵ر | اُردو کی تیسری " " ۴ر

اُردو کی چوتھی پانچویں " ۶ر | اُردو کی چوتھی " " ۶ر

| مرزا رجب علی سرور | مولانا عبدالحلیم شرر | پنڈت رتن ناتھ سرشار | منشی احمد علی شوق | خواجہ حسن نظامی | نیاز فتح پوری |
|---|---|---|---|---|---|
| فسانۂ عجائب | جنید بغدادی | [illegible] | ترانۂ شوق | سیپارۂ دل | ایک شاعر کا انجام |
| الف لیلہ | ابوبکر شبلی | بچھڑی ہوئی دلہن | گنجینہ | روزنامہ باتصویر | مرگِ سیاہ کی ڈائری |
| گلزار سرور | خواجہ معین الدین چشتی | کامنی | قاسم و زہرہ | روزنامچہ | کیوپڈ اینڈ سائکی |
| انشائے سرور | مصر قدیم | خدائی فوجدار | **ڈاکٹر اقبال** | تسخیر … | [illegible] |
| **منشی امیر احمد مینائی** | دولت سپانیہ عرب | فسانۂ آزاد | [illegible] | محرم نامہ | **سیاب اکبرآبادی** |
| امیر اللغات ۲ جلد | دروب صلیبیہ | سیر کہسار | شکوہ | … خطوط نویسی | خدیجۃ الکبریٰ |
| … عشق | آغا صادق کی شادی | جام سرشار | جواب شکوہ | یزید نامہ | بنت الرسول |
| خطوط امیر احمد | تذکرۂ شاعرہ | **مرزا محمد ہادی رسوا** | نخل ترانہ | بیوی کی تعلیم | سیرۃ الحسین |
| **جلال مرحوم لکھنوی** | مقدس نازنین | امراؤ جان ادا | آئینۂ اقبال | میلاد نامہ | جام کوثر |
| مضامین گلشن | قیس و لبنیٰ | [illegible] | رموز بیخودی | کرشن بیتی | **شہر سلطان حیدر جوش** |
| نغم نگار | ایام عرب | **پنڈت … چکبست** | اسرار خودی | اردو دعائیں | ابن مسلم |
| رسالہ تذکیر و تانیث | ملک العزیز ورجنا | صبح وطن | **منشی محمد حسن خان** | قتل … | صبر کی دیوی |
| **منشی سجاد حسین مرحوم** | یوسف و نجمہ | گلدستۂ … | [illegible] | غدر دہلی کے افسانے | **صفدر مرزا پوری** |
| احمق الذین | رومۃ الکبریٰ | [illegible] | ترکوں کی معاشرت | چٹکیاں اور گدگدیاں | بزم خیال |
| حاجی بغلول | فلورا فلورنڈا | **سید برکات احمد** | **مولانا اسلم جیراجپوری** | جگ بیتی | مرقع ادب |
| پیاری دنیا | فردوس بریں | جمیلہ | حیات حافظ | بچوں کی کہانیاں | مشاطۂ سخن |
| طلسمی فانوس | آغا صادق کی شادی | [illegible] | حیات جامی | خطوط حسن نظامی | **مولانا حسرت موہانی** |
| طرحدار لونڈی | حسن کا ڈاکو | [illegible] | علوم عرب | … موت | حیات تسلیم |
| میٹھی چھری | دربار حرام پور | **خواجہ عشرت** | خواتین | سیر دہلی | شرح دیوان غالب |
| کایا پلٹ | خوفناک محبت | زبان دانی | **مولوی سید سلیمان** | **مولانا راشد الخیری** | دیوان حسرت |
| **منشی جوالا پرشاد برق** | الفانسو | قواعد میر | ارض القرآن ۲ جلد | صبح زندگی | **مولوی مصباح الدین احمد** |
| مرآۃ المنی | فلپانا | ہجولی | حیات امام مالک | شام زندگی | المامون |
| [illegible] | فاتح مفتوح | شاعری کی پہلی کتاب | لغات جدیدہ | شب زندگی | محاسبۂ فرانس … |
| بنگالی دولھن | جویائے حق | تذکرۂ … | مکاتیب شبلی ۲ جلد | طوفان حیات | مصباح الادب |
| معشوقۂ فرنگ | ایک خرمی | گلدستۂ … | اہل السنۃ والجماعۃ | سراب مغرب | |
| | لعبت چین | | | [illegible] | |
| | تاریخ بغداد | | | بنت الوقت | |
| | حسن بن صباح | | | جوہر قدامت | |
| | افسانۂ قیس | | | | |

[illegible]

الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

### مولانا اشرف علی
- نشر الطیب فی ذکر الحبیب
- تعلیم الدین
- اکسیر فی اثبات التقدیر
- الانتباہات المفیدہ
- اصلاح الرسوم
- کلید مثنوی ۲ جلد
- مناجات مقبول
- بہشتی زیور ۱۰ حصے
- بہشتی گوہر
- تربیت السالک ۲ حصے
- ہفت اختر

### علامہ سید احمد
- حمایت الاسلام
- فن ہیئت
- فن کیمسٹری

### پروفیسر محمود علی
- دین و دانش
- الایمان

### پروفیسر سلیم
- تذکرۃ المصطفے
- معارج الدین

### مولوی عبد الحق
- قواعد اردو
- انتخاب کلام میر

### منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

### مسٹر عبد الماجد
- تاریخ اخلاق یورپ ۲ حصے
- فلسفۂ اجتماع
- نفسیاتِ خیال (درلا)

### مولوی عبد الحی
- تاریخ یورپ ۳ جلد
- عروس سلطان
- انشائے امیر
- مصاحب عصری
- اقبال دو لتمن
- حسن معاشرت
- مسلمات بہشت
- ... (نامکمل)

### سید علی بلگرامی
- خاص عملی و دعا
- تاریخ یونان قدیم

### مطبوعات انجمن ترقی اردو
- فلسفۂ تعلیم
- رہنمایان ہند
- نیولین اعظم
- امرائے ہنود
- القمر
- تاریخ تمدن
- مبادی سائنس
- فلسفۂ جذبات
- فلسفۂ اجتماع
- مقدمات الطبیعات
- عجائب الارض
- البیرونی
- مشاہیر یونان و روما
- تاریخ زبان قدیم
- تاریخ اخلاق یورپ
- علم ہیئت
- نظریات لطافت
- انتخاب کلام میر
- اردو کا نیا قاعدہ
- کلید قاعدہ
- اسباق النحو ۲ حصے
- القول الاظہر

### مولانا عبد الغفور
- مصباح الکلام
- مصادق البیان

### مرزا حیرت دہلوی
- سیرۃ الرسول کامل
- کتاب الشہادتین
- مضامین حیرت
- درجان تعلیم

### منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- حیات صالح

### خواجہ غلام الحسنین
- فلسفۂ تعلیم
- دستور العلمین
- معیار الاخلاق
- تربیت اولاد

### مولانا عبد الشکور
- اسماء الغنا ۲ جلد
- علم الفقہ ۲ جلد
- تاریخ طبری

### خواجہ عبد الحمید صاحب
- دمشق
- حضرت زید
- ام القرآن

### قاضی عبد الرحمن امرتسری
- سفر نامہ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- سیاحت ہند
- عرب بول چال

### مرزا سلطان احمد
- فنون لطیفہ
- خیالات
- مثال
- فن شاعری
- نیرت

### مولانا ظفر علی
- آیات اسلامیہ
- کارنامہ ترک

### منشی محمد لطیف
- الہم
- ادب لطیف

### مولانا عبد الغنی
- حاد الحب
- ارمغان غنی
- تذکرۃ الشعرا

### مولانا سید سلیمان ندوی
- تمدن اسلام ۲ جلد
- الاسلام والنصرانیہ
- اسلام اور سوشلزم
- فتح اندلس

### سید احمد حسین امجد
- القمر
- اصل

### مولوی محمد مہدی
- ... الیات
- تاریخ مصر جدید

### مطبوعات الناظر پریس
- سیل اشک انجمی
- محاربات صلیبی
- تسخیر فرانس
- الاحسان
- حیات نظامی
- تذکرہ حزین
- جمیل و بثینہ
- مثنوی شوہر
- اتفاقات زمانہ
- سکندر نامہ اولسی
- شوکت و رشید
- اکسیر اولاد خدایت
- سعادت
- محبت کا خزانہ
- انسان
- ترقی تجنیس و تراجم
- نوبہار
- مثنوی سیدہ بیگم
- سلطان اندلس
- اصول تنخ
- کلیات نعت
- الطاف کربلا
- بچوں کی تعلیم کے اصول
- شکوہ
- خیابان
- عروس کی رسم
- اساس التعلیم
- انساب الانبیا
- روضۂ قدرت
- تاریخ سندھ کی کہانیاں
- خوان دعوت
- اسرار تمکین

رجسٹرڈ نمبر ل ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیمت فی پرچہ ۸/

# الناظر

قیمت سالانہ ۴

ایڈیٹر ـ ظفر الملک علوی

| | | |
|---|---|---|
| نمبر ۱۱۹ | یکم مئی سنہ ۱۹۱۹ء | جلد ۲۰ |

فہرست مضامین



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

# مشہور مصنفین اردو کی قابل دید کتابیں

## مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب قسم اعلیٰ
- صحیح نظم طباطبائی

## سرسید احمد خاں مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- آثار الصنادید
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- سیرۃ فریدیہ
- اسباب بغاوت ہند
- آخری مضامین سرسید

## مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مجموعہ نظم حالی
- مسدس حالی
- مناجات حالی
- مقالات حالی

## سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت
- لکچر

## مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- نیرنگ خیال
- نظم آزاد

## مولوی نذیر احمد مرحوم
- ترجمۃ القرآن متوسط
- الحقوق والفرائض ۳ جلد
- اجتہاد
- مرآۃ العروس
- بنات النعش
- توبۃ النصوح
- مجموعہ نظم بینظیر
- چند پند
- منتخب الحکایات
- رویائے صادقہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- لکچروں کا مجموعہ

## مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- فلسفۂ اشتمال
- محاربات عظیم

## مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی صلعم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- سیرۃ النعمان
- سوانح عمری مولانا روم
- موازنۂ انیس و دبیر
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- مضامین عالمگیر
- شعر العجم ۴ جلد
- مثنوی صبح امید
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- زیب النساء بیگم

## نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت والشوق
- مجموعہ لکچر

## مولوی چراغ علی مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- تحقیق الجہاد
- اعظم الکلام ۲ جلد
- مجموعہ رسائل

## مولوی عبد الرزاق
- نظام الملک طوسی
- البرامکہ مجلد

## مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- فلسفۂ شاعری
- ادیب
- نور جہاں
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان
- مرقع تا جپوشی

## خلیفہ محمد حسین
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ برنیر ۲ جلد

## مولوی سید احمد
- راحت زمانی
- رسوم دہلی
- تسخیر شوہر
- مہرافروز بیگم
- کنز الفوائد
- انشائے ہادی النساء
- تعلیم لمبیح
- لغات النساء
- افتتاح تحریر النساء
- محاکمہ مرکز زبان اردو

## مولوی سید علی بلگرامی
- تمدن ہند
- میڈیکل جورسپروڈنس
- عربوں کا فن تعمیر
- سفرنامہ موسیو تھیونو
- جنگ ٹرانسوال

## مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق
- ذکر الحبیب
- ذکر جمیل

## مولوی حامد علی صدیقی
- تاریخ اندلس
- اقتصاد عرب

## مولوی سید احمد انصاری
- تحریر المراۃ
- المدنیۃ والاسلام
- کتاب الصدق
- کتاب التوحید

## مولوی عبد اللہ عمادی
- کتاب المعارف
- تحکمات
- تاریخ عرب قدیم
- علم الحدیث

## مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- وکرم اردسی

## مسٹر ظفر علی خاں بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس مجلد
- جنگل میں منگل
- سیر ظلمات
- ڈرامہ جنگ روس و جاپان

## مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- بوسیمن
- نیلی چھتری

## خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامچۂ سیاحت
- ایک فلسفیانہ لکچر اسلام پر
- طالب علم کی زندگی کا مقصد

## مفتی انوار الحق ایم اے
- اثبات وجود باری
- حقائق اسلام

## مسٹر عنایت اللہ
- دعوت اسلام
- اشاعت اسلام چین میں
- اشاعت اسلام بذریعہ تلوار

[illegible]

الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم


# الناظر

نمبر ۱۱۹ جلد ۲۰ —— یکم مئی سنہ ۱۹۱۹ء


## ایجاد کا ماخذ

تم نے بارہا یہ سوال سنا ہوگا "اس چیز کا موجد کون تھا؟" "فلاں چیز کس کی اختراع ہے؟" ایسے سوالات کا بسا اوقات کوئی یقینی اور صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ بہت سی چیزیں ہیں جو اگرچہ بسبب کثیر الفوائد ہونے کے اس قدر شہرت پا چکی ہیں کہ بچہ بچہ انھیں جانتا ہے لیکن انکے موجد محض گمنام افراد ہوے ہیں۔ یہ اشخاص اپنے زمانۂ حیات میں چپ چاپ کام کرتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج آیندہ نسلوں کے لیے چھوڑ کر راہیِ ملکِ بقا ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اُنکا بویا ہوا بیج پھل لاتا ہے اور اس طرح حضرت انسان کی آسایش و بہبودی کا ایک وسیلہ مہیا ہو جاتا ہے۔

ایسی ایجادیں اکثر اتفاقیہ معلوم ہوتی ہیں لیکن غور کرو تو اس خیال کی غلطی نظر آجائیگی۔ اصل یہ ہے کہ ایسے اشخاص اول تو غیر معمولی دماغ کے آدمی ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ اپنے مواقع سے فائدہ اُٹھا جانتے ہیں آنے کو تو ایسے ہی اتفاقات عام آدمیوں کو بھی پیش آتے رہتے ہیں لیکن وہ انکی نوعیت اور ماہیت کو نہیں سمجھتے ہاں قابل آدمی ان واقعات کی تہ کو پہونچ جاتے ہیں اور اس طرح بنی نوع انسان کے سرمایۂ علم میں ایک قابل قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایسے اتفاقات کی نہایت مشہور مثال نیوٹن اور سیب کا واقعہ ہے جس سے کشش ثقل کا اصول دریافت

ہوا- نیوٹن باغ میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک سیب خود بخود درخت سے نیچے گر پڑا۔ اس واقعہ نے اسے سوچ میں ڈال دیا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ زمین میں ضرور کوئی ایسی طاقت ہے جسنے سیب کو نیچے کی طرف کھینچا۔ ہوتے ہوتے یہ اصول دنیا کی ہر ایک مادی چیز پر حاوی قرار دیا گیا- اور آج سائنس کے بنیادی اصولوں میں اسکا شمار ہوتا ہے۔

قریب قریب ایسا ہی واقعہ مشہور سائنسداں گے لی لی او (Galileo) کو بھی پیش آیا۔ گے لی لی او پیزا (Pisa) کے جامع گرجا میں کھڑا تھا کہ اُسے چھت میں ایک لیمپ ہلتا نظر پڑا۔ اُسنے دیکھا کہ لیمپ کی جنبش رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے۔ سوچتے سوچتے اسکے دل میں خیال آیا کہ یہ معلوم کرنا چاہیے کہ چھوٹی جنبش لمبی جنبش سے کتنا کم وقت لیتی ہے۔ اسکے پاس گھڑی تو تھی نہیں (کیونکہ گھڑیاں ابھی ایجاد نہ ہوئی تھیں) لیکن حرکات نبض کی تعداد سے وہ وقت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب اُس نے یہ اندازہ لگایا تو اُسے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ چھوٹی جنبش اور بڑی جنبش ٹھیک ایک ہی وقت میں ختم ہوتی ہیں۔ اس دریافت سے اسنے پین ڈولم (Pendulum) کا تمام اصول اخذ کر لیا۔ یہ ایک ایسا اصول تھا کہ اسوقت تک صرف معدودے چند اصول اس اہمیت کے دریافت ہوئے تھے۔ اس زمانہ سے اکثر کلاک پین ڈولم کے اصول پر بنائے جاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ صحیح اور قابل اعتبار اندازہ وقت کا لگانا کسی اور ذریعہ سے مشکل ہے۔ علاوہ ازیں جو اجسام زمین کی طرف گر رہے ہوں اُنکی رفتار معلوم کرنے کا بھی یہ نہایت اعلیٰ ذریعہ ہے اگرچہ شروع میں اس کا صرف ایک ہی استعمال معلوم تھا یعنی ڈاکٹر اسکی مدد سے حرکات نبض گنتے تھے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں کوپن ہیگن یونیورسٹی میں ایک پروفیسر اورسٹیڈ (Oersted) نامی تھا جسنے سائنس کی تحقیق میں پیش قدمی کی۔ کرۂ ہوائی کی برقی طاقت اور سوزن مقناطیسی کے باہمی تعلق کا خیال اکثر دلوں میں پیدا ہوا تھا لیکن اورسٹیڈ کے اکتشافات سے پہلے یہ خیال قیاس کی حد سے آگے نہ بڑھا تھا- کیونکہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا- اورسٹیڈ نے الیکٹرو میگنے ٹزم (electro-magnetism) کا اصول دریافت کیا جسنے اب اسقدر اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اس صنعت و حرفت کی ترقی کے زمانہ میں بیشمار انجنوں اور مشینوں کے لیے محرک طاقت زیادہ تر اسی ذریعہ سے حاصل کیجاتی ہے۔ یہ دریافت یوں ہوئی:-

پروفیسر اورسٹیڈ ایک لیکچر کے دوران میں برقی طاقت کے تجربے دکھا رہا تھا کہ یکایک اُسنے دیکھا کہ برقی تار کے قریب کی ایک مقناطیسی سوئی میں غیر معمولی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ سوئی میں ایک مضطربانہ حرکت

پیدا ہوتی تھی اور وہ تیزی سے گھومتی تھی۔ اورسٹیڈ نے لیکچر کو چھوڑ کر اس تار اور سوئی کو بغور دیکھا بھالا۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر ایک مقناطیسی سوئی کے قریب میں برقی رو گذرے تو سوئی ہمیشہ گھوم کر اسکے راستہ میں آجائیگی۔ اب غور کرو کہ محض اس اتفاق سے کہ جس میز پر تجربے دکھلائے جارہے تھے ایک مقناطیسی سوئی بھی تھی ایک ایسا اہم اصول معلوم ہوگیا جسکی مدد سے اورسٹیڈ اور اسکے بعد آنے والے سائنسدانوں نے نئے نئے اصول دریافت کیے۔

ایسا ہی زمانۂ حال کی عظیم ترین طبی کامیابی یعنی چیچک کے ٹیکہ کی دریافت بھی محض اتفاقیہ طور پر ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک چیچک کا یورپ کی خطرناک بیماریوں میں شمار ہوتا تھا اور کثیر التعداد جانیں اس سے ضائع ہوتی تھیں۔ لیکن نہ تو اسکا کوئی علاج معلوم تھا اور نہ کوئی تدبیر حفظ ماتقدم کی کارگر ہوتی تھی۔ البتہ تجربے سے معلوم ہوگیا تھا کہ اگر ایک دفعہ کسی کے چیچک نکل آئے تو دوبارہ اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اس اصول سے ایک صورت فائدے کی نکل آئی۔ ہسپتالوں یا گھروں میں لوگ اپنی رضامندی سے چیچک کے مادے سے ٹیکہ لگواتے تھے جسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک خفیف قسم کی چیچک انھیں نکلتی تھی جس سے ۱۰۰۰ آدمیوں میں صرف ۴ مرتے تھے۔ لیکن اس میں خرابی یہ نکلی کہ جن لوگوں نے ٹیکہ کروالیا وہ تو محفوظ ہوگئے لیکن ملک میں بیماری موجود رہی اور ٹیکہ نہ کروانے والوں میں شرح اموات پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ایک دن جینر [redacted] جو ایک مشہور سرجن کے پاس کام سیکھتا تھا ایک دیہاتی عورت کو طبی مشورہ دے رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں جینر نے عورت کو چیچک اور اسکے خطرات سے آگاہ کیا۔ عورت نے کہا مجھے اسکی ذرا بھی فکر نہیں۔ مجھے چیچک نہیں نکل سکتی کیونکہ میری گائے کے چیچک نکل چکی ہے۔ اسوقت تو جینر نے عورت کی بات کا کچھ خیال نہ کیا لیکن بعد ازاں جب وہی بات اسے پھر یاد آئی تو اس نے ادھر ادھر پوچھنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگرچہ ڈاکٹر لوگ اسے وہم سمجھتے ہیں لیکن عوام میں یہ خیال بہت پایا جاتا ہے کہ اگر کسی کے گائے کے چیچک نکل گئے تو انسانی چیچک سے وہ محفوظ رہتا ہے۔ کئی سال بعد جب اسنے بطور خود علاج معالجہ کا کام شروع کیا تو اس بات کا کافی ثبوت مل گیا۔ اسنے دیکھا کہ دیہاتی آدمیوں میں کئی ایسے ہیں جن پر ٹیکہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور انھیں چیچک نہیں نکلتی۔ آخر اسکی کیا وجہ ہے؟ اس تمام تحقیقات سے اس اہم نتیجہ کا انکشاف ہوا کہ اگر گائے کی چیچک کے مادہ سے انسان کو ٹیکہ لگایا جائے تو وہ کچھ عرصہ تک انسانی چیچک سے محفوظ رہتا ہے۔

جینر نے اس انکشاف کا اعلان کردیا لیکن پہلے پہل کسی نے اسکی بات کو نہ مانا اور ہنسی میں اڑادیا۔ رفتہ رفتہ اسکی دریافت کی اہمیت کو لوگوں نے تسلیم کرلیا اور پارلیمنٹ کی طرف سے اسے ۳۰۰۰۰ پونڈ کی

گراں قدر رقم عطا ہوئی - ہوتے ہوتے ٹیکہ کا رواج تمام دنیا میں پھیل گیا اور اب اسے ایک نعمت عظمیٰ سمجھا جاتا ہے - لیکن غور کرو تو اسکی اصلیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس گفتگو میں جو جیز اور دیہاتی عورت کے درمیان ہوئی تھی ایک اتفاقیہ بات ایسی کہی گئی جس سے یہ سب نتیجہ نکلا -

چیچک کے ٹیکے کے اہم نتائج کا اندازہ کرنے کے لیے اٹھارویں صدی کے اشتہارات پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے - خانگی ملازمین کی خدمات حاصل کرنے کے لیے جو اشتہارات دیے جاتے تھے اُن میں ملازم کی دیگر صفات کا ذکر کرنے کے بعد یہ الفاظ ضرور ہوتے تھے " اُسے چیچک نکل چکی ہو" - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ چیچک سے بہت خائف تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ایسا ملازم ان میں رہنا سہنا شروع کردے جو چیچک سے محفوظ نہ ہو -

دُوربین کی ایجاد بھی اتفاقیہ طور پر ہوئی - اسکے موجد دو ولندیزی عینک ساز جَینسَن (Jansen) اور لپرشے (Lippershey) نامی تھے - اس آلہ کا خیال اُنھیں اپنے بچوں کے کھیل سے سوجھا بچے شیشوں کو آنکھ کے سامنے رکھکر مختلف اشیا کو دیکھ رہے تھے - ایک لڑکے کو ایک نئی ترکیب سوجھی اس نے پہلے تو ایک مجوّف شیشہ آنکھ کے سامنے رکھ لیا اور پھر ایک محدب شیشہ اسی سیدھ میں کچھ فاصلہ پر - جب اس ترکیب سے ان میں سے دیکھا تو وہ چلا اُٹھا " اہا ! گرجے کا مینارہ بہت قریب آگیا ہے " - یہ سنتے ہی اسکا باپ دوڑا آیا اور اس نے بھی ان شیشوں میں سے دیکھا - واقعی جس طرح لڑکے نے شیشوں کو رکھا تھا اس طرح دیکھنے سے مینارہ بہت بڑا اور قریب نظر آتا تھا - عینک ساز نے شیشوں کو ایک تختہ پر جما کر دوربین بنالی جو اُس نے شاہزادہ مارس والیٔ نساؤ (Prince Maurice of Nassau) کو بطور تحفہ دی جب گیلیلیو کو اسکا حال معلوم ہوا تو اس نے شیشوں کو ایک نلی میں جما کر ایک واقعی کارآمد دوربین بنالی اس دوربین بنانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اسکی مدد سے اُسنے یہ چیزیں دریافت کیں :- چاند کے پہاڑ، چاند پر زمین کی روشنی کا عکس اور سیارۂ مشتری کے چار چاند -

پتھر سے چھاپنے کا فن جسکی مدد سے تصویریں چھاپی جاتی ہیں اسی طرح دریافت ہوا تھا - اس فن کے تین اصول ہیں (۱) چکنی چیزیں باہمی ارتباط رکھتی ہیں اور پانی سے نفرت (۲) چونے کے پتھر کے ساتھ آسانی چمٹ جاتی ہیں (۳) چونے کا پتھر پانی کو جذب کرلیتا ہے - اگر چونے کے صاف پتھر پر چکناہٹ سے نشان کیا جائے تو وہ اس قدر پائدار ہوتا ہے کہ جب تک اُس حصہ پتھر ہی کو نہ نکال دیا جائے وہ نہیں مٹتا - اب

فرض کرو کہ ایسے پتھر پر چکناہٹ سے تصویر بنائی جاتی ہے اور پتھر کی باقیماندہ سطح پر پانی پڑا ہونے دیا جاتا ہے۔ اب اگر چکنی سیاہی کا رولر پتھر پر پھیرا جائے تو سیاہی صرف چکنی تصویر کی سطح کے ساتھ چمٹے گی اور پتھر کے باقی حصہ نہ لگیگی۔ اب اگر کاغذ کا تختہ اس پتھر پر دبایا جائے تو اسپر تصویر کا خاکہ اتر آئیگا۔ پس پتھر سے چھاپنے کا یہی اصول ہے؟

اس عمل کا موجد ملک بویریا کا ایک باشندہ سینی فیلڈر (Senefelder) نامی تھا۔ یہ شخص ایک طرح سے ہمہ گیر قابلیت کا مالک تھا لیکن باوجود بہت سی باتوں میں کافی استعداد رکھنے کے کسی ایک چیز میں بھی ماہر نہ تھا۔ اسکی پیدائش ۱۷۷۱ء میں ہوئی تھی۔ سن بلوغ کو پہونچکر اس نے کئی ایک کاموں میں ہاتھ ڈالا مثلاً قانون، شعروشاعری، راگ، ڈراما نویسی، مصوری اور تھیٹر کی ایکٹری۔ قبل اسکے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اُسکا والد انتقال کر گیا اور اب اسے غربت کا سامنا ہوا۔ اس نے ایک ڈراما لکھا جو سٹیج پر ناکامیاب ثابت ہوا۔ اس ناکامی کے داغ کو مٹانے کے لیے اس نے ایک اور ڈراما لکھا جسے وہ چاہتا تھا کہ فوراً اسے پیشتر چھپ جائے۔ چھاپے والوں نے اتنی جلدی چھاپ دینے سے انکار کیا۔ اسپر اُس نے ارادہ کر لیا کہ میں اپنا چھاپہ خانہ کھولونگا۔ پس چھاپے کا کام سیکھنے کے لیے وہ ایک چھاپہ خانہ میں ملازم ہو گیا۔ اسکا قول ہے کہ اگر اُس وقت میرے پاس اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کافی روپیہ ہوتا تو شاید میں لیتھوگرافی کا موجد نہ ہوتا۔

پہلے تو اسنے لکڑی کے ٹائپ بنانے اور سٹیریوٹائپ (Stereotype) پلیٹ ڈھالنے کی کوشش کی لیکن روپیہ کی کمی اس میں مانع آئی۔ پھر اس نے تانبے کی پلیٹ پر چھاپے کے حروف کو اُلٹا لکھنا شروع کیا۔ اس میں یہ دقت تھی کہ اگر لکھتے لکھتے کوئی غلطی ہو جاتی تو اُسکا صحیح کرنا بہت مشکل ہوتا کیونکہ اسے آجکل کے کندہ گروں کا یہ عمل معلوم نہ تھا کہ پہلے پلیٹ پر روغن لگا کر کام کرنا چاہیے اور جب سب حروف صحیح لکھے جائیں تو تیزاب ڈالکر اُنکو پائدار نقش دینا چاہیے۔

تاہم اُس نے اس مشکل پر غالب آنے کے لیے بھی ایک تدبیر سوچ لی۔ اس مطلب کے لیے اُس نے ایک قسم کا مرکب ایجاد کیا۔ جسکے اجزا یہ تھے:۔ موم، کاجل، صابن، اور بارش کا پانی۔ جب اس طریقہ سے کامیابی کی صورت نظر آنے لگی تو روپیہ کی کمی پھر مانع ہوئی اور تانبے کی پلیٹ خریدنے کو اُسکے پاس کچھ نہ بچا۔ لاچار اُس نے یہ سوچا کہ پُرانی پلیٹ کے حروف کو پتھر سے رگڑ کر مٹانے کے بعد پھر اُسی کو نئے حروف لکھنے کے لیے کام میں لانا چاہیے۔

اسکے گاؤں کے گرد و نواح میں ایک قسم کا نرم پتھر پایا جاتا تھا جو اس مطلب کے لیے بہت موزوں ثابت ہوا۔ چنانچہ اس خیال پر عمل کرکے وہ پرانی تانبے کی پلیٹوں سے عرصے تک کام لیتا رہا۔ پھر اس نے خود پتھر پر نقش بنانا چاہا لیکن جب اسپر تیزاب گراتا تو نقوش کا مادہ اڑ جاتا اور نقش اتنا گہرا نہ ہوتا کہ چھاپے کی سیاہی اسپر چڑھتی۔ اس غربت کے زمانہ میں محض اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس عجیب و غریب فن کی ایجاد کا باعث ہوا اس واقعہ کو ہم سینی فیلڈر کے لفظوں میں ہی بیان کرینگے۔

"میں پتھر کی ایک پلیٹ کو صاف اور شفاف کر چکا تھا اور اسپر الٹا لکھنے کے لیے نقاشی مادہ چھیلا جاتا تھا کہ میری ماں کمرے میں آئی اور مجھسے کہنے لگی کہ دھوبن باہر کھڑی ہے اسکا بل لکھدو۔ اسوقت اتفاق سے میرے پاس کاغذ کا ایک پرزہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ میرا سارا کاغذ پتھر پر سے پروف اتارنے میں خرچ ہو چکا تھا اور نہ ہی دوات میں سیاہی کا ایک قطرہ تھا۔ چونکہ معاملہ جلدی کا تھا اور کوئی آدمی بھی ایسا پاس نہ تھا جسے کاغذ اور سیاہی لانے کے لیے بازار بھیجا جاتا۔ میں نے اسی پتھر پر اپنی خاص سیاہی سے جو موم، صابن اور کاجل سے تیار کی تھی دھوبن کا بل لکھدیا اس خیال سے کہ فرصت کے وقت کاغذ پر نقل کر لوں گا۔ بعد ازاں جب میں اس بل کو پتھر پر سے مٹانے والا تھا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ دیکھوں اسپر تیزاب ڈالنے سے کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے اسپر تیزاب ڈالا اور جب انچ کا سواں حصہ گہرے نقش ہو گئے تو انپر سیاہی لگادی اور اس پتھر پر سے کئی عمدہ نقش اتار لیے۔"

بس اس طرح اس نئے فن کی ایجاد ہو گئی اور لیتھو کی مدد سے جو چیز سب سے پہلے چھاپی گئی وہ ایک دھوبن کا بل تھا۔ غربت اور اتفاق کی مدد سے سینی فیلڈر اس اہم فن کا موجد ہوا لیکن اس سے فائدہ اٹھانے سے بیشتر اسے بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ روپیہ اسکے پاس نہ تھا اور نہ ہی وہ اپنا راز دوسروں پر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ روپیہ حاصل کرنے کے لیے اس نے فوج میں ایک دوسرے آدمی کے عوض میں بھرتی ہونا چاہا لیکن اسے منظور نہ کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک گوئیے دوست نے اسکی مدد پر کمر باندھی اور دونوں نے ملکر ۱۷۹۶ء میں کچھ راگ شائع کیے جسکی آمدنی سے لتھو کا پریس قائم کیا گیا۔

شیشے کی ساخت کا طریقہ بھی اتفاقیہ طور پر دریافت ہوا تھا۔ پلائنی دی ایلڈر مشہور رومن مورخ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ ملک شام کے چند ملاح دریائے بلیس کے کنارے اترنے پر مجبور ہوئے۔ وہاں دریا کے آس پاس کی زمین ریتلی تھی اور اسی ریت پر انھوں نے کالے پودے کو ملا کر آگ بنائی۔ بعدازاں انھوں نے وہاں ایک روشن چمکدار چیز پائی۔ یہ شیشہ تھا جو پودے کی کھار اور ریت کی آمیزش سے بنگیا تھا۔

علم آثار قدیمہ کے میدان میں اتفاق نے نمایاں کام کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ مصری حروف کا پڑھا جانا ہے۔ صدیوں سے یہ علم فراموش ہو چکا تھا حتیٰ کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ حروف کس قسم کی تحریر ہیں۔ دیواروں اور میناروں پر عجیب و غریب نقش اور تصاویر دیکھ دیکھ کر انسان تو حیرت رہ جاتا تھا اور باوجود ہزار کوشش کے انکا مطلب و معنی سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ زمانہ آیا جب نپولین نے مصر کو فتح کیا۔ نپولین اپنے ساتھ ملک کی تاریخ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ کا مطالعہ کرنے کے لیے چند عالم بھی لایا تھا۔ اُنھوں نے بہت سی چیزیں جمع کیں لیکن ان باتصویر کتبوں کے پڑھنے میں اُنھیں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے راز کا پردہ اُٹھ گیا اور اُس خزانہ کی کنجی ملگئی جس میں ایک عظیم الشان قوم کی حیرت انگیز تہذیب کا دفینہ تھا۔

عالموں نے تو خزانوں اور دیگر آثار قدیمہ کے لیے جا بجا زمین کھودی تھی لیکن انکے ہاتھ کچھ نہ لگا تھا۔ یہ عزت ایک سپاہی کی قسمت میں تھی۔ بوسارڈ (Bouchard) نامی توپخانہ کا افسر چند فوجی سپاہیوں کو لے کر روزیٹا (Rosetta) کے قریب فورٹ سن جولین (Fort St. Julien) کے ایک مکان کی بنیادیں کھود رہا تھا۔ یہ کھدائی آثار قدیمہ کے مطالب کے لیے نہیں بلکہ محض فوجی اغراض کے لیے ہو رہی تھی۔ کھودنے والے کھدائی میں ہمہ تن مصروف تھے کہ یکایک اُنھیں ایک سیاہ پتھر نظر پڑا جسکے کونے ٹوٹے ہوئے تھے اور اسپر عجیب و غریب نشانات تھے۔ سپاہیوں نے یہ پتھر اپنے افسر کو دکھایا۔ بوسارڈ نے اُسے مفید اور دلچسپ سمجھکر عالموں کے حوالہ کیا جنھوں نے اسے قاہرہ کی فرانسیسی نمائشگاہ میں رکھوا دیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد فرانسیسی فوجوں نے انگریزی فوجوں سے شکست کھائی اور مال غنیمت میں یہ پتھر بھی انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ مصر سے اس پتھر کو انگلستان لے آئے اور برٹش میوزیم میں رکھدیا۔

اگرچہ محض اتفاق سے یہ پتھر سپاہیوں کے ہاتھ لگا تھا لیکن یہ نہایت ہی کارآمد ثابت ہوا۔ اسپر تین کتبے تھے ایک باتصویر حروف میں دوسرا ڈیموٹک (demotic) حروف میں اور تیسرا یونانی حروف میں۔ اول اول اس پتھر کی قیمت کا کوئی اندازہ نہ لگا سکا لیکن برسوں کی جد و جہد کے بعد یہ معلوم ہوا کہ پتھر کا کتبہ اصل میں ایک تحریر تھی جو میم فس (Memphis) کے پادریوں نے ۱۹۶ قبل مسیح میں مصر کے ایک بادشاہ کی نسبت لکھی تھی۔ اس بادشاہ کے متعلق بہت کچھ تھا لیکن وہ ضروری حصہ جسکی وجہ سے اس پتھر کی اتنی قدر و قیمت تھی آخری فقرہ تھا جو حسب ذیل الفاظ میں ہے:۔ "ہمارا آخری حکم یہ ہے کہ یہ تحریر سخت پتھر کی تختی پر باتصویر حروف، ڈیموٹک حروف

اور یونانی حروف میں کھودی جائے اور ہر ایک معبد درجہ اول، دوم وسوم میں لافانی بادشاہ کے بت کے قریب رکھی جائے"۔

چونکہ وہی تحریر تین طرح کے خطوں میں تھی اسلیے با تصویر حروف کے پڑھنے کی ایک کنجی مل گئی۔ یونانی تحریر کے ساتھ دوسرے کتبوں کا مقابلہ کرنے سے قدیم مصری تحریر کا پڑھنا ممکن ہو گیا۔ لیکن یہ کام اگرچہ بظاہر آسان تھا لیکن اصل میں مشکلات سے بھرا پڑا تھا ——— کئی سال کی تحقیق کے بعد فرانسیسی عالم (Champollion) پرانے مصری کتبوں کے پڑھنے کے لیے ایک قاعدہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ اگر فوجی سپاہی اتفاقیہ طور پر اس پتھر کو نہ پاتے تو مصر سے آج ہم اتنے ہی ناواقف ہوتے جتنے قرون وسطے کے لوگ تھے۔

ایسی ہی ایک دریافت آثار قدیمہ کے متعلق ۱۸۷۲ء میں برٹش میوزیم میں ہوئی جو ایک عالم میں زبانزد خلائق ہو گئی۔ جارج اسمتھ میوزیم کے صیغۂ تحقیقاتِ مشرقیہ کا ایک کارکن ایک چھاپہ خانہ میں کندہ گری کا کام کرچکا تھا اور فرصت کے وقت میں اسیریا اور بابل کے قدیم کتبوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اپنی لیاقت اور قابلیت کے طفیل اسکی رسائی سر ہنری رانسن تک ہوئی جو برٹش میوزیم کا ایک ٹرسٹی تھا اور اسکی مدد سے اسے برٹش میوزیم میں ایک عہدہ مل گیا۔ عراق عرب کی قدیم سلطنتوں کی تاریخ میں وہ خاص دلچسپی لیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ مٹی کے متفرق ٹھیکروں کو جو رانسن مشرق سے اپنے ساتھ لایا تھا دیکھ بھال رہا تھا کہ اُسے ایک ایسا ٹھیکرا ملا جس پر کتبہ کے چند الفاظ تھے اس میں ذکر تھا کہ ایک جہاز پہاڑوں پر جا کر ٹھیرا۔ ان الفاظ نے اُسے متوجہ کر لیا۔ جب اسنے زیادہ غور سے کتبہ کو دیکھا تو یہ الفاظ پڑھے کہ ایک فاختہ اُڑائی گئی لیکن اُسے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ ملی۔ یہ کتبے نہایت اہم تھے کیونکہ یہ بالکل طوفان نوح کے بیان سے جو توریت میں مندرج ہے ملتا جلتا تھا۔ جارج اسمتھ کہتا ہے میں فوراً سمجھ لیا کہ یہ کتبہ کلدانیوں کے قلم سے ہے اور اسمیں طوفان نوح کا ذکر ہے۔ میں نے سارے کتبہ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ الفاظ طوفان کے ہیرو نے ایک شخص نامی سے گفتگو کے دوران میں کہے تھے۔ مٹی کے دوسرے ٹھیکروں پر جنھیں آج تک صرف کوڑا کرکٹ سمجھا جاتا تھا اسنے پھر ڈھونڈنا بھالنا شروع کیا۔ یہ تلاش بہت محنت کا کام تھا اور اس میں ایک عرصہ صرف ہوا کیونکہ ہزارہا ٹکڑوں کو دیکھنا تھا لیکن اسکی محنت ضائع نہ ہوئی اور تلاش سے اُسکی اور ٹھیکرے مل گئے جنکی مدد سے اُسنے طوفان نوح کا ایک معتد بہ حصہ کا بیان مرتب کر لیا جب اس دریافت کی خبر دنیا میں شایع ہوئی تو ایک کہرام مچ گیا اور اخبارات کے کالم کے کالم اس پر سیاہ ہونے لگے۔ سمتھ کو عراقِ عرب بھیجا گیا تاکہ وہاں جا کر وہ کتبہ کے دوسرے حصوں کی تلاش کرے۔ تعجب کی بات ہے کہ اس بے سراغ و لاپتہ تلاش میں اسے پوری کامیابی حاصل ہوئی اور بہت سے ٹھیکرے جمع ہو گئے جن کی مدد سے قریباً قریباً سارا بیان طوفانِ نوح مرتب ہو گیا۔ اسی تلاش میں کئی ایک ایسے کتبے بھی اُسے ملے جن میں کلدانیوں کے قلم سے کتاب پیدائش کی بہت سی کہانیوں کا بیان تھا۔ غور کرو کہ مٹی کے چند ٹھیکروں کو اتفاقیہ طور پر دیکھنے سے جو ایک گودام میں بطور کوڑا کرکٹ پڑے تھے زمانۂ حال کی ایک عظیم علمی تحقیقات نتیجہ ہوئی۔ "شاہین" پشاور

# مثنوی اسرارِ خودی

ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی جب سے شائع ہوئی ہے اُسوقت سے اسپر مخالفین کے اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس مثنوی میں تصوف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کو بُز و گوسفند لکھا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:-

راہبِ اول فلاطونِ حکیم　　از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گوسفندے در لباسِ آدم است　　حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود　　جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت　　خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات　　قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

خواجہ حافظ کے متعلق لکھا ہے:-

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار　　جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ او　　از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید　　عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملتِ میخوارگاں　　آں امامِ ملتِ بیچارگاں
گوسفندے ست و نوا آموخت است　　عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائیہائے او زہر است و بس　　چشمِ او غارتگرِ شہر است و بس
از بزِ یوناں زمیں زیرکتر است　　پردۂ گوشش حجابِ اکبر است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش　　چوں مریدانِ حسن دارد حشیش
محفلِ او در خورِ ابرار نیست　　ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر　　الحذر از گوسفنداں الحذر

مخالفین کو افلاطون کی نسبت کم لیکن خواجہ حافظ کی بابت زیادہ ملال ہے۔ کیونکہ وہ صرف شاعر

ہی نہیں ہیں بلکہ ایک مقدس بزرگ بھی تسلیم کیے جاتے ہیں اسی وجہ سے عصبیت کے جوش میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں - میں ایک عرصہ سے اس بحث کو دیکھ رہا تھا - لیکن اس وجہ سے خاموش تھا کہ یہ اصولی بحث نہ تھی - چند روز ہوے میرے پاس مثنوی "رازِ بیخودی" ایک دوست کے ذریعہ سے پہونچی جو خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنر ڈپٹی کلکٹر محکمۂ انہار پنجاب نے مثنوی "اسرارِ خودی" کے جواب میں لکھکر شائع کی ہے - بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کچھ ضرور ان مثنویوں پر لکھوں - اسلیے مجبوراً مُہرِ سکوت کو توڑنا پڑا - لیکن میرے اس لکھنے کا منشا صرف یہ ہے کہ اس بحث کو اصل مرکز پر لاؤں - تاکہ آیندہ موافقین یا مخالفین جو کچھ لکھیں وہ قوم کے لیے مفید ہو - ذاتیات سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا -

**احترامِ سلف** ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا - کیونکہ انکی وجہ سے ایک تو خود اُنکی ذات پر حملے ہونے لگے اسلیے کہ قدیمی اصول ہے

بزرگش نخوانند اہلِ خرد کہ نامِ بزرگاں بزشتی برد

دوسرے نفسِ مسئلہ جو مفید تھا ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آگیا - چنانچہ پیرزادہ صاحب جنھوں نے اس دھوم دھام سے اس مثنوی کا جواب لکھا ہے وہ بھی اصلی بحث کو نظر انداز کر گئے - اور صرف افلاطون اور حافظ کی مدح سرائی اور ڈاکٹر صاحب پر شلیں سپت کرنے میں مشغول رہے - بدگو سفند کے جواب میں کہیں شغال اور کہیں خر بنایا ہے - اور دشمنِ اسلام و رہزنِ اسلام وغیرہ خطابات بخشے ہیں - لکھتے ہیں

خود زما خیلے بسے وحشت سگال جامہ زن در نیل و ستاں چوں شغال

فلسفی فطرت زدیں برگشتگاں در بیابانِ جنوں سرگشتگاں

عقل و دین و داد را دشمن ہمہ در لباسِ شحنگاں رہزن ہمہ

از دمِ گفتار دستاں داستاں فلسفہ در دل تصوف بر زباں

دشمنِ جاں آمدند اسلام را رہزنِ جاں آمدند اسلام را

سلہ میں خوش ہوں کہ اس مثنوی کے دوسرے اڈیشن میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ خواجہ حافظ کے متعلق لکھا تھا اسکو حذف کر دیا اور اسکے بجائے نئے اشعار لکھدئیے لیکن اسکے ساتھ یہ دیکھکر افسوس ہوا کہ اسکا ضمیمہ چھپ نیا ہے جس میں خیال ڈالا گیا جسکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۱۲-

وائے بر این پختگانِ عقلِ خام　　　اولیا را میش و بز کردند نام
از دمِ مکرِ شغالان الحذر　　　الحذر از بد سگالان الحذر

دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

از خودی بیچارہ زن اسلاف را　　　کردہ پامالِ جنوں انصاف را
بندۂ دنیا و دنیا دیں فروش　　　سربسر ملت فروش آئیں فروش

پیرزادہ صاحب کے ان اقوال کو جب صوفیانہ حلم اور حُسنِ ظن کی میزان میں ہم تولتے ہیں تو انکی سبکی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے ۔

خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی رائیں پہلے سے بھی لوگوں کی چلی آتی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کچھ اسکے اول مجرم نہیں ہیں ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے یہ عام منادی کرادی تھی کہ دیوانِ حافظ کو کوئی نہ پڑھے ۔ کیونکہ لوگ اسکے ظاہری معنی سمجھکر گمراہ ہوتے ہیں ۔ نیز مولانا حالی مرحوم نے حیاتِ سعدی میں لکھا ہے :

> خواجہ حافظ کی غزل بخلاف سعدی کے قوالی میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اسکے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں ۔ وہ ہمیشہ سامعین کو جنون و آوارگی کی ترغیب دیتی ہے عشقِ حقیقی سے قطع نظر عشق بازی اور صورت پرستی و کامجوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے ۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ، غرض کسی شے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی ۔ وہ عقل و تدبیر، دل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے ۔ اور دیوانگی، رسوائی، بدنامی، بے ہستی، بے سروسامانی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے ۔ دولتِ دنیا پر لات مارنا ۔ عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا ۔ توکل و قناعت کے نشے میں اپنی ہستی مٹادینا اور جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملادینا ۔ دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا ۔ علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجابِ اکبر سمجھنا ۔ حقائقِ اشیا میں کبھی غور و فکر نہ کرنا ۔ کفایت شعاری اور انتظام کو ہمیشہ دشمن رکھنا جو کچھ ہاتھ لگے اسکو فوراً اٹھا دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بیکاروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا ساحرانہ اور دلکش ہو اور شاعری کی فصاحت و بلاغت بدرجۂ کمال ہو اور مطرب کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور تاثیر کی سنے

انکو لے اُڑتی ہے۔ اور انکی تاثیر کو دس میں گنا کر دیتی ہے۔ اور جب با وجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جنکی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گذری ہے۔ اور جنکا فخر شریعت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشیں ہو جاتے ہیں۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں

"خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک بادہ احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اوباش و اوباط کو بے فکری ناعاقبت اندیشی عشقبازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔"

ہم نے خود اپنی تصنیف حیات حافظ میں ان رایوں کو نقل کیا ہے اور انکا جواب بھی دیا ہے لیکن ہمارے جواب کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "حسن کا معیار یہی ہے کہ وہ کمال درجہ کا دلکش ہو۔ عشاق کی رسوائی سے حسن بُرا نہیں قرار پاسکتا۔" باقی حافظ کی غزل کے ان اثرات سے جو مولانا حالی نے لکھے ہیں کون انکار کر سکتا ہے اب بے شک یہانتک ہم پیرزادہ صاحب کے ساتھ ہیں کہ

الادب پیغارہ بر مستان مزن شیشۂ خود بر سر سنداں مزن
در گذر از بادہ خوار اے محتسب مست را معذور دار اے محتسب

**لسان الغیب** مولانا حکیم فیروزالدین احمد صاحب طغرائی نے ڈاکٹر صاحب کے جواب میں جو رسالہ لسان الغیب کے نام سے شایع کیا ہے اُس میں جو پہلو جواب کا اختیار کیا ہے وہ "سوال از آسمان جواب از ریسماں" کا مصداق ہے۔ شعرا اور تذکرہ نگاروں نے کلام حافظ کی جو مدح کی ہے وہ شاعری اور صوفیانہ رموز کے لحاظ سے ہے۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ کلام کی ان خوبیوں کو ڈاکٹر صاحب بہ نسبت حکیم صاحب موصوف کے زیادہ سمجھتے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ اُن اثرات کے متعلق ہے جو خواجہ کے کلام سے جذبات پر پڑتے ہیں۔ اسلیے اُن محامد و مدائح کا نقل کر دینا جو ڈاکٹر صاحب کے بھی پیش نظر ہیں جواب کیلیے کافی نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں حکیم صاحب موصوف نے شعرالعجم سے بہت کچھ استدلال فرمایا ہے کہ علامہ شبلی نے کلام حافظ

کو چناں و چنیں لکھا ہے ۔ مگر اُنکو یہ خبر نہیں کہ اسی شعر العجم میں عمر خیام کے تذکرہ میں ہے کہ

"افسوس ہے کہ خیام خواجہ حافظ کی طرح صوفی نہ تھا ۔ ورنہ اسکی شراب بھی شرابِ معرفت بن جاتی"

اسرار خودی میں خواجہ حافظ کے جن اشعار کی طرف تلمیح ہے اُنکے لطیف معانی حکیم صاحب نے بیان کیے ہیں اور جو صوفیانہ نکات اُن سے نکالے ہیں وہ ہر شاعر کے ہر شعر سے نکالے جا سکتے ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ ہوا میں نے کسی مضمون نگار کا مضمون پڑھا تھا جس سے مضمون نگار نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خواجہ آتش لکھنوی کا کلام تصوف اور معرفت سے لبریز ہے ۔ اور اسکے شواہد بھی اُسنے لکھے تھے ۔ نیز بمبئی کے کسی اخبار میں ایک گبر کا یہ دعویٰ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ خواجہ حافظ آتش پرست تھے ۔ مدعی نے خود حافظ کی کئی غزلوں سے اسپر استدلال کیا تھا ۔ منجملہ اُنکے ایک غزل جو مجھے یاد رہ گئی یہ ہے

کنونکہ در چمن آمد گُل از عدم بہ وجود      بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود

اس غزل کے مندرجہ ذیل شعر کو اس نے اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے ثبوت میں پیش کیا تھا ۔

باغ تازہ کن آئینِ دینِ زردشتی      کنونکہ لالہ برافروخت آتشِ نمرود

جنوری سنہ ۱۹ء کے رسالہ نقاد میں ایک مضمون نگار نے اسی بحث کے متعلق لکھا ہے کہ

"غالب و مومن ۔ داغ و امیر کا کلام بھی بالکل اسی رنگ میں ہے ۔ اور سوائے زبان کے فرق کے حافظ کے اور ان شعراء کے کلام میں کوئی فرق نہیں ۔ پھر کیا سبب ہے کہ بلا سبب حافظ کے کلام کو مذہبی رنگ دیا جائے اور اسکا تقدس و احترام اسکی ادبی حیثیت سے بڑھا چڑھا کر تسلیم کیا جائے ...... اس رنگ کے اثرات ہماری قوم کے لیے بالیقین مضر ثابت ہوتے ۔ اور آج سب سے بڑی ضرورت ہے کہ دعوتِ عمل و اسرار خودی و حب وطن کے جذبات تمام قوم میں سرایت کر جائیں ۔ اور ہر شاعر اسی ترانہ کو گاتا نظر آئے"

**حافظ و عرفی** | ہم کو سب سے زیادہ جو بات مثنوی اسرار خودی میں حیرت انگیز معلوم ہوئی وہ یہ ہے

حافظ جادو بیاں شیرازی است      عرفی آتش زباں شیرازی است

این سوے ملک خودی مرکب نراند      واں کنار آب رکنا باد ماند

این قتیل ہمتِ مردانہ      آن ز رمزِ زندگی بیگانہ

بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز      زندہ ۔ از صحبتِ حافظ گریز

* مطلب کہ اگر شاعری ہی کے دائرہ میں رہنا ہے تو حافظ کو چھوڑ کر عرفی کو مقتدا بنا لینا بعینہٖ اس مثل کا مصداق

"فرمن المطر ووقع تحت المیزاب"

حقیقت یہ ہے کہ ہماری شاعری خرد جال ہے خوش نصیبی نہیں ہے۔ اسکے چند مخصوص عنوانات ہیں جنکو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اُنھیں کو شعراء الفاظ کے نئے نئے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ زندگی کے لیے کسی عملی شاہراہ کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ سوائے ادبی لطافت کے کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن شریف نے جس شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اسکا بہترین یا بدترین نمونہ یہی ہے۔ الا ماشاء اللہ مولانا حالی نے بہت صحیح فرمایا ہے

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر — زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر

ہوا علم و دیں جس سے برباد سارا — وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

عقیدت مندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر بھی تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے، عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے۔ رہیں ادبی خوبیاں، تو اُنکے لحاظ سے خود عرفی اسی شمع کا پروانہ ہے۔ کہتا ہے

بگرد مرقد حافظ کہ کعبۂ سخن است — در آمدیم بعزم طواف در پرواز

بیشک نخوت اور خودستائی کہیں کہیں اُسکے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن وہ خود ڈاکٹر صاحب کی مصطلح خودی کے متضاد ہے۔

**بحث خودی** پیرزادہ صاحب نے خودی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے خواجہ حافظ کے جوش حمایت میں ڈاکٹر صاحب کے مفہوم مقصود کو سہواً یا قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ "خودی کو بمعنی غرور میں نے استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اسکا مقصود محض احساس نفس یا تعیین ذات ہے"۔ باوجود اس تصریح کے اس لفظ کے جو معنی اُنھوں نے خود ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے نکالنے کی کوشش کی ہے اس میں صریحی طور پر انصاف سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اسلیے کہ جب کوئی لفظ کسی اصطلاحی معنی میں رکھ دیا گیا تو اسکے لغوی معنی لیکر اعتراض کا پہلو نکالنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس شعر پر

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغ یک محمد بر فروخت

جو اعتراض پیرزادہ صاحب نے کیا ہے کہ اسکا اثر انبیاء کی عظمت و شان پر اچھا نہیں پڑتا ہم بھی اس سے متفق ہیں لیکن ہمارا جہاں تک خیال ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون اس کلام سے اخذ کیا ہوگا، ہم کیسی

رک صوفی کا ہے

صد ہزاراں سبزہ پوش از غم بسوخت — تا کہ آدم را چراغے برفروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح — تا دریں حضرت درودگر گشت نوح
صد ہزاراں پشہ خوردش کرد شاد — تا براہیم از میاں سر برنہاد
صد ہزاراں طفل سر بریدہ گشت — تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنار شد — تا کہ عیسیٰ محرم اسرار شد
صد ہزاراں خلق در تاراج رفت — تا محمد یک شبے معراج رفت

خودی کا عرفی مفہوم مراد لیکر پیرزادہ صاحب نے جو اعتراضات کیے ہیں ان تیروں کا نشانہ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اسکا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث بالکل لفظی ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ طبیعت نے جب مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و علل دریافت کرنے کی طرف توجہ کی تو یہ سراغ پایا کہ امتِ اسلامیہ سے قوتِ عمل فنا ہو گئی۔ اور جو علمی ولولہ اور جوش سلف میں تھا وہ خلف میں نہیں رہا۔ اور چونکہ ترقی کا مدار عمل پر ہے جب تک پھر اسی قوتِ عمل کو زندہ کرکے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اس قوتِ عمل کے احیاء کیلیے یہ ضروری ہے کہ ہمکو اپنی ہستی کا بھی احساس ہو۔ اسی نظریہ کی تعلیم کیلیے انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ خودی کی تعریف یں کہتے ہیں۔

پیکر ہستی ز آثارِ خودی ست — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
می شود از بہر اغراضِ عمل — عامل و معمول و اسباب و علل
زندگی محکم ز ربطِ خودی ست — کاہ از خوابِ خودی بیہوشی ست

اس مفہوم کو مثنوی رموزِ بیخودی میں اور بھی صاف کر دیا ہے

تو خودی از بیخودی نشناختی — خویش را اندر گماں انداختی
جوہرِ نوری ست اندر خاکِ تو — یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو
واحد است و برنمی تابد دوئی — من ز تابِ او منستم تو توئی

خویش دار و خویش باز و خویش ساز — تا زہائی پرورد اندر نیاز
خوگرِ پیکارِ پیہم دیدمش — ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں

ہرچہ گفتی از خودی حاشا غلط — سر بسر از لفظ تا معنی غلط
در حیاتِ کس خودی را دخل نیست — خلقِ عالم نو رسِ این نخل نیست
در حریمِ حق خودی را نیست بار — در حرم خود دیر دیوان را چہ کار
از خودی بگذر کہ کار این است و بس — خاصہ مسلم را شعار این است و بس

دراصل پیرزادہ صاحب خودی کے لفظ ہی سے بیزار ہیں۔ کہتے ہیں

اے خودی را مرکبِ خود ساختی — دُرِّ دریا سے بجاں انداختی
اے خیالِ خامِ اسرارِ خودی — پختہ کارِ زارِ پندارِ خودی
زہر را تریاق می گوئی مگوے — بہ ہلاکِ خویشتن پوئی مپوئے
در عیارستانِ بازارِ صفا — سکۂ قالِ تو باشد ناروا

مجھکو حیرت ہے کہ "عیارستان بازارِ صفا" میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کے "انا الحق" کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی "انا" سے اس قدر بیزار۔ !!

منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں

زاہداں منصور را خوں کردہ اند — بیکس و معذور را خوں کردہ اند
مردِ حق گو را بدار آویختند — بے گنہ را خون ناحق ریختند
ہاں اے زہادِ آشفتہ دروں — ہاں اے استیزہ کارانِ جنوں
خونِ منصور از شما خواہم گرفت — خفتہ خوں را خونبہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت "مسئلۂ اعیان" کی وجہ سے کی ہے اسکے جواب میں پیرزادہ صاحب نے شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب تلویح سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اسکی مدح سرائی فرمائی ہے۔ فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لیے یہ جواب ایک لطیفہ ہے۔ اسکا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے۔ پوچھا کہ کیا اسکے درجے کا کوئی اور حکیم نہیں؟ ارسطو نے کہا نہیں

پھر مسلمان چند گروں اور صوفیوں کے نام لیے ارسطو نے سوائے بایزید کے اور کسی کو افلاطون کا ہم تربہ نہ بتایا۔
چنانچہ پیرزادہ صاحب اسی بنیاد پر ان کی بابت کہتے ہیں

خیر سینے در لباس آدم است

ہکو امید تھی کہ پیرزادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کرینگے۔لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا۔کہتے ہیں

اے کہ حافظ را شماتت میکنی		رندِ میکش را ملامت میکنی
اے کہ علم و بینش مخمورِ عمل		تو چہ دانی سرِ مستانِ ازل

**بحث تصوف** اصل مرکز بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام ایک حقیقی پیغام عمل ہے۔ باوجود پیرو اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آکر غالب ہوگیا ہے اور وہ تصوف ہے۔ اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس کشی نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیات اسلامیہ میں ساری ہوگیا ہے اور ہر قوم اسکے ادبیات کا ایک گہرا اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے۔ اسلیے رفتہ رفتہ اسکے اثر سے ہماری قوتِ عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفیِ خودی کو بنی نوع انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفۂ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا اسوجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے دیباچے میں خود انھیں کے الفاظ میں نقل کیا ہے یہ ہے

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔
(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔
(۳) تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اُٹھایا ہے۔
(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اسکی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے بلکہ اُنھوں نے خود تحقیقات کی ہے جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے دیباچہ

تصوف نفس کشی سکھلاتا ہے۔ لیکن شریعت کی یہ تعلیم نہیں ہے وہ صرف اصلاحِ نفس کی خواہاں ہے۔

بھی انکا قول نقل فرمایا ہے

(۱) میرے آبا و اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میرا فطری میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔

(۲) فلسفہ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہو گئی تھی۔ کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی مجرد تصوف ہے۔

(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا۔ اسواسطے میں نے تصوف کو ترک کر دیا۔

اسکے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا نسبی و روحانی تعلق ایک قدیم صوفیانہ خاندان سے ہے میرے اجداد و اجداد نے نسلاً بعد نسلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جد اعلیٰ ہیں اسوقت تک تصوف کے دامان تربیت میں پرورش پائی ہے میرا عقیدہ یہ ہے کہ "اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے"

**مسئلۂ عینیت** تصوف کا مسئلۂ "عینیت" افلاطون کے مسئلۂ "اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے "ہمہ اوست" کے عقیدہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ہر ذرہ عین آفتاب ہو گیا اور خالق اور مخلوق متحد ہو گئے۔ چند اقوال بطور مثال کے لکھتا ہوں

"انا الحق"

"سبحانی ما اعظم شانی"

"سبحان الذی خلق الاشیاء و ہو عینہا"

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ    خود بر سر بازار خریدار بر آمد

خود انا الحق زد از لب منصور    خود بر آمد ز شوق بر سرِ دار

گفت[1] انا احمد بلا میم    از زبانِ محمدِ مختار

[1] اس قسم کی کوئی ضعیف روایت بھی موجود نہیں۔ خود ڈاکٹر اقبال کو بھی یقین پیدا نہیں ہوا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کہیں تہذیب کی پرچھائیں تسلیم کی ہے    قوم دنیا میں جو احمد بےمیم کی ہے

معلوم نہیں کہ قرآن و حدیث کے مطالعے سے جس طرح تصوف کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال بدلا ہے اسی طرح ان عقیدہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی یا ابھی تک "عندیہ سہاسے محبت" ہیں اللہ خالق ہر کے ہو خود اے گروادھی سمجھتے ہیں۔

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست　　خیالِ آب و گل در رہ بہانہ
یہاں تک کہ بعض یکہ تازانِ میدانِ تفریط توحید کو بھی شرک خیال کرتے ہیں۔
اے پسر لا الہ الا اللہ　　خود ز شرکِ خفی ہست اشبہ وار
ہست شرکِ جلی رسول اللہ　　خویشتن را ازیں دو شرک برآر
ایک اور سرمست کا ترانہ سنیے
من ہم زمینم ہم سما۔ من با تو ہستم جابجا　　من مصطفٰے را ہم خدا۔ من ملحد و بدنام
فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے۔
چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد　　موسیی با موسیی در جنگ شد
تجرید کا یہ نعرۂ مستانہ بھی سن لیجیے۔ جس میں قافیہ کی پابندی بھی ترک کر دی گئی ہے
سر برہنہ نیستم دارم کلاہِ چار ترک　　ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک
ان شطحیات کا ایک انبار ہے۔ اُن میں سے بہت سی ایسی ہیں جنکو نقل کرتے ہوئے کہنہ نا شناسے سرِ وحدت کا قلم لرزتا ہے۔ اور یہ ان حضرات کے اقوال ہیں جنکا ایک ایک لفظ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں بے بہا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

**علم و عقیدت کی جنگ** تمام ملتوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ یہی علم و عقیدت کی جنگ ہے۔ مصلح دیدۂ تحقیق سے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ اے قوم جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے کیونکہ یہ زہریلا سانپ ہے۔ مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں یہ تازیانہ ہے۔
بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت　　کہ با کہ باختہ عشق در شبِ دیجور
اس جنگ کے ہزارہا تماشے دنیا دیکھ چکی ہے لیکن ابھی تک بدستور اسکا سلسلہ جاری ہے۔ ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے قوم اُسکو جاہل، دشمنِ اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالی، ابن رشد، اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ صحیح بات دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلا وطن کیا جاتا ہے، کسیکو قید خانے میں جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جسکی بنیاد یقینی ہو۔ محض رسمی عقیدہ "عیارستانِ بازارِ تحقیق" میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

**تصوف اور اسلام** سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن و حدیث تصوف کے لفظ تک سے نا آشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری

صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقین یورپ و دیگر محققین جن میں سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے، کوئی اسکا ماخذ کلیساؤں کی رُہبانیت کو قرار دیتا ہے۔ اُنکی تحقیقات لکھنے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس مختصر مضمون میں اسکی گنجایش ہے۔ تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے اس سے جہانتک معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ابتدا ابتدا میں جو اہل زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہوکر عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے انکو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے۔ یعنی جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے فرمایا ہے

پیشِ طاقِ صوفیاں احساں بود اتباعِ سنت و قرآں بود

اُس زمانہ میں تصوف کمالِ اسلام کا نام تھا جسکو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جسکی مدح غزالی وغیرہ ائمۂ اسلام نے کی۔

لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کردی تو انکی ہولناک خوں ریزیوں سے امت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے۔ دنیا کی طرف سے اُنکے دل سرد ہوگئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں سست ہوگئیں۔ زوال و فنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد اور ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا۔ اور سرمایۂ توکل و قناعت کو لیکر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی اور ایسے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا کلاہِ نمدی کو تاجِ زر پر ترجیح دیگئی اور پکار اُٹھے

گوشۂ عافیت و کنجِ قناعت گنجیست
کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را
بفراغِ دل زمانے نظرے بماہروئے
بہ ازانکہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہائے وہوئے
کہ ہمہ نزدِ شاہانِ زمین گدا پیاسے
کہ بکوئے میفروشاں دوہزار جم بجامے
مے دو سالہ و معشوقِ چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر
شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں درو درج است
کلاہِ دلکش است اما بترکِ سر نمی ارزد

ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہوگیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلہ میں رہ و رسمِ پارسائی دور و دراز نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی۔ اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں۔ شریعت اور حقیقت دو جداگانہ راستے قرار پائے۔ انسان میں پوست اور مغز کی تفریق کیگئی علما و فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے۔ یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان تھا

لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا۔ اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہو گیا۔

شوکت اسلام کے زوال کے اسباب یوں تو پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً سیاست کی خرابی یعنی وہ جمہوریت جو اسلام لیکر آیا تھا جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا ہاتھوں سے جاتی رہی اور اسکے بجائے استبدادی حکومت قائم ہو گئی۔ جس نے تمام امت کو غلام بنا دیا۔ مسلمان بیگناہ قتل کر دیے جاتے تھے۔ ائمہ و علماء جو اپنے اپنے زمانوں کے روشن چراغ تھے بیشتر زیر عتاب، زیر خنجر یا زیر طوق و زنجیر رکھے جاتے تھے۔ اور حق گو زبانیں اسقدر خاموش کر دی گئی تھیں کہ ان مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔ اس طرح پر مسلم حریتِ عمل سے محروم کر دیا گیا۔ پھر علمی تقلید جس سے حریتِ فکر بھی جاتی رہی۔ یہ شکنجہ ایسا سخت تھا کہ ایک زمانہ میں یہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی کہ اہلِ علم اس خوف سے کہ کہیں کوئی دشمن اُنکے اوپر تہمت لگا کر قتل نہ کرا دے اپنی صحتِ عقیدہ کی سند قاضی سے لیکر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ اسلام میں بیرونی عنصر کے شمول سے جو جمود پیدا ہوا اُسنے بھی بہت کچھ ان اسبابِ زوال کو تقویت دی اور خاصکر ہندوستان میں تو اسلام کی حالت اور بھی خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم شخص یعنی قومیت کا مبصرِ اعظم ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب تمدن ہند میں یہاں کے مسلمانوں کی نسبت یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ

> وہ اسلام جو اسوقت ہند میں رائج ہے اسکی حالت بھی بالکل ویسی ہی ہو گئی ہے جیسے ہند کے اور مذاہب کی اس میں ساوات بھی قائم نہیں جسکی وجہ سے اوائل میں اسکو اس قدر کامیابی ہوئی۔

پھر ایک جگہ لکھتا ہے

> ہندوستان کے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس مذہب کی یہاں کیسی کچھ خرابی ہوئی ہے

ڈاکٹر صاحب نے رموز بیخودی میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسمیں کچھ بھی شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے

| | |
|---|---|
| مسلم از سرِ نبی بیگانہ شد | باز این بیت الحرم بتخانہ شد |
| از منات و لات و عزی و ہبل | ہر یکے دارد بتے اندر بغل |
| شیخ ما از برہمن کافر تر است | زانکہ او را سومنات اندر سر است |
| رخت ہستی از عرب بر چیدہ | در خمستانِ عجم خوابیدہ |

شل ز بر فاب عم اعضاے او — سرو تر از اشکِ او صہباے او
ہچو کا فر از اجل ترسندۂ — سینہ اش فارغ ز قلب زندۂ

قرآن شریف میں نص قطعی موجود ہے" ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا" پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے محروم ہوگئے؟ میرے خیال میں اسکا جواب صرف یہی ہے جو قرآن شریف دیتا ہے" ان قومی اتخذوا ہذا القرآن مہجورا" ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست — از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش

**خاتمہ کلام** | گزشتہ مصنفین دیباچے میں یہ التماس لکھا کرتے تھے کہ " ناظرین اگر کوئی سہو وخطا دیکھیں تو دامنِ عفو وعطا سے چھپا ئیں" لیکن اب عفو وعطا کا زمانہ گذر گیا - لوگ ایک ایک لفظ پر گرفت کرتے ہیں اور غلطیوں کو چھپا کر نسل در نسل نہیں چلنے دیتے - ڈاکٹر صاحب کی مثنوی اسرار خودی پر فارسیت اور شاعری کے لحاظ سے بہت کچھ بحث ہو چکی ہے اسلیے اسکے متعلق میں کوئی خاص بات لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا - علاوہ بریں اُنھوں نے آغاز مثنوی میں خود ہی کہدیا ہے -

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست — بت پرستی بت گری مقصود نیست
ہندیم از پارسی بیگانہ ام — ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسنِ انداز بیاں از من مجو — خوانسار و اصفہاں از من مجو

لیکن مثنوی رموزِ بیخودی کی نسبت کچھ لکھنا البتہ ضروری معلوم ہوتا ہے - کیونکہ عیارستانِ بازارِ علم میں یہ ابھی ایک متاعِ تازہ ہے - اور پیرزادہ صاحب فرماتے بھی ہیں -

ہچوں شمشیر از قراب آیم بروں — آفتا بم از سحاب آیم بروں
شانہ گردانی کنم از شاعری — بزم پرہم قسم شاعری

پیرزادہ صاحب کی فارسیت اعلیٰ درجہ کی ہے - زبان پر انکو قدرت معلوم ہوتی ہے، بیان میں شوکت اور شگفتگی ہے اور طرز بیان دلکش اور مطبوع ہے - تخیل میں بلندی اور جدت، تشبیہوں اور استعاروں میں طرفگی اور ندرت ہے اور باوجود صوفیانہ رنگ کے کلام میں شاعرانہ لطافت ہے - لیکن

کہیں کہیں ناہمواری بھی معلوم ہوتی ہے اور جابجا غیر مانوس الفاظ بھی ملتے ہیں مثلاً نگیب۔ جنگک فریود۔ فرزود۔ فربارہ۔ پاچایہ۔ مولو۔ وغیرہ۔ بعض بعض الفاظ میں مکروہ تصرف بھی ہوا ہے مثلاً

(صفحہ ۶) می دہم سر دہ بجگر سیل سرشک     آب بہ آتیش سوزاں می زنم

قدما نے ضرورتِ شعری سے آتش کو آتیش بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن متاخرین میں متروک ہے۔

(صفحہ ۱۲) شعشعۂ اول کہ زد تاب شہود     تاب زا، جلوۂ لولاک بود

لفظ شعشعہ ہے۔ دوسرا عین گرا کر اسکا استعمال صحیح نہیں ہے

(صفحہ ۲۹) کنت کنزاً مخفیاً رادور بود     بہ دو دارم ہم غیب وشہود

(صفحہ ۱۷) بو ذر احد بر زند عمرؓ کجاست     المدد ضرار بن ازور کجاست

پہلے شعر میں مخفیا تخفیف یا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے میں عمر اور ضرار دونوں کی تشدید ناگوار ہے۔

انحراف از حرف و بطلانِ حق     اعترافِ گفت او بیانِ حق

اس شعر میں بطلان جو لازم ہے اُسکے معنی ابطال کے لیے گئے ہیں جو متعدی ہے۔ اور یہ لغت کی رو سے صحیح نہیں

(صفحہ ۲۵) چوں خیالِ خود گذشتم از فلک     با ملک ہا راز کردم چوں ملک

(صفحہ ۲۹) نامے از نام آورانہا چوں شدے     ہمچوں لعل از رشک حسرت خوں شدے

پہلے شعر میں جب ملائک آ سکتا تھا تو بقاعدہ جمع ملک ہا کیوں لائی گئی۔ راز کردن محاورہ بھی ٹھیک نہیں ہے

دوسرے شعر میں نام آوران کی جمع الجمع غیر فصیح ہے۔

(صفحہ ۳۰) آسماں آسیمہ از اقبالِ او     در جنون گردش از جنجالِ او

(صفحہ ۸۲) بسکہ چشم او ز خر ترسیدہ بود     پا بہ رفت و خیز نفرت می کشود

(صفحہ ۹۲) گردنِ ضحاکِ گردوں خم کنم     عرضۂ تیغ دمار غم کنم

رفت و خیز نفرت اور تیغِ دمار دونوں اضافتیں غیر مسموع ہیں اور مکروہ معلوم ہوتی ہیں۔ علاوہ برین پا کشودن کا محاورہ غلط ہے۔ جنجال ہندی لفظ ہے۔

کہیں کہیں الفاظ مطلب ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً

(صفحہ ۶۰) رازِ مولودش چو بر روز اوفتاد     بہ رخ عالم در عشرت کشاد

(صفحہ ۶۳) ما زہستی شائے ناما ہنوز     انتظارِ وعدۂ فردا ہنوز

پہلے شعر میں راز مولود کا لفظ مفہوم مقصود کو ادا نہیں کرتا۔ دوسرے شعر میں پہلے مصرعہ کا کچھ مطلب نہیں نکلتا شاید کاتب نے کچھ غلطی کی ہو۔

(صفحہ ۴۹) با ملی از قرب نفی اعلیٰ حق شود زندگانی ہستی مطلق شود

اس شعر میں باطل سے مراد بندہ ہے۔ پھر بندہ کے لفظ میں کیا قباحت تھی۔ حدیث کا ترجمہ بھی صحیح ہو جاتا۔

اسلم۔ جیراجپوری

# جذبات حقیقی

(سیدنا امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرثیہ قصیدے کی تشبیب)

میں اپنی جان پر کھیلے ہتھیلی پر لیے سر کو
چلا ہوں امتحاں گاہ وفا میں چھوڑ کر گھر کو

مرا شوق شہادت اک دن منہ چڑھی لیگا
سواد مقتل عشاق کو قاتل کے خنجر کو

ہزاروں آفتیں آئیں مگر ہمت نہ ہاروں گا
قدم کیا چیز۔ سر سے طے کرونگا کوے دلبر کو

بلاؤں پر بلائیں جھیل لونگا شادماں ہو کر
تڑپنے پر بھی روکے ہی رہونگا قلب مضطر کو

نہ جھجکوں گا قسم ہے جذبۂ شوق شہادت کی
لگا لوں گا گلے سے دوڑ کر قاتل کے خنجر کو

ستم پر جب ستم ہونگے بڑھے گی اور بھی ہمت
میں اپنے ضبط سے حیرت میں ڈالونگا ستمگر کو

جفائیں ہوں تو ایسی ہوں کہ شکوے سے دل کانپے
وفائیں ہوں تو ایسی ہوں کہ رلوائیں جہاں بھر کو

کہیں وہ دن بھی جلد آئے کہ ہو بوچھار تیروں کی
ہدف کرنے کو ہے جانباز اپنے قلب مضطر کو

ہنسوں گا صورت گل۔ زخم پر جب زخم کھاؤں گا
رضائے دوست کی خاطر نہ روؤنگا مقدر کو

خلش تلووں میں ہوتی دمبدم دل سے گوارا ہے
رگ جاں سے سوا سمجھونگا خار راہ دلبر کو

بلائیں مختلف شکلیں بدل کر آئیں گیا پروا
ہر صورت میں آئینہ کرونگا اپنے جوہر کو

جواہر ریزے ہیں آنکھیں مرے دل کے خزانے سے
میں ڈھونڈوں کس لیے سنگ و صدف میں لعل و گوہر کو

رہے وہ خوش تو ہے تخت سکندر بوریا مجھکو
بغیر اسکی رضا کے کیا کروں گا ہفت کشور کو

نگاہِ دوست میں ہیں بے حقیقت ہو جہاں سارا
لٹا دوں گا میں اسکی راہ میں اک دن گھر بھر کو

یہ خنجر اشاروں میں نیاز و ناز کی باتیں
کبھی خنجر پھرائیں گی کبھی روکیں گی خنجر کو

ملے گی از سرِ نو اک حیاتِ جاوداں مجھکو
رضائے دوست کی خاطر لٹا دونگا اگر سر کو

اگر بھولے سے مجھکو لطفِ ساحل یاد آئے گا
میں رو کر دکھا دونگا اپنے دامن میں سمندر کو

نگاہِ رحمت ایسے دُرِّ ناسفتہ کی گاہک ہے
سر بازارِ محشر لے چلوں اشکوں کے گوہر کو

رہوں گا دم بخود گو دردِ دل کا دم نہ لینے دے
میں اپنے صبر کے جوہر دکھا دونگا جہاں بھر کو

زمانہ خون رو رو کر جلی حرفوں سے لکھے گا
مرے ایفائے وعدہ کو مری ہمت کے دفتر کو

نہ چھوڑینگے وہاں زخمِ پیکاں تیرِ قاتل کے
یہ ذوقِ لذتِ آزار ہوگا غم کے خوگر کو

میں خوش ہوں لاش کبھی پامال ہو جائے تو ہو جائے
دکھائے گا تنِ صد پارہ عبرت خیز منظر کو

کئی دن تک فلک سا سنگدل بھی خون روئیگا
نہ پھروں چین آئیگا زمیں کے قلبِ مضطر کو

مٹا نیوالے میرے خود فنا ہو جائینگے اک دن
زمانہ روز دُہراتا رہے گا غم کے دفتر کو

مرا دعویٰ نہیں کچھ ۔ سوزِ الفت کا یہ دعویٰ ہے
بشر کا دل تو کیا ہے موم کر دونگا میں پتھر کو

ہے کافی بے نواؤں کو زمینِ گرم کا بستر
مبارک سایۂ چترِ زری شاہانِ خود سر کو

ہزاروں انقلاب آئیں تو آئیں مجھکو ڈر کیا ہے
میں رکھوں گا ہمیشہ اپنے قبضے میں جہاں بھر کو

دکھائیگی عجب انداز سے صبحِ قیامت تک
زمینِ کربلائے عشق شامِ غم کے منظر کو

وہی کچھ عشق کی جانکاہیوں کو خوب سمجھے گا
جو خود طے کر چکا ہو خار زارِ فتنہ و شر کو

وہ لذت گیرِ کاوش ہوں کہ پھر میں سازِ غم چھیڑوں
ٹھہر جائے اگر میرا دلِ بیتاب دم بھر کو

—سید محمد جعفر قدسی (رمائی)

# ہندوستانی پالٹیشین

اگر ہم گذشتہ ایک صدی پر تنقیدی نظر ڈال کر اُن جملہ تغیرات مادی و خیالی اور اُن جملہ موجودات کی فہرست بنادیں جو ہمارے ملک میں مشرقی و مغربی تمدن کے تصادم سے معرض ظہور میں آئی ہیں تو سب سے زیادہ دلچسپ شے جو نظر کو خیرہ کرتی ہے وہ ہندوستانی پالٹیشین ہے۔ یہ ایسا عجیب الہیئت وجود ہے کہ ہندوستانی زبان نے کچھ تو عجیب الخلقت ہونے کی وجہ سے لیکن زیادہ تر وہم وضعف الاعتقادی کے باعث اور عوارض و حوادث زمانہ کے خوف سے ابھی تک نام بھی نہیں رکھا ہے۔ قدرت کے طریقوں میں عجیب ستم ظریفی ہے۔ بیشتر اوقات موت و زندگی کے اسباب، زہر و تریاق، ایک جگہ پائے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ حضرت پالٹیشن مشرقی و مغربی تمدن کی کیمیائی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جو امراض انکے واسطے جونکا ثابت ہوئے ہیں وہ انھیں حضرات کے زیادہ جماؤ اور ہندوستانی اور یوروپین پالٹیشنوں کے ارتباط سے پیدا ہوتے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں ان کے میل جول، خوش فعلیوں اور جلسوں نے ایسے گل کھلائے ہیں کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو جیسی عجلت اور بے اٹکلی سے یہ وجود کے میدان میں کودے ہیں بالکل اُسی سرعت کے ساتھ مفقود بھی ہو جائیں گے اور ایسے صاف غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اگر انکی بقائے نسل منظور ہے تو اصول حفظان صحت کو مد نظر رکھکر ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ جمع نہ ہونے پاویں۔ اور انکے بلا ضرورت میعادی جماؤ کے انتشار کے واسطے ایک ایکٹ پاس کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں البتہ امید ہوسکتی ہے کہ مادر زبان کو نام نہادی کی رسم ادا کرنے کا موقع باطمینان مل سکے۔ کوئی خاص نام نہ ہونے کی وجہ سے عجیب و غریب دقتوں کا سامنا ہوتا ہے جب کوئی پالٹیشن نظر آتا ہے۔ اول تو اشاروں سے کام لیا جاتا ہے اور جب انگشت نمائی کے الزام کا خوف غالب ہوتا ہے تو بہ مجبوری انگریزی زبان سے عارتیاً مانگ کر پالیٹیشن کا لفظ کہدیا جاتا ہے اور تکلیف دہ مخمصہ سے نجات ملتی ہے۔ امید ہے کہ ایسا لفظ بہت جلد اختراع کیا جائیگا جو مرد و عورت، بوڑھے اور جوان۔ داڑھی دار اور داڑھی منڈے، پگڑی باز اور ننگ سرے، ایماندار اور بے ایمان، لائق اور نالائق، ہوشمند اور مخبوط الحواس، تعمیل پسند اور رہل اختار، فیر دل اور روباہ منش وغیرہ وغیرہ سب پر حاوی ہو۔ فی زمانہ اگر مولوی یا پنڈت کو پالیٹیشن کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی جاوے تو گھنٹے، دن، بلکہ مہینے گذر جاویں تو بھی یقیناً انکی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

بضرور جانتے ہیں کہ انکا قریبی تعلق یا رشتہ دار ہی ایڈیٹر، نامہ نگار، رائٹر، یا وہ اس کمیٹی یا لکھنؤ کے شہدوں سے ہے۔ اور خاندانی اوصاف جاو بیجا نکتہ چینی، بدزبانی، اور دست طلب کی موقع وبے موقع درازی ان جملہ حضرات میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ بلا تکلف ہر امر پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ "چھوٹا منہ بڑی بات" کی ضرب المثل انکی چڑھ ہے۔ دراصل یہ ایسا ہمہ گو اور ہزار پہلو وجود ہے کہ چشم روزگار کو باوجود اس پیانہ سالی کے انکا مثل دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ہمارے ہندوستانی بھائی جن کے سر میں ابھی تک یکرنگی، وضعداری، کم گوئی وغیرہ کے از کار رفتہ خیالات گونج رہے ہیں اگر انکو پوری طور سے نہ سمجھ سکیں تو استعجاب کی گنجایش نہیں۔ اور قابل معافی ہیں۔

زمانہ کے تغیر پسند ہاتھوں نے ہمارے اخلاق میں محض سطحی تبدیلیاں کی ہیں۔ جسکی وجہ سے دورنگی بلکہ ہزار رنگی، گندم نمائی جو فروشی اور منافقت کے مقتدر اوصاف کا ہم میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لہو و لعب کے اب تک ہم اُتنے ہی بلکہ اُس سے زیادہ متلاشی ہیں جتنے کہ کچھ دنوں پہلے تھے۔ صرف نوعیت تفریح میں ضرور فرق آگیا ہے۔ مثلاً کبوتر بازی کے بجائے اب لفظ بازی کا شوق دامنگیر ہے۔ الفاظ کے جھنڈ کے جھنڈ جمع کر کے اسپیچ کے وقیع نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ جلسے مرتب ہوتے ہیں جن میں اُنکو ہوا میں اڑایا جاتا ہے۔ ایک فریق دوسرے کے الفاظ کا اپنی تقریر میں حوالہ دیتے ہیں اور معنی پہنا کر اپنی قابلیت کی داد چاہتے اور خود ستائی سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اسکی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی اور نہ ارادہ ہوتا ہے کہ الفاظ کا معنی دنیائے عمل میں کبھی بھی نمودار ہو۔ کانگریس پلیٹ فارم پر ہمقومی، عصبیت، اخوت اور یگانگت کا دم بھرتے ہیں لیکن اُس سے علٰحدہ ہونے کے بعد اپنے ہر فعل سے ان قابلِ فخر خیالات کی ضد پر کاربند ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔

اسی طرح کانگریس اور کانفرنس وغیرہ میں زیادہ جانے کی وجہ بیشتر اوقات تفریح ذاتی ثابت ہوتی ہے۔ اسپیچ کا تھوڑا حصہ سننے اور کانگریس پنڈال میں منہ دکھلانے کے بعد عموماً پالیٹیشین اُس شہر کے ملاحظہ میں مصروف ہو جاتا ہے جہاں یہ جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ اور شام کو تو ہر گلی کوچہ میں پالیٹیشین ہی پالیٹیشین نظر آتا ہے۔ جو حضرات بوجوہات کوچہ گردی سے مجبور ہیں وہ ایسے فریضۂ اخلاقی کو اپنی جائے قیام پر باحسن طریق ادا کرتے ہیں۔

چونکہ اس لفظ بازی کے زمانہ میں الفاظ ہی کے متعلق بقدر ہمت و وسعت خود ہمارے ملک میں

نزاعات بین الافراد پیدا ہوتے ہیں جو بالآخر مذہبی اختلافات کا لباس پہنا کر فرقہ بندی کے خیالات کی بنا قرار دیے جاتے ہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پالیٹیشین کے مفہوم کی تشریح اور انکی ماہیت کی توضیح بنظر فائدۂ عامۂ خلائق کردی جاوے۔

چونکہ ما علیہ (Denotation) کے ذریعہ سے انکا تذکرہ غیر ممکن ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے اسلیے اصول ما لہٗ (Connotation) کو مد نظر رکھکر ہم چند خاص خاص اوصاف کا تذکرہ کیے دیتے ہیں تاکہ اُن حضرات کو جو اس نئے وجود سے ناواقف ہیں کسی قدر آگاہی ہو جاوے اور ان حضرات سے برتاؤ میں غلط فہمی کی گنجایش باقی نہ رہے —— اس مسلم الثبوت دعوے سے کسی اہل نظر کو انکار نہیں ہو سکتا کہ "پالیٹیشین بنائے نہیں جا سکتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں"۔ ہمارا پالیٹیشین اسکی زندہ مثال ہے۔ پولیٹکل اور سیاسی مادہ انکی سرشت میں بمقابلہ عوام کے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ انکی ہر حرکت سے سیاسی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ سیاسی احساس اُسی وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ آپکی حالت محض جنین کی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ منزل وجود نہایت بےچینی و بیقراری کے ساتھ طے کی جاتی ہے بلکہ حاذق اطبا کی رائے کے مطابق بیشتر اوقات اسقاطِ حمل کا باعث اس قوت کی ملیت بصیرت اور زیادتی ہوتی ہے۔ بیزار وقت و خرابی مدت اور زمانہ کی ناخوشگوار پابندی کے دن پورے کیے جاتے ہیں اور وجود میں آتے ہی ہمارا پالیٹیشین سیاسی بدنظمیوں کے احساس سے شور و بکا شروع کرتا ہے اور ساری عمر نہایت وضعداری کے ساتھ شکایت و فریاد میں بسر کر دیتا ہے۔

ہاتھ پیر پر قابو ہوتے ہی سیاسی قوت دوسری صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ جس چیز پر ہاتھ پڑا منہ میں داخل۔ یہ اُس خودغرضی کا بلا آمیزش اظہار ہے جو ساری دنیا کی پالیٹکس کی بنا، صدہا بلکہ ہزارہا سال سے بلاحجت مانی گئی ہے۔ اگرچہ رنگین و ابلہ فریب الفاظ کا لباس اسکو قریب قریب ہمیشہ پہنایا گیا ہے۔ ہمارے پالیٹیشین پر اس اعلیٰ اصول سے انحراف کا الزام اُنکا دشمن بھی نہیں رکھ سکتا۔ مدۃ العمر اس اصول کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔ اور انکے ہر قول و فعل کے پس پشت ذاتی غرض کا ہیولے ارباب نظر کو دکھلائی دیتا ہے۔ ہمارا پالیٹیشین ابھی اتنا ذلیل نہیں ہوا ہے کہ الفاظ کو مصنوعی معنی پہنا کر "ذات" کے معنی "ملک" یا "قوم" قرار دے اور مغربی ممالک کے فدائیان قوم کی طرح اپنے نفس کو فراموش کر کے ہر کوشش ملک یا قوم کی بہبود و فلاح کے واسطے کرے۔ بلکہ وہ ابھی تک قدرت کے بنائے ہوئے

سچے اصول پر کاربند ہے۔ اور "اوّل خویش بعدہٗ درویش" کو اسکی رائے کے موافق ترمیم ہو کر "اوّل خود بعدہٗ خویش" ہونا چاہیے۔ تاکہ خدانخواستہ اگر اس ضرب المثل کے دوسرے حصہ پر عمل کی نوبت کبھی خلافِ امید و قیاس آ بھی جائے تو بھی بیچارہ درویش مستفید نہ ہونے پائے اور خیرات اعزا و ذات بھائی تک محدود رہے۔

زبان پر قابو ہوتے ہی ہمارے پالیٹیشین کا شوقِ تحقیقات زور کرنے لگتا ہے۔ اور عمر بھر رہتا ہے۔ ہر چیز کی بابت کچھ نہ کچھ سوال کر ہی دیتا ہے۔ "یہ کیا" "یہ کیا" کے متواتر سوالات بیچارے والدین کو اسی طرح عاجز کر دیتے ہیں جس طرح کہ کاؤنسل میں آنریبل ممبران کے ناسمجھی کے سوالات گورنمنٹ کے سکریٹریوں کو۔ پوچ سے پوچ سوالات کا جواب نہایت سنجیدگی سے کھڑے ہو کر دیا جاتا ہے۔ کیا مجال کہ چہرے پر ذرا بھی شکن آ جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سکریٹری صاحبان کا صبر و تحمل متانت و ظرافت قابلِ تعریف ہے۔ انکو اس اجتہاد کا صلہ یقیناً عاقبت میں ملے گا۔ راقم الحروف کی اب تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سائلان کی قرار واقعی آؤبھگت کیوں نہیں کر دی جاتی اور قیمتی وقت کے ضائع کرنے بلکہ بے جگری سے قتل کرنے کو کیوں روا رکھا گیا ہے۔ چپراسیوں کو کیوں نہیں حکم دیا جاتا کہ ان حضرات کو "باہر دکھلائیں"۔ شاید یہ نظر انداز ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں تہذیب و تنبیہ تعلیم کا جزوِ لاینفک ہے۔ اگر چھڑی کی بے محل حفاظت کی گئی تو پالیٹکس کے مکتب کا مبتدی ضرور خراب ہو جائیگا۔

بہر حال:—

امورِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند　　گدائے گوشہ نشینی تو راتقا مخروش

شکر کی تو یہ بات ہے کہ ہمارا پالیٹیشین جواب پا کر خواہ کتنا ہی غیر متعلق اور بے معنی کیوں نہ ہو نہایت درجہ محظوظ و مطمئن ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ملک در قوم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ جس سے ہر ہندوستانی فرداً فرداً سر نہیں اٹھا سکتا۔

"حقیقت نگار"

معمورۂ دارِ دنیا کچھ نہیں　　ہے طلسمی کارخانہ کچھ نہیں
اک دلِ بے آرزو پہلو میں ہے　　شکر ہے میری تمنا کچھ نہیں
حضرت موسیٰ سے کو وہ طور پر　　تجھ کو یوں دیکھا کہ دیکھا کچھ نہیں
نوجوانوں سے نہ ہو ناصح خفا　　عمر کا ہے یہ تقاضا کچھ نہیں
چاہیے دل میں فراتیشی دردِ خلق　　ورنہ بیدردوں کا جینا کچھ نہیں

# ہماری شاعری کی نوائے غم

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

لٹریچر کو بجا طور پر کسی قوم کے طرزِ زندگی اور معاشرت کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ حیاتِ قومی بہت سے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں سے بعض انسانی طاقت کے زیرِ اثر اور بعض اس سے باہر ہوتے ہیں۔ مثلاً آب و ہوا، طبعی خصوصیات اور گرد و پیش، سیاسی آزادی یا سیاسی تابعیت اور غلامی۔ فنِ ادب پر ان اثرات کا نتیجہ ایسا نہیں ہوتا جسے نظرانداز کیا جا سکے۔ ایشیا میں چند اقسام کی شاعری شاذ و نادر ہی ظہور پذیر ہوئی ہوگی۔ مشرق بحری شاعری نا آشنائے محض ہے۔ یہاں کی فضا میں ملٹن، شیلے، اور وکٹر ہیوگو جیسے شاعروں کے نغمہائے حریت و آزادی بہت کم گونجے ہیں۔ ہمارے افقِ کلام پر ہمت افزا امید اور درخشاں مستقبل کا وہ ستارہ بہت کم طلوع ہوا ہے جس کی چمک براؤننگ اور ٹینی سن کے اوراق پر نظر آتی ہے۔ نہ ہمارے پاس کوئی شے ایسی ہے جس کا مقابلہ ہم نیچر کی اُس کیف آور اور وجدانی پرستش سے کریں جو ورڈزورتھ کا مذہب تھی۔ ہماری شاعری کا تعلق مادی نیچر یا سیاسی آزادی سے بہت کم رہا ہے اور ہماری شعرا کی تمام مساعی، قوت اور ذکاوت انسان اور اُس کے انجام سے متعلق رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں وہ وسعت اور رنگارنگی نہیں پائی جاتی جس پر مغربی شاعری ناز کرتی ہے۔ لیکن اپنے مخصوص دائرہ میں ہمارے شعراء بجا طور پر بے نظیر اور لا مثال قرار دیے جا سکتے ہیں۔

مشرقی لوگ خلقی طور پر تصوف، سوز و گداز اور تخیل کا رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ واقعات کی عریاں تصویر کو سورج کی تیز روشنی میں دیکھنے کے بجائے تخیل کی عینک کو کام میں لاتے ہیں اور نوشتۂ تقدیر پر صابر و شاکر رہ کر انسانی کوششوں اور خواہشوں کو فضول اور بے سود اور زندگی کو گردشِ آسمان اور اتفاقات کا تابع سمجھتے ہیں۔ نہ اس وجہ سے کہ یہ ہمارے مذہب کی تعلیم ہے بلکہ اس وجہ سے کہ روزانہ زندگی کے واقعات اور زمانہ گذشتہ کا تجربہ دونوں ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ حیاتِ انسانی میں کوئی چیز یقینی اور استوار نہیں ہوتی: موسمی وبا ایک ہی ہلے میں سیکڑوں ہزاروں گھر صاف کر دیتی ہے۔ حاکمِ وقت کا ایک ادنیٰ اشارۂ چشم لوگوں کو معزز یا ذلیل بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اگر ایک سال بارش نہ ہو تو زمیندار کی بہترین کوششیں بھی فصل کو جل جانے

اور لوگوں کو نہ قحط و گرسنگی سے نہیں بچا سکیں۔ نتیجہ یہ اس قدر ہوا اس درجہ کا دارومدار ہی اس امر کا باعث ہے
کہ لوگ "قسمت یا نصیب" کہکر اپنے امور کو تقدیر پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جس وقت یورپ اور ملکوں کے لوگ بدقسمتی
کے خلاف جنگ کرینگے وہاں ہندوستان کے باشندے بالعموم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور سمجھیں گے
کہ مشیت ایزدی یوں ہی ہے۔ جوں جوں ملک ترقی کرتا جاتا ہے ہماری زندگی میں دشواری اور کشمکش بھی بڑھتا
جاتا ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ ہماری شاعری کی لے بھی بدلتی جارہی ہے اور شعرائے حال کے غبار آلود آئینہ میں
مستقبل کا صاف اور خوفناک چہرہ دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن پچھلے ہزاروں برس میں جن مشاہدات سے ہماری آنکھیں
آشنا رہی ہیں اور جو خیالات ہمیں صدیوں سے ورثہ میں ملتے چلے آئے ہیں ان کا نقش مٹتے ہی مٹتے مٹے گا۔ یہی وجہ ہے
کہ ہماری شاعری کا پیچ و خم صبر و رضا، غم، سکون اور خود فراموشی رہا ہے۔ زندگی سے تھک کر ہم مذہب اور تصوف کا سہارا
ڈھونڈتے ہیں۔ اور دنیا کی ناپائداری اور دنیاوی جاہ و حشمت کی بے ثباتی کا گیت گاتے ہیں۔ تصوف کی
چاشنی، عشق حقیقی کے جلوے، خدائے تعالیٰ کی حمد و ثنا میں پرجوش اور وجدانی زمزمہ آرائیاں، انسانی
کوششوں کی ناکامیابی اور انسانی قوت ارادی کی کمزوری پر اظہار تاسف، یہ سب ہماری شاعری کے امتیازی
نشان رہے ہیں۔ شعرائے اردو کے کلام میں ہم ایک عمیق غم اور گہرے درد کا اثر پاتے ہیں گویا کہ [illegible]
سے سیر اور تنگ ہو گیا ہے۔ ہماری شاعری شروع سے آخر تک نغمہائے غم سے لبریز ہے۔ اس میں دنیاوی
اولوالعزمیوں اور دنیاوی ترقی اور عیش و آرام کے خوابہائے شیریں کی بے ثباتی کی جھلک پائی جاتی ہے
مرزا سودا کا یہ کہنا خالی پرواز تخیل ہی نہ تھا کہ

میں جوں طاؤس آتش بار کیسی ہی بہار آئے — تو با صحرا بہر سو دارم نہ با گلزار سودائے
بہر سو می روم از خویش ہیچ شد تماشائے

یا میر تقی کا اظہار مایوسی کہ

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے — خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
مہلت یہ قلیل جسکو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

یا ناسخ کا یہ شعر

بےقید کیا کلفت ایام نے مجھکو — گوہر تو ہوں لیکن ہوں نکالا گرہ سے میں

نہیں۔ بلکہ ان شعرا کی زندگی رنج و مایوسی کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ تھی اور ان کا پرگداز اور غم انگیز کلام ان کے

جذباتِ دروں کا اظہار اُنکی زبردست فطرت کی تہ میں ایک کشمکش، ایک بےچینی، ایک سکون ناآشنائی سی ہمارے قلوب پر ایک گہرے غم کا اثر چھوڑتی ہے۔

یہی سوز تھا جو میر انیس و مرزا دبیر کے مراثی کی شکل میں جلوہ گر ہوا۔ اسی درد کا اثر تھا کہ عہد قدیم کے عدیم النظیر باکمال اور عہد جدید کے پیشرو مرزا غالب ایسی وغم کے لمحوں میں پکار اُٹھے

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

لیکن ہمارے شعرا کی یہ نوائے غم اُس شخص کے رنج و ملال کے مانند نہیں ہے جو ذوقِ محبت سے ناآشنا ہو اور اہلِ دنیا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہو بلکہ یہ اس ہستی کے ساز سے پیدا ہوتی ہے جو جد و جہد اور کشمکش کی دنیا کو پیچھے چھوڑ کر اٹل اور ناقابلِ تغیر نوشتہ تقدیر کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر چکی ہو۔ ہم اکثر سنتے ہیں کہ ہندوستانی شاعری غم افزا ہے۔ لیکن میں اُس پُرکیف غم کا اظہار کیسے کروں جو بجائے کرب کے تسکین پیدا کرتا ہو۔ کیا ایک عاشق فراقِ محبوب کے باوجود حقیقی معنوں میں خوش ہو سکتا ہے! کیا ایک شاعر اپنی جلا وطنی یعنی حیاتِ دنیاوی کے زمانے میں، خوشی، سچی اور حقیقی خوشی کے راگ گا سکتا ہے؟ عام طور پر فراقِ معشوقِ مجازی کو غم افزا اور وصل کو اندوہ ربا کہا جاتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بلند فطرت طبیعتوں میں وصالِ دلربا کے باوجود بھی ایک طرح کی بےچینی اور بیتابی باقی رہتی ہے اور روح کو کسی گم گشتہ شے کی تلاش ہوتی ہے۔ جس طرح کہ آنکھ دنیا کے ورلیے بے پایانِ حسن کی سیر کر کے کسی اور نظارے کی متلاشی رہتی ہے اُسی طرح روح کو دنیا میں وصالِ محبوب سے تسکین نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم ایک سرخ و سفید مٹی کی مورت کی پرستش نہیں کرتے ہیں بلکہ اُس پوشیدہ جلوے کی جو جسم اور شخصیت کی نقاب کے نیچے مستور ہوتا ہے۔ اُس روحانی پیاس اور بےچینی، اور ازلی زندگی کے مقابلہ میں حیاتِ دنیاوی کی ناپائداری کے یقین نے ہماری طبیعت میں جو خلقی طور پر مذہب پسند واقع ہوئی تھی ایک تسکین بخش اور پُرکیف غم پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نغمہائے غم سے لبریز شاعری لاانتہا کے امن اور شانتی سے پُر اور مذہب کے ساتھ رشتۂ اتحاد مستحکم کر کے دل کی عمیق ترین تمناؤں اور وجدانی کیفیتوں کی مظہر ہے۔ مغربی شاعری میں روزانہ زندگی کی حقیقتیں ملی ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف ہماری شاعری کی پرواز حیاتِ انسانی کے واقعات سے بالاتر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس میں اسقدر لطافت پائی جاتی ہے گویا کہ وہ قلوبِ انسانی اور دنیا کے پوشیدہ ترین اور ناقابلِ اظہار اسرارِ سربستہ کو افشا کرنے کا مشن انجام دینے آئی تھی۔

مغربی شاعری دن کی دُنیا کے مانند ہے جو نہایت ہی پُر رنگ اور بوقلموں نغموں کے سامنے پیدا ہوتی ہے اسکے برخلاف ہماری شاعری کو جو ایک پاکیزہ، عمیق اور لطیف گنگنی سے مانند ہے شب کی دُنیا سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دونوں اقسام کی شاعری ہمارے دلوں میں توجہ پیدا کرتی ہے لیکن اثر کی نوعیت جداگانہ ہے۔ ہم لوگ عالم شب کے دلدادہ ہیں اور ایک وا حد لا محدود ذات کا پرتو ہمیں یہ دنیا دیتا ہے۔ ہماری شاعری روح کو روزانہ زندگی کی خوشیوں اور غموں کی قیود سے رہا کرکے ایک اور عالم میں لیجاتی ہے جو اس مادی دنیا سے پرے ہے۔ اسکے برعکس مغربی شاعری رنج وراحت کے ابدی مدوجزر میں ہماری روح کو رقص کراتی ہے۔ جس طرح ہماری فطرت تصوف اور مذہب کی دلدادہ ہے اسی طرح ہماری شاعری روحانی تسکین اور شانتی بخشنے والی ہے۔

زبان ترقی کرتی ہے۔ مذہب میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ لوگوں کے مذاق دوسری روش اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ختم نہ ہونے والے تغیرات اور اختراعات، سوشل زندگی اور رسم و رواج کی تبدیلیاں انسان کے سرمایۂ علم میں ہمیشہ جاری رہنے والی گھٹ بڑھ ——— ان سب باتوں کے باوجود انسانی فطرت کا بدلنا بہت مشکل ہے۔ تکلیف اور مصیبت، حیات اور موت کے رازہائے سربستہ، نہ برآنے والی امیدیں اور ناکامیِ محبت کا افسوس، افلاس اور غربت کے دُکھ، قسمت اور نصیب کے برخلاف ناکامیاب جنگ، یہ ہیں مضامینِ غم کی وہ سرخیاں جو انسان کے دل ودماغ کو گرویدہ بناکر اسے اسفل سے اعلیٰ بنادیتی ہیں رنج وراحت کی شاعری وہ مضراب ہے جو ابدالاباد تک انسان کے دل میں وجدانی نغمے پیدا کرتی رہیگی۔ اُردو میں میر تقی، مومن، ذوق، آتش، انیس اور غالب شاعری کے اُس پایہ تک پہونچ گئے ہیں جہاں بقائے دوام کا تمغہ ملتا ہے۔ یہ وہ مسلم الثبوت اُستاد ہیں جنکی شیریں بیانی اور سحر طرازی، معراجِ خیال اور رفعتِ تخیل، جنکا خندہ اور جن کے آنسو تعریف و توصیف کے محتاج نہیں۔

جو لوگ انگریزی شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اکثر اوقات اُردو شاعری سے بیزاری اور بےتعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ اُردو شاعری سب قسم کے عیوب اور نقائص سے مبرا ہے اسکے برخلاف میرا خیال ہے کہ انگریزی شاعری سے ہمیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور اردو شاعری کی بلندی، وسعت، اور رنگانگی کو مغربی شاعری کے دوش بدوش لانے کے لیے ایک زمانہ درکار ہوگا۔ لیکن اُردو شاعری سے اسلیے اظہار نفرت کرنا غالباً بجا نہ ہوگا کہ اس میں اثراتِ غم فراوانی کے ساتھ

پائے جاتے ہیں اور عیش و مسرت کے وہ نغمے مفقود ہیں جو انگریزی شعرا کی زبان سے کھلی ہوئی فضا میں اُڑتے ہوئے پرندے کے ترانہائے مسرت و بہجت بنکر نکلتے ہیں۔ اس قصور ------ اگر واقعی اسے قصور کہا جا سکتا ہے ------ کے ذمہ دار اُردو شعرا نہیں بلکہ جیسا کہ میں پیشتر لکھ چکا ہوں، ہماری فطرت۔ اُردو شاعری کے دور جدید میں ایسے شعرا پیدا ہو رہے ہیں جو قوم کو دعوت عمل دیتے اور حال کے مایوس کن آئینہ میں ایک درخشاں مستقبل کا فرحناک چہرہ دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے افق قومی پر ایک ستارۂ اُمید کو دیکھا جس محبوب خواب میں تخیل کے ساتھ کہا تھا

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں (شمع و شاعر)
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

وہ ٹینی سن اور براؤننگ کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ لیکن یہی اقبال اقتضائے فطرت سے مجبور ہو کر درد و بے چینی کے لمحوں میں پکار اُٹھے:-

پیر مغان فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر اس میں وہ کیف غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

کوئی کچھ ہی کہے لیکن میں تو اردو کی اس نوائے غم پر فخر کرتا ہوں اور اس امر کو شعرائے اُردو کا امتیازی نشان سمجھتا ہوں کہ وہ

چھیڑ آہستہ سے دیتے ہیں مرا تار حیات جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتار حیات
نغمۂ یاس سے دھیمی سی صدا اُٹھتی ہے اشک کے قافلہ کو بانگ درا اُٹھتی ہے

---

جس طرح رفعت شبنم ہے مذاق رم سے میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

---

**بشیر حسین زیدی**

کرو حجاب نہ یوں صورت آشنا کرکے دکھا دو پھر رخ زیبا نقاب وا کرکے
اگر ہے مد نظر دید شاہد معنی تو دیکھ چشم حقیقت نگر کو وا کرکے
نہ فصل گل، نہ نشیمن، نہ بال و پر میرے کریگا کیا مجھے صیاد اب رہا کرکے
دیار یار میں پروائے خضر راہ نہیں چلیں گے جذبۂ الفت کو رہنما کرکے
نہ خالی پھیریے حافظ کو اے شہ طیبہ در حضور پہ آیا ہے آسرا کرکے

(حافظ) امام الدین حافظ

# سری کرشن کی جوگن

(۱) ہر بٹ کنندۂ بادۂ نازاں نے جس نے دریائے گنگا سے سندھ تک اور کوہ ہمالیہ سے وندھیا تک کی بادیہ پیمائی کی ہے۔ ہندی زبان کے شیریں نغموں میں گو وہ اس زبان سے نابلد ہی کیوں نہ ہو، ایک رسیلے اور دلکش نام کو بار بار ضرور سنا ہوگا۔ چرواہے اپنے دوپہر کے گیتوں میں، صفت اپنے معرفت کے ترانوں میں ارباب نشاط اپنی گرم محفلوں میں، رقاصہ حسن اپنی خلوت کی صحبتوں میں، میرابائی کے سریلے نام کے گیت گاتی ہے اور ہر ٹوٹے پر لفظ میرابائی ہمساز ہوتا ہے۔ آخر میرابائی کون تھی؟ ہر ماہروت پوچھو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی، شیب ہو یا شبیہ، ہر شخص اسکے نام سے آشنا، اسکا محب اور محترم، اسکا دلدادہ اور اسے فرشتہ خصلت سمجھکے پوجنے والا پاؤ گے۔ وہ سیکڑوں کیا ہزاروں انسانی ہستیوں کی انمول ہیرا تھی۔ وہ عورتوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار اور ہندوستان کی بہترین شاعرہ تھی۔

(۲) جس طرح کہ راجپوتانہ کے بہترین پھول ہمیشہ زینت دہ قصر چتور رہے، یہ دوشیزہ گلاب بھی بالآخر راج کمار سے بیاہی گئی تاکہ سنگرام رانا کے بعد میواڑ کی رانی سے ملقب ہوکر تخت و تاج کی مالک بنے۔ رانی اور راج کمار دونوں شاعر تھے اور زیادہ تر انکا وقت شعر و شاعری ہی میں گزرتا تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں کے کلام میں امتیازی فرق ہونے لگا۔ راج کمار کی شاعری فطرت انسانی کی دلچسپ مرقع ہی تھی لیکن رانی کی طبعی پرواز اس سے کہیں بلند تر آسمان معرفت میں غوطہ زن ہونے لگی۔ اس نے سری کرشن جی کے کارناموں کو خوب پڑھا تھا۔ وہ اس جیتے اور جاگتے دیوتا کی ہستی کو بندرابن کے گلشن پیرا راہ کے پیراہن میں پاتی تھی۔ اسکا ایمان تھا کہ کوئی اس دنیا میں بالاس سرچشمہ محبت سے فیضیاب ہوئے خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ کرشن جی کو خدا کا اوتار سمجھتی تھی۔ وہ اپنے ذوق کل کا ایک گوپی تصور کرتی تھی۔ اسکے لیے معشوق مجازی میں حقیقت کی جھلک ہویدا تھی۔ اسکو عشق و محبت کی مادی زندگی سے روحانیت کا سبق ملتا تھا اور اسکی ساری نظمیں پیارے ہری کی تعریف میں ہوتی تھیں۔

(۳) وہ میخوار بادۂ مذہب، وہ پروانۂ آتش محبت اور وہ فدائی معرفت رفتہ رفتہ دنیاوی کاروبار سے علیحدہ ہوتی جاتی تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ آزاد بھی تھی کیونکہ اسکے شوہر نے اسے

علمی جولانی کے لیے ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ نہ خانہ داری سے کچھ کام نہ پوشش کی پرواہ نہ دنیا کی لذتوں کی خواہش۔ اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ معرفت کے ترانے گاتی اور نادیدہ گووند کی زیارت سے مشرف ہوتی یوں تو اُسکا نازک بدن، اسکی چشم پرفن، اسکا غنچۂ دہن ہر چیز بجاے خود لبھانے والی تھی مگر ان سے بڑھکر اسکے کلام کا سوز و گداز اور اسکی نغمہ سنجی تھی جو انسان کو مبہوت کردیتی اور آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی۔ آخر وہ کب تک شاہی زندان خانۂ چتور میں رہتی۔ جس شخص کا پیمانۂ دل شراب محبت سے لبریز ہو، کسی محدود چہار دیواری میں نہیں رہ سکتا۔ وہ سری کرشن کے مندر میں پہونچی اور وہاں بھجن گانا شروع کیا یہاں تک کہ وہ اپنے جامہ میں نہ رہی اور شراب معرفت نے اُسکو بالکل بیخود کردیا۔ اسکا دستور ہوگیا کہ برابر مندر میں جاتی اور وہاں اپنے محبوب دیوتا کی تعریف میں بھجن گاتی۔ اسکی شہرت رفتہ رفتہ ہونے لگی اور سیکڑوں کیا ہزاروں لوگ آتے اور اسکے نغمہ سے محظوظ ہوکر چلے جاتے۔ کمال عقیدت کے اب اس سے محل بھی قریب قریب چھڑادیا تھا، زیادہ تر وہ مندر ہی میں رہتی

(۴) جوں جوں اسکی آتش محبت میں ترقی ہوتی جاتی تھی اسکی شہرت بھی ہندوستان کے کونوں کونوں میں پھیلتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ تخت دہلی کے بےنظیر تاجدار یعنی شہنشاہ اکبر کے کانوں تک اطلاع پہونچی چونکہ خود شاعر تھا اور ذوق سلیم رکھتا تھا اسلیے جب میرا بائی کا نام سنا تو اشتیاق پیدا ہوا کہ ایک جام اسکے نغموں کا بھی لیں۔ چتور نے اپنا علم اب تک تخت دہلی کے آگے نہیں جھکایا تھا لیکن اسکے ساتھ ہی یہ ریاست برسر پرخاش بھی نہ تھی تاہم علانیہ میرا بائی کے نغموں کا اشتیاق ہوجانے سے اندیشہ تھا کہ غیور راجپوت اسکو ناپسند کریں اور ایک مہلک جنگ کا سامنا ہو۔ چتور کے اگلے کارنامے اسکو یاد تھے جب راجپوتوں نے اپنے گلے کٹا دیے تھے صرف اسلیے کہ ایک شہنشاہ نے انکی رانی پر نگاہ ڈالی تھی اور عورتوں نے بےعزتی کے خوف سے اپنے جسم میں آگ لگالی تھی۔ آخرکار اس نے ماہر فن موسیقی تان سین کو بلایا اور یہ رائے قرار پائی کہ ہندو جوگی کے بھیس میں اس مندر تک پہونچیں جہاں میرا بائی رنگ حور بنی ہوئی انسانی ہستی سے بیخود معرفت کے ترانے گاتی ہے۔

(۵) یہ دونوں اپنے وقت کے شہنشاہ شوقِ دیدار میں سفر کی سخت منازل کو طے کرتے ہوے تاریکی شب کو سپیدۂ صبح سے دور کرتے ہوے مقام مقصود تک پہونچے اور پروانہ وار اس مندر پر نثار ہوے جہاں میرا بائی رشک بلقیس بنی ہوئی خود آتش عشق میں سوزاں دوسروں کو مشتعل کررہی تھی۔ اس شہنشاہِ

اقلیم خوبی اور گل حدیقۂ محبوبی کے آگے اکبر کی اکبری کی کیا حقیقت تھی فوراً محو جمال شمع محبت ہوکر سر قدموں پر رکھدیا اور بطور نذر ایک بیش بہا مالا اپنے خرقہ سے نکالکر ملتجی ہوا کہ یہ قبول کیا جائے اور سری کرشن کی مورت پر چڑہا دیا جائے - میرا بائی انکی گدڑی سے میرا نکلنے پر متعجب ہوئی اور کہا کہ اے خدا کے محبوب بندے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ لوگ جو پھٹے پرانے بوسیدہ پوششوں میں رہتے ہیں کیسے اتنی بیش بہا چیزیں اپنی ملک میں رکھتے ہیں؟ جوگی نما شاہ نے کہا کہ میں نے اسکو جمنا میں نہاتے ہوے پایا - اور اس سے اچھا اسکا مصرف ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اسکو تمھارے اور تمھارے خدا کی نذر کردوں۔

(۶) میرا نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور یہ دونوں اپنے مقصد میں کامیاب اور بامراد دہلی واپس آئے - مگر وہ ہیرے کا گلوبند میرا کے لیے فرشتۂ موت بنکر گلوگیر ہوا - اسکی آزاد زندگی کیلیے عام صبا وشہرا اور اسکے عاشق صفت شوہر کی محبت کے لیے قاطع نکلا - اسکی شہرت تمام میں پھیل گئی اور ہزاروں لوگ اسکے دیکھنے کے لیے آنے - آخر کار یہ پتہ چلا کہ شہنشاہ اکبر کے ہاتھ کئی لاکھ پر فروخت ہوا تھا - دونوں جوگیوں کا بھی پتہ چل گیا کیونکہ شاہی قدم کہیں چھپائے چھپتے ہیں - راجہ کو معلوم ہوگیا کہ اکبر آیا - اسکی بیوی کو ہاتھ لگایا اور نذر دیکر چلتا ہوا - یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا - اس سے رانی کی عزت پر بدنما داغ عائد ہوا - اسکی ذات سے میواڑ کی غیرت وناموس میں بٹہ لگا - وہ ایک کذات کے ہاتھ لگانے سے کذات ہوگئی اور اسکے لیے قتل کا حکم ہوا - لیکن تعمیل ارشاد کون کرتا؟ دربار کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ نے اس سے انکار کردیا - بالآخر پروانہ قتل نافذ ہوا جس میں حکم تھا کہ رانی خود اپنا قصہ تمام کرلے - جب وہ مندر سے پوجا پاٹ کرکے واپس آرہی تھی اسے یہ پروانۂ موت دیا گیا - اس نے پڑھکر یہ سوال کیا کہ میں راجہ سے مل سکتی ہوں؟ قاصد نے بعجز کہا کہ اس میں صاف تحریر ہے کہ راجہ صاحب آپ کو دیکھنا نہیں چاہتے - میرا ایک سکوت میں آگئی اور کہا بھی تو صرف اتنا کہ عورت پر شوہر کی اطاعت فرض ہے - چونکہ حسب دستور اسکی بہت سی سہیلیاں تھیں اسلیے اسنے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا مبادا انکو افسوس ہو اور یہ میرے لیے گریہ وزاری کریں - چپ چاپ خاموشی سے قصر میں داخل ہوئی اور موت کی تیاری کرنے لگی! اس نے شاہی لباس کو اتار کر زرد رنگ کی ایک ساری ملبوس بدن کی اور رات کی خاموشی میں جبکہ سب سو رہے تھے حتیٰ کہ ستارے بھی شانۂ آسمان پر اپنی زلفوں کو کھولے خواب ناز میں مصروف تھے، وہ تن تنہا دریا کے کنارے آئی اور چند منٹ کی دلسوز دعا کے بعد اپنے کو شور افزا

لہروں کے سپرد کر دیا۔ عالم بیہوشی میں اس نے ایک منور ہستی کو دیکھا جس نے اسکو پیار کیا اور کہا کہ میرا تو نے اپنے شوہر کی اطاعت میں اپنی جان دی لیکن اس سے ایک اہم کام کی تعمیل، اس سے ایک وسیع فرض کی ادائیگی تجھکو مجبور کرتی ہے کہ اُٹھ ابھی اور زندہ رہ اور دنیا کو خدا پرستی کی تعلیم دے۔

(۷) جب اُسکی آنکھ کھلی اس نے اپنے کو دریا کے نزدیک ریگستانی کنارے پر پایا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اور اپنی پوری ضوء سے دنیا کو روشن کر رہا تھا۔ وہ عندلیب گلزار محبت فرش زمین سے ملامت سی اُٹھی اور یہ اشعار پڑھتی ہوئی ایک طرف کو چل نکلی :—

آنکھوں میں جوت اُسکی من میں اُسی کی مایا ۔۔۔ سب تپ ہیں اسی کے جھلکا ہے تپ دیا!
جل میں جھلک اسی کی پربت پہ ٹھاٹھ اسکا ۔۔۔ چاروں طرف وہ پربھو پرماتما ہے چھایا!
اکاش پر وہ نیلا اور سورج میں پیلا ۔۔۔ دھرتی پہ اور لیلا کیا رنگ ہے بنایا!
نفرت سے دیکھنا مت جگ میں کسیکو پیارے ۔۔۔ کہتے ہیں گیان والے ہر تن ہے ہر بنایا!

اثنائے راہ میں اسے ایک چرواہے کا لڑکا ملا جس سے اس نے پوچھا کہ میرے پیارے بچے کیا تم اُس عظیم معبدگاہ کا راستہ بتا سکتے ہو؟ لڑکے نے اُسکو ماں کہکر پکارا اور دور سے بلایا اور برنداون کا راستہ بتا دیا۔ وہ ہری کا بھجن گاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جس راہ اور گاؤں سے گزرتی اپنے الہامی ارشادات سے روحوں کو معطر کر دیتی اور جوق کے جوق ہری ہری کہتے اُسکے ہمراہ ہوتے۔ تحفہ جات کا لوگوں نے انبار لگا دیا بہترین کھانے لائے اور طرح طرح کے سامان آسایش مہیا کیے لیکن وہ ان سب سے مستغنی اور بے نیاز صرف اپنی ایک دُھن میں چلی جا رہی تھی۔

(۸) جب وہ برنداون میں پہونچی تو معلوم ہوا کہ گویا خود رادھا کیلاش کی مہادیوی اپنے معتقدین کے ساتھ داخل ہوئی۔ اسکی آمد کی خبر تمام شہر میں پھیل گئی۔ اسکی شیریں کلامی کے نادیدہ عاشق جو مدت سے اسی تمنا میں تھے کہ دیدار میسر ہو اور اسکے غلامان حلقہ بگوش جن پر اُسکے فراق کی گھڑیاں موت سے زیادہ سخت کٹ رہی تھیں خبر پاکر فوراً حاضر خدمت ہوئے۔ اب وہ میوار کی محدود چار دیواری کی رانی نہ تھی بلکہ ایک جوگن تھی جو گیروے رنگ میں ملبوس، ہاتھ میں چنبل، دولت وصال معشوقِ حقیقی سے مالا مال، سلطنتِ عشق کی بے نظیر تاجدار بنی ہوئی غیر فانی زندگی کی لا انتہا نعمتوں سے لطف اُٹھاتی تھی۔
اس ملک میں ایک راجپوت گوسائیں تھا جو اپنے زہد اور علم کے لیے مشہور تھا۔ اسکا مقولہ تھا کہ اگر خدا کو

چاہتے ہو تو عورت اور روپیہ پر نگاہ نہ ڈالو۔" میرا نے جب یہ سنا تو اُسکو حسب ذیل خط لکھا "برندابن میں صرف ایک مرد ہے اور وہ سری کرشن جی ہیں بقیہ سب ہستیاں اُنکی محبت میں عیاں ہیں اور اسلیے اُنکی محبوب ہیں جو اُس سے جدا نہیں۔ روپ گوسائیں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر وہ عورتوں کے قبیلے میں سری کرشن جی کے حرم میں داخل ہوئے ہیں تو بہتر ہے کہ چلے جائیں مبادا سری کرشن جی کو پتہ چل جائے اور وہ معتوب ہوں۔" اس تحریر کو پڑھکر روپ گوسائیں اتنا خوش ہوا کہ اس عورت کو اپنے سامنے بلا بھیجا۔ میرا حاضر خدمت ہو کر پالاگی کی اور آشیرباد کی طالب ہوئی۔ فقیر نے پوچھا لڑکی کیا چاہتی ہے؟ میرا نے جواب دیا بابا مجھے بھی یہاں رہنے دو تاکہ تمہارے لبوں سے خدا کا نام سنوں۔ اسکے بعد دونوں ایک ہی جگہ رہنے لگے اور ہر ایک دوسرے کو اپنا گرو پکارتا تھا۔

(۹) زمانہ کے دور کے ساتھ اُنکی شہرت بھی پھیل گئی۔ ہمالیہ کے سفید چوٹیوں پر گنگا اور جمنا کے مشفق ساحلوں پر، پنجاب کے سبزہ زاروں پر، دور دراز دیار دشت کے میدانوں پر اسکے گیت ہر ایک کے زبان زد تھے جو کہ برندابن کے مندر سے نکلکر ایک آن واحد میں پہونچ جاتے تھے۔ ہر گلی کوچہ میں یہی تذکرہ تھا کہ میرا نے یہ نظم کہی اور وہ۔ بادشاہ کو فکر نہ تھا۔ آخرکار اسکی بابت قلب بھی بدل، پر شوق ہونے اُنکو اسکا احساس ہوا کہ جس سلطنت سے میرا نکال دی گئی اُسکی اس سلطنت کے آگے جسکی وہ اب تاجدار ہے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ اسلیے نکالی گئی تھی کہ اس سے ناموس خاندان میں فرق آیا تھا گو اُس سے زیادہ کسی نے خاندان کو عزت نہیں بخشی۔ دُنیا اُس سے محبت کرتی ہے اور اُسپر پروانہ وار نثار ہے۔ یہ سب خیال کر کے راجہ نے بھیس بدل کر برندابن کی راہ لی۔ جب منزل مقصود پر پہونچا میرا کو مندر کے چبوترہ پر بیٹھا ہوا پایا۔ گو اُسکے گلاب سے گال مرجھا گئے تھے لیکن تبسم وہی شیرینی تھی۔ راجہ نے پہچانا اور اُس سے سوال کیا۔ میرا نے جواب دیا کہ میں ایک ناری جوگن ہوں کسی رئیس کے پاس جاؤ۔ فقیر نے کہا کہ ایک حق شناس فقیر خدا پرست ہی کے پاس جاتا ہے۔ میرا نے کہا کہ میں تمہیں کیا دوں؟ فقیر نے کہا "معافی"۔ اب میرا نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنی زندگی کے ساتھی، اپنے پیارے شوہر، اپنے دُلارے راجہ کو پہچانا۔ قدموں پر گر پڑی اور مسرت کے گونا گوں اشک نچھاور کر کے حسرت کے ساتھ بولی: "اب بھی پوچھا تو مہربانی کی"۔ بادشاہ نے اسے جوش محبت میں لپٹا لیا۔ ندامت کے آنسو بہانے اور دست بستہ عرض کی "اب مفارقت کی حد ہو چکی چلو اس اندھیرے قصر کو روشن کرو۔"

میرا بائی ۔ "قصرِ شاہی ہو یا فقیر کی جھونپڑی سب مایا کا کرتب ہے ۔ اب مجھے مایا میں نہ پھنساؤ"
راجہ :۔ "یہ میں مانتا ہوں لیکن یہ دھرتی کرم یوگ کی جگہ ہے ادہیاں کی ۔ روحانیت دھیان اور گیان دونوں سے پوری ہوتی ہے ۔ تم نے جو کچھ تپشیا اور گیان سے حاصل کیا ہے اُسکو اپنے ملک میں پھیلاؤ"
میرا بائی :۔ "اب میں اُس مقام پر پہونچ گئی ہوں جہاں مجھے قاعدہ اوڑھنا بچھونا سب ہیچ معلوم ہوتا ہے ۔ مگر ایک سچی راجپوتنی کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کو ہر حال میں اپنے اوپر واجب سمجھے ۔ اسلیے میں چھ مہینے کے بعد چتوڑ آؤں گی"

---

یہ قصہ مسٹر اڈمنڈ رسل صاحب (Edmund Russell) کی تراوشِ فکر کا نتیجہ ہے ۔ مصنف کے زورِ قلم اور میرا کے سُریلے حقانی نغموں نے طبیعت کو بیچین کر دیا ۔ چتوڑ کا گذشتہ عروج نظروں کے سامنے آگیا ۔ اور دماغ نے تواریخ کے ورق اُلٹنے شروع کیے ۔ مگر اس میں ہمکو زیادہ مایوسی ہوئی کیونکہ جہاں شہنشاہ اکبر سریر جہانبانی پر ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک جلوہ نما رہا ہے ۔ میرا بائی کا زمانہ ۱۴۱۹ء سے لیکر ۱۴۶۹ء تک گذرا ہے جو اکبر سے قریب قریب سو برس قبل کا واقعہ ہے ۔ صرف اتنا ہی نہیں، اس میں بھی شک ہے کہ میرا بائی راج کمار سے بیاہی بھی گئی تھی یا نہیں ۔

یہ ہمارے انگریزی مصنفین کا حال ہے جو زورِ قلم کا پرچم اُڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور واقعات پر نگاہ بھی نہیں ڈالتے ۔ یا یوں کہیے کہ ایسے ہی چھوٹے واقعات سے ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرتے ہیں جس سے ستونِ سلطنت میں مضبوطی آتی ہے ۔ بہرحال قصہ عمدہ ہے اور ہم مصنف صاحب کے مشرقی مذاق کو، چاہے اُس میں فساد ہی کی بو کیوں نہ آتی ہو، پسند کرتے ہیں ۔

حامد حسن صدیقی (علیگ)

وہ تڑپے مجھے مری افسردہ صورت دیکھکر ۔۔۔ رحم اُنھیں آیا مجھے محوِ مصیبت دیکھکر
یاد ہم کو آگئیں صبحِ وطن کی راحتیں ۔۔۔ رو دیے ہم بیکسیِ شامِ غربت دیکھکر
ہوں وہ مایوسِ ازل آنکھوں میں میری پھر گیا ۔۔۔ مجلسِ ماتم کا نقشہ بزمِ عشرت دیکھکر
چلے ہی منزل میں تنہا چھوڑ کر چلتے ہوئے ۔۔۔ دل بھر آیا ہے رفیقوں کی رفاقت دیکھکر
عشقِ صادق نے اثر اُسپر کیا آخر اثیم ۔۔۔ شمع کیا کیا روئی پروانے کی حسرت دیکھکر

# باغِ امید

(ترجمہ مضمون ڈاکٹر جانسن)

دنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جو امید سے زیادہ عام پسند ہو۔ دوسرے جذبات تو انسان کے دل میں خاص خاص اوقات پر پیدا ہوتے ہیں مگر جس وقت سے کہ ہم اپنی موجودہ اور ممکنہ حالت کا اندازہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں امید موجود ہوتی ہے اور ہمیشہ ہر حصہ میں ہر حالت میں ساتھ دیکر کبھی ہمکو نئی نئی خواہشوں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور کبھی تکلیف کو آرام سے، اور غم کو خوشی سے بدلنے کے سرسبز باغ دکھلاتی ہے۔

زندگی کے لیے امید لازمی ہے۔ بیماری، گرفتاری، عسرت، مصیبت، ہر حالت میں جب تک امید کا قدم درمیان نہ ہو انسان کی زندگی محال ہے۔ دنیا کی شادمان ترین ہستی بھی ایسی نہ ہوگی جو اسکی محتاج نہ ہو کوئی ذی روح انسان بھی ایسا نہ ہوگا جسکے چاروں طرف خدا کی نعمتوں اور دنیا کی دولت کے بیش بہا انبار لگے ہوں اور پھر بھی اُسے امیدوں کے پُرفضا باغ نظر نہ آتے ہوں۔ طرح طرح کی حسرتیں سینہ میں موجزن نہ ہوتی ہوں ایسی حسرتیں جنھیں وہ موجودہ حالت کے مقابلہ میں زندگی کا معراج سمجھتا ہو۔

امید ایک دلربا شے ہے اور شاذ و نادر پوری ہوتی ہے مگر اُسکے وعدے دولت کے عطیات سے کہیں بیش قیمت ہیں۔ انسان کو جب ناامیدی ہوتی ہے تو آیندہ امیدوں کے ولولے اُسکے دل میں اور بھی جاگزیں ہوتے ہیں

ایک روز میں انھیں خیالات میں محو تھا اور اُن خطروں اور فوائد پر جو اکثر اوقات خیالی پلاؤ پکانے سے پیدا ہوتے ہیں غور کر رہا تھا کہ دفعتاً میری آنکھ لگ گئی اور خواب میں ایک غیر محدود خوشنما باغ نظر آیا۔ دھوپ کی سنہری شعاعیں، پھولوں کی روح افزا مہک، بہار کا سماں، رنگ برنگ روشوں پر انواع و اقسام کے خوبصورت پرند، اُنکے نغمہائے دلکش یہ سب ایسے اسباب تھے کہ تھوڑی دیر تک مجھپر وجد کی کیفیت طاری رہی۔ ذرا دیر بعد جو میں چونکا تو مجھے اس سے بھی زیادہ مسرت اور خوشی کے سامان نظر آنے لگے۔ خوشرنگ پھول، صاف شفاف چشمے اونچی پُرفضا روشیں، طرح طرح کے پرندوں کے دلکش نغمے اور معطر درخت نہایت پُرلطف سماں پیش کر رہے تھے۔ آخر مجھپر طمع غالب آئی اور میں اُن پختہ پھلوں کے لالچ میں جو گرنے کے

قریب سے آگے بڑھا جتنا بڑھتا گیا خوشنمائی کم ہوتی گئی - میوہ ہائے شیریں میرے پہونچنے سے پہلے گرنے لگے اور پرند چوں چوں کرتے ہوئے اُڑ گئے - یہاں تک کہ یہ سب پُرلطف سامان میرے پیچھے ہٹ گیا -

اگرچہ میں ان رنج و خوشی کے جذبات کو دیکھکر پس و پیش میں پڑ گیا تاہم نا امید نہیں ہوا اور اُسی امید میں کہ شاید یہ بوقلمون مناظر میرے ہاتھ آجائیں میں نے اپنا قدم آگے بڑھایا - اور دیکھا کہ مختلف العمر اشخاص بڈھے، جوان بچے، مرد و عورت انبساط و وجد میں محو ہیں ہر ایک کے چہرہ پر تازگی کے آثار نمایاں ہیں اور ہر ایک کی آنکھ جوشِ مسرت سے مست ہے - ہر شخص اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے میں اسقدر مصروف ہے کہ دوسرے سے مخاطب نہیں ہوتا - ان سب کی محویت پر میں غور کرنے لگا مگر یہ خیال کر کے کہ ان لوگوں سے سوالات کرنا انکے تخیل میں حارج ہوگا میں آگے بڑھا - میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص وہاں موجود تھا - مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ میری طرف متوجہ ہو میں نے سوال کیا مگر اُس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا - دوسرے سے مخاطب ہوا کہ شاید یہ اخلاق سے پیش آئے مگر اُس نے بھی جھڑکی دی - آخرکار تیسرے شخص نے کسی قدر خلوص سے جواب دیا کہ آپ کی قدر شناسی سے زیادہ کوئی امر میرے لیے قابل مسرت نہیں مگر میں مجبور ہوں میری بیس سال کی تمنائیں آج پوری ہونے والی ہیں اور میں انھیں چھوڑ کر آپ سے گفتگو نہیں کر سکتا - چوتھے نے جواب دیا کہ میرے چچا کا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا ہے اور میں اسوقت اُنکے متروکہ پر قبضہ کرنے جا رہا ہوں - پانچواں لبِ دریا مرغابیوں کی امید میں غوطہ لگانے کے لیے کھڑا ہوا تھا اور چھٹا فکر و ایجادات کی اُدھیڑ بُن میں غلطاں و پیچاں تھا -

میں یہ دیکھکر کہ ہر ایک اپنی اپنی دھن میں مصروف ہے اور کوئی میری طرف رُخ نہیں کرتا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا - دل میں کچھ خیالات موجزن ہوئے - آخر نہ رہا گیا - ایک خوش و خرم نوجوان کی طرف مخاطب ہوا - اس بیچارے نے میری تسلی و تشفی کی اور مجھے بتایا کہ تم اسوقت "باغِ امید" میں ہو جسکی ماں کا نام حسرت ہے اور جو لوگ تمھیں نظر آرہے ہیں وہ امید کے موجودہ عطیات کے منتظر ہیں -

میری نظر ذرا اونچی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک زیب تخت حسین نوجوان "دیبی" جسکے چاروں طرف تحفہائے دولت کے بیش بہا انبار اور لطائفِ زندگی کے خوش ذائقہ سامان آراستہ ہیں تختِ زرنگار پر جلوہ افگن ہے اسکی ہر ادا سے انبساط کے آثار نمایاں ہیں اور جو اُسکے فرحت انگیز تبسم کو دیکھتا ہے اپنی طرف مائل کرنا باعثِ فخر سمجھتا ہے -

میرے خیالات سے اضطراب طاری کیا اور اب میں اُس لق و دق میدان کے مختلف حالات پر غور کرنے لگا

جہاں مجھے باغ امید کے دو دروازے جن پر "شعور" اور "تخیل" نامی دو دربان متعین تھے نظر آئے۔ "شعور" نشۂ غرور سے چور اور کسی قدر بد اخلاق تھا اور جب تک بے شمار سوالات کر کے اپنا اطمینان نہ کر لیتا کسی کو داخلہ کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ہاں "تخیل" کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے اور ہر جانے والے کا نہایت محبت اور جوش سے وہ استقبال کرتا تھا۔ غرض یہ کہ ان دونوں دروازوں کا راستہ ایک مجمع غفیر سے رکا ہوا تھا جو "شعور" کے سوال و جواب کے خوف یا اُسکے غیر مہذب انکار کے خوف سے وہاں جمع تھے۔

باب "شعور" سے ایک راستہ مصائب گنج ہو کر تخت امید کو جاتا تھا جو نہایت دشوار تھا۔ اسکو وہی لوگ طے کرنے کے مجاز تھے جنکو "شعور" نے اجازت دی ہو۔ بالآخر ان سب لوگوں نے ہمت باندھ کر بہت غور و خوض کے ساتھ سفر شروع کیا۔ یہاں تک کہ کنکر پتھر اونچی چٹانیں، عمیق خندقوں کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور جہاں کہیں ہموار سڑک پاتے تھے دم لینے کے لیے رک جاتے تھے۔ پھر بھی راستہ اس قدر سنگلاخ تھا کہ لغزشوں نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ بہت سے آغاز سفر ہی میں تھک کر بیٹھ رہے بہتوں نے آدھے راستہ پر ہمت ہار دی صرف معدودے چند ہی منزل مقصود تک پہونچ سکے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے جنہیں امید میں بھی نا امیدی کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ بہ ناز ایک یا دو جو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے انہیں عقل نے رہنمائی کر کے گلشن "قناعت" تک پہونچا دیا۔

باب "تخیل" سے تخت تک پہونچنے کا راستہ سیدھا تھا۔ حالانکہ حسن کی دیوی پورے طمطراق سے ہمہ ناز و ادا کے ساتھ تخت امید پر جلوہ گر امید کے طلبگاروں کی سرگرمی بڑھی تھی راستہ کے سایہ دار درخت اور [illegible] کو دیکھکر ہر شخص دعوی کرتا تھا کہ وہاں تک پہونچ جاؤں گا مگر باوجود انتہائی محنت اور جانفشانی کے بھی منزل امید تک انکی رسائی نہ ہو سکی۔ اور "تخیل" کے دلدادوں نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی آسایش و آرام کے خیال نے انکو وہیں روک دیا اور وہ راہ ہی میں وادی غفلت میں آرام سے لیٹ گئے اس امید پر کہ دوبارہ اٹھکر آگے بڑھیں گے اور منزل مقصود تک پہونچ جائیں گے۔

اتفاق سے میں بھی انہیں میں تھا۔ میں نے جو سر اٹھایا تو "بڑھاپے" اور "حاجت" نے تمام امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ خوف سے میری حالت غیر ہو گئی۔ ہچکی بندھ گئی اور میں چونک پڑا۔

وفا۔ صدیقی۔

# عرب میں حسن و جمال کا معیار

طبیعت فطرتاً جمال کی طرف راغب اور عقلی فوائد کے لحاظ سے حسن پسند ہے - اور باوجودیکہ آنکھیں کثرت سے اُسکی نظارہ کی خوگر اور کان اُسکے ذکر مذکور کے عادی ہیں - پھر بھی اُسکے اسرار ہنوز موضوع فکار اور اُسکی گہری تاثیریں محل حیرت و استعجاب ہیں - وہ ایک بڑا راز ہے جو انسان کو اعلیٰ مقامات تک پہونچانے کا ذریعہ اور انسان و حیوان میں وجدان اور ادراک کے لحاظ سے ایک حد فاصل ہے - اس لیے تمام بنی آدم اسکی شرافت پر متفق اور کوئی قوم اُسکی تاثیر اور دلآویزی کی منکر نہیں - جو قوم اُسکے فیضان سے محروم ہے اُسکے حرمان کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا - اسلیے ہم اس مضمون میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اہلِ عرب اس فضیلت میں اپنی دوسری معاصر اقوام سے کسی طرح کم نہ تھے - یہ بحث اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُن لوگوں میں جو اس قوم کے صحیح حالات پر عبور نہیں رکھتے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ عرب میں حسن و جمال کا وجود ہی نہیں تھا اور حسن کے متعلق عربوں کا مذاق بھی سلیم نہ تھا - عرب کی نسبت یہ اتہام اُن لوگوں کی طرف سے لگایا جاتا ہے جنکا یہ خیال ہے کہ جو قوم اقلیم حارکی رہنے والی اور عیش و نشاط کے برکات سے محروم ہو کیونکر حسین و جمیل اور کس طرح خط و خال کے لحاظ سے بدیع الجمال ہو سکتی ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔

اہل عرب قدرت کی اس بیش بہا نعمت سے محروم نہ تھے - عرب میں تناسبِ اجزا، موزونیتِ اوضاع، اعتدالِ اشکال عموماً پایا جاتا تھا - وہ صبیح تھے لیکن اُنکی سپیدی میں بہق کی آمیزش نہ تھی - وہ ملیح تھے لیکن اُنکی جلد پر سیاہی کا اثر نہ تھا - جو لوگ اُن میں حسین گزرے ہیں وہ اپنے معاصر اقوام میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے - اور انسانی حسن و جمال کا بہترین نمونہ تھے -

مشہور یہ ہے کہ حسن و جمال مذاق کے اختلاف کے باعث کسی خاص شکل و صورت میں محدود نہیں ہو سکتا لیکن حسن و جمال کے متعلق مختلف قوموں نے جو معیار قائم کیے ہیں اُن سب پر گہری نظر ڈالنے سے ایک قدر مشترک کا پتہ چلتا ہے اور ایسی وجہ جامع ملجاتی ہے جسپر قیاس کرنے سے تمام حسین و جمیل ایک سلسلہ میں منسلک ہو جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حسن جلد کے رنگ سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ نام ہے موزونیتِ قامت، کشادہ پیشانی،

چہرہ کے اجزا اور اُسکی وضع قطع کی مناسبت اور تبسم کی حلاوت، آنکھوں کی ملاحت، ابرو کی پاکیزگی
بوں کی نزاکت کا۔ یہی امور مذکورہ حسینانِ عرب میں کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی
سین مرد اور کوئی حسین عورت مشہورین عرب میں سے ایسی نہیں پائی جاتی جو ان صفات کے ساتھ
متصف نہ ہو۔ پھر ان اوصاف کے ساتھ ساتھ جلد کی سپیدی جس میں سرخی یا گندم گونی پائی جاتی ہو
کی کشش جمال کو کچھ نہ کچھ بڑھا دیتی ہے۔ یہ رنگ عرب میں عموماً اور حضرت خدیجہؓ کی قوم میں خصوصاً
صوصیت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔

عرب نے اپنے اشعار میں جس کثرت کے ساتھ حسن وجمال کی تعریف کی ہے اتنی کسی دوسری چیز کی تعریف
میں کی اور حسن وجمال کے ضمن میں جسقدر ان دونوں رنگوں کو سراہا ہے اسقدر کسی دوسرے رنگ کو نہیں
سراہا۔ سپیدی جس میں سرخی کی جھلک ہو اور سپیدی جس میں زردی کی دمک ہو۔ ذوالرمہ کہتا ہے

بیضاء وصفراء قد تنازعها ... اذنان من فضة ومن ذهب

ور اسی رنگ کو "لون لولو" کہا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں حسینانِ جنت کو لولوِ مکنون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے
ا اختلاف یہی وہ رنگ ہے کہ اگر اس رنگ کے ساتھ تناسبِ اعضا و اوضاع بھی نصیب ہو تو حسن وجمال
ا اعلیٰ نمونہ اور مکمل مثال ہو۔ سپیدی میں جو کسی سبب سے سرخی کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے، وہ اُس سرخی
سے بدرجہا بہتر ہے جو سپیدی کا جزو بن جاتی ہے۔ اسی کی نسبت علوی ابن زید نے کہا ہے

حمرة غض مفرق من بياض ... مثل ما حاك حائك ديباجا

ور چونکہ عرب میں بیاضِ لطیف کثرت سے پائی جاتی ہے اسی وجہ سے عرب نے اسکو صبح سے تشبیہ دی اور
س سے ایک رنگ بنایا جسکی مناسبت سے سپید رنگ کے آدمی کو "صبیح" کہنے لگے۔ اسی طرح کلیوں سے
یہ رنگ اخذ کیا اور اُسکی سرخی مائل سپیدی کی مناسبت سے اسکا نام "ازہر" رکھا۔ عرب نے رخساروں
گلاب سے عموماً تشبیہ دی ہے۔ یہی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ رنگ کثرت سے عرب میں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ
رخی کی جھلک جب سپیدی میں پائی جاتی ہے اُسی وقت گلاب کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ اُنھوں نے گلے کو
بریقِ فضہ سے تشبیہ دی ہے۔ جیسا کہ ابوسفیان کی بہن فریعہ بنت حرب نے اپنے ددھیال و ننھیال کی تعریف
ں کہا ہے۔

پھر جب نیرنگیِ جمال خصائص عرب میں داخل ہے تو کچھ تعجب نہیں کہ عرب تجلیاتِ حسن وجمال سے

دل باختہ نظر آئیں اور اُنکی نگاہیں اسی اثر حسن کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ پھر چونکہ حسن و جمال کی محبت نے اُنکے مذاق کو لطافت دیا اُنکی طبیعتوں کو اچھی چیز کا مادی بنا دیا تھا اسلیے اُنکے قلوب اس دعوت کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے جس نے اُنکو اس جمال سے اُس جمال کی طرف بلایا جو اس سے اعلیٰ تھا۔ اور اس محبت نے اُس محبت کی طرف رہبری کی جو سب سے اولیٰ اور افضل ہے یعنی جمالِ الٰہی کے تصور کی طرف جو مقصد حسن و جمال ہے اُنکو مائل اور عشق حقیقی کی طرف جو تمام کمالات سے بہتر ہے راغب کر دیا جو لوگ اس جمالِ ظاہری کے شیدا تھے اُنھیں اُس حقیقی جمال کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی جو غیر محسوس تھا [illegible] وہ کسی سے عالم میں نہیں رہ گئے بلکہ اُنھیں ایسی چیز کی طرف لایا گیا جو اُس سے اجمل و اکمل تھی جسکے وہ شیدا تھے۔

ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ عرب کو حسن و جمال کی طرف زیادہ شغف تھا تو ہمارے دل میں اُنکی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور ہم بغیر تردد یہ کہنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ قوم تھے۔ کیونکہ وہ تمدن اور شہریت کے فضول تکلفات اور بزم آرائش سے دور تھے اور غالباً یہی سبب تھا اُنکے قرار واقعی جمال کا کیونکہ انھوں نے اپنی معیشت میں اعتدال کا لحاظ اور سفر و حضر میں اقالیم [illegible] کا خیال رکھا۔ اعمال اور مشغولیات [illegible] کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور سب پر طرہ یہ کہ وہ بغیر دیکھے ہوئے شادی کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ [illegible] نسل میں سب سے زیادہ دخل انتخاب زن و شو کو ہے۔

اگر کوئی شخص کسی حسین و جمیل عورت سے حسن و جمال کا شہرہ سنکر اُسکے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ شہرت عام پر اکتفا نہ کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کو [illegible] جنکے ذوق سلیم اور [illegible] پر [illegible] ہوتا تھا تحقیق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا۔ جو حکایت آیندہ بیان کی جاتی ہے اُس سے اسکا اندازہ ہو سکے گا کہ عرب حسن و جمال کے کس قدر رسیا تھے اور خود عربوں میں حسن و جمال کس حد تک پایا جاتا تھا۔

عرب کے ایک بادشاہ عمرو بن حجر نے جو خاندان کندہ سے تھا اور جسکا پوتا امرأ القیس عرب کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ عوف ابن محلم کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنی چاہی۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھی اور اسکا شہرہ گھر گھر تھا۔ بادشاہ نے عصام نامی ایک عورت کو اُسکے دیکھنے

اور جو باتیں اُسنے سنی تھیں اُنکے جانچنے کے لیے بھیجا۔ جب وہ لَوٹی تو بادشاہ نے عصام سے پوچھا کہو تم نے کیسا پایا؟ عصام نے جو جواب دیا وہ اُسی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

میں نے آئینہ کی طرح ایک روشن پیشانی کو دیکھا۔ بکھرے ہوئے بال اس طرح زینت دے رہے ہیں کہ اگر وہ اُنکو کھول دے تو تم اُنکو سلاسل سمجھنے لگو۔ اور اگر اُن میں کنگھی کرلے تو وہ انگور کے خوشوں کے مشابہ ہوجائیں جنکو ابرِ بارندہ نے نکھار دیا ہو۔ اسی کے ساتھ دو ابرو ہیں جو گویا قلم سے کھنچی ہوئی ہیں یا کاجل کی تحریر۔ جو ایسی ہرنی کی آنکھوں کے اوپر جھکی ہوئی ہیں جسکو نہ شکاریوں کا خوف بیزار اور نہ شیر کا ڈر مضطرب کرسکتا ہے۔ بیچ میں ناک ہے جو صیقل شدہ تلوار کی طرح دراز ہے نہ بہت چھوٹی اور نہ زیادہ طویل۔ جسکو دو گلابی رخسار بیچ میں لیے ہوئے ہیں جو خالص سپیدی میں ارغوانی ہوتے گئے ہیں اور جن میں فمِ من مُہر کی طرح واقع ہے۔ جسکا تبسم دلاویز ہے جسکے اندر تیز اور چمکدار دانت ہیں۔ جن کے بیچ میں ایسی زبان حرکت کرتی رہتی ہے جو کمال فصیح اور نہایت خوش بیان ہے۔ جسکی تقریر ازدیادِ عقل کا ذریعہ اور حاضر جوابی کا ایک نمونہ ہے۔ دونوں جانب دو ہونٹھ ہیں جو گلاب کی طرح سرخ ہیں اور جنکا لعاب شہد جیسا میٹھا ہے۔ نیچے گردن ہے جو صراحی سے مشابہ ہے اور ایسے سینے سے ملی ہے جو سنگ مرمر کی طرح صاف اور سپید ہے۔ سینے کے دونوں جانب دو بازو ہیں پُر گوشت اور پُر شحم۔ وہ بانہیں ہیں نہ طویل اور نہ موٹی، نہ قصیر اور نہ دُبلی۔ ان دونوں میں تو ہتھیلیاں ہیں جنکی کلائیاں نہایت نازک ہیں

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

غرض جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اُس سے تم بخوبی اندازہ کرسکتے ہو کہ اہلِ عرب میں حسن و جمال کا معیار کس قدر بلند اور اس امر میں اُنکا مذاق کس قدر سلیم اور پاکیزہ تھا۔

منظور احسن

---

زمانہ سے بڑھکر کوئی بھولنے اور بھلا دینے والا نہیں۔ دنیا کے اسٹیج پر نہ جانے کتنے لوگ [illegible] جو شہرت کے آسمان پر چاند سورج ہوکر چمکے۔ لیکن غور کرو کتنے ایسے ہیں جن کی کرنیں اب بھی نور افشاں ہیں۔ بلاشبہ بڑے خوش نصیب ہیں وہ جنہیں کسوف و خسوف کے بعد بھی شہرتِ دوام کے آسمان پر چمکنا نصیب ہوجائے۔

([illegible])

# دوست کی یاد

کارخانۂ نیچر کا ہر ایک ذرہ متحرک ہے، سیارۂ انسانی کے بنتے بگڑنے کا چکر لگا یا اور تھا۔ نظام عالم میں ہزاروں انقلابات پیدا ہوئے، اور ہوں گے، ہوتے رہیں گے۔ تارے چمکے، چمک کر ٹوٹے، ٹوٹ کر آنکھوں سے نہاں ہوئے۔ چاند نکلا، نکلکر بڑھا، بڑھکر روشن ہوا، گھٹا، گھٹ کر اندھیرا ہوا، آفتاب طلوع ہوا، طلوع ہوکر پھر ڈوبا۔ زمانہ پلٹا، موسم بدلا۔ جاڑا آگیا گرمی، گرمی گئی برسات۔ دن نکلا، نکل کر پھر ڈھلا، رات آئی، نسیم سحری چلی، چل کر، غنچے کھلے، کھل کر مرجھائے۔ پھول ہنسے، ہنسکر کمھلائے۔ شاخوں سے پتے گرے، گر کر سوکھے، اُنکی جگہ نئی کونپلیں نکلیں، پتے بنے بڑھے، سبزہ پامال ہوا، پھر اُگا۔ میووں سے ڈالیاں لدیں، لدکر بازار میں آئیں، آکر بکیں، بک کر گاہکوں کے مشتاق ہاتھوں میں ہوئیں۔ بادل گھرا، گھر کر برسا۔ بجلی چلی، چمک کر گری، گر کر سخت سے سخت دل کو تڑپا گئی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ ہوگا، اور ہوتا رہیگا۔

مگر مجھ سے جو پوچھو تو سکون خاطر مفقود! ہر وقت "دوست کی یاد" موجود۔ اکثر یہی دیکھا گیا تاکہ: جب آپس میں کوئی ایک دوسرے کو یاد رہے تو اُسکا یاد کرنا اور آنا بھی لازمی ہے" جبکہ یہاں صورت حال جدا ہے تو پھر یہ یاد کیسی؟

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ الفت پر بھی کیونکر یاد آتے ہیں

یہ بھی عجیب زبردستی کی یاد ہے۔۔

لیکن میری سمجھ میں اب تک مطلق نہیں آیا کہ کیا چارۂ کار اختیار کروں۔ یہ معلوم نہیں اُسکی یاد کا وہ گہرا نقش جو میرے صفحۂ دل پر مرتسم ہوا ہے کیونکر دُور ہو۔ اور وہ کون سی روشنائی، اور وہ کونسا نسخہ ہے اور اُسکے اجزا وہ کون سے ہیں کہ جس سے اس طرح کا نقش مرتسم کرنے کے لیے کام لیا گیا؟ کیا اچھا ہوتا اگر اُس روشنائی کا نسخہ مجھے معلوم ہوتا۔ تو میں بھی اس یاد کے دفعیہ کے لیے اسی قسم کا نسخہ تلاش کرتا۔ مگر دستیاب ہونا معلوم۔ اسلیئے کہ قضا و قدر کو خود منظور نہیں کہ وہ نسخہ مجھے دستیاب ہو اور اُسکی یاد میرے دل سے جاتی رہے۔ خوب یاد ہے! بلبل کی چہک، کوئل کی کوک، پپیہے کی پی، بھونرے کی الاپ، پتوں کی پُرترنم آواز، جھیل کی مستانہ روی، یہ نیچرل زیر و بم، رزد و ساز، ایک حد تک ایک نیچر پرست کو کسی کی تغافل شعاری بھلا سکتی ہے

اکثر نے اس سے کام لیا - میں بھی لے سکتا ہوں، میں نے بھی لیا، ایک لحظہ بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ مگر آخر کیا ہوا؟ کیا بتاؤں - اتنی فدا سی تغافل شعاری کا عوض عجیب طرح سے یوں ملتا ہے کہ وہی یاد ایک قہر مجسّم، خشمناک، ابروؤں پر بل پڑا ہوا، سامنے موجود - اور مشغول جرح کہ " اس تغافل شعاری، لاپروائی کا جواب بتایا جائے کہ ایسی تغافل شعاری، لاپروائی، میری یاد سے کیوں برتی گئی؟ جس میں میری توہین ہے!" میں کیا جواب دوں؟ کوئی جواب ہوتا تو دیتا یا گویائی میرے اختیار میں ہوتی تو کہتا - آخر کار میں اقبالی مجرم ہو جاتا ہوں! (واقعی انصاف سے دیکھا جائے تو ہونا بھی چاہیے) یہ بھی عجیب اقرار جرم ہے!!

یوں تو فطرت کی عطا کردہ چیزوں میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہے - اعضاے انسانی میں "دل" جسقدر نرم اور لاجواب شے ہے کوئی دوسرا عضو اسکی برابری نہیں کر سکتا - کیونکہ یہ اثر پذیر بہت ہے، اور خاص کر میرا دل جو اچھی، بری، ذی روح، غیر ذی روح، غرض کائنات عالم کی کل چیزوں سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے - بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ دوست کی بیوفائی سے اس قدر تنگ آ گیا ہوں کہ العظمۃ للہ - اور میں نے بھی اسی رنگ کو دیکھ کر اپنے دل کو سخت بنانے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا، اس لیے کہ آخر میں بھی تو انسان ہوں، دل رکھتا ہوں، میری رگوں میں بھی خون گردش کھاتا ہے، میں بھی ہر ایک لذت اور جراحت کو محسوس کرتا ہوں - اسلیے میں نے اپنے دل کو جو نرم اور گوشت کا لوتھڑا تھا پارۂ الماس، زمرد، یاقوت کی طرح سخت بنا لیا، اور وہ بنگیا - (میرے خیال میں ان سنگریزوں میں یہ نسبت دوسرے سنگریزوں کے معنوی حیثیت سے دیکھا جائے تو زیادہ سختی ہونا لازمی ہے اسلیے کہ یہ ایک مدت تک بڑے بڑے گراں ڈیل پہاڑوں کے سینہ میں پوشیدہ رہتے ہیں اور ایک مدت کے بعد نکل کر اپنا اثر پھیلاتے ہیں) اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ "دوست کی یاد" سے نجات تو فی الحال پائی اب دل کو کس کام میں لگایا جائے (اسلیے کہ طبیعت ایک زمانے سے ان باتوں کی عادی ہے) غور کرتے کرتے پختہ ارادہ کر لیا کہ کوئی مضمون لکھا جائے اور اس کام کو شروع بھی کر دیتا ہوں لیکن غضب تو یہ ہے کہ اس کام کو ابتدا کیے ابھی چند سکنڈ بھی گذرنے نہیں پاتے کہ میری اس غفلت کو اسکی یاد محسوس کر لیتی ہے (اس سے مجھے گمان ہوتا ہے کہ اسکو بھی میری یاد ہوگی مگر مجھے یقین نہیں آتا) اور وہی یاد ایک محبوب متین، سنجیدہ صورت مجسم ہو کر، خندہ کناں، میرے روبرو جلوہ گر ہوتی اور نہایت ہی بردبارانہ طور پر مجھ سے یوں ہم کلام ہوتی ہے کہ :- ہاں جناب فرمائیے گا تو، کیا شغل ہو رہا ہے؟ چونکہ مجھے اسکی آمد کی اطلاع پہلے سے نہیں ہوتی اسلیے اس آواز کے ساتھ میری آنکھیں نیچے سے اوپر اٹھاتی

ہیں! اور دیکھتا کیا ہوں کہ وہی یاد ایک نورِ مجسم ہو کر سامنے موجود، ان آنکھوں سے میری آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ
کہ ہوش و حواس رخصت، بس مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشش روح کا عمل شروع ہو گیا۔ بلکہ شروع کر دیا گیا۔
مجھ میں، حس نہ حرکت، بفرضِ محال میں نے اپنے حواس بجا بھی رکھے تو نہایت ناتواں آواز سے جو میرے منہ ہی
منہ میں رہ جاتی ہے، کہتا ہوں کہ:- جی نہیں یوں ہی ایک مضمون جسکی سرخی کا شعر

اب لذتِ زخمِ جگری پوچھتے کیا ہو جب تم ہو نمک پاش تو پھر کیوں نہ مزا ہو

لکھ رہا ہوں - تو وہی یادِ مجسم ایک خندۂ پُرضیا سے اُسی طنطنہ اور وقار کو قائم رکھے مجھے یوں مخاطب کرتی ہے
کہ:- اچھا تو چند منٹ کے لیے قلم ہاتھ سے رکھ دیجیے، اور میری باتوں کا جواب دیجیے" میں مجبوراً حکماً
قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں، رکھ دیتا کیا معنی رکھ دینا پڑتا ہے۔ گو کہ اسوقت میں نے لاکھ لاکھ کوشش اس امر کی
تو ضرور کی کہ اُسکے حکم کی تعمیل نہ کروں مگر اُسوقت اس حکم کے رد کرنے کی طاقت خود میں موجود نہیں پاتا۔ اور مجھے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میری یہ طاقت بیک نگاہِ غلط انداز سلب کر لی! معلوم کہ یہ کیونکر ہو جاتا ہے!

مجبوراً بت بنکر کھڑا ہو جاتا ہوں تو ارشاد ہوتا ہے کہ:- باوجود تاکید کے پھر بھی آپنے میری یاد سے سہل انگاری
کی اسکی کیا وجہ ہے؟" ایسی صورت میں بعض اوقات یہ ہوا ہے کہ انسانی فطرتی تیزی عود کر آتی ہے اور میں بھی
اس موقع کو غنیمت تصور کر کے کسی قدر بیباکانہ (لیکن اسمیں بھی ایک حد تک عاجزی، انکساری کا پہلو صاف
طور پر دکھلائی دیتا ہے) کہتا ہوں کہ:- ستم کی بھی کوئی حد ہے، ظلم کی انتہا بھی ہے، لیکن یہ بیوفائی تا کجا؟
جب آپ نے مجھ سے لاپروائی کی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھوں" جواب ملتا ہے
کہ:- ایسا ہی سہی مگر بڑے بول کا سر نیچا۔ وہ آپ کی ابتدائی لن ترانیاں کیا ہوئیں؟ کہ میں ایسا میں ویسا
خیر بقول آپ کے میں ظالم، بدعہد، تغافل شعار، بیوفا، غرض سب کچھ سہی مگر آپ یہ تو بتائیے کہ محبت کی
عدالت میں آپ بیوفائی کے مجرم کیوں قرار پاتے ہیں۔ آپ کے قول و فعل کا کہاں تک اعتبار کیا جائے" یہ
یہ کہکر بغیر اسکے کہ مجھسے انکا جواب سنے وہ یادِ مجسم چلی جاتی ہے اور میرا مضمون دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔
اور میں بسمل کی طرح تڑپتا رہتا ہوں۔ یہ بھی از کمی یاد ہے!!

غرضکہ یہ واقعات میں حقیقت سے گریز کرنی نہ چاہیے۔ بعض دفعہ یہی یاد میرے حق میں فرشتہ غیبی سے
کم نہیں ثابت ہوئی، کیونکہ اکثر دفعہ میں دنیا کی بے ثباتی پر غور کر کے بہت کہیں سے کہیں پہونچ گیا ہوں اور
اسی عہد میں اس قدر ٹھوکریں کھائیں کہ پناہ بخدا اسکا کر دو راست پہ آنے کی جس قدر کوشش کی اُسی قدر

اور گم کردہ راہ بنا (واقعی ہونا بھی یہی چاہیے اسلیے کہ میری طبیعت کو کسی پہلو قرار ہی نہیں) سوچتے سوچتے بعض اوقات اس نتیجہ پر پہونچا کرتا۔ شاید زندگی اسی کا نام ہے جسکی کائنات کو ضرورت ہے۔ حالانکہ وہ صریحاً دیکھ رہے ہیں کہ بجز درد، تکلیف، رنج، مصیبت، یاس، حسرت وغیرہ کے کچھ بھی نہیں مگر ایک عالم ہے کہ اسکا شیدائی، اسی کا فدائی۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو اس زندگی میں کوئی لمحہ ایسا جس میں ہم جسکو بھی راحت یا مسرت کہہ سکیں ملنا غیر ممکن! مجھے تو ایسی زندگی کی خواہش نہیں۔ مجھے ایسی زندگی کی تمنا نہیں۔ مجھے ایسی زندگی چاہیے جس میں ایک ایسی محویت ہو کہ اپنا ہوش نہ رہے، ایک ایسی لذت محسوس ہو کہ دنیاوی لذتیں اسکا مقابلہ نہ کر سکیں، ایک ایسی روحانی کیفیت طاری ہو کہ جسکی کیفیت عقل انسانی حل کرنے سے قاصر رہے۔ چونکہ انسان علائق دنیاوی میں ایسا مقید ہے کہ دنیا میں جیتے جی ایسی زندگی ملنا ناممکنات سے معلوم دیتا ہے تو یہی خیال اکثر یہی ہوا اور کئی دفعہ پختہ ارادہ بھی کر چکا۔ کہ طائر روح کو قفس عنصری سے قبل از وقت آزاد کر دوں، اور "حیات ابدی" حاصل کروں (نہ معلوم کہ تقدیر کو کس مدت تک اس قفس عنصری میں طائر روح کا مقید رکھنا منظور ہے) کہ وہی یاد "فرشتۂ رحمت" بنکر مجھے میری غفلت سے اس طرح بیدار کرتی ہے:۔ خبردار۔ صراط مستقیم سے قدم نہ ڈگمگانے۔ کہیں ایسی غلطی کا مرتکب نہ ہونا ورنہ بجائے "حیات ابدی" کے عذاب سرمدی میں گرفتار ہو جائے۔ صبر و استقلال سے کام لے۔ دیکھ کہ آئندہ کیا کیا ہونے والا ہے"۔ میں وہیں اس خواب غفلت سے چونک جاتا ہوں تو میری مسرت اسقدر بڑھ جاتی ہے اور میں کس قدر اُسکی یاد کو یاد کرتا اور دعائیں دیتا ہوں کہ اُسکے وجود سے مجھ پر کیسی خطرناک حقیقت کھلی اور میں کیسی خطرناک غلطی سے متنبہ کیا گیا۔ ورنہ نہ معلوم کیا ہوتا اور میں کیا کر جاتا! اُسوقت میری موجودہ مسرت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس مسرت کی لذت کو وہی خوب محسوس کریگا جو میری طرح کا دل رکھتا ہو، ورنہ دوسرا ممکن نہیں کنہ ذات کو پہونچ سکے! اور اس لذت کو محسوس کر سکے! آہا، یہ ہے سب سے اچھی اور سب سے زیادہ پیاری یاد ہے!

غرض یہ یاد عجیب عجیب طرح سے آکر اپنا کرشمہ دکھا جاتی ہے۔ کبھی تو میرے زخموں پر مرہم رکھتی ہے اور کبھی میری جراحتوں پر نمک پاشی ہوتی ہے، ہو، کچھ بھی ہو، دونوں حالتیں لذت سے خالی نہیں۔

آ۔ او پیارے دوست کی پیاری یاد آ۔ کائنات عالم کی بساط الٹ جائے۔ رات دن [illegible] رات ہو جائے۔ خورشید نیلگوں آسمان پر چمکنا بھول جائے۔ سمندر خشک ہو جائے جسد فنا کی نالی رہ جائے مگر تیری یاد میرے دل سے کبھی نہ جائیگی! نہ جائیگی!! نہ جائیگی!!!

بشیر احمد اختر

# خوانِ دعوت

## حالات گوکھلے

ہندوستان کے بہت فرزند اور مشہور شیدائے وطن آنریبل گوپال کرشن گوکھلے اُن لوگوں میں سے تھے جن کی ذات ملکی و قومی ترقی کے لیے منجملہ دیگر اسباب کے ایک خاص ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ انھوں نے ہندوستان و اہل ہندوستان کے لیے جو کچھ کیا وہ اگرچہ اُنکا فرض تھا لیکن اُنکے کارناموں سے فائدہ اُٹھانیوالے نفوس بہرحال زیر بار کرم ہیں۔ اُنکی حقیقی عظمت کا سب سے بڑا راز اُنکا وہ جذبۂ ایثار تھا جسکی مثالیں بہت کم دنیا میں پائی جاتی ہیں ضرورت تھی کہ اُنکے کوائف زندگی جن میں جگہ جگہ ایثار و قربانی کی تصویریں پائی جاتی ہیں موجودہ نسلوں کی رہنمائی کے لیے ہر وقت پیش نظر رکھے جائیں۔ اور ہم خوش ہیں کہ "حالات گوکھلے" کے نام سے مسٹر مظفر حسین خاں صاحب بی اے، ایل ایل بی۔ وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد نے ایک مختصر رسالہ اُردو خوان پبلک کیلیے مرتب کیا ہے جس میں مسٹر گوکھلے کی ابتدائی زندگی سے لیکر آخر وقت تک کے واقعات پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ کتاب بار بار چھپے گی اور مشتہر ہوگی۔ افسوس ہے کہ کتاب کے ملنے کا پتہ اور قیمت سرورق پر درج نہیں ہے۔ غالباً مولف کے پتہ پر حیدرآباد سے مل سکے گی۔

## نصائح چانکیہ

خاک ہند سے جیسے جیسے مدبر، حکیم، فلاسفر اور عالم پیدا ہوئے وہ اس ملک کی تاریخ کے لیے باعث نازشیاں ہیں۔ منجملہ اُنکے قنوج کا نامور برہمن "چانکیہ" بھی تھا۔ جو مہاراجہ چندر گپت کا دیانتدار مشیر اور مدار المہام رہا تھا۔ دنیا کے نشیب و فراز دیکھنے اور انقلاب دہر سے متاثر ہونے کے بعد اُس نے اپنی مالامال طبیعت سے ایک نصیحتوں کی کتاب نیتی شاستر مرتب کی جو بلحاظ فہرست کے اسوقت ۲۳ سو برس قبل کی تصنیف کہی جا سکتی ہے جسکا ہمنت راؤ صاحب ... سل سرکار نظام نے اُردو میں ترجمہ کیا اور زمانہ پریس کانپور نے صفائی کے ساتھ اُسے چھاپا ہے۔ قیمت ۲ر ہے

## روٹھی رانی

اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مسٹر نواب رائے کا نام نیا نہیں ہے۔ "آدیب" اور زمانہ میں اُنکے قلم سے کئی دلچسپ مختصر قصے نکلے اور پبلک میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ ۱۹۰۷ء میں موصوف نے منشی دیبی پرشاد صاحب کے ہندی قصہ سے اخذ کرکے "روٹھی رانی" کے عنوان سے ایک دلکش فسانہ زمانہ میں شایع کرایا جسکو منشی دیا نرائن صاحب نگم نے اب جداگانہ کتابی صورت میں چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحوں پر خوشنمائی کے ساتھ چھاپا ہے۔ جسکے مطالعے سے نسوانی فطرت کے تاثرات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ملنے کا پتہ: زمانہ پریس کانپور

## القریش

محمد علی صاحب رونق صدیقی کچھ عرصے سے ایک مذہبی و قومی رسالہ "القریش" کے نام سے امرتسر سے شائع کرتے ہیں۔ اس مرتبہ اپریل کا پرچہ "صدیق نمبر" نکلا ہے جس کے تمام مضامین سیدنا حضرت عبداللہ ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل سے لبریز ہیں۔ مضمون نگار اصحاب نے جن میں بہترین انشا پرداز اور ملک کے ممتاز اہل قلم شامل ہیں پوری کوشش اور محنت سے مضامین لکھے ہیں اور ایڈیٹر صاحب کو اس نمبر کی ترتیب میں حقیقی کامیابی ہوئی ہے چونکہ یہ نمبر نفوس انسانی کے اخلاق و ترتیب کی مکمل اصلاح کا ذریعہ اور زہد و اتقا، عصمت و عفاف، احسان و کرم، علم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف اور غیرت و استغنا کا سبق دینے والا ہے اس لیے خاص طور پر کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے۔ اور بجائے خود مکمل مجموعہ ہے۔ ۸ر قیمت پر دفتر "القریش" رونق منزل امرتسر سے طلب کیا جائے۔

# چند دلکش کتابیں

## فیوچر آف اسلام

یہ کتاب مسٹر ولفرڈ بلنٹ سیاحِ بلادِ اسلامیہ و نزیلِ مصر کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جسمیں مصنف نے اسلام کی موجودہ مذہبی و پولیٹکل حالت پر غور کرکے اسلام کے استقبال کے متعلق طبع آزمائی کی ہے اور مختلف مشورے اپنے ہم مذہبوں، اپنی قوم اور مسلمانوں کو دیئے ہیں۔ متعدد حواشی اور ایک ضمیمہ بھی ترجمہ میں اضافہ کیا گیا ہے جسمیں اسی مضمون کا ترجمہ بھی ہے جو مصنف نے ہندوستان کی سیاحت کے بعد لکھا تھا قیمت ۸ فی جلد ۸ر

## سفر دار المصطفیٰ

یہ کتاب کپتان رچرڈ فریڈرک برٹن کے سفرنامہ انگریزی "پلگریج ٹو المدینہ اینڈ مکہ" کا ترجمہ ہے۔ اس میں ۱۲ ابواب ہیں اور ملک حجاز کے عہد تاریخ سے لیکر دور حاضر تک کے حالات نہایت دقیق النظری سے لکھے گئے ہیں۔ کپتان موصوف نے اس تصنیف کی بدولت یورپ میں غیر معمولی شہرت حاصل کی تھی اور اسمیں شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے بیان کی شگفتگی اور طرز تحریر کی دلفریبی کے سبب سے دوسرے تمام سفرناموں پر فوقیت لے گئی ہے قیمت فی جلد ۸ر

## قد افلح من تزکی

(بیشک وہ (دینی و دنیاوی) مراد کو پہونچ گیا جو سنورا)

کلام مجید ان اغراض کے لیے بمنزلہ اکسیر ہے۔ دنیا بھر کے نیک مسلمان اسی لیے روزانہ تلاوت کیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں غیر عربی دانوں کیلیے ہر زمانہ میں ترجمے ہوتے رہے ہیں اردو زبان میں مستند اور سلیس ترجمہ اگر درکار ہو تو جناب مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔ اڈیٹر صاحب الناظر خود پڑھتے ہیں اور اپنے احباب سے سفارش کرتے ہیں کہ اس ترجمہ سے مستفیض ہوں۔ یہ حمائل کی صورت میں ہے اور خواص القرآن حواشی مفیدہ نے اسکی خوبی دوبالا کردی ہے جلد انجمنی نے مذاق جدید کے مطابق بنوادی ہے۔ ہدیہ صرف للعہ

## تاریخ ایران

اس میں شک نہیں کہ یورپ میں مصنف جنھوں نے ایران پر قلم اٹھائے ہیں انہیں کوئی تصنیف تحریر میں فرو گذاشت بھی نہیں کر دیتے۔ مسٹر ایس۔ جی۔ ڈبلیو بنجمن نے جو دولت امریکہ کی طرف سے پہلا ایران میں سفیر کے عہدہ پر مامور تھے ایران کی ایک جامع اور مکمل تاریخ اپنے ابنائے ملک کی واقفیت کیلئے بڑی کدوکاوش سے لکھی تھی جسکا اردو میں "تاریخ ایران" کے نام سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ قیمت عہ ر

## سفرنامۂ جاپان

دنیا میں اگر کوئی مشرقی ملک اسوقت ترقی و شہرت کی منزلت کا حقیقی معنوں میں مستحق ہے تو وہ جاپان ہے اور عام بیداری کے اثر سے مذہب حقہ کی تشنگی اسی ملک کے باشندے محسوس کر رہے ہیں۔ اخبار "الارشاد" قاہرہ کے فاضل اڈیٹر شیخ علی احمد جرجاوی نے حمیت مذہبی کے ساتھ اسلام اور جاپان کے مسئلہ کو پیش نظر رکھکر اس ملک کا سفر کیا اور واپسی پر اپنا سفرنامہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جسکو مولانا حسن میاں صاحب پھلواروی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں جاپان کے چشم دید واقعات ملک کے عام حالات اور چند روز میں بارہ سو معزز جاپانیوں کے مشرف باسلام ہونے کا بیان نہایت دلچسپ ہے۔ قیمت عہ

## دختر وزیر

لیڈی ہڈ اکر مس الیٹن جلشن شاہی طبی مشیر کی تالیف کردہ ایک جدید دلچسپ ناول کا ترجمہ جو بوجہ قبولیت عام دوسری مرتبہ چھاپا گیا ہے۔ احباب بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں قیمت عہ

مینجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

### مرزا رجب علی سرور
- فسانۂ عجائب ۱۲ر
- الف لیلہ عہ
- گلزار سرور ۸ر
- انشائے سرور ۶ر

### منشی امیر احمد مینائی
- امیر اللغات ۲ جلد عہ
- سفینۂ عشق سے
- خطوط امیر احمد ع

### جلال مرحوم لکھنوی
- مضمون ہائے دلکش عہ
- نظم نگارین ۸ر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸ر

### منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۱۰ر
- پیاری دنیا ۱۰ر
- طلسمی فانوس ع
- طرحدار لونڈی عہ
- میٹھی چھری ۶ر
- کایا پلٹ ۱۲ر

### منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا الفی ۱۰ر
- مایہ تمکین ۱۰ر
- بنگالی دولھن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ عہ

### مولانا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی عہ
- ابوبکر شبلی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- عصر قدیم عہ
- دولت سپانیہ عرب ۳ جلد عہ
- حروب صلیبیہ ع
- آغا صادق صاحب عہ
- تذکرۂ شاہ عبد الحکیم عہ
- سقدس نازنین عہ
- قیس ولبنیٰ عہ
- ایام عرب ع
- ملک العزیز ورجنا عہ
- یوسف ونجمہ عہ
- روزینہ الکبریٰ عہ
- فلورا فلورنڈا عہ
- فردوس بریں عہ
- آغا صادق کی شادی ۱۰ر
- حسن کا ڈاکو عہ
- دربار حرام پور ۱۰ر
- خوفناک محبت عہ
- الفانسو ۱۲ر
- ظلیانا عہ
- فاتح مفتوح عہ
- جویائے حق عہ
- ماکم خرمی عہ
- لعبت چین عہ
- تاریخ بغداد ۱۲ر
- حسن بن صباح ۶ر
- افسانۂ قیس ۲ر

### پنڈت رتن ناتھ سرشار
- ہشو ۶ر
- بچھڑی دولھن ۸ر
- کامنی عہ
- خدائی فوجدار عہ
- فسانۂ آزاد عہ
- سیر کہسار عہ
- جام سرشار عہ

### مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا عہ
- لیلیٰ مجنوں ۸ر

### پنڈت کیفی بی اے
- صبح وطن عہ
- گلدستۂ پنج عہ
- کلا ۸ر

### سید برکات احمد
- جمیلہ ۱۲ر
- بیوفا ۱۲ر
- یادگار سلف ۶ر

### خواجہ عشرت
- زباندانی ۱۲ر
- قواعد میر ۶ر
- ہجولی ۷ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸ر
- تذکرۂ آب بقا عہ
- گلدستۂ ظرافت ۶ر

### منشی احمد علی شوق قدوائی
- ترانۂ شوق عہ
- گنجینہ ۸ر
- قاسم و زہرہ ۱۲ر

### ڈاکٹر اقبال
- ملت بیضا ۱۴ر
- شکوہ ۲ر
- جواب شکوہ ۳ر
- مکمل ترانہ ۲ر
- اکبری اقبال ۳ر
- رموز بیخودی عہ
- اسرار خودی عہ

### منشی محمد حسن خان
- ماہ زہرہ ع
- ترکوں کی معاشرت عہ

### مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ عہ
- حیات جامی ۸ر
- علوم عرب عہ
- خواتین عہ

### مولوی سید سلیمان
- ارض القرآن ۲ جلد ۱۲ر
- حیات امام مالک ۱۲ر
- لغات جدیدہ عہ
- مکاتیب شبلی ۲ جلد عہ
- اہل السنۃ والجماعۃ ۸ر

### خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل عہ
- روزنامہ باتصویر سے
- روزنامچہ ۸ر
- سنحر زہر و قہر ۸ر
- محرم نامہ عہ
- آداب خطوط نویسی ۸ر
- یزید نامہ عہ
- بیوی کی تعلیم ۴ر
- حسین نامہ ۸ر
- کرشن بیتی ع
- اردو دعائیں ۶ر
- حقنل ببیار زوپ ۸ر
- غدر دہلی کے افسانے عہ
- چیلیاں اور گدگدیاں ۱۰ر
- جگ بیتی ۶ر
- بچوں کی کہانیاں ۶ر
- مضمون حسن نظامی ۱۲ر
- کرشن موت عہ
- سیر دہلی عہ

### مولانا راشد الخیری
- صبح زندگی عہ
- شام زندگی عہ
- شب زندگی (زیر طبع)
- طوفان حیات عہ
- سراب مغرب ۸ر
- ستارۂ صبح کے آنسو ۶ر
- نوبت الوقت ۸ر
- جوہر قدامت عہ

### نیاز فتح پوری
- اکتشافِ عرکا انجام ۸ر
- مرغی سیاہ کی ڈائری ۸ر
- کیوپڈ اینڈ سائکس ۸ر
- کیتان جلی عار

### سیماب اکبرآبادی
- خدیجۃ الکبریٰ عہ
- بنت الرسول ۵ر
- سیرۃ الحسین ع
- جام کوثر ۵ر

### مسز سلطان حیدر جوش
- ابن مسلم عہ
- صبر کی بیوی ۴ر

### مسعود مرزاپوری
- بزم خیال عہ
- مرقع ادب عہ
- شاطرۂ سخن عہ

### مولانا حسرت موہانی
- حیات تسلیم عہ
- شرح دیوان غالب عہ
- دیوان حسرت عہ

### مولوی مصباح الدین احمد
- الماسدان عہ
- محاربہ فرانس و جرمنی عہ
- مصباح اللغات [illegible]

تصانیف [illegible]

**الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ**

## مولانا اشرف علی

- نشر الطیب فی ذکر الحبیب
- تعلیم الدین
- اکسیر فی اثبات التقدیر
- انتخابات المنظوم
- اصلاح الرسوم
- کلید مثنوی ۴ جلد
- مناجات مقبول
- بہشتی زیور ۱۰ حصے
- بہشتی گوہر
- تربیت السالک ۲ حصے
- ہفت اختر

## علامہ سید احمد

- حیات الاسلام
- فن ہیئت
- فن کیمسٹری

## مولوی عبد الحق بی اے

- قواعد اردو
- انتخاب کلام میر

## مولوی بشیر الدین احمد

- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- حزم سلطان
- اشاعت
- عصائے پیری
- اقبال دولھن
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- انجیبو دو دو باتیں

## منشی محمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

## سید محمود علی

- دین و دانش
- الایمان

## مسٹر عبد الماجد بی اے

- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد
- فلسفۂ اجتماع
- زود پشیماں (ڈرامہ)

## پروفیسر نواب علی ایم اے

- تذکرۃ المصطفیٰ
- معارج الدین

## سید ہاشمی فرید آبادی

- مشاہیر یونان و روما
- تاریخ یونان قدیم

## مطبوعات انجمن ترقی اردو

- فلسفۂ تعلیم
- رہنمایان ہند
- نپولین اعظم
- امرائے ہنود
- القمر
- تاریخ تمدن
- مبادی سائنس
- فلسفۂ جذبات
- فلسفۂ اجتماع
- مقدمات الطبیعیات
- طبقات الارض
- البیرونی
- مشاہیر یونان و روما
- تاریخ یونان قدیم
- تاریخ اخلاق یورپ
- علم المعیشت
- دریائے لطافت
- انتخاب کلام میر
- اردو کا نیا قاعدہ
- کلید قاعدہ
- اسباق النحو ۲ حصہ
- القول الاظہر

## مولانا عبد الغفور

- مصباح الکلام
- حدائق البیان

## مرزا حیرت دہلوی

- سیرۃ الرسول کامل
- کتاب الشہادت کامل
- مضامین حیرت
- نور جہاں بیگم

## منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- حیات صالح

## خواجہ غلام الحسنین

- فلسفۂ تعلیم
- دستور المعلمین
- معیار الاخلاق
- تربیت اولاد

## مولانا عبد الشکور

- اسد الغابہ ۵ جلد
- علم الفقہ ۴ جلد
- تاریخ طبری

## خواجہ عبد اللہ اختر بی اے

- دمشق
- حضرت زید
- ام القریٰ

## حافظ عبد الرحمن امرتسری

- سفر نامہ بلاد اسلامیہ
- الصدیق
- سیاحت ہند ۲ جلد
- عربی بول چال ۲ حصے

## مرزا سلطان احمد

- فنون لطیفہ
- خیالات
- امثال
- فن شاعری
- ثبوت

## مولانا خلیل احمد اسرائیلی

- آیات اسماء اللہ الحسنیٰ
- کارنامہ ترک

## مفتی محمد لطیف بی اے

- اکبر
- اورنگ زیب

## مولوی محمد حلیم انصاری

- تمدن اسلام ۲ جلد
- الاسلام والنصرانیۃ
- اسلام اور سوشل نظام
- فتح اندلس

## مولانا عبد الغنی

- معیار العرب
- ارمغان الغنی
- تذکرۃ الشعرا

## سید راحت حسین بی اے

- القمر
- انخل

## مولوی الحاج ظفر حسن آبادی

- علم السیاست
- تاریخ مصر جدید

## مطبوعات الناظر پریس

- میلاد النبی
- محاربات صلیبی
- تسخیر فرانس
- الاحسان
- حیات نظامی
- تذکرۂ حزین
- جمیل و بثینہ
- مصنوعی شوہر
- اتفاقات زمانہ
- سیکفرنا اور لوسی
- شوکیا دینہ و منظوم بیانیہ
- کاری کمپنی اور ان کی مذہبیت
- سادات
- مبادی جاہ و ثروت
- انسان
- ترقی زبان بذریعہ تراجم
- نوبہار
- مثنوی سید نعیم
- مسلمانان اندلس
- اصول فتح
- کلیات نعت
- واقعات کربلا
- بچوں کی تعلیم کے سنہری اصول
- کنول
- خیابان
- عورتوں کی انشا
- اساس التعلیم
- انقطاع الانبیا
- رموز فطرت
- تاریخ ہند کی کہانیاں
- خوان دعوت
- اسرار زندگان

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

قیمت سالانہ ۶ع

ماہانہ شائع ہوتا

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

| نمبر ۱۲۱ | ماہ جولائی سنہ ۱۹۱۹ع | جلد ۲۱ |
|---|---|---|

فہرست مضامین



قیمت فی پرچہ ۵

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

قیمت ششماہی ۳

پرنٹر و پبلشر۔ اسحاق علی علوی

# قابل دید کتابیں

**فلسفہ تعلیم** حکیم ہربرٹ اسپنسر کی لاجواب کتاب کا ترجمہ جسکے مطالعہ سے مسئلہ تعلیم نہایت صاف روشنی پڑتی اور بڑی حد تک اس منزل دشوار میں رہنمائی ہوتی ہو قیمت عگر

**تاریخ التعلیم** ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ایم پروفیسر علیگڈھ کالج جنھوں نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کیلئے وقف کررکھی ہے اور فن تعلیم کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہو کہ مسلمانان ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو اس قدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو یہ کتاب انھیں کے رشحات قلم سے نکلی ہو اور اس قابل ہو کہ وہ تمام اصحاب جو ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مطالعہ فرمائیں قیمت عصر

**اساس التعلیم** بچوں کی ابتدائی تعلیم کن اصولوں پر ہونی چاہیے علمی اور عملی تدابیر معہ متعدد عکسی تصاویر قیمت عا

**چھوٹے بچوں کی تعلیم کے اصول** ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں کا لاجواب لکچر قیمت ۴ر

**فلسفہ اجتماع** علم النفس کی لاجواب کتاب جسمیں اُن کیفیات و حسیات نفس کا بیان ہو جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں قیمت عصر

**فلسفہ ازدواج** جسکے متعلق مولانا حالی مرحوم نے یہ قیمتی رائے ظاہر فرمائی تھی کہ ہر متاہل اور غیر متاہل شخص کا فرض ہو کہ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک بار بار پڑھو اُسکی ہدایتوں پر عمل کرے اور جس ہدایت پر خود عمل کرسکتا ہو اُسپر اپنے متاہل دوستوں ورعزیزوں اور اُن نوجوانوں کو جو عنقریب اس جوے کو اپنی گردنوں پر رکھنے والے ہیں اُن پر عمل کرنے کی تاکید کرے۔ ایک جلد منگا کر ملاحظہ فرمائیے قیمت عصر

**النّاظر بک ایجنسی کی**
**مکمل فہرست**
**مفت بھیجی جاتی ہے**

**القول الاظہر** علامہ ابن مسکویہ نے صانع عالم کا ثبوت دلائل فلسفیہ سے پھر مسئلہ نفس اور اسکے ادراکات کا بیان اور نبوت کا اثبات بڑی خوبی سے کیا ہو مسئلہ ارتقا جو ڈارون کا نظریہ کہا جاتا ہو اسکا ذکر اس کتاب میں موجود ہے قیمت عہ

**القمر** چاند کی ماہیت و حقیقت پر علم ہیئت و ریاضی کی رو سے بحث۔ جدید معلومات کا ذخیرہ قیمت ۸ر

**علم المعیشت** یعنی اصول اکنامکس یا اقتصادیات پر اُردو میں سب سے پہلی جامع و مستند کتاب جس کی خوبی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہو کہ اُس کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اپنی کتاب علم الاقتصاد کے متعلق لکھا کہ اب اسکے پھر چھپنے کی ضرورت نہیں تمثیلات تمام تر ہندوستان کی دی گئی ہیں اور ہر مسئلہ کا انطباق اس ملک کے حالات سے کیا گیا ہو قیمت سے

**مقدمات الطبیعات** پہلی مکمل کتاب طبعیات پر قیمت عہ

**مبادی سائینس** علم حیوانات، نباتات اور معدنیات کے تمام ابتدائی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں قیمت عا

**طبقات الارض** پہلی مکمل کتاب ارضیات پر قیمت عہ

**رموز فطرت** سائینس کے ابتدائی و بنیادی مسائل قیمت عا

**انسان** انسان کی حقیقت و ماہیت سائینس کے اصولوں پر ۸ر

**جان کی دشمن مکھی** مکھی کی وجہ سے جو امراض پھیلتے اور جسقدر انسانی زندگیاں تلف ہوتی ہیں اُس کی حقیقت عام نگاہوں سے پوشیدہ ہو اس رسالہ کے مطالعہ سے ہر شخص ان حالات سے آگاہ ہو کر اپنے اور اپنے خاندان والوں کی تندرستی و صحت کا انتظام کرسکے قیمت ۸ر

رسالہ علم فلاحت عا رسالہ علم برق عا

النّاظر بک ایجنسی لکھنؤ

# مطبوعات جدیدہ

## رسالہ علم نباتات

مولفہ مولوی محمد یوسف صدیقی - یہ علم نباتات کا پہلا رسالہ ہے جو انجمن ترقی اردو کی طرف سے حال ہی میں شائع ہوا ہے اس میں بہت سلاست اور صفائی سے علم نباتات کے مسائل سے بحث کی گئی ہے تاکہ عام اردو خواں اصحاب بآسانی اُن امور کو سمجھ سکیں - نظام فطرت کے مطالعہ اور قوت مشاہدہ کی تربیت کے لیے اس کا پڑھنا نہایت مفید ہوگا - قیمت ۱۲ر

معلومات - خریدار رسالہ معلومات لکھنؤ کے نام مکمل سٹ اور متفرق پرچے ہمارے دفتر میں آگئے ہیں - مکمل سٹ (مجلد) کی قیمت ۴ر اور فی پرچہ ۴ر

## ضرورت ہے

ایک لائق انگریزی مددگار کی جو الناظر کے سب ایڈیٹر اور دفتر ہر دو کے منتظم رہیں گے - تنخواہ علیٰ قدر قابلیت پچاس روپیہ یا زائد - کوئی تعلیم یافتہ نوجوان ایک اخبار نویس اور کاروباری شخص کی آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہیں وہ خاص طور پر موزوں ہوں گے - اور اگر روپیہ لگا کر کاروبار کی توسیع میں معاون ہوں گے تو کافی نفع بھی اُٹھائیں گے

خط و کتابت سے زبانی طے کر لیے جائیں

ظفر الملک علوی - ایڈیٹر الناظر لکھنؤ

مجموعہ کلام شبلی - یعنی مولانا شبلی کا اردو کلام - یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ اب دوسرا ایڈیشن چھپ گیا ہے - قیمت ۱۲ر

## شب زندگی

(مصنفہ مولوی عبد الراشد الخیری)

جس کا اعلان کئی مہینے ہوئے کیا گیا تھا اب خدا خدا کرکے تیار ہو گئی ہے اور انشاء اللہ آیندہ ہفتہ میں روانہ ہو سکے گی جن صاحب کو درکار ہو فوراً اطلاع دیں - کیونکہ اس کی مانگ بہت ہے - ورنہ پھر دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے - قیمت عصر

## مثنوی اُمید و بیم

(از جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی بی اے رسوا لکھنوی)

یہ لاجواب نظم اپنی آپ نظیر ہے - علاوہ اس کے کہ مرزا صاحب کی شاعری کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں، مسائل فلسفیہ کو جس سلاست اور صفائی سے مرزا نے نظم کیا ہے وہ خاص طور پر قابل داد ہے - قیمت ۴ر

**منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

نمبر ۱۳۷۰

# طاقت بڑھانیوالا پھل

کولا ٹانک افریقہ کا ایک نہایت قوت دینے والا پھل ہے زیادہ فکر یا محنت کی وجہ سے یا غم و بیماری و تبدیل آب و ہوا کے سبب بدن کمزور ہوگیا ہو تو اسکو استعمال کیجیے نئی طاقت پیدا ہوتی ہے دم کو بڑھاتا ہے اسلیے گھوڑے کی سواری پہاڑ کی چڑھائی کشتی کسرت ناچ گانا پڑھنا پڑھانا وغیرہ کاموں میں پہلے اسکو استعمال کرنے سے دم نہیں پھولتا - ہولدل - دھڑکن کو روکتا ہے رات کو جاگنا ہو تو اسکو پی لیجیے تکان نہیں ہوگا - یہ شراب اور افیون کی عادت کو چھوڑاتا ہے مفصل حالت کی فہرست بلا قیمت منگاکر دیکھیے - قیمت ۳۲ خوراک کی شیشی ایک روپیہ عہ محصولڈاک ۵ر

ادویات ہر جگہ دوکانداروں اور ڈاکٹروں اور دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں ورنہ کارخانہ سے طلب کیجیے

## زخم کا مرہم

یہ زخم کا مرہم سب طرح کے زخموں میں فائدہ کرتا ہے - زخم کے کیڑے اس سے مرجاتے ہیں بدبو جاتی رہتی ہے زخم صاف ہوکر جلد انگور کی طرح بھر آتا ہے اور نیا چمڑہ پیدا ہوکر زخم کو آرام ہو جاتا ہے چھوٹی زخم سے لیکر بڑے گلے زخم تک یہ سادی اثر دکھلاتا ہے - قیمت ایک اونس کی ڈبیہ ۵ر زخم دہونے کی ٹکیہ - مرہم لگانے کے ساتھ ہی زخم دھونا چاہیے - جس دوا سے زخم دہونے کا پانی بنتا ہے وہ چھوٹی چھوٹی ٹکیہ کی صورت بنی ہوئی ہے - ایک ٹکیہ سے زخم دھونے کا پانی بنتا ہے - مرہم کے ساتھ ٹکیہ مل سکتی ہے قیمت فی ٹکیہ ار محصول ڈاک ہر دو ۵ر

## کونین کی ٹکیاں

یہ خوبصورت چھوٹی چھوٹی کونین کی ٹکیاں کل میں بنتی ہیں اور سنہلی ٹین کی ڈبیا میں ۱۶ ٹکیاں رہتی ہیں - کونین کا استعمال کرتا ہو تو یہ کونین کی ٹکیہ پاس رکھیے اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تکلیف قیمت ۱۶ ٹکیوں کی ڈبیہ ۸ر محصول ایک ڈبیہ سے ۲ ڈبیہ تک ۵ر

## داد کا مرہم

ہر وقت کے کھجلانے سے آرام کرنا بہتر ہے دیکھیے جناب مہاراجہ صاحب ریاست شنکر پور ضلع بھاگلپور سے کیا لکھتے ہیں یہ دوسرا موقع ہے کہ آپکے داد کے مرہم نے جادو کا اثر دکھلایا جس سے میں نے ہر وقت کی پریشانی سے نجات پائی آپکا نہایت مشکور ہوں - اسکے استعمال کرنیوالے سبھی جناب مہاراجہ صاحب کی طرح سے مداح ہیں کیونکہ دو ہی تین مرتبہ کے استعمال سے بغیر کسی تکلیف کے ایکدم اچھا کردیتا ہے - قیمت فی ڈبیہ چار آنے ۴ر ایک سے ۶ تک چھ آنے ۶ر

## ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

یہاں کی دوائیاں لکھنؤ میں ہمارے ایجنٹ ڈاکٹر گنگا رام جبلی کے پاس ملتی ہیں -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۲۱ جلد ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

## گذشتہ دس سال

خدا کے فضل و کرم سے آج الناظر کی زندگی کا گیارہواں سال شروع ہوتا ہے۔ بےسروسامانی کی وجہ سے دُنیا کی دہ سالہ زندگی پر کوئی بسیط تبصرہ پیش نہ کرسکنے کے باوجود نامناسب ہوگا اگر خود الناظر کی گذشتہ زندگی پر ایک نظر نہ ڈالی جائے۔

جولائی سنہ ۱۹۰۹ء میں جب الناظر کا پہلا پرچہ اہل مُلک کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا گیا ہے تو اُسوقت "الناظر کے اجرا کی ضرورت" پر جو کچھ بطور تمہید لکھا گیا تھا اُس میں ہم نے الناظر کے اغراض و مقاصد کا حسب ذیل خاکہ پیش کیا تھا:۔

"اُردو لٹریچر کو علمی اور سائنٹفک خیالات کے اظہار کا آلہ بنانے۔ قدرت کی گوناگوں نیرنگیوں کی تصویروں اور نقشوں سے اُسے مالا مال کرنے۔ تہذیب و اخلاق تمدن و معاشرت کے اعلیٰ مسائل کو اسکے ذریعہ سے رواج دینے۔ غیرملکوں کے لٹریچر، آدابِ معاشرت، تاریخ و جغرافیہ اور وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل کے مرقعوں کی اُس میں اشاعت کرنے اور اُسکے لیے دُنیا کی قدیم و جدید علمی زبانوں کے بیش بہا معدنیات سے علوم و فنون کے جواہر اور تحقیق و تلاش کے پُرصدف سمندروں سے دُرہائے مضامین لانے میں ہماری کوششیں اتنی وسیع۔ نمایاں اور مفید نہیں ہوئیں جتنی کہ اُس مناسبت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھیں جو ساکنان لکھنو

اور صوبۂ اودھ کے باشندوں کو اُردو سے ہے ''

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ

''ہمارے صوبہ کا تعلیم یافتہ گروہ ابھی تک اس طرف متوجہ نہیں ہوا ہے کہ اُردو زبان کی خدمت گذاری کو بھی اپنے ذمہ ایک فرض سمجھے۔ اور اگرچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قدرت کے کارخانے سے انشا پردازی کی خداداد قابلیت لے کر آئے ہیں لیکن چونکہ نہ کوئی اُن کو اس قسم کی تحریک دے کر غنودگی و مدہوشی سے بیدار کرنے والا ہے اور نہ اُن کے پیشِ نظر کوئی ایسا رسالہ ہے جسے وہ اپنی مشقِ خامہ فرسائی کا جولاں گاہ بنائیں۔ وہ اپنا زورِ قلم صرف کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اربابِ ذوق اُن کی انشا پردازیوں کے اعلیٰ نمونوں سے لذت آشنا نہیں ہو سکتے''

اسی ضمن میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ

''تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی باوجودیکہ اُسے چھڑتے ہوئے سالہا سال گذر گئے تا ہنوز حال خشتِ اوّل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا اگر زمانے کے پلٹے ہوئے رُخ اور تہذیب نسواں اور خاتون کے ایڈیٹروں کی خالص کوششوں نے بہتیرے خاندانوں میں مستورات کی تعلیم کا خاطر خواہ چرچا نہ کر دیا ہوتا۔ اس لیے ہمارے خیال میں وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم بھی اپنے ہاں کی مستورات کے علمی ذوق کو پورا کرنے کا سامان کریں''

ان تین مقاصد میں سے آخرالذکر مقصد کی تکمیل میں ہمیں ابتدا ہی سے شک تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی مضمون میں یہ لکھدیا تھا کہ

''اگرچہ یہ کام ایسا ہے کہ بغیر مستقل نسوانی اعانت (ایڈیٹریس) کے بہ احسن وجوہ سرانجام نہیں پا سکتا۔ لیکن جب تک ایسی اعانت نہ مل سکے اُس وقت کے لیے ہو سکتا ہے کہ مستورات کے واسطے علمی غذا مہیا کرنے کا کام چند تعلیم یافتہ خواتین کی وقتی امداد سے ضمنی طور پر شروع کر دیا جائے''

اور ابتدائی دو سال کی جدوجہد کے بعد جب ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں تو ہم نے اس ضمنی مقصد سے دستکش ہوجانا ہی مناسب سمجھا۔

گو اس میں شک نہیں کہ الناظر میں جن محترم خواتین کے مضامین شایع ہوتے رہے وہ ایسے رسالوں کے مضامین سے کسی طرح کم درجے کے نہ تھے جو مخصوص طور پر طبقۂ نسواں کے ملاحظہ کے لیے شایع ہوتے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ الناظر کے اکثر مضامین اپنی ادبی پاکیزگی کے لحاظ سے اور نیز اس حیثیت سے خاص قدر کے سزاوار تھے کہ وہ خالصۃً اُن خواتین ہی کے لکھے ہوئے تھے جن کے نام سے وہ شایع ہوئے تھے۔ عام طور پر جس قدر مضامین خواتین کے نام سے چھپا کرتے ہیں تجربہ بتاتا ہے اور اکثر مضامین خود بول اُٹھتے ہیں کہ اُن کے لکھنے میں یا تو کسی مرد کا قلم شریک غالب رہا ہے یا وہ سراسر کسی مردانہ قلم کی جولانی کا نتیجہ ہیں۔ جہاں حالت یہ ہو وہاں کسی مضمون کے متعلق یہ وثوق ہوجانا کہ وہ کسی خاتون کی خالص تحریر ہے بجائے خود ایک بڑی کامیابی ہے۔

الناظر میں جن خواتین کے مضامین چھپتے رہے ہیں اُن میں سب سے بلند پایہ ہماری عزیز بھاوج بیگم صفدر علی صاحب کا ہے اُن کا مذاقِ ادبی اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ عورتیں تو عورتیں بیشتر مرد بھی اس منزلت کو نہیں پہونچ پاتے۔ عورتوں کی انشا کے نام سے اُن کی ایک مستقل تصنیف موجود ہے۔ جس کو مولانا راشد الخیری صاحب کی لڑکیوں کی انشا کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے تو بیگم صاحبۂ موصوفہ کی قابلیت کا کسی قدر صحیح اندازہ ہوجائے گا۔

ہمارے لیے یہ امر خاص طور پر موجب اطمینان و مسرت ہے کہ گذشتہ دس سال کے اندر جہاں الناظر کے مرد مضامین نگاروں میں سے متعدد مصنف ملک کو حاصل ہوئے ہیں وہاں طبقۂ نسواں میں بھی الناظر کے مساعی سے ایک مصنفہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔

صوبۂ متحدہ کے تعلیم یافتہ طبقہ میں الناظر کو جو مقبولیت ہوئی ہے اُس کا اندازہ کرنے کے لیے شاید یہ کہنا کافی ہو کہ ابتدائی سالوں کے سوا اب الناظر کے جملہ مضامین عموماً اسی صوبہ کے اصحاب کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس کے ماسوا صوبۂ ہذا نے جو مصنفین و مترجمین ان دس سال میں پیدا کیے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر وہی اصحاب ہیں جن کو الناظر کے صفحات پر انشا پردازی کی مشق کا موقع ملا ہے

اصحاب ذیل سے غالباً آپ اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں۔

مولوی معشوق حسین خاں بی اے (علیگ)

مولوی عبدالحق بی اے

مسٹر عبدالماجد بی اے

مسٹر سید حسن برنی بی اے ایل ایل بی

سید ہاشمی فرید آبادی

مسٹر انیس احمد عباسی بی اے

مسٹر سلطان حیدر جوش

منشی رشید احمد ارشد تھانوی

کیپٹن لطافت حسین خاں، آئی۔ ایم۔ ایس

مسٹر تفضل حسین تاثر

منشی محمد عبدالحق بی اے ایل ایل بی

مسٹر عزیز الرحمٰن آسیونی

ان میں سے مولوی معشوق حسین خان اور کیپٹن لطافت حسین خاں دونوں بھائیوں کے مضامین عموماً فرضی ناموں سے الناظر میں چھپتے رہے ہیں۔ مولوی معشوق حسین خاں کی کتاب محارباتِ صلیبی البتہ اُن کے نام ہی سے چھپتی رہی تھی۔

مسٹر عبدالماجد۔ منشی سلطان حیدر جوش اور منشی رشید احمد صاحب ارشد کے مضامین الناظر کے سوا دوسرے رسائل میں بھی چھپتے رہے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ الناظر کو ان کے ساتھ جو خصوصیت رہی وہ اس تمام مدت میں کسی رسالہ کو حاصل نہیں ہوئی۔

مسٹر سید حسن برنی۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ مسٹر انیس احمد عباسی۔ منشی محمد عبدالحق اور منشی تفضل حسین تاثر نے الناظر کے سوا دوسرے رسائل کی طرف بہت کم التفات کیا۔

اس سلسلے میں اگرچہ مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ خاص لکھنؤ کے اصحاب کو الناظر اپنی طرف پوری طرح متوجہ نہ کر سکا۔ بلکہ ہمارے شہر کے اکثر شعرا کا کلام عموماً لکھنؤ سے باہر کے

رسالوں میں زیادہ چھپا کرتا ہے۔ تاہم یہ کچھ کم مسرت بخش نہیں ہے کہ عالیجناب پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا بی اے نے جو بلا خوفِ تردید لکھنؤ کے ادبی دربار کے صدر نشین کہے جا سکتے ہیں الناظر کے ابتدائی دور میں اس کی معقول قلمی اعانت فرمائی۔ اور امید ہے کہ آیندہ بھی اُن کے رشحاتِ فیض سے اہل ملک الناظر ہی کی وساطت سے بہرہ ور ہوا کریں گے۔

---

مقصدِ اولیں کی تکمیل میں الناظر کو کس حد تک کامیابی ہوئی؟ اس کا جواب کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے۔ میں ابتدا ہی میں اس امر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ الناظر کا جو خاکہ شروع سے میرے ذہن میں تھا اُسکے مطابق جہاں تک ترتیب و تہذیب کا تعلق ہے ہنوز میرا مدعا پورا نہیں ہوا ہے۔ تاہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ الناظر اس دہ سالہ زندگی میں بالکل ناکام بھی نہیں رہا۔

الناظر کے وجود میں آنے سے قبل صوبۂ ہذا کا مذاق جس منزلت پر تھا اُس کا اندازہ اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۹ء تک سوائے اودھ اخبار کے اس صوبہ میں کوئی روزانہ اخبار نہ تھا۔ اور نہ الندوہ اور زمانہ کے سوا کوئی علمی رسالہ ہی تھا۔ دو ایک ادبی رسائل ضرور تھے مگر وہ بھی اُنھیں دنوں بند ہو گئے۔ الناظر کے بعد "ادیب" جاری ہوا اور خاصا کامیاب رہا۔ گو افسوس ہے کہ ہندی کی پُر تعصب حمایت کے جذبات نے چند سال سے زیادہ کی عمر اُسے نہ دی۔ "ادیب" ہی کے رنگ کا "العصر" یہیں لکھنؤ سے جاری ہوا اور اب تک جاری ہے۔ گو اب ایک بالکل غیر متعلق حادثہ کی وجہ سے احتمال ہے کہ بند ہو جائے۔ آگرہ کا ادبی رسالہ "نقاد" بھی چھ سال سے ادب پاشی کر رہا ہے — اگرچہ درمیان میں ہمارے کرم سید نظام الدین شاہ دلگیر مالک و ایڈیٹر کے ذاتی ترددات کی وجہ سے کبھی کبھی غائب ہو جاتا رہا — اسی اثناء میں لکھنؤ سے ایک اور قابلِ قدر رسالہ "لسان العصر" نکلا تھا جو افسوس ہے کہ مولانا شبلی کی مصلحتوں پر قربان ہو گیا۔ ہمارے دوست مسٹر عبد الولی نے چند سال ہوے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا رسالہ "معلومات" کے نام سے نکالا تھا جو ڈیڑھ سال کے بعد اُن کی خانگی پریشانیوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس سال اُسکے زندہ کرنے کی پھر کوشش ہوئی تھی۔ اور اگرچہ اُس وقت کامیابی نہیں ہوئی تاہم یقین ہے

کہ آئندہ کسی موقع پر وہ پھر جاری ہوگا۔ "الندوہ" بزرگانِ ندوہ کی ہنگامہ آرائیوں کی نذر ہوا تو اُس کی جگہ اعظم گڈھ سے "معارف" نکل آیا ہے جو اس وقت صوبہ بھر کے لیے مایۂ ناز ش ہے۔ مولانا شرر کا مشہور رسالہ "دلگداز" بھی اب نو برس سے پوری پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے اور دلگداز پریس سے "مورخ" "دل افروز" اور "سخن سنج" تین نئے پرچے بھی نکل رہے ہیں۔ دہلی کا مشہور رسالہ "تمدن" بھی کچھ دنوں لکھنؤ سے نکلتا رہا اور جب تک اُس کے اڈیٹر لکھنؤ میں رہے اُس کی کامیابی میں کوئی شبہہ نہیں تھا۔ سال گذشتہ سے ہمارے دوست پنڈت کشن پرشاد کول نے انجمن خادمانِ ہند کی طرف سے ایک سیاسی رسالہ "صبحِ امید" کے نام سے نکالا ہے جو نہایت آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ اور اسی سال بداؤں سے ایک نہایت ہی دلچسپ رسالہ "نقیب" شایع ہونا شروع ہوا جو امید ہے کہ کامیابی کے ساتھ جاری رہے گا۔ حال ہی میں ایک طبی رسالہ ہمارے شہر کے مشہور حکیموں کے گھرانے سے جاری ہوا ہے جس کا نام "خادم الاطبا" ہے۔

عمدہ اخبارات کی تعداد میں بھی معقول اضافہ ہوا ہے۔ گو لکھنؤ کے تین اخبارات "مسلم گزٹ" "سیارہ" اور "اخوت" پریس ایکٹ کی حفاظتیوں کی نذر ہو چکے ہیں تاہم یہاں سے روزانہ "ہمدم" اس خوبی کے ساتھ نکل رہا ہے کہ ہندوستان بھر کے روزانہ اُردو اخباروں میں سے کوئی بھی اس کا ہم پلّہ نہیں۔ کانپور کے "آزاد" و "البرید" بجنور کا "الخلیل" امروہہ کا "اتحاد" اور بعض دیگر اخبارات بھی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اور عنقریب کئی جدید اخباروں کا اضافہ ہونے والا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اس دس سال کے عرصہ میں جتنے رسائل و اخبارات بند ہو گئے اُن کی تعداد نہایت ہمت شکن ہے۔ لیکن اگر ان بند ہو جانے والے رسائل و اخبارات کے حالات پر فرداً فرداً غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی موت کے اسباب میں ملک کے عام مذاق کی خرابی کو زیادہ دخل نہ تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ ہمارے صوبہ کا علمی مذاق اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ مالکان اخبارات و رسائل پورے اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اس وقت جتنے رسالے صوبۂ ہذا میں نظر آتے ہیں کسی کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ اور جتنے پُرانے پرچے ہیں تقریباً سب کے مالکوں نے ایک معقول رقم بطور خسارہ کے نذر کر دی ہے۔ لیکن اہل ملک کی رفتارِ ذہنی پر غور کرنے سے یہ صاف

عیاں ہو جاتا ہے کہ ملک میں عمدہ لٹریچر کی کافی مانگ پیدا ہو گئی ہے۔ اور اگر منتظمین اخبارات ورسائل پوری مستعدی اور کافی سلیقہ سے کام کریں تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

ہماری مشکلات کو ہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُسکے شاید اس میں بھی ذرا مبالغہ نہیں کہ ہمارے عیوب سے بھی ہم ہی کو پوری واقفیت ہو سکتی ہے۔ گذشتہ چھ سات برس کا زمانہ اس ملک کے لیے عموماً اور ہم مسلمانوں کے لیے خصوصاً نہایت نازک زمانہ تھا۔ اور اخبار نویسوں کے لیے تو شاید ایسے سخت امتحان کا زمانہ پھر ہماری زندگی میں کبھی نہ آئے گا۔ ان ناموافق اسباب کے باوجود جو اخبارات ورسائل اپنی زندگی کو فنا ہونے سے بچا لے گئے ہیں۔ اُن کے لیے نہایت مسرت کا مقام ہے اور یقین رکھنا چاہیے کہ اُن کا مستقبل نہایت درجہ امید پرور ثابت ہوگا۔

---

الناظر سے پیشتر عموماً سب رسالوں کے مضمون نگار قدر مشترک کی حیثیت رکھتے تھے یعنے وہی چند اہل قلم تھے جو تقریباً سب رسالوں میں لکھا کرتے تھے۔ الناظر نے ابتدا ہی سے اس امر کی خاص کوشش کی کہ نئے لکھنے والے پیدا کرے۔ اور اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ باندازہ خواہش وضرورت ہماری یہ کوشش کامیاب ہوئی تاہم الناظر کے مضمون نگاروں میں کافی تعداد ایسے اصحاب کی ضرور رہی جو ملک سے عام طور پر روشناس نہ تھے اور جنھوں نے الناظر ہی کی تحریک پر اس میدان میں قدم رکھا۔ اور یہ سب لوگ عموماً جدید تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو متوجہ کرنا ہمارا مقصودِ اصلی تھا۔

تعلیم یافتہ طبقہ کو ایک دوسری نہج سے بھی الناظر نے اُردو زبان کی طرف کافی طور پر ملتفت کر دیا ہے اور غالباً یہ شعبہ الناظر کی خدمات کا سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔

اب سے سات سال پہلے عام طور پر اس بات کی شکایت کی جاتی تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب یا تو سرے سے مطالعہ کا ذوق ہی نہیں رکھتے اور یا اگر اُن میں سے بعض کچھ ذوق رکھتے بھی ہیں تو بجز انگریزی کتابوں اور انگریزی اخبارات ورسائل کے اُن کو کچھ نہیں بھاتا۔ الناظر کے اجرا کے بعد جب متعدد انگریزی خواں احباب سے اس

بارے میں گفتگو آئی تو اُن میں سے اکثر نے اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ مگر ساتھ ہی اس کے اپنی متعدد مشکلات بھی بیان کیں۔ جن میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُردو زبان میں کون کون کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں اور وہ کہاں سے منگائی جاسکتی ہیں احباب کی یہ شکایت یقیناً نہایت بجا تھی۔ اور الحمدللہ کہ اس کے رفع ہو جانے سے انگریزی خواں طبقہ میں اُردو زبان کی تصانیف کے مطالعہ کا عام شوق پیدا ہو چلا ہے۔

الناظر بک ایجنسی کے قیام سے پہلے بلکہ اُسکے قائم ہونے کے کئی سال بعد تک ہندوستان میں کوئی ایک جگہ ایسی نہ تھی جہاں اُردو کی تمام اعلیٰ درجے کی کتابوں کا کیا ذکر، آزاد، حالی نذیر احمد اور شبلی جیسے مشہور و مقبول مصنفین کی مکمل تصانیف بھی دستیاب ہو سکتیں۔ بجز سوائے پنجاب کے چند اخبارات کے جو بعض خاص قسم کی کتابیں تیار کرکے اپنے اپنے پرچوں کے ذریعہ سے شایع کرتے تھے ملک بھر میں کوئی ایسا کارخانہ نہ تھا جو بار بار اشتہارات کے ذریعہ سے اعلیٰ قسم کی کتابوں کو پبلک کے روبرو لاتا۔

الناظر بک ایجنسی کے کارکنوں نے گذشتہ پانچ سال کے اندر بڑی تلاش و کوشش سے اُردو کی تمام اعلیٰ درجہ کی کتابوں کو یکجا فراہم کیا اور الناظر اور دیگر اخبارات کے ذریعہ سے اُن کو خوب مشتہر کیا۔ اس طریقہ سے ملک میں عمدہ قسم کے لٹریچر کی اتنی مانگ پیدا ہوگئی ہے کہ اب شاید کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہیں جو اپنی بک ایجنسی نہ قائم کر چکا ہو اور اس ذریعہ سے معقول منافع نہ اُٹھاتا ہو۔

ملک کے مذاق میں یہ خوشگوار تبدیلی شاید عام طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ لیکن اگر غور کیا جائیگا تو معلوم ہوگا کہ پانچ سال کے اندر ایک فرقِ عظیم واقع ہوگیا ہے۔ اور جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ بعض ضمنی موثرات کے علاوہ یہ نتایج سب سے زیادہ الناظر بک ایجنسی ہی کی بدولت حاصل ہوے ہیں تو میری مسرت کی کوئی حد نہیں رہتی ——— مجھے اپنی بے بضاعتی کی بدولت ہرگز اسکی توقع نہ تھی کہ میں کوئی خدمت ملک و قوم کی کرسکوں گا۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت الٰہ العالمین نے میری سعی مشکور فرمائی۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ میری کوششوں سے کہیں زیادہ قیمتی ثمرات عطا فرمائے۔

مضامین کے لحاظ سے، الناظر کے متعلق اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب امیدیں پوری ہوئیں جو ابتداءً میں قائم کی گئی تھیں، تاہم ملک کی موجودہ تعلیمی حالت کو دیکھتے ہوئے اُس کی خدمات اس شعبہ میں بھی کافی حد تک ممتاز ہیں۔ ہندوستان میں ابھی تک علمی مذاق اس مرتبہ پر نہیں پہونچا ہے کہ یورپ و امریکہ کی ہمسری کا دعوٰی کیا جائے۔ اسی وجہ سے اب تک نہ تو ہماری زبان میں اعلیٰ درجہ کے علمی مضامین لکھنے والے کافی تعداد میں پیدا ہوئے ہیں اور نہ ان اصحاب کی تحریرات کو دلی شوق اور قدر سے پڑھنے والے ہی زیادہ مقدار میں ملتے ہیں۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ الناظر کو باوجودیکہ اُس کے مضامین یورپ کے علمی رسالوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے تھے بہت سے اصحاب اپنی علمی سطح سے بلند خیال کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس اس دس سال کی مدت میں بکثرت خطوط ایسے آتے رہے جس میں اس بات کی شکایت ہوتی تھی کہ الناظر مذاقِ عام کے مطابق نہیں نکلتا، اور اُس کے اکثر مضامین نہایت دقیق اور خشک ہوتے ہیں۔ الناظر کی اشاعت بھی اسی سبب سے ہمیشہ محدود رہی۔ گو اس میں شک نہیں کہ اگر ساتھ ہی ساتھ اُس کے دلچسپ بنانے اور مشتہر کرنے میں زیادہ سعی کی جا سکتی تو یہ شکایت بھی نہ رہتی۔ اہل ملک کے مذاق عام کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چند سال ہوئے لاہور سے "ترجمان" نامی ایک رسالہ جاری ہوا جو ابتداءً میں کچھ عرصہ تک علمی مضامین شایع کرتا رہا۔ لیکن جب تھوڑے دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ملک میں ایسے مضامین کی قدر نہیں ہے تو صاحبِ رسالہ نے اُس کا ڈھنگ بدل دیا۔ اور اب "ترجمان" میں محض ناول کا ترجمہ شایع ہوا کرتا ہے۔

بایں ہمہ الناظر نے گذشتہ سالوں میں جس قدر اعلیٰ درجے کے مضامین شایع کیے ہیں، غالباً ہندوستان کا کوئی رسالہ اس کی نظیر نہ پیش کر سکے گا۔ فلسفہ اور سائنس کے شعبہ جات کے علاوہ تاریخی، اصلاحی، و تنقیدی مضامین بھی اُس میں بکثرت شایع ہوتے رہے ہیں۔ الناظر سے پہلے مستثنیٰ حالتوں سے قطع نظر کرکے عام دستور یہ تھا کہ لوگ تنقیدی مضامین کا تمام تر ماحصل یہ سمجھتے تھے کہ کتاب زیرِ تنقید یا پھر اُس کے مصنف کی قصیدہ خوانی پر سارا زور صرف کردیں۔ الناظر نے زندگی کے سال اول ہی میں مولانا شبلی کے الکلام پر جو مبسوط اور مدلل تنقید شایع کی اُس نے میدان تنقید میں ایک نیا باب اضافہ کردیا۔ اور اس سلسلہ کو الناظر نے ہمیشہ جاری رکھا۔ اب

[redacted]



بعض دیگر رسالوں میں بھی اس قسم کی تنقیدیں شایع ہونے لگی ہیں۔

مبسوط مضامین کی اشاعت بھی الناظر کے خصوصیات میں بیان کی جا سکتی ہے - عام رواج یہ تھا (اور ایک حد تک اب بھی یہی صورت ہے) کہ رسائل میں چھوٹے چھوٹے مضامین شایع کیے جاتے تھے - کوئی مضمون اگر اتفاق سے ذرا بڑھ گیا تو اُسکے متعدد ٹکڑے کر دیے جاتے تھے - الناظر نے تیس تیس چالیس چالیس صفحے کے مضامین برابر ایک ہی دفعہ میں شایع کیے ——— بجز اس صورت کے کہ کوئی مضمون بہت ہی طولانی ہو یا راقم مضمون نے کسی سبب سے بہ اقساط شایع کیے جانے کی خواہش ظاہر کی — الناظر کے ذریعہ سے متعدد مستقل تراجم کی اشاعت بھی ہوتی رہی ہے - گو یہ سلسلہ ادبی و تاریخی شعبہ پر محدود رہا -

شاعری کے اعلےٰ نمونے فراہم کرنے میں الناظر کو اگرچہ کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں رہا تاہم بکثرت طرز جدید کی بلند پایہ نظمیں اور متعدد با کمال شعرا کی غزلیں الناظر میں بالالتزام شایع ہوتی رہی ہیں - عام طور پر شعرا کو الناظر کی طرف پوری طرح متوجہ نہ کر سکنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ خود مجھے فطرت نے اس ذوقِ شاعری سے تقریباً بالکل محروم رکھا ہے - اسکے سوا شعرا عموماً نازک مزاج اور خوگر خوشامد ہوتے ہیں اور جب تک اُن کی کماحقہٗ نازبرداری اور بمبالغہ توصیف و تعریف نہ کی جائے محال ہے کہ وہ التفات فرمائیں - میں اسے ارباب کمال کی ایک لازمی صفت جانتا ہوں لیکن خود میری افتاد اور روش ایسی ہے کہ مجھ کو اس میں ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے - حتیٰ کہ وہ شعرا جو عزیزانہ تعلقات کی بنا پر میرے حال پر خاص شفقت فرماتے تھے اور جن کی اعانت سے الناظر کو کبھی محروم نہ ہونا چاہیے تھا، افسوس ہے کہ الناظر کی آزادانہ روی نے اُن کو بھی بددل اور آمادۂ سرد مہری کر دیا -

آزادی ایک بیش قیمت اور گراں قدر جنس ہے اور جس طرح زر و جواہر کی نمایش خالی از اندیشہ نہیں اور اُس کی حفاظت میں بسا اوقات سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی جان تک نذر کر دینا ہوتی ہے - اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زائد خطرات و صعوبات اُس شخص کو پیش رہتے ہیں جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہے یا کبھی کبھی اُس کو عمل میں لا سکے ——— الناظر کی دس سالہ زندگی میں اس جنس گراں کے لیے کافی قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور یقیناً آیندہ بھی یہ نذرانے پیش کرنا ہوں گے -

الناظر کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ اور وہ یہ کہ اُس کی اشاعت میں پابندیِ وقت کا بڑا لحاظ ہوتا تھا۔ الناظر سے قبل ہندوستان میں کوئی رسالہ اس طرف توجہ نہ کرتا تھا اور اس بدنظمی سے لوگ حد درجہ بددل رہا کرتے تھے۔ یہ بیماری ہمارے ملک میں اس قدر عام تھی کہ اُردو رسالوں کا تو کیا ذکر، ہندوستان بھر کے انگریزی میگزین تک اس میں مبتلا تھے۔ الناظر نے چار پانچ سال تک اس امر کا پورا التزام رکھا کہ رسالہ ہمیشہ انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوا کرے۔ مجھے ندامت ہے کہ اب کئی سال سے یہ انتظام بگڑ گیا ہے۔ گو اب بھی اس بات کی خاص کوشش کی جاتی ہے کہ ہر مہینے کا رسالہ اُسی ماہ کے اندر شایع ہو جائے۔ ہندوستان کے ماہوار رسالوں میں اسی قسم کا ایک اور عام مرض بھی پایا جاتا ہے جس کا تعلق اشاعت کی بے قاعدگی ہی سے ہے۔ یعنی اکثر رسالے کئی کئی مہینوں کے پرچے ایک ساتھ شایع کیا کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو اس لے کو یہاں تک بڑھایا کہ ایک دفعہ چھ مہینے کا ایک نمبر نکالا۔ الناظر دس سال کے اندر صرف ایک دفعہ اس جُرم کا مرتکب ہوا ہے اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ بعض اسباب کی بنا پر خاکسار ایڈیٹر الناظر کو بند کرکے ہندوستان سے ہجرت کر جانے کے لیے آمادہ تھا۔

یہ داستان بہت طولانی ہو گئی ہے اور اگرچہ میری بریت کے لیے یہ عذر موجود ہے کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پھر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں ناظرین کرام اس خود سرایانہ ہرزہ درائی سے منغص نہ ہو جائیں۔ لیکن سخت نا احسان شناسی ہوگی اگر اختتام سے پیشتر میں اُن اصحاب کا ذکر نہ کروں جن کی توجہ و اعانت کے بغیر ناممکن تھا کہ الناظر کو آج اس قدر فخر و مباہات کا موقع ملتا۔۔ بلکہ حق یہ ہے کہ الناظر کی شمعِ حیات بھی صدہا دوسرے جرائد کی طرح کبھی کی افسردہ ہو گئی ہوتی۔

الناظر کے کثیر التعداد معاونین کے تذکرے میں یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کوئی باقاعدہ ترتیب قائم رہ سکے۔ اور عجب نہیں کہ باوجود کوشش کے بھی بعض اصحاب کے نام رہ جائیں —— البتہ چند احباب ایسے بھی ہیں جن کا اس عام فہرست سے علحدہ ذکر کرنا ہوگا۔ اس لیے اُن کے نام بعد میں پیش کروں گا —— لیکن یہ ناممکن نہیں ہے کہ ان احباب کے اسمائے گرامی بعض خاص مدات میں تقسیم کر دیے جائیں۔ وہو ہذا:—

(۱) **قلمی معاونین**:- خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب)
منشی ارتضا علی شر علوی کاکوروی۔ مولوی فخرالدین احمد سغیر کاکوروی۔ بیگم صاحبہ مسٹر صفدر علی اکزیکیٹو انجنیر (صوبۂ متحدہ) منشی افتخار علی جگر بسوانی۔ منشی احسان علی فصیح فتح پوری مرحوم۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی رسوا بی اے لکھنوی۔ مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ۔ شمس العلما مولانا ذکا ء اللہ مرحوم حکیم سید شمس اللہ قادری حیدرآباد دکن۔ مسٹر عبدالماجد بی اے۔ سید محمد فاروق شاہ پوری۔ منشی احمد علی شوق قدوائی۔ منشی دیانت حسین صدیقی (بہار) نواب حیدر یار جنگ مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی۔ مسٹر عبد الحکیم تسبل سب اسسٹنٹ سرجن پنجاب۔ سید امین الحسن تسبل رضوی موہانی زہرا بیگم فیضی صاحبہ (جنجیرہ) سید علی اصغر بلگرامی۔ مولوی معشوق حسین خاں بی اے (حیدرآباد دکن) مسٹر نورالرحمن بچھرایونی۔ کیپٹن لطافت حسین خاں آئی، ایم، ایس۔ مولوی سید ابوالحسن الہ آبادی۔ سید محمد یوسف قیصر بھوپالی۔ بیگم صاحبہ نواب خدیو جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) مفتی انوارالحق ایم اے مولوی فاضل ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن بھوپال۔ مولوی عبدالحق بی اے۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی۔ مولوی مرزا محمد بہادر یاور وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن۔ منشی رشید احمد ارشد تھانوی۔ قاضی خادم حسین علوی امیٹھوی۔ مولوی جواد علی خاں عالی ندوی۔ شیخ محمد عالیجاہ فضا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔ مولانا حسن مرتضیٰ شفق عماد پوری۔ مولوی محی الدین تمنا عمادی پھلواری سید کلب احمد مانی جائسی۔ مولوی غیاث الدین فضا وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن۔ مرزا مہدی خاں کوکب حیدرآباد دکن۔ منشی محمد حسین محوی۔ قاضی موسیٰ خاں اختر (جوناگڈھی) مسٹر جے آر رلے۔ سید ہاشمی فریدآبادی۔ مسٹر محمد مسلم عظیم آبادی۔ مولوی تفضل حسین آثر (حیدرآباد دکن) مسٹر اظہر علی ایم اے (دہلی) مسٹر سلطان حیدر جوش (علیگ) مولوی قمرالدین احمد قمر سندیلوی۔ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے (علیگ) مسٹر صدیق الزماں وفا (حیدرآباد دکن) سید محمد جعفر قدسی جائسی۔ مولانا سید احمد لکھنوی۔ منشی محمد ظفر بی اے ایل ایل بی (گوڑگانوں) مولانا رضا علی وحشت (کلکتہ)۔ منشی تصدق حسین صدق جائسی منشی ممتاز حسین ممتاز جونپوری۔ منشی عبدالحق بی اے ایل ایل بی منصف (اودھ) مسٹر سید حسن برنی بی اے (علی گڈھ) مولوی محمد ابراہیم خاں تجلی (خورجوی) منشی غلام حسین آفاق بنارسی۔ مولوی سید حافظ علی سندیلوی مرحوم۔ مسٹر عزیز الرحمٰن آسیونی۔ منشی انیس احمد عباسی کاکوروی بی اے۔

مسٹر ابو البقا بی اے (صوبۂ متحدہ) پروفیسر فیروز الدین مراد (علی گڈھ) سید انور حسین آرزو لکھنوی۔

(۲) **مالی معاونین** - جن میں اشاعت بڑھانے والے بھی شامل ہیں:-

بابو شمبھو ناتھ ڈپٹی کلکٹر (صوبۂ متحدہ) مسٹر وصی الحسن علوی بی اے ایل ایل بی وکیل لکھنؤ۔ منشی ابرار حسین بی اے لکھنؤ۔ مسٹر عبد الستار بی اے وکیل جون پور۔ مسٹر بشیر حسین قدوائی۔ مس عطیہ فیضی (جنجیرہ) منشی رشید احمد ارشد تھانوی۔ مولوی احسان الدین علوی کاکوری مرحوم حافظ ساجد علی عباسی وکیل ہائیکورٹ (اورنگ آباد دکن)۔ مولوی مصطفیٰ علی عباسی وکیل جالنہ (دکن) نواب نذیر جنگ بہادر حیدرآباد دکن۔ مولوی مرزا ساجد بیگ صاحب صدر منصف (حیدرآباد دکن) مولوی ظہور الدین احمد صاحب معتمد عدالت العالیہ حیدرآباد دکن۔ مولوی حکیم محبوب حسن وکیل ناندیر (دکن) مولوی عبد الحق بی اے۔ مولوی عشوق حسین خاں بی اے۔ مولوی معصوم علی صاحب منصف حیدرآباد دکن۔ خان بہادر مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (پنجاب) مسٹر نذیر حسین جنون صدیقی۔ ڈاکٹر فیض محمد خاں صاحب چیف میڈیکل افیسر (نابھہ)۔ مسٹر ایس آر حیدر (پٹنہ) مولوی حسن الرحمٰن قدوائی بڑاگاؤں۔ مولوی طالب الحق مرحوم سابق مددگار صدر محاسب حیدرآباد دکن۔ منشی محمد عبد الحق بی اے ایل ایل بی منصف۔ نواب ذو القدر جنگ سابق جج ہائیکورٹ (حیدرآباد دکن) مسٹر حیدری، ہوم سکرٹری حیدرآباد دکن۔ ڈاکٹر سراج الحسن سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن بیگم صاحبہ حکیم محبوب حسن (ناندیر دکن)

وہ چند اصحاب جنھوں نے الناظر اور اُسکے متعلقات کو زندہ رکھنے اور کامیاب بنانے میں خاص حصہ لیا ہے یہ ہیں:-

(۱) مسٹر عبد الماجد بی اے۔ الناظر کو ابتداءً اہلِ ملک کی نگاہوں میں جو وقعت حاصل ہوئی وہ "اقیس" طالبعلم" صاحب کے قابلِ قدر مضامین کا نتیجہ تھی۔ وہ پہلے ہی سال الناظر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور ہمیشہ اعلیٰ درجے کے فلسفیانہ مضامین لکھتے رہے۔ اُن کے اُن مضامین کا مجموعہ جو کافی ضخیم ہے انشاءاللہ آیندہ سال تک اربابِ علم کی خدمت میں پیش ہو سکے گا۔

(۲) منشی احمد علی شوق قدوائی - جناب شوق نے الناظر کے ابتدائی دور میں اپنی پاکیزہ نظموں کے ذریعہ سے رسالہ کو مقبول و ممتاز بنا دیا۔ گو جس وقت سے اُن کی نظم موسومہ "نیرنگِ خیال" پر ابو الرشاد صاحب کی تنقید الناظر میں چھپی صاحب موصوف قطعاً امداد سے دست کش ہو گئے۔

(۳) مولوی عشوق حسین خاں بی اے - میں اپنے دیرینہ دوست کی اعانت کا پوری طرح

اعتراف نہیں کر سکتا۔ الناظر میں جتنے اعلیٰ درجے کے مضامین شایع ہوئے ہیں اُن میں سب سے زیادہ انھیں کی بامحبت مساعی کا نتیجہ ہیں۔ وہ خود عرصے تک بالالتزام لکھتے رہے اور اپنے برادرِ خُرد کیپٹن لطافت حسین خاں آئی ایم ایس سے برابر لکھواتے رہے۔ اگر دونوں صاحب اپنے اسمائے گرامی کی اشاعت گوارا فرماتے تو یقین ہے کہ ناظرینِ کرام خود اُن کی پوری قدر کر سکتے۔

(۴) مولوی عبدالحق بی اے۔ الناظر کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو مولوی صاحب کا رہینِ منت نہ ہو۔ صرف یہی نہیں کہ وہ الناظر کی قلمی اعانت کرتے رہے۔ کبھی اپنے نام سے اور کبھی گمنام۔ بلکہ جب کبھی طوفانِ حوادث سے الناظر کی کشتی بربادی کے قریب ہوئی تو اُنھوں نے میری ہمت بڑھائی اور اپنے مخلصانہ مشورہ و امداد سے الناظر کو منجدھار سے نکال لیا۔ ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے غیرت سوز تصفیہ نے مسلمانانِ ہندوستان کے مستقبل سے اس درجہ مایوس کر دیا تھا کہ میں ہجرت کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن بعد کو اپنے برادرِ محترم (جن کے سایۂ شفقت سے دو سال گذرے کہ محروم ہوگیا ہوں) کے اصرار پر یہ عزم فسخ کرنا پڑا۔ میں اُسی زمانے میں میری تندرستی بہت خراب ہوگئی اور میرے عزیز بھائی جو ابتداسے الناظر کی مالی کفالت فرماتے تھے بعض اسباب کی بنا پر مزید مالی اعانت سے دستکشی کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان سب اسباب کی بنا پر میں نے الناظر کو بند کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور اگر اُس وقت مولوی عبدالحق صاحب کی محبت اور اعانت شریکِ حال نہ ہوتی تو آج الناظر کی دس سالہ زندگی پر تبصرہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ اُس وقت سے ۱۹۱۶ء تک صاحب ممدوح مجھ کو ہر قسم کی مدد دیتے رہے۔

الناظر بُک ایجنسی کا وجود بھی تمامتر اُنھیں کا رہینِ احسان ہے۔ مصنفینِ اُردو کی فہرست سب سے پہلے اُنھیں کی خواہش کے مطابق تیار کی گئی تھی۔ اور سب سے پہلی بڑی فرمایش جس نے مشہور مصنفین کی تصانیف کو مہیا کرنے کی بنیاد ڈالی مولوی صاحب ممدوح ہی کی تھی۔ نیز اس کاروبار کی توسیع میں جو امداد مولوی صاحب ممدوح کی لاجواب تصنیف قواعدِ اُردو سے ملی۔ جس کا حقِ اشاعت اُنھوں نے الناظر پریس کو ۱۹۱۲ء میں عطا فرمایا تھا اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کتابوں کے کاروبار کا تجربہ رکھتے ہیں۔

الناظر پریس کی ترقی میں بھی مولوی عبدالحق صاحب کی امداد کو سب سے زیادہ دخل رہا ہے۔

بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اگر مولوی صاحب کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو میں شاید اس جھگڑے کو اپنے سر نہ لیتا۔ چنانچہ جس وقت سے مشین خریدی گئی الناظر پریس نے جس قدر کام کیا اُس کا بڑا حصہ انھیں کے واسطے سے حاصل ہوا مگر یورپ کے تباہ کن اثرات سے گذشتہ ڈھائی سال کی مدت میں اگرچہ پریس کی بدولت مجھے نفع کے بجائے برابر خسارہ ہوتا رہا ہے لیکن امید ہے کہ جب کاغذ کا نرخ اعتدال پر آجائے گا تو اُس وقت نہ صرف اس نقصان کی پوری تلافی ہوجائیگی بلکہ اس شعبہ میں بھی کافی توسیع و اصلاح کا اہتمام ہوسکے گا۔

مولوی عبدالحق صاحب کے احسانات کی تفصیل جو اوپر بیان ہوئی ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ کافی نہیں ہے۔ میں انشاءاللہ آیندہ کسی موقع پر زیادہ وضاحت سے بیان کروں گا۔ افسوس ہے کہ اُردو کانفرنس کے بعد بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے صاحب ممدوح بعض باتوں سے کشیدہ خاطر ہوگئے۔ گذشتہ ستمبر میں جب بمبئی سے واپس آنے لگا ہوں تو خاص اسی غرض سے اورنگ آباد حاضر ہوا تھا اور الحمدللہ کہ ایک بڑی حد تک غلط فہمیاں رفع ہوگئی تھیں لیکن اکتوبر ۱۹۲۰ء کے الناظر میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و حشمتہٗ کو علماے ندوہ، فرنگی محل و دیوبند کی طرف سے خطاب "محی الملۃ والدین" دیے جانے کے خلاف جو احتجاجی مضمون شایع کیا گیا تھا اُس نے صاحب ممدوح کو الناظر سے قطعی بے تعلقی اختیار کرلینے پر مجبور کردیا۔ کیونکہ اُن کے مخالفین نے اس مضمون کی آڑ میں اُن پر نہایت ہی رکیک ناپاک حملوں کی بوچھاڑ شروع کردی۔ اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کی بارگاہ میں شکایت پہونچائی کہ ایڈیٹر الناظر نے یہ مضمون مولوی عبدالحق کے مشورہ بلکہ شرکت سے لکھا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ غرضمند و بدنفس چغل خوروں کا یہ وار خالی گیا۔ ورنہ بیچارے مولوی عبدالحق صاحب کی ساری محنت جانفشانی خاک میں مل جاتی۔ حالانکہ فی نفسہ مولوی صاحب ممدوح کو اُس مضمون سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔

---

اب اس دعا پر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے کہ جس طرح حضرت الہ العالمین نے اپنے کمال فضل وکرم سے اب تک اس ناکارۂ محض کی کوششوں کو بارور فرمایا ہے آیندہ بھی اپنے احسانِ عمیم کے طفیل اور اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصدق میں اسی طرح ثمر کامیابی سے سرفراز فرمائیں اور الناظر، الناظر کب ایجنسی و الناظر پریس کے ذریعہ نہایت وسیع پیمانہ پر ملک و قوم کی خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

با کریماں کارہا دشوار نیست

# کوزہ

کوزۂ گل! کس جلے تن کی قبا تو خاک ہے
سوز غم سے اب بھی تیرا رنگ آتشناک ہے

صحبت خوباں میں بزم جاں میں تھا تیرا وجود
اس سے پہلے قالب انساں میں تھا تیرا وجود

تو نے لوٹی ہوں گی برسوں لذتیں دیدار کی
تو نے دیکھی ہوں گی سیریں حسن کے گلزار کی

بھولی بھولی چاند سی صورت پہ مرتا ہوگا تو
گیسوئے خمدار کی نکہت پہ مرتا ہوگا تو

خاک میں ملنا ترا کچھ کم نہیں ہے راز سے
ہر قدم پر تو بپا ہوگا خرام ناز سے

تجھ پہ ناوک پڑ چکے ہوں گے ترنم کے بہت
بجلیاں تجھ پر گری ہوں گی تبسم کی بہت ۲

قالب انساں میں تو جب تک رہا کیا کام تھا
سچ بتا اے کوزۂ خاکی ترا کیا نام تھا

جمع تھے سب عیش کے ساماں کہ مہماں تھا تو
عالم دانا تھا تو یا جاہل ناداں تھا تو

صورت گل تو رہا کرتا تھا خنداں رات بھر
شمع کے مانند یا رہتا تھا گریاں رات بھر

بجھ گئی باد اجل سے کس طرح شمع حیات
گل ہوا کیونکر زمانے میں چراغ کائنات

خاک تیری کیا ہوئی؟ آغوش تربت میں گری؟
رہرووں کے دامنوں پر یا وہ اڑ اڑ کر پڑی؟

کیا ہوا انجام کار اے ہستیِ ناپائدار
چین پایا یا مصیبت سے کٹی زیر مزار؟

شرح غم ہم کو سنا دے تو قلق کا جوش ہے
بول اٹھ اے کوزۂ گل کس لیے خاموش ہے

جاگ اٹھا اپنے افسوں سے جو تھا سویا ہوا
اس طرح کوزہ زبان حال سے گویا ہوا

کیا کہوں میں تجھ سے اے ہمدرد جاں افزا مرے
رنگ بدلے انقلاب بخت نے کیا کیا مرے

محفل ہستی میں تھا میں اک جوان خوبرو
دیکھتے تھے پیار سے مجھ کو بتان خوبرو

عمر کا حاصل جوانی کا زمانہ تھا مرا
دید کے قابل جوانی کا زمانہ تھا مرا

عالم مستی میں راحت سے کٹا دور شباب
دور مے سے کم نہ تھا ہرگز مرا دور شباب

میرے ہاتھوں میں رہا دامان عیش بیکراں
جمع رہتے تھے سبھی سامان عیش بیکراں

کیوں قلق ہے تجھ کو میری ہستیِ ناشاد کا
خانۂ جاں لٹ چکا مجھ خانماں برباد کا

اک فانی شے ہوں بے بنیاد ہوں غمناک ہوں
خاک کے قالب میں تھا پہلے بھی اب بھی خاک ہوں

جگر - صدیقی

# میسوپوٹامیہ

## (ارض نہرین یا جزیرہ)

**بابل اور اشور** جس زمین پر بابل اور اشور آباد تھے وہ یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس زمانہ کے حالات لکھنے میں اُسکو بھی ہزارہا برس منقضی ہو چکے ہیں۔ پس اگر کوئی یہ پوچھے کہ ایسے تمدن کے ساتھ جو بابل میں حضرت عیسٰی سے تین ہزار برس پہلے اور بابل سے اشور میں جو تخمیناً ڈھائی ہزار برس پیشتر مسیح رائج تھا ہم کو کیا دلبستگی ہے؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ موقع کا فاصلہ، زمانہ کی دوری اور واقعات کی قدامت ہی وہ چیزیں ہیں جن سے ہم کو بابل و اشور کی تاریخ، اُسکے علوم و فنون، مذہب و ملت کے حالات سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زمانۂ ماضی اور خاصکر ماضی بعید ہمارے دلوں پر کچھ عجیب جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ اور یہ اثر غالباً اس یقین کا نتیجہ ہے کہ گو حال و مستقبل ہمارے بس کا نہیں، لیکن زمانۂ ماضی تو اپنا ہو چکا ہے، اور جو چیز اپنی ہو چکی ہو اُس سے کیوں بیخبر رہیں۔ بنی نوع انسان کی تاریخ ایک زنجیر ہے جسکی ایک کڑی دوسری کڑی میں لگی ہے۔ ہر ایک تمدن جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے اپنے سے پہلے تمدن کا وارث ہوتا ہے۔ آج شمالی و مغربی یورپ کی تہذیب رومانی تمدن کا نتیجہ ہے۔ رومانی علم و ہنر کو قوت یونان سے پہونچی۔ یونانی تمدن کی بنیاد ایشیائی تمدن پر رکھی گئی۔ ایشیائی تمدن میں مصر قدیم، بابل اور ایشیا کوچک کے تمدنوں کا اثر موجود تھا۔ اگر ایشیا میں زیادہ مشرق کی طرف بڑہیں تو معلوم ہوگا کہ زنجیر یہاں بھی نہیں ٹوٹتی۔ ایران ہندوستان کا ایسا ہی خوشہ چین تھا جیسے کہ جاپان چین کا۔ بودھ مذہب کی وجہ سے چین و ہندوستان کے تمدن میں تعلق قائم ہوا اور اس یقین کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ بودھ مذہب کے پیدا ہونے سے پہلے ہندوستان سے علم و ہنر کی موجیں چین میں پہونچ چکی تھیں۔ اس بات کی شہادت بھی قوت پکڑتی جاتی ہے کہ ہندوستان اور چین کی تہذیب پر بہت کچھ اثر وادیٔ فرات اور وادیٔ نیل کے تمدنوں سے پہونچا۔

**عہد ماضی اور آثار قدیمہ** پس عہد ماضی کے واقعات کا مطالعہ کرنا اپنے ہی ماجرائے سابق کا مطالعہ کرنا ہے۔ مقام یا زمانہ گو کیسا ہی بعید ہو مگر وہ قریب ہی نظر آتا ہے۔ کوئی چیز پرائی نہیں بلکہ اپنی ہی معلوم ہوتی ہے۔

گویا اپنا ہی خون اپنا ہی پوست ہے۔ غرض یہی وہ چیز تھی جس نے یورپ اور امریکہ کے بعض لوگوں کو اس محنت میں مصروف کر دیا کہ وہ عماراتِ قدیمہ کو جو مدت ہائے دراز سے زمین میں دبی پڑی تھیں کھود کر نکالیں ۔ یہ شوق ایسا بڑھا کہ اکثر ملکوں میں مثلاً یونان، اطالیہ، ایشیائے کوچک، ہندوستان، شام، فلسطین، مصر بابل میں بلا کشانِ تحقیق ہاتھوں میں کدال اور بیلچے لیکر قدیم تمدنوں کے آثار زمین سے برآمد کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اور اکثر صورتوں میں اولاد آدم کے فراموش کردہ واقعاتِ تاریخی کو انسان کے حافظہ میں پھر زندہ کر دکھایا۔ اور وہ حکایات و روایات جو دھندلی روشنی میں صاف سمجھ میں نہ آتی تھیں انکی جگہ صحیح واقعات روشن اور واضح شکل میں پیش کر دیے ۔ تاریخ کے اصلی واقعات کو قصوں اور افسانوں کے کوڑے کرکٹ سے چن کر الگ کر دکھایا۔ بلکہ یہ کہنا زیبا ہوگا کہ عصرِ پیشیں کی قوموں نے جو جو مشقتیں اس شوق میں اُٹھائی تھیں کہ ناموری میں کون کس سے بازی لے جاتا ہے اور ناموں میں کس کا نام رہتا ہے اور کس کا جاتا ہے اُنکی مٹی ہوئی خاک اور اُفتادہ نشانیوں کے پورے قصر کو از سرِ نو تعمیر کر دیا۔

**سرزمینِ دجلہ و فرات، گہوارۂ بنی آدم** لیکن قدامت کے علاوہ بعض اسباب ایسے ہیں جنھوں نے دجلہ اور فرات کی سرزمین کو ایک خاص دلچسپی بخشی ہے ۔ توریت کی مقدس روایات نے اس سرزمین کو تہذیب و شائستگی کا دیباچہ ہی نہیں قرار دیا ہے بلکہ بنی آدم کا گہوارہ بھی اُسکو بتایا ہے۔ باغ عدن ارض بابل ہی میں واقع تھا۔ چنانچہ بیان ہوا ہے کہ رود دجلہ و فرات انسان کے اسی ابتدائی مسکن میں سے گذرے تھے حضرت آدم و حوا کے قصہ کی نسبت اتنا ضرور ہی کہنا پڑتا ہے کہ روایتیں جن میں حضرت آدم و حوا کی ابتدائی سکونت بابل میں بیان ہوئی ہے اُنکی بڑی قیمت یہی ہے کہ کاتبانِ توریت یعنی عبرانیوں کے دلوں میں بابل کی نہایت درجہ عظمت موجود تھی اور اُنکے مذہبی قصص و حکایات بابل سے ایسے وابستہ تھے جیسے ناخن سے گوشت۔ ابوالبشر حضرت آدم گو باغ عدن سے چلے گئے مگر آپ کی اولاد ارض بابل سے نہیں نکلی۔ وادی سنعار (جہاں بیان ہوا ہے کہ تمام بنی آدم اُسوقت سکونت رکھتے تھے جس وقت کہ بابل میں وہ منار تعمیر ہوا تھا جسکو آسمان تک مرتفع کرنے کا شوق سب کے دل میں تھا) فی الحقیقت وادی فرات کے جنوبی حصہ کا ایک نام ہے۔ توریت کے اس منارہ کے ذکر کے ساتھ اہل فن کے ذہن میں وہ منارے بھی آجاتے ہیں جو ارض بابل کی مذہبی عمارتوں کے ساتھ اکثر بنا ہوئے ہیں۔ منار کی روایت میں اور اُن دونوں روایتوں میں جو کتاب پیدایش کے گیارہویں باب میں درج ہیں یعنی ایک تو شہر کی تعمیر کے متعلق جسکو بابل کا نام دیا گیا اور دوسری منارہ کے متعلق۔ ان

دونوں میں بڑا سبق یہ ہی نکلتا ہے کہ ارض بابل کی عزت اور اسکا تقدس مخلوق کے دل میں اس درجہ موجود تھا کہ اُنھوں نے بنی آدم کا مولد و مسکن بھی ارض بابل ہی کو سمجھ لیا تھا۔ بنی نوع انسان نے جہاں پہلے پرورش پائی وہ مقام کہاں تھا؟ اُن ماہرین کے درمیان ایک مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے جنکو علم الانسان سے بحث ہے۔ اور ابتک اس سوال کی نسبت یہ ہی خیال ہے کہ اُسکے جواب میں سائنس کچھ مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ واقعہ کہ ارض فرات آفرینشِ انسان سے اسوقت تک بنی آدم کا ابتدائی وطن مشہور چلی آتی ہے۔ دلیل اس دعوے کی ہے جسکے لیے اور شہادت بھی موجود ہے (گو مکمل نہیں) کہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن سب سے پہلے سرزمین بابل ہی پر پیدا ہوا۔ بابل کا رقیب اگر کوئی دوسرا ملک ہو سکتا ہے تو وہ مصر ہے۔ اسوقت جو نشانیاں ملی ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ گو مصری تمدن کی ابتدا بابل کے تمدن سے پہلے ہوئی ہو لیکن کسی تمدن سے جو اعلیٰ درجہ کی ترقی بطور نتیجہ کے پیدا ہوئی ہے وہ سب سے پہلے بابل ہی کے تمدن سے ظاہر ہوئی۔

**بابل اور اشور کا تمدن** | اس سوال کو ہیں چھوڑ کر ہم توریت کے بیانات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ عبرانیوں نے فلسطین میں داخل ہونے سے پہلے اپنا سفر بابل ہی کے ایک شہر سے شروع کیا۔ کیونکہ مقام اُر جہاں سے حضرت تارح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد روانہ ہوے ارض بابل کا ایک مشہور شہر تھا حاران بھی جہاں اُر سے چل کر آپ نے قیام کیا۔ اُر سے شمال میں سرزمین بابل کا ایک شہر ہے۔ کوئی وجہ اس خیال سے انکار کی نہیں ہو سکتی کہ منجملہ اُن گروہوں کے جو زمانہ مابعد میں عبرانی کے لقب سے پکارے گئے اُن میں سے کم از کم ایک گروہ ایسا تھا جسکی اصل ارض بابل سے تھی۔ سچ یہ ہے کہ فراتی تمدن کی طرف اشارہ عبرانیوں کی تاریخ کے ہر زمانہ اور عہد میں ملتا ہے۔ عبرانیوں کی زبان میں اُن کے قوانین و آئین میں اُنکے فنون اور تعمیرات میں اُنکی معاشرت اور سیاسی انتظام میں، اور بہت زیادہ اُنکی مذہبی رسوم اور معتقدات میں اس تمدن کے آثار بخوبی نظر آتے ہیں ـــــ انجیل کا عہد عتیق بابل کے تمدن سے بھرا پڑا ہے ـــــ یہاں تک کہ جب عہد جدید کو پڑھتے ہیں تو بھی یہ ہی دیکھتے ہیں کہ ہم اُس دائرہ سے باہر نہیں ہیں جس میں بابل کا اثر موجود تھا۔

**ارض بابل کے دو دریا** | نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وادی فرات میں تمدن اسقدر قدیم زمانہ سے کیونکر شایع ہو گیا ـــــ اس ملک میں دو بڑے دریا نظر آتے ہیں جن سے ملک سیراب ہوتا ہے یعنی ایک فرات اور دوسرا دجلہ۔ ان دریاؤں سے زمین کے زرخیز ہونے کا حال یونان کے قدیم مورخ ہیرو ڈوٹس نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے ـــــ فرات کا اصلی نام پراتو ہے ـــــ پرانی تصانیف اور کتبوں میں اس کو

دریائے کبیر بھی لکھا ہے ـــــ یہ دریا دراصل ملک بابل کے جنوبی حصہ کا دریا ہے ـــــ دجلہ جس کا اصلی نام ادکلہ ہے اور جسکو دریائے تیزرو لکھا ہے۔ فی الواقع بلاد شمالی یعنی ارض اشور کا دریا ہے۔ یہ دونوں دریا گو ایک ہی کوہستان سے یعنی جبالِ آرمینیہ سے نکلے ہیں لیکن انکی خصوصیات جدا جدا ہیں۔ گو فرات بحیثیتِ مجموعی ایک خاموش اور بعض حصوں میں سُست رَو دریا ہے مگر بڑی شان سے بہتا ہے اور پہاڑوں کی حدود سے باہر نکلنے سے پہلے اُس میں بہت سی پہاڑی ندیاں اور چھوٹے دریا شامل ہوجاتے ہیں۔ شروع میں اُسکا بہاؤ مغرب کی طرف ایسا نظر آتا ہے کہ گویا بحر متوسط کا قصد رکھتا ہے۔ لیکن اُس طرف چلتے چلتے دفعتاً اُسکا رُخ جنوب مشرق کی طرف پھر جاتا ہے۔ پھر اس میں ندیاں اور دریا بہت کم شامل ہوتے ہیں۔ جنوب مشرقی سمت میں ۳
بہتا ہوا جب زیادہ جنوب میں پہونچتا ہے تو رودِ دجلہ سے اُسکا اتصال ہوجاتا ہے۔ فرات کا طول ۱۷۸۰ میل ہے لیکن اس طول کا وہ حصہ کم ہے جس میں کشتیاں چل سکتی ہیں۔ کیونکہ اُسکی شمالی گذرگاہ کی ناہمواریاں کشتیبانی میں مزاحم ہوتی ہیں۔ جنوب میں اُسکی سُست چال اور جا بجا ریت کے ٹاپو کشتیاں چلانے میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ مالِ تجارت کی آمدورفت کے لیے کسی وقت میں بھی اس دریا کو شہرت نہیں ہوئی۔ دریائے دجلہ کا طول اگرچہ فرات سے کم ہے (یعنی صرف ۱۱۴۶ میل) لیکن اُسکا حال فرات سے مختلف ہے۔ وہ پہاڑوں میں اپنے منبع سے نکلتے ہی قوت پکڑکر اونچے نیچے درّوں اور تنگ و تاریک گھاٹیوں میں سے زبردستی اپنا رستہ نکالتا ہے اور ہموار ملک تک پہونچنے میں بہت سے دریا اُسمیں ملجاتے ہیں اور اس رفتار میں اسکا عرض بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ مگر باوجود اسکے جب وہ جنوب کی سطح زمین پر پہونچتا ہے تب بھی اُسکی تیز رفتاری میں فرق نہیں آتا۔ اور اب اور بھی جنوب کی طرف پیچ و خم کھاتا دریائے فرات کا رُخ کرتا ہے لیکن پھر ہٹ جاتا ہے۔ مگر کچھ دور بڑھکر قرناء کے مقام پر بالآخر فرات سے جا ملتا ہے اور اس مقام سے دجلہ اور فرات کی ملی ہوئی دھاریں شط العرب کا نام اختیار کرکے خلیج فارس میں جا گرتی ہیں۔ شمال میں دیار بکر سے لیکر فرات کے اتصال تک دجلہ میں کشتیاں چل سکتی ہیں۔ شہتیروں کے بیڑے دریا دریا بغداد تک آسکتے ہیں اور شط العرب کے دہانے سے موصل تک چھوٹے اگبوٹ جا سکتے ہیں پس دریائے دجلہ، بابل و اشور کے مال تجارت کے لیے بڑا راستہ تھا اور یہی وہ دریا تھا جسکی وجہ سے بابل و اشور کا خلیجِ فارس کی راہ سے ایک طرف ہندوستان سے اور دوسری طرف مصر اور بحرِ قلزم اور بحر متوسط سے تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ جیسا فرق ان دونوں دریاؤں میں پایا جاتا ہے ویسا ہی فرق ملک کے شمالی حصہ یعنی اشور اور جنوبی

حصہ یعنی بابل میں پایا جاتا ہے۔ ارض اشور کا طول ۲۵۰ میل ہے اور عرض جہاں کم سے کم ہے وہاں ۹۰ میل ہے۔ اور جہاں زیادہ سے زیادہ ہے وہاں ۳۰۰ میل تک پہونچ جاتا ہے۔ شمال اور شمال مشرق اور شمال مغرب میں وہ پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے اور زمین کا بہت سا حصہ خاصکر مشرق کی طرف کا کوہستانی ہے۔ کردستان کے پہاڑ دجلہ سے قریب اور موصل سے کچھ جنوب میں واقع ہیں۔ انکے باہر زمین کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ پہاڑوں سے نکلتے ہی ہموار زمین نرم اور قابل زراعت ملتی ہے۔ رود دجلہ اور اُسکے مددگار دریا اور چشمے سرمائی بارشوں سے طغیانی میں آکر گرد و نواح کی زمینوں کو بالکل غرقاب کر دیتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب نہریں تعمیر نہیں ہوئی تھیں یہ سیلاب جان اور مال کو غارت کر دیا کرتے تھے۔ مگر ان سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ جنوبی حصہ ملک یعنی بابل جسکا طول ۳۰۰ میل اور عرض زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ میل ہے نہایت شاداب اور زرخیز خطہ بنگیا۔ جو اور گیہوں کی پیداوار اس کثرت سے ہونے لگی کہ اکثر ملکوں کو غلہ بابل ہی سے جایا کرتا تھا

**بابل کے تمدن کے اسباب** ارض بابل کی شادابی اور زرخیزی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ زمین اُس مٹی سے پیدا ہوئی ہے جو دریا اپنے ساتھ لاکر طغیانی کے بعد چھوڑ جاتے تھے۔ یہ مٹی اب بھی ایک سال میں ۹۰ فٹ نئی زمین دریا کے دہانے پر پیدا کر دیتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نئی زمین دریا کے دہانوں پر پیدا ہوا کرتی تھی۔ اس آوردہ مٹی کے جمنے اور نئی زمین پیدا ہونے سے بابل کے ایسے شہروں کی عمر کا اندازہ کیا جاتا ہے جو پہلے خلیج فارس کے کناروں سے بہت قریب یا بالکل کنارے پر واقع تھے۔ مگر جواب کناروں سے بہت ہٹے ہوے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے شہروں میں اریدو کا شہر تھا جسکی نسبت تحقیق ہے کہ وہ خلیج فارس کے ساحل پر واقع تھا۔ اب وہ خلیج سے ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اگر مٹی بڑھنے کا اوسط فی سال ۹۰ فٹ قرار دیا جاوے تو اس حساب سے کہہ سکتے ہیں کہ عرصہ ۰۰۰ ، برس کا ہوا کہ اریدو خلیج فارس کے کنارے پر آباد تھا۔ چونکہ یہ بھی تحقیق ہوا ہے کہ دجلہ اور فرات کے دریا خلیج فارس میں جدا جدا مقام پر گرتے تھے، اسلیے نتیجہ نکلا کہ وہ تمام ملک جو مقام قرنا سے موجودہ سواحل خلیج کے درمیان واقع ہے وہ عہد تاریخی میں پیدا ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہاں پانی تھا۔ پس قدرت کی یہ فیاضی کہ دو دریا ملک میں موجود تھے جو غیر معمولی شادابی زمین کو بخشتے تھے اور یہ بات کہ اُن میں ایک دریا شمالی ملکوں سے خلیج فارس تک سلسلہ تجارت کی بڑی شاہراہ تھا اور یہ امر کہ خلیج فارس جس سے ملک ملا ہوا تھا خود ایک بڑا ذریعہ تھا کہ دور دور کے ملکوں تک رسائی ہو سکے وہ اسباب ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارض بابل کیونکر قدیم زمانہ سے ایسے لوگوں کا

٢ مسکن ہوگیا جنھوں نے بدویت سے نکل کر زراعت کو اپنا پیشہ بنالیا اور اس پیشہ کو ایسی حالت میں اختیار کیا جبکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار کم سے کم محنت میں پیدا ہوسکتی - ملک کے موسمی حالات نے بھی زراعت کو بہت ترقی دی

**ایک عجیب خصوصیت** علاوہ قدامت کے وادی فرات کے تمدن پر برخلاف دیگر تمدنوں کے یہ ایک عجیب اچمبا گذرا تھا کہ اسکے تمام ظاہر اور مادی آثار یا تو مٹ گئے تھے یا پردہ خاک میں ایسے روپوش ہوگئے تھے کہ اُنکا نشان تک ڈھونڈنا دشوار تھا - اور اس طرح تاریخی عہد کے ہزارہا برس کے حالات جو اُن آثار رہے (اگر وہ قائم رہتے) آسانی سے ظاہر ہو جاتے، انسان کے احاطۂ علم سے خارج رہے - آج سے چند پشتوں
٣ پہلے یہ حال تھا کہ بابل اور اشور کی تاریخ علوم و فنون سے واقفیت بہت کم کسی کو حاصل تھی - اگر کچھ تھی بھی تو اسکا دارومدار قطعی توریت کی حکایات یا بعض یونانی اور رومانی مصنفوں کے بیانات پر تھا - گران سانی سے جو کچھ معلومات پیدا ہوتی تھی وہ ناکمل و غیر کافی تھی - ملک مصر کی طرح بابل اور اشور میں ایسی عمارتیں موجود نہ تھیں جن کو دیکھکر اہل ذوق زمانہ ماضی کی شوکت پر حیرت زدہ ہوتے - گر باوجود اس کے جو قوی اثر دنیای قدیم پر بابل و اشور کے تاجداروں نے پہونچایا تھا اور جیسی حربی قوت اُنھوں نے پیدا کی تھی - اور جیسی جیسی عمارات عالیشان معابد و ہیاکل محل و باغات سے اُنھوں نے اپنے ملک کو رونق بخشی تھی، اور نیز وہ فضل و کمال جس کی وجہ سے اُنکے پیشوایان دین ہزارہا برس تک دنیا میں مشہور رہے انسان کی یاد سے مطلقاً محو نہ ہوسکے - گو خواب کی طرح یہ چیزیں کچھ نہ کچھ یاد رہیں، لیکن اُنکے صحیح اور تفصیلی حالات جن سے پوری تصویر اُس تمدن کی آنکھوں میں پھر جاتی جسکو گذرے ہوے ہزارہا برس ہوے تھے مطلق معلوم نہ تھے - بلکہ صحیح معلومات کی جگہ مبالغہ آمیز اور غیر واقعی افسانے اُن میں مشہور چلے آتے تھے -

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ایسا ملک جو علم و ہنر کو جلد پرورش کرنے اور ترقی دینے کی قابلیت رکھتا ہو وہ زوال شروع ہوتے ہی جلد تلف اور ضایع کر دینے کا مادہ بھی رکھتا ہے - مثلاً دونوں دریاؤں کی طغیانی جو زمین کے لیے اس قدر مفید تھی اُس میں ہر سال جان و مال کے ضایع ہونے کا خوف بھی شامل تھا - اور جب تک ایک بڑے پیمانہ پر نہریں کھودنے کا سلسلہ جاری نہ ہوا اُسوقت تک مخلوق کی جان و مال کو حفاظت نصیب نہ ہوئی - اور اس مصیبت سے کہ مہینوں تک ملک کے بعض بعض اضلاع پانی میں غرق رہیں نجات نہ ملی - کتاب پیدایش کے پہلے باب میں جو تصویر سیلاب نوح کی دکھائی گئی ہے اور جس میں زمین کے برآمد ہونے سے پہلے کی

حالت بیان ہوئی ہے کہ پانی نے سب چیزوں کو ڈھک دیا تھا۔ غالباً یہ موقع اسی منظرِ سیلاب کا ہے جو ہر سال ارضِ بابل میں پیش آیا کرتا تھا۔ اسی طرح یہ خیال کہ بجز چند نفوس کے ایک زمانہ میں تمام بنی نوعِ انسان ایک طوفان کی وجہ سے بالکل غارت ہو گئے تھے اُن لوگوں کے وہم و قیاس سے بعید نہ تھا جو ہر سال برسات میں طوفان و طغیانی کی غارتگری اپنی زمینوں پر دیکھا کرتے تھے۔ بابل و اشور کے زوال پر جب نہروں کی مرمت کی طرف سے غفلت ہونے لگی تو نہروں کی تعمیر سے پہلے جو خراب حالت تھی اُس سے بھی بڑھکر یہ نقصان ہوا کہ جو کام صدہا نسلوں نے ہزارہا برسوں میں کیا تھا وہ تھوڑے عرصہ میں غارت ہو گیا۔ بستیاں اور شہر صفحۂ ہستی سے مٹنے لگے۔ اور یہ تباہی اُن چیزوں کی وجہ سے جن سے اہلِ بابل اپنی عمارتیں بناتے تھے اور بھی زیادہ عمل میں آئی۔ یہاں بھی اگر بابل کی عمدہ مٹی عمارتوں کے بنانے اور اہلِ بابل کو اپنا ہنر دنیا پر جلد روشن کرنے میں مددگار ہوئی تو ویسے ہی اُنکی ناپائداری اس بات کا سبب ہوئی کہ بڑی بڑی مرتفع عمارتیں جلد مسمار ہو کر تودۂ خاک بن گئیں۔ کچی عمارتوں کی ہمیشہ مرمت کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ بادشاہِ بابل بنوخذنصر ثانی کے عہد کے ایک میخانی خطبہ میں لکھا ہے کہ ۴۵ برس کی غفلت کافی ہوئی کہ ایک بڑی پرستش گاہ کی عالیشان عمارت ٹوٹ کر کھنڈر ہونے کے قریب ہوگئی۔ جنوبی حصہ ملک میں قطعاً اور شمالی حصہ میں اکثر تعمیر کے کام میں صرف مٹی ہی استعمال ہوتی تھی۔ خواہ اُس سے غریب اپنے گھر بنائیں اور خواہ بادشاہ اپنے محل و قصور و پرستش گاہ تعمیر کریں۔ شمالی حصہ میں بڑی بڑی عمارتوں میں کہیں کہیں پتھر لگایا گیا تھا۔ پس جب یہ حالت تھی تو آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس دو ہزار برس کے عرصہ میں جو بابل و اشور کے شہروں کی ویرانی اور اُنکو کھود کر برآمد کرنے کے درمیان گذرے ہیں ان عمارتوں پر کیا کچھ نہ گذرا ہوگا۔ عمارتیں گر کر کھنڈر ہو گئیں اور بادِ سموم کے جھونکوں نے زمین سے ریت کے دل بادل اُڑا کر اس تباہی کو اور زیادہ کیا۔ چنانچہ شکستہ در و دیوار کی اگر کہیں تھوڑی بہت ہیئت بھی نظر آتی تھی وہ بھی آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ بڑے بڑے آباد شہروں کی جگہ فقط خاک کے تودے یا ریت اور مٹی کے ٹیلے رہ گئے۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑے گا کہ فطرت نے اس غارتگری میں بھی رحمدلی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اگر ریت و مٹی ان پرانے شہروں کے کھنڈروں پر ڈھیر اور ٹیلے نہ بنا جاتے تو دنیائے قدیم کے تاریخی دفتر اس جہان سے قطعی ناپید ہو جاتے۔ کیونکہ ان ڈھیروں اور ٹیلوں کے نیچے جیسا کہ بعد کو ظاہر ہوا میخانی خط میں لکھے ہوئے طرح طرح کے مکتوبات، اسناد و دستاویزات، گلی تختیاں اور اسطوانے، اینٹیں اور

لوحیں، بڑے بڑے معبودوں کی مورتیں اور آدمیوں کے بُت بالکل محفوظ رہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی مدد سے آج آثار قدیمہ کے محقق بابل واشور کی تاریخیں لکھنے کے قابل ہوئے۔ غرض اس صورت سے تختیوں اور لوحوں پر جو تاریخی ذخیرہ کندہ تھا وہ زمانہ کی دستبرد سے بچ گیا۔ ورنہ زمانہ کے انقلابات سے متاثر ہو کر یہ چیزیں کبھی کی غارت ہو گئی ہوتیں۔

**اُنیسویں صدی** | گذشتہ تمدن کی نشانیوں کو زمین سے نکالنا اور پھر اُن نشانیوں سے بابل واشور کی تاریخ، علوم وفنون معاشرت کو پڑھکر اور سمجھکر دوبارہ ضبطِ تحریر میں لانا۔ یہ سب کام اُنیسویں صدی عیسوی کے ہیں۔ یہ صدی دنیا میں ہمیشہ اس بات کیلیے مشہور رہے گی کہ اس میں وہ باتیں تحقیق ومنکشف ہوئی ہیں جنھوں نے ایک طرف تو کائنات کی نسبت ہمارے خیالات کو تبدیل کر کے موجودہ شرائط زندگی کو ایک دوسری نہج پر قائم کر دیا اور دوسری طرف تاریخِ قدیم کے اوراقِ گم شدہ کو بازیاب کر کے ہمارے علم کو ترقی دی۔

**شہر نینوہ** | دجلہ کے کنارے کنارے اور فرات کی وادی میں جو ٹیلے جا بجا نظر آتے تھے اور مٹی کے ٹوٹے برتن یا نقشیں اینٹوں کے ٹکڑے جو اُن ٹیلوں کے اوپر یا آس پاس پڑے ملتے تھے یا تھوڑی سی زمین کھودنے پر نکل آتے تھے اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ ان ٹیلوں کے نیچے ضرور پرانے وقتوں کے آثار دبے پڑے ہیں۔ لیکن تھوڑی سی کھدائی سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ جہاں یہ ٹیلے ہیں وہاں کس کس نام اور حیثیت کے شہر اگلے وقتوں میں آباد تھے۔ نام اور شہرت ایسی چیزیں ہیں جو واقعات کے صحیح علم کے معدوم ہونے پر بھی باقی رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ مشہور چلا آتا تھا کہ شہر موصل کے سامنے کچھ فاصلہ پر جو ایک سلسلہ ٹیلوں کا ہے وہاں کبھی نینوہ کا مشہور شہر آباد تھا۔ ان ٹیلوں میں سے ایک کا نام نبی یونس ہے اور اسکی چوٹی پر ایک چھوٹی سی عمارت تھی جسکی نسبت یہاں کے لوگوں کا بالعموم یہ اعتقاد تھا کہ وہ حضرت یونس کا مزار ہے۔ حضرت یونس وہ نبی تھے جنھوں نے شہر نینوہ کے حق میں بد دعا کی تھی اور یہ شہر غارت ہو گیا تھا۔

**ابتدائی توجہ** | اس عمارت میں حضرت یونس کی قبر کا ہونا تو ایک فرضی بات ہے۔ لیکن اس روایت میں کہ حضرت یونس نے نینوہ کے حق میں بد دعا کی تھی حضرت یونس کے ساتھ نینوہ کا خیال ایسا وابستہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اس بات کو نہ بھولا تھا کہ نبی یونس کے ٹیلہ کے نیچے سلطنت اشور کا دارالحکومت یعنی نینوہ کے شہر کا بڑا حصہ (جیسا کہ فی الحقیقت بعد کو ثابت ہوا) دبا پڑا ہے۔ جنوب میں بغداد سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک سلسلہ ٹیلوں کا اور تھا جس میں سے ایک ٹیلہ کا نام بابل تھا۔ اس نام سے یہ

خیال ہوا کہ جنوبی سلطنت کا دارالحکومت اسی موقع پر کہیں ہوگا۔ غرض یہ اشارے اور اتنے پتے تھے جنکی وجہ سے پُرانے سیاحوں اور عمارات قدیمہ کے شائقین نے تحقیق کا کام شروع کیا۔ سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں ان ٹیلوں کی طرف اور ان ہی کے نواح میں دوسرے ٹیلوں کی طرف بہت سے سیاحوں کو توجہ ہوئی۔ بلکہ اس زمانہ سے بھی کئی سو برس پہلے ایک مشہور سیاح نے جسکا نام ربی بن یامین طلیطلی (۱۱۶۰ء) تھا اپنے سفرنامہ میں مختصر سا حال بابل و نینوہ کے ویرانوں کا لکھا سولھویں صدی کے اخیر نصف حصہ میں جن سیاحوں نے بابل اور نینوا کی طرف کسی قدر توجہ کی اُن کا ذکر چھوڑ کر سترہویں صدی کے شروع میں ایک سیاح پڑونامی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ شخص اطالیہ کا باشندہ تھا۔ اور مشرقی ملکوں میں بہت سیر و سیاحت کر چکا تھا۔ اس نے اصطخر کے کھنڈروں کے علاوہ جہاں سے میخانی خط میں لکھے ہوے کتبے کی ایک نقل بھی حاصل کی تھی۔ بابل کے ٹیلوں اور مقیر کے ٹیلوں کا جن میں حضرت ابراہیم کا مولد یعنی اُر کا شہر وادیِ فرات میں آباد تھا امتحان کیا تھا۔ یہ پہلا شخص ہے جو یورپ میں بابل کی اینٹیں جن پر حروف کندہ تھے لایا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے سیاحوں میں جن کو دجلہ اور وادی فرات کے ٹیلوں کی تحقیق کا شوق ہوا اُن میں دو بڑے آدمیوں کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔ ایک کارستن نیبور جو ڈنمارک کا مشہور ڈاکٹر اور سیاح تھا جس نے دجلہ کے قریب شہر بابل کا واقع ہونا ثابت کیا اور دوسرا ابی دی بیچمپ ہے جس نے اٹھارویں صدی کے ختم ہونے سے کچھ پہلے اُن ٹیلوں کا ذکر کیا ہے جن کے نیچے شہر بابل کے آثار جابجا دبے پڑے تھے۔ اس سیاح نے لکھا ہے کہ ان ٹیلوں کے قریب بہ روغنی اینٹوں اور اسطوانوں کے ٹکڑے جن پر حروف کندہ ہیں جابجا ملتے ہیں۔

**کندن کا ابتدائی کام** جس وقت یہ یقین ہوگیا کہ ان ٹیلوں کے نیچے زمانۂ قدیم کے آثار اور نشانیاں دفن ہیں تو پھر اُنکو کھود کر نکالنے کا جو شوق سیاحوں اور شائقین آثار قدیمہ کے دل میں پیدا ہوا اُسکا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ حقیقت میں جب یہ لوگ سوچتے ہوں گے کہ ان ٹیلوں میں ہزارہا برس کی پرانی چیزیں خدا جانے کس کس قسم کی دبی ہیں تو اُنکی بیتابیِ شوق انتہا سے گذر جاتی ہوگی۔ چنانچہ ایک انگلش مین کلاڈیس جیمس ریچ نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بغداد میں رزیڈنٹ کا عہدہ رکھتے تھے ولایتِ بغداد کو اپنا صدر مقام قرار دیکر ۱۲ برس اس کوشش میں صرف کیے کہ بابل اور نینوہ کے ٹیلوں کی تحقیق اور بغداد سے موصل تک جس قدر مقامات ہیں اُنکی جغرافی کیفیت دریافت کریں۔ ریچ صاحب کی کوششوں کے نتیجے بہ نسبت سابق

کی کوششوں کے بدرجہا مفید ثابت ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ۱۸۲۱ء میں صرف ۳۴ برس کی عمر میں اس لائق نوجوان محقق کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر باوجود کوششوں کے ناتمام رہنے کے بہت سی پرانی چیزیں کہ جو زمین سے کھود کر خود برآمد کی تھیں یا دوسرے لوگوں سے خریدی تھیں ایک معقول ذخیرہ اپنے بعد چھوڑا۔ یہ ذخیرہ گو زیادہ نہ تھا مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ کیسی مختلف اقسام کی چیزیں ان ٹیلوں میں دبی ہیں۔ رچ صاحب کے مرنے پر برٹش میوزیم نے انکی جمع کی ہوئی کل اشیا خرید لیں۔ ۱۸۲۷ء و ۱۸۲۸ء میں ایک اور انگریز نے جسکا نام رابرٹ میگنان تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت رکھتے تھے جنوبی حصہ ملک میں بہت سے ٹیلوں کا امتحان کیا تھا اور ان ٹیلوں پر لمبی لمبی نالیاں کچھ چوڑی اور کچھ گہری کھود کر ان ٹیلوں کی عمر اور کیفیت کا اندازہ کرنا چاہا تھا۔ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۶ء میں انگلش گورنمنٹ نے نواح دجلہ اور فرات کی پیمائش کا کام اپنے ذمہ لیا۔ لیکن یہ عزت کہ کندن کی غرض سے پہلی باضابطہ جماعت قائم کی جاوے فرانس ہی کو نصیب ہوئی۔

**گذشتہ ستر برس کی محنت** | یہ قصہ کہ اشور و بابل کے شاہی محل اور عبادت خانے اور انکے قیمتی سامان محققوں کی کوشش سے کس طرح انسان کی نظر کے سامنے دوبارہ پیش ہوئے نہایت درجہ دلچسپ ہے۔ اس داستان کو ایک فرانسیسی محقق موسیو بوٹا کی کارگزاری سے جسکی ابتدا ۱۸۴۲ء میں ہوئی شروع کرکے زمانۂ حال کے حالات تک بیان کرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے عجائب خانوں کے ملاحظے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اشیائے قدیمہ کا کس قدر کثیر ذخیرہ گذشتہ ستر برس کے عرصہ میں ترتیب و انتظام کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ اشیا صرف عجائب خانوں ہی میں نہیں رکھی گئیں۔ بلکہ اشیاء کی تصویریں اور کتبوں کی نقلیں بار بار طبع ہو کر شائقین تاریخ بابل اور اشور میں تقسیم بھی ہوتی رہی ہیں۔

**ابتدائی کامیابی کی نوعیت** | ۱۸۴۲ء میں موسیو بوٹا موصل کے شہر میں دولت فرانس کی جانب سے کونسلر ایجنٹ مقرر ہوئے اور اسی سال کے آخر میں موصل کے سامنے دجلہ کے کنارے قوینجک کے ٹیلے پر انھوں نے کندن شروع کیا۔ قوینجک کا ٹیلا بھی تل بی یونس کی طرح نینوہ کے قدیم شہر کے ایک حصہ کو چھپائے ہوئے تھا۔ ان بڑے بڑے ٹیلوں کو کہاں سے کھودا جائے کہ گوہر مقصود حاصل ہو۔ اسکے لیے کوئی قاعدہ اور اصول موجود نہ تھا۔ وقت پر جہاں سمجھ میں آیا خندقیں کھودنی شروع کیں۔ کئی مہینے تک اسطرح کام جاری رہا مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ کچھ کتبے اور پتھر کی سلوں پر ابھرے ہوئے کام کی تصویریں

ملیں لیکن ان میں سالم کم تھیں۔ انکے علاوہ اور کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ اسلیے سنہ ۱۸۴۳ء کے ماہ مارچ میں موسیو بوٹا نے قرینجیک کو چھوڑ کر خورس آباد کے ٹیلے پر کام شروع کیا۔ یہ ٹیلہ قرینجیک کے شمال میں تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع تھا۔ یہاں تھوڑی سی زمین کھودی تھی کہ دو دیواریں نمودار ہو گئیں۔ ان دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پیکانی خط کے کتبے بھی دستیاب ہوے۔ اور اب شبہ نہیں رہا کہ سلطنت اشور کے زمانہ کی ایک عمارت کا پتہ چل گیا اور کام برابر جاری رکھا گیا اور قلیل عرصہ میں اس عمارت کے بہت سے کمرے جن میں پرانے وقتوں کی بہت سی چیزیں ملیں دریافت ہو گئے۔ ان انکشافات کی شہرت جس وقت فرانس میں ہوئی تو بڑا جوش پیدا ہوا اور موسیو بوٹا کے پاس جلد بہت سا روپیہ فراہم کرکے اس غرض سے روانہ کیا گیا کہ زیادہ وسیع پیمانے پر اس کام کو جاری رکھکر خاتمہ کو پہونچا دیں۔ ایک مصور موسیو فلانڈن بھی فرانس سے روانہ کیے گئے کہ جو عمارتیں یا کتبے یا تصویریں ملی ہیں اُنکے نقشے اور نقلیں تیار کریں۔ غرض سنہ ۱۸۴۴ء کے ماہ اکتوبر تک اس عمارت کا جو شاہان اشور میں سے ایک بادشاہ کا محل ثابت ہوا بڑا حصہ برآمد کر لیا گیا۔ اور معلوم ہو گیا کہ اس میں کمرے اور حجرے بہت کثرت سے ہیں۔ دیواروں پر پتھر کی سلیں نصب ہیں اور ان سلوں پر طرح طرح کی تصویریں کندہ ہیں۔ کہیں سپاہیوں کے دستے کوچ کرتے ہوے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں لشکرگاہ میں فوج والوں کی روزانہ زندگی کے واقعات کہیں گھوڑے، رتھ، خیمہ و خرگاہ، کہیں حملہ کرنے کے کرتب اور دشمن کی دیوار کے قریب پہونچکر دست بدست لڑائیوں کے معرکے دکھائے ہیں، کسی حصین شہر کو محاصرہ کے بعد فتح کرنے اور دشمن کو گرفتار کرکے لیجانے کی تصویریں بنائی ہیں۔ شکار کی کیفیتیں بھی بڑی تفصیل سے دکھائی ہیں۔ جس میں بادشاہ اپنے رتھ میں سوار ہے اور ملازمین صفیں باندھے گرد و پیش حاضر ہیں۔ کہیں جنگلی شیر پنجروں میں بند دکھائے گئے ہیں۔ پنجرے کھول دیے گئے ہیں اور بادشاہ شیروں کا شکار کر رہا ہے۔ کہیں شکار کردہ شیروں اور جانوروں کو نوکر صف باندھے گھسیٹے لیے جاتے ہیں۔ اس کندن میں جو سب سے عجیب چیز برآمد ہوئی وہ پتھر کے بڑے بڑے بُت تھے جن کا چہرہ انسان کا سا تھا اور دھڑ بیل کا سا، اور شانوں پر بڑے بڑے پر لگے تھے۔ یہ جوڑے جوڑے قد آور بُت محل کے سب سے بڑے کمرے کے دروازوں کے دونوں طرف نصب تھے۔ ان پر دار بیلوں کے تمام جسم پر پیکانی خط میں عبارتیں کندہ تھیں۔ جب ان عبارتوں کو پڑھنے کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ جس بادشاہ نے یہ محل بنوایا تھا اُسی کے کارنامے ان

عمارتوں میں درج ہیں۔ یعنی شرو کن ثانی کے جس نے ۷۲۵ قبل مسیح سے ۷۰۰ قبل مسیح تک ملک اشور پر حکومت کی تھی۔ اشیاے قدیمہ کا یہ بڑا ذخیرہ جہاں تک ممکن ہو سکا موصل سے دجلہ کے راستہ بیڑوں پر رکھکر بصرہ میں لائے اور وہاں سے ایک فرانسیسی جنگی جہاز پر لادکر فرانس کو لیگئے۔ وہاں ان چیزوں کی تصویریں جو مصور فلاندن کی تیار کی ہوئی تھیں پانچ بڑی تقطیع کی جلدوں میں چھاپی گئیں۔ ان تصویروں کی تعداد ۴۰۶ تھی اور ان کے ساتھ ہی موسیو بوٹا نے جو حالات ان اشیا کے لکھے وہ بھی طبع کیے گئے۔

**قصر شرو کن** یہ عجیب اکتشافات ایسے بیش بہا تھے کہ فرانس میں اور زیادہ شوق تحقیقات کا پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۸۵۱ء میں فرانس کی گورنمنٹ نے ایک دوسری باقاعدہ جماعت تجویز کرکے اس کام کے لیے روانہ کی۔ اس جماعت کا افسر وکٹر پالس ایک شخص تھا جو فن معماری میں کامل تھا اور موصل میں موسیو بوٹا کی جگہ فرانس کی جانب سے کونسل ایجنٹ بھی مقرر کردیا گیا تھا۔ اس نئی جماعت نے شمالی حصہ ملک میں کام کرنے کے بعد جنوبی حصہ میں بھی ٹیلوں کی چھان بین شروع کی۔ وکٹر پالس چونکہ فن تعمیر میں اُستاد تھے اسلیے زمین کھودکر عمارتوں کو برآمد کرنے میں اُنھوں نے بہت باقاعدہ کام کیا اور اس بات کو ثابت کردیا کہ زمین میں دبی ہوئی عمارتوں کے نکالنے میں ایک لائق معمار جس عمدگی سے کام کرسکتا ہے وہ دوسرے سے ممکن نہیں۔ موسیو پالس نے قصر شرو کن کے بہت سے کمرے برآمد کیے اور اس قصر سے آگے بڑھکر متعدد عالیشان دروازے نکلے جن پر نہایت خوشرنگ روغنی اینٹوں کا کام تھا۔ طرح طرح کے بیل بوٹے اور عجیب غریب صورت کے جانوروں کی تصویریں بنی تھیں۔ قصر کے متصل صحنوں کا ملبہ جب صاف کیا گیا تو کئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں اور نکلیں جنکی نسبت بعد کو تحقیق ہوا کہ وہ عبادت خانے ہیں۔ طرح طرح کے برتن، سنگین اور برنجی، اور شیشے کی بنی ہوئی چیزیں بھی کثرت سے نکلیں قسم قسم کے آہنی اوزار بالکل صحیح و سالم حالت میں برآمد ہوے۔ بعض مکان کیسے یا گودام ایسے نکلے جہاں عمارت کے کاموں کی غرض سے روغنی اینٹیں بھری تھیں۔ اب وکٹر پالس نے ایک بڑی کتاب میں اپنی تمام کارگذاری کے حالات اور نتائج بیان کیے اور عمارت کو جس حد تک دیکھا اور سمجھا تھا اوسکی مدد سے پوری عمارتوں کے نقشے تیار کیے۔ اگر کسی عمارت کا کوئی جزو بھی دیکھا تھا تو اصول تعمیر کے مطابق عمارت کا کل نقشہ تیار کرلیا۔ پس یہ دریافت ہوگیا کہ خورس آباد کے ٹیلوں میں شرو کن ثانی بادشاہ اشور کا ایک شہر جسکے چاروں طرف شہر پناہ اور برج تھے دبا پڑا ہے اور جس کا نام اصلی زبان میں دور شرو کن یعنی شرو کن بادشاہ کا قلعہ یا شہر تھا۔

شہر کے چاروں طرف فصیل تھی اور شہر پناہ کے آٹھ دروازے تھے اور کل رقبہ جس پر یہ شہر واقع تھا ۷۵۰ ایکڑ تھا۔ بیچ کی عمارت شاہی قصر تھا۔ دیواروں کا جو رُخ باہر کا تھا وہ پتھر کا تھا۔ کہیں کہیں فرشوں میں بھی پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ باقی عمارتیں سب کچی اور پکی اینٹ کی تھیں۔ ایسی ہی اینٹوں سے اشور اور بابل کے مکانات بالعموم بنائے جاتے تھے۔

وکٹر پالس نے اور ٹیلوں پر بھی کام جاری کیا جو موصل سے دور نہ تھے۔ مثلاً قلعۂ شرقتہ کے ٹیلہ پر جہاں پہلے اشور کا مشہور و معروف شہر تھا اور تل نمرود پر جہاں سلطنت اشور کا شہر کلح (کلح) واقع تھا۔ ان ٹیلوں کے علاوہ اور ٹیلوں کا بھی امتحان کیا گیا۔ لیکن ان سب میں وہ کامیابی جو موسیو بوٹا کو خورس آباد کے ٹیلوں کو کھودنے میں حاصل رہی تھی میسر نہ ہوئی۔ افسوس ہے کہ وکٹر پالس نے جو اشیاے قدیمہ فرانس بھیجنے کے لیے جمع کی تھیں وہ سب تلف ہو گئیں کیونکہ جن کشتیوں پر یہ سامان بھر کر روانہ کیا جاتا تھا وہ سب غرق ہو گئیں۔ مگر ان اشیاء کی جو تصویریں اور نقشے اُتار لیے گئے تھے وہ بچ گئے۔ اور اس لیے علم کو زیادہ نقصان نہ پہونچا۔

**ایک انگریزی محقق** اسی زمانہ میں فرانسیسیوں کی ایک جماعت جس کا افسر موسیو فرزنل تھا جنوبی حصۂ ملک میں ایک ٹیلہ پر کام کر رہی تھی۔ یہ ٹیلہ ان متعدد ٹیلوں میں سے ایک تھا جس کے نیچے شہر بابل دبا ہوا تھا۔ یہاں ۱۸۵۵ء تک کام جاری رہا۔ لیکن پیشتر اس سے کہ بابل والے ٹیلوں کا حال لکھا جاوے ایک انگریزی محقق کی کارگزاری کو لکھنا ہوگا۔ یہ انگلستان کا مشہور شخص جس نے موسیو بوٹا، فلاندن اور پالس سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی اپنا کام اُس زمانہ میں کر رہا تھا جبکہ وکٹر پالس خورس آباد کے ٹیلوں میں مصروف تھا۔ یہ شخص آسٹن ہنری لے یرڈ تھا۔ 'سر' کا خطاب اس وجہ سے ملا تھا کہ امور سیاسی اور آثار قدیمہ کے متعلق اُنکی خدمات نہایت قابلِ قدر تھیں۔ بلاد شرق میں مدت کے سیر و سفر کے بعد ۱۸۴۰ء میں موصل کے قریب کے ٹیلے انکی نظر سے گذرے اور دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ کاش یہ ٹیلے ایک دن کھودے جائیں۔ ۱۸۴۵ء کے اخیر حصہ میں جبکہ سر سٹریٹ فورڈ کیننگ قسطنطنیہ میں برٹش سفیر تھے لیرڈ صاحب کو اس کام کے لیے کچھ روپیہ دیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے تل نمرود پر کام جاری کر دیا۔ یہ ٹیلہ اسلیے پسند کیا کہ وہ موصل سے کسی قدر فاصلہ پر ہے اور وہاں کام چپ چاپ چلتا رہے گا۔ لوگوں میں زیادہ چرچا نہ ہوگا۔ سرمایہ اسقدر قلیل تھا کہ زیادہ تحقیقات کی امید نہ کیجا سکتی تھی۔ یہ سمجھا گیا تھا کہ کام

شروع کرنے سے شاید اتنا ضرور معلوم ہو جائے کہ اس ٹیلہ کے نیچے پرانے آثار اور اشیاء موجود ہیں یا نہیں۔ اگر اتنا پتہ بھی چل گیا تو پھر شوق میں زیادتی ہو جائیگی اور اگر زیادہ روپیہ مل گیا اور روپیہ کے ساتھ ترکی گورنمنٹ نے لندن کا فرمان بھی دے دیا تو تحقیقات وسیع پیمانہ پر ہو سکے گی۔ لیکن اتفاق یہ کہ جس دن کام شروع کیا گیا اسی دن ایک عمارت کے دو کمرے نکلے۔ جن کی دیواریں پتھر کی سلوں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ ایک کمرہ ٹیلہ کے جنوب مغربی گوشہ میں اور دوسرا مغربی پہلو کے وسط میں واقع تھا۔ یہ کمرے ایک عمارت کے نہ تھے بلکہ دو جدا جدا عمارتوں کے تھے اور یہ دونوں عمارتیں بعد کو ثابت ہوا کہ بادشاہوں کے محل تھے۔ لےیرڈ صاحب کی ہمت بڑھی اور رفتہ رفتہ مزدوروں کی تعداد بڑھانے لگے۔ مشکلات بہت سی پیش آئیں ادھر سرمایہ کی کمی ادھر باشاے موصل کا اختلاف لیکن بہر حال کام بند نہ کیا۔ اسی اثناء میں برٹش میوزیم کے حکام نے لےیرڈ صاحب کی مدد کے واسطے کچھ روپیہ بھیجنا منظور کیا اور وہ اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۴۵ء کے موسم گرما تک نہایت محنت جانفشانی سے اس کام کو چلائیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے صرف بہت سے کمرے پانچ شاہی محلوں کے تل نمرود سے کھود کر نکالے۔ بلکہ موصل کے سامنے جو ٹیلا قوینجیک کے نام سے تھا اسکے کھدن میں بھی بڑی کامیابی حاصل کی۔ کیونکہ یہاں بادشاہ اشور سنحریب (۷۰۵-۶۶۱ ق م) کا ایک عالیشان محل مل گیا۔

**جدید انکشافات**

تل نمرود سے خاص کوشش کے ساتھ اس محل کو برآمد کیا گیا۔ جو ٹیلے کے شمال مغربی حصہ میں تھا اور جو بادشاہ اشور نسرپال (۸۸۳-۸۵۹ ق م) اور شروکن ثانی (۸۰۶-۷۲۱ ق م) کا بنایا ہوا تھا۔ خورس آباد کی طرح تل نمرود کے محلوں میں بھی اور بعد کو قوینجیک سے برآمد کردہ عمارتوں میں ایسے کمرے اور طاق بکثرت نکلے جنکی دیواریں تصاویر سے پٹی تھیں۔ علاوہ اسکے پردار شیروں اور پردار بیلوں کے بلند قوی ہیکل بت جن کے چہرے انسان کے سے تھے کمروں کے دروازوں کے دو طرفہ ملے۔ تصویروں میں وہی گوناگونی تھی جو خورس آباد کی تصویروں میں پائی گئی تھی۔ بادشاہ اشور نسرپال کے محل میں جو تل نمرود سے برآمد ہوا اور جسکا پرانا نام کلح (قلع) تھا بادشاہ مذکور نے اپنے شاہی مصوروں سے ان لڑائیوں کی تصویریں کھنچوائی تھیں جو خاص اسکے عہد کے محاربات تھے بعض تصویروں میں دکھایا گیا تھا کہ افواج شاہی ایک دریا کو عبور کرتی ہیں لیکن دشمن سے دست و گریبان ہیں کبھی فتح پاکر خوش خوش وطن کو واپس آرہی ہیں۔ ایک بڑے سلسلۂ تصاویر میں بادشاہ کے شکار کھیلنے

کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ ٹیلے کے بیچ میں سلمانسر سوم (۸۵۸ - ۸۲۴ ق م) اور تگلات پلیسر چہارم (۷۴۵-۷۲۷ ق م) شاہان اشور کا تعمیر کردہ محل نکلا۔ اور اسی محل سے ایک یادگار پتھر نکلا جو اب تک برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اور بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ پتھر ایک چوپہل مخروطی شکل کا نہایت سخت اور سیاہ رنگت کا ستون ہے۔ ہر رخ پر پانچ پانچ قطاریں تصویروں کی ہیں اور تصویروں سے جو جگہ خالی رہی ہے اس میں نہایت باریک پیکانی خط میں عبارت لکھی ہے۔ اس ستون پر بادشاہ سلمانسر سوم نے اپنی سی سالہ حکومت کے واقعات درج کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ مذکور نے یہ سمجھکر کہ اب میرا آخری وقت آ پہونچا ہے، مرنے سے کچھ پہلے اس ستون کو تیار کرایا تھا اسکی تصویروں میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ اُن قوموں سے جن کو فتح کیا ہے خراج لے رہا ہے۔ ہر رخ کی پانچوں تصویریں قطاروں میں قوموں کے جدا جدا گروہ دکھائے گئے ہیں اور اُنکے جدا جدا نام ہر تصویر پر لکھے ہیں۔

**اینٹوں کا کتبخانہ** جب زمانہ قدیم کی ان نشانیوں کا بڑا حصہ جس میں پرداربت بھی شامل تھے برٹش میوزیم میں پہونچا تو اشوری اکتشافات میں اہل انگلستان کو بھی دلچسپی ہو گئی اور یہ شوق اس وجہ سے اور بڑھا کہ لے یرڈ صاحب نے نہایت دل آویز پیرایہ میں ان تمام یادگاروں اور نشانیوں کا احوال تحریر کیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ پیکانی خط کی عبارتیں سمجھ نہ سکتے تھے، لیکن پھر بھی کچھ اپنی ذہانت سے اور کچھ اُن کتبوں سے جن کے مطالب سمجھ لیے گئے تھے اور کچھ اُن ناموں سے جو سر ہنری راسن صاحب نے پیکانی عبارتوں سے محلوں کے تعمیر کرنے والے بادشاہوں کے پڑھ لیے تھے لے یرڈ صاحب نے کسی قدر تاریخی حالات اپنی برآمد کردہ اشیا کے متعلق لکھ ڈالے۔ بہت سے کتبوں اور یادگاروں کے پتھر جن کا انگلستان لیجانا سخت دشوار تھا اُنکی تصویریں اور نقلیں لیکر پھر اُنکو وہیں دفن کر دیا۔ اور اُن تصویروں اور نقلوں کو چھپوا کر طلبائے تاریخ اشور کے سامنے اس بیش بہا علمی ذخیرہ کو پیش کر دیا۔ لے یرڈ صاحب کی اس محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں آثار قدیمہ کے متعلق شوق کو زیادتی ہوئی اور ایک دوسری جماعت جس کے پاس سرمایہ بہت وافر تھا لے یرڈ صاحب کے پاس بھیجی گئی۔ اس جماعت اور سرمایہ کی مدد سے وہ ۱۸۴۹ء سے لیکر ۱۸۵۱ء تک نمرود اور قوینجیک کے ٹیلوں کے کندن میں مصروف رہے۔ اس سے پہلے اُنھوں نے ایک دیسی عیسائی ہرمزد رسم کو جن کا بھائی دولت برطانیہ کی طرف سے موصل میں وائس کونسل تھا اس کام میں شریک کر لیا تھا۔ ہرمزد رسم جنھوں نے خود اپنی کوشش سے اس فن میں بڑا نام پیدا کیا

اس دوسری جماعت کے ساتھ کام میں شریک ہوئے اور ۱۸۵۱ء کے بعد جبکہ لے یرڈ صاحب وطن چلے گئے تو ۱۸۵۵ء تک ہرمزد رسم ہی نے کام کو جاری رکھا۔ اس دوسری پارٹی کے ساتھ ایک بڑا ہوشیار مصور ایف کوپر بھی تھا تاکہ ایسی چیزوں کی جو اپنی جگہ سے ہٹائی نہ جاسکیں تصویریں تیار کرتا رہے۔ ایک ہی وقت میں قویخیک اور نمرود کے ٹیلوں پر کام شروع کیا گیا۔ اس مرتبہ قویخیک کے ٹیلے سے بڑی بڑی چیزیں دریافت ہوئیں۔ بادشاہ اشور سخریب کا محل پورا دریافت کر لیا گیا اور اس میں صدہا سلیں جن پر بادشاہی محاربات اور شکار کی تصویریں کندہ تھیں دستیاب ہوئیں۔ اسکے علاوہ ایک اور بڑا عالیشان اور وسیع محل شاہان اشور میں سب سے نامور بادشاہ اسورنیاپال (۶۶۸ - ۶۲۶ ق م) کا دریافت ہوا۔ یہ وہی اشوری بادشاہ ہے جسکا نام یونانی میں بگڑ کر سرداناپالس ہوگیا۔ اور جسکو کتاب مقدس کے عہد عتیق میں اسنا پہ (عذرا ۴-۱۰) لکھا ہے۔ علاوہ معمولی سلوں کے جن پر تصویریں تھیں اور بڑے پردار توں یا کتبوں کے جن میں نقشیں استوانے شامل تھے اور جن پر بادشاہ کی لڑائیوں کا حال تحریر تھا لے یرڈ صاحب کو اس محل میں دو بڑے کمرے ملے جنمیں ہزارہا مٹی کی تختیاں چنی تھیں۔ بعد کو ثابت ہوا کہ یہ بادشاہ اسورنیاپال کا کتبخانہ تھا اور یہ مٹی کی تختیاں دراصل کتابیں ہیں جن پر مضامین کندہ ہیں۔ اور دریافت ہوا کہ اس جلیل القدر بادشاہ نے نہ صرف سلطنت اشور کی پرانی تحریرات، مکتوبات اور کیفیات کو بلکہ بابل کی بھی جملہ تصنیفات کو جس قدر دستیاب ہوسکیں اپنے کتبخانہ میں جمع کیا تھا۔ ان تختیوں کے نکلنے کے بعد کھندن جاری رہنے پر اور کئی تختیاں بھی برآمد ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان سب کی تعداد قریب تیس ہزار کے پہونچگئی۔ یہ سب تختیاں برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ اور عجائب خانہ مذکور کا سب سے بیش بہا خزانہ ہیں۔ بابل کے ادبیات کی نسبت جو کچھ علم اس وقت ہے وہ ان ہی تختیوں کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر تختیاں ایسی ہیں جنکی عبارتوں سے دریافت ہوتا ہے کہ بادشاہی نقل نویسوں نے انکو اصل عبارتوں سے نقل کیا ہے اور اصلی عبارتوں کی تختیاں جنوبی حصہ ملک بابل کے بڑے مقامات میں خاصکر شہر بابل اور بورسیا میں جو مشہور عبادتخانے تھے انکے کتبخانوں میں موجود تھیں۔ ادبیات کی سب سے بڑی شاخ جو اس کتبخانہ سے دریافت ہوئی وہ کہانت سے متعلق تھی۔ اس فن کے بڑے ماہر بابل کے پیشوایان مذہب تھے۔ کہانت کی کتابوں میں وہ تحریریں بھی تھیں جن میں قربانی کی بھیڑوں کو ذبح کرکے انکی کلیجی کو دیکھکر سعد ونحس کا شگون معلوم کرنے کے طریقے درج تھے۔ نجوم کے متعلق بہت سی تختیاں تھیں۔ بہت سی تصنیفات اس مضمون کی تھیں

کہ بچہ کی پیدائش کے وقت کن باتوں سے بدشگونی اور کن سے نیک شگونی سمجھی جا سکتی ہے۔ تعبیر خواب اور طرح طرح کے فال نامے بھی تھے کہ کن کن واقعات سے خواہ دریا پیش آئیں خواہ زمین پر شہروں یا شہر کی گلیوں اور گھروں میں پیش آئیں کیا کیا فالیں نکلتی ہیں۔ دوسرا بڑا حصہ ادبی تصنیفات کا عبادت کے متعلق تھا۔ ان میں شریعت وقت کے تمام قواعد واصول اور رسوم بھی بیان ہوئے ہیں۔ ایسے ٹوٹکے اور نسخے بھی لکھے ہیں جن سے بیماری کے بھوت پریت دور ہو جاویں۔ یا کسی پر سحر یا طلسم کا اثر ہو تو وہ رفع ہو جاوے۔ عبادات کے متعلق جو مضامین ہیں اُن میں طب شامل ہے۔ البتہ جو امور مذہبی معتقدات سے تعلق رکھتے ہیں اُنکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ بعض میں محض مناجات، توبہ و استغفار کے مضامین ہیں۔ قصص اور حکایات کی بہت سی تختیاں ہیں جن میں دنیا کے پیدا ہونے کی کہانیاں درج ہیں اور ملک کے مشہور نامور (ہیرو) گلگمش کے واقعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اور ہر قصہ و داستان میں اسی نامور کے کسی نہ کسی عجیب کام کا ذکر آ جاتا ہے۔ کچھ حصہ اس ذخیرہ کا درسی کتابیں ہیں۔ ان میں بہت سی کتابیں بابل کی تصنیفات سے ہیں جن میں اشور کے کاتبوں نے اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ ان درسی کتابوں میں بڑی بڑی فہرستیں علامتوں کی ہیں کہ فلاں علامت سے فلاں بات پیدا ہوتی ہے۔ یہ مذہب پیشہ لوگوں کے پڑھنے کے لیے مرتب ہوئی تھیں۔ بعض تصانیف میں صرف و نحو کے قواعد مع مثالوں کے بیان ہوئے ہیں۔ بعض میں وہ اصطلاحات اور جملے بیان ہوئے ہیں جو قانونی یا تجارتی تحریرات میں استعمال ہوتے ہیں۔ بعض کتابیں محض شرح کے طور پر ہیں اور بعض مدارس میں پڑھائے جانے کے لیے تختیوں پر لکھی ہیں۔ اگرچہ اس کتبخانہ کی تختیوں کی اہمیت کو لے یرڈ صاحب فوراً سمجھ گئے، لیکن جبتک سر ہنری رالنسن اور ایڈون نورس صاحبان اور جارج اسمتھ صاحب نے جو برٹش میوزیم میں اسسٹنٹ کا عہدہ رکھتے تھے ان تختیوں کو قسم وار ترتیب دیکر عبارتوں کو طبع نہیں کیا اور جب تک ان عبارتوں کے مطالب سمجھ نہیں لیے گئے اصلی حال اس ذخیرہ کی اہمیت کا کسی پر نہ کھلا۔ آج بھی گو اس کتبخانہ کو دریافت ہوئے ساٹھ برس ہو چکے ہیں، لیکن اُسکی بہت سی تختیاں پڑھنے اور سمجھنے کے لیے باقی ہیں۔

**عروج اشور کی تاریخ** | سر آسٹن لے یرڈ صاحب کے خاص خاص اکتشافات نمرود کے متعلق یہ تھے۔ ایک مینار زمین سے کھود کر برآمد کیا گیا۔ دو عبادت خانے زمین کھود کر ظاہر کیے گئے۔ یہ عبادت خانے اشور نسیر بعل سوم (۸۸۳ - ۸۵۹ ق م) کے تعمیر کردہ تھے۔ یہ کچی اینٹوں کے تھے جن پر استرکاری تھی۔

دونوں عبادت خانوں میں مٹی کے بت اور پتھر کی سلیں جن پر تصویریں کھدی تھیں اور سنگین لوحیں جن پر عبارتیں کندہ تھیں دریافت ہوئیں۔ ان میں ایک سنگین لوح قریب ۲۲ فٹ کے طول میں تھی اور اس پر نہایت باریک پیکانی حروف میں عبارت لکھی تھی۔ اس لوح سے اور ایک سنگین ستون سے جو ایک دوسرے عبادت خانہ سے نکلا بادشاہ اسورنسربال کے حالات تام و کمال معلوم ہو گئے۔ یعنی جس زمانہ میں یہ بادشاہ گذرا ہے اسکے تاریخی حالات پر پورا عبور ہو گیا۔ ایک تہخانے میں ایک بڑا مجسمہ اُس بادشاہ کا ملا۔ اس بُت خانے میں سلے یرڈ صاحب نے کندن برابر جاری رکھا۔ اور جب دوسری جماعت نے کام شروع کیا تو بہت سی چیزیں تانبے اور پیتل کی مثلاً خود و سپر، تلواریں اور خنجر، بارہ بڑی بڑی دیگیں دستیاب ہوئیں۔ جن میں چھوٹے چھوٹے برتن اور اور طرح طرح کی چیزیں بھری تھیں، مثلاً لوہے کے بہت سے اوزار، ہتوڑیاں آریاں، برچھیاں، پیتل کی نقشیں رکابیاں اور اسی طرح کی اور چیزیں ملیں۔ اشیاء کے علاوہ کتبی سرمایہ میں بھی ان عبارتوں کی وجہ سے جو مورتوں، تصویروں، اور لوحوں، اسطوانوں اور تختیوں پر پڑھی گئیں بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ ان عبارتوں کے پڑھنے سے نینوہ دارالحکومت اشور کی بربادی سے (جو ۶۰۰ قبلِ مسیح میں پیش آئی تھی) تین سو برس پہلے کے واقعات بہت کچھ معلوم ہو گئے۔ اور یہی تین سو برس کا زمانہ سلطنت اشور کے اقبال اور عروج کا تھا۔

۱۸۵۱ء میں سو سے زیادہ صندوق ان پرانی چیزوں سے بھر کر انگلستان روانہ کیے گئے۔ اور وہ برٹش میوزیم میں صحیح سلامت پہونچ گئے۔ سلے یرڈ صاحب نے بابل اور نینوہ کے اکتشافات پر پھر ایک کتاب لکھی۔ اور تمام برآمد کردہ اشیا کا حال بہت خوبی سے لکھا۔ پہلی کتاب میں جو تصاویر چھاپی تھیں اُسکے علاوہ کوپر صاحب کے بنائے ہوے نقشوں کی نقلیں بھی شامل کر دیں۔ اس زمانہ میں پیکانی خط کے پڑھنے میں بہت کچھ کامیابی ہو چکی تھی۔ سر ہنری رالنسن اور ایڈورڈ ہنکس نے جس حد تک اس فن کو معلوم کر لیا تھا اُسکی مدد سے لے یرڈ صاحب نے کسی قدر تاریخی حالات بھی اُن اشیا کے جو کتبوں سے اسوقت تک سمجھنے ممکن ہوسے تحریر کیے۔ اور چونکہ تل نمرود اور قریمیک سے شاہی محل خود برآمد کیے تھے اسلیے انکے بنانے والوں کی مختصر کیفیت کہ وہ کون تھے اور آپس میں کیا رشتہ رکھتے تھے بیان کی۔ اور یہ بھی تحریر کیا کہ کسی محل کا ایک حصہ جو ایک بادشاہ نے تعمیر کیا تھا اُسکے شکستہ ہونے پر اُسکے جانشینوں میں سے کس نے اُسکی مرمت کرائی یا اُس میں اضافہ کیا۔ اور بعض محلوں میں جو مال مصالح لگایا گیا تھا اُس کو

اُکھیڑ کر کسی دوسرے محل کی دیواروں یا چھتوں میں کیونکر استعمال کیا گیا۔

**قدیم ترآثار** انگلستان کی کسی دوسری جماعت نے جو دو برس قائم رہی بڑے بڑے کام کیے۔ بہت سے ٹیلوں کو جو شمالی اور جنوبی حصۂ ملک میں تھے پُرانی چیزوں کی تلاش میں تھوڑا تھوڑا کھودا گیا اور یہ بات طے ہوگئی کہ جو شہر ان ٹیلوں کے نیچے دبے ہیں وہ بہت ہی پُرانے ہیں۔ بعض مقامات پر جیسے کہ قلعہ سرجہ جو دراصل قدیم شہر اشور کا مقام ہے یا عربان اور شریف خاں کے مقامات پر نہایت عجیب اشیا اور کتبے دریافت ہوئے۔ جنوب میں نفر (قدیم نام نپور) کے مقام پر لے یرڈ صاحب نے جو کچھ کام کیا تھا اُس سے تیس برس بعد امریکانی محققوں کو ایسے اشارے مل گئے کہ ان کو ان ٹیلوں کے کھودنے میں بہت زیادہ کامیابی ہوئی۔

**تین پُرانے شہر** اس وقت تک کندن زیادہ تر پُرانے ملک اشور کی زمین پر ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین بڑے پُرانے شہر دریافت ہوگئے۔ ان میں ایک قلعہ سرجہ کے موقعہ پر اشور کا شہر تھا جو ملک اشور کا پہلا دارالحکومت تھا۔ دوسرا کلح (قلح) تل نمرود کے نیچے سے نکلا۔ اس شہر کو سلمانسر اول نے ۱۳۰۰ سال قبل مسیح تعمیر کرایا تھا اور جس کو بادشاہ اسودنسر بال (۸۸۳ - ۸۵۹ ق م) نے اپنا دارالحکومت بنایا۔ تیسرا شہر نینوا تھا جو تل قوینجیک کے نیچے نکلا۔ یہ شہر بادشاہ اسوربل کلح (۱۱۰۰ ق م) کے عہد میں پایۂ تخت قرار پایا جبکہ سلمانسر سوم (۸۵۵-۸۲۴ ق م) تخت سلطنت پر بیٹھا۔ یہی رتبہ اس شہر کو سلطنت اشور کے برباد ہونے تک جس کا زمانہ ۶۰۶ قبل مسیح ہے حاصل رہا۔ ان تین شہروں کے ساتھ درشرکن کا شہر بھی خورسی باد کے مقام پر دریافت ہوا جس کا بانی بادشاہ شرکن ثانی (۷۲۱ - ۷۰۵ قبل مسیح) ہوا۔ یہ شہر نینوہ کے مضافات سے تھا۔ ان شہروں کے علاوہ ملک اشور کے اور بہت سے پُرانے شہروں کے موقعہ کی شناخت کی گئی۔ اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ ان موقعوں کے نیچے اشیاء قدیم کے دفینے موجود ہیں اور اس کی ضرورت ہے کہ اس کا باقاعدہ کندن کیا جائے۔

**لافٹس صاحب کا کام** اب جنوبی حصۂ ملک کے ٹیلوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ قدیم شہر بابل کو زمین سے برآمد کرنے کا کام ایک انگلش مین ولیم کنیٹ لوفٹس کو حاصل ہوا۔ اس کام کو انھوں نے جاری کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک بڑی چیز اُن کی کوشش سے ظاہر ہوگئی۔ اُنھوں نے ۱۸۵۰ء میں پہلی بار اور ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۴ء میں بار ثانی کچھ وقت مقام ورقہ کے قریب کے ٹیلوں کے کھودنے

میں صرف کیا اور ثابت ہوا کہ ان ٹیلوں میں آبو رک یا ایرک ایک پرانا شہر دبا پڑا ہے۔ ورقہ کا موجودہ نام بھی یورک یا یرق کی ایک صورت ہے۔ یہ شہر سیاسی اور مذہبی معاملات میں وادی فرات کے مشہور ترین مقامات سے تھا۔ پہلے شہر کا وہ حصہ نمودار ہوا جو اخیر زمانہ میں بنا تھا۔ اس میں کشتی نما تابوت ملے جن پر روغن تھا۔ یہ تابوت شاہانِ عجم کے عہد کے ثابت ہوئے۔ یعنی پانچویں یا چوتھی صدی پیشین مسیح پہنچے۔ اس زمانے میں یورک کا شہر گو موجود تھا مگر اُس کی وہ پہلی شان باقی نہ تھی۔ چونکہ اس شہر کی عظمت مدت ہائے دراز سے لوگوں کے دلوں میں چلی آتی تھی۔ اس لیے دُور دُور کے مردے وہیں لا کر دفن کیے جاتے تھے۔ لافٹس صاحب جب زمین کھودتے کھودتے نیچے کی تہوں پر پہونچے تو ایک عالیشان عبادت خانہ کے آثار نظر آئے۔ جس کے متعلق ایک منار بھی جسکو قدیم بابلی زبان میں زکوران کہتے تھے ملا۔ اس منار کے آثار بھی اسی وضع کے تھے جس وضع کے دوسرے منارے عبادت خانوں کے متعلق دریافت ہوئے تھے۔ ان ہی ٹیلوں میں سے ایک ٹیلے کے نیچے ایک عمارت ملی جو کسی بادشاہ کا محل معلوم ہوتی تھی۔ اسکے در و دیوار پر روغنی اینٹوں سے گلکاری کی گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ بابل کے دو مشہور قدیم اور جدید عہدوں میں سے یہ عہد جدید کا کام ہے۔ اس عمارت میں جو کتبے ملے خاص کر وہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی تختیاں جن پر کاروباری مضامین کندہ تھے اُن سے ظاہر ہوا کہ یورک کا شہر جدید بابلی خاندان شاہی کے زوال کے وقت جس کو بادشاہ عجم کیرش یا خورس نے ۵۳۹ ق قبل مسیح میں معزول کر دیا موجود تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ورقہ میں لافٹس صاحب کے آنے سے ۶۰ برس کے بعد اسی پہلے بابلی ٹیلے پر بلکہ بعض منتشر ٹیلوں پر کیونکہ یہاں بہت سے ٹیلے ایک دوسرے سے علیحدہ نظر آتے ہیں۔ زمانۂ حال میں یعنی نومبر ۱۹۱۲ء میں جرمن اورینٹل سوسائٹی نے نہایت اہتمام سے کندن شروع کیا جس کی وجہ سے " ای انا " کے معبد کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ " ای انا " کے معنی فردوسی مکان کے ہیں۔ اور یہ عمارت نامہ یا اشتر کی پرستش کے لیے بنائی گئی تھی۔ ان خداؤں کی پرستش کے بارے میں یورک کا پرانا شہر مشہور و معروف تھا۔

(از انسٹی ٹیوٹ۔ علی گڈھ)

محمد عنایت اللہ بی اے

# چاند

اے کہ خضرِ ظلمتِ شب تجھکو کہتا ہے جہاں — پیشوائے شب کا سمجھتا ہے تجھے رخشندہ دل
روشنی سے ہے منور سب زمین و آسماں — ہیں کواکب تیرے آگے نقطۂ نورِ مجل

---

گو فضائے آسماں ہے تیری ممنونِ خرام — تیرا عکسِ رخ زمیں سے گو یاس اندوز ہے
لیکن اک بختِ سیہ تجھسے ہے محرومِ دوام — تیرا سازِ حسن اسکے واسطے اک سوز ہے

---

میں - کہ مایوسی کی دنیا میں ہوں تمثالِ کہن — بنگیا ہوں دستِ بُردِ دہر سے تصویرِ درد
ہوں سبق آموزِ عبرت ہمرا ہانے وطن — چاہتا ہوں منتشر ہو جائے کچھ تاثیرِ درد

---

جب دیارِ دوست میں ہو اہتزازِ روشنی — اور کریں تیری شعاعیں جاکے شبنم سوزیاں
جب ہوں وہ چشمِ خمار آلودہ نازِ روشنی — میرے حالِ زار کا آئینہ بنجانا وہاں

---

جب پڑے جاکر وہاں تیری شعاعِ زرنگار — جملہ افروزی کی عزت سے بنے وہ شادکام
جب ہو رفتارِ نظر میں اک ادائے خوشگوار — لرزشِ شیریں مری جانب سے پہونچادے پیام

---

واقعاتِ زندگی نے کردیا پژمردہ دل
انقلاباتِ جہاں سے ہوگیا افسردہ دل

"ابو نواس"

# زمین کی عمر

**تعریف** | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زمین کی عمر سے وہ مدت مراد لینی چاہیے جو زمین کے منجمد ہو کر صورت موجودہ میں آنے سے اسوقت تک گذری ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں نہیں زمین کی عمر سے مقصود وہ مدت ہونی چاہیے جو اسپر دریاؤں وغیرہ کے نمودار ہونے کے بعد سے گذری ہے۔

**زمین کیونکر بنی** | غالباً یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ زمین کسی زمانہ میں سیال مادہ کی صورت میں تھی۔ کوہ آتش فشاں سے نکلنے والا رقیق مادہ اسکا کافی ثبوت دیتا ہے۔ زمین کا اندرونی حصہ اسوقت تک سیال حالت میں ہے اور بہت ممکن ہے کہ بہت گہرائی پر پہونچکر ہم کو بخاری صورت میں بھی ملے۔

اشیاے منجمد کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ جو رقیق تھیں اور سردی کے اثرات سے جم گئی ہیں؛ دوسری وہ جو چھوٹے چھوٹے ذرات کے اجتماع سے ملیں اور رفتہ رفتہ جمکر سخت ہو گئیں۔ اگر ہم ایک ریزے کو اٹھاکر دیکھیں تو اسکی ساخت سے ہم اسکی گذشتہ حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہوسکتا ہے کہ آیا پہلے وہ رقیق تھا اور اب اس نے منجمد ہوکر یہ صورت اختیار کی ہے یا چھوٹے چھوٹے ذروں کے اتصال سے اس صورت میں آیا ہے۔ اگر زمین کسی زمانہ میں رقیق تھی تو اسکی بناوٹ ایسی ہونی چاہیے جیسا کسی رقیق مادہ کے سطحی حصہ کی جم کر ہو جاتی ہے۔ اس طرح جمی ہوئی چٹانوں کی بڑی بڑی تہیں جنکی دبازت بعض مقامات پر کئی کئی ہزار فیٹ تک ہے زمین کے تمام حصوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ تحتی سے عمیق تر کی تہیں بھی اسی طرح بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

زمین کی ساخت ابھی تک جاری ہے۔ کیونکہ اسکا اندرونی حصہ ابھی تک سیال ہے۔ بلکہ سطحی حصہ بھی اب تک اس قدر سرد نہیں ہوا ہے کہ تمام دریا اور سمندر جمکر برف کی چٹانیں بن جائیں۔ اور ہوا آکسیجن (Oxygen) یا نائٹروجن (Nitrogen) کے منجمد پودوں کی صورت اختیار کرلے۔ جب ایسی صورت پہونچ جائے گی تو ہمارے نزدیک اسکی تباہی کا زمانہ شروع ہو جائیگا اور آخرکار وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر دوسرے ستاروں کے بنانے میں کام آویگا۔ یہ وہ زمانہ ہوگا جسکو ہندو علما پرالیا کے نام سے موسوم کرگئے ہیں اور جسکا حساب لگاکر انھوں نے بتلایا ہے کہ شاید اب سے بیس یا پچیس لاکھ سال کے بعد آئیگا۔

مطبق چٹانوں (Stratified rocks) کی سطحی تہیں ہوا، بارش، دھوپ، سردی اور گرمی کے اثرات سے ٹوٹ پھوٹ کر رفتہ رفتہ ریت ہو جاتی ہیں اور یہی ریت پھر جمع ہو ہو کر زمین کی سطح پر جم جاتی ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت اور باد و باراں کے اثر سے پھر سخت ہو جاتی ہے اور چٹانوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ریت کی نئی تہیں پھر اُسپر جمنے لگتی ہیں اور نئی چٹانیں بنجاتی ہیں۔ یہ چٹانیں پہلی قسم کی چٹانوں سے مختلف ہیں اور انکو شعور زاری (Igneous rocks) کہتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا ہے برابر کی تہیں ان چٹانوں کی مل مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ انکی ضخامت بڑھتی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر یہ چٹانیں اس قدر ضخیم پائی گئی ہیں کہ سو سو فیٹ کھودنے کے بعد بھی تحجر چٹانوں کا پتہ نہیں لگا ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت رفتہ رفتہ گھٹ رہی ہے اور سطحی حصوں کی صورت بھی تبدیل ہو رہی ہے۔ لہذا قسم دوم کی چٹانیں (شعور زاری Igneous rocks) تمام یکساں نہیں ہیں بلکہ صورت میں بہت کچھ مختلف ہیں۔

**مختلف طریقے جن سے زمین کی عمر کا اندازہ کیا جاتا ہے**

اگر ہم یہ حساب لگائیں کہ ایک سال میں کتنے انچ ضخیم چٹانیں شعور زاری کی سطح زمین پر عموماً جمتی ہیں تو اس سے ہم کو تھوڑا سا اندازہ اُس زمانہ کا ہو سکتا ہے جن میں اتنی بڑی ضخامت کی چٹانیں بن سکیں۔ جوں جوں نئی چٹانیں ایک دوسرے پر جمتی گئیں۔ خود ان چٹانوں کے وزن کی وجہ سے اُنکی ضخامت کم ہونے لگی۔ ان مختلف تہوں کو بغور دیکھکر ہم بیرونی وزن کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ علوم طبقات الارض کے ذریعہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ دریائے مسی سپی (Mississippi) ایک زمانہ میں سمندر سے سینٹ لوئس (St Louis) کے قریب ملتا تھا جو اسکے موجودہ دہانے سے سات سو میل پیچھے واقع ہے۔ اسکی لمبائی میں کمی اس وجہ سے واقع ہوئی کہ اسکے دہانے پر کیچڑ جم جم کر آخرکار سخت زمین بن گئی۔ اس سے ہم کسی قدر اندازہ اس مدت کا کر سکتے ہیں جس میں ایک تہ آب حصہ پر کیچڑ جمکر پانی کی سطح سے بہت اونچی ہو گئی اور اسقدر سخت ہو گئی کہ پانی کی قوت بھی اُسکو اُسکی جگہ سے نہ ہٹا سکی۔

ایک زمانہ میں بڑے بڑے گنجان جنگل زمین پر پھیلے ہوئے تھے جو رفتہ رفتہ تباہ ہو کر کوئلہ ہو گئے اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور زمین کی تہیں اوپر جمتی رہیں۔ یہ کوئلہ زمین کے اندر دبتا گیا۔ کوئلہ کی کانیں اس خیال کو ثابت کرتی ہیں۔ ویلز کی کانیں ۱۲ ہزار فیٹ گہری نکلی ہیں اور اسکے علاوہ اُن سکے اوپر

چٹانوں کی کئی تہیں نکلی ہیں۔ اس بڑی ضخامت کو دیکھکر ہم کو اندازہ کرنا چاہئے کہ کتنے ایسے سلسلے گنجان جنگلوں کے یکے بعد دیگرے کوئلہ بنکر اتنی ضخامت کو پہونچے ہوں گے۔ اکثر مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ کوئلہ کے درخت بجنسہ موجود ہیں۔

اسکی تشریح ہم اس طرح پر کر سکتے ہیں کہ جوں جوں زمین پر نئی تہیں جمتی رہیں تھوڑا تھوڑا حصہ ان درختوں کا زمین کے اندر پوشیدہ ہوتا گیا۔ پہلے جڑ مٹی میں دب گئی اسکے بعد مٹی کی تہیں جم جم کر تنہ تک پہونچیں اسی طرح رفتہ رفتہ تمام درخت زیر زمین پوشیدہ ہو گیا۔ جب زمین اور اونچی ہوئی اور اسکے اوپر مٹی کی نئی تہیں جم گئیں تو اُسکے اوپر اور درخت پیدا ہوئے جو اسی طرح زمین کے اندر غائب ہو گئے اور اسی طرح سینکڑوں سلسلے درختوں کے یکے بعد دیگرے زمین کے اندر دفن ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے درخت ایسے ہیں جن کا محیط بیس بیس فیٹ تک ہے۔

اب یہ امر قابل غور ہے کہ یہ درخت کتنے عرصہ میں اتنے اتنے بڑے ہوئے ہونگے۔ دوسرے یہ کہ زمین میں پوشیدہ ہونے میں کتنا عرصہ صرف ہوا ہوگا۔ اس قسم کی باتوں کو دیکھکر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ کتنے زمانہ میں یہ سلسلے پیدا ہو کر غائب ہوئے ہوں گے۔ سڈنی (Sydney) کی کوئلے کی کانوں میں ۵۹ سلسلے درختوں کے اوپر نیچے پائے گئے ہیں نوا اسکوشیا (Nova Scotia) کی کان کا عمق ۲۷۵۰ ہزار پانچسو فیٹ ہے اور اس میں سترہ سلسلے درختوں کے ہیں اب غور کیجئے کہ زمین بیس ہزار فیٹ عمیق کا نہ کتنے درختوں کے سلسلوں سے بنی ہوگی اور انکے بننے میں کتنا عرصہ لگا ہوگا۔ زمین کے مختلف حصوں کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ اگر ایک حصہ زمین کا کسی وقت میں خشک تھا تو کچھ عرصہ کے بعد ایک صاف جھیل کی صورت میں تبدیل ہو گیا بعد ازاں پھر خشک ہو گیا اور پھر کسی زمانہ میں ایک شور جھیل بنگیا۔ ان تبدیلیوں کو دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کس قدر قدیم ہے۔ امتحانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو ترکیب جسمانی آج کسی خاص جانور کی ہے کسی دوسرے زمانے میں اس سے مختلف تھی۔ اگر ہم ایک جانور کے ڈھانچے کو جو ہمیں زمین کے اندر سے ملتا ہے اُسی جانور کے آج کے ڈھانچے سے ملائیں تو ہم ان دونوں میں فرق پاتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر جاندار کی شکل میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جتنے زمانہ کا ہمکو علم ہے اس میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسی جسمانی تبدیلی کے واسطے اس سے کہیں بڑا زمانہ درکار ہے جسکا ہمکو علم ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے

کہ یہ جسمانی تبدیلی ایک مرتبہ نہیں ہوئی بلکہ صدہا مرتبہ - اس سے ہم کو خیال ہوتا ہے کہ جبتک زمین کو بنے ہوئے بہت زمانہ گذرا - ان تمام باتوں کو دیکھکر ہم صحیح طور سے تو وقت نہیں بتا سکتے جو ان تمام تبدیلیوں میں صرف ہوا ہوگا لیکن اس مدت کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور کر سکتے ہیں -

مشہور نام لارڈ کیلون نے تین طریقوں سے زمین کی عمر کا حساب لگایا ہے اس سے بھی قبل پروفیسر جولی (Joly) اور علم الحیات کے ماہر پروفیسر ہکسلے (Huxley) نے بھی زمین کی عمر کا اندازہ کیا ہے - پروفیسر جولی نے حساب لگایا کہ کتنا نمک دنیا کے سمندروں میں اسوقت موجود ہے - یہ متفقہ رائے ہے کہ سمندروں میں نمک ضرور موجود ہے - نیز سمندروں کی جسامت کا بھی کچھ اندازہ لوگوں نے کیا ہے - اگر سمندر کے پانی کے کچھ حصہ کو لیکر اُسکے نمک کو نکالکر وزن کیا جائے تو دنیا کے سمندروں کے تمام نمک کا ایک حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے - اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سمندر کا نمک اُس حصہ زمین پر سے آیا جن کو یہ سمندر ڈھکے ہوے ہیں - یا دریاؤں کے ذریعہ سے اُن تک پہونچا - آبِ شیریں کی صدہا جھیلیں، لکھوکھا سال سے موجود ہیں لیکن ان تہ آب زمینوں سے انکو نمک بہت کم حاصل ہوا ہے - دریاؤں کے پانی میں بھی اس قدر نمک موجود نہیں ہے جتنا کہ سمندروں میں - اگر یہ تمام نمک سمندروں کو اُنکی تہوں سے حاصل ہوتا تو پانی اتنا شور نہ ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ اتنا جتنا کہ دریاؤں اور جھیلوں کا - لہذا یہ زیادتی نمک کی اس وجہ سے ہوئی کہ ہمیشہ دریاؤں کے ذریعہ سے تھوڑا تھوڑا نمک اُس میں آتا رہتا ہے اور ہمیشہ نمک کی مقدار زیادہ ہوتی رہتی ہے لیکن پانی کی مقدار میں کبھی زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے - لوگوں نے معلوم کیا ہے کہ کس قدر پانی ہر سال دریاؤں کے ذریعہ سے سمندروں میں پہونچتا ہے اور اس پانی کے ساتھ کتنا نمک ہر سال جاتا ہے - پروفیسر جولی نے اس طرح حساب لگایا ہے کہ ایک ارب پچاس کروڑ ٹن نمک ہر سال سمندر میں دریاؤں کے ذریعہ سے پہونچتا ہے - چونکہ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ سمندروں میں اس مقدار کا نو کروڑ گُنا نمک موجود ہے - لہذا ان دریاؤں اور سمندروں کے پیدا ہونے کے بعد سے کم از کم نو کروڑ سال گذر چکے ہیں -

لیکن یہ حساب بہت کم صحیح سمجھا جاتا ہے اور آجکل اسپر یقین نہیں کیا جاتا - ماہرین علوم طبقات الارض نے ایک دوسرے طریقہ سے طبق چٹانوں کی عمر دریافت کی ہے - اس علم کے تمام کاملین نے مان لیا ہے کہ ۱۰۰ سال میں زمین کی سطح ایک فٹ اونچی ہوتی ہے یہ بھی اتفاق رائے سے مان لیا گیا ہے

کہ سطبق چٹانوں کی ضخامت ۱۲۰۰۰۰۰ فیٹ ہے جسکے نیچے متحجر چٹانیں ہیں لہذا ان چٹانوں کے بننے میں ایک کروڑ اٹھائیں لاکھ اسی ہزار سال صرف ہوئے ہوں گے۔ لیکن یہ تمام زمانہ ان تمام تبدیلیوں کے واسطے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کافی نظر نہیں آتا۔ پروفیسر جیکی Geikie نے نہایت جانفشانی کے ساتھ زمین کی عمر کا اندازہ لگایا ہے۔ انکا خیال ہے کہ زمین کی عمر اکرور بلکہ ایک ارب سال سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑی کوششوں کے بعد وہ اس نتیجہ کو پہونچے ہیں کہ مطبق چٹانوں کی ضخامت کم از کم ۱۹ میل یا تیس ہزار میٹر ہے اور مختلف قسم کی چٹانیں مختلف مدتوں میں بنتی ہیں ایک میٹر چٹان کے بننے کے واسطے کم از کم تین ہزار اور زیادہ سے زیادہ بیس ہزار سال درکار ہوتے ہیں۔ لہذا اس قسم کی چٹانوں کے بننے میں کم از کم نو کرور اور زیادہ سے زیادہ ساٹھ کرور سال صرف ہوئے ہوں گے۔ لیکن پروفیسر جیکی اس نتیجے سے بھی کچھ زیادہ مطمئن نہ تھا لیکہ اسکا ذاتی خیال یہ تھا کہ ... کم از کم ایک ارب سال آنے چاہییں۔

اسی زمانہ میں لارڈ کیلون نے حساب لگا کر زمین کی قدامت کا اندازہ کیا۔ جوں جوں ہم کسی کوئلہ کی کان میں زیادہ گہرائی پر پہونچتے ہیں ہم کو زمین کی حرارت بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا اندرونی حصہ ضرور اب تک سیال حالت میں ہے۔ جرمن انجینیر کپتان آئزن (Captain Hiesen) نے کوئلہ کی تلاش میں زمین کو ... گز گہرا کھدوایا۔ اسکو شوق پیدا ہوا کہ زمین کی مختلف گہرائیوں پر ٹمپریچر معلوم کرے اور اس نے معلوم کیا کہ ... گز گہرائی کے بعد ایک درجہ حرارت زیادہ ہوتا ہے۔ مسلسل تجربوں کے بعد سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ ... یا ساٹھ فیٹ کے بعد ایک ڈگری کا فرق پڑتا ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ زمین کی اندرونی حرارت کس رفتار سے کم ہو رہی ہے اس طرح پر حساب لگا کر لارڈ کیلون نے بہترین نتیجہ حاصل کیا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ آجکل زمین کی بیرونی سطح کا عام درجہ حرارت کیا ہے۔ منطقہ حارہ میں تو قدرے زیادہ ہے لیکن ممالک قطبی میں برودت بدرجہ برف رہتی ہے۔ تاہم زمین کے درجات حرارت کا اوسط نکل سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زمین رفتہ رفتہ سرد ہو رہی ہے۔ ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ کسی خاص وقت میں زمین کا اوسط ٹمپریچر کیا رہا ہوگا۔ فرض کیجیے کہ زمین کو سیال صورت سے منجمد صورت میں آئے ہوئے دس لاکھ سال ہوئے۔ لارڈ کیلون نے لکھا ہے کہ زمین کا ٹمپریچر اس زمانہ میں اب سے

زیادہ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس ٹمپریچر تک آنے میں کم از کم دو کرور سال صرف ہوئے اور زیادہ سے زیادہ اڑتالیس کرور سال۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر زمین کو منجمد ہوئے چالیس کرور سے زیادہ ہوئے ہوتے تو اسوقت تک اُسکی اندرونی حرارت بہت کم ہو گئی ہوتی۔

جب اس نے اپنا نتیجہ شایع کیا تو سب سے بیشتر ماہرین جیالوجی نے اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ زمین اس سے بھی قدیم سیارہ ہے اور مطبق چٹانیں بنے ہوئے چالیس کرور سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر زمین باقاعدہ رفتہ رفتہ سرد ہوتی تو لارڈ کیلون کا حساب ضرور صحیح ہوتا لیکن زمین اس قدر باقاعدہ سرد نہیں ہوئی ہے۔ اُسکی تاریخ میں ایسے بھی زمانے موجود ہیں جب وہ اپنی حرارت فضا کے سپرد کر چکی تو اُسکو اور زیادہ حرارت ریڈیم وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی جو اُسکے اندر موجود ہیں۔ ان دھاتوں کے ذریعہ سے بہت عرصہ تک زمین کی گرمی کی کمی پوری ہوتی رہی۔ آخرکار یہ دھات خود ہیلیم (Helium) وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ اسپر لارڈ کیلون نے جواب دیا کہ میں خود اسکا لحاظ رکھنے کو تیار ہوں۔

دوسرا طریقہ لارڈ کیلون کا جس سے اُس نے زمین کی عمر نکالی ہے یہ ہے کہ اُس نے قطر قطبی اور قطر استوائی کا فرق دریافت کیا۔ سمندر کے مدوجزر سے سطح زمین پر ایک دباؤ پڑتا ہے زمین کی محوری حرکت سے بھی یہ قوت طالب المرکز جو حرکت محوری سے پیدا ہوتی ہے ایک دباؤ یا وزن قطبین پر پڑتا ہے۔ ان دونوں وجوہات سے قطعات قطبی مسطح ہوتے جاتے ہیں۔ لارڈ کیلون نے حساب لگایا ہے کہ اگر زمین ایک ارب سال سے اس محوری گردش میں مصروف ہے تو دونوں قطروں میں کس قدر فرق ہونا چاہیے؟ اُس نے معلوم کیا کہ درحقیقت یہ فرق اتنا نہ تھا جتنا ایک ارب سال میں ہونا چاہیے۔ اور وہ اس نتیجہ کو پہونچا کہ زمین منجمد ہوئے دس کرور سال گذرے۔ یہ بیان کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس نتیجہ پر جیالوجی دانوں نے کیا کیا اعتراضات کیے۔

اس موقعہ پر یہ بتلانا ضروری ہے کہ جیالوجی دانوں نے ۱۰ کرور سال کو کم عرصہ کیوں تجویز کیا۔ کوئلہ کی کانوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک درخت کے ۱۵ یا ۲۰ فیٹ کا محیط ہونے کے واسطے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور اس عرصہ سے کئی گنا وقت اُسکے زمین سے ڈھکے جانے میں لگتا ہے۔ چالیس پچاس سلسلے ایسے درختوں کے اور بعض مقامات پر اس سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اُنکے زمین میں دفن

ہوکر کوئلہ بن جانے کے واسطے صدہا صدیاں درکار ہیں - اور اگر کوئلہ کی تہیں اولیں زمانہ سے شروع ہوئیں تب بھی دس کروڑ سال ایسے آدھے سلسلوں کو بھی پیدا کر کے کوئلہ بنانے کے واسطے کافی نہیں ہیں - دریائے مسی سپی کا طول ۰۰۰ میل زیادہ ہو جانا ایک دو صدی کا کام نہیں ہے اور اگر ہم تہہ کی کیچڑ کا حساب لگاویں تو اُن سے صدہا صدیوں کا پتہ لگ سکتا ہے -

بذریعہ علم ہیئت حساب لگایا گیا ہے کہ زمین کی آب و ہوا وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ایک پوری تبدیلی ۲۶ ہزار سال کے دور میں واقع ہوتی ہے - قطبی ممالک کی جگہ تبدیل ہو جاتی ہے اور ۲۶ ہزار سال میں ایک مرتبہ اُسی جگہ گرمی کی شدت ہوتی ہے جہاں اسی عرصہ میں سے کسی زمانہ میں برف جمی رہتی تھی - کوئی نہ کوئی حصہ زمین کا ہر وقت برف سے ڈھکا رہتا ہے اور برف کے تودے ایسے نشانات چھوڑ جاتے ہیں جن کو ماہرین علوم طبقات الارض پہچان سکتے ہیں - جوں جوں آب و ہوا میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں موسم گرما آہستہ آہستہ انکو گھلاتا ہے - موسم گرما میں برف کے تودے گھل کر ریت اور مٹی کو بہا لیجاتے ہیں جو موسم سرما میں اپنی جگہ پر پھر جم جاتے ہیں - باریک مٹی اوپر جمتی ہے اور ریت زیادہ وزنی ہونے کی وجہ سے نیچے - ایک ایک تہہ ایک ایک سال میں بنتی ہے اور ایک تہہ سے ایک سال کا پتہ لگتا ہے -

جوں جوں زمین گھومتی ہے موسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور پھر یہ دور قبل ۲۶ ہزار سال کے دوبارہ نہیں آتا - ڈی جیر (De Geer) نے سب سے پہلے مرتبہ صحیح طریقہ طبقات الارض کی مدد سے اسوقت کا اندازہ کرنے کا نکالا اور اس قاعدہ سے ساحل اسکینیا پر جو آجکل سرد ممالک میں واقع ہے زمین کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی اُسنے پانچ ہزار برف کی چٹانوں کے نشانات دیکھے اور یہ نتیجہ نکالا کہ آخری سردی کا زمانہ اس مقام کو پندرہ ہزار سال ہوئے چھوڑ چکا - سیا بتدائی اینیس وکس (مخوزلدی) پر تجربہ کرنے کے بعد پروفیسر ریڈ بوم نے معلوم کیا کہ اسکی برفی چٹانیں ۲۴ ہزار سال کی ہیں - کوئی شخص نہیں بتلا سکتا کہ ایسے موسمی دور کتنی مرتبہ زمین پر گذرے ہونگے - ایسے موسمی دوروں میں کچھ دریاوں میں چونے اور شیل (Shell) کی تہیں جم جاتی ہیں - یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر ایک دور میں ۲ - انچہ کی تہہ ان چیزوں کی جمتی ہے - ۰۰ ۹ ۲ فیٹ کی ضخامت کی شیل کی تہہ دریائے نیشن (Benton) کی تہہ پر پائی گئی ہے اور یہ حساب لگایا گیا ہے کہ یہ دو کروڑ سال کے عرصہ میں جمی ہوگی - غرض کہ آجتک کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکا ہے کہ زمین کی عمر در حقیقت کیا ہے لیکن جہاں تک حساب لگایا گیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی عمر کم از کم دس کروڑ سال اور زیادہ سے زیادہ ایک ارب سال کی ہے -

ضمیر حسن برنی بی اے (علیگ)

# ہندوستانی پالٹیشن

(بسلسلۂ الناظر بابت مئی ۱۹۱۶ء)

اسی طرح ناسمجھی کی قلیل مدت کی حرکت سے پالیٹیشن اپنے اصول اعمال کا اظہار کرنے لگتا ہے اور تفرقہ بدور ۱۲ یا ۱۳ سال کی عمر میں تو پرپرزے جھاڑ کر اچھا خاصہ پالیٹی شین ہو جاتا ہے اور مسرس لائڈ جارج اور بانرلا سے کم رتبہ حضرات سے ٹکر لینا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ زمین ہند تنگی کی وجہ سے ان کی جولاں گاہ خیال نہ بن سکی لہذا مجبوری آسمانِ یورپ کو تختۂ مشق بنانا پڑا۔ یورپ اور امریکہ کے ہر مدبر کی اسپیچ کا اصلی و واقعی مفہوم اُن سے پوچھ لیجیے۔ باوجودیکہ بیشتر اوقات حضرت کو اسپیچ کا علم سننے سے نہیں بلکہ دوسرے پالیٹی شین کے سینے سے ہوا ہے۔ سنی سُنائی بات سے اتنی واقفیت حاصل کر لینا انھیں کا حصہ ہے۔ حضرت سنسر کو اگر ان کی دماغ کی وسعت معلوم ہو جاتی تو یقیناً اُن کو اخبار کی اصلاح و حجامت میں سخت دقت اُٹھانا پڑتی۔ ان کی تمیز طبعی یا جبلت (ایک مشکلہ) کو پولیٹکل اور سیاسی امور سے خلقی تعلق ہوتا ہے یعنی بلا کسی قسم کی محنت اور دماغ سوزی کے مشکل سے مشکل سیاسی مسائل پر نہایت وثوق اور اطمینان کے ساتھ گھنٹوں بآواز بلند بحث کر سکتے ہیں۔ مثلاً درآمد و برآمد سکۂ رائج الوقت و تجارت بین الاقوام کے سے دقیق مسائل پر بحث کرنے میں انھیں بالکل تکلف نہیں ہوتا۔ پلیس فونٹ ٹاٹنگ اسکیم پر ابھی حال میں راقم الحروف کو ایک پالیٹی شین سے بحث کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ چار گھنٹے کی جھائیں جھائیں اور ردّ و قدح کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت نے ابھی تک اسکیم کا مطالعہ نہیں فرمایا ہے۔

اصولِ جمہوریت کا پالیٹی شین از حد دلدادہ ہوتا ہے چنانچہ کسی متنفس کو چاہے وہ کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو رہنما قبول نہیں کرتا۔ ان میں سے ہر ایک خود اپنے تئیں لیڈر اور رہنما تصور کرتا ہے۔ لہذا پالیٹی شینوں کا مجمع دراصل لیڈروں کا مجمع ہے۔ سب ان میں اول درجہ کے ہوتے ہیں دوسرے درجے کا پالیٹی شین آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

اصول - اخوت - مساوات وآزادی پر ہمارا پالیٹی شین عملاً کاربند ہوتا اور نہایت دیانت کے ساتھ اُن کی پابندی کا اظہار اپنے طرزِ عمل سے کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے بوڑھے باپ سے اخوت اور جدِامجد اور دیگر بزرگوں سے تحریر وتقریر۔ حرکات وسکنات میں ساوات کا برتاؤ کرتا ہے اور خواہاں ہے کہ قانون ملک اس کو تسلیم کرلے۔ ابھی حال میں ایک نوخیز پالیٹی شین نے اپنے پدربزرگوار کو نہایت سبق آموز لکچر دیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اُنھوں نے اپنے عنفوانِ شباب میں قبل شادی ہونے کے بے اعتیاطی، شوقینی اور بدانتظامی کو اس درجہ دخل دیا کہ باوجود ساری عمر مشقت کرنے کے صرف پانچ سو روپیہ ماہوار کا آزوقہ بس انداز کرسکے جو ناصحِ مہربان کے واسطے بالکل ناکافی ہے۔ شاید کوئی سزا بھی تجویز کی تھی جس کی تفصیل کا پتہ نہ چل سکا۔

چند نوخیز پالیٹی شینوں کا ابھی حال میں بمقام ...... ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اُس میں ایک سودۂ قانون پیش کیا گیا تھا۔ واہ۔ واہ۔ مرحبا۔ چیرز سے سارا ہال گونج رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کی مرثیہ خوانی کی مجلس ہے۔ سودہ کی تائید میں خوب دھواں دھار اسپیچیں ہوئیں اور باتفاقِ آرا پاس ہوگیا۔ اس قانون کی رو سے باپ اور بیٹے کے حقوق بالکل ساوی کردیے جائینگے یعنی جس طرح بوڑھے باپ کو بیٹے کے عاق کرنے اور دوسرے لڑکے کو متبنّیٰ کرنے کا اختیار رہتا ہے اُسی طرح صاحبزادے کو ولدیت کو منسوخ اور ازکاررفتہ باپ کو معزول کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور یہ بھی اختیار ہوگا کہ نیا باپ نامزد کرلے۔ اس نامزدگی میں والدۂ کرمہ کو کوئی حق رائے دینے کا حاصل نہ ہوگا۔ کچھ عجب نہیں کہ آیندہ کونسل کے اجلاس میں یہ سودہ بل کی صورت میں پیش ہو۔ اُس وقت پبلک کو تفصیلی حالات معلوم ہوجائیں گے۔ ابھی تھوڑے ہی روز کا واقعہ ہے کہ ولایت کے پاس شدہ ایک ہونہار پالیٹی شین اپنے بڑے بھائی کے انتقالِ پُرملال پر اپنے بوڑھے باپ کے پاس تشریف لے گئے اور دیگر اصحاب کے روبرو مراسمِ تعزیت بجالائے۔ اور اپنے ذاتی خرچ سے جو اتفاق سے اُسی روز اُن کو گھر سے ملا تھا اور جس میں سے کچھ رقم اُن کے پاس باقی رہ گئی تھی ماتم پُرسا ادا کیا۔

ایسی مثالیں تو اب بھی بہت ملیں گی جبکہ پدربزرگوار نے پسرذی وقار کے سامنے سے بھاگ کر

اپنی عزت اُسی طرح بچائی جس طرح کہ بزدل سپاہی اپنی جان دشمن سے بچاتا ہے۔

ہمارا پالیٹی شین حسنِ طلب کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ کچھ تو شئے لطیف کی خلقتاً کمی ہے کچھ نمایش پرستی اور طمع سازی کی عادت اس شدت سے فطرت میں داخل ہوگئی ہے کہ کوئی قول وفعل اس سے خالی نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں پالیٹی شین کا نازک ترین فرض سرکار دولتمدار پر ضرورت کا اظہار اور حقوق طلبی ہے۔ جس دلکش آواز اور شیریں الفاظ میں یہ فرض ان کے ہاتھوں انجام پاتا ہے وہ ہندوستان کیا بلکہ دنیا کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ طلب کا ہرگز یہ منشا نہیں ہوتا کہ سرکار استدعا منظور کرے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ عوام میں واہ واہ کی دھوم مچ جاوے اور پبلک زبان کی چُستی اور نمائشی ہمت کی تعریف کرے۔ لکھنؤ کے شہدوں یا موہان کے جوگیوں کا پورا اتباع کیا جاتا ہے صرف یہیں اختلاف کہ یہ حضرات بغیر انعام وصول کیے ہوے ٹلتے ہی نہیں لیکن ہمارا پالیٹی شین گالیاں دینے کا پارٹ ادا کرکے بنظر تحفظ پسِ پردہ غائب ہوجاتا ہے۔

موجودہ موقع پر بھی ان حضرات نے فتح کا خیال قبل از وقت باندھ کے ہزل سرائی اور حقوق طلبی شروع کردی اور لگے جوڑے اور جاگیر مانگنے۔ زبان کی تیزی اتنی بڑھ گئی کہ تنبیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہرحال اب فتح مکمل ہوگئی ہے۔ دیکھا چاہیے انھیں کیا ملتا ہے۔ امید کہ اشک شوئی کردی جاوے گی۔

ہمارے پالیٹی شین کا ہر قول وفعل آزادی سے لبریز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے اقوال وحرکات پر لحاظ وشرم کے حدود کو بیشتر اوقات گراں مانتا ہے۔ جس قدر وہ اپنے ارادہ کی آزادی کو قابلِ احترام سمجھتا ہے اور اپنے اُجڈپن پر فخر کرتا ہے اُسی قدر دوسروں کی آزادی کو ناقابلِ برداشت عیوب میں داخل کرتا ہے۔ اور محض اختلافِ آرا کی بنا پر مدت العمر کے لیے دشمن پیدا کرلیتا ہے۔ ایسی لاتعداد مثالیں ملیں گی جہاں سیاسی امور میں اختلافِ رائے کی بنا پر، بھائی برادری، حصہ بخرا، شادی بیاہ، ہمیشہ کے واسطے ترک ہوگئے۔

نواب آصف الدولہ بہادر نے خیالاتِ زمانہ کے مطابق قحط سالی میں بڑا امام باڑہ تعمیر کراکے اہلِ حاجت کو امداد دی۔ ہماری سرکار نے انٹرنمنٹ اور نظربندی کو عام رواج دے کر قحط کی سختی

اور جنگ کی گرانی کو دُور کرنا چاہا - لیکن اس سے ہر کس وناکس - مستطیع اور غیر مستطیع نے فائدہ اُٹھانا چاہا - ہمارا پالیٹیشین بھلا ایسے موقعہ کو کیوں ضائع کرتا - اُس نے اس قانون کو نیم نوکری کی جابجا دارو گیر، ڈگری قرقی، کے الام سے بدرجہا بہتر تصور کیا - بدزبانی و بدلگامی نے ازحد ترقی کرنا شروع کی چنانچہ ضرورت نے رولٹ کمیٹی کو قائم کروایا - اگر حضرات اہل کمیشن کو اِن کی دماغی ساخت، اصول اعمال اور قوتِ عمل کا صحیح اندازہ ہوتا تو یقیناً اُن کی رپورٹ کوئی دوسری صورت اختیار کرتی - اگر ہم سے رائے لی جاتی تو ہم ایسی سزائیں تجویز کردیتے کہ جن سے پالیٹیشین کی روح تک لرز جاتی - اور یہ جنگِ زرگری، مصنوعی بدزبانی، ایسی غائب ہوجاتی کہ پتہ ونشان تک نہ لگتا - مثلاً

(۱) بڑے بڑے مٹھائی والوں - ولیرو - برٹولڈو وغیرہم کے نام حکم امتناعی جاری کردیا جاتا کہ ان حضرات کو اپنی دوکان میں نہ گھسنے دیں نہ ان کے ہاتھ کوئی سودا بیچیں اور نہ ان کی پارٹیوں کا انتظام کریں - صرف وہ پارٹیاں مستثنےٰ کردی جاویں جو سرکاری حکام کی تفریح کی غرض سے منعقد کی جاتی ہیں -

(۲) ارباب نشاط کے نام حکم جاری کردیا جاتا کہ ان حضرات کو مُنہ نہ لگاویں - نہ اپنے یہاں آنے دیں نہ خود اُن کے یہاں جاویں - اور نہ اُن سے ملیں - اگر اتفاقاً راستہ گلی میں ملاقات ہوجاوے تو سیدھے منہ بات نہ کریں - صورت دیکھتے ہی ڈیڑھ ہاتھ کا منہ بنالیں

(۳) بڑے بڑے سوداگر اور عینک ساز، ان حضرات کے ہاتھ اشیا فروخت کرنے سے منع کردیے جاویں - وقس علیٰ ہذا -

ان سزاؤں کا شدید اثر ہونا نہایت ضروری ہے - اغلب تو یہ ہے کہ ہمارا پالیٹیشین اپنے لباس کو خلافِ فیشن دیکھ کر اپنے گھر کے کسی گوشے میں خود ہی انٹرن (نظر بند) ہوجاتا اور پبلک میں کبھی صورت نہ دکھاتا اور تھوڑے دنوں کے بعد عاجز آکر اپنا روتیہ بدل دیتا -

ہمارا پالیٹیشین خلقتاً ازحد بہادر واقع ہوا ہے - یہ محض نری اکّھڑ بہادری ہی نہیں بلکہ اس میں دُور اندیشی اور انجام بینی کا معتدبہ حصّہ شامل ہے - ایک پالیٹیشین نے اپنے منطقی خیالات اس انسانی کمزوری کے متعلق نہایت شرح وبسط کے ساتھ راقم الحروف سے بیان کیے وہ اسقدر

سبق آموز ہیں کہ التزام طوالت کا خوف بھی عاجز کو انکے اندراج سے باز نہ رکھ سکا۔

فرمانے لگے۔ "بھئی۔ میں نے تو بہادری اور بزدلی کے متعلق

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ۔ گر نوشت است پند بر دیوار

پر عمل کرکے اپنے پڑوسی کے مرغ کی حالت دیکھکر اور اُس سے اپنے یہاں کے مرغ کی خوشحالی کا موازنہ کرکے رائے قائم کی ہے۔ یہ پڑوسی کا مرغ بڑا جنگجو اور بہادر ہے ہر وقت لڑائی پر تیار رہتا ہے۔ سارے محلہ کے مرغ اِس سے عاجز ہوگئے ہیں۔ بیشتر اوقات کسی نہ کسی سے اَنکی پالی ہوجاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ حضرت کی ایک آنکھ غائب۔ ایک خار ٹوٹا ہوا۔ ایک ٹانگ کمزور۔ دُم ندارد۔ کیس پھٹا ہوا۔ بال نچے ہوے ہیں۔ ظاہری وجاہت تو بالکل غائب ہوگئی۔ مرغیاں بھی بدصورتی کی وجہ سے الگ تھلگ رہنے لگیں۔ ناجائز دباؤ سے تو مجبوری ہے ورنہ رضامندی سے پاس نہیں پھٹکتیں۔ سارا دن کُٹ کُٹ کرتے گذرتا ہے۔ چنانچہ آج کل بے مونس و غمگسار، کٹے کنکوے کی طرح تیاتے پھرتے ہیں۔ بمقابلہ اسکے میرے یہاں کا مرغا پر پُرزوں سے آراستہ و پیراستہ، شاندار تاج زیبِ سر کیے ہوے، ہر قدم پر اپنے جسم کی خوشنمائی سے خود خوش ہوتا اور اپنی مرغیوں کو خوش کرتا ہے۔ جس کونے کھدرے میں دیکھیے مع اپنی حرم کے شاداں و فرحاں اکڑ رہے ہیں۔ البتہ جب کبھی رانا سانگا (یعنی پڑوسی کا مرغ) سامنے آگیا تو چوٹی اُٹھاکر، بازو پھٹ پھٹاکر، بدن چُراکر نہایت پھرتی سے پنوٹ کے اصول کے مطابق غالی دے جاتا ہے۔ رانا سانگا کیا بلکہ پڑوسی کا کوئی مرغ بھی بھاگنے میں اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ دُور ہو بچ کر "ککڑوں کوں" "ککڑوں کوں" کے متواتر فتحیاب نعروں سے کرۂ ہوا کو سر پر اٹھا دیتا ہے۔ آپ ہی بتلائیے ان دونوں مرغوں میں کون زیادہ ہوشمند اور ڈپلومیٹک ہے۔ ہٹ دھرمی سے قطع نظر کی جاوے تو کوئی بھی ذی عقل میرے مرغ کے طرزِ عمل کو قابلِ اعتراض نہیں بتلا سکتا۔ اگر میں نے اُس کی نقل کی تو کیا بُرا کیا؟"

درحقیقت کچھ بُرا نہیں کیا۔ لیکن ان حضرت نے محض نقل ہی نہیں کی ہے بلکہ اُس سے دو ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً ان کے مرغ کیا، دنیا کے کسی مرغ نے کبھی یہ نہیں کیا کہ لڑائی کے وقت مرغیوں کو سپاہی بناکر خود سپہ سالار کا کام کیا ہو۔ اور ایک محفوظ گوشے میں پناہ لے کر

مرغیوں کو مارنے اور مرنے کے لیے آگے کردیا ہو۔ زمانے کے سرد و گرم پر نظر کر کے ہمارے پالیٹیشین نے صنفِ نازک کی بیوقوفی سے فائدہ اُٹھا کر اُن سے سمجھوتہ کر لیا۔ اُن فریبوں کو سمجھایا کہ آج کل کی پالیٹکس میں محض زبان کی طراری، اسپیچ بازی، گالی گلوج جھوٹے ہر الزام بازی کی ضرورت ہے۔ جن خصائل میں مستورات ہمیشہ سرنام رہی ہیں۔ اس صدی میں یہ موقعہ نام آوری کا ہرگز ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ وہ چلکے میں آگئیں۔ چنانچہ فرائض تبدیل ہو گئے۔ جلسوں کے انتظام۔ چاء پانی۔ مہان نوازی کی نگہداشت۔ چندے کی فراہمی وغیرہ وغیرہ کو حضرت پالیٹیشین نے اپنے ہاتھ میں رکھا، جان جوکھم والے کام مستورات کے سپرد ہو گئے۔ یہ انھیں حضرات کی درپردہ ڈپلومٹیک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ لیڈیز کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ شاعر نے صورتِ حال کی نہایت سچی ترجمانی کی ہے۔

ایں زماں ہمتِ مرداں ہمیں مصروف است  زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

یہ شاید اسی صلح (۱) سمجھوتے کا نتیجہ ہے کہ کوئی ہندوستانی پالیٹیشین ہونے کا اقرار نہیں کرتا۔ اگر ایک فہرست آج کل ہندوستانی پالیٹیشینوں کی تیار کی جائے تو ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ بالکل سادی رہے گی اور ایک متنفس بھی ایسا نہ ملے گا جو پالیٹیشین ہونے کا دعوے یا اقرار کرے —— آئندہ واقعات بتلائیں گے کہ مستورات بیچاریاں پولٹیکل لیڈری کو کس طرح جھیلتی ہیں۔ بہرحال یہ اُمید کرنے کی کافی گنجایش ہے کہ صنفِ لطیف کے دورِ حکومت میں ہماری قومیت، خودداری اور سیاسی زندگی برقرار رہنے پاوے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ اس کا بالکل خاتمہ ہو جاوے جس کا اندیشہ فی زمانہ ہمارے پالیٹیشین کے ناپسندیدہ طرزِ عمل سے پیدا ہو چلا تھا۔ "حقیقت نگار"

بہار آتے ہی زنداں میں کچھ ایسا جوش ہوتا ہے  کہ ہر دیوانہ اپنے خون سے گلپوش ہوتا ہے
یہ میخانہ ہے میکش جمع ہیں مسجد نہیں کوئی  یہاں دن رات زاہد شغلِ نوشا نوش ہوتا ہے
تنِ بے جاں میں جن کے دیکھنے سے جان آتی تھی  چراغِ زیست اُنکے سامنے خاموش ہوتا ہے
کوئی اک پھول کو اس باغِ عالم میں ترستا ہے  کسی کا تختۂ تابوت بھی گلپوش ہوتا ہے
نہ پوچھے کوششیں داغِ دلِ عاشق مٹانے کی  چراغِ زیرِ دامن بھی کہیں خاموش ہوتا ہے
دمِ تزئین تمہیں پر بیخودی طاری نہیں ہوتی  تمہارا آئینہ بردار بھی بیہوش ہوتا ہے
وہ ہو ملنے ہیں جو اخلاق کو خود سمجھتے ہیں  سے الفت کا متوالا سراپا ہوش ہوتا ہے

# دل سے

دل۔ وہ ناکام تمنا۔ کبھی نہ چین سے رہنے والی نہ چین دینے والی مخلوق۔ عمر ختم ہونے آئی پہ تیرا راز نہ کھلا۔ تو کہ تجھ ہی میں رازِ ہستی پنہاں ہے۔ سیاروں کی۔ فلک پیر کی۔ ماہ ور زمیں کی۔ چاند اور سورج کی گردش کے قوانین معلوم ہو گئے مگر تیری نبض کون پہچانے۔ نادان انسان! نازاں ہیں کہ ان کو عقل دی گئی۔ تو سلامت رہے۔ مجھے اس پر فخر کہ تو ملا۔ یہ نہ سمجھنا کہ تجھ سے شکایتیں نہیں۔ ہیں اور ظالم! بہت ہیں۔ پھر بھی اتنا جانتا ہوں کہ میں تو وہ نہیں۔ تیری ہی برکت ہے کہ عالم کی یکرنگی میں ایسی ایسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ تیرے قبضے میں وہ اسرارِ حیات ہیں جن تک نہ عقل کی رسائی نہ حکومت کا تسلط۔ کتنے کام ہیں جن میں عقل کوئی مصلحت نہیں دیکھتی۔ بلکہ اُن کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ مگر انسان کر گزرتا ہے۔ اس لیے اور صرف اس لیے کہ تو چاہتا ہے۔ ندامت زبان پکڑ لیتی ہے۔ کس طرح کہوں کہ تیری خواہش فرمانِ ایزدی پر غالب آجاتی ہے۔ اُس وقت جب عقل کے ناخن گھس جاتے ہیں۔ جب قیاس و ادراک عاجز ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی حجت پیش نہیں جاتی۔ جب انسانی علم و تحقیق کے سب ذرائع مسدود نظر آتے ہیں۔ ان تاریک لمحوں میں آخری حجت یہ ہوتی ہے کہ "دل یہ کہتا ہے"۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ تیرا قول صدائے حق سمجھ کر۔ بغیر دلیل و برہان کے مان لیا جاتا ہے۔ کسی کو تکلیف پہنچانا ہر حال میں بُرا ہے لیکن تیری ایذا رسانی سے قساوت بھی ڈرتی ہے۔ سب جُرم قابلِ عفو ہیں لیکن عفو کی سرکار میں دادرسی اگر نہیں ہوتی تو دل دُکھانے کی۔ عالم صغیر کے خود مختار شاہنشاہ! جس طرح تیری قدرت بڑی ہے تیری مملکت بھی وسیع ہے۔ ساری دنیا کی سمائی تجھ میں ہے۔ اور ایک دُنیا کیا۔ اس حد و ادراک سے باہر عالم کی جسے عالم روحانی سے تعبیر کرتے ہیں کُنجی تو ہی ہے۔ تیرے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ تیری رنگا رنگیوں کا احصاء علم الٰہی نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ شاید تو ہی وہ امانت ہے جس سے آسمان تھرا گیا۔ زمین سمٹ گئی۔ پہاڑ جھجکے۔ مگر انسان کی سادہ دلی! فحملہ۔ انہ کان ظلوماً جہولاً۔

صانعِ فطرت کے نازک کھلونے! فیاضِ ازل نے تجھے نظامِ جسمانی میں صدر میں جگہ بخشی۔ کہ تیری شان کے شایاں تھی۔ مگر ایک محفوظ گوشہ میں ودیعت رکھنے سے اشارہ تھا کہ لینے والے! سنبھال کر رکھنا۔ لیکن تجھے یاد ہے؟ تو نے میرے ساتھ خیانت کی۔ خیانت۔ جس سے تو خوش ہو لیکن جس کے ذکر سے تیری جبینِ عظمت پر پسینہ آ جاتا ہے۔ یہی خیانت جو میری نحوست کا ستارہ تھی۔ تیری شانِ خودداری پر داغ بنکر چمک رہی ہے۔ حشر کے دن جب ظالم و مظلوم رو برو ہوں گے۔ خلقت کے ہاتھ میں ظالموں کا دامن ہوگا اور میرے ہاتھ میں تو۔ حیران ہوں کہ اپنے ہاتھوں غلامی کا طوق کس طرح گردن میں ڈال لیا۔ خدا پرستی کا مدعی نہیں۔ تاہم اس پر ناز تھا کہ مخلوق کے آستانۂ فیض پر ناصیہ فرسائی نہیں کی۔ تو نے میرا سرمایۂ ناز مجھ سے لے لیا۔ میری پُر غرور نگاہ جو منت پذیری کے حجاب سے ناآشنا تھی۔ جو کسی آدم زاد کے سامنے ادب سے جھکی ہو۔ لیکن رعب سے گراں بار نہ ہوئی تھی۔ جو متکبر انسانوں کو دیکھ کر۔ استغنا کی دیوی بنکر کھنچ جاتی تھی۔ اسی نگاہ کو دیکھا ہے کہ ان کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکی۔ مجھے یاد ہے جب کبھی وہ سامنے آتے ہیں۔ تو۔ تمنا بنکر شوق بن کر۔ سائل بن کر۔ دو ٹکڑے ہوکر آنکھ کے شیشوں میں آ بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی دیکھنے والوں کی نظر بچا کر۔ یہ سمجھ کر کہ وہ فسوں ساز نگاہ کسی اور طرف مصروفِ سحر کاری ہوگی۔ ان پر ایک نظر۔ غائب نظر۔ ڈالنے کی ہمت بھی کی۔ لیکن نگاہ ابھی پوری نہ اُٹھی تھی کہ یکایک اس برقِ بلا سے دوچار ہوگئی۔ ہائے کیا کشمکش تھی۔ چہرے کی زردی جسے اطبا ضعفِ جگر کا نتیجہ بتاتے تھے۔ حیا پاش سرخی میں بدل گئی۔ وہ بھی بے اثر نہ تھے۔ آلہٰی! کیا دونوں مجرم ہیں۔ لیکن یہ مضطرب۔ خجل۔ شکر ریز نگاہیں۔ خلافِ اُمید لڑ جانے والی نگاہیں ایک داستان سُناگئیں۔ جس کی حلاوت مرورِ ایام پر ہنستی ہے کہ بس ہو تو کم کر دے۔ محبت کی کرشمہ سازی دیکھو کہ زبان کی طاقت سلب کر کے آنکھوں کو گویائی بخشی ہے۔ آہ مِنَ الحُبِّ ما اَحلَاہُ وما اَمَرَّہُ!! آنکھوں ہی تک نہیں۔ میں جانتا ہوں جس طرح تو نے تمام اعضا کا وظیفہ صرف اُن کی خدمت قرار دے دیا ہے۔ زبان ناحق بدنام ہے۔ تو ہی ایسے ڈھنگ ڈالتا ہے کہ ہر گفتگو کا سلسلہ۔ علمی ہو یا معاشرتی۔ دُنیا سے متعلق ہو یا دین سے۔ اُن تک پہونچ جائے۔ ایک دفعہ ذکر چھیڑ کر تو انجان بن جاتا ہے اور ہمہ تن گوش ہو کر اُسے سُنا کرتا ہے۔ وہ تذکرہ جب ختم کے قریب آتا ہے تو اندر ہی اندر کیسا مچلتا ہے کہ ابھی آور۔ دُنیا میں

کسی کے ساتھ سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُن سے محبت کی جائے۔ انتہائی بُرائی یہ کہ نفرت ہو۔ لیکن تو۔ عالی حوصلہ کہلا یا سادہ لوح۔ یہ سب سے بڑا احسان کرتا ہے۔ اور یہ جان کر کہ تیری سعی مشکور نہ ہوگی۔ تبا ........

سلسلۂ کلام ابھی جاری تھا کہ دفعۃً ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوئی۔ ناظرین گواہ ہیں کہ میں نے اُن کا نام نہیں لیا۔ مگر خدا جانے اس اشارے میں کیا برقی خزانہ تھا کہ تمام نظامِ عصبی میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے روئے سخن کے ساتھ۔ دل کی حالت بدل رہی ہے ایک غیر معتاد حرکت پیدا ہوئی۔ بڑھی اور بڑھ کر میری زبان روک دی۔ تھوڑی دیر۔ ایک لمحہ، بیخودی کی کیفیت رہی۔ لیکن یہ لمحہ مجھے اعتراف ہے کہ میری عمر کا بہترین لمحہ تھا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ انسان کیا ہے؟ دُنیا سکوتِ مجسم تھی۔ کائنات میں سناٹا تھا۔ ایک حرکت تھی جو اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی ہر ضرب سے ایک دلکش صدا پیدا ہوتی تھی جس کے سننے کے لیے سیارگانِ فلک نے اپنی سامعہ نواز گردش روک دی ——— زبان کے لیے بس ہے کہ محوِ نظارہ رہے۔ زبان کو کافی ہے کہ اُن کے ذکر سے شاد کام رہے۔ کان کے لیے بس ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ سے ان کا نام سُنا کرے۔ خیال کے لیے یہ کافی ہے کہ مجھے اُن سے ملا دیا کرے۔ عقل کو یہ بہت ہے کہ میری نیرنگیوں پر غور کرلے۔ اور ——— میری راحت اسی میں ہے کہ اُن کا ہو رہوں۔ میرے دمساز۔ ملامت نہ کر کہ مجھے تیری ملامت خون کر دیگی۔ تو نہ گھبرا۔ جس دن "لمن الملک الیوم" کا صور پھُنکے۔ تو یہ کہکر بری ہو جانا کہ مالک! میں بیخبر ہوں۔ یہ حاضر ہے۔ اس کی سرگذشت اسی سے پوچھیے۔

زندہ نہ آنست کہ جانے دراوست
زندہ آنست کہ از عشق نشانے دراوست

محمد ظہیر احسن

# نظرے خوش گذرے

تعجب ہے کہ جو اصحاب ضابطہ اور قانون کی پابندی کے لیے خاص شہرت رکھتے ہیں بعض اوقات مفید ہیں اگر اُن اصولوں کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں جن کی بنیاد پر کوئی ضابطہ یا قانون بنتا ہے۔ حال میں بعینہٖ یہی صورت عالیجناب سید محمد علی صاحب آنریری سکرٹری علی گڈھ کالج کو پیش آئی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ قواعد و قوانین کی کس سختی سے پابندی کرتے ہیں، اور ایک ایسے بزرگ سے عام طور پر یہی توقع بھی کی جاتی ہے جس نے زندگی کا بڑا حصہ ایک ایسی حکومت کی عدالتی خدمت میں بسر کیا ہو جس کی آئین پرستی شہرۂ آفاق ہے۔

ہمارے دوست مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے نے اُس گشتی مراسلہ میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ جو اُنھوں نے بحیثیت رکن مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے تمام ارکان ایسوسی ایشن کے پاس حال ہی میں بھیجا ہے۔ مختصراً واقعات یہ ہیں:— جب نواب اسحٰق خاں مرحوم کا انتقال ہوا اور علی گڈھ کالج کی مجلس امناء نے ایک جلسۂ خاص منعقد کر کے سید محمد علی صاحب کو آنریری سکرٹری منتخب کیا تو سید صاحب موصوف نے کالج کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کو بھی اپنے تحت میں لے لیا، اور اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ امناء علی گڈھ کالج کی طرح مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کا بھی ایک جلسہ منعقد ہو اور اُس میں باقاعدہ کوئی سکرٹری منتخب کیا جائے۔ اب بحیثیت سکرٹری مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے صاحب موصوف نے اراکین ایسوسی ایشن سے یہ تحریک کی ہے کہ علی گڈھ کالج کی امداد کے لیے سرمایۂ مسلم یونیورسٹی سے ترسٹھ ہزار روپیہ کی رقم نکالنے کی منظوری صادر کریں۔ حالانکہ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن نے سرمایۂ مسلم یونیورسٹی سے اس قسم کی امداد دیے جانے کا سدِّباب کرنے کے لیے ۱۹۱۶ء میں ایک تجویز بہ ایں مضمون منظور کی تھی کہ "یہ ایک خطرناک پالیسی ہوگی کہ یونیورسٹی فنڈ کا کوئی حصہ علی گڈھ کالج کی کمی آمدنی یا زیادتی اخراجات کے پورا کرنے پر صرف کیا جائے۔ سوائے اُس حالت کے کہ مقابلہ ۱۹۱۲ء تعداد طلبا کے بڑھ جانے کی وجہ سے اخراجات میں بھی نسبتاً اضافہ ہوا ہو۔"

مولانا حسرت موہانی نے اپنے گشتی مراسلہ کے ذریعے تمام ممالکِ مسلم یونیورسٹی کو اس صریح بے قاعدگی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس بارے میں اُن کے ہم آہنگ ہو کر نہایت سخت صدائے احتجاج بلند کریں۔

مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن ایک باقاعدہ مجلس ہے اور جب تک اس مجلس کا کوئی جلسہ منعقد ہو کر اس مسئلہ کا تصفیہ نہ ہو جائے سید محمد علی صاحب کو قطعاً اس کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ وہ محض تحریری اجازت کی بنا پر سرمایۂ مسلم یونیورسٹی سے یہ رقمِ خطیر برآمد کرلیں۔

علی گڈھ کالج کی مالی حالت ابتر ہو رہی ہے۔ طلبہ کی تعداد بھی بہت گھٹ گئی ہے پُرانے یورپین پروفیسر بھی مستعفی ہو کر چلے گئے ہیں۔ یہ حالات ہر چند کہ نہایت دردناک اور عبرت انگیز ہیں لیکن بجائے اسکے کہ امناء علی گڈھ کالج مسلسل جد و جہد کرکے اور ذاتی راحت و آرام کو بہ لحاظ چندے مفادِ قومی کے خاطر بالائے طاق رکھ کر ان خرابیوں کے انسداد کی سعی کریں، وہ آمادہ ہیں کہ ایک کھُلی ہوئی بے ضابطگی کے ذریعے مسلم یونیورسٹی کے سرمایہ کو اپنی غفلت و بے فکری کا پردہ پوش بنا لیں

علی گڈھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کے درجے پر پہونچانے میں جب بہت عجلت کا اظہار کیا جاتا تھا تو اُس وقت اکثر اربابِ رائے از راہِ قیاس یہ اندیشہ بیان کرتے تھے کہ یہ سب اس لیے کیا جا رہا ہے کہ کالج کی موجودہ بدنظمیوں پر پردہ پڑ جائے۔ اور مسلم یونیورسٹی کے سرمایہ پر تصرف حاصل کرنے کی آسان راہ نکل آئے۔ اِن حالات کے ہوتے ہوئے کیا یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ ان اصحاب کے یہ اندیشے بالکل صحیح تھے۔

سید محمد علی صاحب سے نہایت ادب گر اصرار کے ساتھ ہماری یہ استدعا ہے کہ وہ اور دوسرے بزرگانِ قوم اگر علی گڈھ کالج کو موجودہ مالی مشکلات سے نکالنے کی اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں تجویز کر سکتے کہ مسلم یونیورسٹی کے سرمایہ سے اس قدر کثیر امداد حاصل کریں تب بھی انھیں اس قسم کی صریح بے ضابطگی سے تو احتراز کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر خود ہمارے مقتدر رہنمایانِ قوم خدانخواستہ سی عارضی ضرورتوں پر آئین و ضوابط کو پس پشت ڈالا کریں گے تو یہی بری مثال خود بخود [illegible] ہمارے طلبا کو ازبر ہو جائے گا۔ اور آیندہ جب کبھی اساسہ ہائے قومی کی عنانِ تصرف اُن کے ہاتھ میں آئے گی تو انھیں مثالوں کو نظیر قرار دے کر وہ اس سے بھی زیادہ آئین شکنی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ نیز

اس قسم کے موقع پر مرزا غالبؔ کی یہ سبق آموز نصیحت کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا

---

لکھنؤ سے ایک ماہوار رسالہ "خادم الاطبا" شایع ہونا شروع ہوا ہے جس کی ظاہری حالت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ انشاءاللہ آگے چل کر اس کا شمار نہایت کامیاب جرائد میں ہوگا۔ مضامین کی ترتیب و نوعیت ابھی قابلِ اطمینان نہیں جس کا اعتراف خود مدیر رسالہ نے اُسکے دوسرے نمبر میں کیا ہے۔ اور اسکی وجہ ظاہر ہے۔ صوبۂ ہذا اور خصوصاً لکھنؤ میں جو کثیر التعداد اطباء حاذق و نامور مخلوقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہیں ان کو عموماً اول تو اس خدمت ہی سے کم فرصت ملتی ہے، دوسرے اُن کے دلوں پر قدیم معاشرت و تمدن کا ایسا شدید قبضہ ہے کہ جدید رنگ اختیار کرنے میں سب سے زیادہ دشواری انھیں کو محسوس ہوتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دو مستثنیٰ شخصیتوں کے سوا عام طور پر جماعتِ اطبا کو معاملاتِ ملکی و قومی و سیاسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اور چند اصحاب جو اس بارے میں سابقہ بندشوں کو توڑ سکے ہیں یا آج معاملاتِ ملکی میں کچھ حصہ لیتے نظر آتے ہیں اُن کا معیارِ عمل بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے کہ حکامِ وقت کی چاپلوسی یا اُن کے اشارۂ ابرو پر اپنی متاعِ ہمت کو قربان کر دیا کریں۔ بہرحال جب یہ دَور گذر جائے گا اور جدید رنگ پوری طرح اس جماعت پر بھی چھا جائے گا۔ اُس وقت یقین ہے کہ انشاءاللہ اس قسم کی خامیاں باقی نہ رہیں گی۔ "خادم الاطبا" پر ابھی ریویو کا وقت نہیں آیا ہے۔ لیکن اسکے دوسرے نمبر کے ایک جملہ نے چند سطریں لکھنے پر مجبور کر دیا۔ جناب حکیم عبد المعید سلمہ اللہ نے جن کا نام نامی رسالہ کے سرورق پر بحیثیت ایڈیٹر درج ہے اس نمبر میں اپنے خاندانی حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اور حکیم مولوی محمد ابراہیم مرحوم کے حالات میں (صفحہ ۳۲) لکھا ہے

"چونکہ آپ متشرع تھے اس لیے کبھی آپ نے اپنی تصویر یا فوٹو نہیں لینے دیا۔ ورنہ ہم اس رسالہ میں آپ کی مبارک شبیہ ضرور درج کرتے"۔

جسکے صاف معنی یہ ہیں کہ اعتقاداً وہ بھی تصویر کشی کو خلافِ شرع جانتے ہیں مگر اس اقرار کے بعد ہی جب سرآمد اطبائے ہندوستان جناب حکیم عبد العزیز مرحوم کی تصویر پر نظر پڑی تو ہمیں یہ دیکھکر بڑا صدمہ ہوا کہ حکیم صاحب موصوف نے اپنے معتقدات کے مطابق علی الاعلان اس جرم شنیعہ کا ارتکاب کیسے کیا۔ وہ لوگ جن کی شرع میں تصویر کشی اور اس قسم کی سیکڑوں معصیتیں جائز ہیں ایک حد تک لائقِ درگذر ہو سکتے ہیں مگر وہ لوگ احتساب سے کیسے بری ہو سکتے ہیں جن کے عقائد بحمد اللہ کہ ابھی تک صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

# مفید اور دلچسپ کتابیں

**تقویم الاسلام** جس میں تاریخ کی حقیقت۔ دنیا کی ابتدا و انتہا۔ سنہ ہجری کی کیفیت۔ ایام جاہلیت کے لکھنے کا طریقہ تاریخ و روز ولادت باسعادت و وفات و عمر شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ مہینے اور ایام کی تحقیق۔ مذہبی مناسک بعض بعض بدعات جو مہینوں میں رائج ہیں اور معظم واقعات وغیرہ بڑی خوبی و تحقیق سے لکھے گئے ہیں قیمت عہ ر

**المہدی**۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی فرقوں میں سے کون سا فرقہ اسلام کی اصلی حالت پر ہے۔ اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ مسلمانوں کی موجودہ حالت پستی و تنزل کے اسباب و علل علما کے فرائض اور خانہ جنگیوں، جدید تعلیم یافتہ گروہ کی مذہب سے بیگانگی و بے اتفاقی۔ نظام قومی میں تناسب اعتدال پیدا کرنے کے طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت عمار

**عربی بول چال**۔ جس کے ذریعہ سے مبتدیوں کو عربی زبان سیکھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ قیمت عہ ر

**سفرنامہ جاپان**۔ علی احمد جرجاوی ایڈیٹر اخبار الارشاد قاہرہ (مصر) نے جاپان کی سیاحت کر کے چشم دید حالات لکھے ہیں جس میں بارہ سو معزز جاپانیوں کے مشرف باسلام ہونے کے واقعہ کا بھی بیان ہے۔ قیمت عمر

## صوفی جنتری سنہ ۱۹۱۹ء

جس میں پنجگانہ نماز کے اوقات۔ سحری و افطار۔ بزرگان اسلام کی تاریخہائے وصال اسلامی تاریخ کے نہایت مشہور واقعات کے علاوہ آیندہ دس سال کی جنتری بھی درج کر دی ہے۔ ماسوا اس کے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان دعوت اسلام کا عکس۔ حیدر کرار حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ذوالفقار کا خاکہ۔ مامون الرشید خلیفہ عباسی کے فرمان دعوت کا عکس۔ نجف اشرف کی تصویر۔ حضرت سلیم چشتیؒ۔ حضرت محمد غوثؒ۔ حضرت چراغ دہلویؒ۔ حضرت امیر خسرو دہلویؒ کے مزارات کے نقشے اور دیگر مفید و کارآمد باتیں ہیں لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ اور گرانی کے باوجود قیمت صرف دو آنے

**سفرنامہ ایران**۔ جنرل گارڈن مشہور انگریزی سفیر و مدبر نے مظفر الدین شاہ قاجار کے زمانہ میں سفر کیا تھا اور یہ حالات قلمبند کیے تھے جس کے مطالعہ سے شاہ ممدوح کے ذاتی حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ عمر

**سفرنامہ سید علی**۔ اس ترکی امیر البحر نے ۱۵۵۳ء سے ۱۵۵۶ء تک ہندوستان۔ افغانستان وسط ایشیا اور ایران کی سیاحت کی ہے۔ یہ اس کے ترکی سفرنامہ کا ترجمہ ہے قیمت ۸ر

**حالات عرب و عراق و عمان** یعنی جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں اور وہاں کے سیاسی امور اور جغرافیہ پر پادریوں کے نقطۂ نگاہ سے ایک نظر۔ امریکہ کے ایک مشہور پادری زویمر کی لکھی ہوئی ہے جسے مسلمانوں کو عبرت سے مطالعہ کرنا چاہیے خصوصاً موجودہ سیاسی ہلچل کے زمانہ میں جو تغیرات پیش آنے والے ہیں ان کی روشنی میں یہ حالات ضرور جبق آموز ہوں گے۔ قیمت عہ ر

**شوکت آرا بیگم**۔ ایک خاتون کا لکھا ہوا لاجواب فسانہ۔ قیمت عہ ر

رجسٹرڈ نمبر — بسم اللہ الرحمن الرحیم — اے ۸ ۷ ۴

# الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۲ | ماہ اگست ۱۹۱۹ء | جلد ۲۱

:۔:۔: فہرست مضامین :۔:۔:



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

# قابلِ دید کتابیں

**فلسفہ تعلیم** حکیم ہربرٹ اسپنسر کی لاجواب کتاب کا ترجمہ جسکے مطالعہ سے مسئلہ تعلیم پر نہایت صاف روشنی پڑتی اور بڑی حد تک اس منزلِ دشوار میں رہنمائی ہوتی ہے قیمت عہ

**تاریخ التعلیم** ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج جنھوں نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کیلئے وقف کر رکھی ہے اور فن تعلیم کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو اس قدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو یہ کتاب انھیں کے رشحات قلم سے نکلی ہے اور اس قابل ہے کہ وہ تمام اصحاب جو ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مطالعہ فرمائیں قیمت عصر

**شرح اس التعلیم** بچوں کی ابتدائی تعلیم کن اصولوں پر ہونی چاہیے علمی اور عملی بحث مع متعدد عکسی تصاویر قیمت عا

**چھوٹے بچوں کی تعلیم کے اصول** ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خان کا لاجواب لکچر قیمت ۴ر

**فلسفہ اجتماع** علم النفس کی لاجواب کتاب جسمیں ان کیفیات و حسیات نفس کا بیان ہے جو مجامع اور ان کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں قیمت عصر

**فلسفہ ازدواج** جسکے متعلق مولانا حالی مرحوم نے یہ قیمتی رائے ظاہر فرمائی تھی کہ ہر متاہل اور غیر متاہل شخص کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک بار بار پڑھے اُسکی ہدایتوں پر عمل کرے اور جس ہدایت پر خود نہ عمل کرسکتا ہو اُسپر اپنے متاہل دوستوں اور عزیزوں اور اُن نوجوانوں کو جو عنقریب اس جوے کو اپنی گردنوں پر رکھنے والے ہیں اُن پر عمل کرنے کی تاکید کرے۔ ایک جلد منگا کر ملاحظہ فرمایئے قیمت عصر

**الناظر بک ایجنسی کی مکمل فہرست مُفت بھیجی جاتی ہے**

**القول الاظہر** علامہ ابن مسکویہ نے صانع عالم کا ثبوت دلائل فلسفیہ سے پھر مسئلہ نفس اور اسکے ادراکات کا بیان اور نبوت کا اثبات بڑی خوبی سے کیا ہے مسئلہ ارتقا جو ڈارون کا نظریہ کہا جاتا ہے اسکا ذکر اس کتاب میں موجود ہے قیمت عہ

**القمر** چاند کی ماہیت و حقیقت پر علم ہیئت و ریاضی کی رو سے بحث۔ جدید معلومات کا ذخیرہ قیمت ۸ر

**علم المعیشت** یعنی اصول اکنامکس یا اقتصادیات پر اُردو میں سب سے پہلی جامع و مستند کتاب جس کی خوبی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اپنی کتاب علم الاقتصاد کے متعلق لکھا کہ اب اسکے پھر چھپنے کی ضرورت نہیں تمثیلات تمام تر ہندوستان کی دی گئی ہیں اور ہر مسئلہ کا انطباق اسی ملک کے حالات سے کیا گیا ہے قیمت سے

**مقدمات الطبیعات** پہلی مکمل کتاب طبیعات پر قیمت عہ

**مبادی سائنس** علم حیوانات، نباتات اور معدنیات کے تمام ابتدائی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں قیمت عا

**طبقات الارض** پہلی مکمل کتاب ارضیات پر قیمت عہ

**رموزِ فطرت** سائنس کے ابتدائی و بنیادی مسائل قیمت عا

**انسان** انسان کی حقیقت و ماہیت سائنس کے اصولوں پر ۸ر

**جان کی دشمن مکھی** مکھی کی وجہ سے جو امراض پھیلتے اور جسقدر انسانی زندگیاں تلف ہوتی ہیں اُن کی حقیقت عام نگاہوں سے پوشیدہ ہے اس رسالہ کے مطالعہ سے ہر شخص ان حالات سے آگاہ ہوکر اپنے اور اپنے خاندان والوں کی تندرستی و صحت کا انتظام کرسکے قیمت ۸ر

رسالہ علم فلاحت عا رسالہ علم برق عا

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

# مطبوعات جدیدہ

## جویائے حق (حصہ دوم)

عبدالحلیم شرر کا یہ دلچسپ ناول اب دوسرے حصہ کے طبع ہو جانے سے مکمل ہو گیا ہے اور جن شائقین کرام کے پاس حصہ اول ہی ہے اُن کو حصہ دوم منگا کر ناول کی تکمیل کر لینا چاہیے - قیمت حصہ اول ۱۲ حصہ دوم ۱۲ر

## نوحۂ زندگی

علامہ راشد الخیری کا تازہ ترین ناول - جس میں عقد بیوگاں کے رواج دینے کی ایسی موثر اپیل کی گئی ہے کہ کوئی شخص اسے پڑھتے وقت روئے بغیر نہیں رہ سکتا - قیمت ۱۲ر

## سلسلہ موعظہ حسنہ

مسٹر شفیع احمد سلہری بی اے نے سردست اپنی تین نظمیں اس سلسلہ میں شایع کی ہیں یکجا دیکھا: دنیا دین تعلقات کا خاکہ ۲ر خواب محو خیال - قوم کے عیوب پر تنبیہ ۲ر سبق دیرینہ - تنگ ۲ر

## صحیح قرآن مجید

اگر آپ خواہاں ہوں تو الناظر بک ایجنسی کے پاس چند نسخے موجود ہیں - یہ کلام مجید ۱۸۶۴ء میں بمقام کلکتہ چھپا تھا - جس پر نیدرہ مشہور و معروف علما و حفاظ کی مہریں ثبوت صحت کی غرض سے ثبت ہیں - یہ قرآن مجید فلسکیپ سائز کے نہایت دبیز کاغذ پر چھپا ہوا ہے - ۹۶۰ صفحات پر تمام ہوا ہے - اور اب بالکل نایاب ہے -

## النظر

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب نے ڈاکٹر اقبال کی لاجواب مثنوی اسرار خودی پر ایک عالمانہ تنقید لکھی ہے جو ۲۴ ۱/۲ جزو کی چھوٹی سی کتاب بن گئی قیمت ۲ر

## سیر فلکی یا معراج

مولانا سید احمد لکھنوی نے اس رسالہ میں معراج کو عقل سے ثابت کیا ہے قیمت ۳ر

## حالات گوکھلے

مسٹر مظفر حسین خاں بی اے نے فخر ملک مسٹر گوکھلے آنجہانی کی سوانح عمری لکھ کر اُردو داں ناظرین کو اس گوہر گرانمایہ کی حقیقی عظمت سے مطلع ہونے کا سامان فراہم کر دیا ہے اور ہمارے مشورہ سے قیمت بھی بلحاظ سابق کم کر دی ہے تاکہ عام طور پر لوگ مستفید ہو سکیں - قیمت ۸ر

## عالم ذر

جس میں سالکات کے صفات پر بحث کی گئی ہے - مولانا سید احمد صاحب کے اس رسالہ کا ایک حصہ الناظر میں چھپ چکا ہے - قیمت ۱۲ر

## سیرت صدیقہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حالات زندگی - مولفہ ملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر صوفی قیمت ۸ر

لکھنؤ میں ہمارے یہاں کی دوائیاں ڈاکٹر گنگا رام ٹملی کے پاس ملتی ہیں۔

# قوت کی گولیاں

۳۶ برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں۔ طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس اکنیا وابانہ ملا کر یہ گولیاں بنائی گئی ہیں۔ مغز۔ ریڑھ۔ رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعویٰ رکھتی ہیں زیادہ محنت جوانی کی خرابی و بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہوا ان گولیوں کے استعمال سے اول ہی روز فائدہ ظہور میں آتا ہے۔ بدن میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرہ پر رونق جوانی میں بڑھاپے کی سی حالت ٹوٹے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے قیمت ۴۰ گولیوں کی شیشی دو ہفتہ کی خوراک کا ایک روپیہ محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک ۵ ر دیکھیے جناب ایڈیٹر صاحب مخبر دکن کیا تحریر فرماتے ہیں ہم نے ڈاکٹر صاحب کی تعریف پر خیال کر کے تیس گولیاں منگائیں اسکے تیر بہدف اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہیں تو ان گولیوں کی قیمت بجائے ایک روپیہ کے تیس روپیہ رکھنی چاہیئے تھی۔

# گرمی آتشک

گرمی (آتشک) بدفعلی سے ہوتی ہے۔ اسکی ابتدائی حالت میں زخم ہوتا ہے اور تھوڑے عرصہ میں دونوں پٹھوں کی گلٹیوں میں ورم ہوتا ہے جسکو بالگی کہتے ہیں۔ کچھ دن میں گرمی پھوٹ کر نکلتی ہے اور تمام جسم میں چٹے۔ گھاؤ۔ پھنسیاں۔ گمڑے وغیرہ ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں نکلی ہوئی آتشک کا زہر بڑھاپے میں ستا سکتا ہے اور باپ سے لڑکا اور پوتے تک کو آتشک کے زہر کے سبب مصیبت جھیلنی پڑتی ہے اس مرض میں زخم کے ہوتے ہی لوگ شرم سے چھپاتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے پھر دوا کرتے ہیں تو ایسے ویسے ہی لوگ ایسی دواؤں میں زیادہ پارہ ملا رہتا ہے جسکا اثر مرض سے بھی برا ہوتا ہے ان سب باتوں پر بخوبی غور کر کے ڈاکٹر برمن نے یہ دوا آتشک کی بنائی ہے اور تھوڑے ہی دن کے استعمال سے یہ دوا آتشک اور اسکے نقصوں کو رفع کرتی ہے زخم کے ساتھ ہی ساتھ مرہم لگانا چاہیے قیمت فی شیشی عہ زخم کا مرہم ۵ ر محصول ڈاک ہر دو ۵ ر

## وقت پر صلاح

جو دوست ہوتے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں

# ہیضہ کی مجرب دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے کہ موسم بارش میں کھانے پینے یا رہنے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف رہتا ہے اس سے بچنے کیلیے پہلے ہی ایک شیشی اصلی عرق کافور منگوا کر اپنے گھر میں ڈال رکھیں جس سے اپنے یا اپنے پڑوسیوں کی وقت پر حفاظت کر سکیں۔ یہ اصلی عرق کافور عرصہ ۴۰ سال سے تمام ہندوستان میں جاری ہے یہ عرق گرمی کے دست پیٹ کے درد و متلی کیلیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے قیمت فی شیشی ۴ر محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک ۵ ر

# دانت کے درد کی مجرب دوا

لگاتے ہی درد مٹاتی ہے روتے کو ہنساتی ہے۔

ایک باریک مضبوط تنکے کے سرے پر ذرا روئی لپیٹ کر دوا میں ڈبو کے ٹھیک درد کے مقام پر لگائیے اور اگر دانت کی جڑ میں درد ہو تو ذرا سی روئی دوا میں ڈبا کے تنکے کے سرے پر رکھکر اس میں بھر دینے سے فوراً درد بند ہو جاتا ہے اسبات کی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ دوا ہونٹوں و مسوڑھوں میں نہ لگے کیونکہ دوا تیز ہے قیمت فی شیشی ۴ر محصولڈاک پیکنگ ایک سے آٹھ شیشی تک ۶ر دیکھیے ایڈیٹر صاحب رسالہ تمدن دہلی اپنے رسالہ کے اپریل نمبر میں کیا لکھتے ہیں۔ ملک میں بہت سے اشتہاری طبیب نیا نیا فروخت کر رہے ہیں اور انہیں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جنکی وجہ سے واقعی مفید دوا کا بھی اعتبار قائم نہ رہا مگر ڈاکٹر ایس کے برمن کلکتہ کے مشہور کارخانہ ادویہ میں سے دو کا تجربہ کے بعد ہمنے سال گذشتہ میں پورا کیا درحقیقت اسم بامسمیٰ ہیں اسوقت ہم دانت کے درد اور کان بہنے کے متعلق کہہ رہے ہیں جو ہمنے اپنے تجربہ میں تیر بہدف پائیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا کارخانہ ملک میں وقعت سے دیکھا جائیگا۔

**ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۲۲ جلد ۲۱ ماہ اگست سنہ ۱۹۱۹ء

## عرصہ - اور - عرصۂ دراز

عرصہ سے اکثر اُن لفظوں میں اعتراض کرتے لوگ چلے آتے ہیں جو عام اہل ہند کی زبانوں پر الفاظ فارسی وعربی باعتبار لغات فارسی وعربی کے غلط مستعمل ہوگئے ہیں۔ اور اُن پر اہل علم کے اعتراض رہتے ہیں۔ جس طور پر اُردو کا سانچہ ان الفاظ میں جا بتا ہے اپنا ہی رنگ اور اپنا ہی نقش ونگار دکھاتا ہے۔ وہ "اجی حضرت" سے حرف "ر" کو گرا کے "اجی حضت" ہی کہتے رہے۔ صلوات جمع صلات بمعنے دُرود کے۔ اور انھیں معنوں میں مذہبی اصطلاح ہے۔ مگر اُردو کے سانچے میں آکر صلوٰۃ کا "صلواتیں" اور معنوں میں اتنا تصرف اور انقلاب پیدا ہوا کہ بُرا بھلا کہنے کو اور غصہ میں آکر باتیں سنانا صلواتیں ہوگئیں۔

یہ تصرف زبان کا اور حکومت اور اقتدارات زبان کے ہر ایک ترقی یافتہ زبان میں پائے جاتے ہیں جو قدرتی طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اور اسکو کوئی روک نہیں سکتا۔ زبان کسی قاعدے کی تابع نہیں، بلکہ قاعدہ زبان کے تابع ہوتا ہے۔ قدرتی نمونے کی ساوات دیکھ کر ایک قاعدہ استخراج کیا جاتا ہے اور زبان کی بول چال میں تفحص اور استقراء۔۔۔ ۔۔۔ کا قاعدہ بناتے اور لغات کے معنی لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں حروف وتلفظ بھی ایک مخلوق ہے۔ اور ان مخلوقات نادرہ پر کل گروہوں کے انسان اور کل شہروں کے آدمیوں کو تصرف کا اختیار دیا ہے۔ اور باعتبار مدارج کمال کے ہر صنف میں امتیاز رکھا گیا ہے۔ لہذا ہر گروہ کا آدمی باعتبار اپنی امتیازی حیثیت کے اپنی بول چال میں بھی ممتاز ہوتا ہے

قدرتی مخلوقات کی حیثیت سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہوتی ہے باعتبار مناسبت کے دوسری زبان کے بعض بعض قاعدے بعض جگہ پر خوبصورت نظر آتے ہیں اور بعض جگہ بدنما ہو جاتے ہیں۔ اپنی سلاست زبان کے لحاظ سے بدنما ترکیبیں متروک ہو جاتی ہیں اور بول چال کی کثرت یا استعمال کثیر سے بعض بعض ترکیبیں خوشنما ہو جاتی ہیں اور انھیں اصولوں پر تمام گلا کا دارمدار ہے۔ بندش ترکیب کا ہر کس وناکس شیدائی رہتا ہے اور یہ خاص بات لکھنؤ والوں کے خمیر میں پڑی ہے اس وجہ سے الفاظ کی سجاوٹ لکھنؤ والوں کا حصہ ہے جس طرح یہ وہ الفاظ کی سجاوٹ اور ترکیبات کی آراستگی کرتے ہیں اُسی طرح مضامین بلیغ اور بلند پروازیوں کے بھی عاشق ہیں۔ سادے مضمون میں اُن کو لطف نہیں آتا جب تک کہ مبالغہ اور غلو کا نمک مرچ نہ لگا ہو۔ جس کا اثر باہر والوں کے ذہنوں پر کم ہوتا ہے۔ یہی ہر سرزمین کی خاصیت اور آب وہوا کا اثر ہوتا ہے۔ کہیں کے لوگ چٹپٹا کھانا کھاتے ہیں، کہیں پھیکا پکوان پکتا ہے۔ کہیں کی زبان چلبلی اور بانکپن کی ادائیں رکھتی ہے اور کہیں کی زبان میں گوکھاپن اور سختی ہوتی ہے اور اکھڑپن۔ جس کو عوام کہتے ہیں کہ فلاں جگہ کی کھڑی بولی ہے۔ ان اصلی اصولوں پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ دیں گے کہ عام زبان کی بحث میں کوئی قاعدے کی غلطی اہل زبان کے مقابلہ میں قابل سماعت نہیں ہے۔ بلکہ وہ استقراء کا نقصان ہے اور اہل لغت کی کوتاہ نظری ہے اور اہل تنقید کے فہم کا قصور ہے۔ قدرت کے مناظر قابل اعتراض نہیں ہوتے۔ دریا کی روانی میں بھنور اور چکر اور گنڈھی پڑتے ہیں گو ان میں حباب در لہروں کی سی دلچسپی نہ پیدا ہو۔ عکس آفتاب سے اگرچہ گوناگوں رنگ لہروں کے سے نہ بدلے لیکن قدرتی گھماؤ اور چکر کی دلفریبی بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ زبان کی روانی میں غلط الفاظ عربی وفارسی کا مستعمل ہو جانا بھی اُردو کی شان فصاحت میں کچھ کمی نہیں پیدا کرتا۔ بلکہ تخفیف اور ترمیم لفظ کی اصلاح اور تراش وخراش سے اُلجھی ہوئی زلفیں کتروال بال ہو جاتے ہیں یا جھاڑ جھنکار لمبی داڑھیاں خشخشی خط گل عذاروں کے چہروں کا منظر نظر آنے لگتا ہے۔ ہماری زبان اُردو ہے اور اُردو میں دنیا کی زبانوں کی قدرتی طور پر گنجایش ہے۔ لیکن یہ کیا ظلم ہے کہ وہ اپنے ان پروردہ الفاظ کو اپنا لباس پہنا کر اس مشترکہ خاندان کا ممبر نہ بنائے۔ اور ایک ممتاز حیثیت بنا کر ان کو اچھوتا کرکے رکھے اور شیر شکر نہ ہونے دے۔ یہ تعصب ہے کہ عرب فارسی کو عجم، اور عجمی اہل ہند کو اصم اور بے زبان کہنے لگے۔ اور باوجودیکہ خود ایسے رلے کہ اب دونسلوں کا پتہ مشکل سے ملتا ہے۔ یہ فخر مباہات خالی زبانی جمع خرچ ہے کہ اُردو زبان کی بول چال میں عربی وفارسی کے تلفظ میں فرق نہ آنے پائے۔ ہر زبان

کی موسیقی اُس زبان کی ترازو ہے - اپنی زبان اپنی موسیقی میں بے تکلف موسیقی کے قاعدے پر رہتی ہے دوسری زبان کا اس تال سُر پر لانا بہت مشکل ہوتا ہے - لفظ کے اصلی مخرج سے تان اُٹھتی ہے اور سُر قائم ہوتا ہے - عورتوں کی سریلی آوازیں اور بیک لہجہ دوسری زبان کی گرانی کی متحمل نہیں ہوتی ہیں - حقیقتاً لفظوں کی پرورش زبان پر ہوتی ہے - اور دودھ پیتا بچہ ماں کی زبان سنتا ہے - جیسا ماں بچے کو دودھ پلا پلا کر پرورش کرتی ہے اسی طرح باتیں بنا بنا کر لفظوں کی پرورش بچوں کی زبان پر کرتی ہے - اسی وجہ سے زبان کی اصلیت ماں ہی بتائی جاتی ہے زبان کی شیرینی عورتوں کی زبان کی ہوتی ہے اور عورتوں کی آواز خصوصیت کے ساتھ موسیقی کے لیے موزوں ہے - لہذا جب اس ترازو پر آ کے بیرونی الفاظ وزن کیے جاتے ہیں تو لازمی طور پر اُن کی گرانی دفع کر دی جاتی ہے - اور اسی کا نام غلط رکھا گیا ہے - جو حقیقت میں اپنی زبان میں شریک کرنے کا معیار ہے - زبان کے اعتبار سے عورتوں کا میل جول بیرونی لوگوں سے کم ہوتا ہے - لہذا اُن کی زبان میں جو لفظ جس طریقے سے بولا جائے گا خواہ وہ کسی زبان کا ہو صحت کی کامل سند ہے - اگرچہ باعتبار اُس زبان کے غلط ہو - کیونکہ وہ لفظ بیشک اب اُردو ہو گیا - بے انتہا الفاظ غیر زبانوں کے خواہ بتغیر خواہ بجنسہ اُردو میں موجود ہیں مگر کوئی فریق اُسکی صحت کا دعویدار نہیں ہے - جس طرح پر ہماری زبان پر چڑھا ہے یا لب و لہجہ میں آ گیا ہے وہ صحیح اور فصیح اُردو کہلاتا ہے - کوئی کنڑی، مرہٹی، دکھنی یا پوربی، بنگالی لفظ نہیں کہتا ہے - نہ یہ کہ سکتا ہے کہ پوربی یا بنگالی یا مرہٹی میں اس کا تلفظ یہ ہے - یا استعمال اسکا غلط ہے سچ یہ ہے کہ دیگر الفاظ زبان غیر کے ماتحت عربی و فارسی کے ہو گئے اور مسلمان اپنی زبان کا وقار قائم رکھنے کے لیے اُسکی حرکات و سکنات کے ہمیشہ نگراں رہے - اب آپکے سامنے مختلف مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے - ایک موقع پر عرصہ کے معنی بجائے میدان کی وسعت بتائے گئے ہیں - جس کو غالب علیہ الرحمہ نے یوں باندھا ہے

"وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا　　　دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے"

جناب مولانا طباطبائی شرح میں لکھتے ہیں کہ جب میری صحرا نوردی کے لیے زمین کی وسعت ہیچ ثابت ہوئی تو زمین عرقِ شرم میں غرق ہو گئی - یہ دریا گویا عرق انفعال ہے" ایک شاعر اسی معنوں میں لکھتا ہے :-

میری وحشت پَر پھیلائے تو پھر دو دو جہاں　　　ہو اگر اک عرصۂ میداں تو کچھ وسعت نہیں

صرف اس لغت کے تحفظ کے لیے شاعر نے اس لفظ کو باندھا ہے - دوسرا شعر ہے :-

درد دل سے لوٹتا ہوں میرا کسکو درد ہے    ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے اُلٹو درد ہے

فارسی میں درد کے معنی دُکھ کے ہیں لیکن شاعر نے پہلے مصرعہ میں اُردو کے تصرف کو بتایا ہے کہ یہ محاورہ ہے کہ نہ میرا کوئی دردی نہ میرا کوئی غرضی' میرا کس کو درد ہوگا۔ محاورہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اپنا شاعرانہ پہلو دکھلاتا ہے "ہوں میں لفظِ درد جس پہلو سے اُلٹو درد ہے"۔

دوسرا تصرف میر تقی میر بتاتے ہیں کہ اصل میں معنی اس لفظ کے یوں ہیں مگر محاورے میں یہ تصرف اُردو زبان کا ہے جو درحقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ زبان کی محبت نے اس تصرف کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ فرماتے ہیں:۔

پڑھتا تھا میں تو سبحہ لیے ہاتھ میں درود    صلواتیں مجھ کو آنکے ناحق سُنا گئے

کس قدر مترشح ہے کہ "صلواتیں" اس کے معنی بتانے کے لیے کس قدر بے چین تھے کہ وظیفے کی حالت میں بھی بول اُٹھے اور نہ رہا گیا۔ دوسرا شعر ہے:۔

قیامت کا عرصہ ہے لے میر درہم    مری شور زاری نے میدان مارا

یہاں بھی عرصہ کے معنی میدان بتائے۔ لغت کا کام اشعار میں کر رہے ہیں۔ یہ قادر کلامی ہے ان بزرگوں کی۔ باوجود اسکے شاعری بھی ہاتھ سے نہ گئی۔ "میدان مارا" یعنی فتح ہوگئی۔ ایک محاورہ اُردو کا ہے، بتا دیا میدان مارنا یا میدان اپنے ہاتھ میں رہنا یا لاجنبا یعنے فتحیاب ہونا۔ اُردو زبان کی اصطلاح ہے

اب ایک معنی عرصہ کے مابہ النزاع ہیں جس کی نسبت بعض کا خیال ہے کہ یہ غلط ہے۔ یعنی بمعنے زمانہ اور مدت۔ اس کا قائل میں نہیں ہوں کہ کسی عام زبان کی لفظ کو جو روزمرہ بولی جائے اُسکی سند شعرا کے کلام سے طلب کی جائے اور عام بول چال کو غلط ٹھیرایا جائے۔ مگر یہ لفظ ان معنوں میں ایسا عام ہے کہ اہلِ علم کے نظم و نثر میں برابر جاری ساری ہے۔ اور اہلِ لغت نے بلا سند اشعار فارسی کے اپنی اُردو زبان میں اس لغت کو درج کر دیا ہے اور مستند بتا دیا۔ لکھنؤ کے مستند مرثیہ گو جناب مرزا دبیر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

مشغول وردِ نادِ علی ہوگئے جواں    گذرا تھا ایک دم کا نہ عرصہ کہ ناگہاں

قلق:۔ دیر کتنی ہے میرے مچلنے میں    کتنا عرصہ ہے میرے ٹلنے میں

غالب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

پھر جمع کر رہا ہوں دلِ لخت لخت کو　　عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

اس شعر میں بھی عرصہ بمعنی مدت کے ہے۔ لیکن ذہین طباع اور چالاک حضرات اسکو کاتب کی غلطی پر محمول فرما کے "مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے" فرما دیتے ہیں۔ یہ اک بات کی پرورش ہے اور بحث کے موقع پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ "عرصہ ہوا ہے کہ مژگانِ یار کی دعوت کی ہے جس نے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیے، اب پھر اُنھیں ٹکڑوں کو جمع کر رہا ہوں اور پھر اُسی دعوت کا حوصلہ ہے۔ دعوتِ مژگاں کا نامقبول مضمون ہے اس سے زینتِ مژگاں بہتر ہے"

مولوی علی حیدر طباطبائی غالب کے اس شعر کی شرح میں

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال　　تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

صفحہ ۱۱۵ دیوان غالب میں لکھتے ہیں "یعنی چاہتا ہوں کہ اپنے خیال میں ایسا غرق ہوں کہ پھر اُدھر نہ سکوں" مولوی محمد حسین آزاد کے بیان سے معلوم ہوا کروں ہوں، مروں ہوں کو دہلی میں بھی عرصہ سے غیر فصیح سمجھتے ہیں۔ اور پھر ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اساتذۂ دہلی کے کلام میں آئے ہے، جائے ہے اکثر ہے۔ مگر آخر کی غزلوں میں انھوں نے بھی بچاؤ کیا ہے۔ مولانا علی حیدر صاحب لکھتے ہیں کہ ہر زبان میں یہ بات ہے کہ جس طرح ادنیٰ لوگوں کی زبان اچھی نہیں ہوتی اُسی طرح لکھے پڑھے ہوئے لوگ بھی بعض الفاظ کا خلط کرتے ہیں بعض محاورات کی تصحیح کرتے ہیں اور زبان کو خراب کر ڈالتے ہیں بعض اشخاص محاورے میں نحوی یا لغوی قیاس کو دخل دے کر اور زیادہ خرابی کرتے ہیں: آگے چل کر لکھتے ہیں اور علما کی تو زبان سب سے زیادہ بگڑی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ علوم و فنون کے اصطلاحات اپنے محاورات میں داخل کرتے ہیں، اپنی زبان کی نحو اور ترتیبِ کلمات کو بھول جاتے ہیں۔ لفظی ترجمہ کرتے کرتے غیر زبان کی نحو اپنی زبان میں جاری کرنے لگتے ہیں۔

اہل ادب کا اتفاق ہے اس بات پر کہ جس تحریر اور تقریر میں اصطلاحات کا زیادہ خرچ ہوا اُس سے بڑھ کر کوئی مکروہ زبان نہیں ہو سکتی۔ اور اہل فن کا یہ حال ہے کہ اس قدر اصطلاحات وضع کی ہیں کہ اُن کی ایک نئی زبان ہو گئی ہے کہ اصطلاحات یاد کرنے میں ادب سے محروم رہ جاتا ہے۔ 'دیکھیے' فعلن کے وزن پر جو ہے اصلی بہ نسبت 'دیکھیے' جو فاعلن کے وزن پر ہے فصیح ہے۔ بلکہ اکثر لوگ

دیکھیے کو جو کہ فعلن کے وزن پر ہے نظم میں ترک کر چکے ہیں۔

مرقومۂ بالا تمثیلات سے آپ نے معلوم کر لیا ہوگا کہ عرصہ بمعنی زمانہ اور مدت عام طور پر عوام و خواص کی زبانوں پر بکثرت جاری ہے اور زبان اُردو کی نسبت جو اہل فن کے اقوال اور رائیں تھیں اُن سے بھی آپ واقف ہو چکے کہ غیر زبان کی تقلید اُن کے نزدیک نہایت مکروہ ہے۔ جیسا میں تمہید میں عرض کر چکا ہوں۔ مولوی علی حیدر صاحب نے بھی "عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوے" میں 'عرصہ' کے معنے زمانہ کے تسلیم کیے ہیں۔ لوگوں کی ذہانت کا خاتمہ مولوی صاحب کی تحریر نے فرما دیا۔ اور شرح میں اس لفظ کی تصدیق کر دی۔ علاوہ اسکے جن الفاظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں اُن میں ماہران فن اپنی قادر الکلامی کے سبب سے الفاظ کے تناسب میں ایک خصوصیت رکھتے ہیں۔ اور بعض موقع پر اگرچہ معنے صحیح ہوتے ہیں مگر ترکیب اوچھی ہوتی ہے اچھی نہیں معلوم ہوتی، جیسے غالب کے اس شعر میں۔

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی — کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

جس کا فارسی مصرعہ یوں ہوا "نیارد شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی" یعنی شوخیِ اندیشہ سے نومیدی اور مایوسی کا صدمہ نہیں اُٹھ سکتا اُسی تنا میں ہمیشہ رہنا یاس سے بہتر ہے۔ اور کفِ افسوس یاس ہی کے عالم میں ملتے ہیں، تو مصنف نے اُسکی یہ تاویل کی کہ یہ ہاتھ ملنا گویا پھر تنا سے تجدید بیعت کرنا ہے۔ مصنف نے تفننِ کلام کی راہ سے تجدیدِ عہدِ تمنا کے بدلے (عہدِ تجدید تمنا) کہا۔ گو محاورہ سے الگ ہے لیکن معنی درست ہیں۔ اسی طرح پر اگر ہم کہیں کہ ایک وسیع عرصہ میں پہونچا۔ یعنی ایک وسیع میدان جنگل بیابان میں پہونچا۔ دوسرے معنی یوں سمجھیں کہ ایک وسیع عرصہ میں پہونچا یعنی ایک زمانۂ دراز میں پہونچا تو غالبًا یہ معنی قریب الفہم ہیں، اور عرصہ کے معنی کسی طور سے نہ سمجھ میں آئیں گے کہ میدان کے ہیں۔ شاعر دو جگہ کہہ چکا ہے کہ "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوے" "مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوے" اب کیا اُسکی شامت آئی ہے کہ یہاں بھی (مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوے) مدت باندھے گا۔ تو یہ اُسکی نہایت ذلت ہے کہ اُسکو اور کوئی لفظ و ترکیب یاد ہی نہیں ہے کہ مدت کو دو جگہ باندھ آیا اور پھر تیسری جگہ بھی نہیں بھرتا؟ اُسکے کمالِ فن اور زبان دانی پر حرف آتا ہے۔ علاوہ اسکے اس میں ایک مخفی نکتہ بھی ہے، جو کاملینِ فن اسکو اک دوسری نظر سے دیکھتے ہیں۔ 'مدت' میں 'مد' ہے اور 'مد' کے معنی کھنچاؤ کے ہیں، اور 'عرصہ' میں وسعت اور کشادگی اور پھیلاؤ کا اشارہ ہے۔ کشیدگی معشوق کی صفت ہے۔ لہذا یار کی

مہمانی کے لیے مدت کا لفظ موزوں تھا۔" مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے" یعنی یار کو مجھ سے بڑی کشیدگی ہے۔ یہ ایک ضمنی پہلو ہے۔ مناسبتِ الفاظ کے خیال سے۔ اور اب رہی دعوتِ مژگاں کی مہمانی۔ مہمانی میں کشادہ دلی پھیلاؤ صفت ہے۔ لہٰذا عرصہ کا لفظ اسکے واسطے اک مناسبات و جدائی سے ہے۔ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے' زیادہ موزوں ہے۔ بہرحال عرصہ کا لفظ بمعنی زمانہ بہت کثرت سے کملائے فن ادب نے استعمال کیا ہے۔ عرصہ بمعنی زمانہ۔

<u>عرصہ بمعنی زمانہ</u>: آبِ حیات میں محمد حسین صاحب آزاد فرماتے ہیں کہ سید انشا پھرتے چلتے دلی آئے تھے اور کچھ عرصہ رہے تھے۔ اور جو لوگ اُن معرکوں میں رہے تھے اُن میں سے اکثروں نے دلی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر مصحفی نے یہ قطعہ کہا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں ⁂ دلی نہیں دیکھی ہے زباندان وہ کہاں ہیں

مولانا آزاد مرحوم ایک اور مقام پر لکھتے ہیں "مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے"۔

مولوی عبد الحلیم شرر (صفحہ ۶۸ زیادہ وطلاوہ) زیادہ کہتا ہے" اب اس عرصہ میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا"۔ اب ایک بحث اور پیدا ہو گئی۔ عرصہ کا لفظ جب باعتبار معنی زمانہ کے معنوں میں مستعمل ہے تو لفظ ہند ہوا۔ اب اسکی اضافت دراز کی طرف جائز ہے یا نہیں؟ معترضین کہتے ہیں کہ 'عرصۂ دراز' بالکل غلط استعمال ہے۔ مگر مجھے اس میں بھی کلام ہے۔ اول تو لفظ باعتبار صورت کے فارسی ہے اور مستقل معنی فارسی رکھتا ہے۔ لہٰذا لفظ فارسی، دوسرے فارسی لفظ کی طرف مضاف ہے جو صورۃً بالکل صحیح ہے لیکن معنًا مصداق فارسی زبان کا اُسکے معنوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ فارسی معنے کا مصداق میدانِ دراز ہے مگر یہاں معنی زمانۂ دراز کے ہیں۔ اب یہاں پر کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ہندی بنائی ترکیب مہند ہے۔ جیسے آبِ رواں' بتِ بے پیر' آبِ رواں ایک باریک کپڑے کا نام ہے۔ آبِ جاری اس کا مصداق نہیں ہے۔ اب میں یہ کہوں گا کہ اہلِ زباں کے مقابلہ میں قواعدِ نحو صرف بھی زبان کے تابع ہیں۔ فارسی کی نحو صرف اُردو زبان میں کیا کام دے گی۔ کیونکہ زبان ایک فطرتی چیز ہے اور قواعد ہمارے بنائے ہوئے ہیں تفحص اور استقراء اہلِ زبان زبان سے کرتے ہیں اور وہ خالی تشخصِ واحد کا ادّعا ہوتا ہے۔ غلطی قوانین میں ممکن ہے لیکن زبان کے تصرفات سے غیر ممکن ہے کہ وہ دوسری زبان میں تصرف نہ کرے۔ زبان کو کوئی نہیں

، بنا تا ہے وہ خود بنتی ہے اور نفرت سے تائید ہوتی ہے ۔ یہ بھی منجملہ مخلوقات کے اک مخلوقِ خدا ہے جو بندوں کے تکلم کے واسطے پیدا کی گئی ۔ فطرت کا یہ تقاضہ ہے کہ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے اور ماں باپ کی زبان سیکھنا شروع کرتا ہے تو وہ اس قدر اپنی زبان میں تصرف کرتا ہے کہ لڑکوں کی زبان کا موضوع ہی جدا گانہ ہو جاتا ہے ۔ "مَم" "مَما" ہر لڑکا پانی کو کہے گا ۔ غور کیجیے تو تخلیقِ زبان کا اس سے اک راز معلوم ہوتا ہے۔

مولانا آزاد تذکرہ آبِ حیات میں فرماتے ہیں کہ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ فصاحت و بلاغت کے لیے کوئی قاعدہ نہیں جس زبان میں خدا مزہ دے ہزار اصول اور قواعد کی کتابیں اُسپر قربان ہیں ۔

مولانا آزاد نے فقرات بالا انشاء اللہ خاں کی نسبت تحریر فرمائے ہیں اور سید انشاء بھی فرماتے ہیں ۔

لگ گئے عیب ملنے اُسکے ساتھ یوں کہا جس کو مردِ بھنگی ہے

مولانا آزاد صاحب مرحوم سید انشا کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ " پنڈتان کشمیر کا لباس درست کرکے سب سامان پوجا پاٹ کا تیار کیا " اور پھر ایک مقام پر سید انشا کی نسبت لکھتے ہیں کہ کل تصنیفات کی ہیئتِ مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ نئے تصرف اور ایجادوں کے لحاظ سے سید انشا فن انشا کے قلمرو میں بادشاہِ علی الاطلاق تھے ۔ اور اس اعتبار سے اُنھیں اُردو کا امیر خسرو کہیں تو بجا ہے کچھ بیجا نہیں ۔ بلکہ قصیدۂ طور الکلام میں جہاں صنائع مختلفہ کی ذیل میں اُنھوں نے ایک مصرعہ پر فخر کیا ہے وہ درحقیقت قابلِ تحسین ہے ۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں کہ " مگر اس احسان کا شکریہ کس زبان سے ہو کہ ہماری زبان میں نئی نئی تشبیہیں اور شگفتہ استعاروں کے دروازے کھول دیے ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ان میں فارسی اضافت کی گرہ کو نہایت خوبصورتی سے کھولا ہے ۔ غزلوں میں اُسکے اشارے معلوم ہوں گے جو اہلِ نظارہ کی آنکھوں میں نظر آئے گا ۔ اب اہلِ بصیرت ملاحظہ فرمائیں : ۔

اہلِ نظارہ کی آنکھوں میں نظر آئے گی باغ میں نرگسِ شہلا کی ہوائی جیتون

جناب میر تقی علیہ الرحمہ کا مقولہ آبِ حیات میں آزاد نے یوں بیان کیا ہے " ایک موقع پر لوگوں نے کہا کہ ہم انوری اور خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے ۔ میر صاحب نے کہا کہ درست ہے اُن کی شرحیں اور فرہنگیں اور مصطلحات موجود ہیں اور میرے کلام کے لیے فقط محاورہ اہلِ اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں ۔ اور اس سے آپ محروم ۔ یہ کہکر ایک شعر پڑھا

عشق بُرا ہے خیال پڑا چین گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھہر گیا صبح گیا یا شام گیا

پھر کہیں گے کہ دی) تقطیع میں گرتی ہے۔ گر یہاں اسکے سوا جواب نہیں کہ محاورۂ زبان یہی ہے" میرتقی مرحوم بیڑۂ پان بترکیب اضافی۔

جب وہ کھاتے ہیں بیڑۂ پان کو  رُو نہیں دیتے لعل و مرجاں کو

ترکیب اضافی فارسی ہے اُردو ترکیب بیڑا پان کا ہے۔ ایسے تصرفات میرصاحب کے عام ہیں۔ کیونکہ وہ زبانِ اُردو کو کسی زبان کا مقلد اور خراج گذار بنانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ وہ اسے مستقل بالذات اور خود مختار کشورِ ہند کی زبانوں کی شہزادی مان رہے ہیں۔ جو لفظ اُنھوں نے کسی زبان کا پایا اسکے عام تصرفات کو صحیح مان کر خود بھی برتا اور اہلِ لغت کو بھی ایک سند دے دی کہ یہ ہائیکورٹ کی نظیر ہے اب اسکے خلاف فیصلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ علاوہ اسکے لغاتِ اُردو کا دارمدار ہماری زبان پر ہے۔ جو تلفظ اور معنی اور ترکیب محاورہ اہل زبان کی زبان پر ہوگا وہی لغت میں داخل ہوگا۔ اہلِ فارس کے لغت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم کہتے ہیں فارسی میں عرصۂ دراز زمانۂ دراز کے معنوں میں نہ آئے نہ سہی۔ دیکھنا ہے کہ ہماری اُردو زبان میں یہ لفظ کیونکر بولا جاتا ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں کہ عربی اور فارسی میں مذکر ہیں لیکن اُردو میں آکر مؤنث ہوگئے۔ اس معاملہ میں کوئی اہل فن جرح اور تنقید نہیں کرتا۔ تمثیلات ملاحظہ فرمائیے کس قدر اضافتیں فارسی الفاظ کی اُردو کے لفظ سے مرکب ہیں۔ حضرت شاعر، شاگردِ جلیل قدر خواجہ آتش

ہے رشتۂ الفت یہ ترا ایسے گلوگیر  زنار نہیں او بُتِ بے پیر سے گلے میں

دھیان اسکو کہتے ہیں آیا نظر جب طفلِ اشک  دیدۂ تر کو اُسی بے پیر کا دھوکا ہوا

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں بٹتی ہے شراب  اب تو ناسخ اور رندِ لااُبالی ہوگیا

لااُبالی مہند ہے یعنی بے فکرا، آزاد، بے ڈھنگا، اُول جلول، ہولا کھیلا۔

اُردوے معلٰی صفحہ ۲۳۴۔ غالب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:" اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا۔ جدت طرز اسی کا نام ہے۔ جو ڈھنگِ تازہ "نوابانِ ایران کے خیال میں نہ گذرا تھا وہ تم بروے کار لائے"۔

صفحہ ۱۳۲۔ مصطلحاتِ اُردو۔ مصنفہ خواجہ اشرف علی اشرف۔ گھنگرو بولنا۔ جو آواز جاں کنی کے وقت نکلتی ہے۔ حضرت میر علیہ الرحمہ:۔

جاں کنی کے وقت مجھکو دیکھنے آیا جو تو شور گھنگرو سے ہوا پیدا مبارک باد کا

**لفظ ھند کی منافت** | طوطی اگرچہ فارسی ہے لیکن طوطی بولنا بمعنی شہرت وترقی اور زمانہ کا موافق ہونا۔ اُردو کا محاورہ ہے۔ صفحہ ۲۲۸۔ مصطلحات۔ برقؔ

کیا بولتا ہے طوطی شیریں مقال کا شہرہ جہان میں ہے خطِ بے مثال کا

مصطلحات صفحہ ۳۔ آب فارسی میں پانی کو کہتے ہیں۔ مگر اصطلاحِ اُردو میں صفائی، چمک تلوار یا چھری وغیرہ کی تیزی کو کہتے ہیں۔

ننگا کر تیغ اے قاتل مجھے ٹھنڈا کیا تونے بجھائی آتشِ شوقِ شہادت آبِ آہن سے

آپ فرمائیں گے کہ استعارہ ہے مگر آبِ آہن سے تلوار مراد لی ہے۔ اور آتشِ شوقِ شہادت کی غرض سے آبِ آہن لایا ہے۔ لہذا یہی آب اصطلاحِ اُردو ہے۔ جو اس کا مدعا ہے۔ داغؔ دہلوی۔

وہ ناکامِ تمنا ہوں جو اپنا قتل میں چاہوں اثر ہو جائے آب تیغ میں بھی آبِ حیواں کا

آبدار یا آبداری، اصطلاحِ اُردو میں رونق، چمک اور تیزی کو کہتے ہیں۔ لفظ ھند ہے۔ جناب ناسخؔ

دمِ اخیر تو کرلوں نظارہ جی بھر کر الٰہی خنجرِ سفاک آبدار نہ ہو

محاورہ ہے۔ مثلاً۔ اسیرؔ

غرورِ اہلِ جہاں سے میں لنگار ہوا کھنچا جو مجھ سے مجھے تیغ آبدار ہوا

اضافت ہے۔ سنداً تیغِ آبدار کی ترکیب ملاحظہ ہو۔ آبِ رواں، ایک قسم کی نزیب کا نام ہے جسکو آج کل جنگل یا ململ کہتے ہیں۔ اور محلات کی زبان پر آبِ رواں ہے نہ ململ۔ اشکؔ

کرتی تنِ محبوب میں ہے آبِ رواں کی اطلس کی نہیں گوٹ، ہے دریا کا کنارہ

دریا کا کنارہ آبِ رواں کے واسطے ایک ضلع کا لفظ ہے۔ عاشقؔ

عکسِ جامِ جسم ساقی نے بدل دی ہے نقاب پارچۂ آبِ رواں کا جامدانی کر دیا

خواجہ نصیرؔ دہلوی

بخت خفتہ نے جگایا اُسے صد حیف نصیرؔ آگِ گلخن مرے سینے میں دبی رہتی ہے

یعنی گلخن کی آگ سینے میں دبی رہتی ہے۔ نگہتؔ

صرفِ زرِ سخن سے ہے حاصل تونگری کرتا نہیں کلام کوئی غیرِ زرگری

زرگری ایک اصطلاح زبان اُردو کی ہے یعنی بغیر زرگری کی اضافت مستوی ہے۔ سید انشاء:-

چھتوں میں موتیوں کی جھالریں لٹکتی ہوئی    سب ایک ڈال زمرد ہر اک کواڑ کی پٹ

یعنی زمرد کی ایک ڈال ہر ایک کواڑ کے پٹ ہیں۔ یہاں اضافت لازمی کسرہ جو ہے ۔ ورنہ جملہ ناتمام رہتا ہے بغیر اضافت کے۔ اور شاعر یوں کہہ سکتا تھا: سب ایک ڈال زمرد کے ہیں کواڑ کے پٹ۔ اس جملہ میں کسرہ لازمی نہیں۔ خود مصنف مصطلحات "ایک آدھ" کی تصریح میں یوں لکھتے ہیں "ایک آدھ، یعنی عرصۂ قلیل، یا یک دو تیم"۔ جناب ناسخ فرماتے ہیں

عاشقوں سے ہے کڑی بات اس بت بے پیر کی    کاکل پیچاں سے آتی ہے صدا زنجیر کی

بت بے پیر میں بے پیر بیدرد کے معنوں میں لفظ پوربی ہے۔ مولانا حبیب فرنگی محلی فرماتے ہیں

ہو گیا اُلٹا نتیجہ آہ کی تاثیر کا    پھر گیا دل اور مجھ سے اس بت بے پیر کا

ہول دل کا تعویذ یعنی دھڑکن کا تعویذ۔ عورتوں کی زبان کی ایک پھبتی ہے، چھوٹے ٹکڑے پان کے یعنی یہ پان ہے کہ ہول دل کا تعویذ، مرض اختلاج کا علاج۔ ہول عربی لفظ ہے بمعنی دہشت اور خوف۔ ایک عرب کہتا ہے

اصبر ستہ اہوالہا    لا موت الا الاجل

یعنی قبر کے ہولوں اور دہشتوں پر اب تو صبر کر، کیونکہ مرنا تو جبھی ہوگا جب اجل آئے گی۔ اب اُردو شاعر کہتا ہے۔ غالب علیہ الرحمہ

وان اُسکو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار    یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے    کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہمکو

مولانا علی حیدر صاحب شرح میں لکھتے ہیں کہ وسواسی اور خفقانی ہونا، یہ بھی اک ادائے معشوقانہ ہے لہذا ہول دل کے معنی وسواسی ہونا مسلم ہے۔

سید برکات احمد لکھنوی

بزم رنداں میں وہ دور بادہ پیمائی نہیں    میکشو! ابکی برس کیا چاند آئی نہیں
اے نگاہ رند پر در تیرے جوش کیف سے    ... محو رعنائی نہیں
قصۂ فرہاد اب بھی وحشت آور ہے مگر    کوہ پر جا پہونچے ایسا کوئی سودائی نہیں
انقلاب عام کا جب خود نتیجہ ہے سکوں    آرزوئے راحت آرام ۔ دانائی نہیں
واصف دیوانہ جب سے رہن مایوسی ہوا    چاک دامانی ہے اب وہ وحشت آرائی نہیں

# ہمیں اک نیمجاں تھے تیری طاقت آزمانے کو

بھلا دینا کچھ آساں ہے شہیدوں کے فسانے کو؟ / زمانہ چاہیے خونیں نوشتوں کے مٹانے کو

ذرا ہشیار چرخِ سربلند اُن پائمالوں سے! / جو مٹتے مٹتے آمادہ ہوں مٹنے اور مٹانے کو

بھرم کھولا ہے تونے آپ اپنی تیغ و بازو کا / ہمیں اک نیمجاں تھے تیری طاقت آزمانے کو؟

ایاغِ چشم میں یاں اشکِ خوں کا دَور چلتا ہے / کوئی کیا جانے اہلِ درد کے پینے پلانے کو

نہیں پروا ہمیں زخموں کی۔ ہاں غم ہے تو اسکا ہے / بنا رکھا ہے صید اغیار نے تیرے نشانے کو

نہ پوچھو بندگانِ عشق کی آسودہ حالی کو / کہ خونِ دل ہے پینے کو غم و غصہ ہے کھانے کو

وفا کہتے ہیں مٹ جانے کو شبنم کی طرح گل پہ / سمجھ رکھا ہے بلبل عشق تونے غل مچانے کو

اُدھر برقِ بلا ہنستی ہے میری سعی باطل پہ / بناتا ہوں اِدھر چُن چُن کے تنکے آشیانے کو

ہنسی آتی ہے مجھ کو اشک کی طفلانہ جرأت پہ / چلا ہے سیل بنکر ظلم کی بنیاد ڈھانے کو

وہ دلچسپی کہاں صیاد کو بلبل کے نغموں سے / ترستی ہے غریب اب دام کے بھی دانے دانے کو

ستانے والے! اُسکو دھمکیاں کیا جاں ستانی کی؟ / حیات جاوداں جانے جو اپنے جی سے جانے کو

ترے جاں باز کو حرفِ خرد سے یاد ہے اتنا / اگر ہے کاٹنے کو تیغ تو سر ہے کٹانے کو

خبر لے مژدۂ لاتقنطوا کے بھیجنے والے
دلِ مسلم پہ کفرِ یاس ہے نقشہ جمانے کو

محمد مسلم (عظیم آبادی)

# میسوپوٹامیہ

## (ارض نہرین یا جزیرہ ۵)

بسلسلۂ ماہ گذشتہ

**تل سنقریہ** | بابل - نفر - تل صفر اور چند اور ٹیلوں میں تھوڑے تھوڑے کندن کے بعد لافٹس صاحب نے کچھ زمانہ تل سنقریہ کے کھودنے میں صرف کیا - یہ ٹیلا ورقہ سے ۱۵ میل جنوب میں واقع ہے - سن قریہ میں تھوڑی سی کھدائی کے بعد ایک معبد اور منار کے نشانات ملے - اور اس میں مختلف مضامین کے کتبے دستیاب ہوے - کہیں مٹی کے اسطوانے یا لوہے پیپے کی شکل کے نکلے جن پر تاریخی واقعات لکھے تھے - اور کہیں ایسی اینٹیں نکلیں جو عمارتوں میں لگائی گئیں تھیں اور جن پر عبارات نقش تھیں - بہت سی گلی تختیاں جن پر کاروبار کے معاملات تحریر تھے یا جو بطور قانونی تمسکات یا دستاویزات کے تھیں برآمد ہوئیں - ان سب کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ معبد اور منارہ نہایت درجہ قدیم زمانے کے ہیں - سن قریہ کا شہر ایک پرانے شہر کے ڈھیر پر آباد ہوا ہے - اس پرانے شہر کا نام لارسا تھا جس کو توریت میں الاسر (کتاب پیدایش ۱۴-۱) لکھا ہے - یہ شہر یعنی لارسا خدائے شمس کا پرستش گاہ تھا - اور شمس کا ہیکل اور شمس کا منارہ اس شہر میں بابل کے تمام تاریخی عہد میں بڑے زیارت گاہ مانے گئے تھے - سن قریہ سے جنوب میں تل صفر کے مقام پر گو لافٹس صاحب نے کندن تھوڑی مدت تک جاری رکھا مگر کثرت سے کندہ تختیاں اور مختلف قسم کی برنجی اور آہنی اشیاء جیسے کلہاڑیاں - کٹاریں - چاقو - دیگچیاں - دیگیں - اور آئینے نکلے - یہ سب چیزیں انگلستان روانہ کر دی گئیں - تاکہ برٹش میوزیم ان عجائبات سے اور بھی مالا مال ہو جائے -

**تل قصر** | جس زمانہ میں کہ دوسری فرانسیسی جماعت نے موسیو بوٹا کے کام کو خورس آباد اور قزنجیک میں جاری کر رکھا تھا - گورنمنٹ فرانس نے موسیو فرزنل کو مقرر کیا کہ قدیم شہر بابل کے موقع پر جو کندن شروع ہونے والا تھا اُس کی نگرانی کریں - موسیو فرزنل کے ہمراہ موسیو اوپرٹ ایک نوجوان روشن خیال شائق علم بھی تھا - جس کی قسمت میں یہ بزرگی لکھی ہوئی تھی کہ وہ بہت جلد تاریخ اشور کی

تحقیقات میں درجۂ کمال کو پہونچ جائے۔ اوپرٹ کے ہمرکاب فلیکس ٹامس معمار تھا۔ جس کا یہ کام تھا کہ عمارتوں کی وضع اور ساخت پر غور کرتا رہے۔ اور کندن کے متعلق جس قدر تصویر کشی کا کام ہو وہ اُس کے قلم کا ہو۔ جولائی ۱۸۵۱ء کے وسط میں ایک بڑے ٹیلے پر کام شروع کیا گیا۔ اس ٹیلے کا نام تل تصر تھا۔ تل تصر کے کام کو بڑھاتے بڑھاتے دو اور ٹیلوں تک پہونچا دیا۔ جن کا نام بابل اور عمران بن علی تھا۔ یہ ٹیلے بھی اُسی سلسلے میں تھے جس کے نیچے قدیم شہر بابل دفن تھا۔ یہاں بہت سی مٹی کی مُہریں بیلن کی قطع کی ملیں۔ ان پر بادشاہ بابل، نبوکدنسر ثانی (۶۰۴ - ۵۶۱ ق م) کا نام لکھا تھا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ تل قصر کے نیچے جو عمارت دبی ہے وہ اسی بادشاہ کا محل یا قصر ہے۔ روغنی اینٹیں جن پر طرح طرح کے بیل بوٹے اور جانوروں کی تصویریں بنی تھیں نکلیں۔ لیکن کوئی چیز ایسی نہ نکلی جس کا مقابلہ دلچسپی اور شہرت انگیزی کے اعتبار سے اُن انکشافات سے کیا جا سکتا جو اسی زمانے میں موسیو بوٹاس اور سرا گسٹس تے یرڈ شمالی ٹیلوں کے متعلق دُنیا پر روشن کر رہے تھے۔ فرزنل اور اوپرٹ جن ٹیلوں پر کام کرتے تھے اُن کے نتیجے بھی کچھ بہت حیرت خیز نہ تھے۔ بابل کے متعلق ارضی معلومات میں کچھ اضافہ ضرور ہوا گو بعض مسائل جو اوپرٹ نے حل کیے وہ بعد کو صحیح نہ ٹھیر سکے۔ اسی فرانسیسی جماعت نے بابل کے قریب اور ٹیلوں پر مثلاً برس نمرود جو قدیم شہر بورسیپا کا موقع تھا یا الاحمر پر جس کے نیچے شہر کش دبا پڑا تھا۔ ان ٹیلوں پر کچھ ایسی بُری گھڑی کام شروع ہوا کہ دو برس کی محنت میں جس قدر پُرانی چیزیں جمع ہوئی تھیں وہ سب دریا کے رستے بصرہ تک پہونچنے میں بیڑے کے ڈوب جانے سے تلف ہو گئیں۔

**حضرت ابراہیم کے سفر کا مقام آغاز** جی۔ ای۔ ٹیلر ایک انگلشمین جو بصرہ میں نائب کونسل تھے مقیّر کے ٹیلے کے کھودنے میں بہت کامیاب رہے۔ یہ ٹیلا بابل سے بہت جنوب میں ہے اور ثابت ہوا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں پہلے اُر کا مشہور شہر تھا۔ توریت کے بموجب اسی شہر سے حضرت ابراہیم کا وہ سفر شروع ہوا تھا جس نے آخر الامر ان کو فلسطین پہونچا دیا۔ ورقہ کے ٹیلوں میں جو کھنڈر نکلے اُن کے آثار بہت چوڑے تھے اور بعض جگہ دیواروں کے سر ٹیلوں کے اوپر نکلے ہوئے تھے۔ برس نمرود اور عقرقوف کے ٹیلوں میں بھی پُرانے مناروں کے حصے اوپر نکلے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن مقیّر میں ٹیلے زیادہ اونچے نہ تھے۔ اس لیے کندن میں بھی آسانی ہوئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک بڑی عمارت کے

نشان پاکر ٹیلر صاحب اُس کے اندرونی حصوں تک پہونچ گئے۔ اور معلوم ہوا کہ یہ عمارت ایک عبادت خانہ ہے۔ جہاں سِن کی پرستش ہوتی تھی۔ سِن سے مراد قمر ہے۔ اور آر کا شہر قمر پرستی کیلئے قدامت سے مشہور تھا۔ ٹیلر صاحب اس عمارت کی تفصیل کو پہلے ہی سے خوب سمجھ گئے۔ اور جہاں کسی دیوار کا کوئی پہلو دکھائی دیا فوراً اُن کی سمجھ میں آگیا کہ یہ دیوار کس رُخ گئی ہوگی۔ چنانچہ اُسی سمت میں کھود کر آسانی سے عمارت کے حصوں کو برآمد کر لیا۔ اس عبادت خانے میں سب سے زیادہ مخصوص چیز زگورات یعنی منارے کی عمارت تھی۔ اس منارہ کے دو درجوں کا جو ایک کے اوپر ایک واقع تھے پتہ چل گیا۔ اور پہلی منزل کے ایک گوشے میں ایک مٹی کا اسطوانہ یا خول بالکل صحیح حالت میں ملا۔ اور اسی اسطوانے کے تین مثنیٰ باقی تین گوشوں میں ملے۔ گوشوں پر اسطوانے رکھنے کا دستور بابل اور اشور کی عمارتوں میں عام طور پر پایا گیا۔ زمین کی مختلف تہوں پر اینٹیں نکلیں جن پر بیکانی خط میں عبارتیں کندہ تھیں۔ ان عبارتوں کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ عبادت خانہ آر کے شاہی خاندان نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ شاہی خاندان نہایت قدیم ہے۔ چنانچہ اس کی حکومت کا زمانہ تیسویں صدی پیشینِ مسیح یا اُس کے قریب دریافت ہوا ہے۔ ٹیلر صاحب ہی وہ متجسس تھے جن کا گذر پہلی مرتبہ بابل قدیم کے عہد کی قبروں پر ہوا۔ اُس زمانے کے تابوت جدید بابلی اور ایرانی عہد کے کشتی نما تابوتوں سے بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ بعض کی صورت ایسی ہوتی تھی جیسے نہانے کا انگریزی ٹب ہوتا ہے کہ سر کی طرف سے کسی قدر اونچا اور پاؤں کی طرف سے کسی قدر نیچا۔ اس میں مُردے کا سر پاؤں کے مقابلہ میں بہت اونچا رہتا تھا۔ بعض تابوت محض سرپوش کی شکل کے مدوّر بنے ہوتے تھے کہ مردہ کو زمین پر رکھ کر اُن سے ڈھک دیا جاتا تھا۔ بعض کی یہ شکل تھی کہ دو لمبے مٹکے یا خُم ہوتے تھے آدھی لاش ایک خُم میں اور آدھی دوسرے خم میں رکھ کر خموں کا مُنہ کسی مسالے سے جوڑ دیتے تھے۔ ان چیزوں سے اُس زمانے کے لوگوں کے رواج اور دستور کے متعلق بڑی معلومات ہوئی۔ اسی طرح سے اُنکی روزمرہ زندگی کے طور طریقے۔ طرح طرح کے گلی ظروف سے اور کھانا پکانے کی چیزوں سے اور مٹی کی تختیوں سے جن پر اُن کے کاروبار کے معاملات، قبالے اور تمسکات بابل کے ہر تاریخی عہد کے کندہ تھے دریافت ہوگئے۔ ٹیلر صاحب نے یہ سب چیزیں زمین سے نکالیں۔ باوجودیکہ تھوڑے ہی کھدائی کے لیے کم وقت ملا لیکن بابل کی ابتدائی تاریخ پر بہت کچھ روشنی ٹیلر صاحب ہی کی کوشش سے پڑی۔ اسی طرح

انھوں نے اَبُو شہرین کے ٹیلے کے نیچے جو شہر دفن تھا اُس کی عمر کا اندازہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ابو شہرین کا ٹیلا مقیر سے بھی جنوب میں تھا۔ اس امر کا ثبوت بھی ٹیلر صاحب ہی نے دیا کہ ابوشہرین کے مقام سے جو ٹیلے سطح میدانوں میں جابجا سیدھے اُٹھے نظر آتے ہیں وہاں کسی زمانے میں اریدو کا شہر تھا۔ یہ شہر جیسا کہ حال میں دریافت ہوا ہے کسی زمانے میں خلیج فارس کے کنارے سے ملا ہوا اُس کے سرے پر یا اسکے قریب واقع تھا۔ لیکن اب ساحل خلیج اُس سے بہت فاصلے پر ہے۔ ٹیلر صاحب نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ابوشہرین کے شمالی جانب جو ٹوٹے ہوئے آثار اب تک ٹیلے کی چوٹی سے ۷۰ فیٹ اونچے اُٹھے نظر آتے ہیں وہ ایک پرستش گاہ کے منارے کے آثار ہیں۔ جس طرح مقیر کے مقام پر معلوم ہوا تھا اُسی طرح یہاں بھی منارے کے دو درجے دریافت ہوئے۔ اور ایک درجے یا منزل سے دوسرے درجے پر چڑھنے کے لیے ایک جانب بجائے سیڑھیوں کے محض ڈھلواں سطح تھی۔ اور چوٹی پر ایک چھوٹا سا حجرہ تھا جس میں معبود آیا کا بُت رکھا رہتا تھا۔ یا کوئی علامت رہتی تھی، جو اُس معبود کو تعبیر کرتی تھی۔ یہ معبود شہر اریدو کا محافظ اور نگہبان سمجھا جاتا تھا۔ یہ انکشاف یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ اس مورخ نے بابل کے مناروں کا حال اس طرح لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مناروں کی چوٹی پر ایک مسقف مکان ہوتا تھا جس میں کسی معبود یا معبودہ کی مورت ہوتی تھی۔ اور اُسی کے نام پر یہ مکان ایک معبد کے طور پر مشہور ہوتا تھا۔ ٹیلر کی کوششوں سے پہلے یا بعد کو جس قدر عمارتیں جنوب کے ٹیلوں کے نیچے دبی ملیں وہ کچی یا پکی اینٹوں کی تھیں۔ لیکن ابوشہرین کے ٹیلوں سے جو مکانات برآمد ہوئے اُن میں سنگِ سرخ۔ سنگِ خارا اور سنگِ مرمر کا مستعمل ہونا بھی کثرت سے پایا گیا۔ چونکہ وادیِ فرات میں پتھر نام کو نہیں اس لیے لازمی ہے کہ یہ پتھر اریدو کے پُرانے شہر کی تعمیر کی غرض سے خلیج فارس کے رستے سے لایا گیا ہوگا۔ ٹیلر صاحب نے اپنا زمانہ اس جنوبی حصے میں بھی صرف کیا تاکہ باقی ٹیلوں کی نسبت بھی تحقیقات ہو سکے اور آزمائش کے طور پر کہیں کہیں کندن کیا جائے۔ غرض ٹیلر صاحب کی روانگی کے ۲۰ برس بعد تک یعنی اُس وقت تک جب تک کہ فرانسیسی محقق ترزیک اس زمین پر نہ پہونچا جنوبی ٹیلوں کے متعلق جو کچھ علم تھا وہ ٹیلر صاحب ہی کا دریافت کردہ تھا۔

**سر ہنری رالنسن کی کارگزاریاں** | اس کام میں دی ترزیک کی جانفشانیوں کا حال بیان

کرنا بھی ضروریات سے ہے لیکن اس سے پہلے سرہنری رالنسن صاحب کی وہ کارگذاریاں بیان کرنی زیادہ مناسب ہیں جو اُنھوں نے برس نمرود کے ٹیلے کی تحقیقات میں جہاں پہلے کسی وقت میں بورسپا کا قدیم شہر آباد تھا انجام دیں۔ اُن کی تحقیقات گو مختصر تھی لیکن اُن کے اکتشافات نہایت صحیح نکلے۔ منارہ (زکورات) کے پوشیدہ آثار جو برس نمرود میں تمام ٹیلوں سے اونچے نظر آتے ہیں کچھ شبہہ نہیں کہ اُن کی بلندی ہی اس شہرت کا موجب ہوئی ہو کہ منارۂ بابل جس کا ذکر توریت میں ہے اسی جگہ واقع تھا۔ بورسپا کے منارے کا نام بابلی زبان میں " اِی۔ اَر۔ امینی۔ اَنکی" تھا۔ جس کے معنی ہیں " آسمان و زمین کا سات درجوں والا گھر"۔ اسی طرح بابل میں جو منارہ تھا اُس کا اصلی نام " ای تمن اَنکی" تھا۔ یعنی " آسمان و زمین کی بنیادوں والا گھر" ان دونوں ناموں میں آسمان و زمین کو ملا دینے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ توریت کے قصہ میں بھی یہی بات نکلتی ہے کہ خدا نے اس منارہ کو جسے لوگ زمین سے آسمان تک پہونچانا چاہتے تھے اعتراض کی نظر سے دیکھا۔ اگر توریت کا بیان اس دستور کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عبادت خانوں کے متعلق اونچے اونچے منارے تعمیر کرنے کا طریقہ بابل اور اشور میں عام تھا تو بے شک یہ روایت صحیح ہے کہ بابل والا منارہ یا اُس کے قریب بورسپا کا منارہ (یعنی برس نمرود کے آثار) وہ ہی منارہ ہے جس کا ذکر توریت میں آیا ہے اور جس کو منارہ یا برجِ بابل لکھا ہے۔ غرض اس برس نمرود کی تحقیقات کا شوق سرہنری رالنسن صاحب کو پیدا ہوا۔ اور اس شوق کو انجام دینے کے وہ اہل بھی تھے۔ کیونکہ ان کی لیاقت اور قابلیت طرح طرح سے ظاہر ہو چکی تھی۔ پُرانے کتبوں کی عبارت پڑھنے میں وہ بڑے مشاق تھے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات میں ان کو کمال حاصل ہوتا جاتا تھا۔ پیکانی خط کی عبارتیں وہ اکثر شایع کرتے رہتے تھے۔ درحقیقت تاریخ بابل و اشور کی تحقیقات میں ان کو بڑا درجہ حاصل تھا۔ برس نمرود کی تحقیقات کا شوق ان کو اُس زمانے میں پیدا ہوا جبکہ بابل کے قرب و جوار میں جو فرانسیسی انجمن قائم ہوئی تھی اُس کو تحقیقات میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور وہ جوش جو موسیو بوٹا۔ بالس۔ اور لے یڈ کے اکتشافات سے پیدا ہوا تھا اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ رالنسن صاحب جب بحیثیت برٹش ریزیڈنٹ و کونسل متعینہ بغداد لافٹس اور لے یڈ والی جماعتوں کے اجزا کا بندوبست کر چکے۔ اور ۱۸۵۱ء میں لے یڈ صاحب کی واپسی پر شمالی ٹیلوں کا کام بدستور ہرمزد رسم کے ہاتھ میں رہنے کا انتظام کر چکے تو ان کو موقع ملا

کہ ۱۸۵۴ء کے اخیر میں دو مہینے بابل اور بورسپا کے ٹیلوں پر صرف کریں۔ لنڈن کے زمانے میں جو کچھ تجربہ اور علم اس مضمون کے متعلق اِن کو ہو گیا تھا اُس کی مدد سے پہلے اُنھوں نے برس نمرود کے اُس حصّے کو جو ٹیلے سے نکلا ہوا تھا اس قصد سے بغور امتحان کیا کہ تعمیر کا ڈول اور اُس کا پھیلاؤ اور اُس کے درجوں کی تعداد اور اُس گہرائی کا اندازہ کریں جہاں سے منار کی تعمیر شروع ہوئی ہے۔ جب یہ سب باتیں اُن کے ذہن میں آگئیں تو یہ سمجھ لیا کہ منارہ کے کسی درجے میں چاروں گوشوں پر مٹی کے اسطوانے جن پر اس عمارت کا کچھ احوال کندہ ہوگا ضرور رکھے ہوں گے۔ چنانچہ ایک مقام سے جہاں تیسرے درجے کا ایک پہلو نظر آتا تھا اینٹیں نکلوانی شروع کیں۔ ایک گھنٹے کے بعد ایک مزدور نے مٹی کا ایک اسطوانہ ٹھیک اُس مقام سے نکالا جس کو رالنسن صاحب نے ڈھونڈنے سے پہلے تیار کیا تھا۔ یہ مٹی کا خول بالکل سالم تھا۔ دوسرے گوشے میں ایک اسطوانہ اور نکلا۔ اور بعد کو ایک اسطوانے کے کچھ ٹکڑے بھی برآمد ہوئے۔ جب ان کی عبارتیں پڑھی گئیں تو ثابت ہو گیا کہ رالنسن صاحب نے بورسپا کے شہر قدیم کا وہ منارہ دریافت کر لیا جس کا نام بابلی زبان میں "اِی۔ اُر۔ ایمنی۔ آنکی" یعنے "آسمان و زمین کا سات درجوں والا گھر" تھا۔ جس سے مراد یہ تھی کہ کائنات میں یہ منارہ آسمان و زمین کے ملائے جانے کی ایک علامت تھی۔ رالنسن صاحب نے یہ بھی دریافت کر لیا کہ چھٹی صدی پیشین مسیح کے شروع میں بنوکدنسر ثانی بادشاہِ بابل نے جب اس منارے کی درستی کی تو اُس وقت اُس کے سات درجے تھے۔ جیسا کہ منارے کے اصلی نام سے ظاہر ہے۔ یہ درجے ایک کے اوپر ایک واقع تھے۔ اور اوپر جانے میں اوپر والا درجہ نیچے والے درجے سے محیط میں کم ہوتا جاتا تھا۔ سب سے نیچے کا درجہ رالنسن صاحب کے تخمینے کے مطابق ۲۷۲ فیٹ مربع تھا۔ اور اُس کی بلندی ۲۶ فیٹ تھی۔ بعض جگہ اینٹوں کے ٹکڑے ایسے ملے جن پر سیاہ نیلا اور سرخ رنگ ہونا پایا جاتا تھا۔ اب تک جس قدر زکورات یا منارے معلوم ہوئے ہیں وہ دو سے سات درجے تک کے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے مناروں میں عموماً چار درجے دریافت ہوئے ہیں۔ بعد کے زمانے میں اِن مناروں کی بلندی اور درجوں کا شمار بڑھتا گیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ایک بلند مقام مثل پہاڑ کے بنایا جاوے اور چوٹی پر پہونچنے کے لیے چکردار سیڑھیاں یا سپاٹ بتدریج اونچا ہوتا ہوا پکّا فرش ہو جس پر آسانی سے چڑھتے چلے جائیں اور چوٹی پر اُس معبود کی زیارت گاہ ہو جس کے نام پر یہ منارہ قائم کیا جائے۔

**سیزدہ سالہ محنتوں کا نتیجہ** پس معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۵ء تک متقدان بوٹا۔ پالس۔ لے یرڈ۔ رسم۔ فریزنل۔ اوپرٹ۔ لوفٹس۔ ٹیلر اور راؔلنسن نے جو تحقیقات جنوب اور شمال کے ٹیلوں کی بابت کی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزارہا پُرانے وقتوں کی چیزیں زمین سے نکالی گئیں۔ بڑی بڑی عمارات خاص کر عبادت خانے۔ بُرج اور منار۔ محل وکوٹھک دریافت ہوگئے۔ ان میں سے بعض کو مٹی نکال کر اپنی اصلی صورت میں ظاہر کردیا گیا۔ عمارات کی نوعیت اور غرض معلوم کی گئی۔ اشوری محلوں کی نسبت تو حالات بہت ہی تفصیل سے تحقیق ہوگئے اور ان مختلف زمانوں کی مختلف یادگاروں سے اگلے وقتوں کی صنعت وحرفت کا پتہ چل گیا تاریخی اور مذہبی کیفیات کے کتبے۔ گلی تختیاں جن پر روزمرہ کی کاروبار کی باتیں کندہ تھیں۔ یا اقرارنامے۔ تمسکات۔ دستاویزات تحریر تھیں۔ اور کتابوں کا وہ کثیر ذخیرہ جس کو شاہانِ اشور میں سب سے نامور بادشاہ نے جمع کیا تھا۔ یہ سب نادر اشیاء اور حالات دنیا پر روشن کردیے گئے۔

**زمانہ فترۃ** راؔلنسن صاحب جب بغداد سے وطن کو چلے گئے تو بیس برس تک شمال یا جنوب میں کندن کا کام قطعی بند رہا۔ اور یہ اچھا بھی ہوا۔ کیونکہ دوبارہ کندن شروع کرنے سے پہلے کچھ زمانہ ایسا بھی ملنا چاہیے تھا کہ جس میں یورپ کے اہل علم میکانی خط کے پڑھنے اور اس کے مطالب سمجھنے میں مہارت پیدا کرلیں اور جو ذخیرہ زمین سے باہر آچکا تھا اُس کے حالات سے بخوبی واقف ہوجاویں۔ برٹش میوزیم اور فرانس میں لووار عجائب خانے کے مہتموں نے یہ اہتمام کیا کہ جن لوگوں کو تحقیق کا شوق تھا وہ آسانی سے برآمد کردہ اشیاء کو معائنہ کرسکیں۔ چنانچہ برٹش میوزیم نے میکانی کتبوں کی نقلیں چھاپ کر تقسیم کیں۔ تاکہ جو لوگ میکانی خط کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق رکھتے تھے اپنے دماغ کا تیل اُس پر صرف کریں۔ ۱۸۷۰ء تک اُن کتبوں کا بڑا حصہ چھاپ کر شایع کردیا گیا جو ۱۸۵۵ء تک زمین سے برآمد ہوئے تھے۔ کتبوں کی زبان کے متعلق بڑے بڑے ذہین اور لائق لوگوں کے افکار بھی شایع ہوتے رہے۔ کتبوں کی زبان کو بالعموم اُس وقت اشوری زبان کہتے تھے۔ غرض میکانی خط کو پڑھنے اور سمجھنے کا سلسلہ شائقینِ علم میں بخوبی قائم ہوگیا۔ اور اب اُن عبارتوں کے ترجمے چھپنے لگے جو اسطوانوں یا تختیوں یا لوحوں یا پتھر کے ستونوں پر بادشاہوں کے حالات یا واقعات کی یادگار میں کندہ تھیں۔ اگرچہ ان ترجموں میں بعض فروعات میں خامی پائی جاتی تھی۔

لیکن انصاف پسند مبصروں کو اس میں شبہہ نہیں رہا تھا کہ بڑے بڑے واقعات ضرور صحت کے ساتھ تحقیق کر لیے گئے ہیں۔

**طوفان نوحؑ** رالنسن صاحب کے بعد کندن کا دوبارہ شوق جس شخص نے پیدا کیا وہ برٹش میوزیم کے ایک افسر جارج اسمتھ نامی تھے۔ یہ برٹش میوزیم کے صیغۂ تصویر کشی میں ملازم تھے اور بعد کو اشوری آثار قدیمہ کے محکمے میں اسٹنٹ مقرر ہو گئے۔ ۱۸۷۲ء کے اخیر میں ایک گلی تختی کی عبارت کو انھوں نے نہایت صبر و محنت کے ساتھ نکالنا شروع کیا۔ اور معلوم کر لیا کہ اس عبارت میں ایک بڑے طوفان کے حالات بیان ہوے ہیں۔ جب زیادہ غور کیا تو دریافت ہوا کہ یہ قصہ توریت کے طوفانِ نوحؑ سے بہت ہی ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ آثار قدیمہ متعلق انجیل کی مشہور انجمن کے ایک جلسے میں جو ۳ دسمبر ۱۸۷۲ء کو منعقد ہوا۔ جارج اسمتھ صاحب نے اپنے نتائج افکار کو جو اس کتبے کے مطالعہ سے پیدا ہوے تھے اس انجمن کے سامنے پڑھا۔ اور بیان کیا کہ نہایت قدیم زمانے میں ایک بڑا اسور شخص گلگمش گذرا ہے۔ اُس کے حالات میں ایک پوری تصنیف لکھی گئی تھی۔ جو اشوری کتبہ انھوں نے نہایت محنت سے پڑھا ہے وہ اس تصنیف کا محض ایک حصہ ہے۔ پھر اُنھوں نے اشوری قصۂ طوفان اور طوفان نوحؑ میں جو مشابہتیں تھیں اُن کی تفصیل کی۔ دونوں قصوں میں طغیانی سے بنی نوع انسان کا غارت ہو جانا بیان تھا۔ اس عجیب مضمون کا چاروں طرف غل مچ گیا۔ اور اخبار لنڈن ٹیلیگراف نے تحریک کی کہ کتبخانۂ اشور کے باقی حصے کو دریافت کرنے کی غرض سے ایک جماعت قوینجیک کو پھر روانہ کی جاسے اور اس جماعت کے جملہ اخراجات کا اخبار مذکور خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس تجویز کو ٹرسٹیانِ برٹش میوزیم نے منظور کر لیا۔ اور ۱۸۷۳ء میں جارج اسمتھ صاحب اشور اور بابل کے ٹیلوں کی طرف روانہ کر دیے گئے۔ ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۶ء میں دو مرتبہ ان کو وہاں جانا پڑا۔ لیکن اخیر مرتبہ کے سفر میں حلب کے شہر میں مبتلاے تپ ہو کر دنیا سے چل بسے۔ ۱۹۔ اگست ۱۸۷۶ء کو یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ ۳۶ برس کی عمر میں آثار قدیمہ کے ایسے لائق محقق کی موت اس علم کے سخت نقصان کا باعث ہوئی۔ کیونکہ جو کچھ کام اپنی زندگی میں وہ دکھاسکے اُس سے قوی امید تھی کہ پچھلے کاموں سے کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ وہ آیندہ کام کریں گے۔ قوینجیک میں دو مرتبہ قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدہا تختیاں کتبخانۂ اشور کی برٹش میوزیم میں

پہونچ گئیں۔ یہ تختیاں در اصل کتابیں تھیں۔ اس لیے علاوہ بہت سے مٹی کے اسطوانے یا خول۔ پتھر کی لوحیں جن پر حالات کندہ تھے انھوں نے مقام نمرود۔ قلعہ سرخہ اور دیگر مقامات سے نکالیں بہت سی پرانی برتنے کی چیزیں بھی نکال کر روانہ کیں۔ اس زمانے سے پہلے لے یرڈ صاحب کے جانے کے بعد ہرمزد رسم صدہا کتابی تختیاں قوئنجک کے ٹیلے سے نکال چکے تھے۔ اور آخر مرتبہ جو کچھ تختیاں اُس اشوری محل میں جہاں کتبخانہ تھا باقی رہ گئی تھیں ان کو برٹش میوزیم کے اہلکاران واٹس بج۔ اور ایل ڈبلیو کنگ نکال لے گئے تھے۔

**ایک ایشیائی محقق** جارج اسمتھ کا قیام ٹیلوں پر اس قدر کم مدت کے لیے ہوا کہ وہ کسی بڑے پیمانے پر باقاعدہ طورسے کندن نہ کر سکے۔ جو کچھ انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ قوئنجک۔ نمرود۔ اور قلعۂ سرخہ کے جو مقامات کھود کر ظاہر کرا دیے گئے تھے اُن میں ہی اِدھر اُدھر تختیوں کی تلاش میں کچھ زمین کھود کر جو کچھ ہاتھ لگا اُس کو نکال کر وطن پہونچا دیا۔ یہی کیفیت ہرمزد رسم کی تھی جنھوں نے جارج اسمتھ کے انتقال کے بعد چند سال تک شمالی اور جنوبی ٹیلوں پر کام جاری رکھا۔ برابر پانچ برس تک یعنی ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک ہر سال کا کچھ حصہ رسم نے ان ٹیلوں کی نذر کیا۔ اس ایشیائی محقق کی کوششیں ٹھکانا جانتی ہی نہ تھیں۔ اور چونکہ تجربہ بہت حاصل ہو چکا تھا اس لیے تھوڑی سی کوشش میں بھی ان کو زیادہ کامیابی میسر ہو جاتی تھی۔ مدت تک ان ٹیلوں پر قیام رکھنے کی وجہ سے انھوں نے بہت بڑا ذخیرہ پرانی چیزوں کا جمع کر لیا۔ اور بہت سے ٹیلے ایسے دریافت کر لیے جن کے نیچے پرانے آثار اور شہر دبے تھے۔ اس تحقیق کے اکتشافات میں سب سے قابل قدر چند برنجی ظروف کے ٹکڑے ہیں جن پر نہایت خوبصورت نقشیں کام ہے۔ کچھ مورتیں اور پیتل کے پتروں پر کتبے ہیں جو شاہ سلمانسر ثالث کے محل میں صنوبر کے دروازوں پر جڑے تھے۔ یہ چیزیں بلوات کے مقام سے برآمد ہوئیں جو موصل سے پندرہ میل کے فاصلے سے مشرق کی سمت میں ہے۔ پرانا نام اس مقام کا انگورانلیل تھا۔ ان برنجی پتروں پر نہایت خوبصورت تصویریں شاہ سلمانسر ثالث کے عہد کی بنی ہیں۔ اور ان لڑائیوں کے متعلق نہایت تفصیل سے لشکرگاہ کے منظر۔ اشوری افواج کا گذرنا۔ دشمنوں پر حملہ۔ قلعوں کی فتح۔ مالِ غنیمت کا حاصل کرنا۔ قیدیانِ جنگ کی گرفتاری۔ قربانی کی رسمیں دکھائی گئی ہیں۔ انھیں تصویروں سے فوج کے مختلف حصوں کی پوشاک۔ گھوڑوں کے

سازوسامان لشکرگاہ میں خیموں اور ڈیروں کی ترتیب وصف بندی - رات دن کے برتنے کے برتن۔ روزمرہ کی رسمیں اور عبادت کرنے کے طریقے ظاہر ہوتے ہیں - یہ کیفیتیں تو تصویریں دیکھنے سے معلوم ہوتی ہیں لیکن ان تصویروں پر جو عبارتیں نقش ہیں اُن سے اور بھی زیادہ حالات منکشف ہوتے ہیں - جنوب کے بعض ٹیلوں میں ہرمزدرسم نے بہت اہتمام سے کندن کیا تھا - یہاں ان کو اور بھی زیادہ کامیابی ہوئی - بابل جن ٹیلوں میں پوشیدہ تھا اُن میں سے بعض ٹیلوں کو کھود کر بہت سے کتبے نکالے - اور اس اعتبار سے ہرمزدرسم کو وہ کامیابی ہوئی جو ان سے پہلے لوگوں کو نہ ہوئی تھی۔ تاریخی کتبوں میں ان کا برآمد کردہ ایک کتبہ مٹی کے خول پر تھا جس کو بادشاہِ ایران کیرش (خورس) نے ۵۳۹ پیشین مسیح بابل پر فتح پاکر اپنی فتح کے حالات میں تیار کرایا تھا - یہ فتح تاریخ عالم کا ایک بڑا واقعہ تھا - کیونکہ اس نے بابل واشور کی تاریخ کو بالکل ہی خاتمہ کو پہونچا دیا - بابل جدید کا زمانہ ۶۲۵ ق م سے ۵۳۹ ق م تک رہا - اس زمانے کے کاروباری معاملات کی تختیاں بھی نکلیں - ان سے اور اسی قسم کی کئی ہزار اور تختیوں سے جن کو جارج اسمتھ نے اپنی موت سے چند روز پیشتر جمع کیا تھا بابل جدید کے لوگوں کے کاروبار اور ان کے قانون وضوابط کا حال معلوم ہوا - اُن کی تجارت کے طریقے جن سے اُن کی ذہانت ثابت ہوتی تھی - زندگی کے روزانہ کام اور شغل دریافت ہوگئے۔

تاریخ وادب سے جو تختیاں متعلق تھیں اُن کے مطالعہ سے اُن کے سیاسی اور حربی حالات - اُن کا شوق ملک گیری ظاہر ہوا - جو لوحیں کاروبار اور روزمرہ کی زندگی کے معاملات کی تھیں اُن سے اُنکے خرید و فروخت کے طریقے - کھیتوں کا لگان - مکانوں کا کرایہ - جائداد کا بیع و شرٰی - قرضے - بیدیا ٹھیکہ داروں کے اقرارنامے - گماشتوں کے رقعے - بیاہ اور طلاق - وصیت نامے - تبنیت نامے - مقدمات کی روداویں - حاکموں کی تجویزیں - غرض ہر قسم کے معاملات نظر کے سامنے آجاتے ہیں - اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی کسی میونسپلٹی کے دفتر کے کاغذات دیکھ رہے ہیں - بابل کے ان گلی دفتروں کے علاوہ ہرمزدرسم نے ابوحبہ کے مقام پر ایک عبادت خانے کے احاطے سے تختیوں کا ایک ایسا ہی دفتر اور برآمد کیا - ہرمزدرسم ہی کی کوشش سے ابوحبہ میں کندن کا یہ نتیجہ ہوا کہ قدیم شہر سپار کا موقع شناخت کرلیا گیا - یہ قدیم شہر پرستشِ آفتاب کا صدر مقام تھا - شمس پرستی جن لوگوں کا دین تھا اُن کو بابل کی تاریخ میں بڑا حصہ ملا ہے - ابوحبہ کے ٹیلے بہت دور تک

پھیلے تھے۔ تقریباً ۲۵۰ ۔ایکڑ زمین اُن سے ڈھکی تھی۔ عبادت خانہ جس کے احاطے سے تختیاں نکلی تھیں ہیکل شمس تھا۔ اور ۲۵۰ ۔ ایکڑ میں سے ۴۰ ۔ایکڑ زمین پر اسی عبادت خانے کا احاطہ تھا۔ اس احاطے میں علاوہ ہیکل کے چھوٹے چھوٹے معبد اور تبخانے تھے اور سکونت کے مکانات تھے جن میں عبادت خانوں کے متعلق سرشتوں کے اہلکار یا ہیکل کے خدام اور کاہن رہتے تھے۔ ہرمزد رسم نے اس وسیع عبادت خانے کے بہت سے کمرے نکالے۔ اور اُس کی محنت کا ثمرہ یہ ہوا کہ ساٹھ ہزار تختیاں ہیکل کے ایک دفتر خانے سے نکلیں۔ ان میں اکثر کاروباری معاملات کی تھیں اور کسی قدر ادبی معلومات سے بھی متعلق تھیں۔ اور یہ اسی قسم کی تھیں جیسے بادشاہِ اشور آسوربنا بال کے کتبخانے سے نکلی تھیں۔ مثلاً بعض تختیوں میں محض خدا کی تعریف تحریر تھی۔ کسی میں محض کسی بڑے واقعہ یا مجلس کی پوری کیفیت درج تھی۔ کہیں فال نکالنے سے پہلے جو عبارتیں پڑھی جاتی ہیں وہ بیان کی گئی تھیں۔ کہیں صرف و نحو کے کسی مضمون کے متعلق مثالیں بیان ہوئی تھیں۔ کہیں علوم ریاضیہ سے بحث ہوئی تھی۔ رسم نے ابوحبہ کے ٹیلے سے بہت سی تاریخی لوحیں بھی برآمد کیں۔ ان میں سب سے قابلِ قدر ایک پتھر کی لوح ہے جس کے سرے پر رب الشمس کی تصویر ہے کہ اپنے تخت پر اجلاس کرتا ہے۔ سامنے پہیے کی شکل کا ایک حلقہ رکھا ہے جس میں دو رسیاں لگی ہیں اور رسیوں کے سرے دو ملازموں نے تھام رکھے ہیں۔ سامنے ایک بادشاہ کو شمس کی خدمت میں حاضر کرتے ہیں۔ آگے آگے ہیکل شمس کا بڑا کاہن ہے اور رب کے پیچھے شمس کی ملکہ ہے جس کا نام آ لکھا ہے۔ ملکہ کی مودب چال سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی سفارشی بن کر شوہر کے پاس حاضر ہوئی ہے۔ اس تصویر کے علاوہ لوح کے دو طرف بیبلانی خط میں عبارت لکھی ہے۔ جس میں ہیکل شمس کی تاریخ اور حالات نہایت تفصیل سے بیان ہوے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ شہر سپار پر جب تباہی آنے لگی تو لوگ دین شمسی سے غافل ہوگئے اور شمس کا وہ بڑا بُت جو ہیکل میں مدت سے رکھا تھا دفعتہً غائب ہوگیا۔ لیکن بادشاہِ بابل نیبو لبیدین (۸۸۰۔۸۵۴ ق م) نے مصمم ارادہ کر لیا کہ خدا کے اس گھر کو پھر پہلی سی رونق بخشے۔ چنانچہ بادشاہ کو ایک لکڑی پر رب الشمس کی شکل بنی ہوئی مل گئی۔ اور اس شکل کے مطابق ایک نہایت تیار کرایا گیا۔ اس کتبے میں بہت سے تاریخی حالات لکھے ہیں اور دین شمسی کے اصول نہایت عجیب

بیان ہوے ہیں اور اخیر میں ایک بڑی فہرست اُن چیزوں کی بیان ہوئی ہے جو لوگوں نے نیاز ونذر میں چڑھائی تھیں - کیونکہ نیبولیدین بادشاہ بابل کا حکم تھا کہ برس کے پانچوں تہواروں پر ہیکل شمس میں نذریں پیش کی جائیں - ہرمزدرسم کو سرحدی نشان کے پتھر بھی مل گئے - ان میں ملازمین شاہی کو جو اراضیات بطور جاگیر کے ملی تھیں اُن کا ذکر ہے - اور اُن معبودوں کی علامتیں اور نشانیاں اُن میں بنائی گئی ہیں جو گویا ان عطیوں کے شاہد تھے - اور ان کی طرف سے اُن لوگوں پر لعنت لکھی گئی ہے جو اِن پتھروں کے کسی نقش کو مٹائیں یا پتھروں کو توڑدیں یا کسی قسم کی تبدیلی اُن کی عبارت میں پیدا کریں -

**پروفیسر ونسنٹ شِل** | ہرمزدرسم کی تحقیقات ختم ہونے کے بارہ برس بعد ۱۸۹۴ء میں ابوحبہ میں پروفیسر ونسنٹ شیل ساکن پیرس نے باقی مقامات کو ٹرکش گورنمنٹ کی سرپرستی میں کھودا - اس کوشش کا ثمرہ یہ ہوا کہ صدہا تختیاں علم ادب کے متعلق سابقہ ہیاکل کے دفترخانوں سے برآمد کی گئیں - چھوٹی چھوٹی مورتیں جو کسی درخت کی چھال کو تراش کر بنائی تھیں اور بعض پتھر کی سطح سے کسی قدر اُبھری ہوئی تھیں اور اُس کی ملکہ کی تصویریں نکالی گئیں - جانوروں کے بت جو بطور نذر کے چڑھائے گئے تھے - کھانے پینے کے برتن - آہنی ہتھیار - بیلن کی قطع کی منقدہ مُہریں جن پر طرح طرح کے نقش تھے اور جو مٹی کی تختیوں پر جس حالت میں کہ اُن کی مٹی کسی قدر گیلی اور نرم ہوتی تھی بیلن کی طرح پھیر دی جاتی تھیں اور مُہر کے نقش تختی پر اُٹھ آتے تھے - گویا فریقین کے دستخط ہوگئے - دستیاب ہوئیں - ان کے علاوہ بہت سی نقشیں اینٹیں ، اور مٹی کی محرابوں کے ٹکڑے نکلے - ابوحبہ میں پروفیسر شِل نے تھوڑے عرصے تک قیام کیا - لیکن ان کو اس کا اندازہ ہوگیا کہ ہیکل شمس کے کل احاطے میں عمارات کی تقسیم و ترتیب کس طرح پر واقع ہوئی ہے - نہ صرف احاطے کی عمارات کا بلکہ خاص ہیکل کے اندرونی حصوں کا حال بھی دریافت کرلیا - بالخصوص اُس حصے کا جس میں مدرسہ تھا -

**دوسرے عہد کا خاتمہ** | ہرمزدرسم نے پانچ برس کے زمانے میں جو بموجب ترکی فرمان ان کو حاصل تھا شمال اور جنوب میں بہت سے ٹیلوں کو چھان مارا تھا - کسی ٹیلے پر مدت تک اور کہیں قلیل عرصے تک مختلف نتائج کے ساتھ کام جاری رکھا تھا - برس نمرود کے مقام آتی زیدا (بیت الحق)

کے عظیم الشان عبادت خانے کے ۸۰ حجرے برآمد کیے۔ یہ عبادت خانہ شہر بورسپا کے معبود خاص نابو کے نام سے مشہور تھا۔ جو کتبے اس ہیکل میں تھے اُن میں ایک لکڑی کے خول پر جو مضمون تحریر تھا وہ قابلِ ذکر ہے۔ اس چوبی خول یا اسطوانے پر بیکانی خط میں کل حالات ہیکل کی مرمت کے جو بابل کے یونانی گورنر انیٹی آدکس سوتر کی معرفت ۲۷۰ قبل مسیح ہوئی تھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا شہادت اس بات کی ہوگی کہ سلطنت بابل کے زوال کے تین سو برس بعد تک اس ہیکل کی عظمت و بزرگی لوگوں کے دلوں میں قائم تھی۔ حلّہ سے ۱۵ میل کے فاصلے پر سمت شمال مشرق میں تل ابراہیم کے ٹیلے واقع ہیں۔ اور ولیم کے ٹیلے حلّہ سے دس میل کے فاصلے پر ہیں۔ ان ٹیلوں کا امتحان بھی رسّم نے کیا تھا۔ لیکن کوئی بڑا نتیجہ نہ نکلا۔ ہرمزد رسم نے ایک مختصر سی کتاب میں آثار قدیمہ سے متعلق اپنے کل کام بیان کیے ہیں جو لے یرڈ کے زمانہ سے شروع ہو کر اُس کندن کے آغاز پر ختم ہوگئے، جو ارض بابل و اشور میں سب سے آخر تھا۔ رسم کے کاموں کے ختم ہونے پر وجلہ و فرات کے کندن کا عہد اُن بھی ختم ہوجاتا ہے اور تیسرا عہد اس کام کا اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ رسّم اپنے اخیر کندنوں میں مصروف تھا۔ اس تیسرے عہد میں ٹیلوں کے ایک ہی سلسلے پر نہایت باقاعدہ کام کیا گیا۔

**لوحوں والا ٹیلا** ۱۸۷۷ء میں فرانسیسی نائب کونسل متعینۂ بصرہ یعنی ارنسٹ دی سرزیک نے مقام تلوح (تل لوح یعنی لوحوں والا ٹیلا) میں جو سلسلہ ٹیلوں کا تھا ان کو کھودنا شروع کیا تھا۔ تلوح وادیِ فرات کے سب سے جنوبی حصے میں واقع ہے۔ اس مقام کو سرزیک نے ہر چہار طرف دورہ کرنے کے بعد سب سے بہتر مقام تلاش و تحقیق کے لیے سمجھا۔ کبھی کبھی کسی قدر وقفہ کے ساتھ یہاں کام بالعموم مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ سرزیک کی عمر کا خاتمہ ہوا۔ سرزیک کی موت کے بعد گاسٹن کروس کی نگرانی میں کام ہوتا رہا۔

**طوفان نوح سے پہلے کی تجارت** تلوح کے ٹیلوں میں سے دو ٹیلوں کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ یہ دونوں ٹیلے سطح زمین سے پچاس سے ساٹھ فیٹ تک بلند تھے۔ ان دونوں میں جو ٹیلا چھوٹا تھا اُس سے سرزیک نے کام شروع کیا تھا۔ تھوڑے سے کندن کے بعد ایک بڑے وسیع محل کے آثار ظاہر ہوئے لیکن معلوم ہوا کہ یہ محل زیادہ پُرانے وقتوں کا نہیں ہے بلکہ تیسری صدی قبل مسیح کے شروع زمانہ کا ہے۔ گو اُن آثار کے زیادہ قدیم ہونے کی علامتیں بالکل صاف نہیں لیکن انکے ساتھ ساتھ ایک بہت پُرانی عمارت

کی نشانیاں بھی دریافت ہوتی گئیں آخر کار اس بات کا قطعی ثبوت مل گیا کہ جو آثار زیادہ قدیم نہیں ہیں وہ شاہان پہلوی کے عہد کے ہیں اور وہ ایک شاہی محل کے آثار ہیں جو کسی قدر اشوری محلوں کی وضع پر تعمیر ہوا تھا۔ لیکن اُس کی بنیادیں ایک نہایت قدیم بابلی پرستش گاہ کی عمارت پر رکھی گئی تھیں۔ اور اُس پُرانی عمارت کا کچھ سامان اُکھیڑ کر جدید عمارت میں لگا دیا گیا تھا۔ سب سے نیچے حصے کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک ۶۰۰ فیٹ مربع چبوترے پر ۴۰ فٹ کی کرسی دے کر قدیم عمارت کو بنایا گیا ہے اونچے اونچے پشتے اور چبوترے بنا کر اُن پر عمارت اُٹھانے کا طریقہ بابل میں پرانے زمانے سے لیکر اخیر تک جاری رہا۔ غرض دریافت ہو گیا کہ پُرانی پرستش گاہ چالیس فیٹ بلند چبوترے پر بنائی گئی تھی اور معبود نِن گرسو کے نام سے مشہور تھی جو شر پرلا (لاگاش) کے پُرانے شہر کا محافظ و مربی معبود تھا۔ اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ تلوح کے ٹیلوں کے نیچے شر پرلا یا لگاش کا پُرانا شہر دبا پڑا ہے۔ اس پرستش گاہ کا بانی بادشاہ اردو کا بیٹا تھا جو ۴۰۰۰ برس قبل ولادتِ مسیح گذرا تھا۔ ممکن ہے کہ اِس بادشاہ کے زمانے سے کئی صدی پہلے کی یہ پرستش گاہ ہو۔ اگر ۴۰۰۰ قبل مسیح کا بھی سمجھا جائے تو اُن قرون کے اعتبار سے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ طوفان نوح سے ساڑھے تین سو برس پہلے کا ہوا۔ لگاش کے بادشاہ اس پرستش گاہ کی نہایت عظمت کرتے تھے اور اُس کی شہرت پُرانے شہروں کے بادشاہوں میں اس قدر ہوئی کہ وہ معبود نِن گرسو کے معتقد ہو گئے اور اپنی نیاز کیشی اس طرح ظاہر کرتے رہے کہ کسی نے اس پرستش گاہ کے احاطے کو وسیع کر کے تعمیر کرایا۔ کسی نے ایسے حصوں کی مرمت کرا دی جو بوسیدہ ہو گئے تھے۔ اصلی پرستش گاہ کا کوئی حصہ بجز گوشۂ مشرق کی دیوار کے یا ایک مینار اور دروازے کے یا کہیں کہیں پُرانی اینٹوں کے ڈھیر کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ یہ دیوار بھی اُس تعمیر کا ایک حصہ ہے جو بادشاہ ار آ ؤ نے ۴۲۵۰ برس قبل مسیح پرستش گاہ کے متعلق بنوائی تھی مینار اور دروازہ بادشاہ گدآیا کا بنوایا ہوا ہے جو غالباً ۲۵۰۰ برس مسیح سے پیشتر گزرا ہے۔ اس پرستش گاہ کے کندن کے وقت کثرت سے پُرانی اشیا برآمد ہوئیں۔ جن کی مختصر فہرست یہ ہے۔ بڑے بڑے ظروف جن پر عبارت کندہ تھی۔ مُہر کے بیلن۔ بُت اور مورتیں۔ پیتل کی چیزیں جو بطور نذر کے چڑھائی گئی تھیں۔ مٹی کے برتن۔ لوہے کے اوزار۔ لکڑی کے خول۔ مخروطی چیزیں جن پر عبارت تحریر تھی۔ ان میں جو چیز سب سے قابلِ توجہ تھی وہ بادشاہ گدآیا کے نو مجسمے سنگِ سیاہ کے تھے۔ اس بادشاہ

کے زمانے میں گوشر پولا یا لگاش کا شہر خود مختار ریاست نہ تھا۔ لیکن اُس نے اپنی پُرانی شان پھر اختیار کر لی تھی۔ ان مجسموں میں بادشاہ کو یا تو کھڑے قد یا بیٹھا ہوا دکھایا ہے۔ تمام مجسموں پر از سرتا پا باریک پیکانی خط میں عبارتیں کندہ ہیں۔ جن کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجسمے بھی معبود ننگرسو کو نذر میں پیش کیے گئے تھے۔ بادشاہ آرباؤ کا بھی ایک بت اسی قسم کا دریافت ہوا جس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ گدیا نے بھی آرباؤ کی تقلید میں اپنا مجسمہ اس پرستش گاہ میں بطور نذر کے چڑھایا تھا۔ بادشاہ گدایا نے اپنے مجسمہ پر لکھوایا ہے کہ جس پتھر کا یہ مجسمہ ہے اُس کو میں نے باہر کے ملکوں سے اسی طرح منگوایا تھا جیسے کہ تانبا اور سونا اور قیمتی لکڑی عرب کے ملک سے یا صنوبر کی لکڑی شام کے ملک سے منگوایا کرتا تھا۔ یہ عبارت ظاہر کرتی ہے کہ ایسے قدیم زمانے میں بھی جو طوفان نوح سے پہلے کا یا قریب کا ہو دُور دُور کے ملکوں میں تجارت کے تعلقات قائم تھے۔

**سومری زبان کے کتبے** | جب یہ مجسمے فرانس میں پہونچے تو تمام ملک میں ان کا چرچا ہو گیا اور فرانسیسی گورنمنٹ نے ایک رقم کثیر کھندن جاری رکھنے کے لیے اور منظور کی۔ ان مجسموں پر جو عبارتیں کندہ تھیں وہ پُرانی سومری زبان میں تھیں۔ اور یہ زبان ارض بابل کے وہ باشندے بولتے تھے جو سامی الاصل نہ تھے اور قدیم سے قدیم زمانے میں اس ملک پر تصفیہ رکھتے تھے۔ سومری زبان کے کتبوں کے پڑھنے سے وادی فرات کی سب سے زیادہ پرانی سیاسی حالت سے بہت کچھ واقفیت پیدا ہو گئی مجسموں کے علاوہ لکڑی کے بڑے بڑے اسطوانے بھی برآمد ہوے جن میں ایک ایک پر دو دو ہزار سطروں کی عبارت کندہ تھی۔ ان عبارتوں سے قوم سومر کے ملکی اور سیاسی حالات اور بھی منکشف ہوے۔ اور دریافت ہوا کہ بادشاہ گدایا نے آنی نیو کا ہیکل جس نقشے کے مطابق بنوایا تھا وہ نقشہ اُسس کو کیونکر معلوم ہوا۔ بیان ہوا ہے کہ معبود ننگرسو نے خواب میں نظر آ کر بادشاہ کو بتایا کہ آنی نیو کا ہیکل ایسی ایسی وضع کا تیار کیا جائے۔ چنانچہ ان ہی ہدایتوں کے مطابق گدایا نے ہیکل تیار کرایا۔ جنوبی حصۂ بابل میں جو تمدن کی حالت قدیم زمانے میں تھی۔ ان عبارتوں سے اب اُسکی کیفیت صاف نظر آنے لگی۔ اور اہل فن سمجھ گئے کہ تمدن بابل اور اشور کی ابتدا کا پتہ اگر چل سکتا ہے تو وہ جنوب ہی کے ٹیلوں سے چلے گا۔ اور اس وجہ سے سرزیک کے زمانے سے جس قدر جماعتیں کھندن کے لیے روانہ کی گئیں اُن کی کارگزاری کے لیے جنوب ہی کے ٹیلے اکثر تجویز کیے گئے۔ تلوح میں جو کام

کیا گیا۔ اُس نے صرف بادشاہ کدایاکے زمانے کے واقعات پر روشنی نہیں ڈالی بلکہ ایسے پرانے کتبے اور چیزیں بھی برآمد ہوئیں جن سے اس بادشاہ سے بھی پہلے کے حالات دریافت ہوے۔ چنانچہ ایک لوح کا ٹکڑا نکلا جو کسی ہیکل میں بطور نذر کے پیش ہوا تھا۔ اس لوح کے ایک رُخ پر معبود نن گرسو کی تصویر تھی۔ ایک ہاتھ پر دو سر والا عقاب بیٹھا تھا۔ یہ عقاب شرپلا کے شہر کا نشانِ علَم تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک جال تھا جس میں دشمنوں کے سر جمع تھے۔ اس تصویر کے ساتھ جو عبارت کندہ تھی اُس میں آدنہ کے شہر والوں کی لڑائی کا ذکر تھا جس میں بادشاہ اایتوم کو جس کا زمانہ ۲۹۰۰ قبل مسیح دریافت ہوتا ہے فتح ہوئی تھی۔ اس موقع پر فریقین میں جو صلح نامہ ہوا تھا اُس کا مضمون بھی بیان ہوا ہے۔ ایک اور لوح بھی اس قسم کی نکلی جو بادشاہ اایتوم کے دادا ارنینا کے وقت کی تھی۔ اس بادشاہ یعنی ارنینا نے سنگ سرخ کی ایک لوح پر اپنا نام اور اپنی زندگی کے واقعات کندہ کرائے اور ایک عقاب کی تصویر بنوائی جس کا سر شیر کا سا تھا اور جو دونوں پنجوں میں دو شیر پکڑے ہوے تھا معبود نن گرسو کے ہیکل میں چڑھائی تھی۔ باقی لوحیں جو نذر میں چڑھائی گئی تھیں پیتل کی تھیں۔ ان میں ایک لوح میں ایک معبود کی تصویر تھی جس کے ہاتھ میں مخروطی شکل کی کوئی چیز ہے۔ مخروطی شکل کی میخوں پر بیلوں کی تصویریں بھی نکلیں۔ ایک مرد اور عورت کی تصویر نکلی جو ٹوکرے لیے جاتے ہیں۔ عبارتوں کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ان ٹوکروں میں نذر نیاز کی چیزیں ہیں۔

(از انسٹی ٹیوٹ۔ علی گڈھ) عنایت اللہ بی۔ اے

دل کو خلوتگہِ جانانہ بنا رکھا ہے ۔۔۔ ہم نے کعبے کو صنم خانہ بنا رکھا ہے

خوش نصیبی ہے جو اُس زلف کا سودائی ہو ۔۔۔ کام تیرا دلِ دیوانہ بنا رکھا ہے

اُن سے یوں ملتے ہیں جیسے کبھی کیا ہی نہ تھا ۔۔۔ ہم نے خود آپ کو بیگانہ بنا رکھا ہے

گرمیِ حسن سے محفل میں جلی جاتی ہے ۔۔۔ آپ نے شمع کو پروانہ بنا رکھا ہے

معنیِ عشق ہیں معشوق سے مر کر مل جائے ۔۔۔ مختصر بات کو افسانہ بنا رکھا ہے

عشق میں ہم ترے ممنون کرم ہیں بیحد ۔۔۔ دل میں گھر اپنے غم جانانہ بنا رکھا ہے

اک شہِ حسن کو ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں جگر
اس لیے بھیس فقیرانہ بنا رکھا ہے

جگر صدیقی

# قبائے رنگیں

(بسلسلۂ الناظر ماہ دسمبر ۱۹۱۶ء)

## فصل (۵۴)

## بلد الحرام یا قحط و قہر کی نمائش گاہ

سعید کی زبانی حجاج کی ظلم آفرینی اور بے حرمتی خانۂ کعبہ کے حالات سن کر حسن سخت متحیر ہوا کہ ایک مسلمان ایسی بدعتوں کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ اب یہ لوگ سوقِ شہر میں تھے۔ حسن نے سعید سے کہا "آپکی مہربانی اور خلوص کا شکریہ ادا کرنے سے میں قاصر ہوں۔ کہ معمولی توجہ سے آپ نے کام نہیں فرمایا۔ بلکہ منزلِ مقصود تک رہبری کی تکلیف بھی گوارا کی۔ مگر اب زیادہ زحمت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ خدا آپ کو جزائے خیر عطا فرمادے۔"

سعید "ابھی میں مسجد الحرام تک آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اور وہاں سے بیت اللہ کا طواف کر کے واپس ہوں گا۔"

اس کے بعد حسن احترام قربتِ کعبہ کے خیال سے اونٹ سے اتر پڑا۔ سعید بھی فوراً اتر پڑا۔ ابھی دونوں مسجد میں نہ داخل ہونے پائے تھے کہ ایک گھن گرج آواز سنائی دی۔ سعید نے حسن کی طرف دیکھ کر کہا "ہماری تسبیح و تہلیل کی یہ صدائے بازگشت ہے اور جس عظمت و جلال کے ہم گیت گا رہے ہیں اُسی بلندی کی طرف اُڑ اُڑ کر یہ کبوترانِ بامِ حرم (اُڑتے ہوئے کبوتروں کی طرف اشارہ کر کے) شکوہ سنج ہیں کہ تیرا خاص عطیہ امن و امان جس کی دنیا قسم کھاتی تھی ان ظالموں نے ہم سے چھین لیا ہے۔ اور یہ حسرت زمزمہ خواں ہیں

تو اے پناہ دہِ بے پناہاں می دانی     تپیدنِ دلِ مرغانِ بامِ کعبہ را

حسن "خیر۔ ان کے غیر مفہوم طرزِ کلام اور حالاتِ گرد و پیش سے یہ اخذ کرنا تو ہمارا کام ہے۔ لیکن اُن بولنے والے طائرانِ حرم کی داستانِ مظلومی البتہ نہایت دردناک اور قابلِ عبرت ہے جو اس تاریکِ ظلم

کے اصلی صید ہیں۔"

پھر اثنائے راہ میں حسن نے بھوک کی شکایت کی اور کہا "چلیے کہیں ٹھیکر کچھ کھائیں۔"

سعید (ہنس کر) "آج کل مکہ میں کھانا، اور اس افراط سے کہ دوکانوں پر بکتا پھرے؟ اصل یہ ہے کہ ہم بیرونی اشخاص یہاں کے مصائب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ باہر کی رسدیں قطعاً بند ہیں۔ سنتا ہوں کہ بیس درم سیر جو کے آٹے کا بھاؤ ہے اس پر بھی ملتا نہیں۔ حال کا ذکر ہے کہ انصارِ ابن زبیر کئی فاقوں سے تھے۔ باوجود تلاش و فکر اشیاء خوردنی فراہم نہ ہو سکیں۔ اور بھوک ناقابلِ برداشت حد تک پہونچی۔ بحالتِ مجبوری ابن زبیر نے اپنی سواری کا ناقہ ذبح کر کے سب کو کھلایا تب سبھوں کی جان میں جان آئی۔ (پھر حسن کے کان کے قریب منہ لیجا کر آہستہ سے کہا) لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ابن زبیر کا مسکن جو، خرمہ، ستو، پنیر اور روغنِ زیتون کا انبار خانہ بنا ہوا ہے، جو کمال پیش اندیشی کر کے اسی دن کے خوف سے جمع کر لیا گیا تھا۔ ورنہ کہاں تک بھوک پیاس کا ضبط کرتے۔ لیکن حجاجی گروہ اس غلط فہمی میں ہے کہ یہ بالکل بے مایہ ہیں۔ اور آج نہیں تو کل بھوک پیاس سے تنگ آ کر بیعت قبول کر لیں گے۔ محض اسی خیال سے انھوں نے اس وقت تک کوئی جارحانہ حملہ نہیں کیا ہے۔"

حسن (شوخی سے) "بس تو اسی انبار خانے کی طرف چلیے کہ اب بھوک کی وجہ سے تابِ ضبط باقی نہیں رہی۔ اور بحیثیت مسافر ہم مستحق بھی ہیں۔ مگر نہیں۔ شفقت اور غرضِ مہ. ور یہ نظر کی جائے تو ہمارا کچھ حق نہیں۔ (بلال سے) بہرحال، بلال خشک و تر جو کچھ کھانے کو مل جائے تھوڑا بہت لے آؤ۔ کھا لیں تب چلیں۔"

بلال اُدھر گیا اور یہ دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ لحظہ بھر میں بلال ... روٹیاں اور ستو (سویق) لے آیا جو بعجلت تمام کھایا گیا۔ اس کے بعد سب مسجدِ حرام کو آئے۔ بلال گھوڑے اور اونٹوں کی نگہداشت کے لیے بیرون حرم ٹھہر گیا۔ سعید اور حسن زیارت و طواف کے شوق میں بھرے ہوئے مستانہ وار صحن مسجد میں داخل ہوئے۔ بعد فراغِ طواف ابن زبیر کے مستفسر ہوئے۔ معلوم ہوا سمتِ کعبہ میں مصروف سجدہ و صلوٰۃ ہیں۔ سعید بعد فراغتِ طواف اپنے معسکر کو روانہ ہوا۔ اور حسن ابن زبیر کا انتظار کرنے لگا۔ اس فرصتِ انتظار میں گوناگوں خیالات کا ورود اُس کے دماغ میں شروع ہوا۔ کبھی اس معاملہ پر غور کرتا تھا کہ ایسا تو نازک وقت ابن زبیر اور اُن کے رفقاء کو درپیش ہے اور میں

خطبہ و نکاح کے خوش آیند مرحلے کو سَر کرنے آیا ہوں۔ آخر گفتگو کس پیچ پہ ہو؟ اور اسلوبِ تذکرہ کیا اختیار کیا جائے؟ کہ ذکر چھیڑ کر مفت ندامت نہ حاصل ہو۔ اور پھر اس سے اُکتا کر کبھی مدینہ کے سواد اور کوچۂ محبوب کے خیال سے اپنے کھوئے ہوئے دل کی یاد تازہ کر لیتا۔ اور سوچتا کہ اس کام سے کسی طرح جلد سے جلد فراغت ملتی تو کوچۂ دلدار کی گلگشت سے شاد کام ہوتا۔ کبھی عزیزہ کا خیال آتا۔ کہ ابن حنفیہ کے یہاں سے اُس نے سیدھا مدینہ کا ہی رخ کیا ہوگا۔ کیونکہ سمیّہ کی تنہائی اُسے زیادہ غیبت کا موقع نہیں دے سکتی۔ البتہ جو ناکامی اُسے آج حاصل ہوئی یقیناً اُس سے اُس کا قلب متاثر اور نرم ہوا ہوگا۔ اور یہ میرے مفید مدعا ہے۔ کیونکہ ایسے سنگدل اشخاص سے بحالتِ اطمینان و کامیابی توقع خیر نہیں ہو سکتی۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ اُن کی نظر کو افسردہ خاطری اور ناکامی ملاءِ اعلیٰ سے موڑ کر فرشِ زمین پامال کر لے تب ہم خاک نشین نظروں میں آئیں۔"

حسن ان خیالات میں ایسا محو تھا کہ اُسے مطلق ہوش نہ رہا کہ مسجد میں کون آیا اور کون گیا کہ دفعتہً ایک دھماکے کی آواز نے اُسکے خیالی سلسلے کو توڑ دیا۔ یہ آواز کہیں دُور کی نہ تھی بلکہ آواز کے ساتھ جو نظر بلند ہوئی تو حرم کے کبوتر اُڑتے ہوئے نظر آئے۔ اور ایک بڑا پتھر دیوارِ کعبہ سے ٹکرا کر زمین پر آ رہا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مگر تعجبناک امر یہ تھا کہ اُس نے لوگوں کو اس کی جانب بالکل غیر ملتفت پایا۔ فوراً دل نے یہ توجیہ کی کہ "سنگ آمد و سخت آمد" عادی ہو گئے ہیں۔ نکل کر کہاں جائیں۔ ارضِ حرم اور رفاقت ابن زبیر سے انحراف ان کے حوصلے، ہمت اور شرم و غیرت کے خلاف ہے۔

ساتھ ہی اُس کا خیال گیا کہ دیگر حاضرینِ حرم تو ہوشیار اور چوکنے رہتے ہیں مگر ابن زبیر جو عین دیوارِ کعبہ سے ملصق مصروفِ سجدہ و صلوٰۃ ہیں۔ مبادا! اس سنگِ بیداد کا نشانہ نہ بن جائیں۔ اس خیال سے اُسکے قلب میں ہیجان ہوا۔ اور وہ اُٹھ کر حطیم و حجرِ اسمٰعیل سے گزرتا ہوا زمزم کی طرف آیا۔ جہاں چند آدمیوں کو کھڑا ہوا پایا۔ اور اُن سے کچھ فاصلے پر سمتِ کعبہ میں ایک شخص بے حس و حرکت سجدے میں پڑا ہوا بھی نظر آیا۔ اُس نے بطور رفع اشتباہ اُن سے دریافت کیا۔ اُن میں سے ایک شخص متبسم ہو کر بولا "تم نو وارد مکہ سے نہیں معلوم ہوتے ہو، ورنہ اس تاباں و درخشاں وجود کی تنویر و تجلی سے تمھارا ذہن و دماغ تاریک و غیر منعکس نہ ہوتا۔"

حسن نے منفعل ہو کر کہا میری سکونت بیشک یہاں کی نہیں۔ اور نہ مجھے پہلے کبھی امیر کی زیارت کا

شرف حاصل ہوا۔ البتہ اُن کے محامد اخلاق، ریاضاتِ شاقہ اور تقوائے خالص کا شہرہ ضرور سنتا تھا۔ مگر اس ساعتِ سعید میں اُس نفس ذکی اور وجودِ مقدس کو بچشم خود دیکھ رہا ہوں۔ جس کی ولادت گروہ مہاجرین کے لیے ایک عام نوید مسرت لائی تھی اور کفار کے دیگر مفوات کی طرح اس پیشین گوئی کی مبطل تھی کہ "مہاجرین کے یہاں آیندہ کوئی اولاد نہ پیدا ہوگی۔"

دوسرا شخص (منہ سے بات چھین کر) "آپ اُن مجاہدات اور جبر علی النفس کی روایات سے کہاں واقف جو امیر کے عادات مستمرہ میں داخل ہیں۔ مجھے زیادہ شرف حضوری حاصل رہتا ہے۔ میں نے کوئی رات ایسی نہیں دیکھی جو قیام و قعود میں اور بہ استثنائے تین دن کے پورا مہینہ حالت صوم میں نہ گذرا ہو۔ پس صائم الدہر اور قائم اللیل کے الفاظ کا موضوع لہٗ اگر کوئی ذات ہو سکتی ہے تو یہ ذاتِ گرامی ہے۔"

حسن "پھر توفیق اور تسکینِ ربانی ایسے مرتاض اور پاکیزہ خو بزرگوں کو نہ حاصل ہوگی تو کیا ہم ایسے گنہگاروں اور ناشکروں کو ہوگی۔"

یہ لوگ ابھی اذکار میں مصروف تھے کہ پھر ایک گرج محسوس ہوئی۔ اور ایک پتھر دیوار کعبہ سے متصادم ہو کر ابن زبیر کے جائے سجدہ کے قریب آگرا۔ اس مرتبہ حسن کو پتھر کے گرنے سے تو کم مگر ابن زبیر کے قریب گرنے سے بہت زیادہ وحشت ہوئی۔ اور اُس نے اپنے مخاطب سے کہا۔ "اس مقام پر صلوۃ و سلام امیر کے لیے کس قدر مخدوش اور موجبِ خطرہ ہے۔"

متکلم "ہم نے بارہا اس خطرے کو امیر کے گوش گذار کیا مگر وہ اسے ذرا خاطر میں نہیں لاتے۔"

حسن "اصل میں اُن کا حارس و نگہبان محافظ حقیقی ہے۔"

متکلم "اے شخص اجنبی تو سچ کہتا ہے۔ اس حفاظتِ غیبی کا تماشا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے گذشتہ سال سیلاب کے موقعہ پر جبکہ حرم کے ہر چہار جانب سوائے ماء آب کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور کسی بشر کی قدرت نہ تھی کہ اُس میں پیر رکھ سکے۔ مگر ایسی حالت میں بھی امیر کے معمولات طواف و صلوۃ فی المسجد میں ذرا فرق نہ آیا۔ وہ طوفان جو دوسروں کے لیے ہمت شکن تھا امیر کا مزاحم اور خارقِ عادت نہ ہو سکا۔"

---

# فصل (۵۵)

## عبداللہ ابن زبیر

شخص مخاطب امیر کے محامد و مناقب کے بیان میں ایسا رطب اللساں تھا کہ پہلے تو حسن کو اُس کی شوریدگیِ بیان پر حیرت ہوئی۔ کیونکہ دورانِ گفتگو میں وہ حسن کے لیے سوالات توضیحی کے مواقع لاتا تھا۔ اور خواستگارِ استفسار ہوتا تھا کہ روایات تقویٰ و طہارت، اعمال و اشغال، سخاوت و شجاعت کو طولِ کلام حاصل ہو۔ مگر اُس کے حیرت و استعجاب میں کمی ہوتی جب اس رمز کو وہ قیافتاً سمجھا کہ یہ شخص امیر کا مویدا ور ارادتمندِ خصوصی ہے۔ اور ایامِ حرب میں اپنے قائد کی تطویلِ اوصاف بھی ایک تدبیر ہے۔ ترقی جماعت، توسیعِ انصار اور اشاعتِ خیال کی۔ خود متکلم کی وجاہتِ ذاتی اور علوِ ظرف کا تجربہ بھی اُسے اُسکے اندازِ کلام اور کارِ مفوضہ سے ہو گیا۔ کیونکہ اس کا اہل کوئی عامی..... نہیں ہو سکتا۔

حسن اور شخص مخاطب کھڑے تھے کہ ابن زبیر کی آواز کہتے ہوئے سنائی دی " ابن صفوان! معاً شخص مخاطب اطاعت و انقیاد کی ادا سے " لبیک یا امیر المومنین " کہتا ہوا بڑھا۔ اور یہ راز آشکارا ہوا کہ عبداللہ ابن صفوان بھی یہی بزرگ ہیں۔ ابن زبیر کے ساتھ ان کی اخلاص عقیدت اور ہوا خواہی کی حکایت حسن پہلے سن چکا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ ابن زبیر کی حمایت اور تائید میں اُس نے اپنے مصالحِ ذات اور عیش و آرام کو خیرباد کہہ رکھا ہے۔

اُس کے چشم و ابرو۔ چہرے کی ساخت اور قیافۃ الوجہ۔ تقلید فی الرائے۔ پختگی عزم اور قوتِ ارادہ پر دال تھے۔ اور اُس کی شصت سالہ کہولتِ عمر اُس کی پختہ مغزی پر گواہ تھی۔

ابن زبیر نے سجدے سے سر اُٹھا کر اپنا عمامہ درست کیا اور ابن صفوان سے کچھ باتیں کہتے ہوئے اُٹھے۔ اور اُٹھ کر چلے۔ حسن " السلام علیک یا امیر المومنین " کہکر مصافحہ کے لیے بڑھا۔ حسن کو جوابِ سلام دیتے اور احوال پرسی کرتے ہوئے جلال و وقار کی شان سے آہستہ آہستہ روانہ ہوئے۔ حدودِ مسجد حرام سے گذر کر ایک مکان میں داخل ہوئے جو وسیع صحن و رقبے کو محیط تھا۔ ابن زبیر کے پیچھے ابن صفوان اور ان دونوں کے نقشِ قدم پر حسن تھا۔ حسن کو اپنے مدعا و مقصد کی فکر مزید

تھی - مگر موقعہ دمل سے مجبور تھا۔

ابن زبیر کے مکان میں داخل ہوتے ہی جو لوگ جہاں جہاں پر تھے مودب اور ساکت ہو گئے۔ امیر صدر نشست میں جا کر فروکش ہوے۔ بعد ازاں لوگ حواشی میں گرداگرد آ بیٹھے۔ جو لوگ اندرون مکان موجود تھے وہ، اور جوق جوق لوگ باہر سے آتے گئے۔ یہاں تک کہ مکان بھر گیا۔ ایک نوجوان جس کا آغاز عنفوان تھا آ کر امیر کے ایک پہلو میں جاگزیں ہوا۔ جس کی شباہت بالکل امیر سے ملتی جلتی تھی۔ بعد ازاں دو نو عمر اور آئے اور دوسرے پہلو میں آ بیٹھے۔ باوجود اس قدر اجتماع کے محفل پر ایک عام سناٹا طاری تھا۔ "کانَ علیٰ رؤسہم الطیر"

سب لوگوں کے ساتھ حسن بھی ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اور مجمع پر جو اُس نے نظر کی تو آفاقی بجز اس کے اور کوئی نہ تھا۔ اس خیال سے اُس نے قصد کیا کہ ٹل جائے۔ اسی ارادے میں تھا کہ ابن صفوان نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلا یا۔ وہ اُٹھ کر اُن کے پاس جا بیٹھا۔ تو ملتفت پا کر حسن نے اُس سے کہنا شروع کیا۔" میں عرصے سے آپ کے اوصاف کا شہرہ سُنا کرتا تھا۔ عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ ملاقات بھی ہو گئی۔

**ابن صفوان**: "کیا از راہِ مہربانی آپ اپنا نام ونشان اور قبیلہ کا پتہ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

حسن نے مختصراً اپنا نام ونشان بتا کر کہا:" مگر اپنے شان نزول کے لیے موقعہ کا متلاشی ہوں جو بوقتِ فرصت بہ اُمید چارہ سازی عرض کروں گا۔"

بعد ازاں اُس نے امیر کے ہم نشینوں کی نسبت ابن صفوان سے سوال کیا:" کیا یہ امیر کے فرزند ہیں؟"

**ابن صفوان**:" دائیں جانب جو بیٹھے ہیں وہ عروہ بن زبیر امیر کے بھائی ہیں۔ اور بائیں جانب دونوں صاحبزادے حمزہ و حبیب ہیں۔ اور اسی رُخ ذرا فاصلے سے نیچی نظر کیے ہوے جو صاحب بیٹھے ہیں وہ امیر کے تیسرے فرزند زبیر بن عبداللہ ہیں۔ جو فی الواقع اہلیت وصلاحیت کا مرکز ہیں۔ اور اپنے فضل وکمال، زہد وورع کے اعتبار سے امیر کے حقیقی جانشیں کہے جا سکتے ہیں۔" اسکے بعد اُس نے یہ کہکر معذرت کی" یہ اجتماع اس وقت ایک امرِ اہم کے تصفیہ کے لیے ہُوا ہے۔ حضارِ مجلس، اکابرینِ قریش، اور رؤسائے قبائل ہیں۔ مقاصدِ اجتماع کے سلسلے میں مجھے بھی امیر سے

قربت و اتصال کی ضرورت ہے۔ پس میں افتراق کی معافی چاہتا ہوں"۔ یہ کہکر وہ اُٹھا اور امیر کے قریب جا بیٹھا۔

## فصل (۵۶)

## شرکاء مجلس کا مظاہرۂ اختلاف

حاضرین میں سے ایک شخص اُٹھا اور امیر کی طرف خطاب کرکے گویا ہوا۔ "اے امیرالمومنین! خدا کا شکر و احسان ہے کہ اُس نے ہمیں آپ کی تصدیقِ دعوت اور معرفت احقیت کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اس حق و یقین کی ہدایت سے ہم نے آپ کے ساتھ تمام تکالیف و مصائب میں شرکت کی جدال و قتال میں شانے سے شانہ ملائے رہے بلکہ اکثر پیش قدمی کرکے سینہ سپر ہوئے۔ مگر اب فاقہ کی مصیبت اُٹھانے اور بھوک کی کڑیاں جھیلنے کی تاب ہم میں نہیں رہی۔ بس یا ہمیں اجازت دیجیے کہ اصحابِ خروج (حملہ آوروں) کی اطاعت کریں۔ یا خارج البلد ہو جائیں"۔

حسن اس تقریر کو سُن کر سمجھ گیا کہ ان کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ نفاق و انتشار ان میں دخیل ہو رہا ہے۔

ابن زبیر نے تحمل و وقار کے لہجے میں قائل کی طرف خطاب کرکے فرمایا۔ کیا بیعت کے وقت "بِأَمْوَالِنَا" و "أَنْفُسِنَا" تمہارے الفاظ نہ تھے؟

**قائل**:- بیشک۔ یہ ہمارے ہی الفاظ تھے۔ مگر اس طوالت کی ہمیں اُس وقت امید نہ تھی۔ اور ہم ان شدائد کو ذرا خاطر میں نہ لاتے، بشرطیکہ ہمیں کچھ مآلِ کار خاطر خواہ نظر آتا"۔

**ابن زبیر**:- اس تقریر کے وقت کیا تم نے اپنے اس دعوے سے رجوع اختیار کیا کہ تم ... عرب ہو؟ جس عرب کی شان یہ ہے۔

إِذَا هَمَّ أَلْقَى بَيْنَ عَيْنَيْهِ عَزْمَهُ ۔۔۔ وَنَكَّبَ عَنْ ذِكْرِ الْعَوَاقِبِ جَانِبًا

اور اسلام سے بھی رجوع کیا جو اعلائے کلمۃ اللہ مومنین کا سب سے بڑا فرض قرار دیتا ہے "وَكَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا" کی عام بشارت سے مومنین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ خیر اب تم جو راہ چاہو اختیار کرو۔

؎ بوقت ارادہ اپنے نصب العین کو پیش نظر سمجھ لیتا ہے اور پس و پیش کے خیال کو قریب پھٹکنے نہیں دیتا۔

میں تمہارا ہمزاحم نہیں۔ مجھے اللہ کی تائید اور اسلام کا سہارا کافی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس قول میں ابن صفوان بھی میرا ہمنوا ہے"۔

امیر کی زبان سے ابن صفوان کے نام کا ادا ہونا تھا کہ وہ جوش سے بے قابو ہو کر سرو قد کھڑا ہو گیا۔ حمیت و غیرت کے جذبات اُس کے چہرے سے عیاں تھے!۔ آخر، امیر کو مخاطب الیہ قرار دے کر اُس نے کہا" اے امیرالمومنین! جو اعتماد میری جانب حضرت نے منسوب فرمایا۔ بشرطیکہ میں اُس پر قائم رہوں میرے لیے موجبِ نجاتِ دارین ہے۔ پس میں اُس خدا سے جو انسانی ارادوں میں جزم و تصمیم کا واہب ہے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھے برکتِ عزم عطا فرمائے۔ اطاعتِ امیر سے انحراف نہ کروں یہاں تک کہ میری روح جسم سے جدا ہو جائے۔ قسم ہے وحدہ لاشریک کی کہ انحراف و روگردانی سے بدترین معصیت کوئی نہیں۔ کیونکہ یہ انحراف عین ارتداد ہے۔ جس کی سزا خلود فی النار ہے"

ابن صفوان یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اختلافِ رائے جو ابتک کن پھسکیوں میں ہو رہا تھا آوازِ بلند ہونے لگا۔ حتیٰ کہ ایک شور و انتشار اور مجلس میں عام بے ترتیبی پیدا ہو گئی۔ بعض ابن صفوان کے ہمزبان تھے۔ اور بعض خلاف۔ مگر زیادہ گروہ اختلافیوں کا تھا۔

اور بدر عمری کے کلام پر اوروں کا اعتراض ابن صفوان سے معاذ اللہ ... (۱۸)

اس ہڑ بونگ کو دیکھ کر حسن نہایت متاسف ہوا۔ شور و شغب کم کرانے اور کچھ لوگوں کو متوجہ کر کے کہنے لگا" مرحبًا بک یا ابن صفوان! صد رحمت تجھ پر اے ابن صفوان! حقیقت یہ ہے کہ تو سچا متبع اسلام اور مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔ تیری صداقت ایسی اٹل ہے کہ منجنیق کی سنگباری اُسکو ڈھانا چاہتی ہے مگر تیرا کردار تیری اس گفتار کا ترجمان ہے کہ جس طرح حرمتِ کعبہ اس رمی حجار (سنگ اندازی) سے زائل نہیں ہو سکتی اُسی طرح صداقت قلب مسلم غیر منفعل شے ہے۔ تیرا یہ رسوخِ عزم نتیجہ ہے امیرالمومنین کی صحبت سے اثر پذیری کا اور ان کے مرتبہ و منزلت کے عرفان کا۔ کیونکہ وہ اولیٰ بالخلافۃ ہیں۔ اولویت کے ثبوت کے لیے یہ کوئی ادنیٰ بات نہیں ہے کہ عثمان ذی النورین نے روز شہادت احقین کے ذکر میں اُن کا بھی نام لیا تھا۔ تو وہ نہیں ہے کہ مفہوم خلافت کو سمجھکر دنیاوی دبدبہ و حشمت کو خاطر میں لائے عبدالملک ابن مروان اور امیرالمومنین کے مابین اس فرق کو کون نہیں جانتا کہ اُنکو فوج اور خزانے کی قوت حاصل ہے اور یہاں صرف صوم و صلوٰۃ کی برکت۔ معاشر المسلمین! تم کہہ سکتے ہو کہ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کس قوت سے کام لیا ہے اور اہلِ عالم کی تسخیر قلوب کی ہے؟ اس میں شک

نہیں کہ قبل از حکومت عبد الملک کا شمار فقہائے مدینہ میں تھا مگر باپ کی خبر مرگ پاتے ہی اور خلافت کی بشارت سن کر قرآن کو بیکبیک بیا ختہ کہہ اٹھا " ہذا فراق بینی و بینک " ۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ ان سب کو چھوڑو۔ تم نے امیر المومنین سے عہد بیعت کیا ہے۔ تم جماعت قریش سے ہو جو اہل حماسہ مشہور ہیں۔ بس کیا تمہاری شایان شان یہی امر ہے کہ ایسے نازک وقت میں اُن کے ساتھ بدعہدی کرو کیا ابن صفوان کا طرز عمل تمہارے لیے قابلِ تقلید مثال نہیں ہے ؟"

حسن یہ کہہ رہا تھا اور حمیت وغیرت کی سرخی سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اور عرق سے اُسکی پیشانی پرنشاں ہو رہی تھی۔ مجمع کا رنگ دیکھ کر وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ کوئی جادو ان پر کارگر نہیں ہو سکتا۔ مگر اُسکے جذبہ شرافت سے یہ بعید تھا کہ اُس قولِ حق سے اپنی زبان بند رکھتا۔ جو کسی ضعیف کے حق میں ممکن الانتفاع ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ غریب الدیار تھا لہذا ہر شخص کو اُسکی طرف توجہ ہوئی۔ ابن زبیر کو اپنی جگہ پر حیرت تھی کہ یہ فرشتۂ غیبی مجسمۂ غیرت کہاں سے آیا۔

الحاصل حسن کی خاموشی کے بعد شور و غوغا زیادہ بڑھا۔ اسی دوران میں ایک شخص نے اُٹھکر کہا۔ "اے مرد غریب۔ تو اپنی گفتگو میں حق و صواب سے متجاوز نہیں ہوا۔ نہ ہمیں بیعت سے انکار ہے نہ ہم یہاں سے بلا اجازت قدم اُٹھائیں گے۔ مگر غور طلب امر یہ ہے کہ بھوک پیاس کی تکالیف اور بے مائگی نے ہماری تاب و توان اور زور و قوت کو بالکل سلب کر لیا ہے۔ ایسی حالت میں ہم میں جدال و قتال کی جو قابلیت باقی رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمارے جوہر ذاتی "قلیل اذا عدو، کثیر اذا شدّو" کی کی قلب ماہیت ہو کر "کثیر اذا عدو، قلیل اذا شدّو" کی نوبت آگئی ہے۔ کوہ شکن منجنیق بیت اللہ اور بیوتِ انسانی کو اُدھر ڈھائے دیتی ہے مگر اس قتل گاہ سے پرے حجاج نے رایۃ الامان (پناہ کا جھنڈا) نصب کیا ہے۔ پس ان حالات کی موجودگی میں اے شخص خود تیرا کیا فتویٰ ہوگا کہ امن و امان کی راہ نہ اختیار کی جائے۔"

اس کے بعد ابن زبیر کی طرف توجہ کر کے بولا۔ "آپ عبد الملک ابن مروان سے بذریعہ مراسلت اس معاملہ کو کیوں نہ طے کیجیے۔ ممکن ہے تبادلۂ خیال سے صلاح و فلاح کی کوئی صورت نکل آئے۔"

ابن زبیر کا رنگ عبد الملک کا نام سنتے ہی متغیر ہو گیا۔ اور غیر معمولی لہجے میں اُنھوں نے جواب دیا۔ "مکتوب میں کیا صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ ابتدا کس نام سے کی جائے؟ کیا

"من عبداللہ امیرالمومنین الی عبدالملک ابن مروان" جس مکتوب کا سرنامہ ہو اُسے عبدالملک دیکھنا گوارا کر سکتا ہے ؟ یا "عبدالملک ابن مروان امیرالمومنین - من عبداللہ" لکھنے کی اجازت میرا ضمیر مجھے دے سکتا ہے ؟ قسم ہے اُسکے عظمت وجلال کی آسمان مجھ پر پھٹ پڑے یہ گوارا ہو جائے گا مگر یہ نہ گوارا ہوگا"۔

اسکے بعد پورے مجمع پر نظر ڈالی اور کہا "ایہا المسلمین! تم کو اپنے اپنے نفس کا اختیار ہے تم جس امر سے بھاگ رہے ہو - میں یا کوئی اُس پر تمھیں مجبور نہیں کر سکتا - رہا میں - تو میرا مالک و مددگار مسبب الاسباب ہے جس کی شان ہے - یجیب المضطر اذا دعاہُ - فہونعم المولیٰ ونعم النصیر"۔

ابن زبیر یہ کلام ختم کرکے ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ مجمع چھٹنے لگا - یکایک حمزہ و حبیب اُن کے پہلوئے چپ سے یک زباں ہوکر بولے "کیا سب کی طرح ہمیں بھی اپنی بابت اختیار حاصل ہے ؟" یہ سنتے ہی ابن زبیر نے اُن کی طرف دیکھا - آنکھیں پُرنم ہوگئیں مگر قلب کو روک کر اور استقلال سے کام لیکر جواب دیا "بیشک - تم بھی راہِ امن اختیار کرو - میری موت کیوں مرو"۔ اتنا کہنے کے بعد اُن کی آواز میں گرفتگی پیدا ہوگئی - اس وجہ سے ذرا سکوت کیا - اور پھر حسرت سے زبیر کی جانب پھر کر بولے "بیٹے تم بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ جاؤ - کیونکہ تمھیں ابھی گلشنِ حیات کی بہت بہار دیکھنی ہے"۔ زبیر نے سعادت وانقیاد کی ادا سے حزیں و ملول آواز میں عرض کیا "ازبرائے خدا - اور اپنی اُبوّت کا واسطہ مجھے غلامی سے آزاد نہ کیجیے - میں اُس موت کو جو آپ کے قدموں کے نیچے نصیب ہو، ہزار زندگیوں سے افضل جانتا ہوں"۔

## فصل (۵۷)

## خالد اور عبدالملک

اسکے بعد ابن زبیر زنانہ حصہ مکان میں چلے گئے - مجمع میں جو لوگ چلے نہ گئے تھے وہ کھڑے تھے - اُن کی آزاد گفتگو سُن کر حسن کو اس بات کا کامل یقین کرلینا پڑا کہ یہ لوگ باذمے بھی رُکنے والے نہیں - بنی امیہ کی عطا و بخشش نے اُن کے دلوں پر طلسمی اثر ڈالا ہے - آخران ناگفتنی اوکا سے اُکتا کر وہ ابن صفوان کو دیکھنے لگا - ابن صفوان نے متجسس پاکر خود اُسے بُلایا اور اُسکے جانے پر

کہنے لگا " امیرالمومنین آپ کے مشتاق ہیں"۔ یہ کہا اور ایک درجے میں چلا گیا۔ امیر کے اشتیاق کو سن کر حسن مسرور ہوا اور اپنے دل میں کہا " خدا نے اس حیلہ سے عرض مدعا کی راہ نکال دی" اتنے میں ابن صفوان نکلا اور حسن کو لیکر پھر داخل ہوگیا۔ امیر چہل قدمی کر رہے تھے۔ مگر چہرے پر غیظ و غضب کے آثار تھے۔ کبھی ہونٹھ چباتے تھے اور کبھی داڑھی کے بال دانت کے نیچے دابتے تھے۔ کبھی لٹکتے ہوئے آستین چڑھانے لگتے تھے۔ یہ حرکات و سکنات اُن کے اضطرابِ قلب کا پتہ دیتی تھیں۔ ابن صفوان اور حسن جس کمرے میں منتظر کھڑے تھے وہاں کی بے سروسامانی دیکھکر حسن متعجب تھا۔ کیونکہ وہاں بجز ایک کھجور کی چٹائی اور دو مونڈھوں کے اور کوئی چیز اسبابِ رہائش میں سے نہ تھی۔ بہرحال امیر اس حجرے میں آئے۔ بعد از سلام و جوابِ سلام حسن کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ اور مونڈھے پر بیٹھنے کو فرمایا۔ حسن نے ادباً بیٹھنے میں تامل کیا تو فرمایا " الامر فوق الادب"۔ اور اصرار سے بٹھایا۔ بعد از تامل حسن سے دریافت کیا "کہاں سے آنا ہوا؟"

حسن ۔ میں شام سے آرہا ہوں"۔ شام کا نام سنتے ہی امیر حیرت میں آگئے۔ کیونکہ باشندگانِ شام میں سوائے اعداء کے ایک بھی امیر کا ہوا خواہ نہ تھا۔ استفہاماً امیر نے ابن صفوان پر نظر ڈالی تو اپنی طرح اُسے بھی گرفتار حیرت پاکر سوال کیا " آخران حالات میں یہاں آنے کا منشاء؟ کیا جاسوس ہو؟

حسن ۔ معاذاللہ۔ ایسا سوءِ ظن مجھ غریب کے متعلق حضرت نہ فرمائیں۔ جاسوسی کی مد میں رہ کر آپ کے شوریٰ کی شرکت اور آپ کے نصب العین کی علیٰ رؤس الاشہاد تائید کیونکر روا ہوسکتی تھی؟

اسکے بعد خود امیر مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ اور ابن صفوان کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا "جو امر تم سے ظہور میں آیا، بلحاظ جاسوس ہونے کے کچھ بعید نہیں، وہ ہر رنگ و لباس میں ہوسکتا ہے بہرحال مجھے مطلق اس کی پرواہ نہیں۔ کیونکہ نہ میں اس سے نفع کا متوقع رہتا ہوں نہ خوفِ نقصان رکھتا ہوں بلکہ محض حق و عدل پر بھروسہ رکھتا ہوں"۔

حسن (عذرخواہی کے انداز سے کھڑے ہوکر) "قصور معاف! میرا نفس ایسے رذائل سے کلیتہً بری رہتا ہے چہ جائیکہ احقاقِ حق و انتصارِ ملی کے مواقع میں۔ فی الواقع میں ایک امرِ خاص میں آپ کی جانب بیابر ہوں

جس کے اظہار کا اس وقت محل نہیں پاتا۔

**ابن زبیر۔** تم پیام لیکر آئے ہو اور میرے پاس؟ اچھا! موقعہ و محل کا خیال نہ کرو۔ حال کہو۔ تمھیں کس نے بھیجا ہے؟ کیا عبد الملک کے پاس سے آئے ہو؟

**حسن۔** جی نہیں۔ میں خالد بن یزید بن معاویہ کا مرسلہ ہوں۔

**ابن زبیر۔** وہ بھی تو اموی ہے۔ ہمارے لیے جیسا عبد الملک ویسا ہی خالد۔ اگرچہ وہ کیمیا اور فن شعر میں درک کی وجہ سے ظاہرا و حکومت سے جدا گانہ بھی ایک خالص علمی و ادبی پایہ رکھتا ہے۔

**حسن۔** عفو تقصیر کی امید پاؤں تو عرض کروں۔ میں خیال کرتا تھا کہ خالد و عبد الملک کے معاملات حضور سے مخفی نہیں۔ مگر گستاخی معاف! ایسا نہیں ہے۔

**ابن زبیر۔** یہ کیونکر؟ دراں حالے کہ ہمارے مقابلہ میں دونوں مشترکاً بانیِ حرب ہیں۔

**حسن۔** ایسا نہیں ہے۔ اس جدال و قتال کا بانی محض عبد الملک ہے۔ اگر آپ کو اُن اسرار نزاعی کی اطلاع ہو جو اُن کے مابین امور خانگی میں برپا ہیں تو آپ سے زیادہ اس بات پر یقین لانے والا کوئی نہ ہو کہ خالد سے زیادہ آپ کا شائق بیعت کوئی متنفس نہ ہوگا۔

**ابن زبیر** (خندۂ زیر لب کے ساتھ) کہو تمھارے کہنے سے میں اس کو مان لوں۔ مگر یقین کرنے والی بات تو نہیں ہے۔ کیا خالد یزید کا خلف نہیں؟ جس نے بیت اللہ کے انہدام و احتراق کے معاصی سے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کیا اور ہم پر قتل و غارت کی مصیبت لایا۔ جس کے بعد بناء جدید کا مرحلہ بھی ہم ہی طے کرنے والے تھے۔

**حسن۔** آقائے من! آپ کا ارشاد بجا ہے۔ بیشک وہ اُسی یزید بن معاویہ کا بیٹا ہے۔ مگر بعد مرگ یزید جو قضایا، عالمِ ظہور میں آئے آپ سے مخفی نہ ہوں گے۔ وقتِ مرگِ یزید حصین بن نمیر محاصرین بیت الحرام کا قائد تھا۔ یزید کی موت کا اُسے علم نہیں ہوا۔ مگر ہم لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ آپ لوگ اس سے بیخبر نہیں ہیں۔ مگر اس واقعہ کی صحت کی صورت میں آپ کے اور اُسکے درمیان معاملۂ خلافت کے بارے میں ....

**ابن زبیر** (قطع کلام کرکے) میں سمجھ گیا۔ تمھارا منشاء یہ ہے کہ جب وہ میرے سامنے بیعت کا سوال لایا اُس وقت یزید مر چکا تھا۔

**حسن۔** بیشک۔ اُدھر سے بیعت کا سوال پیش ہونے پر جواب میں اِدھر سے تبلیغ بیعت کی جاتی۔

کیونکہ مسندِ حکومت یا اُنکے الفاظ میں مسندِ خلافت خالی از خلیفہ ہو رہی تھی۔

**ابن زبیر** - ایسا ہی ہوا۔ مگر اُس نے اس کا یہ جواب دیا کہ صدر خلافت شام (دمشق) ہے۔ آپ وہاں چلیں اور جمہور کو دعوت دیں۔ پہلا ہاتھ بڑھانے والا میں ہوں گا۔

**حسن** - پھر کون سا امر مانعِ تشریف بری ہوا؟ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ تشریف لیجاتے تو آپ کی بیعت سے کسی کو انکار نہ ہوتا۔ اور مرکز ........

**ابن زبیر** (مستعجلاً قطع کلام کرکے) خیر! گذشت آنچہ گذشت۔ تم خالد کا قصہ بیان کرو۔

**حسن** - یزید کے مرنے پر اہل شام نے اُسکے بیٹے معاویہ ثانی کی بیعت کر لی۔ مگر یہ شخص انتقال خلافت بطریق توریث کے خلاف تھا۔ جیسا کہ اُس نے چہل روزہ حکومت کے بعد اپنے آخری خطبۃ الوداع میں بصراحت ظاہر کیا۔ اُسکے حکم سے "الصلوٰۃ جامعۃ" منادی نے ندا دی۔ جب سب اکٹھا ہو گئے۔ تو اُس نے بعد حمد و ثنا کے بیان کیا" میں اپنی خرابیِ صحت کی وجہ سے بار خلافت سے سبکدوشی اختیار کرنے والا ہوں۔ لہذا میں چاہتا تھا کہ اسوۂ حسنہ کا تتبع عمر بن خطاب کے ایسے جامع و کامل شخص کے انتخاب کے متعلق اختیار کرتا۔ اسی لیے مثل اُن ستہ شوریٰ کے یہاں بھی ستہ شوریٰ کا طلبگار تھا جو جمہور امت کی نیابت و قائم مقامی کا حق ادا کر سکے۔ مگر میری نظر ستہ شوریٰ کے انتخاب صحیح میں کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اور بدرجۂ مجبوری میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کا معاملہ آپ ہی کے سپرد کرکے میں اس امانت کے بار گراں سے سبکدوشی حاصل کر دوں۔ لہذا اب اپنی مجبوریوں کے اظہار کے بعد میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں"۔ اسکے بعد پھر اُسے لوگوں نے نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ فوت ہو گیا۔ اُسکی وفات کے بعد انتخاب میں بڑا اختلافِ رائے اور اضطراب و انتشار برپا رہا۔ اور یہ نہایت گہری فکر اور عمدہ تدابیر کا حاصل و انجام تھا کہ مروان کے نام قرعۂ فال نکلا۔ جو تمام خاندان بنی امیہ میں تجربہ و عمر کے لحاظ سے کمالِ بزرگی رکھتا تھا۔ ہم لوگ چونکہ اُنکی شانِ صفت سے واقف تھے اور عثمان ذی النورینؓ کے تلخ تجربات پیش نظر تھے کہ جو چنگاری اُسنے خرمن اسلام پر پھینکی تھی اُس سے آج تک ملتِ بیضا کسی طرح عہدہ برآ نہ ہو سکی۔ مگر بہرحال ایسی سازشی چالیں چلی گئیں کہ اُس پر اتفاق رائے ہوا۔ بنی سفیان اس پر بھی اختلاف پر قائم اور خالد کے انتخاب کے متعلق پر اصرار کرتے رہے مگر آخر ملطالعت اس وعدۂ فردا پر وہ بھی ہموار کر لیے گئے کہ بعد اسکے خالد کی خلافت امر منفصلہ متصور ہو گی۔ یہ معاملہ ایک طرف رہا۔ مروان کو حکومت ملتے ہی یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ حکومت

نسل معاویہ سے اگر اپنی نسل میں منتقل نہ ہوئی تو کچھ نہ ہوا۔

اس خیال کی تکمیل کے سلسلہ میں اُس نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ خالد کی ماں کو اپنے عقد نکاح میں لایا۔ اس طریقہ سے گویا خالد کو جو اصل مدعی تھا اپنا مطیع و حلقہ بگوش بنانا چاہا۔ بعد چندے یہ معاملہ پیش آیا کہ مروان نے کسی بات پر بگڑ کر خالد کے سامنے اُسکی ماں کی شان میں کچھ توہین آمیز کلمات کہے۔ خالد نے یہ روداد اپنی ماں سے بیان کی۔ ماں نے اُسکو تسلی دی کہ خاموشی اختیار کرو۔ آج کے بعد پھر اُسکو قدرت نہ ہوگی۔ شام کو جب مروان یہاں آیا تو اُس نے ام خالد سے استفسار کیا کہ خالد نے اپنے اور اُسکے درمیانی واردات کے متعلق اُس سے کیا بیان کیا؟ ام خالد نے عرض کی کہ "امیر المومنین۔ خالد کو آپ کی تعظیم و تکریم جس قدر ملحوظ ہے اس لحاظ سے آپ کچھ فرمائیں مگر وہ اُس کا ذکر کسی موقعہ پر روا نہیں رکھتا" بہرحال اُس شب کے بعد صبح کو دفعۃً اُسکی خبر مرگ مشہور ہوئی۔ جس کے متعلق مرگ اتفاقی کا نہیں بلکہ غیر طبعی موت کا عام طور سے خیال قائم کیا گیا۔

اُسکے بعد اُسکا بیٹا عبد الملک متمکن خلافت ہوا۔ اور اس طریقہ سے نسل معاویہ نے انتقالِ حکومت کی تجویز نے جانئہ واقعیت اختیار کیا۔

عبد الملک کو چونکہ مروان کے سببِ مرگ کی کچھ نہ کچھ اطلاع تھی۔ لہٰذا وہ اپنی جان کے متعلق بھی ایسے اسباب سے خائف رہتا ہے۔ علی الخصوص خالد پر تو اُسکی گہری نظر پڑتی ہے۔ اور غصب و اتلافِ حق کی بناپر خالد کو کیا کم خصوصیت اُس سے ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر میں نے عرض کیا کہ خالد آل عوام سے زیادہ امیر المومنین کی خلافت کا خواہشمند و طرفدار ہے۔ اور بانیِ جنگ عبد الملک ہے۔

(غنی) مستی و عربدہ کار چو منے نیست ولے		چشم ساقی ست کہ تاراج گرِ ہوش آید

**جواد علی خاں عاؔلی**

## رباعی

جب ترک ہوئے ہم سے شعارِ اسلام		ہم خاک کریں گے رستکارِ اسلام
یورپ کا جو سبزباغ ٹھیرا مرغوب		آنکھوں میں ہوئی خارِ بہارِ اسلام

"**شہرت**"

# ذاتِ مافی العتبہ

## (Subliminal self)

وہ فقرہ ہے جس کی ترویج و تشکیل میں "تفحص نفسیہ" کے مباحثِ حل طلب نے سنین جاریہ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اور جو اپنی وسیع رواج پذیری میں ایف، ڈبلو، ایچ، مائرس کی عام تحریرات کا عموماً، اور اس کے بعد از وفات مطبوعہ تصنیف "انسانی شخصیت اور جسمانی موت کے بعد اسکی بقا" کا خصوصاً، بہت کچھ رہین منت ہے۔ یہ کبھی تو وسیع تر و مسترخی معنوں میں اور کبھی تنگ تر اور محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں متضاد معانی بعض وقت کچھ ایسے گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ سلامت پسند طبیعتوں کو منغص کیے بغیر نہیں رہتے۔ محدود معنوں میں اس سے انسانی شخصیت کا وہ مفہوم مراد لیا جاتا ہے جس کی تفصیل میں مائرس نے معلومات کی ہیئات کے ساتھ فصاحت و بلاغت کا دریا بہا دیا ہے۔ یہ اپنے ممدوح الصدر بانی کے خیال میں اس قیاس کا کام انجام دیتا معلوم ہوتا ہے جس کے نظام توضیح کے تحت میں قریباً وہ کُل انوکھے واقعات و خوارقِ عادات جن کے دیکھنے کا خود اُس کو یا اُس کے ہم خیال ملنے والوں کو اتفاق ہوا اور وہ امور ما بعد بھی جن کی حقیقت ہنوز زیر بحث ہے آنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ یہ ان کے مقبولِ عام علمی Scientific اصول سے بھی تعلق پیدا کرتے نہیں چوکتا۔ لیکن یہ فقرہ مافی العتبہ اب ان لوگوں کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے جو مائرس کے اس نظریہ کو ایک ایسا سہولت آفریں عنوان تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں جس کی طرف ان کُل کثیر التعداد متنوع الاقسام واقعات و خوارق کو منسوب کیا جا سکے جن سے خفی الشعور اعمال ذہنیہ مراد لیے جاتے ہیں مگر میرا یہ مضمون اس فقرہ کے صرف ان معانی پر روشنی ڈالنے کی غرض سے تیار کیا گیا ہے جو مائرس نے بتائے ہیں اور اس کی ازحد آرزو ہے کہ کاش یہ اُنھیں محدود معنوں میں استعمال ہوا کرتا!

شوپن ہور، اور ہارٹ مین کی معقولات میں "لاشعور" نے مظاہر حیات انسانی و حیوانی دونوں کے مابعد الطبیعی اصول کی توضیح و توجیہ کی حیثیت سے بہترین خدمت انجام دی تھی۔

مگر ان دونوں مستثنیات سے قطع نظر کر لینے پر، اُنیسویں صدی کے جمیع فلاسفہ و نفسیین "بلا شعور" یا "خفی الشعور" اعمال و کوائفِ ذہنیہ کے مفہوم کی کسی خصوصیت کے اعتراف میں متامل رہے اور ان کو علی العموم اپنی کسرِ شان ہی شمار کرتے رہے۔ اس صدی میں میلانِ غالب تو یہ رہا کہ کوئی سی جسمانی حرکت جو فاعل کے شعور و ارادہ سے آزاد واقع ہوتی نظر آئی ہا مرازیں کہ وہ حرکت کتنی ہی معقول اور کتنی ہی ارادی خصوصیت لیے ہوئے کیوں نہ ہو، جھٹ پٹ متحرک بلا ارادہ اعمال عصبی یا بلاشعور تدمیغ (عمل دماغی) کا نتیجہ قرار دے دی گئی۔ بعض ضرورت سے زیادہ سخت گیر Orthadox ملایان سائنس تو اس وقت تک خفی الشعور سے تعصب کا ویسا ہی سلوک کرنے پر اڑے ہوئے ہیں؛ مگر کثیر التعداد جمہور میں اب یہ قبولیتِ عامہ بار پاتی جاتی ہے کہ شعور خفی یا مافی العقبہ اعمالِ نفسیہ پر بھی بعض اعتبار سے ایمان لانا ناگزیر ہے۔ Zimmn کے عتبہ شعور کا مفہوم جو مافی العقبہ یا خفی الشعور اعمالِ نفسیہ کو مافوق العتبہ اعمال شاعرہ سے علیحدہ کرتا ہے؛ فشنر ابو الطبیعات النفسیہ کی تصانیف ہی میں متشکل ہو کر ایک وسیع حلقے میں گوش آشنا ہو گیا تھا۔ فشنر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ بعض حسی ہیجانات جو اپنی قلتِ اثر اور ضعفِ عمل کے سبب شعور تک پہونچنے کے ناقابل ہوتے ہیں، وہ بھی ایک نفسی اثر پیدا کیے بغیر نہیں رہتے جو عتبۂ شعور کے اندر پڑا رہ کر بعض ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ کام دے جاتا ہے۔ اس بنا پر مافی العقبہ اعمالِ نفسیہ کے وسیع الاثر قلمرو کی تشکیل عمل میں لائی گئی تھی۔ مگر اس کے براہین گو مفتح الطور اختیارات اور مبداء التدور تجارب پر مبنی تھے تاہم یقین آفرینی میں کچھ ایسے پھولے پھلے نہیں۔ اور باکثر الوجوہ وہ دلائل فشنر سے بہت ہی مختلف ہیں، جن کی بنا پہ آج ان اعمال ذہنیہ کو عموماً خفی الشعور اور مافی العقبہ بنایا جاتا ہے، اور جو اب عمیم التسلیم بھی ہو چلے ہیں۔ اُنیسویں صدی کے آخری رُبع اور بیسویں کے ابتدائی سالوں میں ایسے مشاہدات کا ایک انبار لگ گیا تھا جو بہترے صفتِ تنقید سے علیٰ درجہ الکمال متصف اشخاص کی رائے میں ان اعمال کی اصلیت ثابت کرنے کو کافی ہے جن کا اظہار اعمال منتج بہ ارادہ کے پیرایہ میں ہوتا ہے اور جو ان کل علامات کے حامل ہیں جن سے ہم وقوف شاعرہ اور عمل ارادہ کا استدلال کرنے کے خوگر فتہ ہیں۔ مگر جتنی خبر یا آگاہی ان اعمال کے مشاہدین کو ہوتی ہے اس سے زیادہ اسکے فاعل یعنی معتاد شخصیت کو بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ظہورات میں "کتابت بلا ارادہ" عامۃ الورود

اور سب سے زیادہ حیرتناک ہے اور اسپر معمولی قسم کے متعدبہ اشخاص قدرت بھی رکھتے ہیں۔ایک جس میں یہ پر کھارت ہوتی ہے ایسی حالت میں جبکہ وہ پڑھنے یا کسی دوسرے خیال میں مستغرق بیٹھا ہوا ہو اُس کا ہات ایسے الفاظ اور جملے لکھا کرتا ہے جن کی خود اسے بھی جب تک وہ ان کو پھر نہ پڑھے خبر ہی نہیں ہوتی۔ مضامین جو اس طرح لکھے جاتے ہیں مختلف حالتوں میں مختلف پائے گئے ہیں :۔ الفاظ و جملہ کے کٹے کٹے نا قوانی ٹکڑوں اور قرامنوں سے لیکر مربوط طویل السلسلہ اور بعض دفع فصیح اور اکثر کم و بیش تمثیلی Dramatic ٹچیوں تک کون سا نقص و کمال ہے جو اُن میں نہیں ہوتا۔ بعض حالتوں میں "بلا ارادہ لکھنے والا ہات ان سوالات کا جواب معقول دینے پر بھی مائل کر لیا جاتا ہے جو فاعل کے کان میں یا اُس تک کسی اور طریقہ سے پہونچا دیے جائیں کہ اسکی توجہ اس عمل سے ہٹنے نہ پائے جس میں وہ سرتا سر منہمک معلوم ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں جوبات یوں لکھی جاتی ہے وہ ان امور کا اظہار کرتی ہے جن سے ان کا فاعل کسی وقت آگاہ تو ہوا تھا، مگر اب ان کو بلا ارادہ سعی سے یاد کرنے پر قادر نہ تھا اور شاذ و حالتوں میں اس طرح لکھی ہوئی باتیں ایسی واقفیت اور صلاحیت کا پتہ دے جاتی ہیں جن کے ہونے کا نہ تو خود فاعل کو علم تھا اور نہ اس کے جاننے والوں کو۔ اور دوسرے اعمال جن میں مربوط تقریر بھی شامل ہے اسی طرح پیدا کیے جاتے ہیں اور سب سے آخری حالت یہ ہوتی ہے کہ فاعل ان الفاظ کو سنتا اور سمجھتا تو ہے جو اس کے منہ سے نکلتے ہیں مگر اتنا ہی جتنا دوسرے کے الفاظ کو۔ "اطراق المائدہ" میز کو جھکا دینا۔ "کتابۃ بالوحیۃ" پلین چیٹ (لوحہ صغیرہ) کے ذریعہ تحریری پیشین گوئی اور سوالات کے معقول جواب دینے کے دوسرے مختلف طرقِ اظہار جن کا مدت سے مناجی الروح یا روحانی حلقے میں رواج ہے اور جن کو ان کے عامل لبا اوقات ارواح مقبوضہ یا عقول منزوعہ خیال کرتے ہیں بظاہر اسی سے بآسانی متعلق و وابستہ قرار پا سکتے ہیں۔ انتہائی حالتوں میں اس خفی الشعور (یا باصطلاح اصح شریک الشعور Co-consciousness) کے اعمال کے ظہورات اس کثرت سے وقوع میں آتے، اس تسلسل کا اظہار کرتے، اور اس صفائی سے خیال، حافظہ اور ارادے کو دکھاتے ہیں کہ ہم اس سے ایک ایسی منتظم شخصیت کا استنتاج کرنے پر جس کے یہ کرشمے قرار دیے جائیں، اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور یہ حالت اُس وقت بہت نمایاں ہو جاتی ہے جب ایک ہی شخص دو متضاد و متبائن یا متعدد

بوقلموں شخصیتوں کا اظہار کرتا دکھا جاتا ہے۔ شرکۃ الشعور لنشاعر یا Co-consciousness کے اس سے ملتے جلتے ظہورات معمولی اشخاص کے معتدبہ تعداد میں بھی ما بعد التنوعی Posthypnotic ہدایت کے ذریعہ پیدا کرکے دکھائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب حالت تنوع میں کوئی ہدایت معمول کو کی جاتی ہے تو بعد کو وہ ان اعمال سے قاطبۃً لاعلمی کی حالت میں بے کم وکاست تعمیل کردیتا ہے۔ یا وہ علامتیں جنون کے جواب میں وہ حسب ہدایت عمل تو کرتا ہے مگر اس کی وجہ مطلق اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور لطف یہ کہ یہ بھی یاد نہیں آتا کہ اسکو کسی وقت میں ایسی ہدایت بھی دی گئی تھی۔ ان کل ظواہر کو ایک طرف تو وافر احتیاط کے بیدار مغز گر مائل بہ تساہل محققین، معتاد شخصیت کے انشقاق وانقسام کی مثال، اور دماغی عدم تعلیم کے اصول سے قابلِ توجیہ ظاہر کرنے کے متوقع ہیں، (ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف البرطانیہ طبع ۱۱ میں Hypnotism تنوع) اور دوسری طرف زیادہ جوشیلے مہمات پسند اپنی توجہ کو انتہائی مثالوں پر مرتکز کرکے اس قسم کے کل ظہورات کو شخص مذکور پر (جزءً یا کلاً) دوسرے کی روح کی — جو علی العموم اشخاص متوفی کی خیال کی جاتی ہے — تسلیط خیال کرنے پر ڈھلے ہوئے ہیں۔

مائرس کا یہ نظریہ ما فی القلب ان دونوں مذکورۂ بالا انتہا پسندیوں میں مصالحت کراکے انکے بین بین میانہ روی اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے غوامض الخصوصیت امور جو خاصکر رویائے صادقہ Veridical Hallucinations گوناگوں مخابرۃ المتباعدین Telepathy تنوع Hypnotism اور اس کی عجب العجاب مثالوں کو — جن میں حواس، حافظہ اور اعمالِ عضویہ پر قدرتِ فائقہ کا حصول — بھی شامل ہے، ایک دھاگے میں پرونے اور ایک سلک میں منسلک کرنے کی تابناک سعی تھی۔

مائرس روح انسانی کو جسم سے آزاد ہوکر بھی کسی ما فوق الارض یا خارج از دنیا مقام میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کے قابل خیال کرتا ہے۔ وہ ہماری معتاد دنیوی حیاتِ ذہنیہ کو صلاحیت وقابلیت روح کا محض ہی جزئی — صرف اُتنا سا جس نسبت سے انسانی دماغ کے ذریعہ ہو سکتا ہے — اظہار خیال کرتا ہے۔ (آفتاب جتنا چھوٹا ذرہ میں اور جتنا کم نور سیاہ شیشے سے دکھائی دیتا ہے حقیقت کو اس سے کیا نسبت؟) اس کے خیال میں دماغ ہنوز اپنے

ارتقاء کے نسبتہً ابتدائی درجے میں ایک ایسا آلہ ہے جس سے روح مادی دنیا میں اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا کرتی ہے - مگر ہماری حیات روح حیات شاعرۂ عضویہ میں اس ناقص کل Mechanism کی وساطت سے تعامل یعنی فعل و انفعال اور اپنے اظہار میں جس قدر قاصر رہتی ہے وہ عتبۂ شعور کے اندر جمع ہو ہو کر کہا جاتا ہے کہ ذات مانی العتبہ کی تشکیل کا باعث ہوتی ہے - مگر ذات مانی العتبہ جس کی یہ تعریف سمجھی گئی ہو، اُس کو ذات کا مانی العتبہ حصہ، وہ حصہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا جو اپنی وسعت قوائے نفسیہ کے لحاظ سے مافوق العتبہ یعنی معتادہ و شاعرہ ذات سے براصل لاتحصٰی فائق اور اسکا قوائے نفسیہ کے اس مخزن و معدن سے تعلق بھی اسکے حامیوں کے نزدیک قرین قیاس ہے جہاں سے یہ طاقت کارکردگی حاصل کرکے عموماً، بہت محدود مقدار میں عضویہ (جسم) کے اندر داخل کیا کرتا ہے - لیکن بعض مستثنیٰ مناسب حال مواقع میں ایک عظیم طوفان بھی آتے دیکھا گیا ہے جو اتنی دیر کے لیے اعمال ذہنیہ اور قوائے دماغیہ کو جسم پر خرق عادت کی حد کو پہونچا ہوا تفوق عطا کرتا ہے -

اس تغول پیشہ تلون تصور مانی العتبہ کا خاصۂ رئیسہ ہے کہ بہتیرے غیر معمولی ظہورات ذہنیہ مثلاً:- اذکیاء کی سوجھ، ملہم من اللہ پیشین گوئیوں کا نزول، جذباتی بحران، یا روحانی شغف جو شہید کو سخت سے سخت امتحان میں ثابت قدم رکھ کر فتح و ظفر تک منتہی ہوتا ہے اور وہ جوش مذہبی جو انسانی عضویہ (جسم) کو ناقابل یقین مشقتوں میں ڈال کر بھی فرو نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ جو بالعموم عصبی مرض و ذہنی فساد کی علامات تشخیص کیے گئے تھے - اسی نظریہ کی نظر عنایت کی بدولت ان اعمال ذہنیہ کے دائرہ میں در آنے جن کے مافوق العادت ترفع و عظمت کے عام طور پر سبھی قائل ہیں - مائرس کا یہ نظریہ بڑی بڑی جسارت سے اسی رائج الوقت خیال کو --- جو اجتہاد سے ہر اختلاف کو اور معمولات سے ہر انحراف موقت کو کمزوری و تنزل کی علامت بتانے پر تلا ہوا اور ہیچ یا ہر نئی بات کی موجد ذکاوت شغف دینی و جذب الٰہی کو جنون و اختناق کی حضیض تک اُتار لانے کا عادی ہے ---- یکدم اُلٹ دیتا ہے - عام خیال کے برعکس مانی العتبہ کا قیاس سطح کو نیچا کرنے کے بجائے اونچا کرتا - اور معتاد حیات ذہنیہ سے بہتیرے اختلافات کو، کارنامۂ ذکاوت کی قسم کا --- ذات مانی العتبہ کا بروز (یا عمق سے سطح کی جانب صعود) بتاتا ہے - جس کا مطلب یہ ہے کہ عارضی طور پر یہ عضویہ یا انسانی کل کو کامل تر طریقے پر قابو میں لاکر، ان خاص وقتوں میں اپنی قوتوں کا اسی نسبت سے کامل تر

اظہار کرتی ہے ۔ اور مافی العقبہ صلاحیتوں کے یہ نادر روزگار تماشے اس سطح اعلیٰ وارفع کی ایک جھلک دکھا کر ارتقاے ذہنی کے منازل آیندہ و مدارج مستقبلہ کا پتہ دیتے خیال کیے جاتے ہیں؛ جس پر اگر نظام عصبی کا مزید ارتقا، اس دماغ کو قوائے روحیہ اور اطواق نفسیہ کے نفوذ کے لیے قبیل الممانعت بنا سکا تو ذہن انسانی کا ایک دن وہ معتاد و روزمرہ ہو کے رہے گا (جس کو ہم اُردو داں یوں زیادہ آسانی سے سمجھ لیں گے کہ اگر دماغ میں اور زیادہ ترقی ہو گئی تو ممکن ہے کہ آج جن خوارق کو ہم بڑے بڑے روشن ضمیر، منوم، سمرایزرس میں دیکھ کر دم بخود رہ جاتے ہیں وہ زمانۂ آیندہ میں روزمرہ اور معمولی بات ہو جائیں) یہ وسیع الحدود غیر معمولی جری نظریہ جس کے بانی کی جلیل الشان انشا پردازی و علمی قابلیت گو اسکے ادب و تعظیم سے لبریز سامعین کی ایک بڑی جماعت فراہم کرکے رہی، مگر اس وقت تک پیشہ ور نفسین کی کافی تعداد میں اسکی مقبولیت نہوئی تھی نہ ہوئی بالمقابلہ بے پروائی جو مہذب دنیا کے علما و حکما نے اس کے ساتھ برتی ہے وہ دو قسم کے خیالات کی طرف قابل انتساب ہے (اولاً تو) یہ احساس بالکل بجا ہے کہ امور مدعاہا کی بہت بڑی مقدار ۔ جس کی توجیہ اس نے اپنے سر لی ہے ۔ آج تک اس نوع کے شواہد تائیداً پیش کرنے سے قاصر ہے جو بے جھجک اعتراف کے ضامن و کفیل ہو سکیں (دوسرے) اگر اس قالب Type کی مزید تحقیقات جیسی (جماعت تفحص نفسیہ) کرتی رہی ہے ان کل یا اکثر امور کی اصلیت و حقیقت کو جن کا مائرس کو یقین تھا اٹل اور غیر متزلزل بھی ثابت کر دے تاہم اس نظریہ کا اندرونی ضعف، و اشکال علیٰ حالہ باقی رہے گا جو فی الحال بظاہر عسیر الانحلال ہے ۔

مائرس کا یہ قیاس ۔ ان مشکلات کے علاوہ جو ایسے ہر عقیدہ کو ضیق میں ڈالتے ہیں جو شخصیت انسانی کو جسم سے بے لگاؤ اپنی ہستی قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے ۔ اور بہتیری ایسی مشکلوں کا اضافہ کرتا ہے جو اس سے مخصوص ہیں ۔ اس کے دو رؤس المشاکل کو میں مختصراً بیان کر دوں (ایک تو) مافی العقبہ اور مافوق العقبہ ذوات کا باہمی تعلق مائرس کے پیش کردہ اصول سے نہایت مذبذب غیر مستقل اور پختہ یقین کی تجدید کے احاطے میں آنے کے ناقابل ہے (دوسرے) وہ غیر معمولی ظواہر جن کے اثبات میں "متفحص نفسیہ" نے بڑی شد و مد سے اپنے کو وقف کر دکھا ہے، اور اسکے اکثر کارندوں کی نظر میں اس میں اس کو بڑی کامیابی بھی ہوئی ہے اور جو ہر نقطۂ نظر سے

نہایت دلچسپ اور بہت وقیع بھی ہے۔ ان میں ایک تو زندہ مگر بعید از احساس اشخاص کی خلاف عادت باہمی مخابرت ہے جسے مخابرۃ المتباعدین Telepathy کہتے[۱] اور دوسرے زندہ اور مردہ کے درمیان تبادل خیالات جس کے لیے مناجات الارواح وا ستحضار[۲] کے سے موزوں نام مقبول عام

---

[۱] جماعت تفحص نفسیہ کے دو اکتشافات ہیں سے جو کلیس کے امرکیہ اور ہرشل کے یورینس کی جغرافی و فلکی دریافتوں سے وقعت میں کم نہیں (ایک) یہ ہے کہ ذات مافی العقبہ جب قید حیات میں رہکر عادت جاریہ کو چھوڑ کر ایک دماغ مخصوص کے علاوہ دوسرے دماغ سے بھی تعلق پیدا کرتی ہے تو اسکا یہ طرز عمل مخابرۃ المتباعدین یا تخاس یعنی Telepathy کہلاتا ہے جسکے متعلق ارباب علم نے چار نظریے پیش کیے ہیں (۱) "الاسلکیہ" یعنی بالات سے فاعل کے خلیات دماغیہ میں بے تار کی تاربرقی کا سا تموج پیدا ہوتا ہے پھر یہ تموج ان خلیات سے ماحول کی ذرات اثیر یا میں منتقل ہوکر معمول کے دماغ پر (یعنی جس میں اس سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے) پڑتا ہے جہاں اسی قسم کا تموج پیدا ہوکر نتیجۃً وہی خیال بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر اسپر خود ماہران ارکونی گراف کے اعتراضات ہیں (۲) دوسرا قیاس یہ ہے کہ معمول تک خیال کو منتقل کرنے کا باعث فاعل نہیں ہوتا بلکہ خود گیرندہ، فاعل کے ذہن کو اپنی روشن ضمیری سے پڑھ لیتا ہے۔ (۳) تیسرا نظریہ روحانی ہے جس کی تلقین ہے کہ کوئی خارجی ہستی، یا روح ایک دماغ کے خیال کو دوسرے دماغ تک پہونچا دیتی ہے (۴) چوتھا نظریہ یہ ہے کہ مخابرۃ المتباعدین ذہن مافی العقبہ میں واقع ہوتا ہے اور یہ کہ مرسل کا ذہن مافی العقبہ مرسل الیہ کے ذہن مافی العقبہ سے ایک عالمگیر ذہن کل کے وسیلے تعلق رکھتا ہے جو ہر شے کی تہ میں مستتر ہے اور سب کا ذہن مافی العقبہ منفرد وہ بھی ایک جزو ہے۔ اور یہی رائے اس صدی کے پہلے عصر کے اجل الفلاسفہ پروفیسر جیمز المتوفی سنہ ۱۹۱۰ء کی ہے۔

[۲] دوسرا اکتشاف یہ ہے کہ روح جب جسم سے آزاد ہوکر دوسرے دماغ سے تعلق پیدا کرتی ہے تو اسکو مناجاۃ الروح یا استحضار سے یعنے Spiritualism کہتے ہیں۔ حیات بعد الموت Survival of the bodily death کے بارے یہاں یورپ نے بہت کچھ اجتہادی تحقیقات کی اور کر رہا ہے مگر ہنوز اسکا قطعی فیصلہ مستقبل پر اٹھا رکھا گیا ہے اور بعض تو ہمیشہ کے لیے مایوس ہیں۔ سر ولیم الیٹ بیرٹ جو سر کروکس، لاج اور زندہ فلسفیوں کے سرتاج برگسن کی طرح اس مجلس حق جو کے صدر رہ چکے ہیں، بلکہ وہ اس مجلس کے بانی اور پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اس کے پہلے جلسۂ عام واقعہ سنہ ۱۸۹۲ء میں ٹیلی پیتھی کا اکتشاف کر کے اس کے متعلق اپنی تحقیقات کا ملاحظہ بنام "قراءت خیال کا ریپوٹ" پڑھکر سنایا تھا ——— استحضار کے متعلق سر آلیور۔ جے۔ لاج کی تحریر سے یوں استشہاد کرتے ہیں "کیا یہ مادی شواہد بقاے روح کے اثبات کو کافی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اور نہ کوئی دوسری تحقیقات اس ارفع اوسع ابقی زندگی کا ثبوت پیش کرنے پر کبھی قادر ہو سکے گی جس سے ہماری آرزو نژاد بقاے روح ہے۔ شاذ حالتوں میں اصلیت جو ہوتی بھی ہے تو نقص سے خالی نہیں اور اکثر پیغامات تو ایسے ہیں جن میں اصلیت کا عنصر (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہیں۔ اب اگر ان میں ایک یا دونوں طرق مخابرت قطعی امور فطری و واقعۂ طبعی ثابت ہو جائیں تو پھر ان کی توجیہ کے لیے کسی مافی العتبہ ذات کے نظریہ کی ضرورت ہی سرے سے باقی نہیں رہتی موخر الذکر قسم کی مخابرت کی جو شہادتیں ہم کو ملی ہیں قریباً تمام تر پیغامات کی شکل میں ہیں۔ جن کو ارباب کیف، اصحاب حال یا عاملین لکھ کر یا منہ سے بول کر ان کے ہنوز بقید حیات احباب تک اس دعوے کے ساتھ پہنچاتے ہیں کہ یہ ان کے مردہ دوستوں کی ارواح کے بھیجے ہوئے ہیں، اگر یہ پیغامات حقیقت میں وہی ہیں جن کے ہونے کا ان کے بارے میں دعوے کیا جاتا ہے تو اس سے مائرس یہ مراد لیتا ہے کہ زندہ معمول یا واسطہ Medium پر مردہ کی روح مسلط ہو کر پیغام بھیجتی ہے۔ اس صورت میں ان دونوں مظاہر کو اپنی توجیہ کے لیے دو کٹھن اعتراضات کی ضرورت پڑے گی۔ ایک تو یہ کہ روح ایک ایسی ہستی ہے جو جسم سے علحدہ ہو کر بھی اپنا وجود برقرار رکھنے پر قادر ہے (دوسرے) یہ کہ وہ نفسانی وجسمانی تعامل یا فعل و انفعال میں ایک مخصوص دماغ ہی سے معاملہ رکھنے پر مجبور نہیں ہوتی۔ اور تیسری بڑی مشکل جذبہ کی پیدا کردہ ہے۔ ان کل پرشفقت تفحص و تحقیقات کی ابتدا اور اب تک بقا۔ جس کے نتائج میں مائرس ذات مافی العتبہ کے تعقل Concept کی اعانت سے تطبیق دینے کا چشم براہ ہے، سچ پوچھو تو، ——— جسمانی موت کے بعد شخصیتِ انسانی کے غیر منقسم قیام کے اثبات کی آرزو ہی کا باکورہ (ثمر نورس) ہے۔ مگر مائرس کی یہ تلقین اگر صحیح ہو کہ جسمانی موت کے بعد جو شے باقی رہتی ہے وہ اپنے کو پہچاننے والی (یا عارف بالذات) شخصیت نہیں ہوتی جس کو اُس کے احباب جانتے اور جس کی ان کے دلوں میں اتنی قدر اور جس کی بقا کے وہ اتنے دل دادہ ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے جس کا ——— یہ دنیوی شخصیت ——— محض ایک ناقص اور بگڑا ہوا ٹکڑا، کترن یا قراضہ

---

پر اسے نام ہو تو ہو ورنہ گہرا رنگ واسطوں کے خیالات کا ہوتا ہے جو بقائے روح کی ٹھیک ویسی ہی بھیانک تصویر بنانے میں کام آتے ہیں جیسی کہ ہومر نے اچلیس سے پاتال میں اعتراف کراتے وقت ان لفظوں میں کھینچی تھی کہ اس کے نزدیک زندہ بیگار مردہ تاجدار سے کہیں اچھا ہے" اس کے بعد مرموصوف نے شہر خموشاں سے ارواح رفتگاں کی دنیا اور اہل دنیا کی بے توجہی کی چند قیاسی دلیلیں بتائی تھیں۔ جن کے اعادہ سے اس مضمون کو طول دینا جو میرے منشا سے زیادہ طویل ہو چکا ہے، مناسب نہیں سمجھتا۔ باقی پھر کبھی۔ مترجم

ہے۔ تو اس نظریہ کے مطابق موت اتنے بڑے تغیر و تبدیلی کا نام ہے کہ جیسی جزوی بقا اور ضمناً ناقص تسلسل اسکے بعد قائم رہے گا اس سے اس جذبۂ جاوید اور خواہش خلود کی حسب توقع تسکین ناممکن ہو (کیونکہ ہم باقی رہے اور اپنے کو پہچان بھی نہ سکے تو ایسا رہنا یا نہ رہنا برابر ہے یہ تو نفسیین Positivist کی زندگیِ جاوید ہوتی جن کے خیال میں ان کے عواد و خصال کی ان کے متبعین میں بھی بقا میں اُنکی بقا ہے مگر کیسی بے جبرانہ! یا عوام کی یہ مسرتِ بیجا کہ اولاد باقی رہی تو ہم ہی باقی رہے۔ مگر یہ سب بھی کوئی بقا میں بقا ہے یہ تو ایک قسم کی دل بہلاؤ، تسکین خاطر یا اشک شوئی ہے)۔ بناءً علیٰ ذٰلک یہ نظریہ ایک بڑی مقدار میں اس یقین کی قدر و قیمت کھو دیتا ہے جس کے پیدا کرنے اور استحکام دینے کو یہ قائم کیا گیا تھا۔

(ترجمہ)		فاطمی

# غزل

باز بھی آتے نہیں تم شیوۂ بیداد سے		کرتے ہو فریاد بھی میرے لبِ فریاد سے

بخیر ہرگز نہیں وہ مقصدِ فریاد سے		داد دیتے ہیں مری فریاد کی بیداد سے

بے مزہ ہم کیوں ہوں زخمِ خنجرِ بیداد سے		تم نمک ریزی کرو شورِ مبارک باد سے

کام جو نکلا ہے زورِ بازوے فرہاد سے		وہ نہ نکلے گا فغان و نالہ و فریاد سے

کون کہتا ہے تلافی تم کرو بیداد کی		مُنہ نہ پھیرو کشتگانِ خنجرِ بیداد سے

پھر کوئی صدمہ ہے قسمت میں دلِ ناشاد کی		میرے پہلو سے چلے ہیں اُٹھکے وہ کچھ شاد سے

آپ کی بیداد و استغنا کا آخر کیا علاج		آپ تو آزردہ ہوتے ہیں مری فریاد سے

عمر بھر کے واسطے ہے ہم قفس زادوں کی قید		کیوں خجل ہوں شکوۂ بے مہریِ صیاد سے

ولولے تھے شور انگیز آرزو میں جوش زن
داد پائی ہم نے وحشت خنجرِ بیداد سے

(کلکتہ)		رضا علی وحشت

# نامۂ جاں بخش

آہ۔ اے قلبِ مجروح کے چارہ ساز، اے منتظر اور دردمند دل کے باعثِ تسکیں۔ تجھ کو سینے سے چمٹا لوں، آنکھوں سے لگا لوں۔ وہ سینہ جو عرصۂ دراز سے سیماب وار بیتاب ہو جانے والے اور بسمل کی طرح تڑپنے والے طفلِ دل کو اپنے دامن میں لیے ہوئے، سرور افزا امیدوں، اور وقتِ رخصت کے قسمیہ وعدوں کی داستان سُنا سُنا کر، پرورش کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں جو خونابۂ دل کے اشکوں سے نخلِ محبت کو سینچ رہی تھیں، اور شام و سحر قاصد کے اشاراتِ جاں بخش کے انتظار میں دروازے کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

اُف، ترا سینے سے لگنا آتشِ انتظار کے شعلہائے جاں سوز کو فرو کر کے کس طرح تخیل کے آبِ رواں کی موجوں میں شور، اور قوتِ تخیلہ کے بحرِ ساکن میں مد و جزر پیدا کر دیتا ہے۔ قلبِ ہجور کی سُست رفتار فرطِ مسرت سے تیز ہو جاتی ہے۔ رگہائے بدن میں خون کی روانی بڑھ جاتی ہے اُس وقت اکثر...... آہ اکثر، گذشتہ زمانے کے نظارے جبکہ مجھ کو کسی مسیحا نفس کی حضوری کا فخر حاصل ہوتا تھا۔ یاد آ آ کر آنکھوں کو پُرنم کر دیتے ہیں، اور کبھی آئندہ امکانِ دست بوسی کے ناقابلِ بیان خیالات بجلی کی طرح دل و دماغ میں دوڑ جاتے ہیں۔

آہ اے زخمہائے جگر پر مرہمِ تسکین رکھنے والے کاغذ کے ٹکڑے تجھ کو کھولوں، آہ یہ تیرے چاک ہونے کی جگہ پر کیسی سرخی ہے، کیا یہ میرے زخمِ جگر کے قطرہائے خون ہیں؟ لیکن نہیں اُن پر تو اس وقت تیری آمد نے تسکین کا مرہم رکھ دیا ہے، پھر کیا میری کشش دل کے باعث تو کسی کے دستِ حنائی سے شکستہ ہو کر آیا ہے، نہیں نہیں میں سمجھ گیا...... اُف میں سمجھ گیا...... یہ کسی کے لبہائے پاں خوردہ کی رنگینی ہے جو میری خوبیِ قسمت سے بند ہوتے وقت تجھ پر آ گئی ہے...... لیکن اگر ایسا ہے تو کیا میرے پاس کسی کے لبہائے لعلیں کے بوسے لیکر میرے دل و جگر کا خون کرنے آیا ہے، آہ اے بیوفا میں تجھ کو اپنا مونس اور ہمدم خیال کرتا تھا مگر تو نے مجھ کو دھوکا دیا، افسوس اے فسوں ساز! بتا اب میں تجھ کو اس فریب کی کیا سزا دوں، کیا چاک کر ڈالوں، لیکن نہیں تیرے

چاک ہونے سے میرا دل بھی چاک ہوگا، تو کیا تیری صورت نہ دیکھوں، مگر آہ! میں ایسا کرنے کیلئے مجبور ہوں کیونکہ میرے دل کی تسکین کا راز تجھ میں پوشیدہ ہے،

لیکن میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ تو بیوفا نہیں، اگر بیوفا ہوتا تو سیکڑوں کوس کی مصیبتیں اپنی ننھی سی جان پر جھیل کر کیوں میرے پاس آتا ...... ہاں اب میں سمجھا، تو اس لیے کسی کے لبِ لعلیں کے بوسے لے کر میرے پاس آیا ہے کہ میں تیرے بوسے لوں، اگر ایسا ہے تو اے قلبِ محزوں کے چارہ ساز، میں تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اپنے نامناسب الفاظ کی معافی کا خواستگار ہوں :..... ہاں ہاں تیرے بوسوں سے دلِ مجروح کے درد میں کمی ہوتی ہے۔

اے پیارے خط تو میرا پارۂ دل ہے اور یہ کسی کی نازک انگلیوں کی تحریر جو تجھ پر نظر آ رہی ہے میرا خطِ تقدیر ہے، جس میں میری مسرت اور غم کا راز پوشیدہ ہے، آہ تیرے دیکھنے سے میری آنکھوں میں روشنی میرے دل میں مسرت اور میرے دماغ میں فرحت پیدا ہوتی ہے۔

آہ! وہ کیا وقت ہوگا جبکہ کسی کی نازک انگلیوں نے ٹھہر ٹھہر کر، رُک رُک کر، بار بار پریشان ہو جانے والی زلفوں کو سنوار سنوار کر، بےچینی کے باعث زانو بدل بدل کر، تجھ کو تحریر کیا ہوگا، اُف تیرے تحریر ہونے کے بعد وہ کسی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تجھ سے لڑی ہوں گی، ہاں ہاں تیری خاموشی سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی شرمگیں آنکھیں تجھ سے دوچار ہوئی ہیں، اس لیے میں تجھ کو اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوں۔

تیرے کھلنے کے ساتھ ہی دماغ کسی کی زلفہائے عنبریں کے اشامِ خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے، وہ زلفہائے عنبریں جن کی فرحت بخش خوشبوئیں زمانۂ دراز کے گذر جانے پر بھی میرے دماغ سے نہیں گئیں اور جن کو بوسہ دینے کے خیالات شبہائے تار میں سوہانِ روح ہو کر میری جان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت آہ! جوشِ اضطراب کے ہاتھوں عاجز آ کر میں مالکِ حقیقی کی درگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ "خداوندا! میرے بخت کی تاریکی کو دُور کر اور میری منتظر آنکھوں کو جلد اُس ماہِ کامل کی پُرنور شعاعوں سے منور کر"

**اصغر عباس زیدی**

## رباعی

اے صاحبِ رائے و حامیانِ تعلیم (۲) تقریر و مکاں میں ہیں بتانِ تعلیم (۱)
ہیں منطق و تاریخ و ریاضی لازم اخلاقِ محمدی ہیں جانِ تعلیم (۴)

# دار المصنفین اعظم گڈھ پر ایک نظر

علامہ شبلی علیہ الرحمہ نے جس وقت دار المصنفین کے قیام کا خیالی ڈھانچا کھڑا کیا تھا اُس وقت اُس بلند حوصلہ علمبردار علم و حکمت کو کیا معلوم تھا کہ یہ باغِ علم عالم خیال سے عالم وجود میں اُس وقت آئے گا جب میری روح قفس عنصری کو چھوڑ کر باغِ ارم کو سدھاریگی۔ اور میرے قائم کردہ سلسلۂ ہیروز آف اسلام کی آخری کڑی میری ذات ہوگی۔ اور پھر اسکی کیا امید تھی کہ یہ باغ لگے گا اور پھل پھول لائے گا۔ مگر آفریں اور صد آفریں اُن کے اُن ارشد تلامذہ پر کہ جنھوں نے ایثار نفسی سے کام لے کر اپنے اُستاد مرحوم کی آرزو کو پورا کر دکھایا۔ اور لائق تعریف و مستحق تشکر یہ ہیں وہ عقیدت مندان و ارادتمندان شبلی جنھوں نے دست اعانت بڑھانے میں اُن کے شاگردوں سے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ اور اُنکے شاگردوں میں جس طرح اولیت و قدامت کا طرہ مولانا سلیمان و مولوی مسعود علی کی دستار کے لیے موزوں ہے اُسی طرح عقیدتمندوں میں مسٹر عبدالماجد صاحب کا فرق مستحق تاجِ اولیت ہے۔ خدا ان لوگوں کی حیات و فراغتِ حال کو بڑھائے اور امن دامان میں رکھے کہ دار المصنفین پھولے پھلے اور پروان چڑھے۔

دار المصنفین نے اپنی زندگی کے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ آؤ تو دیکھیں کہ اُس نے اپنی سہ سالہ زندگی میں کیا کیا کارہائے نمایاں کیے ہیں۔ اجمالی طور پر تو میں بغیر لوثِ عقیدتمندی اور بلاخوف تردید یہ کہنے کا مجاز ہوں کہ دار المصنفین نے تین سال کی مدت میں جو کچھ کر دکھایا ہے انجمن ترقی اُردو نے اپنی ساری عمر میں اتنا نہیں کیا ہے[1]۔

تفصیلی طور پر پہلے میں معارف کو لیتا ہوں۔ معارف اس وقت چوٹی کا علمی رسالہ ہے۔ یہ ایک مسلم الثبوت ریمارک ہے جو ہر قدر شناس علم اور ذوق سلیم رکھنے والے اصحاب و صحائف کی زبان سے ادا ہو چکا ہے۔ لیکن معارف میرے خیال میں مرحوم معارف علی گڈھ سے ابھی گوے سبقت نہیں لے گیا ہے ہاں جون اور جولائی کے پرچوں سے یہ آثار نمایاں ہیں کہ وہ اپنے نصب العین اور معیار پیش نظر کی جانب چند قدم اور بڑھ آیا ہے ؂ "سالے کہ نکوست از بہارش پیداست"۔ امید قوی ہے کہ وہ دن بہت دور نہیں ہے جبکہ یہ مشرقی و مغربی علوم کے ماہروں کی متفقہ کوشش سے مُلک علم کا خاتم سلیمانی اور اپنے

---

[1] کیا انجمن ترقی اُردو کی تنقیص کیے بغیر دار المصنفین کی تعریف ممکن نہیں؟ ایڈیٹر

"وقت کا مجدد الف ثانی ہو کر رہے گا۔ چند امور کی منیجر و ایڈیٹر کو خاص توجہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ضخامت کی ابتدائی قوت اور بڑھنی چاہیے۔ پانچ روپیہ قیمت ہے تو صفحات سو سے کم نہ ہونے چاہییں۔ اشاعت میں وقت معینہ کی پوری پابندی ہونی چاہیے۔" "تعذر" کے متعدی مرض سے بچنے کی ہمیشہ کوشش رہنی چاہیے۔ ایڈیٹر صاحب کو تو بیوی کی علالت کا عذر ہو ہی نہیں سکتا مگر منیجر صاحب کو بھی اس عذر سے بچنے کی ترکیب پر عمل کرنا چاہیے۔ انتخاب مضامین کے لیے چار پانچ لائق اشخاص کی ایک کمیٹی ہونی چاہیے۔ کتابت کی غلطی سے پرچہ کو یک قلم پاک رہنا چاہیے۔ ہر مضمون اپنی نوعیت میں جدید ہو اور انشا پردازی و معلومات کے اعتبار سے بے نظیر ہو۔ یہ چند مخلصانہ مشورے ہیں جن کو میں نے پیش کر دیا۔ ورنہ کارکنانِ دار المصنفین خود ایسے لائق و ہوشیار ہیں کہ مجھ جیسے ہیچمداں کے مشورہ کی اُن کو کیا حاجت۔

**تصنیفات و تالیفات** اس وقت تک جتنی کتابیں حلیۂ تصنیف و طبع سے آراستہ ہو کر نکلی ہیں اُن میں سے ہر ایک حسن صورت، حسن سیرت اور حسن رقم ہر حیثیت سے علمی دنیا میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہے۔ علمی خزانہ میں بیش بہا جواہرات کا اضافہ ہے۔ سلسلہ برکلے کی تینوں کتابیں مکالمات برکلے۔ برکلے اور اُسکا فلسفہ۔ اور مبادی علم انسانی جس پایہ کی کتابیں ہیں اور جس حسنِ قابلیت سے اُردو لباس میں لائی گئی ہیں اسکا اندازہ وہی لوگ خوب کر سکتے ہیں جو علوم مغربی و شرقی دونوں میں واقفیت نامہ رکھتے ہیں۔ مولانا عبد السلام کی انقلاب الامم آپ اپنی نظیر ہے۔ غرض یہ کہ ہر تصنیف تعریف سے بالاتر ہے۔ مگر سیرۃ نبوی کو چوٹی پر جگہ دینے کے بعد جس تصنیف کی داد دیجا سکتی ہے وہ ارض القرآن ہے۔ سیرۃ النبی پر اسکو فوقیت دینا تو سوء ادب ہے اور غالباً مصنف کتاب اپنے اُستاد کی تصنیف سے بڑھانا خود بھی پسند نہ کرینگے مگر حق یہ ہے کہ عربی تصانیف سے تو مجھ کو پوری واقفیت نہیں، اُردو میں کوئی کتاب اس وقت تک اس پایہ کی نہیں لکھی گئی ہے۔ مولوی عبد الحلیم صاحب شرر غالباً اس رائے میں میرا ساتھ دیں گے۔ میں جس وقت اس کتاب کو مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے مصنف کی وسعت معلومات اور مورخانہ ریسرچ پر حیرت ہوتی تھی[1]۔ عہد تاریک کے نا معلوم واقعات کا پتہ لگانے کے لیے مصنف نے کتنی راتیں آنکھوں میں بسر کر کے عبرانی، انگریزی اور عربی کتابوں کا مطالعہ کر کے عقل و قیاس کی کسوٹی پر پرکھ پرکھ کر مواد تاریخی جمع کیا ہے اور تطبیق دیگر اسناد و استدلال کے ساتھ بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور کتابی صورت میں اصحاب علم کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اسکا اندازہ اس عہد قدر ناشناسی میں بہت کم لگایا جائیگا۔ یہ کتاب اگر یورپ کی کسی زبان میں لکھی جاتی تو ساری علمی دنیا میں دھوم مچ جاتی۔ کوئی اخبار کوئی رسالہ ریویو سے خالی نہ رہتا اور صرف زبان و قلم سے مصنف کی حوصلہ افزائی نہ کیجاتی

---

[1] غیر عربی داں کے لیے یہ حیرت بالکل جائز ہے۔ ایڈیٹر

بلکہ سند یہ رقم پیش کیجاتی اور کتنے ایڈیشن کی نوبت پہونچ جاتی۔ مگر ہندوستان میں نہ کوئی انعام دینے والی سوسائٹی ہے اور نہ ریاستوں اور گورنمنٹوں میں ایسے علم شناس ارکان ہیں جو انتخاب کی اہلیت رکھتے ہوں۔ عوام سے تو علمی ذوق مفقود ہی ہے اور اگر ہے بھی تو ناول تک محدود ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی کتابیں پہلے ایڈیشن سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتی ہیں۔ ارض القرآن کے مصنف نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے مضمون کی خشکی کو انشا پردازی و زبان کی حلاوت و لطافت سے دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ جناب مہدی الاقتصادی صاحب میرے ہم خیال نکلیں گے۔

دار المصنفین کی خوبیاں جہاں بیان ہوئیں وہاں بعض عیوب کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے سب سے زیادہ بدنما داغ دار المصنفین کے دامن پر یہ نظر آتا ہے کہ کتابت کی غلطیوں سے کوئی کتاب بھی مبرا نہیں ہے ستم تو یہ ہے کہ سیرۃ نبوی جو اتنے انتظام و اہتمام، تزک و احتشام سے چھپی اُس میں بھی کتابت کی بعض ایسی ایسی فاش غلطیاں رہ گئیں کہ دل دکھتا ہے۔ مبادی علم انسانی کے اغلاط پر مسٹر عبد الماجد بھی ملامت کر چکے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ارکین دار المصنفین اس نقص کو دور کرنے کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول رکھیں گے۔

ایک مشورہ میرا یہ ہے کہ جو رفقا بغرض درس وہاں داخل ہوں اُن کو مدت درس ختم کرنے کے بعد کسی خاص سبجکٹ پر جس سے اُنکو دلچسپی اور مناسبتِ طبع ہو کوئی کتاب تصنیف کرنے کو دی جائے اور وہ کتاب کمیٹی میں پیش ہو کر جب پاس ہو جائے تب اُنکو سند اور انعامی تمغہ دے کر رخصت کیا جائے۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ کتبخانہ دار المصنفین کا ایسا ہونا چاہیے جو بلحاظ نوادرات و تعداد کتب و بلحاظِ عمارت اُس کے شایانِ شان ہو۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ان دونوں حیثیتوں سے اُسکا رتبہ گرا ہوا ہے۔ کتابوں کی خریداری ایک ہزار روپیہ سال سے کم کی نہیں ہونی چاہیے۔ بہت سے گھروں میں نادر نادر کتابیں صندوقوں میں بند پڑی ہیں اُنکا پتہ لگا کر حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ بہت سے شخصی کتبخانے سلسلہ جنبانی کرنے سے ہاتھ آ سکتے ہیں۔ مثلاً جناب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، ابو الکلام آزاد، نواب عماد الملک وغیرہ جیسے محب دار المصنفین ایک معمولی تحریک پر میرا قیاس ہے کہ اپنا اپنا کتبخانہ منتقل کر دے سکتے ہیں۔ عمارت کی طرف بھی علم دوست، فیاض دل رؤسا اور والیان ملک کے آگے ایک اسٹمیٹ پیش کر دینا لازمی ہے۔ کیا عجب ہے کہ کوئی دست کرم اُٹھ جائے۔ میں خاموش ہی سوال کرنے کو کہتا ہوں تاکہ آپ کے حصول سعی کا اصول ٹوٹ نہ جائے۔

آخر میں اس خبر پر اظہار مسرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کہ مولانا حمید الدین صاحب بھی حیدرآباد سے مستعفی ہو کر تکمیل سیرۃ نبوی کی غرض سے اعظم گڈھ آرہے ہیں۔ قرآن پاک کی ادبی خوبیاں اور نکات کو دکھلانے والا اس وقت ہندوستان میں اُن سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اور شیدائیانِ سیرۃ نبوی کے لیے یہ مژدۂ جاں فزا ہے کہ اُسکا وہ حصہ جو قرآن سے متعلق ہے مولانائے ممدوح کے اعظم گڈھ میں اقامت گزیں ہونے سے جلد تکمیل پاکر مطالعہ کی میز پر آجائے گا۔ اور اب دارالمصنفین کی عمارت چار ایسے ستونوں پر کھڑی ہو جائے گی کہ جن کے استحکام پر رشک کی نگاہیں پڑنے لگیں گی۔ وہ چاروں ستون اپنی شخصیت کے اعتبار سے یہ نام رکھتے ہیں۔ (۱) مولانا سید سلیمان (۲) مولانا عبد السلام (۳) مسٹر عبد الماجد۔ (۴) مولانا حمید الدین۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ آمین۔

"ابوالکمال"

# جذبات قدسی

شام فراق کس نے دل سوزیِ وفا کی　اک شمع تھی سرہانے جو صبح تک جلا کی
ہوتے ہیں دل جلے ہی دلسوز دل جلوں کے　جل جل کے شمع مجھ کو دیتی سکوں دیا کی
یکرنگیوں کے یہ نقش اُبھریں گے اور دن دن　میں اور شمع دونوں تصویریں ہیں وفا کی
اک سوزشِ مجسم دونوں کی ہستیاں ہیں　گرم آنسوؤں کی ریزش تمہید ہے فنا کی
مجھ کشتۂ تغافل اور شمع کی نہ پوچھو　کرتے ہیں یاد ادائیں چشمِ کرم نما کی
دونوں کی زندگی ہے صورت نمائے عبرت　دونوں کی بےکسی ہے بےمہریوں کی شاکی
دونوں کی روح یکساں موقوفِ سوزِ غم ہے　گھل گھل کے جان دینی اک آن ہے وفا کی
جل جل کے خاک ہونا دونوں کے واسطے ہے　دیکھے تو کون دیکھے شدت غم و بلا کی
دونوں پہ شامِ غم ہے اک بےکسی کا عالم　احساں نہ دوست کا ہے منت نہ آشنا کی
ہیں سرد مہریوں کی شاہد ہماری آنکھیں　گرم آنسوؤں کی ندی جب دیکھیے بہا کی
دل رات بھر جلا ہے شاہد ہے شمعِ بالیں　آہوں نے سوزشِ غم کچھ اور بھی سوا کی
سوز و گداز دل کا کچھ کچھ تو رنگ لایا　غمخوار شمع نکلی مجھ غم کے مبتلا کی

قدسی جائسی

## ہر شہر میں شور مچ رہا ہے

شریف بیگماتوں کے بناؤ سنگار کے کیلئے حکیم محمد یعقوب خاں نے زنانہ سنگھار بکس اور عام عورتوں اور مردوں کے لیے پریجمال صابن کیا لاجواب ایجاد کر کے گورنمنٹ سے رجسٹرڈ کرا لیے ہیں۔

## قیمتی زنانہ سنگھار بکس رجسٹرڈ

معزز حضرات اس بکس میں پانچ چیزیں اور انعام ہیں (۱) پریجمال صابن ایک ٹکیہ (۲) پری بہار تیل ۲ تولہ شیشی (۳) بال صفا صابن ایک ٹکیہ (۴) خوشبودار مسی ۱ تولہ (۵) پان کی بہار ایک ڈبیہ اور سرمہ نور بصر مفت انعام دیا جاتا ہے۔ فی بکس ۲ روپیہ۔ بکس کلاں کے علاوہ کنگھا قیمتی آئینہ ہوگی ۲ روپیہ

## پری جمال صابن رجسٹرڈ

حسن خوبصورتی کا بکس۔ خاص خوبصورتی پیدا کرنے اور چہرہ کو گلرنگ بنانے میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ چہرہ کے تمام داغ۔ دھبے۔ چھائیاں رفع کرتا ہے۔ فی بکس تین ٹکیہ مع صابندانی۔ ایک روپیہ

## پتہ منیجر دواخانہ نورتن دہلی پریجمال منزل

## نوٹو۔ نوٹ۔ صرف تین ماہ کیلئے خاص رعایت

(۱۵ جولائی سے ۱۵ اکتوبر تک)

ہر عورت۔ مرد۔ بچے کو آجکل کے زمانہ میں انگریزی تعلیم ضرور دینی چاہیے اس آسانی کیلئے ہم ایک مفید کتاب پیش کرتے ہیں۔

## انگلش ٹیچر اردو انگریزی

اس لاجواب کتاب میں گرامر، انٹیلیشن، ایڈیم اور لیٹر رائٹنگ وغیرہ درج ہیں تلفظ کے لفظ و تلفظ اردو میں لکھے گئے ہیں یہ کتاب طالبعلموں کیلئے یا ان لوگوں کیلئے [illegible] جو انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے صفحہ ۳۴۴ مجلد کی قیمت [illegible]

بال اڑانے کا اصلی صابن۔ ہمارا مشہور بال صفا صابن جہاں بالوں پر لگائیں چند منٹ میں بال اڑ جاتے ہیں فی بکس ۳ ٹکیہ [illegible]

## پتہ منیجر شہرت ایجنسی دہلی شفاخانہ۔

---

## رسالہ تذکرۃ الشعرا علیگڈھ

یعنی

علی گڈھ کا مشہور ادبی رسالہ جو حسرت موہانی کی نظربندی اور قید کے زمانہ میں مجبوراً کچھ دنوں بند رہنے کے بعد اب جولائی سنہ ۱۹۱۷ء سے دوبارہ جاری ہوا شایع ہوگا۔ چنانچہ جولائی و اگست کے پرچے زیر طبع ہیں ہر پرچے میں منجملہ دیگر مضامین نظم و نثر حسرت موہانی کی زندانی تصنیف "نکات سخن" باقساط شایع ہوا کریگی۔ اور باقی اجزا التزاماً تذکرۂ شعرا و انتخاب دواوین اساتذہ پر مشتمل ہونگے جن میں سے اکثر دیوان ایسے ہیں جو اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتے۔ شائقین سخن کو منی آرڈر قیمت یا اجازت وی پی فوراً روانہ کر کے شروع سے خریدار ہو جانا چاہیے ورنہ بعد میں ابتدائی پرچوں کا ملنا دشوار ہوگا۔ فقط

## المشتہر منیجر رسالہ تذکرۃ الشعرا علی گڈھ سٹی

ہندوستان کی صنعتی نمائشوں سے طلائی و نقری تمغہ جات حاصل ہو چکے ہیں۔ ملیریا اور نزلہ و بخار اور معمولی طاعون میں باٹلی والا کی بخار کی دوائی کلاں یا بخار کی گولیاں استعمال کرنا چاہیے قیمت ۱۲

باٹلی والا کا بالم روٹ بچوں اور کم طاقتوں کا روح پرور ہے۔ ۱۲

دوسری مشہور ادویہ

باٹلی والا کی خالص کونین کی گولیاں۔ ایک یا دو گرین کی ہر شیشی میں سو گولیاں

بخار کی دوا (خرد) قیمت ۱۲ کالیرول ہیضہ اور قے دست کیلئے ۱۲

مقوی گولیاں (ایبرال ٹانک) کمی خون اور اعضاے رئیسہ میں ضعف و اختلال کے لیے۔

کیڑوں کا مرہم کیچڑوں کیلئے قیمت ۱۲ دانتوں کا منجن ۴

یہ ادویہ ہر جگہ ملتی ہیں اور پتہ ذیل پر بھی مل سکتی ہیں

## ڈاکٹر ایچ ایل باٹلی والا سنس اینڈ کمپنی لمیٹڈ ورلی لیبوریٹری بمبئی۔

تار کا پتہ۔ باٹلی والا دادار بمبئی

## ایکسو زائد مصنفین اُردو کی مکمل تصنیفات کی فہرست منگا لیجئے

**تاریخ تمدن** سر ہنری طامس بکل کی لاجواب کتاب ہسٹری آف سولیزیشن کا ترجمہ فلسفہ تاریخ کی یہ بہترین کتاب ہے جسمین تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیے گئے ہین جسطرح طبیعات وغیرہ علوم کے اصول مدون ہوے ہیں۔ دو جلد قیمت ۱۲؍

**تاریخ اخلاق یورپ** انگلستان کے مشہور و معروف علمبردار عقلیت ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی لاجواب کتاب کا ترجمہ جسمین یونان و روم اور دیگر قدیم اقوام کے مذاہب فلسفہ اور اُن کے اخلاقی ثمرات کی تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہے قیمت جلد اول ے

**مشاہیر یونان و روما** حکیم پلوٹارک یونانی کی لاجواب کتاب پیرلیل لائوز کا ترجمہ جسمین یونان و روم کے اولوالعزم مدبرین اور نامور شہنشاہون کے سوانحی حالات اور ان کے بیش بہا خیالات درج کر کے ازراہ تبصرہ ایک دوسرے کا تقابل کیا گیا ہے۔ انگریزی مترجم کو اس کتاب کے ترجمہ کے صلہ مین "نائٹ" کا لقب دیا گیا جس سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیئے۔ مغرب کو قعر ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہونچانے مین اس لاجواب کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے حُبِ وطن ایثار کامل بے نفسی جان نثاری اور اولوالعزمی کی زندہ اور سچی تصویرین ان اوراق مین صاف نظر آئینگی۔ قیمت جلد اوّل ۴؍ جلد دوم ۴؍

**تاریخ یونان قدیم** اردو زبان مین یونان کی سب سے پہلی جامع و نافع تاریخ قیمت عہ

**رہنمایان ہند** ہندؤن کا اصلی مذہب کیا ہے؟ اور اُس مین کیا کیا تبدیلیان ہوئی ہین؟ کرشن جی سدارتھ، گوتم بُدھ کی تعلیمات، شنکراچارج، رامانج، رامانند، گورکھ ناتھ اور کبیر کی تلقینات اور باداجی سورداس تلسی داس اور بیجے دیو کے حالات۔ قیمت۔ عہ

**امرائے ہنود** عہد مغلیہ کے ہندو امرا وزرا اکابر و مشاہیر عہدداران و امرا کے حالات قیمت ۱۲؍

**نپولین اعظم** اس نامور فاتح اور شہنشاہ کی مکمل سوانح عمری پانچ جلدون مین قیمت للعہ

**مسلمانان اندلس** اسٹینلی لین پول کی مشہور تاریخ کا اردو ترجمہ قیمت عہ

**البیرونی** علامہ ابوریحان بیرونی مصنف کتاب الہند کی سوانح عمری اور ان کی تصانیف پر تبصرہ قیمت عہ

**شباب لکھنؤ** عہد نصیرالدین حیدر بادشاہ مین لکھنؤ کی درباری حالت عہ

**فتح قسطنطنیہ** یعنی اسلام کی ایک جلیل القدر اور مہتم بالشان فتح کی تاریخ مؤلفہ حاجی مرزا الدین احمد بی اے عہ

**محاربات طرابلس** از شیخ محمد شوکت علی بی اے یعنی مسٹر ای این بنیٹ نامہ نگار اخبار مانچسٹر گارڈین سابق ممبر پارلیمنٹ کی لاجواب کتاب "وِدھ دی ٹرکس ان ٹریپولی" کا ترجمہ جسمین جنگ طرابلس کے چشم دید حالات ترکی افواج کی کیفیت خطۂ اسلامیہ طرابلس کے جغرافیائی ملکی۔ قومی، اور معاشرتی حالات ادیبانہ و مورخانہ شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور اسی وجہ سے کتاب جنگ کے بعد بھی ایک مستقل تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پڑھی جانے کے لائق ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحے معہ ۴ تشریحی نقشون کے قیمت عہ

**محاربات صلیبی** بیت المقدس کی قربانگاہ پر جو عظیم الشان قربانیان چڑھائی گئی ہیں اُن کے مفصل حالات قیمت عہ

**علوم طبیعہ کی تاریخ** علوم طبیعہ کی ان تمام ترقیات اور ایجادون کی تشریح جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لیکر انیسوین صدی مسیحی تک تا وقتاً عمل میں آتی رہی ہین۔ سائل کی تحقیقات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم و جدید حکماء نے ان علمی دریافتون اور ایجادوں میں کیا کیا حصہ لیا۔ مضامین کی وضاحت کے لیے صدہا تصویرین دی گئی ہیں قیمت ہر دو جلد ۱۲؍

**تاریخ مذہب** اس مین مذہب کی ابتدا و ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذاہب مثلاً بابلی اور اسوری مصری اور چینی اور دیگر ممالک و اقوام کے مذہب کی مختصر تاریخ درج ہے۔ قیمت ۸؍

**تاریخ مصر** مصر کی قدیم رسم و رواج طرز معاشرت عادات وغیرہ کے مفصل حالات قیمت

رجسٹرڈ نمبر ل ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم



# الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

| | | |
|---|---|---|
| نمبر ۱۲۴ | ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء | جلد ۲۱ |

(: فہرست مضامین :)



قیمت فی پرچہ ۵

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

قیمت فی پرچہ [illegible]

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

# قابل دید کتابیں

**فلسفہ تعلیم** حکیم ہربرٹ اسپنسر کی لاجواب کتاب کا ترجمہ جسکے مطالعہ سے مسلۂ تعلیم پر نہایت صاف روشنی پڑتی اور بڑی حد تک اس منزل دشوار میں رہنمائی ہوتی ہو قیمت عمر

**تاریخ التعلیم** ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج جنھون نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کے لیے وقف کر رکھی ہے اور فن تعلیم کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہو کہ مسلمانان ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو اس قدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو یہ کتاب انھین کے رشحات قلم سے نکلی ہو اور اس قابل ہو کہ وہ تمام اصحاب جو ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کا مطالعہ فرمائیں قیمت عمر

**اساس التعلیم** بچونکی ابتدائی تعلیم کن اصولون پر ہونی چاہیے علمی اور عملی تدابیر معہ متعدد عکسی تصاویر قیمت ۶ر

**چھوٹے بچونکی تعلیم کے اصول** ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خان کا لاجواب لکچر قیمت ۴ر

**فلسفہ اجتماع** علم النفس کی لاجواب کتاب جسمین اُن کیفیات و حسیات نفس کا بیان ہے جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہین قیمت عمر

**فلسفہ ازدواج** جسکے متعلق مولانا حالی مرحوم نے یہ قیمتی رائے ظاہر فرمائی تھی کہ ہر متاہل اور غیر متاہل شخص کا فرض ہو کہ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک بار بار پڑھے اُسکی ہدایتون پر عمل کرے اور جس ہدایت پر خود نہ عمل کرسکتا ہو اُس پر اپنے متاہل دوستون اور عزیزون اور اُن نوجوانوں کو جو عنقریب اس جوے کو اپنی گردنوں پر رکھنے والے ہیں اُن پر عمل کرنے کی تاکید کرے۔ ایک جلد منگا کر ملاحظہ فرمایئے قیمت عمر

**الناظر بک ایجنسی کی**
**مکمل فہرست**
**مفت بھیجی جاتی ہے**

**القول الاظہر** علامہ ابن مسکویہ نے صانع عالم کا ثبوت دلائل فلسفیہ سے پھر مسئلہ نفس اور اسکے ادراکات کا بیان اور نبوت کا اثبات بڑی خوبی سے کیا ہے مسئلہ ارتقا جو ڈارون کا نظریہ کہا جاتا ہو اسکا ذکر اس کتاب مین موجود ہے قیمت عہ

**القمر** چاند کی ماہیت و حقیقت پر علم ہیئت و ریاضی کی رو سے بحث۔ جدید معلومات کا ذخیرہ قیمت ۸ر

**علم المعیشت** یعنی اصول اکنامکس یا اقتصادیات پر اُردو میں سب سے پہلی جامع و مستند کتاب جس کی خوبی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہو کہ اس کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اپنی کتاب علم الاقتصاد کے متعلق لکھا کہ اب اسکے پھر چھپنے کی ضرورت نہین تمثیلات تمام تر ہندوستان کی دی گئی ہیں اور ہر مسئلہ کا انطباق اسی ملک کے حالات سے کیا گیا ہو قیمت سے

**مقدمات الطبیعات** پہلی مکمل کتاب طبیعات پر قیمت عہ

**مبادی سائینس** علم حیوانات، نباتات اور معدنیات کے تمام ابتدائی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہین قیمت ۶ر

**طبقات الارض** پہلی مکمل کتاب ارضیات پر قیمت عہ

**رموز فطرت** سائینس کے ابتدائی و بنیادی مسائل قیمت ۶ر

**انسان** انسان کی حقیقت و ماہیت سائینس کے اصولون پر ۸ر

**جان کی دشمن "مکھی"** مکھی کی وجہ سے جو امراض پھیلتے اور جسقدر انسانی زندگیان تلف ہوتی ہیں اُس کی حقیقت عام نگاہون سے پوشیدہ ہو اس رسالہ کے مطالعہ سے ہر شخص ان حالات سے آگاہ ہوکر اپنے اور اپنے خاندان والونکی تندرستی و صحت کا انتظام کرلے قیمت ۸ر

**رسالہ علم فلاحت** ۶ر **رسالہ علم برق** ۶ر

# مطبوعات جدیدہ

## خاتم المرسلین

**مولانا عبدالحلیم شرر کی جدید ترین تالیف**

جسمیں نہایت فصاحت کے ساتھ اور دلکش انداز میں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات زندگی کامل تحقیق و تفتیش کے بعد لکھے گئے ہیں قیمت ہے مجلد

## منطق استخراجی و استقرائی

(از میر عالم علی خاں بی اے۔ بی۔ سی۔ ان)

اردو زبان میں علم منطق کی پہلی جامع و مبسوط کتاب ہے جو ایک لائق گریجویٹ نے بڑی تحقیق کاوش اور عمیق غور و مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔

اسکے ابتدا میں علم منطق پر ایک قابل قدر مقدمہ ہے پھر کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے حصہ میں استخراج یعنی کلیہ، قضیہ، استدلال اور قواعد قیاس کا بیان ہے۔

دوسرے حصہ میں استقرا اور طرق استقرا کی بحث ہے تیسرے حصہ میں مغالطات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اور چوتھے حصہ میں علم منطق کی تاریخ لکھی گئی ہے جن اصحاب کو اس فن سے دلچسپی ہے یا جو اس کی تحصیل کا شوق رکھتے ہوں اُن کے لیے کتاب یقیناً نہایت مفید و کارآمد ہو گی۔

ضخامت ۳۴۴ صفحے۔ کتاب مجلد ہے قیمت عہ/

## طمانچہ بر رخسار یزید

خواجہ حسن نظامی صاحب کا لکھا ہوا جدید ناول جس میں یزید و ابن زیاد وغیرہ کی خفیہ ریشہ دوانیوں کے نظارے ظلم و جفا کی دردناک داستان محبان اہل بیت عورتوں کی جاں بازیاں اور سر فروشیاں بنی امیہ کا تخت الٹ دینے کی سازشیں بنی ہاشم کی حکمت عملی کے کارنامے نہایت موثر انداز سے دکھائے گئے ہیں قیمت صرف عمہ/

## حجاج ابن یوسف

جسمیں عبداللہ بن زبیر محمد بن حنیفہ اور بنو امیہ کے اُن مناقشوں اور لڑائیوں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں جو مسئلہ خلافت پر ہوئے قاتلان امام حسین علیہ السلام سے انتقام کا لیا جانا مکہ معظمہ کا محاصرہ حجاج کی حرم محترم پر سنگباری عبداللہ بن زبیر کا قتل اور عبدالملک کا خلافت پر استقلال حسن و سمیہ کی سچی محبت کی داستان۔ یہ تمام واقعات پر اثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ناول کیا ہے تمام تمدن و معاشرت کا مرقع۔ عرب کے اخلاق و عادات کا آئینہ اور خلافت کے نازک ترین زمانہ کی مکمل تاریخ ہے۔ قیمت ۱۲/

**سراغرسان عاشق** جسمیں ایک خوفناک قتل کا راز پر اسرار قاتل کی حیرت افزا چالیں بے گناہوں کا مشتبہ الزام میں مصائب برداشت کرنا۔ نوجوان دولتمند کی جاسوسی و متوں کی ہمدردی وفا پرست معشوقوں کی سچی وفاداریاں پولیس کی تحقیقات قاتل کی خودکشی اور افشائے راز عاشق و معشوق کی شادی کے دلچسپ مناظر دلکش پیرایہ میں قلمبند ہوئے ہیں قیمت ۸/

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# النّاظر

نمبر ۱۲ جلد ۲۱ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹ء

## تنقید الفاروق

بسلسلہ الناظر ماہ ستمبر سنہ ۱۹ء

اسکے بعد اگرچہ ترتیب کلام کا اقتضا یہ تھا کہ عقد زنار کا مسالہ حل کیا جاتا، لیکن چونکہ اسکے متعلق ہمارا ایک دلچسپ مستقل جواب علیحدہ موجود ہے جو عنقریب آتا ہے اور جہاں ہمنے مصنف کے خلاف اس بات کو اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ یقیناً زنار کے معنی پیٹی کے نہیں ہیں، بلکہ ذمیوں کی بحث میں اس سے مراد وہی جنیو یا موٹا ڈورا ہے جسے فقہا کہتے ہیں، اسلیے ہم اس بحث کو یہاں قلم انداز کرتے ہیں اور بجائے اسکے جلا وطنی کی بحث کو لیتے ہیں۔

اس خاص بحث میں چونکہ مصنف نے یہ احتیاط کی ہے کہ اپنی عادت مستمرہ کے خلاف کسی شخص کو نگاہ عنایت کا بسمل نہیں بنایا ہے اس لیے ہم بھی اسکے متعلق زیادہ کاوش کو ضروری نہیں سمجھتے تاہم مصنف کے خلاف اس موقع پر اتنا ضرور کہیں گے، کہ نجرانیوں کا اخراج یمن اور اُسکے اطراف سے جیسا کہ مصنف کا خیال ہے صرف پولٹیکل ضرورت سے نہیں تھا، بلکہ زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ ضرورت کے علاوہ جب خود اہل نجران نے باہمی حسد کی بنا پر اپنے آپ جلا وطن کیے جانے کی درخواست حضرت عمر سے کی، اُس وقت اُنھوں نے اُنھیں خارج کیا چنانچہ یہ مضمون بعض معتبر روایات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، پس اس مقام پر مصنف ابن ابی شیبہ سے ایک روایت اس

مضمون کی نقل کرتا ہوں جو سالم کی روایت سے منقول اور متصل السند بھی ہے، اور وہ یہ ہے،

نا وکیع نا الاعمش عن سالم قال کان اہل نجران قد بلغوا اربعین الفاً قال وکان عمر یخافہم ان یمیلوا علی المسلمین فتحاسدوا بینہم فاتوا عمر فقالوا اجلنا قال وکان رسول اللہ قد کتب لہم کتاباً ان لا یجلوا فاغتنمہا عمر فاجلاہم فندموا فاتوہ فقالوا اقلنا فابیٰ ان یقیلہم[1]

سالم کہتے ہیں کہ نجرانیوں کا شمار چالیس ہزار تک پہونچ گیا تھا، حضرت عمر اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ مسلمانوں پر ٹوٹ نہ پڑیں، پھر آپ ہی اُنھوں نے باہم حسد کیا اور حضرت عمر کے پاس آکر کہا کہ ہمکو جلاوطن کر دیجیے، رسول اللہ نے انکو ایک نوشتہ دیا تھا جسمیں لکھا تھا کہ وہ جلاوطن نہ کیے جائیں، حضرت عمر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ درخواست خود انکی طرف سے ہوئی ہے، پھر انھیں جلاوطن کر دیا، جب وہ نادم ہوکر پھر آئے اور حکم سابق منسوخ اور در گذر چاہا تو حضرت عمر نے نہ مانا۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو حضرت عمر اہل نجران کے اجتماع سے خائف تھے لیکن تا وقتیکہ خود نجرانیوں نے باہمی حسد کی بنا پر اپنی طرف سے جلاوطن کیے جانے کی درخواست نہیں کی حضرت عمر نے اُنھیں جلاوطن نہیں کیا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل نجران کے پاس جناب رسول اللہ کا ایک نوشتہ تھا جس میں آپ نے لکھ دیا تھا کہ وہ جلاوطن نہ کیے جائیں، پھر کیونکر قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے آنحضرت کے حکم کے خلاف بغیر اُنکی درخواست کے اپنی طرف سے (گو سخت سے سخت ضرورت ہی کی بنا پر کیوں نہ ہو) اُنھیں جلاوطن کیا ہوگا،

اسکے بعد انھیں مباحث کے سلسلے میں مصنف نے جزیے کی بحث بھی چھیڑ دی ہے۔ یہ بحث بھی مصنّف کی معرکۃ الآرا بحثوں میں سے ایک ہے، اسکے متعلق اگرچہ ہم نے ایک مختصر تنقید علمی مصنف کے اُس قول پر کی ہے جہاں اُس نے الفاروق صفحہ ۱۶۸ میں لکھا ہے کہ جزیے کا مصرف فوجی مصارف پر محدود تھا یعنی اُس رقم سے صرف اہلِ فوج کے لیے خوراک، لباس اور دیگر ضروریات بہم کی جاتی تھیں لیکن اسکے علاوہ ہم اس مقام پر دوسری حیثیتوں سے بحث کر کے مصنف کی دیانت اور تحقیق کو منظرِ عام میں لانا چاہتے ہیں،

مصنّف نے اپنے اس دعوے پر کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا، جہاں اور بہت سے دلائل الفاروق وغیرہ میں لکھے ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ

خاص معرکہ یرموک کے پیش آنے کے وقت جب اسلامی فوجیں شام کے مغربی حصے سے ہٹ آئیں اور

[1] منقول از نسخۂ قلمی موجودہ کتب خانۂ مولانا عبدالحی مرحوم لکھنوی

انکو یقین ہو گیا کہ جن شہروں سے وہ جزیہ وصول کر چکے تھے یعنی حمص، دمشق وغیرہ وہاں کے باشندوں کی حفاظت کا اب وہ ذمہ نہیں اٹھا سکتے تو جزیہ سے جس قدر رقم وصول ہوئی تھی سب واپس کر دی گئی، اور ان سے صاف کہہ دیا گیا کہ چونکہ ہم اس وقت تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم کو جزیہ کے لینے کا کوئی حق نہیں"

بیشک یہ صحیح ہے کہ حضرت ابو عبیدہ نے اس نازک وقت میں عام طور پر تمام عاملان ماتحت کو لکھا تھا کہ وہ اُن رقوم کو واپس کر دیں جو انھیں جزیے سے وصول ہوئی ہیں، لیکن واقعہ کی خاص خصوصیتیں جنھیں مصنف نے قلم انداز کر دیا ہے یہ ہیں،

(۱) اس میں جزیہ کی کوئی تخصیص نہیں تھی، بلکہ خراج سے جو رقم وصول ہوئی تھی اُسکی بھی واپسی کا حکم تھا جو ایک معنی خیز امر ہے،

۲. اس واپسی کی وجہ جن الفاظ میں بیان کی گئی تھی وہ یہ ہیں،

| | |
|---|---|
| انما رددنا علیکم اموالکم لانہ قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع وانکم قد اشترطتم علینا ان نمنعکم وانا لا نقدر علی ذلک | جتنے تمہارے مال کو اس لیے واپس کر دیا ہے کہ ہمکو دشمنوں کی تیاری کی خبر ہوئی ہے، اور تم لوگوں نے ہم سے شرط کی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں اب ہاکیس پر قدر |

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ واپسی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مفتوحین نے خاص طور پر اپنی حفاظت کی شرط لگائی تھی جسے ابو عبیدہ نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور اُس وقت اُس شرط کا ایفا نہیں ہو سکتا تھا،

۳ - معاہدات شام میں امیر فوج حضرت ابو عبیدہ کا ایسی شرطوں کو تسلیم کرنا اور مفتوحہ قوموں کو انکے مطلوبہ حقوق کا دینا محض تالیفِ قلوب کی حکمت عملی پر مبنی تھا اور اس میں یہ غایت مضمر تھی کہ دوسری قومیں بھی سن سن کر مصالحت کی طرف جلد جلد مائل ہوتی جائیں، خاص الفاظ یہ ہیں،

| | |
|---|---|
| انما کان ابو عبیدۃ یجیبہم الی الصلح علی ہذہ الشرائط ویعطیہم ما سألوا یرید بذلک تالفہم ویسمع بہم غیرہم من اہل المدن التی لم یطلب اہلہا الصلح فیسارعوا الی طلب الصلح ، | حضرت ابو عبیدہ جو ان شرطوں پر صلح کر لیتے تھے اور جو حق وہ مانگتے تھے وہ انھیں دیتے تھے اس سے غرض تالیف قلب تھی امید کہ دوسرے شہر والے جنھوں نے ابھی تک صلح نہیں کی ہے اس بات کو سنیں اور صلح کی طرف پیش قدمی کریں، |

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ شرط حفاظت کو عموماً داخل معاہدات کرنا ایک ضروری مصلحت پر مبنی تھا نہ خاص اس لیے کہ جزیہ کے واسطے حفاظت کی شرط ایک لازم غیر منفک بات تھی،

۴ - جزیے کی کل رقم واپس نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف وہ رقمیں دی گئی تھیں جو شہروں سے وصول ہوئی تھیں، اور دیہات کی کل وصول شدہ رقمیں بجائے واپس دینے کے مسلمانوں میں تقسیم ہوئیں اور یہ بھی ایک معنی خیز امر ہے، خاص الفاظ یہ ہیں،

| | |
|---|---|
| وما كان ابوعبيدة اخذه من القرى التى حول المدن من الاموال والسبى والمتاع فلم يرده عليهم وقسمه بين المسلمين بعد ان، الخ | حضرت ابو عبیدہ نے دیہاتوں سے جو مال ومتاع لونڈی غلام وغیرہ لیے تھے اُنھیں واپس نہیں دیا بلکہ اُن کو مسلمانوں میں تقسیم کیا، الخ |

۵ - جو رقمیں واپس دی گئی تھیں پھر اُنکو دوبارہ واپس کرنے کے لیے خود باشندگان شہر اُسوقت لائے جبکہ حضرت ابوعبیدہ دوبارہ ان اضلاع میں ہوکر گذرے اور انھوں نے شرائط سابقہ پر اُنھیں بحال رکھا، خاص الفاظ یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| وكلما مر على مدينة مما كان صالح اهلها وكان ابه فيها قد رد عليهم ما كان اخذ منهم تلقوه بالاموال التى كان ردها عليهم مما كانوا اصولحوا عليه من الجزية والخراج، الخ[1] | جب کسی ایسے شہر میں گذرتے جہاں کے لوگوں نے صلح کی تھی اور حاکم نے وصول شدہ جزیہ اور خراج کی رقمیں انکو واپس دی تھیں تو وہ لوگ پھر ان مالوں کو لیکر آتے اور حضرت ابو عبیدہ سے ملتے، |

اب ان قلم انداز باتوں کو بھی پیش نظر رکھ کر انصاف سے دیکھنا چاہیے کہ جزیہ مقرر کرتے وقت خاص حفاظت کی شرط کو اپنے اوپر لازم کر لینا کن اسباب کی بنا پر تھا ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خیال بہت صحیح ہے کہ وضع جزیہ کے بعد اکثر صورتوں میں مسلمانوں پر ضرور تھا کہ وہ اہل ذمہ کی حفاظت کریں۔ لیکن کلام اس میں نہیں، بلکہ اس میں ہے، اور دیکھنا بھی خاص کر یہ ہے کہ آیا جزیہ اہل ذمہ کی صرف اُس حفاظت کا معاوضہ تھا جو بیرونی حملوں سے اُنکی کیجاتی تھی، یا یہ کہ اسلام کو قبول نہ کرنے کے بعد شارع نے محض ترحماً ایک زائد صورت اُنکی جان بچانے کی یہ نکالی تھی، کہ وہ جزیہ دیں جس کے بعد وہ قتل سے محفوظ رہیں گے،

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس بحث کے متعلق مصنف کی تمام خامہ فرسائی کا اصل اصول ایک امر معلوم ہوتا ہے، اس لیے مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اُس پر بڑی احتیاط سے نظر ڈالی جائے سب سے پہلے جب ہم اس باب میں اسلام کی حقیقی واصلی کتاب قرآن مجید کی طرف

---

[1] اس عبارت اور عبارات سابقہ کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج صفحہ ۸۱

رجوع کرتے ہیں، تو نہایت خوشی سے دیکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے صاف لفظوں میں سورۂ توبہ کے اندر یہ آیت نازل فرمائی ہے

وقاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر (الآیۃ) اور ان لوگوں سے مقاتلہ کرو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے

یہ آیت ذمیوں کے باب میں بغیر کسی پیچیدگی کے نہایت واضح طور پر پکار رہے کہ رہی ہے کہ اُن سے لڑو اور مقاتلہ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر ہاتھ سے جزیہ دیں، جزیہ دینے کو مقاتلہ کی غایت قرار دینا، اسکے صریح یہ معنی ہیں کہ جب تک وہ جزیہ قبول نہ کریں، اُنکے مقاتلہ سے باز نہ رہو، ہاں جب جزیہ دیں تو اُنکی جان بخشی کرو،

اس سے ایک غیر متعصب انصاف پسند شخص سمجھ سکتا ہے کہ جزیہ اصلی طور پر فی حد ذاتہ کیا حیثیت رکھتا تھا؟ جزیہ صرف قتل سے بچنے کے لیے ایک سپر تھی جسکی آڑ میں اہل ذمہ مسلمانوں کی تلوار سے پناہ لیتے تھے، یہ شارع کا وہ قرارداد ٹکیس تھا جسے دے کر وہ فاتح قوم کے قتل سے اپنے لیے ذریعۂ نجات حاصل کرتے تھے، اگرچہ شارع کی نیامنی اور مزید عنایت سے بعد میں اور بہت سے حقوق کے علاوہ یہ حق بھی اُنھیں دیا گیا کہ بسا اوقات بیرونی حملوں سے اُنکی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیا گیا، لیکن اس سے صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دشمنوں سے بچانے اور اُنکی طرف سے لڑنے کا ایک معاوضہ تھا جسے اہل ذمہ مسلمانوں کو بطور اجرت و معاوضہ کے دیتے تھے، حدیث اور آثار صحابہ میں اگرچہ ایسی تصریحیں جو بالکل قاطع احتمالات ہوں قریباً نہیں ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ قرآن کی اس واضح تعلیم کے ہوتے ہوئے ہم کو اُن تصریحات کی ضرورت بھی نہیں ہے، مگر دقت یہ ہے کہ جو لوگ مورخانہ تحقیق کو صرف تاریخ کی چند کتابوں کی اوراق گردانی پر منحصر سمجھتے ہیں، اُنکی تسلی صرف اسقدر سے نہیں ہو سکتی، اس ضرورت اور صرف اس ضرورت سے ہم تاریخی حیثیت سے بھی اس بحث پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں،

اولاً خود مصنف نے الجزیہ میں جہاں یزدگرد کے پاس نعمان بن مقرن کا بطور سفیر کے جانا لکھا ہے وہاں نعمان کی سفارتی گفتگو کا خاتمہ مع ترجمہ یہ بیان کیا ہے،

وان اتقیمونا بالجزاء قبلنا ومنعناکم یعنی اگر جزیہ ادا کرنے کے ذریعہ سے جان بچاؤگے تو ہم قبول کرینگے اور تمکو تمہارے دشمنوں سے بچائینگے

انصاف سے کہو کیا یہ اس بات کی تصریح بلکہ اقرار نہیں ہے کہ جزیہ دراصل ذمیوں کے لیے مسلمانوں کے

ہاتھ سے جان بچانے کا ایک ذریعہ تھا، لیکن نظر مصالح اُسکے ساتھ مزید رعایت یہ تھی کہ مسلمان اکثر اُنکی بیرونی حفاظت کا ذمہ بھی کر لیتے تھے، (اتقیمونا کے لفظ پر غور کرو پھر ومنعناکم کی الگ تصریح دیکھو[1])

اسکے علاوہ شام کی فتح میں جب ممالک مفتوحہ کی تقسیم اور رعایا کے لونڈی غلام بنانے کے متعلق اہلِ فوج کا اصرار ہوا تو حضرت عمر نے ابو عبیدہ کو جو جوابی فرمان بھیجا تھا اُس میں یہ الفاظ تھے،

| | |
|---|---|
| لا سبیل لک علیہم ولا للمسلمین معک ان تجعلہم فیئاً وتقسمہم للصلح الذی جری بینک وبینہم ولاخذک والجزیۃ منہم بقدر طاقتہم + + + فاذا اخذت منہم الجزیۃ فلا شئی لک علیہم ولا سبیل + + + فاضرب علیہم الجزیۃ وکف عنہم السبی[2] | تم کو اور تمہارے ہمراہی مسلمانوں کو اب یہ حق نہیں ہے کہ تم اُنکو فئ قرار دیکر باہم بانٹ لو اس لیے کہ تم میں اور اُن میں صلح ہو چکی ہے اور تم نے اُن سے جزیہ بھی لے لیا ہے + + + جب تم نے ان سے جزیہ لیا تو اب تمہارا کوئی حق اُنپر نہیں ہے + + + اُنپر جزیہ مقرر کرو، اور لونڈی غلام نہ بناؤ؛ |

ان الفاظ میں صاف طور پر جو جزیے کی اصلیت سمجھائی گئی ہے، ظاہر ہے، یعنی یہ کہ جزیہ بجائے اسکے کہ اہل ذمہ کو اُنکے بیرونی دشمنوں سے بچانے کا کوئی معاوضہ یا بدل ہو، وہ خاص اُنکی جان بخشی کا معاوضہ ہے، اور جب شارع نے جزیہ لیکر اُن کی عقب گذاری اور جاں بخشی کا حکم دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان جزیہ لینے کے بعد بھی اُنکے نفوس سے تعرض کریں، اور اُنھیں ناجائز طور پر لونڈی غلام بنائیں، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں ایک جگہ صاف صاف لکھتے ہیں،

| | |
|---|---|
| ولا یحل للوالی ان یدع احدا من النصاری والیہود والمجوس والصابئین والسامرۃ الا اخذ منہم الجزیۃ + + + لان دمائہم واموالہم انما احترزت باداء الجزیۃ[3] | حاکم کو یہ جائز نہیں ہے کہ نصرانیوں اور یہودیوں، مجوسیوں صابیوں، سامرہ میں سے کسی کو بھی بغیر جزیہ لیے چھوڑے اس لیے کہ جزیہ ہی کے دینے سے اُنکے خون اور مال و دولت بچائے گئے ہیں، |

آخری جملہ پکار رہا ہے کہ جزیہ دراصل کوئی اُجرت نہ تھی بلکہ وہ جان بخشی کا معاوضہ تھا جسکے بعد

---

[1] معرکہ فارس میں سعد نے رستم سے سفارتی گفتگو کرنے کے لیے ربعی بن عامر کو بھیجا تھا اُنھوں نے بھی اپنی تقریر میں صاف صاف فرمایا تھا اخترنا الاسلام وذلک لدعک او الجزیۃ فنقبل ونکف عنک ان احتجت الینا نصرناک او المنابذۃ فی الرابع الخ (اخبار قادسیہ صفحہ ۹ - ابن خلدون) اس عبارت میں بھی نقبل ونکف عنک اور وان احتجت الینا نصرناک کو غور سے پڑھو اور سمجھو کہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم جزیہ کی حقیقت کیا سمجھے ہوئے تھے۔ [2] کتاب الخراج صفحہ ۸۲ [3] ایضاً صفحہ ۷۰،

اہل ذمہ کی جان ومال سے تعرض نہیں ہوتا تھا،

اس قدر لکھنے کے بعد اب ہم مصنف کے اور استدلالات پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں الفاروق اور خاص کر الجزیہ میں مصنف نے اپنے دعوے کو ثابت کرتے ہوے مختلف معاہدات کی اُن عبارتوں سے بھی استناد کیا ہے جن میں بیان ہے کہ ذمیوں سے فوجی خدمت لینے کی صورت میں جزیہ معاف کر دیا جائے، بلکہ اُسکے استدلال کا ایک کافی حصہ ایسی ہی عبارتیں ہیں، لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی حاکم یا بادشاہ کے اس فعل سے کہ وہ اپنی محکوم رعیت سے کسی نمایاں خدمت سے خوش ہوکر اپنا کوئی حق اُسے معاف کر دے، یہ کیونکر ثابت کیا جائیگا کہ اصل میں بھی وہ حق اُسی خدمت کا معاوضہ تھا،

مثلاً آج کوئی زمیندار اپنی کسی رعیت سے صرف اس لیے خوش ہوکر برس دو برس کا خراج معاف کر دے کہ اُس نے زمیندار کو اُسکے دَورے کے وقت شکار میں مدد دی تھی، یا یہ کہ اُسے ایک نازک موقع پر مثلاً شیر کے حملے سے بچایا تھا، تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقع میں یہی خراج، شکار میں مدد دینے یا شیر سے بچانے کا معاوضہ تھا؟

بہذا، اگر خودغرضی نے مصنف کو خلاف گوئی پر مجبور نہیں کیا ہے، اور فی الواقع امرحق کے انکشاف دل سے چاہتا ہے تو ہمارے نزدیک اُسکو چاہیے کہ وہ قدرت کے اُس بیش بہا عطیہ سے جسکا نام آنکھ ہے، پورے طور پر کام لے، یعنی اگر اُس نے اب تک صرف ایک آنکھ سے اُن معاہدات کو دیکھا ہے جن میں خاص خاص موقعوں پر جزیے کی معافی مذکور ہے، تو اب وہ دوسری آنکھ سے ذیل کے اُن معاہدات کو بھی دیکھے جن میں نہایت صاف اور کھُلے لفظوں میں اصل مدعا کی تائید کے علاوہ اسکی بھی تصریح ہے کہ ہم جزیہ لینے کے باوجود بھی تمھاری حفاظت اور تمھاری طرف سے لڑنے کے ذمہ دار نہیں ہیں،

یہ معاہدے مورخ بلاذری نے فتوح البلدان میں نقل کیے ہیں اور ہم اُسی کے حوالے سے اس مقام پر لکھتے ہیں،

**پہلا معاہدہ** جس میں مصنف کے خلاف اس بات کی صاف تصریح ہے کہ ہم جزیہ بھی لیں گے اور بہذا تمھارے دشمنوں سے لڑیں گے بھی نہیں، کتاب فتوح البلدان بلاذری میں بہ ایں الفاظ منقول ہے،

فصالحهم على سبعة الف ومائتى دينار يؤدونها فى كل عام وصالحهم الروم على مثل ذلك هم يؤدون خراجين واشترطوا ان لا يمنعهم المسلمون اداء الصلح الى الروم واشترط عليهم المسلمون ان لا يقاتلوا عنهم من اراد هم من ورائهم وان يؤذنوا المسلمين بسير عدوهم من الروم[1]

پھر اُن سے سات ہزار دو سو دینار سالانہ دینے پر صلح کی اور رومیوں نے بھی اُن سے اتنے ہی پر صلح کی تو وہ دوہرا خراج ادا کرتے تھے، انکی شرط مسلمانوں سے یہ تھی کہ مسلمان انھیں رومیوں کو رقم صلح ادا کرنے سے منع نہ کریں، اور مسلمانوں نے یہ شرط کر لی تھی کہ وہ انکے دشمنوں کے ساتھ انکی طرف سے نہیں لڑیں گے، اور اُن لوگوں پر فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے اطلاع بھی دیں،

**دوسرا معاہدہ** جس میں علی رغم مخالف اس بات کی تصریح ہے کہ جزیہ برقرار، اور اگر کسی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت یا مدد نہ کر سکے اور تمہارے دشمن تم پر غالب آ گئے، تو اسکے ہم جواب دہ نہیں، اور نہ یہ امر ناقض عہد ہو سکتا ہے، خاص الفاظ یہ ہیں،

وان ابيتم واقمتم الصلوة فاخواننا فى الدين والا فالجزية عليكم وان عرض للمسلمين شغل عنكم فقهركم عدوكم فغير ماخوذين بذلك لا هو ناقض عهدكم[2]

اگر تم نے رجوع کیا اور نمازیں قائم کیں تو ہمارے دینی بھائی ہو ورنہ تم پر جزیہ مقرر ہوگا، اور اگر مسلمانوں کو کوئی مشغولی پیش آگئی اور تمہارا دشمن تم پر غالب آ گیا تو اسکے نہ تو وہ جواب دہ ہونگے اور نہ یہ امر باعث نقض عہد ہو سکتا ہے،

**تیسرا معاہدہ** اس میں یہ تصریح ہے مخاطب (جو ایک معزز نصرانی تھا) اگر اپنے دین پر قائم رہے تو جزیہ دینا لازمی ہے، یا بالفاظِ دیگر، غیر مذہب شخص کا اپنے دین پر قائم رہنا ہی ایجاب جزیہ کے لیے کافی ہے، کما سبق منا فیما سبق، خاص الفاظ یہ ہیں،

ان جبلة اتى عمر بن الخطاب وهو على نصرانية فعرض عمر عليه الاسلام واداء الصدقة فابى ذلك وقال اقيم على دينى واؤدى الصدقة فقال عمر ان اقمت على دينك فاد الجزية فانف منها[3]

جبلہ حالت نصرانیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا حضرت عمر نے اسپر اسلام پیش کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا، اُسنے انکار کیا اور کہا میں اپنے دین پر قائم رہونگا، اور صدقہ زکوٰۃ ادا کرونگا، حضرت عمر نے کہا اگر تو اپنے دین پر قائم رہیگا تو جزیہ دے، اسپر اُسنے ناک بھوں چڑھائی۔

**چوتھا معاہدہ** - اس میں مصنف کے خلاف اس بات کی توضیح ہے کہ جزیہ اور خراج پر جو صلح واقع ہوئی، وہ اس بنا پر ہے کہ مفتوحین قتل نہ کیے جائیں اور نہ انھیں لونڈی غلام بنایا جائے وغیرہ

صالح اهل الدامغان ودرا باذ مقتبة على الجزية و الخراج على ان لا يقتلوا ولا يسبوا ولا يمنعوا طريقاً

دامغان اور درا باذ والوں نے جزیہ و خراج پر عتبہ سے صلح کر لی، اس شرط سے کہ وہ قتل نہ ہوں، اور نہ لونڈی غلام بنائے جائیں

[1] فتوح صفحہ ۱۹۰ [2] فتوح صفحہ ۲۱۰ [3] فتوح صفحہ ۱۴۲ و ۱۴۳

یسلکوہ [1] | اور نہ اپنے اختیار کردہ طریقے سے روکے جائیں،

اب اگر انصاف اور انصاف کے ساتھ خوفِ خدا بھی ہو تو مصنف کو چاہیے کہ وہ ان معاہدات کو بھی پیش نظر رکھ کر بتائے کہ ان سے جیسا کہ مصنف کا خیال ہے آیا یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف بیرونی حفاظت کا معاوضہ یا حق المحنت تھا؟ یا یہ کہ بخلاف اسکے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جزیہ فی حد ذاتہ ایک ذریعۂ جاں بخشی تھا جس سے غیر قومیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنی جان، مال کی بالکل تامین گو کہ اکثر اُنکی بیرونی حفاظت کا ذمہ بھی مسلمان کر لیتے تھے،

یہ بات کہ جزیہ لینے کے باوجود بھی ہم تمھاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں، جیسا کہ پہلے اور دوسرے معاہدہ کے الفاظ صاف صاف بتا رہے ہیں، ایک نہایت روشن دلیل اس امر کی ہے کہ جزیہ فی الواقع کوئی اجرت یا حق المحنۃ نہ تھا، اور کہ مصنف نے جو کچھ اُسکا نشا سمجھا ہے غلط ہے،

معزز ناظرین! یہ تھی مصنف کے اُن مباحث کی حقیقت جن کی بنا پر اُس نے فقہا و متاخرین اہل تاریخ پر نہایت رکیک الزامات عائد کرنے میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیئے ہیں، جن کے انکشاف نفس الامری کو وہ اپنے مختصات میں سے سمجھتا ہے، اور جن کے متعلق بڑی بیباکی اور ناانصافی کے ساتھ اُسکا یہ خیال ہے کہ نہ صرف متاخرین علما بلکہ قدما بھی ایک مدت دراز سے غلطی و جہالت میں گرفتار چلے آتے ہیں،

طوالت کے لحاظ سے اب میں اس بحث کو یہیں ختم کرنے کے بعد چاہتا ہوں کہ اپنی اس تنقید کے خاتمہ پر بعض اُن اختلافی مباحث پر بھی ایک روشنی ڈالوں، جن کی نسبت مصنف کا خیال ہے کہ وہ بھی متعصب فقہا کی تنگ گیری کے نتائج ہیں، اور جن کا ذکر مصنف نے اپنی کسی نہ کسی تصنیف میں مخالفانہ و معترضانہ پیرایہ میں کیا ہے،

ان مباحث کے سلسلے میں ایک سلام کا مسئلہ ہے جسکے متعلق مصنف نے رسائل شبلی صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے کہ

"مخالفوں کی طرف سے بلکہ خود متعصب مسلمانوں کی طرف سے بڑا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلام نہ کرو + + + یہ اور اسی قسم کی اور باتیں بہت زیادہ شہرت پکڑ گئی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس راز سے بالکل پردہ اٹھا دیں"

---

[1] فتوح صفحہ ۱۰۳،

تم کلامہ۔ اسکے بعد مصنف نے اپنی عادت مستمرہ کے موافق پردہ اُٹھایا ہے، لیکن چشم بد دُور، اس محجوبانہ انداز سے، کہ خود اُس پردے کو اُٹھا کر اپنی ہی آنکھوں پر ڈال لیا ہے، ورنہ یقیناً کوئی وجہ نہ تھی کہ اُس کو صحیح مسلم جیسی حدیث کی نہایت معروف، مستند کتاب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذیل کا حکم جو کہ یہود و نصاریٰ ہی کے باب میں ابتدا السلام کی ممانعت کے متعلق ہے نظر نہ آتا، یعنے

لاتبدؤا الیہود والنصاریٰ بالسلام الحدیث [1] یہود و نصاریٰ سے ابتدا بسلام نہ کرو۔ الخ

اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ جن سچے اور نیکدل مسلمانوں نے اس ارشادِ نبوی کے موافق کوئی واقعی استدلال پیش کیا وہ خواہ مخواہ کیوں متعصب ہو گئے؟ اگر وجہ تعصب صرف یہی ہے کہ اُنھوں نے حدیث صحیح کے مطابق ایک بات کہی تو میرے نزدیک ہر مسلمان نہایت خوشی سے متعصب بننے کے لیے آمادہ ہوگا، اور بے شبہہ سچے مسلمانوں کے نزدیک ایسا تعصب شرافتِ اسلام کا تقاضائے اسلام ہے [2]

مصیبت یہ ہے کہ یہاں تو حدیث صحیح کے مطابق ایک بات کہنے پر جناب مصنف کو ایسا جوش آیا کہ بجود ہو کر اُنھوں نے متبعانِ حدیث کو فوراً متعصب بنا دیا، اور ساتھ ہی بلا توقف پردہ اُٹھانے کی بھی ٹھہرا دی، لیکن خیر سے آپ ہی رسائل شبلی صفحہ ۷۸ میں یوں نغمہ پیرا ہوتے ہیں کہ

"اسلام صرف اُن مسائل اور احکام کا نام ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں، اسکے سوا جو کچھ ہے گو اُس نے قوم میں اور ملک میں کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہو، لیکن وہ اسلام کا اصلی قانون نہیں ہے"

جسکا محصل یہ ہے کہ ابتدا السلام کی ممانعت یہود و نصاریٰ کے متعلق جو آنحضرت سے بطریق صحیح مروی ہے اور جو صحیح مسلم جیسی حدیث کی نہایت معتبر کتاب میں آج بھی موجود ہے، وہ خود جناب مصنف ہی کے بیان کے مطابق اسلام کا حقیقی مسئلہ بلکہ عین اسلام ہے۔

---

[1] دیکھو تلخیص ابن حجر صفحہ ۳۷۹ بحوالہ مسلم بروایت ابی ہریرہ، تلخیص کے علاوہ اذکار نووی وغیرہ کتب حدیث میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ ۱۲

[2] لطف کی بات یہ ہے کہ اسی ابتدا سلام کی ممانعت کو شاہ ولی اللہ صاحب جو اسرار و حقائق دین کے بہت بڑے ماہر تھے شرعِ شریف کا ایک صحیح و ثابت مسئلہ قرار دیکر کتاب حجۃ اللہ صفحہ ۳۰۹ میں اسکا بھید یوں بیان کرتے ہیں، اقول سرہ ان احدی المصالح التی بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہا التنویہ بالملۃ الاسلامیۃ وجعلہا اعلی الملل وعظمہا لایتحقق الا بان یکون لہم طول علی من سواہم۔ مگر جناب مصنف اسکو ایک غیر شرعی اور تعصبی بات فرماتے ہیں حالانکہ شاہ صاحب کی نسبت خود مصنف ہی کا مقولہ ہے کہ وہ ایسے شخص تھے کہ اُنکی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے ۱۲

ایک اور مقام پر یعنی رسائل شبلی صفحہ ۵۹ میں یوں ارشاد ہوتا ہے کہ

"پادری وغیرہ اپنے منصب پر بحال رہیں گے، اور مذہب سے کچھ غرض نہ کیا جائیگا، یہ خاص رسول اللہ کے احکام ہیں اور اس لیے دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہیں"

سبحان اللہ! یہ عجیب نیچرل منطق ہے کہ جو بات حدیث صحیح سے ثابت ہو، وہی اسلام اور اسلام کا قانون بھی ہو، اور وہی جناب مصنف کے نزدیک تعصب بھی ہو۔ رسول اللہ کا خاص حکم، اسلام کا خاص حکم بھی ہو، اور وہی وہ بات بھی ہو جسکے ماننے سے غریب مسلمان کٹر، متعصب بھی کہلائیں،

تفو برتو اے چرخ گرداں تفو

جناب مصنف نے نئی عبادت گاہوں کے بنانے کے مسئلہ کو بھی جیسا میں نے ذکر کیا ہے الفاروق میں صرف نقل اعتراض کے موقع پر ذکر کرکے بے جواب چھوڑ دیا ہے، اگرچہ اسکے متعلق مختلف تحریروں میں مصنف کی مختلف صدائیں اُسکی بادہ فروشی کا اعلیٰ ثبوت دے رہی ہیں۔ چنانچہ رسائل شبلی صفحہ ۵۹ میں مخالفین کے اس اعتراض کو کہ مسلمانوں کے عہد میں نئے گرجاؤں یا بتخانوں کے بننے کی اجازت نہ تھی نقل کرکے وہ لکھتا ہے کہ یہ اُنکی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے، حالانکہ سیرۃ النعمان صفحہ ۲۰۰ میں یوں لکھ چکا ہے کہ

"البتہ امام ابوحنیفہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اہل ذمہ اسلامی شہروں میں اپنی عبادت گاہیں نہ بنائیں، لیکن اُن کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ امن وامان میں خلل نہ ہو الخ"

اسکے بعد ہی اسی صفحہ میں ارشاد ہوتا ہے

"مسلمانوں کے آباد کردہ جو دو چار شہر تھے اُن کے سوا باقی تمام ملک میں عموماً ذمیوں کو عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت تھی"

حالانکہ رسائل شبلی صفحہ ۵۸ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہونا بتایا ہے کہ قدیم شہروں میں جو مسلمانوں کے آباد کردہ نہیں ہیں وہاں ذمیوں سے جو معاہدہ ہے مسلمانوں کو اُسکا پورا کرنا ضرور ہوگا، جس کا ماحصل یہ ہے کہ عموماً تمام بلاد قدیم میں ذمیوں کو نئی عبادت گاہیں بنانے کی کوئی عام اجازت نہیں۔ بلکہ یہ بات معاہدے کی نوعیت پر منحصر ہے جیسا معاہدہ ویسی اجازت یا عدم اجازت، لیکن شکر ہے کہ الفاروق کی تحریر کے وقت مصنف کا اضطراب بالکل دفع ہوگیا، اُسکے متضاد اور پریشان خیالات کا رخ

سے ہوا کے رخ نکل گئے، حضرت عبداللہ بن عباس کے فتوے ذیل نے الفاروق میں اُنکی زبان پکڑ لی اور یوں بیچارے فقہا اُسکے تخائل بیجا سے نجات پا گئے۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۸ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| عن ابن عباس سُئل عن العجم اھم ان یحدثوا بیعۃ او کنیسۃ فی بلاد امصار المسلمین فقال اما مصر مصرتہ العرب فلیس لھم ان یحدثوا فیہ بناء بیعۃ ولا کنیسۃ ++ وکل مصر کانت العجم مصرتہ ففتحہ اللہ علی العرب فنزلوا علی حکمھم فللعجم مافی عھدھم وعلی العرب ان یوفوا بذلک۔ | حضرت ابن عباس سے سوال کیا گیا کہ آیا عجمی لوگ مسلمانوں کے شہروں میں نئی عبادتگاہیں بنا سکتے ہیں؟ آپنے فرمایا کہ جو شہر مسلمانوں کے آباد کردہ ہیں اُمیں وہ نئی عبادتگاہیں نہیں بنا سکتے اور جو شہر عجمیوں نے خود آباد کیا ہے لیکن وہ مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوا اور عجمی محکوم ہو کر وہاں رہے، تو اُس میں عہدنامہ کے موافق عجمیوں کو اُن کے حقوق لیں گے اور مسلمان ایفا عہد کے پابند ہوں گے، |

کتاب الخراج صفحہ ۸۷ کی یہ عبارت بھی ملاحظہ طلب ہے

| | |
|---|---|
| واما ما احدث من بناء بیعۃ او کنیسۃ فان ذلک یھدم[1] | لیکن نئی عبادت گاہیں جو بنائی گئی ہیں وہ گرا دی جائیں گی۔ |

کیا اب بھی جناب مصنف اسکو متاخرین فقہا کی ایجاد، اور اسے بھی فقہ کی پچھلی تصنیفات ہی کی جدّتِ نیاز قرار دیں گے؟

رسائل شبلی صفحہ ۶۲ میں آپ نے اس مسئلہ کو بھی چھیڑا ہے کہ ذمی راستے میں مسلمانوں سے بچکر نکلیں، لیکن کمال یہ کیا ہے کہ عیسائی مصنفوں کی طرف سے منجملہ اور چند اعتراضوں کے اس اعتراض کو بھی نقل کرکے نہایت دلیری کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے، کہ ہم بے شبہہ تسلیم کرتے ہیں کہ فقہ کی پچھلی تصنیفات میں ذمیوں کی نسبت یہ احکام موجود ہیں لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے، ائمۂ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں، اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعوے ہے کہ یہ احکام کسی زمانہ میں رواج نہیں پائے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مصنف کو چاہیے کہ وہ اس پچھلے غلط اور بے تکے، اور پہل دعوے کو تو صندوق سینہ میں مقفل کرکے رکھ دے، اس لیے کہ قطع نظر اسکے کہ یہ ایک ادعائے محض ہے کسی اسلامی حکم کا کسی زمانے میں رواج نہ پانا یقیناً اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ حکم واقع میں بھی اسلامی احکام کے دائرے سے باہر ہے،

[1] صفحہ ۷۰، کتاب الخراج میں قاضی ابویوسف فرماتے ہیں ویمنعوا من ان یحدثوا بناء بیعۃ او کنیسۃ فی المدینۃ الا ما کانوا صولحوا علیہ آہ ۱۲

البتہ دعوئے اول قابلِ لحاظ ہے، لیکن میں مصنف کے خلاف علانیہ کہتا ہوں کہ یہ دعوی بھی محض غلط اور بے بنیاد ہے، منجملہ اُن چند باتوں کے ایک یہ بات کہ ذمی راستہ میں مسلمانوں سے بچکر چلیں، اسکے متعلق صاف طور پر حدیث صحیح موجود ہے کہ راستہ میں ذمیوں کا تادباً مسلمانوں سے بچکر نکلنا تو کیا، خود مسلمان اگر راستہ میں ذمیوں سے ملیں تو انکو حکماً تنگ راستہ کی طرف جانے پر مجبور کریں، ملاحظہ ہو تلخیص الحبیر صفحہ ۳۷۹ میں صحیح مسلم کی یہ حدیث بروایت ابوہریرہ

اذا لقیتموہم فاضطروہم الیٰ ضیق الطریق | جب تم اُن سے راستہ میں ملو تو اُنھیں تنگ راستہ کی طرف جانے پر مجبور کرو،

ابوداود کے الفاظ یہ ہیں اذا لقیتموہم فی الطریق فاضطروہم الیٰ اضیق الطریق، اس حدیث صحیح کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مذکورۂ بالا حکم رسول کا حکم نہیں ہے؟ اور حکم رسول ہونے کی صورت میں کون ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ خاص خدا کا حکم نہیں؟ وقس علیہ احکام الصحابۃ والمجتہدین،

علاوہ ازاں مصنف نے رسائلِ شبلی صفحہ ۳۷ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

"اسلام نے اور اسلامی حکومتوں نے کبھی یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ جو شخص ولایت زادہ ہو اُسکو فلاں قسم کے حقوق نہیں مل سکتے یا فلاں فلاں عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں"

لیکن شاید انکو اُسی روشن وائی وہ پرانی روایت یاد نہیں رہی جس میں خود حضرت عمر نے اسی اتفاق نصرانی سے نہایت واضح طور پر فرمایا تھا کہ

انہ لا یحل لی ان استعین بک علی امانۃ المسلمین و لست علیٰ دینہم[1] | مجھے یہ جائز نہیں ہے کہ تجھ سے مسلمانوں کے امانتی کاموں میں مدد لوں جبکہ تو اُن کے دین پر نہیں ہے،

کیا اس سے بالبداہتہ یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ غیر قوموں اور غیر مذہب والوں سے ایک حد تک یعنی مسلمانوں کے مالی اور امانتی کاموں پر مطلقاً مدد لینا حضرت عمر کے نزدیک جائز نہ تھا؟ شاید اسکا جواب مصنف کی طرف سے یہ ہو کہ حضرت عمر کی حکومت اسلامی حکومت نہ تھی۔

ہاں خوب یاد آیا گھوڑوں پر کاٹھی کسنے کے مسئلہ کو بھی مصنف نے الفاروق ہی میں ذکر کیا ہے لیکن وہی کہ جوش کی حالت میں معترض کی طرف سے اعتراض تو جا بیٹھے مگر جواب دیتے وقت قلم کو جو ہاتھ سے رکھا تو پھر اُٹھانا قسم تھا، بے شبہہ اکابر فقہا کو موردِ الزام و مستوجبِ ملام بنانا ایک آسان کام ہے، لیکن اُنکے خلاف اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا یہ اُنکی نوایجاد اور تعصبی کارروائی

[illegible]

ہے ، البتہ کاسے دارو ، مسائلِ بالا کے متعلق فقہا پر سے الزام اُٹھانے کے لیے میرے نزدیک صرف قاضی ابویوسف کی کتاب الخراج سے استناد کافی ہوگا ، دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۴۳ ، میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان کی عبارتِ ذیل ،

| | |
|---|---|
| ولا یرکبن یہودی ولا نصرانی علی سرج ولیرکب علی اکاف ولا ترکبن امرأۃ من نسائہم علی رحالۃ ولکن رکوبہا علی اکاف . | کوئی یہودی اور نصرانی پالان کے سوا زین پر نہ بیٹھے ، اُن کی عورتوں میں سے بھی کوئی عورت کجاوے میں نہ سوار ہو ، بلکہ اُسے بھی پالان ہی پر سوار ہونا چاہیے ، |

کنز العمال ج ۲ صفحہ ۲۹۶ میں خاص حضرت عمرؓ کا ارشاد ان لفظوں میں منقول ہے ،

وتمنعوہم الرکوب الاعلی الاکف عرضاً[۱] ان کو پالانوں کے سوا زین وغیرہ پر بیٹھنے سے منع کرو پالان پر بھی عرضاً سوار ہوں

[۱] " اکف " کے لفظ پر اسوقت میرا ذہن مصنف کی ایک خوش فہمی کی طرف منتقل ہوا ہے جو آپ سے پہلے خود اُسی کتاب سیرۃ النعمان صفحہ ۲۵۰ ، ۲۵۹ میں خاص اُسی کے قلم سے بیساختہ ٹپک پڑی ہے ، اس خوش فہمی کی طرف ذہن کا منتقل ہونا تھا کہ معاً وہ حکایت بھی یاد آئی ، جو عام طور پر مشہور ہے اور اکثر بیان کی جاتی ہے کہ کسی حکیم نے اپنے نسخے میں شربتِ بنفشہ اور آلو بخارا لکھا تھا ، لیکن نسخہ جب ایک تیز طبع طالب علم کو پڑھنے کے لیے دیا گیا تو اُنھوں نے ( چونکہ تیز طبع تھے ) شربتِ بنفشہ کو شَرِبَتُ بِنَفْسِہٖ اور آلو بخارا کو اُلُّو بچارا پڑھا ۔

معزز ناظرین ذرا متوجہ ہو کر سنیں ( کیونکہ ایک خوش فہم کی خوش فہمی کو سراہنا ہے ) لائق مصنف سیرۃ النعمان صفحہ ۲۵۸ و ۲۵۹ میں بحوالہ جامع صغیر امام محمد لکھتے ہیں کہ " امام ابوحنیفہ سے جو کچھ اس باب میں مروی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ذمی زنار باندھیں اور ایسے زین پر سوار ہوں جن کی شکل " ہتھیلی " کی سی ہوتی ہے ( ہتھیلی کا لفظ پیشِ نظر رہے ) اب جامع صغیر کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں ، ویؤخذ اہل الذمۃ باظہار الکستیجات والرکوب علی السروج التی ہی کہیأۃ الاکف ( آخر جامع صغیر صفحہ ۱۴۴ )"

دیکھو خوش فہمی اس کا نام ہے کہ " اُکُف " جو کُتُب کے وزن پر اکاف کی جمع ہے اور جس کے معنی پالان کے ہیں وہ " اَکُفّ " کف کی جمع پڑھا گیا ، اور اُس کے معنی ہتھیلی کے بنائے گئے جو مقام سے انصافاً کوکس قدر چسپاں ہے ؟ اگرچہ ہم نے اور تم نے ہتھیلی اور پنجے کی شکل کے زین آج تک نہ دیکھے اور نہ سنے ہوں گے ، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ جناب مصنف کے عالمِ خیال میں ایسے بھی زین ہوں جو ہتھیلی اور پنجہ تو کیا ہو بہو تلوے اور ایڑی کی شکل کے ہوتے ہوں حقیقت میں انسان جبتک اس درجہ خوش فہم نہ ہو اکابر کی نکتہ چینی کے لائق بھی کب ہو سکتا ہے ، ضرور ہے کہ قوم کے مسلم الثبوت علما کی محض فرضی غلطیاں نمایاں کرنے کیلیے کم سے کم ایسا ہی نکتہ پرداز عقل اور ایسا ہی بلند پرواز ذہن ہونا چاہیے جیسا کہ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے آج چشم بد دور ہمارے شمس العلما جناب مولوی شبلی صاحب کو عطا فرمایا ہے ۔

اب اس قدر لکھنے کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ غالباً ذمیوں کے مذکورہ بالا احکام کے متعلق کسی مزید بیان کی حاجت نہیں رہی، مصنف نے جس دعوے سے ان احکام کو خواہ مخواہ متاخرین فقہا کی ایجاد، اور انکی ذہنی تنگ خیالی کا نتیجہ قرار دیا تھا اُسکی ایک حد تک کامل احتیاط کے ساتھ پوری جانچ ہو چکی، معتبر تاریخوں اور صحیح احادیث کے حوالہ سے ہر ایک حکم کے متعلق دکھا دیا گیا کہ وہ بجائے اس کے کہ کسی پچھلے عالم کی کوئی واقعی ایجاد ہو، خود جناب رسول اللہ کے، صحابہ کے، ائمۂ مجتہدین کے، احکام ہیں، ایسی صورت میں ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ مصنف کا وہ عامیانہ جوش جسکے اثر سے اُس نے متاثر ہو کر "حقوق الذمیین" میں یہ لکھ دیا ہے کہ" ہمارا یہ دعوے ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں" کیسا ٹھنڈا اور بے بنیاد جوش تھا:

معہذا یہ بھی معلوم ہو گیا کہ علمی مقالات اور خاصکر مذہبی مسائل کے دوران بحث میں مصنف کی تحقیق بالعموم کس قدر امانت و دیانت کے اصول پر مبنی ہوتی ہے، بلکہ باانہمہ نا انصافی خود جناب مصنف کے اندر آج دیانت و انصاف کا اعلیٰ جوہر کہاں تک موجود ہے، اور خاصکر متاخرین فقہا و اہل تاریخ پر فرضی الزامات عائد کرنے میں مصنف کو کیسا سچا عشق اور کیسی گہری دلچسپی ہے کہ غالباً اُنکی کوئی تصنیف بلکہ تصنیف کا کوئی حصہ بھی اُسکی اس الزام پرستی کی نمایاں خصوصیت سے خالی نہ ہوگا حالانکہ بیشتر اور اکثر مقالات میں خاصکر حقوق الذمیین کی طول طویل بحث کے موقع پر یقیناً مصنف کی تمام علمی کوشش بالکل غالب مرحوم کے اس شعر کی مصداق ہے

> لغو وحشو و ادعائے محض و اطناب مخل — ما رو موش و سو سمار و گربہ یکجا کردہ است[1]

[1] ما رو موش و سو سمار و گربہ یکجا کردن کا مضمون تو خاصکر سیرۃ النعمان کے حصۂ دوم میں اُس مقام پر نمایاں طور سے معلوم ہوتا ہے جہاں کہ مصنف نے مذاہب ائمہ سے نقل لینے میں اپنی روشن دماغی اور وسعتِ معلومات کے عجیب غریب کرشمے دکھائے ہیں! بالفاظ دیگر اپنی خطا کاری اور غلط نگاری کا تحریری اور روزِ عملی ثبوت دیا ہے خوش اعتقادی شدہ بعض صاحبوں کو جب تک کہ کچھ مثالیں پیش نکی جائیں اس بات کا یقین نہ آئے دیگی، اس لیے باوجود اسکے کہ تنگ وقت ہی ساعد ہے اور نہ محل ہی متقاضی، پھر بھی مشتے نمونہ از خروارے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں، و تلک ہذہ

(۱) سیرۃ النعمان صفحہ ۲۴۱ میں مصنف لکھتا ہے کہ (سرقہ کی صورت میں) نادان بچے پر امام ابو حنیفہ کے نزدیک قطع ید نہیں، لیکن امام مالک کے نزدیک ہے، حالانکہ امام مالک کے نزدیک نادان بچے پر قطع ید کہنا علانیہ غلطی ہے (ملاحظہ ہو اسس

ناظرین سے امید ہے کہ وہ ایک منصفانہ اور غیر طرفدارانہ نظر سے اس بحث کو اول سے آخر تک دیکھیں گے اور پھر فیصلہ کریں گے کہ مصنف نے اس مدعاے خاص میں کہاں تک اصابت رائے سے کام لیا ہے فقہا جن کو مصنف نے تمامتر تعصب اور ناانصافی کے خلعت سے مخلع کر کے قوم کے سامنے پیش کیا ہے

(بقیہ صفحہ ۱۵) اس مسئلہ اور باقی مسائل کے لیے میزان شعرانی ورحمۃ الامہ وغیرہ کتب مذاہب جو خود مصنف کے بھی ماخذ ہیں)

(۲) اسی صفحے میں جاحد عاریت پر صرف امام اعظم کے نزدیک مصنف قطع ید نہیں بتاتا باقی اور ائمہ کے نزدیک قطع ید لکھتا ہے، حالانکہ یہ بھی محض غلط و بیچ ہے (ملاحظہ ہو رحمۃ الامہ صفحہ ۱۴۷ کی عبارت ذیل" وہل تقطع جاحد العاریۃ قال ابو حنیفۃ ومالک الشافعی لا تقطع وقال احمد تقطع)

(۳) پھر اسی صفحے میں امام ابو حنیفہ کے نزدیک لکڑی کے سرقہ پر مطلقاً قطع ید نہیں بتاتا حالانکہ یہ اطلاق بھی غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ بعض لکڑیاں جیسے ساج، آبنوس، صندل وغیرہ انکے سرقہ پر امام صاحب کے مذہب میں بھی قطع ید لازم آتا ہے،

(۴) نکاح سے متعلق مسائل میں سیرۃ النعمان صفحہ ۱۵۹ میں مصنف لکھتا ہے" اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اُسکا انتقال ہو جائے تو امام شافعی کے نزدیک میراث نہیں ملیگی" حالانکہ یہ محض غلط ہے، امام شافعی کے نزدیک مرض الموت میں طلاق دینے کی صورت میں علیٰ اظہر الاقوال میراث ملیگی، (ملاحظہ ہو میزان شعرانی وکتب شافعیہ وغیرہ)

(۵) اسی صفحہ یعنے ۱۵۹ میں مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ امام مالک کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے' حالانکہ یہ بھی صریح غلطی اور جھوٹا دعوے ہے، صحیح یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک رجعت پر اشہاد اصلا شرط نہیں،

(۶) صفحہ ۲۵۲ میں مسئلۂ خلع کے متعلق امام شافعی وامام مالک کا مذہب مصنف لکھتا ہے کہ اُنکے نزدیک مرد جس قدر چاہے معاوضہ لے سکتا ہے اور اسپر عورت کو مجبور کر سکتا ہے، حالانکہ یہ محض غلط بلکہ اتہام ہے، اور اصلیت صرف اس قدر ہے کہ "ہل یکرہ الخلع باکثر من المسمی قال مالک والشافعی لا یکرہ ذلک" (رحمۃ الامہ صفحہ ۲۰۰)

(۷) آگے چل کر مصنف لکھتا ہے کہ" اس سے بڑھکر یہ کہ گو شرارت اور زیادتی مرد کی ہو تاہم وہ عورت سے معاوضہ لے سکتا ہے اور جس قدر چاہے لے سکتا ہے، حالانکہ یہ صریح ناانصافی ہے کہ عورت بیگناہ بھی ہو اور معاوضہ بھی ادا کرے" لیکن لطف یہ ہے کہ یہی صریح ناانصافی کہ عورت بے گناہ بھی ہو اور معاوضہ بھی ادا کرے امام ابو حنیفہ کے مذہب میں بھی ہے، یعنی اُن کے نزدیک بھی مذکورۂ بالا صورت میں مرد، عورت سے معاوضۂ خلع لے سکتا ہے (ملاحظہ ہو رحمۃ الامہ صفحہ ۲۰۱ میں وصح مع الکراہیۃ کا لفظ) لیکن فقہ حنفی کی ترجیح کے موقع پر جہاں مصنف نے اور بہت سے قابل قدر انصاف کیے ہیں وہاں اُس کا ایک نوشیروانی انصاف یہ بھی سہی کہ گو مسئلہ واحد ہے اور حکم بھی واحد، مگر مذہب شافعی میں وہی حکم ناانصافی ہے اور مذہب حنفی میں نہیں (دیکھو صفحہ ۲۵۲)

کیا وہ فی الواقع بھی ایسے ہی متعصب ہیں جیسا کہ مصنف نے محض اپنی چرب زبانی سے غلط طور پر انھیں متعصب ثابت کرنا چاہا ہے؟ کیا در اصل اُنھوں نے حقوقِ اہلِ ذمہ کے متعلق احادیث صحیحہ یا احکام خلفائے راشدین و ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی خانہ ساز یا منگھڑت بات محض تعصب مذہبی کی بنیاد پر کہی ہے؟ کیا یہ بالکل صحیح ہے کہ متاخرین فقہا اور متاخرین اہلِ تاریخ نے عام اس سے کہ وہ تعصبِ مذہبی کی وجہ سے ہو، یا قلتِ تدبر، نقصانِ معلومات، نارسائی ذہن، وغیرہ وغیرہ کی بنیاد پر ہو، احادیث اور آثارِ صحابہ میں سے بعض ایسی ایسی احکامی اور ضروری خصوصیتیں اُڑا دی ہیں کہ جن کی بنا پر آج سے نہیں بلکہ مصنف کے بے بنیاد دعوے کے مطابق مدتِ دراز سے تمام دنیا میں ایک عالمگیر غلطی پھیل گئی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ غریب عربی زبان بالکل سر سے پاؤں تک اور ایڑی سے چوٹی تک غلطی ہی غلطی میں لت پت ہو گئی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۶) غرض یہ اور اسی قسم کے بیسیوں دوسرے مسائل ہیں کہ جن کے صرف نقل میں مصنف نے ٹھوکریں کھائی ہیں، تا بعقل چہ رسد۔ اور دیانت و صداقت جس میں مصنف اپنے تئیں دوسرے اہل قلم سے کسی قدر زیادہ ممتاز سمجھتا ہے، کوئی یہ خیال کرے کہ وہ صرف الفاروق، یا الفاروق میں بھی صرف بحث حقوق الذمیین ہی کے ساتھ مخصوص ہے، نہیں، بلکہ جناب مصنف نے اپنے اس جوہر کو اپنی تمام کتابوں میں عموماً اور سیرۃ النعمان میں خصوصاً بہت اچھی طرح سے چمکایا ہے، سیرۃ، جس میں فقہ اور خاصکر فقہ حنفی کے پردے میں تحقیق و تدقیق کی بہت سی راگ اور راگنیاں گائی گئی ہیں۔ ناظرین یہ تعجب سے دیکھیں گے کہ مصنف نے اس میں علانیہ دعویٰ کیا ہے کہ "مذاہبِ فقہا میں سے صرف مذہب حنفی ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ جس کے مسائل نہایت آسان، نرم اور یسیر التعمیل ہیں، بخلاف اسکے اور ائمہ کے بہت سے احکام بہت سخت اور عسیر التعمیل ہیں" اس دعوے کے ثبوت میں مصنف نے جو منصفانہ اور بے لاگ کارروائی کی ہے اُسکے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان مباحث کے لکھتے وقت مصنف کا داہنا ہاتھ اگر لکھنے کے کام میں مصروف تھا تو بائیں ہاتھ سے اُسکی ایک آنکھ بھی ضرور چھپی تھی، بھلا ایک مصنف کے لیے اس سے بڑھکر نا انصافی اور کیا ہوسکتی ہے کہ فقہ حنفی و شافعی میں فرق دکھاتے ہوئے اُس نے چن چن کر ایک طرف تو مذہبِ حنفی کی آسانیاں رکھدی ہیں اور دوسری طرف خاصکر مذہب شافعی کی چیدہ چیدہ دشواریاں۔ پھر کہدیا ہے کہ دیکھو مذہب حنفی ایسا آسان ہے اور باقی مذاہب ایسے دشوار، کتاب مذکور کے صفحات ۲۴۲ و ۲۴۳ و ۲۵۰ وغیرہا میں اسی طرح مصنف نے مذہب شافعی کی بہت سی سختیاں دکھائی ہیں اور نتیجہ اپنے دعاکے موافق اخذ کیا ہے، حالانکہ انکے مقابلہ میں مختصراً مذہب حنفی کی بعض دشواریاں صرف ایک باب کے متعلق ایک منصف مزاج شخص اس طرح

یا یہ کہ ان تمام خوش گپیوں اور بیہودہ طبع آزمائیوں کے بجائے مصنّف کے یہ زبانی اور محض غلط دعوے اُسکی تعلی اور خودستائی کے نہایت قبیح اور مذموم بیانات ہیں، جن کے ذریعہ سے اُس نے ایک ہوائی اور خام طبع شخص کی طرح چاہا ہے کہ وہ تماشاگاہِ عالم میں باوجود جگنو ہونے کے دیکھنے والوں کی نگاہ میں آسمان کا کوئی بڑے سے بڑا تارا بنکر دکھائی دے، ناکردہ گناہ فقہا کو خاطی، مورخین کو غلط نگار، علما کو کجبحث، خادمانِ دین کو پست خیال، متبعانِ شریعت کو سادہ لوح، وغیرہ وغیرہ بتا کر اعتباری دنیا سے ایک ایک کو چُن چُن کر نکال دے، اور پھر بالطمینان تمام ان مدارج کے طے ہونے کے بعد علمی تحقیقات کے بازار میں بلا خوف مزاحمت خود فروشی کی دوکان چمکانے، اور رفتہ رفتہ قوم کو فرضی و ادعائی انکشافاتِ لدنی کے جعلی سرٹیفکیٹ دکھا کر بلا استحقاق حکمت گروئی کا قابلِ فخر منصب بھی اپنے لیے حاصل کرے، فاغفلاً عماقیل

داند بزرگاں کہ رہِ دور و دراز است ... از کوچۂ مقصود بہ بازارِ تمنا

محمد جان

(بقیہ صفحہ ۱۷) دکھا سکتا ہے کہ مثلاً دار الاسلام میں غیر قوموں کے منہدم شدہ گرجاؤں اور عبادت خانوں کی ترمیم و تجدید کے متعلق امام شافعی کے نزدیک تو عام اجازت ہے کہ وہ ترمیم و تجدید کریں، لیکن امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے یہ شرط لگا کر کہ اگر وہ گرجا یا عبادت خانہ اُس زمین میں ہو جو صلح سے فتح ہوئی ہے تو اجازت ہے ورنہ نہیں، اس حکم کو سخت کر دیا ہے، یا مثلاً امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ذمی پر جزیہ ابتداے سال سے واجب ہوتا ہے، جو ایک سخت حکم ہے، اسکے مقابلہ میں امام شافعی آخر سال میں واجب کہتے ہیں اور یہ آسان ہے، پھر امام ابو حنیفہ کے یہاں جزیہ کا مطالبہ عقدِ ذمہ کے بعد ہی سے کر سکتے ہیں، لیکن اس سختی کے برخلاف امام شافعی وغیرہ کے یہاں یہ آسانی ہے کہ یہ مطالبہ ایک برس گذر جانے کے بعد ہوگا، امام شافعی کا قول ہے کہ "لو صالح الامام قوماً من الکفار علی ان اراضیہم لہم و جعل علیہا شیئاً فہو کالجزیۃ ان اسلموا سقط عنہم وکذا ان اشتراہ منہم مسلم" لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں "انہ لا یسقط عنہم خراج ارضہم باسلامہم ولا بشراء المسلم" (وقس علی ہذا من المسائل ما بقی)

تو جب آسانیوں کے ساتھ دشواریاں بھی ہر مذہب میں ہیں، پھر آنکھ بند کرکے یہ یکطرفہ فیصلہ کر دینا کہ فقط فلاں مذہب آسان ہے اور باقی تمام مذاہب کے احکام سخت اور بہت سخت ہیں، کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے؟ - ۱۲

# مظاہر قدرت میں انسان کا درجہ

سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے سیر ارض سے جس کا صانع قدرت نے حکم فرمایا ہے کیا کچھ حاصل کیا؟ امید ہے کہ اس سبق سے تم بھی میری طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہو گے۔ معقولات کی تحصیل، اس عہد مادیات کے عالمگیر اثرات، کشمکش حیات، پیٹ کے دھندھوں اور نفس کی خدمت گذاریوں نے مذہبی احساس اور جذبۂ معرفت کو نقصان پہونچاتے پہونچاتے بے دَم کر رکھا تھا، بلکہ یوں کہو کہ کبھی اُنکو اُبھرنے یا پیدا ہونے ہی کا موقع نہ دیا۔ یہ سچ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ گر مجھ سنگدل کو مصیبتیں بھی کبھی خدا کی طرف مائل نہ کر سکیں۔ میں تم سے اعتراف کرتا ہوں اور تم نے بھی اسے محسوس کیا ہوگا کہ میری طبیعت کا میلان دہریت کی طرف بہت زیادہ رہا ہے۔

گر مارچ ۱۹۱۸ء میں جب پہلے پہل میں تن تنہا طوفان خیز سمندر کے کنارے کھڑا قدرت کے اس اعظم المظاہر کی سیر کر رہا تھا۔ حد نظر تک پانی اور آسمان کے سوا کوئی ہستی مزاحم نظر نہ تھی۔ پہاڑ سی موجیں اُٹھتیں اور ایک دوسری پر گرتی لُڑھکتی لُڑھکاتی ساحل تک پہونچتیں اور ٹھوکر کھاکر واپس جاتیں۔ بڑے بڑے جہاز اور چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں سب یکساں بے حقیقت نظر آتیں، اُس وقت پہلی بار مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری ہستی بزعم خود اشرف المخلوقات کی وقعت کتنی بھر ہے۔ سمندر کے ہیبت امواج کی ہیبتناکی، طوفان، ہر چیز سے ایک ہستیِ مستتر کی آواز اور جھلک محسوس ہوتی تھی جو بے لگام عقل کو مغلوب کیے دیتی تھی،

پھر مجھکو ایک ٹیلے پر ماہ کامل کا عالم جسے میں کبھی بیان کر چکا ہوں اُسی ہستی کی دوسری شان دکھاتا تھا، یہ سمندر بنانے والے کی جلالی شان نہیں بلکہ جمالی ادا تھی، جس نے دیر تک محو و بیخود رکھا۔ سمندر کے کنارے بھی ایک بیخودی کا عالم تھا گر اسے رعب سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہ اثر اُس سے مختلف تھا جسے عشق و محبت تو نہیں ہاں "حسن کی طرف لپک" کہہ سکتے ہیں۔

پھر جون ۱۹۱۹ء میں قدرت کے اور مہتم بالشان مظاہر کی زیارت ہوئی۔ جن سے میری مراد نیلگری کے پہاڑ، جنگل اور چشمے ہیں۔ ڈوڈابیٹا سطح بحر سے پونے نو ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے اور نیلگری کی بلند ترین

چوٹی ہے۔ اس پر کھڑے ہو کر دیکھو تو وادیاں، پہاڑیاں، ندیاں، جھیلیں، نالے، جنگل، اور نیچے میدانی آبادیاں سب یک نظر مل ملا کر جو مناظر پیش کرتے ہیں وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب ہم ہلکی پھلکی ریل پر بیٹھ کر نو ہزار فٹ بلند پہاڑ کی بلندی طے کرتے ہوتے ہیں اور ان دشوار گذار بلندیوں پر پُل محلات، باغات، بازار اور دنیا بھر کے سامانِ عیش مہیا پاتے ہیں تو من حیث الانسان اپنی قدرت و جبروت پر ناز ہونے لگتا ہے۔ مگر ڈوڈا بیٹا سے موجودات کی سیر سرسری یہ سودائے خام دفعتہً نکال دیتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مناظر مل کر انسانی کوششوں کی بے حقیقتی اور ہمارے زعم باطل پر قہقہہ لگا رہے ہیں اور کسی حقیقی قادر کار اگ گا کر اُسکی قدرت کا نقش دلوں پر بٹھا رہے ہیں۔

ایک نہایت اہم مظہرِ قدرت، ریگستان کی زیارت ابھی تک نصیب نہیں ہوئی، مگر مظاہر مذکورہ پر قیاس کیجئے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ انسانی دست درازیوں سے دور، جس مظہرِ قدرت کی سیر کرو تمھیں فوراً محسوس ہو جائیگا کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور اب میں سمجھا کہ حضرت ابراہیم نے غار کی تاریکی سے نکل کر تاروں کو، پھر چاند کو، پھر سورج کو جو باری باری ہٰذا ربی کہا تھا اُسکی محرک کون سی کیفیت تھی؟ رسول اللہ صلعم غارِ حرا میں کیا کچھ دیکھتے یا سنتے تھے؟ گوتم بدھ کو جنگلوں میں کیا ملتا تھا؟ اور خدا کا یہ ارشاد کیوں ہے:۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ...... تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ

## "سیّاح"

نہ رحم آئے گا ظالموں پر ہماری سستی و اضمحلال کب تک
بشکلِ نقشِ قدم رہیں گے جہاں میں ہم پائمال کب تک

سرور رہتا کیسے وصل کی شب سحر بھی فرقت کی ہو گئی تھی
شباب شب بھر کی چاندنی ہے سفید ہونگے نہ بال کب تک

خدا کو مانو ہنسی نہ جانو ذلیل جینے سے موت بہتر
دبے ہیں اب قوم میں گداگر نہ ہو تمھیں انفعال کب تک

کبھی تو زندہ خدا کا ڈر ہے کبھی ہے دوزخ کا کھٹکا
جو چور گھر کے ہوں انکی ہر دم کرے کوئی دیکھ بھال کب تک

چلو بہت ہو چکے یہی قصے کہ بیہودہ ہیں یہ سارے جھگڑے
لو تم اُن سے ملیں جو تم سے فضول جنگ و جدال کب تک

دلوں کو اہلِ جنوں کے ماشا نہ ہنسنے لئے عفو شان پایا
خدا ہی جانے ان آنسوؤں پر رہیگی گرد ملال کب تک

# قمارِ زندگی

: اُس نورِ مجسّم کا لگا کھوج     پھرے ایسے کہ ہارے چاند سورج

قمار کیا ہے؟ جُوا - جُوا کیا ہے؟ زر کی بازی لگانا - بازیِ زر کیا ہے؟ زر سے کھیلنا۔ عرفاً زر سے سکۂ نقرئی یا سکۂ طلائی مراد ہے - لیکن اقتصادی رنگ میں زر سے ہر وہ شے بھی مراد ہو سکتی ہے جو بدلِ زر ہو سکے یا جسکے عوض میں زر لیا جا سکے - محنت اور ہنر بھی باینمعنی زر ہے - کیونکہ محنت اور ہنر کا بدل زر بھی ہوتا ہے - ایک شخص سارا دن یا دن کا کچھ حصہ محنت کرتا ہے اور شام کو اُسکا بدل زر پاتا ہے - ایک شخص ایک مشین بناتا یا ایک طریقۂ آسائش نکالتا ہے اُسکا عوض زر ہوتا ہے - ایسی سب اشیا اور معاوضات زر ہی کا حکم رکھتے ہیں - قماربازی عرفی معنوں میں ہر ایک مُلک میں پائی جاتی ہے، اور آج سے نہیں جب سے حضرتِ انسان کی تاریخ شروع ہوئی ہے تب ہی سے اسکی ہستی کا نشان ملتا ہے۔ کتبِ مقدسہ میں بھی اسکا ذکر اور اسکی بُرائی مذکور ہے - اور ہر زمانہ کی سوسائٹیوں اور کتبِ سیاسیہ میں بھی اسکا ذکر موجود ہے - وحشیوں میں بھی اور مہذبوں میں بھی اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں - اور اُن لوگوں میں بھی اسکا نشان ملتا ہے جو اقتصادیات اور تمدنیات کے بانی اور شارح ہیں - جب تم ملک فرانس میں جاؤ گے تو تمہیں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ملیگا کہ جس میں یورپ کے ہر ملک و اقوام میں سے مختلف لوگ جن میں بڑے بڑے لوگ بھی ہوتے ہیں، اس غرض سے جمع ملیں گے کہ جو اس مقام پر محض جُوے بازی کی غرض سے آتے ہیں - اگرچہ فرنچ قوانین میں بھی سیاسی نقطۂ خیال سے قماربازی بعض حالات ممنوع ہے، لیکن اس مشہور مقام کے جُواری اس قید سے آزاد ہوتے ہیں - یورپ میں شرط بازی کی ایک اچھی حد تک گرم بازاری ہے - بڑی بڑی سرد طبائع بھی اس شوق میں گرما جاتی ہیں - اور بعض حالات یہ گرموشی ممنوع نہیں ہوتی - ہندوستان میں سٹہ کی شرطیں بھی ایک قسم کی قماربازی ہی ہے - انسان چونکہ بالطبع طلبِ منافع اور تمتع کا خواہاں ہے اس واسطے وہ مختلف طریقوں سے دوسروں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے بالفاظِ دیگر اسکا نام (جیت) یا جیتنا ہوتا ہے -

قمار کیا ہے؟ چند گروہ یا چند قیود اور شرطوں کے تحت ایک کا کچھ جیتنا اور دوسرے کا ہارنا۔

قمار بازی کا خلاصہ کیا ہے؟ جیت اور ہار۔

تہوار دیوالی میں قمار بازی عموماً ہوتی ہے، شاید ہی ہندوستان کا کوئی شہر اس تہوار پر اس جیت ہار سے بچتا ہو۔ بعض اس شوق میں تنگ دست ہو جاتے ہیں اور بعض وارے نیارے بھی کر لیتے ہیں۔ بعض وقت خواص بھی یہ رسم پوری کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ جو لوگ بالخصوص یہ عادت یا یہ شغل رکھتے ہیں اور جن کا یہ پیشہ ہو جاتا ہے اُنھیں قمار باز کہتے ہیں۔ اُن کا کسی خاص مقام میں اجتماع زیر ایکٹ قمار بازی ایک جُرم سمجھا جاتا ہے اور پولیس اُنکی نگرانی کرتی ہے۔

وہ لوگ جو یہ عادت اور یہ شغل نہیں رکھتے ایسے لوگوں کو قمار باز کہکر پھبتیاں کہتے ہیں اور اُنکی نگاہوں میں ایسے لوگ عرفی عزت نہیں رکھتے۔ جب کوئی فعل سوسائٹی کی نگاہوں میں گر جاتا ہے تو اُسکے عادی اور مرتکب بھی اُسے بُرا سمجھتے ہیں۔ قمار باز بھی اُسکی بُرائی کے معترف ہوتے ہیں اگرچہ انکا شعار یہ ہوتا ہے وہ بھی طعنہ زنوں کے روبرو جھینپتے ہیں۔ فطرت شرمندہ کرتی ہے!

اس بدنام قمار بازی کی بُرائیوں اور مضار سے ذرا الگ ہوکر خود اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگیوں کا مطالعہ کرکے کہو کہ کیا ہر زندگی زندگی بھر قمار میں مصروف نہیں، یا ہر زندگی کا شعار قمار نہیں ہے؟ وہی زد اور وہی چوسر، وہی شرط اور وہی بازی اس میں بھی ہوتی ہے جو معیوب اور معتوب قمار بازی میں ہوتی ہے وہی داؤں، وہی چال اور وہی موقع شناسی اس میں بھی پائی جاتی ہے جو عرفی جُوے بازی میں ہوتی ہے چونکہ سوسائٹی میں یہ قمارِ زندگی جائز اور روا ہوتا ہے اس واسطے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ صرف فرق یہ ہے کہ اگر وہ قمار بازی ایک محدود اور بدنام نہاد ایک بے ادب جماعت کا فعل اور عمل ہوتا ہے تو یہ عالمگیر قمار بازی ایک بڑی جماعت اور ایک بڑے گروہ کا فعل ہے۔ اسے سوسائٹی ایک حد تک اور رواج و مذہب ایک پہلو سے مشروع اور جائز قرار دیتا ہے اس واسطے اس پر کوئی گرفت نہیں کی جاتی۔ اور یہ عرفی قمار بازی اُن حدود سے باہر خیال کی جاتی ہے۔

جو ہار جیت نفع نقصان اُس میں ہوتا ہے وہی اس جائز اور مشروع قمارِ زندگی میں بھی ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تر نافع یا مہلک۔ جو لوگ ان دونوں قسم کی قمار بازیوں کا تماشا کرتے ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں میں باعتبار نقائص اور مفاد کے کتنا فرق ہے اور سوسائٹی کا زیادہ تر حصہ کس قمار بازی میں لگا ہوا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو اس قمار بازی سے بچکر اور جیت کر نکلتے ہیں، اور کتنے ہیں

جو اس کا شکار ہوتے ہیں - اس دنیا میں ہر کس و ناکس قمارِ زندگی میں مصروف اور مگن ہے، کوئی کسی داؤں میں بیٹھا ہے اور کوئی کسی میں، کوئی کسی کو داؤں میں پھنساتا ہے اور کوئی پھنستا ہے -

پھنس گئے اُسکے داؤں میں آخر　　غیر کا پیچ اُن پہ چل ہی گیا

کوئی بازی ہار کر ہمیشہ کے واسطے خستہ و تباہ ہو جاتا ہے اور کوئی زمانہ کی موافقت اور قسمت کی یاوری سے وارے نیارے کر لیتا ہے -

ہزار رنج و مصیبت کے دن گذارے ہیں　　کبھی جو لڑ گئی قسمت تو وارے نیارے ہیں

صرف مفلس اور قلاش ہی اس کھیل میں نہیں مصروف ہیں، وہ لوگ بھی اسی دُھن میں مگن ہیں جن کی قسمت طلائی اور جن کا نصیبہ نقرئی ہے - جن کا ہاتھ اپنی پانچوں انگلیوں میں پارس کی طاقت رکھتا ہے اور جن کے ہاتھ میں لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے - اور اگر بنظر غور دیکھو گے تو زیادہ تر ایسے لوگ ہی اس قمار کے عادی پائے جائیں گے - اگرچہ اُنکے خزانے سونے چاندی سے لبالب ہوتے ہیں مگر اُنکا دامنِ حرص کوتاہ نہیں ہوتا - اگر ایک فقیر بے نوا اس بازی میں لگا ہے تو ایک کروڑپتی کیا، ایک والیِ اقالیم بھی اسی دھن میں سرِ ٹیک رہا ہے - غریب لوگ تو شرط بد کر قسمت آزمائی کرتے ہیں، یہ لوگ دھونس دیکر ہی بازی جیت لیتے ہیں - انکی شرطیں ہی کچھ اور ہوتی ہیں - اگر یہ لوگ شرط کے خلاف بھی کر دیں تو کوئی اعتراض نہیں کرتا اور اُنکا پانچ بیس میں سَو اور انکا سات بیسی میں - "زبردست کے بیس بسوے"۔ اس دنیا کے قمارِ زندگی میں غریب عموماً ہارتے ہیں اور زبردست جیتتے ہیں -

(۱) وہ دیکھو ایک قسمت کا مارا نصیب کا دھنی بار بار ایک کام کرتا ہے، توفیق کے مطابق کوشش بھی کرتا ہے اور زر بھی خرچتا ہے، کامرانی کے جس قدر ذرائع سہل الحصول ہیں اُنکا تہیہ بھی کرتا ہے مگر قسمت غریب کی کچھ ایسی ہاری ہے کہ بیل منڈھے چڑھتی ہی نہیں - آخر تھک کر رہ جاتا ہے - ضرورت رہ رہ کر پھر جگاتی ہے - اُٹھتا ہے اور پھر ایک دفعہ کوشش کرتا ہے - مگر اس دفعہ بھی کامیابی منہ نہیں دکھاتی - یار لوگ خواہ مخواہ قلاقین مارتے اور پھبتیاں اُڑاتے ہیں -

جنھیں ہم بے زباں سمجھے ہوئے تھے　　وہی ہم پہ ملاخیں مارتے ہیں

(۲) ایک بد قسمت طالب علم قرض دام لیکر بی اے میں تعلیم پاتا ہے، اور اپنی جانب سے پوری پوری محنت کرتا ہے، شب و روز آرام نہیں لیتا، یاد کرتے کرتے دماغ بھی کھوکھلا ہو گیا ہے - ایک طرف

بڑی محنت اور دوسری طرف قوت کی فکر، امتحان میں شامل ہوتا ہے ، دو ماہ کے بعد نتیجہ کیا نکلا ؟ کشت محنت برباد ہو گئی ۔ دو نمبروں کے واسطے کامرانی اور پاس ہونے پر پہیہ پھر گیا ۔ سال بھر کی محنت برباد ہو گئی۔

مرنا جو عدم آباد کو پہونچا انسان    یہ سفر بھی تو قیامت کا سفر ہوتا ہے

(۳) ایک شخص ملازمت کی تلاش میں رات دن سرگرداں ہے ۔ کبھی کسی در پر جاتا ہے اور کبھی کسی پر، کبھی خاندانیت کا ڈپلومہ پیش کرتا ہے اور کبھی کالجی ڈگریات کا نقشہ ، کبھی خدمات کا ذکر اور کبھی جاں نثاری کا اعادہ ۔ کبھی انشا دکا اور کبھی لیاقت و استعداد کا خوشی خوشی درخواست لکھتا اور ڈاک میں ڈالتا ہے ، ہفتہ بھر انتظار کے بعد جواب آتا ہے ؟ اس دفتر میں کوئی پوسٹ نہیں ۔ دفتر امید پر بجلی گر جاتی ہے جب دیکھتا اور سنتا ہے کہ اُسکے مقابلہ میں فلاں فلاں کامراں ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں تو اور بھی جان پر بنتی ہے دماغ پڑھتے پڑھتے بودا ہو گیا ، قلب کمزور پڑ گیا ، بینائی میں فرق آ گیا ، طبیعت فیشن ایبل ہو گئی ، ہاتھ میں کوڑی نہیں ، یہ باتیں اور یہ کمیاں رہ رہ کر چٹکیاں لیتی ہیں - نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ۔

(۴) ایک خوش قسمت ، نصیبے کی واژگونی کا شکار ہو کر ایک حق مردہ کے زندہ کرنے کے واسطے عدالت میں مقدمہ دائر کرتا ہے ، ثبوت بہم پہونچاتا ہے ۔ اخیر پر کسی قانونی ہیر پھیر میں آکر مقدمہ ہار بیٹھتا ہے۔ اپیل کرتا ہے ، دو ڈنگ جاتا ہے ، اثاثہ اس میں خرچ ہو جاتا ہے ۔ آخر ناکام ہو کر رہ جاتا ہے ۔ پہلی سی حالت بھی نہ رہی ۔ بہتیرا سوچتا ہے کہ ہار کیوں گیا ۔ بار بار عدالتوں کے فیصلے پڑھتا اور پڑھاتا ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ اسی فکر میں رہ جاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے ۔ یہ کہکر خاموش ہو جاتا ہے

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

(۵) ایک کے ہاں اولادِ نرینہ نہیں ہوتی ۔ پہلی بیوی خاوند کی مایوسی دیکھکر دوسری شادی بھی کراتی ہے پھر بھی کوئی بچہ نہیں ہوتا ۔ یوں ہی عمر گذر جاتی ہے ۔ یہ شرط اور یہ بازی بھی سرسبز نہ ہوئی ۔ میاں بیوی دونوں شرکائے نسل کے دعاوی سن سن کر دل ہی دل میں کُڑھتے ہیں اور کوئی علاج نہیں دیکھتے۔ ہر بازی ہر جاتی ہے

قدم بھی ہم کو نہ رکھنے دیا گلستاں میں    ہزار بار قدم ہم نے باغباں کے لیے

(۶) ایک ادیب ادبیات کی اشاعت کے خاطر دوستوں کے سوچ بچار کے بعد ایک اخبار یا ایک رسالہ نکالتا ہے ، اجازت اشاعت حاصل کرتا ہے ۔ مضمون نگار خط لکھکر آمادہ اور مہیا کرتا ہے ۔ افتتاحی

مضمون میں یاد دلاتا ہے کہ ملک و قوم علوم و فنون اور ادبیات کے لیے اُس رسالہ یا اُس اخبار کا وجود اور ہستی اس حد تک مفید ہوگی۔ بدقسمتی سے دوسرے چوتھے مضمون میں ہی کوئی فقرہ قلم سے ایسا نکل جاتا ہے جو سیاسیات اور موجودات کے خلاف ہوتا ہے۔ حکومت ضمانت لیتی ہے۔ اخبار یا رسالہ بند ہو جاتا ہے۔ دلو کے خیالات اور تموجات پر پانی پھر جاتا ہے۔ قلم رُک جاتا ہے اور خیالات کی رَو بند پڑ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ دل بودا اور مایوس پڑ جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ بازی ہی ہری۔ بسم اللہ ہی غلط کر دی اور رہ رہ کر سوکھے گھاٹ اُترے۔

آبداری تری تلوار کی دیکھی ہم نے — سوکھے گھاٹ اُس نے اُتارا ہیں دریا ہوکر

یہ چند مثالیں تو ناکامی کی تھیں، اب کچھ کامرانی کی بھی کہانیاں سُن لو:

(۷) ایک غریب روٹی سے محتاج، قوتِ شبا: دروازہ سے کچھ بچا بچا کر جوڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُسکے پاس ایک رقم ہو جاتی ہے۔ اُس سے صابن کی چند ٹکیاں اور سوئی دھاگا خرید کر فروخت کرتا ہے اُس میں کچھ نفع ہوتا ہے۔ پھر کچھ اور چیزیں لیتا اور بیچتا ہے۔ رفتہ رفتہ سو دو سو روپیہ ہو جاتا ہے۔ پھر دوکان لگا لیتا ہے، گانوں میں پھیری کرتا ہے، دوسرے تیسرے سال پانچ چھ سو ہو جاتا ہے۔ پھر شہر میں آکر دوکان کرتا ہے۔ دس سال کے بعد پتہ لگتا ہے کہ وہ سرکار کو ۱۱ عـــہ روپیہ انکم ٹکس دیتا ہے۔ اور لکھ پتی مشہور ہے۔ اُس کی محنت و مشقت نے اتنے دنوں ہی میں مالامال کر دیا۔

گلشن آرا نہال کر دے گی — لعل و زر سے وہ لال کر دے گی

(۸) ایک غریب لڑکا محنت کرکے کالج سے ڈگری ایم اے کی پاتا ہے۔ خوبیٔ قسمت سے ایک حاکم وقت سے علیک سلیک بھی ہوگئی۔ طرز طریق روش رویہ پسند آگیا۔ دفتر میں ناخن بندی ہوگئی محکمانہ امتحانات میں بھی خوش قسمتی سے کامراں ہوگیا۔ بڑھتے بڑھتے آج سلکِ امرائے حکومت میں منسلک ہے

اُسکا قامت دیکھکر سب کٹ گئے — بڑھ چلے تھے سرو بھی شمشاد بھی

(۹) ایک تعلیم یافتہ، یورپ و ایشیا دیدہ گرم و سرد چشیدہ پولٹیکس میں پڑکر رفتہ رفتہ شہرت پا گیا۔ زمانہ کی چال سمجھ چکا تھا، نشیب و فراز سے واقف تھا، پبلک سے بھی بنائی رکھی اور حکومت وقت سے بھی، آخر اپنی خدمات کا صلہ ملنا ہی تھا، بڑے بڑے القاب سے ملقب ہو کر ملک بھر میں محترم اور ممتاز مانا گیا۔ اگرچہ زندگی کی دوڑ میں کبھی کبھی ٹھوکریں بھی لگیں مگر آخر بازی لے گیا۔

باغ میں پھول کھلے موسمِ سودا آیا　　گرم بازار ہوا وقت تماشا آیا

(۱۰) ایک مڈل پاس کو بوجہ عدم رسوخ نوکری نہیں ملتی۔ آدمی جزرس اور محنتی تھا۔ کسی عدالت کی پنکھے کشی پر لگ گیا، باسلیقہ اور موقعہ بیں تھا، حاکم کی نظر چڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ امیدوار بن گیا۔ سمجھدار تو تھا ہی لکھا بھی ہوگیا۔ قانون سے طبیعت لڑتی تھی، محرر جوڈیشل بن گیا۔ بیشی میں اچھا کام کیا نائب تحصیلداری میں نام درج ہوگیا۔ پاس ہونے پر نائب تحصیلدار بن گیا۔ قسمت برابر یاوری دیتی، اچھے اچھے موقعے ملتے گئے۔ تحصیلدار بن گیا۔ پھر رفتہ رفتہ ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔ آج رائے بہادر کے سی ایس آئی بھی ہے۔ پہلے دن سے بازی سرسبز ہوتی گئی، اور یہ درجہ پایا۔

مکیں سے ہر مکاں کی زیب ہے گو قید خانہ ہو　　نصیبا کھل گیا تھا حضرت یوسف سے زنداں کا

(۱۱) ایک شخص رات کی روٹی کا بھی محتاج، وحشت سے گھر چھوڑ کر نکلتا ہے۔ نہر کی پٹری پٹری یاس زدہ چلا جاتا ہے۔ کوئی انگریز انجینیر راہ میں دوچار ہوجاتے ہیں قسمت نے یاوری کی، اُنکا گھوڑا سیخ پا ہوجاتا ہے۔ یہ قسمت کا مارا دوڑ کر گھوڑا پکڑ لیتا ہے۔ گھوڑا کاٹتا بھی ہے۔ ہمت کرکے چھوڑتا نہیں صاحب بہادر ایک راہرو کی ہمت سے متاثر ہوکر پوچھتے ہیں۔ تم کون ہو؟ راہرو خاموشی سے جواب دیتا ہے "میں ہوں ایک بدقسمت"۔ اور ساتھ ہی رو بھی پڑتا ہے۔ صاحب بہادر کی غریب نوازی جوش میں آتی ہے۔ اور کہتے ہیں "تم خواندہ ہو یا نہیں؟" راہ رو کہتا ہے "ہاں حضور کچھ کچھ"۔ صاحب بہادر سنکر فرماتے ہیں "ہم تم کو ٹھیکہ کھُدائی کا دیویں گے۔ ہمارے ساتھ آؤ"۔

صاحب بہادر ساتھ لے گئے۔ کھُدائی کا ٹھیکہ دیدیا۔ راہرو ناواقفیت کا عذر کرتا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ نندلال ٹھیکہ دار کے ساتھ لگایا جائے۔ دس سال کے بعد دیکھتے ہیں کہ وہی راہرو لاکھوں کا وارث ہے۔ اور خان بہادر کا لقب بھی پاچکا ہے۔ قومی کاموں میں ہزاروں روپیہ دے چکا ہے۔ کرسی نشیں اور درباری بھی ہوگیا۔ مختلف کڑیاں سہ کر یہ دن دیکھا۔ تعزّ من تشاء و تذلّ من تشاء۔

ان چند مثالوں سے ناظرین قیاس کرتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی کس کس جوابازی میں گزرتی ہے، اور ہر انسان کس کس داؤں گھات سے زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ ایک طرف تدابیر اسباب اور وسائل کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مساعی کا۔ مگر باوجود اس سرمایہ کے بھی ہوتا وہی ہے جو ایک خفیہ اور جابر ہاتھ چاہتا ہے۔ ہمیں ان مختلف زندگیوں میں ہزاروں کیا

لاکھوں زندگیاں اس قسم کی بھی دکھائی دیتی ہیں کہ جو اپنی طرف سے مساعی اور تدابیر میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھتیں گر کامرانی اُنکے حصہ میں نہیں آتی۔ اور بعض زندگیاں محض باتوں باتوں میں ہی کامراں ہو جاتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حساب کتاب کسی اور طاقت کے ہاتھ میں بھی ہے اور میزان کوئی اور لگاتا ہے۔ عُرِفتُ ربی بفسخ العزائم۔

کیا با ایں حالات ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہر انسان خواہ کسی رتبہ کا ہو، قمارِ زندگی میں منہمک ہے، اور اس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ جو روحیں بوجہ اپنی نیک فطرت کے روحانیات میں معروف ہیں اُنکی نسبت یہ کہا جاوے گا کہ اپنے رنگ میں وہ بھی روحانی قمار میں منہمک ہیں۔ اُنکی جیت ہار اُسی صفحہ میں محسوب ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ قمارِ زندگی میں جیتتے ہیں اور بہت سے ہارتے ہیں۔ چند روز کے واسطے اس ہار جیت کی کہانیاں ہمارے گوش زد ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی سُن کر خوش ہوتا ہے اور کسی پر صدمہ گذرتا ہے لیکن اخیر پر اس جہان کی زندگی ایک ہی رخ سے ہار جاتی ہے، اور پھر بھی بچھائی بساط طوعاً کرہاً چھوڑنی پڑتی ہے —— ہر ہستی اپنی اپنی بھڑاس نکالکر بنفرتِ خاطر ہزیمت اُٹھا کر رخصت ہوتی ہے۔

خدا بچائے محبت میں جان جوکھم ہے مسیح اس میں ہیں عاجز یہ لا دوا ہے مرض

ہر طرف لوگ قمار خانہائے زندگی میں مصروف بہ بازی ہیں، کوئی کسی رنگ میں کھیلتا ہے اور کوئی کسی رنگ میں۔ کوئی کوئی شرط بدتا ہے اور کوئی کچھ، کوئی اس قمارِ زندگی سے خوش خوش نکلتے ہیں اور کوئی نالاں و مایوس۔ کوئی ہار کر بھی حوصلہ نہیں ہارتے، اور کوئی تھک کر رہ جاتے ہیں، کوئی بازی بدلتے ہیں اور کوئی اُسی بازی پر اڑے رہتے ہیں۔ کوئی اثاثہ بناتے ہیں اور کوئی کھو دیتے ہیں۔ خوش و ناخوش، کامراں و ناکامراں کا اس دنیا میں اخیر ایک ہی ہے بمصداق آیتِ قرآن مجید "یہ دنیا محض لہو و لعب ہے"۔

قمارِ زندگی کی کیا کہیں تم سے جو جیتے تھے وہ مر کر ہار بیٹھے ہیں

**سلطان احمد (گوجرانوالہ)**

یورپ کو چلے تم ہوا ہم کو وسواس تم خرم و شاداں ہو مگر ہم ہیں اُداس
گذرے یہ برس میاں بیم و امید تم پاس جو ہو آئے ہیں ہو گئی یاس

(شہرت)

# شامِ ہجر و شبِ وصل

اے دلنواز و اے سببِ زیستِ عاشقاں اے ہمسوادِ خال و رخ و زلفِ مہوشاں
تجھ سے امید و بیم کے جلوے ہوئے عیاں پردے میں تیرے حسنِ دل افروز ہے نہاں
مے عشق کی جھلکتی ہے تیرے ایاغ میں
تیری سی دلکشی ہے کہاں باغ و راغ میں

اللہ رے ناز و تمکنت و عشوہ و حجاب کیا نت نئی نمود ہے کیا عالمِ شباب
آنچل شفق کا دوش پہ رخ پہ سیہ نقاب کرتی ہیں شوخیاں تری خود تجھ سے یوں خطاب
امروز شاہِ انجمنِ دلبراں یکیست
دلبر اگر ہزار بود دلبر آں یکیست (حافظؒ)

زیرِ نقاب رخ یہ نہیں لے نگینِ حسن آغوشِ عشق میں ہے کوئی نازنینِ حسن
اے لیلیٔ سمن بر و سلمٰی جبینِ حسن ہمرنگِ آسمان ہے تری سرزمینِ حسن
بجو دیتے ہر ادا تری مستانہ چال پر
خود ناز کر رہا ہے "ذرا دیکھ بھال کر!"

ہر دل ہے تیری دید کا ارماں کشِ وصال ہر آنکھ کو ہے حسرتِ نظارۂ جمال،
گویا زبانِ نطق تری مدح میں ہے لال شاہد ہے تیرے حسن کا خود ربِّ ذوالجلال
والّیل کہہ کے مرتبہ تیرا بڑھا دیا
شانِ اذا سجیٰ کا تماشا دکھا دیا

تیرا وصال روح رواں راحتِ جہاں تیرا جمال آئینۂ حسنِ دلستاں
تیرے سواد میں ہے بیاضِ سحر نہاں نیرنگِ انقلاب ہیں تیری دو رنگیاں
ہے تجھ میں سازِ عشرت و سامانِ غم کبھی
انجمن کبھی، خلش کبھی، یادِ صنم کبھی

تسکین۔ قریشی (سوونی)

# اصلی عورت

محبت کی دختر حسینہ! تعلیماتِ عقل کو گوش ہوش سے سن اور صداقت کی نصائح کو اپنے گوشۂ دل میں جگہ دے ۔ اس طرح تیرے محاسنِ معنوی تیرے جمالِ ظاہری کو چار چاند لگا دینگے ، اور تیرا حسن مانند گلاب کے پھول کے جس سے وہ شابہت رکھتا ہے اپنی دلفریبی کو اُس وقت بھی قائم رکھے گا جبکہ اس کی بہار نذرِ خزاں ہو جائے گی ۔

شباب کی بہار اور زندگی کے آغاز میں جبکہ مَردوں کی پُرسرور نگاہیں تجھ پر پڑتی ہیں اور قدرت تیرے کانوں میں انکی ترجمانی کرتی ہے ، اُنکی میٹھی میٹھی باتوں کو احتیاط کے کانوں سے سن ۔ اور ہوشیاری کے ہاتھوں سے اپنے دل کی حفاظت کر اور اُنکے تملقانہ باتوں اور خوش آیند کلمات پر کان دھر ۔ یاد رکھ کہ تو مرد کی رفیق معقول بنائی گئی ہے نہ کہ اُسکی خواہشاتِ نفسانی کی لونڈی ۔ تیری خلقت کا مقصد اُسکی خواہشاتِ نفل کے پورا کرنے ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ کاروبار کے ہجوم ، معاملات کی اُلجھن اور ترددات کی دار و گیر میں اسکو اپنی محبت سے تسلی اور تشفی دینا ۔ اپنی اندوہ ربا گفتگو اور دلفریب انداز سے اسکا غم غلط کرنا اور اُسکے افسردہ دل میں استقلال اور اُولوالعزمی کی روح پھونکنا بھی تیرا کام ہے ۔

جاننا چاہتی ہو کہ وہ کون ہے جو مرد کے دل کو تسخیر کرکے اپنا پورا پورا تسلط جما دیتی ہے اور اُسکو اپنا والہ و شیدا بنا لیتی ہے ؟ ذرا تخیل کی آنکھیں کھولو ۔ دیکھو وہ آ رہی ہے ۔ دوشیزگی کی دلربائی اُسکے ہمرکاب ہے ، معصومیت اُسکے دل کا زیور ، اور حیا اُسکے دل کی آب ہے ۔ ہاتھ اسکے کام کے متلاشی اور پاؤں گھر گھر پھرنے سے گریزاں ۔ لباس میں صفائی کا خیال اور غذا میں لحاظِ اعتدال ۔ سر پر انکساری اور فروتنی کا تاج جگمگ جگمگ کر رہا ہے ۔ اسکی آواز میں نغمہ کی دلکشی ، الفاظ میں شہد کی شیرینی ، گفتگو میں پاکیزگی ۔ جواب میں صداقت اور نرمی ، اطاعت اور فرمانبرداری کا سبق اسکو یاد ، قلب اسکا مطمئن خاطر اسکی شاد ، پیش بینی اسکی پیشوا ہے اور پاک دامانی اسکی ہمقدم ۔ نرم دلی اور محبت اسکی آنکھوں سے روشن ، اور دانائی و بصیرت اسکی پیشانی سے نور افگن ۔ اوباش کی زبان اسکے حضور میں گنگ ، اسکی پارسائی سے اُسکے لب بند ۔ اتہام کی گرم بازاری کے وقت جبکہ اسکے ہمسایہ کا نام مصداق

دلم چو رنگ زلیخا شکست در خلوت — غمم چو تہمتِ یوسف دویدہ در بازار

بدگویوں کی زبان پر چڑھا ہوتا ہے - اسکی کریم النفسی اور نیک مزاجی اسکے لبوں پر مُہر خاموشی لگا دیتی ہے - اسکا سینہ نیکی کا مسکن ہے اس لیے بدگمانی کا اس میں گذر نہیں - خوش نصیب ہے وہ شخص جو اسکو بیوی بنائیگا اور اقبالمند ہے وہ بچہ جو اسکو ماں کہے گا -

عالم کتخدائی میں قدم رکھتے ہی اسکی خوش انتظامی سے عافیت کا دروازہ کھلتا ہے - اسکے احکام میں وہ معقولیت کہ ملازمین کو نہ جائے عذر نہ محل شکایت - آفتاب سے قبل بیدار ہوئی - حسب معمول مصروفِ کار ہوئی - سب کا کام بتلایا - اپنا کام آپ لیا - گھر کے آرام کی فکر ہی سے اسکو خوشی ہوتی ہے اور اسی کی طرف اسکی تمام توجہ مرکوز - سلیقہ اور کفایت شعاری اسکی ہر بات سے پیدا - اسکا مکان انکا ملجا و ماویٰ - اسکی خوش انتظامی سے ہر شخص کے دل میں اسکے شوہر کی عزت - اور اسکی تعریف سن سن کر شوہر کا دل باغ باغ - اسکی تعلیم و تربیت سے بچوں کے دل و دماغ علم سے آراستہ اور محاسنِ اخلاق سے پیراستہ - اسکا حکم انکے لیے قانون - جسکی تعمیل کے لیے اشارۂ چشم کافی - اس نے آواز دی اور ملازم حاضر - اشارہ کیا اور کام سرانجام - کیونکہ انکے قلوب تابع فرمانِ محبت ہوتے ہیں - اور مہربانی کے قدموں میں پر لگا دیتی ہے - خوشحالی اسکے مزاج میں تکبر پیدا نہیں کرتی اور مصیبت میں صبر اسکے زخم پر مرہم کا کام کرتا ہے - اسکے مشوروں سے شوہر کا غم ہلکا ہوتا ہے اور اسکی محبت آمیز باتوں سے تلخی حلاوت سے مبدل ہو جاتی ہے - اپنے تردداتِ اور تکالیف کو اس سے بیان کرکے شوہر تسکین پاتا ہے - خوش نصیب ہے وہ مرد جس نے اسکو بیوی بنایا - اور اقبالمند ہے وہ بچہ جو اسکو ماں کہتا ہے -

صبیح الدین حیدر بی اے - ایل ٹی

وہ ظالم خفا مجھ سے کیا ہو گیا — مصیبت میں میں مبتلا ہو گیا
نہ کر دردِ دل کی دوا چارہ گر — مرا دردِ دل خود دوا ہو گیا
مذاق اُن سے اچھا نہیں ہر گھڑی — یونہی گر کبھی ہو گیا ہو گیا
غضب میں نے چھیڑا تو بولا وہ شوخ — تمھیں بیٹھے بٹھلائے کیا ہو گیا
ملی دم شماری کی مہلت کہاں — حباب ایک دم میں فنا ہو گیا
وہ جب دھوپ سے چلکے سائے میں آئے — تو مُنہ چاند سا سانولا ہو گیا
وہ کہنے لگے دوسروں سے آخر — خبر بھی ہے کچھ کیا سے کیا ہو گیا

# حُسنِ ادا اور ادب

کسی زبان کے ادب سے مراد وہ نتائجِ افکار ہیں جو باعتبار جذبات اور بنظر تخیل و حسنِ بیان بہترین نمونہ ہوں۔ اس لیے بدقسمت ہے وہ زبان جس کے ادب میں ہر قسم کا رطب و یابس شامل ہو۔ اور جس کے ادیب وہ لوگ ہوں جنھیں صحیح عبارت میں اختصار و فصاحت کے ساتھ ادائے مافی الضمیر کا سلیقہ بھی نہ ہو، میں نے بارہا ایسے مضامین دیکھے ہیں اور ہمیشہ ادبی رسائل میں ان اصحاب کے رشحاتِ قلم کو دیکھتا رہتا ہوں جو بلحاظ جذبات کے نہایت ردی اور بلحاظ زبان کے بالکل لغو ہوتے ہیں، پھر لٹریچر کے یہی معنی نہیں ہیں کہ زبان سلیس اور رنگین ہو، اس کے ہر ہر فقرے سے لچک اور رعنائی ٹپکے، بلکہ لٹریچر عبارت ہے اس رنگینیِ خیال اور رفعتِ تخیل سے جو خدا کی دی ہوئی دولت ہوتی ہے یعنی ہر وہ شخص جو "نوٹ اور تجزیہ" لکھ سکتا ہو کوئی سنجیدہ اور متین شخص اُسے ادیب نہیں کہہ سکتا اور خواہ اُسکی شہرت کا آفتاب کیسی ہی بلندیوں پر کیوں نہ چمکے مگر کوئی تعلیم یافتہ اور حقیقی معنوں میں لکھا پڑھا اُسکی پیشہ ور تحریرات کو نہیں دیکھ سکتا۔ سب سے زیادہ مجھے اس وقت تعجب ہوا کہ لاہور کے ایک مشہور اور ادبی رسالہ نے بھی باوجود مضامین کی خوبی اور معیار کی بلندی کے بعض ایسے حضرات کے مضامین سے اجتناب نہ کیا جو ہرگز اس میں جگہ پانے کے مستحق نہ تھے،

ہمیں اُن حاملانِ ادب سے شکایت نہیں جنکا مضمون نگاری اب پیشہ ہو گیا ہے بلکہ افسوس ہوتا ہے اور مجبوراً ان مدیرانِ رسائلِ ادبیہ کے ذوقِ ادب پر ماتم کرنا پڑتا ہے جو پرچہ کو مرتب کرتے وقت مضامین کو یا تو غور سے دیکھتے نہیں یا صاحبِ مضمون کی شہرت سے توسیعِ اشاعت کا خیال انہیں ایسی خفیف الحرکتی پر آمادہ کرتا ہے، اور یا خود انکا مذاقِ ادب اس قدر پست ہوتا ہے کہ شوکتِ الفاظ اور کاتبِ مضمون کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں، میں کئی دفعہ ادارتِ رسائل کے متعلق یہ مسلہ ظاہر کر چکا ہوں، اور روزانہ کے تجربات و مشاہدات نے میری اس رائے کو اب مستقل بنا دیا ہے کہ جب تک ایڈیٹر کو اپنی قابلیت پر پورا بھروسا اور اپنے قلم پر کامل اعتماد نہ ہو اول تو وہ مہربانی فرماکر اس وقت رسالہ کی اشاعت کا ارادہ نہ کریں، لیکن اگر انکو ایڈیٹر بننے کا ایسا ہی شوق ہو

اور نام و نمود کے شیطانِ نمایش نے اُنکو اپنے آہنی پنجہ میں گرفتار کر لیا ہو تو وہ پرچہ کا کوئی خاص حجم مقرر نہ کریں، اور معقول نذرانے پیش کر کے تعلیم یافتہ اور مسلم الثبوت اہلِ قلم حضرات کی مدد سے رسالہ جاری کریں، کیونکہ جب اشاعت کا زمانہ قریب ہو جاتا ہے تو ایڈیٹر کو حجم پورا کرنے کی فکر ہوتی ہے اور ایسے موقع پر وہ اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا کہ مضمون کس درجہ کا ہے، ادب کی خدمت اور ترقی اُردو کی کوشش کا تو صرف نام ہی نام ہے، اور یہ مہذب تجارت کے اصول ہیں، لیکن اگر جناب منشی صاحب تھوڑی دیر اس مسئلہ پر بھی غور کریں کہ سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اُنکے پرچہ کی کیا قدر رہ جاتی ہے، تو غالباً وہ اس نقصانِ عظیم کو بھی محسوس کریں گے، جس نے اُنھیں رسالہ کی اشاعت پر مجبور کیا ہے۔

مجھے اس اظہارِ خیال کا موقع نہ ملتا اور شاید اب میں خاموش رہ جاتا اگر اُردو کے رسائل کا بہترین سرتاج میری نظر سے نہ گذرتا اور اُسکے ایڈیٹر کی طویل فہرستِ ادارت مجھے اسکی قابلیت کے اندازہ اور قوتِ انتخاب و ترتیب کے مطالعہ کی جانب مائل نہ کرتی،

اس وقت جولائی کا تمدن میرے پیشِ نظر ہے اور میں حیران ہوں کہ تمدن و قوم کے قابلِ قدر ایڈیٹر اور "ہمدرد" "ہمدم" اور "جمہور" کے "سابق رکنِ ادارت" پر کن الفاظ میں اس صدمہ کو ظاہر کروں جو تمدن کے مضامین کے مطالعہ سے میرے دل کو پہونچا ہے، یوں تمدن کی حالت قوم کی اشاعت سے پہلے بھی جہاں تک مجھے علم ہے اچھی نہ تھی لیکن میں سمجھتا تھا کہ جس طرح ہر نیا دن انسان کی معلومات اور قابلیت میں ایک بہترین اضافہ کا سرمایہ لاتا ہے اسی طرح تمدن کا دورِ ثانی بھی نقوشِ اوّلیں سے بہتر ہوگا، لیکن اگر توقعات کی پامالی کے رنج کو تھوڑی دیر کے لیے بُھلا بھی دیا جائے تو قاری صاحب کی قوتِ انتخاب اس درجہ طالبِ ماتم ہے کہ اگر بقول حضرت اکبر کے آستین کی کم ظرفی کی رعایت نہ کی جائے تو جوشِ سرِ اشک سے دنیا یکسر عالمِ آب ہو جائے!

جولائی کے تمدن میں اول تو کئی مضمون ناقابلِ اشاعت تھے، لیکن "حسنِ ادا" اپنے اہمال میں اختراعِ فائقہ ہے اور اسکی اشاعت ایک رسالہ کے ایڈیٹر کے لیے سخت شرمناک حرکت ہے، جنابِ انشا جو صرف تمدن ہی کے صفحات میں باریک نقاب ڈال کر تشریف لائے ہیں، اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئے، مگر عبارت کا سیاق، مہمل شوکتِ لفظی، اور غلط ترکیبوں کا استعمال یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ انشا صاحب کوئی کہنہ مشق لغو نگار ہیں، ہر چند یہ نقاب ایسا دبیز نہیں کہ کاتب صاحب کے بعد سے

خد و خال کی پردہ پوشی کر سکے لیکن خیر یہ بھی ایک انداز ہے اور یارانِ طریقت جانتے ہیں کہ اس برقع میں کون ہے!

مضمون اگرچہ مختصر ہے اور تمدن کے ۱۸ + ۲۲ تقطیع کے ½ ۳ صفحوں میں سمایا ہے، لیکن باعتبار اغلاط کے اک وسیع دفتر ہے جو یقیناً صاحبِ مضمون کی سہل نگاری کا ایک حیرت انگیز اعجاز ہے، ہم یہاں اس شعر سے کوئی بحث نہیں کرتے جسے کاتب نے اپنا موضوعِ بحث بنایا ہے، کیونکہ یہ انتخاب اسکے ذوق کے متعلق ہے اور اس میں وہ غریب مجبور ہے۔ جب فطرت ہی سلامت ذوق کے عطا کرنے میں بخل کرے تو بیچارہ انسان کیا کر سکتا ہے، لہذا ہم صرف نفسِ مضمون سے بحث کریں گے اور یہی ہمارا موضوع ہے۔ جناب انشا فرماتے ہیں

"شعر گوئی کے لیے بعض عنوان حقیقتہً ایسے قیامت خیز ہیں کہ اگر لکھنے والا انھیں ذرا سلیقہ سے کہہ لے تو پھر جذبات کے لیے پناہ نہیں رہتی۔

شعر گوئی کے لیے عنوان اب باتباعِ مغرب مقدر کر دیا جاتا ہے، لیکن جس شعر کی تمہید تعریف میں یہ فقرہ لکھا گیا ہے، وہ نظم کا نہیں بلکہ غزل کا شعر ہے، جس کے لیے اب تک کوئی عنوان مقرر نہیں کیا جاتا، معلوم ہوتا ہے مضمون نگار نے اسپر غور نہیں کیا؟ پھر یہ اہمال یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اسکے آگے یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اگر لکھنے والا ذرا سلیقہ سے لکھ لے تو ......" اس سے بھی عنوان کی تعریف ہی مقصود ہے کہ اگر سلیقہ سے لکھ لیا جائے، یعنی "اس نظم کا کوئی بہتر عنوان مقرر کر لیا جائے تو ......" جناب انشا نے اپنے نشئہ ادبیت میں یہ بھی خیال نہیں کیا کہ وہ اس فقرے سے عنوان کی تعریف کر رہے ہیں یا شعر کی، اور پھر لطف یہ کہ عنوان کا کہیں پتہ نہیں، اگر عنوان سے مراد کسی خاص جذبہ کا اظہار یا کوئی مخصوص حالت ہے تو اُسے عنوان کے ماتحت: باعتبارِ لغت داخل کہا جا سکتا ہے اور نہ باعتبار اصطلاح، دوسرے آپ فرماتے ہیں" تو پھر جذبات کے لیے پناہ نہیں رہتی" غالباً لکھنا یہ مقصود تھا کہ "جذبات کا اشتعال بے پناہ ہو جاتا ہے" لیکن کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جذبات کس کے بے پناہ ہو جاتے ہیں؟ شاعر کے یا سامع کے؟ اگر شاعر مراد ہے تو غلط ہے، کیونکہ اُسکے جذبات نے تو شعر میں جسے جناب انشا عنوان کہتے ہیں پناہ حاصل کی ہے، اور اگر سامع مراد ہے تو انداز بیان واضح نہیں اسکا اظہار ضروری ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے

"کون نہیں جانتا صبح شبِ وصل کی رسوا سامانیاں تحسین نگارش کی آرزو مند ہیں"

"صبحِ شبِ وصل" گو غلط نہیں مگر ایک ثقیل ترکیب ہے اور صرف "صبحِ وصل" سے وہ مفہوم ادا ہو سکتا ہے، مگر اسی فقرہ میں دو غلطیاں اور بھی موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب انشا فارسی و عربی سے نابلد محض ہیں، سب سے پہلے رسوا سامانی کی ترکیب غلط ہے۔ مضمون نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ رسوا اسم صفت ہے اس لیے اس ترکیب کے ساتھ مستعمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے "تحسین نگارش" غالباً لکھنے والے کا مقصود "حُسنِ نگارش" ہے۔ تحسین عربی مصدر ہے جسکے معنی حسین ساختن ہیں (دیکھو قاموس اور صراح)

ایک اور جگہ لکھا ہے

"ہاں کون ہے وہ جو نم جبیں اور گلابی ہونٹوں کی خشکی کو دیکھے اور سر نہ دُھنے"

سبحان اللہ کس بری سر دُھنوایا ہے! اگر ایسی ایسی چیزوں پر ہمتے آپ کے اغواسے سر دُھن لیا تو وہ آنے سے پہلے غریب کا خاتمہ ہو جائے گا جب اسکی ضرورت ہو گی، شاید جناب انشا اس افسوس میں سر دھنتے اور اس حرکت پر لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اُنکے محبوب کی پیشانی پر پسینہ آگیا ہے اور گلابی گلابی ہونٹ خشک ہو گئے ہیں، مگر اسکی بہترین ترکیب یہ ہے کہ رومال سے پونچھ دیجیے اور لبوں کو ....... تر کر دیجیے، آخر سر دُھنے سے فائدہ کیا۔ لیکن شاید آپ کا مافی الضمیر یہ ہے کہ نم جبیں اور ہونٹوں کی خشکی پر آپ کو ایسا پیار آتا ہے کہ بیتاب ہو کر نہ صرف سر دُھننے لگتے ہیں بلکہ سر دُھننے کے لیے ایک حلقۂ المشائخ قائم کرتے ہیں کہ لوگ اس میں آئیں اور یہی حرکت کریں مگر افسوس ہے کہ یہ حلقہ وسیع نہیں ہو سکتا، کیونکہ نم جبیں اور خشک ہونٹ ایسی چیز نہیں کہ کوئی سر والا اس پر اپنے سر کو مفت میں پتھر کی نذر کر دے۔ ہم تو شگفتہ گلاب کو پسند کرتے ہیں اور بحمد اللہ اب بھی اسی روش پر قائم ہیں، مگر معلوم ہو کہ آپ کے نزدیک گلاب میں دلکشی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ اُسکی پتیاں زرد ہو جاتی ہیں اور وہ مرجھا کر گر پڑتا ہے،

اب تک میں سمجھتا تھا کہ نیاز صاحب نے لبوں کی تعریف میں یہ شعر لکھکے اُنکو بے نیازِ تعارف کر دیا ہے یعنی

پھر کسے لب کہو اگر چھن جائے تازگی مے کی اور گلاب کا رنگ

لیکن مدتوں کی تلاش و جستجو کے بعد آج ادیبوں کے ایک ایسے گروہ کا پتہ چلا جس کے نزدیک بالوں میں حسن پیڑیاں جمنے کے بعد پیدا ہوتا ہے، اور اس گروہ کے "صدر" جناب انشا ہیں! مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ قناعت کس مقصدِ عظیم کے لیے اختیار کی گئی ہے اور حضرت انشا نے عشاق کے جمِ غفیر میں اپنا سجادہ سب سے علٰحدہ کیوں بچھایا ہے! بھلا اب حسینانِ عالم انشا صاحب کو چھوڑ کر ایسوں کو کیوں پسند کرنے لگے جو صرف تازگی شباب اور حسنِ دلارام کے دلدادہ ہوں، انھیں تو ضعیفی کا عاشق چاہیے اور عمر بھر کا ساتھی!

تمدن اگر آپ نے دیکھا ہے تو پہلے صفحہ کی یہ اخیر سطر آپ کو ضرور یاد ہوگی:—

"کون ہے وہ جو بگڑے ہوئے خال، پھیلے ہوئے غازے اور کھلے ہوئے بالوں کا انداز رعنائی ملاحظہ کرے"

اس "انداز رعنائی" سے ایک اور بات کا پتہ چلا کہ آنجناب نے ابھی تک "رعنائی" کے معنی ہی نہیں سمجھے ہیں، کیونکہ غریب کو ایسی جگہ گرفتار کیا ہے جہاں وہ بالکل بے معنی ہے اور مضمون نگار کی نا قابلیت کا ثبوت دیتی ہے۔ انشا صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رعنائی صرف انھیں چیزوں میں ہوتی ہے جو لانبی ہوں، گو ہر لانبی اور دراز شے میں رعنائی نہیں لیکن ہر رعنائی میں درازی کا مفہوم ضرور شامل ہے، یعنی اس لحاظ سے کھلے ہوئے بالوں میں ضرور رعنائی ہے، مگر پھیلے ہوئے غازے اور بگڑے ہوئے خال میں رعنائی ملاحظہ کرنا مشکل ہے، ہاں اگر خال بگڑ کر گال پر ایک عصا بن گیا ہو یا غازے نے پھیل کر طباق مستطیل کی شکل اختیار کر لی ہو تو اس میں رعنائی کا مفہوم پیدا ہو سکتا ہے مگر اس حسن کی تلاش میں ہمیں انشا صاحب کی ضرورت ہوگی، اور انھیں اپنے کاروبار سے اس قدر فرصت نہیں ہوتی کہ بھوپال تک آ سکیں!

دوسرے صفحہ کے شروع کی یہ عبارت اپنے طرز کی عجیب و غریب عبارت ہے کہ:—

"شباب آسودہ انگڑائی لیتے ہوئے ابھی پورے اٹھ بھی سرے نہ اٹھے تھے کہ کوئی نا جنس بے محابا سامنے آگیا"

حضرت انشا اگر "شباب آسودہ انگڑائی" کے بجائے یہ لکھتے کہ "جوش شباب میں انگڑائی لیتے ہوئے ....." تو کچھ برا نہ ہوتا اور صحیح صحیح مطلب یوں ادا ہو جاتا، مگر جس شعر سے جناب نے یہ ترکیب اخذ کی ہے وہاں "چشم شراب آلودہ" ہے اور آپ نے انگڑائی کو شباب آسودہ لکھا ہے جو سر تا پا غلط ہے،

انگڑائی کی صفت میں آپ پُرشباب کہہ سکتے ہیں، نہ کہ آسودۂ شباب جس میں شیب کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہو یعنی شباب سے آسودگی حاصل کرکے آغوشِ ضعیفی میں عزلت اختیار کرنے والا ہے، کہیں آپ نے شباب آلودہ تو نہیں لکھا تھا جسے کاتب نے آسودہ بنا دیا؟ اس غلطی کے بعد ناجنس کا بے محابا سامنے آجاتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت انشا جب ناجنس کا صحیح استعمال بھی نہیں کرسکتے تو مضمون لکھنے کی جرأت کیوں کی؟ ناجنس کو جنس غیر کی جگہ استعمال کرنا صریح غلطی ہے، کسی کو ناجنس صرف اُسی وقت کہا جا سکتا ہے جب خلافِ مزاج و مذاق مقصود ہو، حالانکہ وہ ایک مرد کی آمد ظاہر کر رہے ہیں!

جناب انشا کے ہاتھ میں قلم ہے اور وہ اپنے نشۂ ادب میں سرشار بے تکان لکھے جاتے ہیں اور پروا بھی نہیں کرتے کہ کیا لکھا ہے، میرے پاس اس قدر وقت نہیں کہ کل مضمون یا اُنکے مضامین کی غلطیوں کو بتلاؤں، تاہم آج فرصت مل گئی ہے، "حُسنِ ادا" میں ایک سرسری نظر جس قدر بھی غلطیاں منتخب کرسکی ہے لکھ چکا ہوں، لیکن اس کا تو ایک ایک حرف محتاجِ تنقید ہے اور میں حیران ہوں کہ کہاں تک لکھے جاؤں، مثلاً اسی دوسرے صفحہ میں ایسی فاش غلطیاں ہیں جنھیں اگر ظاہر نہ کیا جائے اور جو اگر اہلِ نظر کے مطالعہ میں نہ آئیں تو میں گنہگار ہوں گا، اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا، اس لیے مجبوراً میں چند عام غلطیاں اور بتلاتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اگر آئندہ بھی صاحبِ مضمون اپنے قلم کو جنبش دیں تو ذرا ان باتوں کا خیال رکھیں۔ غور کیجیے فرماتے ہیں

"اس کی حریص نگاہیں نظارہ کا پیامِ شوق لیکر آئیں، سوائے اسکے کہ وہ مورے اُٹھے ہوئے ہاتھ مسکرا کر چھوڑ دیے جائیں اور کیا ہوتا۔ یہ فسانہ بھی مجھے تڑپا چکا ہے' اور نظام کے لاجواب مطلع کا یہی موضوع شعری ہے"

کسی مرد کی حریص نگاہیں جب کسی حسین دوشیزہ کے پاس پیامِ شوق لے جائیں گی تو یقیناً وہ اور خواہشات کے ساتھ نظارہ کی درخواست ضرور پیش کریں گی، لہٰذا لفظ نظارہ کی نہ صرف یہاں بالکل ضرورت نہیں، بلکہ اس سے تمام آرزوؤں اور تمناؤں کی تحدید ہو جاتی ہے، کیونکہ نظارہ کو منتہائے آرزو بنا دینے میں عبارت کے اختصار کے ساتھ فصاحت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور تمناؤں کی وسعت بھی کم ہو جاتی ہے،

اسکے بعد اس شرمیلی لڑکی نے ہنس کر ادمورے اُٹھے ہوئے ہاتھ چھوڑ دیے، اور اس فسانہ نے جناب انشا کو بُری طرح تڑپا دیا، مجھے ان واقعات سے تو بحث نہیں اور نہ معلوم کہ خارج از بحث ہونے کے علاوہ مجھے اس خاص بازار کے خلوت کدہ میں دخل کی کہاں مجال، مگر پھر بھی جناب انشا سے مجھے

شکایت ہے اور اس لیئے شکایت ہے کہ عبارت سے عمومیت پائی جاتی ہے درانحالیکہ وہ یہاں ایک خاص واقعہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اگر انکی محبوبہ بنظرعام کی ایکٹرس بھی ہوتی تو ایسے وقت اُسکی حالت اس سے مختلف ہوتی۔ اور انھیں یہ لکھنا پڑتا کہ" اُسکی تیوری پر بل آگئے اور اُس نے ......."

کیونکہ عام طور پر جب کسی عورت کی خاص حالت میں کوئی مرد نامعلوم طریقہ سے داخل ہو بھی جاتا ہے تو بجاے مسکرانے کے اُسکی تیوری پر بل آجاتے ہیں، دوسرے آپ نے لکھا ہے" ادھورے اُٹھے ہوے ہاتھ..... چھوڑ دیئے جائیں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کہنی تک ہاتھ اُٹھے تھے یا انگڑائی کے لیئے ہاتھ اُٹھانے کی کوئی خاص حد معین ہے جو پوری نہ ہوئی تھی؟ لیکن یہ دونوں مطالب مہمل ہیں، اگر آپ یوں لکھتے کہ "سوائے اسکے کہ پوری انگڑائی لیے بغیر ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں ....." یا جس وقت آپ اُنکے پاس جاکر بیٹھے ہوں تو اُنھوں نے غصہ اور بظاہر پیار سے اک خاص انداز سے مارنے کے لیئے ہاتھ اُٹھائے ہوں مگر یہ کہتے ہوئے چھوڑ دیئے ہوں کہ" یہاں تھا۔ اکیا کام ...." بہرحال تاوقتیکہ مطلب واضح نہ ہو لطف نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ اور نہ اس نوع کی تحریرات ادبی کہلائی جا سکتی ہیں!

اسکے بعد موضوع شعری پر حیرت ہوتی ہے، کیونکہ جب مطلع کا لفظ لکھ چکے تھے تو موضوع کے بعد شعری کی کیا ضرورت تھی، مطلع کا موضوع توہرطرح شعری ہوگا!

آگے چل کر جناب آشنا اپنے دوست کو مخاطب فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" پھر حبیب تمیں کہو کہ رات کو آدا نے جو کیفِ تغزل پیش کیا تھا وہ کیا قیامت کا نمونہ تھا "

شاید اس سے مضمون نگار کا مطلب یہ ہے کہ رات کو آدا کی غزل نے بڑی کیفیت پیدا کی، مگر اُنھوں نے جو گُدی کی طرف سے ہاتھ کو گھما کر ناک پکڑنے کی کوشش کی ہے ہمیں تو کچھ پسند نہیں آئی۔ اگر پیش کے بجائے پیدا لکھ دیتے تو غالباً آبروریزی نہیں ہوتی؟ اس کیفِ تغزل کی پیشی کے بعد فرماتے ہیں: "وہ کیا قیامت کا نمونہ تھا" بیک نظر جب آدمی اس جملہ کو پڑھے گا تو فوراً اُسکی نظریں آخر میں علامتِ استفہام کو تلاش کریں گی، کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ آپ اپنے دوست سے سوال کر رہے ہیں، لہٰذا ادائے مطلب اور وضاحت کے لیئے بجائے کیا کے کیس کا لفظ بہتر تھا اور محاورہ میں استعمال بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں یہ بھی ایک انکشاف جدید ہے کہ قیامت مختص بہ کیف ہے اور کیف بھی کیا؟ تغزلی!

ادا کی نغمہ سرائی کی تعریف کرتے ہوے انتہائی داد دیتے ہیں کہ:-

" اور علی الخصوص اسکے اس شعر نے تو عالم جذبات میں ایک رستخیز تلذذ بپا کر دیا "

عالم جذبات میں رستخیز تلذذ بپا ہو جانا بھی اس قدر شان دار لغویت ہے کہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اگر ایک معمولی قابلیت کا آدمی اسے پڑھے گا تو فوراً مرعوب ہو جائے گا، کیونکہ اس فقرہ میں ایک لفظ بھی ہلکا نہیں، عالم جذبات ایک شان دار لفظ ہے اور اس جہان سے الگ مگر اسی سے وابستہ ایک وسیع دُنیا کا نام ہے، رستخیز بھی لڑائی دنگے کے ہم معنی ایک وزنی لفظ ہے، اور تلذذ کو تو ادیبوں کی جدید نسل نے ایک مرض متعدی بنا ہی دیا ہے، لہذا کوئی شخص حتیٰ کہ جناب ...... بھی اس جملہ کو ہلکا نہیں کہہ سکتے، مگر ذرا غور کرنے کے بعد یہ تمام شان و شوکت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے اور پردہ پوش انشا صاحب کی مرعوب کُن قابلیتوں کا راز فاش ہو جاتا ہے، لذت کے ساتھ ہیجان یا رستخیز کا استعمال نہایت لغو اور بے معنی ہے، عالم جذبات میں ہیجان بپا ہو جانا بہت آسان ہے اور ہمیشہ مرد عورت، بچے بوڑھے، حتیٰ کہ حیوان بھی مہیج ہوتے ہیں، لیکن لذت یا تلذذ کو ہیجان و رستخیز سے کیا واسطہ؟ لذت تو ایک ایسے وجدانِ قلبی کا نام ہے جس میں ہیجان یا طوفان نہیں ہو سکتا، اور جو لذت ہیجان کا نتیجہ ہوتی ہے یا جو ہیجان لذت کا نتیجہ ہوتا ہے، اُسے جذبات سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ وہ محسوساتِ جسم سے متعلق ہے، اسکے علاوہ جس شعر کا نتیجہ ہیجان یا رستخیز ہو وہ شعر نہیں بلکہ کچھ اور ہے!

اسی صفحہ کے وسط میں ایک اور بھی شکیب ربا فقرہ ہے، جو صاحبِ مضمون کی زبان میں اس طرح لکھا ہے؛

" اور پھر انہماکِ کیف و لذت میں وہ جو جناب گھنٹوں غرقابِ استغراق رہے آخر کیفیے تو وہ کیا تھا "؟

اگرچہ میں نے انشا صاحب کا مطلب بڑی کاوش و جستجو کے بعد سمجھ لیا مگر اس غرقابِ استغراق پر مجھے اسقدر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ آخر عربیت و فارسیت جتانے کے لیئے بھاری بھاری الفاظ اور ترکیبیں کیوں استعمال کرتے ہیں؟ مضمون نگار نے استغراق کا ایک سمندر فرض کیا ہے اور اُس میں اپنے دوست کو ڈبو دیا ہے، لیکن میں اگر اس موقع پر موجود ہوتا تو جناب انشا کو رائے دیتا کہ بجائے فرض کرنے کے آپ کے لیے اسی دُنیا کے سمندر کافی ہیں جس میں آپ اپنے دوست کو غرق یا مستغرق کر سکتے ہیں!

اسی کے بعد ارشاد ہے :-

" آہ بات تو یہ ہے کہ خوب ہی حقیقت منکشف شعر ہے "

حقیقت منکشف، غالباً کاشفِ حقیقت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، مگر یہ حقیقت صرف

خاص خاص لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے ہر شخص میں اتنی قدرت کہاں کہ ان دُرہائے معانی کو بحرِ اجمال سے حاصل کر سکے، انکشاف کے معنی ہیں خود بخود ظاہر ہونے کے، کیونکہ باب انفعال متعدی نہیں لازم ہے، پس منکشف (جو انکشاف کا اسم فاعل ہے) وہ چیز ہوئی جو خود بخود ظاہر ہو، یعنی شعر حقیقت منکشف وہ شعر ہوا جو اس دُنیا کا کوئی شاعر نہیں کہ سکتا،

شعر کے متعلق لکھا ہے :-

"ہاں یہ کہو کہ ایک شعر میں شرم کے مترادف چُن چُن کر الفاظ بھر دیئے ہیں"

مگر جس شعر کی تعریف میں یہ جملہ لکھا گیا ہے، اسکے اندر ہمیں تو کہیں لفظ شرم کے علاوہ کوئی لفظ اسکے مترادف نہیں ملا، یعنی

کیا ہے شرم کے پردہ میں بسمل     شرارت ہے یہ شرمندہ نظر کی

اس میں اگر پردہ، بسمل، شرارت، شرمندہ نظر، شرم کے مترادف ہو سکتے ہیں تو ضرور "چُن چُن کر بھر دیے گئے ہیں" چونکہ شعر نہایت بلیغ اور ادق ہے، اس لیے شرح کی بھی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انشا سے زیادہ کوئی شخص اہلیت نہیں رکھتا کہ مطالب و معانی کو باحسن وجوہ سمجھا سکے، لہذا مناسب ہے کہ اس تشریح کو بھی انتقادی روشنی میں لایا جائے، چنانچہ لکھا ہے :-

"آؤ میں تمھیں اس شعر کا صحیح مفہوم سمجھاؤں ایک پری تمثال حسینہ کو برسوں کی منت کے بعد ایک رات اپنے ہاں مہمان کیا، رات بھر داستانِ شباب پڑھی جاتی رہی، جوانی کی فتنہ روش حکایتیں ممنونِ سماعت ہوتی رہیں اور وہ کچھ ہو گذرا جس کا ارمان تھا"

اسکے بعد آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ "حسنِ ادا" نہ دیکھنے والوں کی بھی سمجھ میں آسکتا ہے، مگر میں نہیں چاہتا کہ اسکے مفہوم سے نظارِ کرام کو محروم رکھوں، سنیئے اور ذوقِ سلیم کو داد دیئے کہ جب صبح ہوئی اور پری حسینہ اپنے گھر سدھارنے لگیں تو غالباً نذرانہ دینے سے قبل جناب انشا نے ان سے دوسری عنایت یا حسن کی داد طلبی کے لیے کسی خاص مدت کی تعیین کے لیے درخواست کی، مگر اس نے اپنی محجوب نگاہوں کو جھکا کر زبان حال سے یہ کہا

"رات کو کیا چین سے سونے دیا ہے جو پھر بلاتے ہو"

اب غور کیجیے کہ رات کو ایک پری کے سامنے اپنی "جوانی کی فتنہ روش حکایتیں" سنائیں اور وہ کچھ کیا

جو تقاضائے شباب یا اقتضائے بہیمیت و حیوانیت تھا، اور پھر اُس سے دوسری عنایت کی درخواست کی تو اُس نے رات کی چھینیوں کی شکایت کی، کیا یہ تمام واقعات کسی پاکیزگیِ خیال اور سلامتِ ذوق کا نتیجہ ہیں؟ کیا ایسے فحش مضامین اور اس نوع کی بیہودہ تحریریں اس قابل ہیں کہ ایک رسالہ جسے اپنے علمی، فلسفی، تمدنی، اخلاقی، معاشرتی اور نہ جانے کیا کیا ہونے کا دعویٰ ہو، شایع ہو سکیں؟ جس ورندگی کی تعریف ہمارے نقاب پوش دوست ان الفاظ میں کر رہے ہیں اور اپنے انداز گفتگو سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اُنکے نزدیک یہ سب باتیں انتہا نے لطافت ہیں، حالانکہ ہر سلیم المذاق انسان کے لیے ایسی گفتگو یا ایسا لٹریچر تنفّصِ طبع کا باعث ہے اور وہ اسے دناوتِ تخیل اور اخلاق کی پستی کا بدترین نمونہ خیال کرتا ہے، اگرچہ اس زمین پر بسنے والا کوئی انسان بھی ایسا نہیں جسکی فطرت کا اقتضا وہ نہ ہو جو انشا صاحب نے ظاہر کیا ہے، مگر لطافتِ خیال سے اسکو موسوم کرنا بیہودگی ہے اور ایسی تحریریں دامنِ ادب پر بدنما داغ ہیں!

میں نے اس تنقید میں بہت سی خفیف غلطیاں چھوڑ دی ہیں، کیونکہ اگر ان سے بھی بحث کرتا اور تنقیدی نظر ڈالتا تو مضمون بہت طویل ہو جاتا، مثلاً

"رخصت کے وقت جھکی ہوئی آنکھوں کا پردۂ شرم یوں ہی لپا میٹ کر دینے کو کیا کم تھا کہ شرمندہ نظر کی ماجرا طراز خراز تیں اور معیبت ڈھا گئیں"

اسی طرح:-

مانا کہ رات کو اودا خوب گائی، پھر کیا؟ استادانِ موسیقی کو بھا گیا"

اور:-

اول تو یہ کہ پورے شعر کے دونوں مصرعوں میں الّا ماشاء اللہ ربط مفہوم نہیں"

لیکن مجھے امید ہے کہ میرے دوستِ انشا آیندہ اس قسم کی مضمون نگاری سے احتراز کریں گے، کیونکہ اگر انکی یہ جگر کاوی اُردو کی خدمت کے لیے ہے تو اُردو کو ایسی خدمت کی ضرورت نہیں، اور اگر اس سے مقصود شہرت و عزت ہے تو اس میں شہرت تو ممکن ہے مگر عزت کے ساتھ نہیں،

آخر میں مَیں جناب قاری عباس حسین صاحب علیگ کو خصوصاً اور دیگر ادبی رسائل کے محررین کو عموماً یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ حتی الامکان ایسے لغو اور محض شوکتِ لفظی کے مجموعۂ مضامین کی اشاعت

سے اجتناب کریں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے اور اس قدر ان میں قابلیت نہیں تو یا تو منظر عام پر آئیں اور اگر اُن کو ادارت کا ایسا ہی شوق ہے تو "بہترین" اور "ممتاز ترین" کے خطابات سے اپنے مجموعۂ مزخرفات رسائل کو سرفراز نہ فرمائیں، کیونکہ نہ تو یہ خودستائیاں اُنکو کچھ فائدہ پہونچا سکتی ہیں اور نہ ان الفاظ سے کوئی مرعوب ہو سکتا ہے، اور اگر بفرضِ محال کوئی سادہ لوح مرعوب ہو بھی گیا تو ایک دفعہ، اسکے بعد آپ کے لیے کیا چارۂ کار ہوگا۔ علاوہ ازیں انھیں غور کرنا چاہیے کہ جب غیر قوموں کے فاضل انکی نا قابلیت کی یہ حقیقت معلوم کریں گے تو اُنکی نگاہوں میں آپ کی کیا وقعت رہ جائے گی؟ کہکشاں جاری ہے نقاد ابھی زندہ ہے اور جس طرح بھی ادبِ لطیف کی خدمت کر سکتا ہے کر رہا ہے پھر آپ ہی کو ایسی کیا ضرورت ماری جاتی ہے کہ پانچواں سوار بننے کی کوشش میں اپنا نام بدنام کرنے کے درپے ہیں۔ "صبح امید" اگر آپ کی نظر سے گذرا ہے تو غالباً آپ تلاش و تحقیق کے بعد اسکے ایک نمبر میں ایسی فاش غلطی، اور عربی الفاظ کا غلط استعمال نہیں بتلا سکتے حالانکہ اسکا محرر خصوصی وہ ہے جسے آپ کی قوم ہندو کہتی ہے، جس کی مادری زبان بھاشا اور سنسکرت ہے! مجھے معاف کریں قاری صاحب کہ میں نے اُن سے جو توقعات قائم کی تھیں اُن کی پامالی نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ غالباً میں خاموش رہتا، اور مجھے کوئی حق نہ تھا کہ تنقید و احتساب سے اپنے حزن و ملال کا غبار اُن تک پہونچاتا۔ وما علینا الا البلاغ

ابوالاعلیٰ مودودی

ناکامیوں کا غم دمِ رخصت لیے ہوئے
جاتے ہیں دل کی دل ہی میں حسرت لیے ہوئے

طے کر رہا ہوں شوق میں راہِ تلاشِ دوست
اک دل میں شمعِ داغِ محبت لیے ہوئے

تحریک تیری خوب ہے اے اضطرابِ شوق
لیکن یو نہیں کہ شانِ شماتت لیے ہوئے

صدقے ہو میری روح، کھڑے ہو یہ کیوں اُداس
کچھ پھول دیدے سرِ تربت لیے ہوئے

دنیا سے جا رہا ہے کوئی نا امیدِ وصل
دل میں کسی کا دردِ محبت لیے ہوئے

دیکھ اس طرف ذرا کہ پلیٹے کفن سے منہ
جاتا ہے کون شرم کی غیرت لیے ہوئے

بخشش کھڑی ہے حشر میں نشتر کی منتظر
آغوشِ انتظار میں رحمت لیے ہوئے

نشتر (سندیلوی)

# ہندوستان پرست

(۱)

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ حسن نے ولایت سے ڈاکٹری کی سند حاصل کرکے بہت کروفر سے ہمارے صوبہ کے ایک مشہور شہر میں پریکٹس شروع کی۔ نوجوان، بلا کے ذہین، محنتی، اور نہایت ہی وسیع الاخلاق، آنکھ میں مروت ایسی کہ غریب غرباء کا علاج مفت کرتے، فیس کبھی کسی سے مانگتے نہیں، جس کسی نے دیدیا لے لیا۔ نہ دینے والے سے وہ محض اس لیے خوش ہی ہو جاتے کہ اس نے فیس دی ہے اور نہ دینے والے سے ناراض ہی ہوتے۔ شام کو کھانے کے وقت معمول تھا کہ دس بارہ آدمی ضرور ہوں، اور اس میں بھی ایسی شانِ مساوات نظر آتی کہ جو دولتمندوں کے لیے سبق آموز تھی۔ غریب سے غریب بھی ڈاکٹر کے کندھے سے کندھا ملا کر کھانا کھاتا! ڈاکٹر کو غربت سراے ہند کا حال پورے طور سے معلوم تھا، انکے پہلو میں جذبات سے لبریز ایک دل تھا جس میں ہندوستان کی محبت، نہیں بلکہ ہندوستان کا عشق موجود تھا!

قومی جلسوں میں ڈاکٹر بہت دلچسپی سے حصہ لیتا۔ تقریر کرتا، رزولیوشن پاس کراتا۔ اُس کا جوش شہر میں ضرب المثل تھا۔ اسکی فصاحت و بلاغت اور تقریر کی روانی و سلاست کا بہت شہرہ تھا۔ اسکی انھیں دلچسپیوں کے باعث احباب نے اسکو "ہندوستان پرست" کہنا شروع کردیا۔ ڈاکٹر کا عقیدہ تھا کہ خواہ نئی ریفارم اسکیم کیسی ہی ناقابل قبول کیوں نہ ہو، خواہ موجودہ بیوروکریسی کا طرز عمل ہندوستانیت کے خلاف کیوں نہ ہو لیکن ہندوستان کا مستقبل نہایت ہی روشن ہے۔ اسکو وہ زمانہ دور نہیں نظر آتا جب ہندوستان نوآبادیوں کی طرح ایک آزاد ملک ہوکر دنیا میں مہذب ممالک کا تجارت وغیرہ میں مقابلہ کرے گا۔ دوست احباب اُسکی ان باتوں پر ہنستے اور اُسکو جوش آجاتا۔ وہ محبت میں ہندوستان کے مختلف نام لیتا۔ وہ اسکو "مادروطن" کہتا، کبھی "بھارت ماتا" کے نام سے یاد کرتا، کبھی "وطنِ عزیز" کہہ کر پکارتا۔ کبھی "ہمارا ملک" "پیارا ملک" کہتا۔ غرض کہ ڈاکٹر "مادروطن" کی پرستش کرتا، اُس کو ملک کی مصیبت ناک حالت دیکھکر رونا آتا۔

(۲)

ڈاکٹر محض روپیہ پیدا کرنے کی غرض سے علاج کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا۔ وہ روپیہ کو ایک فضول اور بیمعنی شے تصور کرتا۔ دنیا میں اپنی زندگی کا مشن اُس نے بنی نوعِ انسان کی خدمت رکھا تھا۔ رات کو اُن گھنٹوں میں جن میں دوسرے ڈاکٹر غفلت کی میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں، اکثر ہمارا "ہندوستان پرست" کسی ضعیف بُڑھیا کے ہمراہ سڑک پر پیدل جاتا ہوا نظر آتا ہے، غیر معمولی اوقات کے لیے اُسکی فیس بھی غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غریبوں کے ہاں مُفت جاتا۔

ایک دن رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر میٹھی نیند سو رہا تھا کہ وہ بیدار کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک میم صاحب ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتی ہیں۔ اس جگہ پر یہ ظاہر کر دینا ضروری تھا کہ ڈاکٹر کے قومی جذبات، اُسکی ہندوستان کی محبت کے باعث وہ ہندوستانی عیسائیوں کے طبقہ میں زیادہ ہردلعزیز نہ تھا۔

ہمارا "ہندوستان پرست" ہندوستانی میم صاحب کو دیکھ کر متعجب تو ضرور ہوا، لیکن اُسکا ظرف عالی تھا، وہ مجسم اخلاق تھا۔ وہ مروت و محبت کا آفتاب تھا جو ہر فرد پر یکساں روشنی ڈالتا ہے، فوراً میم صاحب کے ساتھ ہو لیا، میم صاحب کا مکان قریب ہی تھا چند منٹ میں دونوں ـــــ ایک ہندوستان کی پرستش کرنے والا اور دوسری شاید اسکے نام سے متنفر ـــــ منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ میم صاحب کی صاحبزادی جو بی۔اے کا امتحان دے کر مکان آئی تھیں دفعتاً دردِ گردہ سے پریشان ہو گئی تھیں۔ سارے جسم سے پسینہ جاری تھا۔ بیہوشی کی سی کیفیت، آنکھیں کسی طرح کھولتی نہ تھیں۔ ڈاکٹر نے انکی حالت دیکھی۔ نہایت ہی غور و خوض سے دوا تجویز کی اور خود اُس وقت تک بیٹھا رہا جبتک کہ صاحبزادی صاحبہ کی تڑپ اور بے چینی کم ہوئی، آنسو تھمے، اور خدا خدا کر کے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مزاج پوچھا، اُدھر سے شکریہ کے ساتھ ہی مزاج اچھے ہونے کا جواب ملا۔ اور ڈاکٹر صاحب واپس چلے آئے۔

(۳)

ڈاکٹر صاحب آنے کو تو چلے آئے لیکن صبح کا انتظار! یہ کیوں؟ یہ سوال اگر اُسوقت خود ڈاکٹر سے کیا جاتا تو وہ بھی اس کا جواب نہ دے سکتا: خود بخود، آپ ہی آپ، بلا ارادہ، بلا ضرورت، صبح کا انتظار! صبح ہوئی لیکن ہمارے "ہندوستان پرست" کی زندگی میں اپنی قسم کی پہلی صبح تھی۔ ایک غیر معمولی

کشش، اور نا معلوم قوتِ غیر ارادی اسکو پھر بیگم کی طرف لے گئی۔ مریضہ رات ہی کو قریب قریب اچھی ہو چکی تھی، ڈاکٹر صاحب مزاج پرسی کو گئے، لیکن خود انھیں کا دل اندر سے ان کے اس فعل کو پسند کرتا! ڈاکٹر صاحب کی خاطر مدارات بہت ہوئی اور بیگم صاحب اور انکی صاحبزادی مس روزا سے قریب ایک گھنٹہ تک باتیں رہیں۔

مس روزا ایک کمسن، خوبصورت، اور نہایت ہی شوخ لڑکی تھی۔ کوئی شاعر اگر اس کا سراپا کھینچتا تو شاید اسکو بحرِ شاعری کی کافی غواصی کرنی پڑتی۔ وہ اسکی کمر اور اسکے دہانے کو اقلیدس کے نقطہ سے تعبیر کرتا۔ اسکے "گل عذار" کو وہ بلبلوں کو دھوکا دینے والا کہتا۔ اسکی چشم نرگسین کو آہو صفت بیان کرتا۔ اسکی برق آسا نگاہ کو عشاق کے دلوں کو چھیدنے والا تیر بتلاتا۔ اسکے گیسوؤں کو ڈس لینے والے مارِ سیاہ سے تشبیہ دیتا۔ لیکن یہاں محض ان تین لفظوں میں اسکا سراپا کھینچنے کی کوشش کیجاتی ہے: وہ کمسن تھی، شوخ تھی، اور غضب یہ کہ خوبصورت بھی تھی! ان الفاظ میں وہ سب پنہاں ہے جو ہندوستان پرست نے دیکھا، جس سے وہ متاثر ہوا، اور جس نے اسکو "ہندوستان پرست" نہیں بلکہ —— آہ! کہتے ہوے شرم آتی ہے —— بلکہ "روزا پرست" بنا دیا۔ اے کاش! یہ صبح صبح محشر ہوتی تو میدانِ حشر میں ہمارا "ہندوستان پرست" سرخرو جاتا۔ اس کا دل ملک اور صرف وطن کی محبت سے چھلکتا ہوتا، نہیں، وہ اس سے بھی بالاتر ہوتا۔ اسکے نامۂ اعمال میں وہی لکھا ہوتا جو ابراہیم بن ادہم نے ایک رات آسمانی فرشتہ سے کتاب زریں میں لکھنے کو کہا تھا: یعنی "بنی نوع انسان کی خدمت!"

(۴)

دنیا کے آئے دن کے نئے انقلابات، اور نت نئی حالتیں ہمارے لیے بہت کچھ سبق آموز ہیں بڑے بڑے زاہد و عابد بڑے بڑے عالم و فاضل، جن کے زہد و اتقا کی قسم کھانے کو ہم تیار ہو جاتے ہیں، اکثر ایسا ہوا ہے کہ اگر بگڑے ہیں تو ایسے کہ ہم سب کے لیے سبق آموز، اور خصوصاً وہ راے جو عنفوانِ شباب میں قائم کی جاتی ہے دقت سے قیام پذیر ہوتی ہے۔ اسی انقلاب کی ایک مثال ہم کو "ہندوستان پرست" کی زندگی میں نظر آتی ہے۔

اسکی زندگی میں انقلاب ہوا، اسکے خیالات نے پلٹا کھایا، اور ہندوستان سے محبت کرنے والا، وطنِ عزیز کا عاشق، بادۂ وطن کی پرستش کرنے والا، ملک کی خدمت میں جان کھپانے والا، اور ہمارا ماتا

کا پجاری آج ہم کو خود غرضی کا اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے۔ پہلے وہ ہندوستان کی محبت دل میں رکھتا تھا، کیونکہ یہ اُس کا فرض تھا۔ پہلے وہ غریب ہندوستانی کو برابر بٹھاتا، غریبوں کی خفیہ مدد کرتا، چھپا چھپا کر بیواؤں کو روپیہ بھیجتا، کیونکہ اُسکی رسالے میں نشاے آفرنیش یہی تھا۔ لیکن افسوس اب اسکے دل سے ہندوستان کا تمام جوش وخروش اُسی طرح جاتا رہا ہے جیسے شام کے قریب سورج کی روشنی۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان کا خیال اُسکے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹ رہا ہے، وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ اب جب وہ جلسوں میں جاتا ہے تو اُسکا دل کچھ اور چاہتا ہے، اسکی نظریں کوئی دوسرا منظر ڈھونڈتی ہیں، اور اسکے کان "بندے ماترم" کی آواز کے بجاے کوئی دوسری آواز سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور نہ اس نے کبھی اس بات پر ہی غور کیا کہ کیوں اب وہ بعض جلسوں کی شرکت ترک کرکے ایک نئی جگہ چلا جاتا ہے۔

(۵)

ہم اُس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں جب "ہندوستان پرست" اپنے صوبہ کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی بہت عزت سے یاد کیا جانے لگا تھا، اسکی معمولی معمولی تقریروں کو نہایت روشن سرخیوں کے نیچے لکھا جاتا، اور عموماً وہ اخبار جس میں اسکی کوئی تقریر ہوتی دونی تگنی تعداد میں فروخت ہوتا، نیشنلسٹ اخبارات اسکی تعریف کے ترانے گاتے، کوئی اسکو مزینی کہتا، کوئی اسکو گیری بالڈی کے نام سے پکارتا، لبرل (ماڈریٹ) اخبارات بھی باوجود بعض معاملات میں مخالفت کے اسکی تعریف کرتے اور حریفان بادہ کش ——— اینگلو انڈین اخبارات ——— اس کا مذاق اُڑاتے اسکی تعریف بھی اگر کرتے تو تضحیک آمیز اور برائی بھی کرتے تو چٹکیاں لیتے ہوے۔

اسی درمیان میں ہمارا دل دوسری جانب متوجہ ہوتا ہے اور ابتداے عشق ہوتی ہے۔ اب جب وہ کسی قومی جلسہ سے احتراز کرتا یا کسی مریض کو دیکھنے کے لیے سیکڑوں طرح کے حیلے ڈھونڈھتا تو اسکے ذکر چاکر تک اسکی اس حرکت سے متعجب ہوتے، اور وہ ان کے تعجب کو جان جاتا، اُسوقت اُسکا دل اُسکو ملامت کرتا، وہ خود کو "ہندوستان پرست" نہ پاتا۔ دل میں اگر ہندوستان کی محبت تھی تو وہ محض اس طرح کی جیسی زید وعمرو کے دل میں ہوا کرتی ہے، وہ گرم جوشی، وہ تندہی، وہ استقلال اور وہ ایثار اب اگر ڈاکٹر کے قومی کاموں میں آپ ڈھونڈھیں تو نہ ملے گا۔ اُدھر فریق ثانی نے بھی "تبادلہ محبت" میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ پہلے تو ڈاکٹر مس روز اسکے مکان ہی پر جایا کرتا لیکن بعد کو اتفاقاً ———

اگر اسکو اتفاق کہا جاسکے ۔۔۔ اس سے اور روزا سے شہر کے مشہور پبلک باغوں میں، پارکوں اور تھیٹر یا بائسکوپ کے تماشوں میں ملاقات ہو جاتی۔

مس روزا زیادہ غور سے اخبار دیکھنے کی تو عادی تھی نہیں، البتہ جب اُس نے سنا کہ اُس کا چاہنے والا ۔۔۔ کیونکہ فریقین میں اب اظہارِ الفت ہو چکا تھا ۔۔۔ دنیائے ہند کا ایک درخشاں ستارہ ہے تو مس روزا کو "ہندوستان پرست" کی یہ فضول تعریفیں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ ہندوستان اگر مفلس ہے، ہوا کرے ہم تو مفلس نہیں ؛ ہندوستان اگر یورو کریسی کے ہاتھوں پامال ہو رہا ہے : ضرور ہونا چاہیے کیونکہ حاکم و محکوم کے ہمیشہ سے یہی تعلقات رہے ہیں ؛ ہندوستان کو اگر نو آبادیوں کی آزادی نہیں ملتی : واقعی نہ ملنا چاہیے کیونکہ عیسائی آبادی محض چند لاکھ ہے ! یہ اور اسی قسم کی باتیں روزا اپنی محدود معلومات کی بنا پر اپنے دل سے کرتی لیکن ابھی اسکی جرأت ڈاکٹر سے کچھ کہنے کی نہ پڑی تھی لیکن تا بہ کے؟ ایک دن آخر ڈاکٹر سے یوں گفتگو ہوئی :۔

"ڈیر حسن! آج آپ وقت مقررہ کے بعد آئے" مس روزا نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہا۔

"پیاری روزا، معاف کرنا میں کچھ ایسے جھگڑے میں پڑ گیا کہ دیر ہو گئی۔ ہزار جان بچائی لیکن دیر ہو ہی گئی" حسن نے لاپرواہی سے جواب دیا

روزا نے طنزاً کہا "کوئی جلسہ ولسہ ہوگا؟" حسن نے دھیمی آواز سے اقرار کیا۔ "لیکن" حسن کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ روزا بول اُٹھی "جلسوں کے فضول جھگڑوں میں کیوں سر کھپاتے ہو، سرکار کو ناراض کرنے سے حاصل، ہندوستان کے نیم وحشی باشندوں کے لیے حقوق مانگنا یہ محض اُن چند گندم نما جو فروشوں کے لیے رہنے دو جو ذاتی نفع کے لیے یہ سب کر رہے ہیں"

حسن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "ہاں اب تو یہ سب فضول ہی سا نظر آتا ہے"۔ اسکے بعد ایک لمبی بحث دونوں کے درمیان میں رہی جس کا اس جگہ درج کرنا فضول ہے۔ اس مضمون پر روزا سے گفتگو کرنے میں ہمارا ڈاکٹر ۔۔۔ کیونکہ "ہندوستان پرست" اسکو اب کہنا گویا منہ چڑھانا ہے ۔۔۔ کنائیاں کاٹتا لیکن آج یہ بحث چھڑ گئی اور وہ روزا کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اُسکے دلائل سے نہیں، بلکہ اُسکے حکم سے ۔۔۔ اگر حکم کا لفظ ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا اس سے پہلے وہ ان واقعات سے ناواقف تھا؟ وہ واقف ضرور تھا لیکن (ہندوستان سے) انکارِ محبت کے بعد مجرم دل

بہانے ڈھونڈھ رہا تھا، ورنہ بہانہ اُسکے دل کو بہلانے کو بہت کافی تھا۔

(۶)

حسن کی زندگی کا یہ انقلاب ایسا ویسا تغیر نہ تھا کہ بلا شہرت حاصل کیے دب جاتا ——— نیشنلسٹ اخبارات خاموش ہیں، اسکے دوست احباب اسکی اس حالت پر انگشت بدنداں، بعض اعتدال پسند اخبارات "حسن کی ہندوستان پرستی" اور "حسن اور ہندوستان پرستی" کے عنوانوں سے مضامین لکھ چکے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جو گرجتے زیادہ ہیں وہ برستے بالکل نہیں۔ بعض جماعتِ جی حضور کے لوگ جن کا کام ہر مفید تجویز کا مضحکہ اُڑانا اور خوشامد کے لیے اُنکی حاکمانِ قضا و قدر کے دربار میں بُرائی کرنا ہے حسن کی روش کا خوب خوب مذاق اُڑاتے ہیں، کرسی نشینانِ عدالت کی جماعت میں بھی اس عجیب و غریب انقلاب پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ حسن کے دو ایک پُرانے دشمنوں نے ایک مختصر خوبصورت کتاب "مثنوی انقلابِ عشق" کے نام سے چھپوا دی ہے جس میں قانونی گرفت سے بچنے کو نام تبدیل کر کے کل واقعات نمک مرچ لگا کر خوب نظم کیے گئے ہیں۔ شہر کے ایک اخبار نے ایک بہت ہی معنی خیز کارٹون چھاپا ہے: کسی قدر بلندی پر "بھارت ماتا" کھڑی ہیں، خلافِ معمول انکے ہاتھ میں چراغ ہے۔ ایک شخص کئی میزوں پر کرسیاں رکھکر چراغ کے کچھ قریب پہونچ گیا ہے۔ ایک حسین مہ جبین اسکے ساتھ ہے۔ ایک ہاتھ سے وہ حسینہ اس شخص کو اُچکنے میں مدد دے رہی ہے اور دوسرے ہاتھ سے چپکے چپکے وہ اُس ریشمی فیتے کو کھول رہی ہے جو اس حسینہ کے دامن کو اس شخص کے دامن سے وابستہ کیے ہوے ہے۔ نوجوان کسی طرح نہ گُل ہونے والے چراغ کو گُل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چراغ کی لَو نوجوان کے پھونکنے سے ٹیڑھی ہو ہو جاتی ہے۔ "بھارت ماتا" کے چہرے سے نوجوان کی اس حرکت کو دیکھکر تعجب اور افسوس کے جذبات ظاہر ہو رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ کے رومال سے وہ آنسو پونچھ رہی ہے۔ نوجوان کی آنکھوں پر ایک نقاب پڑی ہے جس پر "عشق" لکھا ہے۔ اس کارٹون نے صرف اسی شہر میں کیا بلکہ دُور دُور ہلچل ڈالدی اور اب ہمارے ڈاکٹر کی شہرت کے چاند کو اچھا خاصہ گہن لگنے والا ہے۔

حسن اب تک ہر ایک بات کو ٹالتا رہا۔ اگر اعتدال پسند اخبار نویسوں نے اسپر مضامین لکھے تو وہ اسکی مخالف جماعت کے آرگن تھے۔ اگر مثنوی لکھی گئی تو یہ اُسکے دشمنوں کی کینہ پروری اور بغض و عناد کا نتیجہ تھی، اگر جماعتِ جی حضور کے لوگ اس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں تو یہ اُنکا کام ہی ہے، اور اگر کرسی نشینانِ

عدالت میں چہ میگوئیاں ہیں تو ہوا کریں! لیکن ؟ بس اس "لیکن" کے بعد اُسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ دل سے اس کارٹون کی بابت جواب کا طالب ہوتا، لیکن گنہگار، خود غرض، اور مجرم دل لاجواب تھا۔ "کارٹون بالکل صحیح ہے" خودبخود اور بلاارادہ اُسکے منہ سے نکل جاتا۔ لیکن دل خیالات کو دوسری جانب پلٹانے کی کوشش کرتا، کبھی "بھارت ماتا" کی تصویر ہی کو غلط بتلاتا، لیکن وہ اس واقعہ کی صداقت پر حرف نہیں لاسکتا جو کارٹون سے تعلق رکھتا ہے۔ کارٹون پر غور کرتے کرتے ایکبارگی اُسکی نظر کمرے میں لگی ہوئی بھارت ماتا کی تصویر پر جا پڑی۔ اور اس تصویر کا دیکھنا گویا ان تمام واقعات کو دوبارہ یاد کرنا تھا جب اس نے "بمبئی کانگرس" میں اس تصویر کو خاطرخواہ قیمت دیکر بڑے شوق سے خریدا تھا۔ چشم زدن میں بمبئی کانگرس کے پلیٹ فارم پر ہندو مسلمانوں کے اتحاد پر اپنی تقریر اور اپنے جوش وخروش کو یاد کرکے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور اسکے خیالات میں بہت ہی دردناک ہیجان پیدا ہوگیا۔

( ۷ )

جلد باز طبیعتوں کو اکثر بُرے بُرے نتائج سے سامنا ہوتا ہے۔ حَسن اپنے کمرے کی تصویر کو دیکھکر عجیب اُدھیڑبُن میں پڑگیا۔ دل پر ایک گھونسہ پڑا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آخر وہ اس طرح بڑبڑانے لگا:

"اے ہندوستان کی مقدس دیوی! میں نے تیری خدمت میں کوتاہی کی، میں گنہگار ہوں، میں مجرم ہوں، میں قابلِ سزا ہوں، لیکن اس ناہنجار دل کے باعث ——— میں نے تجھ سے پیمانِ محبت توڑا، اور دل دوسری جگہ لگایا، میں بالکل مجبور تھا۔ اہم جلسوں کی شرکت سے میں نے انکار کیا، اُس زبان کو جسکا منشاءِ تخلیق محض تیری ثنا وصفت تھا میں نے دوسرے غیر مناسب کام میں لگایا ——— اے مادرِ وطن! پاپائوں جو محض تیری راہ میں چلنے کے لیے بنے تھے میں نے دوسری راہ چلنے میں تھکائے ——— آہ! میری آنکھوں پر جو صرف تجھے اور تیرے مصیبت زدہ فرزندوں کو دیکھنے کے لیے پیدا ہوئی تھیں، پردے پڑگئے۔ میں نے ان سے تیرے سوا کسی اور کو دیکھا۔ میرے کانوں نے تیری بُرائی سنی اور میں خاموش رہا۔ اے کاش! قبل اسکے کہ میں ان حرکات کے لیے زندہ رہتا، دنیا سے رخصت ہوچکا ہوتا یا میں انسان کے بجائے پتھر ہی ہوتا، اور شاید کسی مصیبت زدہ، کسی بیوہ، کسی فاقوں سے مرنے والی، اور کسی حیا سے بھیک نہ مانگنے والی کے لیے کارآمد ثابت ہوتا۔ وہ میری سینہ کوبی کرتی، میں خوش ہوتا۔ وہ میری کاٹ چھانٹ کرتی میں اسی میں اپنے مقصدِ زندگی کو مضمر پاتا۔ لیکن میں زندہ ہوں اس حال میں کہ میں نے تیرے حکم سے

سرتابی کی، تیرے اشارے کو نہ سمجھا، تیرے خیالات کو فضول اور بے بنیاد تصور کیا ـــــ" اس طرح حسن اپنے دل سے باتیں کرتا رہا۔ اور اب وہ حقیقتاً خود کو مجرم اور گنہگار سمجھنے لگا۔ کسی سے منہ سامنے کرنا اُسکو مشکل ہوگیا، دوستوں سے ملنا جُلنا گیا، وہ اُس دربار ہی میں چار دن کا مل نہیں گیا۔

(۹)

حسن روزنا کے دربار میں روزانہ جاتا تھا، لیکن اب چار دن ہونے کو آتے ہیں کہ حسن نے مکان سے قدم ہی باہر نہیں نکالا۔ اور اگر روزا حسن کی غیر حاضری سے پریشان ہوئی تو بالکل حق بجانب تھا۔ پانچویں دن ۵ بجے شام کو حسن کو اطلاع دی گئی کہ میم صاحب آئی ہیں۔ چار دن کے خیالات پریشان، جنھوں نے ایک منٹ کے لیے بھی حسن کو نہ چھوڑا تھا، میم صاحب کا نام سنتے ہی غائب ہوگئے اور بیخودانہ انداز سے اُٹھکر حسن نے میم صاحبہ کا خیر مقدم کیا، میم صاحب کسی قدر غمگین تھیں، چہرہ اُترا ہوا تھا۔ شاید حسن کے خیال میں یہ رنگ ہوا ہو۔ " خیر تو ہے! چار دن سے صورت نہ دکھائی، میں گھبرائی کہ کہیں کچھ طبیعت تو ناساز نہیں"۔ روزا نے حسن کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

" اچھا ہوں، زندہ ہوں" حسن کا حسرت آمیز جواب تھا۔

" آخر یہ اُکھڑے اُکھڑے جملے، اور اس چہرہ، غمگین صورت کے کیا معنی؟" روزا نے پھر پوچھا۔

حسن (کارٹون میم صاحب کی جانب بڑھاکر) " دیکھو!" میم صاحبہ کارٹون دیکھا اور بہت غصہ ہوئیں۔

میم صاحبہ (غصہ سے ہونٹھ چباکر)" یہ کسی بدمعاش کی حرکت ہے۔ پیارے حسن، تم ان باتوں کی فکر نہ کرو اور جواب جاہلاں باشد خموشی پر عمل کرو، خود ہی کہ سُن کر خاموش ہو رہیں گے۔ جن لوگوں کو دنیا میں ترقی کرنے کی امید کم ہوتی ہے وہ اس شاہراہ میں قدم رکھتے ہیں تو انکی شہرت ہو جاتی ہے، لوگ انکا نام عزت سے لیتے ہیں لیکن اس عزت کا اُس سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے"

حاکمان قضا و قدر اور فیصلہ کنندگانِ قسمت سے میل جول پیدا کرنے کی ترغیب دی گئی، حروف تہجی میں سے چند کے نام کے ساتھ اضافہ کیے جانے کا زریں خواب بیان کیا گیا، اور کہتے کہتے روزا نے حسن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی تقریر کے سلسلہ کو اس طرح جاری کیا " ہندوستان میں حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اہم اختیارات ہندوستانیوں کو کبھی نہ دیے جائیں۔ آئے دن کے ہندو مسلمانوں کے جھگڑے، برہمن اور غیر برہمن کے قضیے، عیسائیوں کی حق تلفی کی داستان کہن، اور نیچ قوموں کی پامالی کی دردناک کہانی ہندوستان

کی تاریخ میں ہمیشہ نئے بابوں کا اضافہ کرتی رہتی، انگلستان اور آئرلینڈ جیسے ترقی یافتہ ملک جب رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے جھگڑوں میں اب تک پڑے ہیں تو کیا، پیارے حسن، تم کو امید ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں، مختلف جماعتوں، اور مختلف صوبوں میں کبھی اتحاد ممکن ہے؟"

حسن روزا کی اس مدلل تقریر سے کافی طور سے متاثر ہو رہا ہے، اس لیے نہیں کہ روزا کے دلائل ناقابل تردید ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ اب واقعی ہندوستان سے محبت نہیں کرتا، اور اس لیے بھی نہیں کہ معشوقانِ فرنگ کے دربار میں رسوخ حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لیے اور محض اس لیے کہ وہ الفاظ ایک حسن و نزاکت کی دیوی، خوبصورتی کی جیتی تصویر، تقویٰ شکن، دین و ایمان لینے والی روزا کے منہ سے نکل رہے تھے اور جادو تھے، افسوں تھے، منتر تھے، نہیں معلوم کیا تھے!

(۹)

محبت کی راہیں بھی کیسی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حسن اب بھی ہندوستان کی محبت سے لبریز دل پہلو میں رکھتا ہے، لیکن یہ حضرتِ عشق کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ وہ روزا کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے۔ ہم کو بخوبی خیال ہے کہ ایک بار پراونشل کانفرنس کے اجلاس میں ریفارم اسکیم کی فروگذاشتوں پر بحث کرتے ہوئے ان تمام اعتراضات کے اور اسی قسم کے دوسرے اعتراضات کے جو آئے دن اینگلو انڈین اخبارات کیا کرتے ہیں اور جنکو روزا اسوقت دوہرا رہی تھی، اس نے کیسی فصیح و بلیغ تقریر میں دنداں شکن جوابات دیے ہیں۔ اور اگر اس وقت کے خود روزا کے جذبات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ سمجھتی تھی کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور حسن کے لیے مفید بھی۔ اس نے حسن کو گمراہ کرنے کو نہ کوئی جال بچھایا تھا اور نہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد پیمانِ محبت توڑنے پر آمادہ ہے۔ کارٹون بنانے والے صاحب نے روزا کو جو "محبت کا ریشمی فیتہ" کھولتے ہوئے دکھایا وہ محض ان کا تخیل ہے۔ واقعی روزا بھی حسن سے اتنی ہی محبت رکھتی تھی جتنی کہ حسن اس سے۔

روزا نے اپنی تقریر ختم ہونے کے بعد محبت سے حسن کے گلے میں ہاتھ ڈال دیے اور کہہ اٹھی "کیوں حسن میں غلط کہتی ہوں؟" نہایت ہی شوق کی نگاہوں سے وہ جواب کی منتظر تھی، اسکے چہرے سے منت کے آثار ہویدا تھے، اسکے تبسم آمیز ہونٹ اس وقت کچھ عجیب انداز سے بے حرکت تھے، اسکا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا، اور وہ اس وقت معمول سے دوچار حصے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی!

حسن پر جادو چل گیا، خود غرضی ایثار پر، ذاتی منفعت دوسروں کی بے لوث فائدہ رسانی پر۔ ایک حسین کی محبت ملک کی محبت پر اور ایک واحد ہستی کے حسن کا منتر "پیارے وطن" کے عشق کے عفریت پر غالب آگیا۔ حسن پہلے چند سکنڈ کیا بلکہ دو ایک منٹ محو حیرت رہا، لیکن روزا کی معنی خیز نگاہیں نہ معلوم دل سے کیا کیا کہ جنکی تعمیل حسن کی مہر سکوت ٹوٹی اور وہ اس طرح گویا ہوا:

"پیاری روزا! تیری خوشنودی کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، ہندوستان کی محبت کا نام نہ لونگا اور اگر تیری رضامندی اور دلجوئی کی خاطر مجھ کو اپنے بہترین اصول زندگی توڑنے پڑیں تو میں اسکے لیے تیار رہا۔ اے کاش میں طوق غلامی پہن لیتا، مجھ کو مالکان قضا و قدر کے حضور میں رسوخ حاصل ہوجاتا میں ـــــ الدین کی طرح بدنام، اور ڈاکٹر نائر کی طرح ہندوستان کا دشمن کہلاتا، لیکن تو، جسکے بے دل بےچین ہے، جسکے لیے روح تڑپتی ہے، جسکے لیے چشم نمناک اشکبار ہے، جسکا خیال نہایت ہی عزیز خیال ہے، آہ! کاش تو میری ہوجاتی!"

ہمارا حسن روزا کے سامنے نظر نیچی کیے اس ادب سے جوش و خروش کے ساتھ تقریر کر رہا ہے کہ گویا وہ آفتاب یا ماہتاب کی پرستش کر رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی محبت سے انکار کیا، اس نے ـــــ الدین یا ڈاکٹر نائر کا ہم جلیس ہونا منظور کیا، اس نے طوق غلامی پہننے پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ لیکن دل کے اندر ہی اندر کوئی اسکو لعنت ملامت کر رہا تھا، ایک نامعلوم قوت اسکی زبان روکے لیتی، اور جس وقت اُسنے یہ سب کہکر اور ہندوستان کی محبت کو لات مار کر حصولِ روزا کی خواہش ظاہر کی، اُسکو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ تمام شُہَداءِ آزادی و حریت، جنھوں نے آزادی و حریت کے لیے اور پامال اقوام کی مدد کی خاطر اپنی جانیں کھپائیں، جن کی تصانیف کہ کتبِ آسمانی کی سی عزت اُس نے دے رکھی تھی اور جنکو وہ مصیبت زدوں کا مددگار، فلاکت زدوں کا ہمدرد تصور کرتا تھا، سب کے سب کھڑے ہیں اور اسکے کلام پر نفریں کر رہے ہیں۔ اس کو ہندوستان کے اُنیسویں صدی کے بڑے بڑے لیڈر ـــــ دادا بھائی، فیروز شاہ، گوکھلے، بدرالدین طیب جی ـــــ سامنے کھڑے نظر آئے۔ گویا وہ پیمانِ محبت کی شکستگی کے شاہد ہونے کو آئے ہیں تاکہ روزِ جزا اسکا دامن یہ لوگ ہاتھ میں لیکر فریادی ہوں!

یہ سب کچھ چند سکنڈ میں حسن کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ حسن چونکا، وہ بیدار ہوا، روزا سے جو خود بھی اسوقت ایک محویت کے عالم میں تھی، الگ جا بیٹھا اور اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس طرح

سے کہنے لگا۔

"لیکن نہیں! میں غلطی پر ہوں، میں ـــــ الدین اور ڈاکٹر نارمن بننے کو تیار ہوں؟ میں طوقِ غلامی گردن میں پہننے کو راضی ہوں؟ میں ہندوستان کی محبت کا منکر ہوں؟ صرف خود غرضی، صرف ذاتی منفعت، صرف حظِ نفس، اور صرف لذاتِ زندگی کی خاطر! ایسا نہیں ہو سکتا۔ افسوس، قبل اسکے کہ میں مادرِ وطن کی عزت اُسکی حرمت، اُسکی آبرو، اُسکی خودداری کو ذاتی نفع کی بنا پر لات ماروں، قبل اسکے کہ میں ڈاکٹر نارمن اور ـــــ الدین بنکر اپنے ہم وطنوں کو نقصان پہونچاؤں، اور قبل اسکے کہ میں یتیم بچوں اور بیکس بیواؤں کو آٹھ آٹھ آنسو رُلاؤں، میں انسان سے حیوان ہو جاؤں۔ غریب ہندوستانی، میرے بھائی، میرے ہم وطن، مجھ سے فائدہ اُٹھاویں اور اس وقت میں خادمانِ ہند کی جماعت میں سرخرو ہو جاؤں! پیاری روزا! تم بھی آخر ہندوستانی ہو، مادرِ وطن کی محبت کچھ نہ کچھ تمھارے دل میں بھی ہونی چاہیے، ہندوستان کے فلاکت زدہ باشندوں پر تم کو بھی کبھی ترس ضرور آتا ہوگا، اور مصیبت زدہ ہندوستانیوں کی ہمدردی کو تمھارے دل نے کبھی نہ کبھی آمادگی ضرور ظاہر کی ہوگی!

مجھ کو اس وقت معاف کرو: میں نے تم سے عہد توڑا، لیکن آہ! تم سے پہلے میں کسی اور سے عہد کر چکا تھا ـــــ میرا دل کسی دوسرے کے لیے مخصوص تھا، میری ہستی ایک بالاتر مقصدِ زندگی کے لیے پیدا ہوئی تھی، میری خدمات ایک دوسرے ہی کام کے لیے وقف تھیں۔ میں مجرم ہوں، میں گنہگار ہوں، میں خطاوار ہوں، مجھ کو جو چاہو سزا دو لیکن پیاری روزا! ہندوستان، دو پیارے وطن کی خدمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ تم اگر چاہو تو ہندوستانی بنکر مجھ کو قبول کرو۔!" یہ کہکر حسن خاموش ہو گیا، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ کسی ناسمجھ بچے کی طرح بیتاب ہوکر رونے لگا۔ ایک حسرت بھری نظر سے جس میں استقلال کی خوفناک جھلک صاف موجود تھی۔ روزا کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظر نیچی کر لی گو وہ روزا کی جادوگری سے اب بھی خوف زدہ تھا لیکن اسکا وار خالی نہیں گیا، روزا ایک بیخودانہ انداز سے اُٹھی، جذبات کا جوش اور خیالات کا ہیجان اُسکی زبان کو بیقابو کیے ہوئے تھا۔ تاہم اُس نے حسن کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "پیارے حسن! تمھاری خاطر مجھے سب منظور، میں آج سے ہندوستانی ہوتی ہوں!"

---

(۱۰)

بعض لوگ ممکن ہے کہ سوال کریں کہ کیا روز اسلمان ہوگئی؟ لیکن اسکا جواب ہمارے قصہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ عیسائی رہی ہو یا مسلمان ہوگئی ہو۔ لیکن اب وہ حقیقتاً ہندوستانی ہے، وہ کانگرس کے جلسوں میں ایسی عقیدت اور ایسے خلوص سے جاتی ہے جیسے کوئی کسی مقدس جگہ جاتا ہے۔ وہ ہمارے "ہندوستان پرست"۔۔۔ کیونکہ اب ہم اُسکو "ہندوستان پرست" کہہ سکتے ہیں۔۔۔ کے ساتھ قومی جلسوں میں جاتی اور اُن میں حصہ لیتی، اُس نے عیسائی عورتوں میں حب وطن پیدا کرنے کے طریقے سوچے اور اُمپر عملدرآمد شروع کیا۔ اُسکا خیال تھا کہ ہم خواہ ہندو ہوں، یا مسلمان، عیسائی ہوں یا سکھ، لیکن ہیں ہندوستانی ہیں

روز اکے اس عقیدہ کے بعد سے دونوں کی زندگی میں حیرت خیز انقلاب پیدا ہوگیا۔ میاں بیوی نے مل کر "ہندوستان کی خدمت" اپنا مقصد زندگی قرار دیا۔ ہمارا "ہندوستان پرست" پھر اپنے رنگ میں رنگ گیا۔ اور درمیان کے اس وقفہ کے بعد اور زیادہ کر دفرت وہ میدان عمل میں قدم زن نظر آتا ہے۔ روز انے عام طور سے ملک کی خدمت میں جو حصہ دیا وہ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں اور خصوصاً عیسائی دنیا میں، (جنکے نوّے فی صدی سے زیادہ افراد ہندوستان کے سیاسیات میں اول تو کچھ دلچسپی نہیں لیتے اور لیتے ہیں ہندوستانیوں کے مطالبات کے خلاف) اس نے ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ اپنے شہر کے عیسائیوں کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ اُنکی زیادہ تعداد اسکی ہم خیال ہوگئی اور اپنے کو بجائے یورپین سمجھنے کے ہندوستانی سمجھنے لگی

اس طرح ہمارے "ہندوستان پرست" اور اسکی بیوی روز انے مل کر زندگی کا بقیہ حصہ ملک اور اہل ملک کی خدمت میں بلاتخصیص مذہب وملت صرف کر دیا!

بندے ماترم "می" آسیونی

## رباعیات شہرت

تہذیب کے اطوار پہ منظور ہوئے
کیا لطف سوسائٹی سے مسرور ہوئے
آزاد ہوئے وضع و خیالات میں ہم
پابندی مذہب کے خلل دور ہوئے

ہر علم کی تعلیم بھی تفہیم بھی ہے
ورزش کے سب اسباب بھی ہیں ٹیم بھی ہے
تہذیب کی تقلید میں کوشش ہے بہت
اخلاق محمدؐ کی تسلیم بھی ہے

# انجمن ترقی اُردو کو چند مشورے

اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا کہ مولوی عبد الحق صاحب نے انجمن ترقی اُردو کے بیجان قالب میں ایک نئی روح پھونک دی ہے، سخت ظلم ہوگا۔ ان کے عہد سے پیشتر انجمن کی وقعت تعلیمی کانفرنس کے ایک غیر دلچسپ ضمیمے سے زیادہ نہ تھی۔ کانفرنس نے جو سالانہ رقم مقرر کردی تھی اور جو کبھی وصول نہ ہوئی اُسکا واحد ذریعۂ آمدنی تھی۔ اراکین کی تعداد ایسی ہی مختصر تھی کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ اسباب کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں، لیکن ملک کو اس سے قطعی دلچسپی نہ تھی اور بہت ہی کم لوگ ایسے تھے جو اسکے وجود سے بھی باخبر ہوں۔ دو چار قابل قدر کتابیں ضرور شایع ہوئیں لیکن جہاں تک میرا ذاتی علم ہے یہ کتابیں ڈیوٹی بک ڈپو علی گڈھ کالج کے سرمائے سے شایع ہوئیں انجمن کی سپند البتہ تھی۔ ادھر مولوی صاحب کے سپرد یہ انجمن کی گئی اور اُدھر انجمن نے مدتوں کی گہری نیند کے بعد آنکھ کھولی، انکی مستعدانہ کوششوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ حیدرآباد و بھوپال سے مستقل سالانہ امداد مقرر ہوگئی اور اراکین کی تعداد میں بھی روز افزوں اضافہ شروع ہوگیا، گو اس میں جیسی کامیابی چاہیے ویسی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ چار سال کی مسلسل کوششوں کے بعد تعداد صرف ۲۲۲ تک پہونچی ہے۔ بہرحال مولوی صاحب نے اب انجمن کو اس قابل بنادیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو۔ اور ملک کی دلچسپی بھی اسکے ساتھ یوماً فیوماً ترقی پر ہے۔ اس کا بین ثبوت اس سے بڑھ کر نہیں مل سکتا کہ اب اکثر انجمن اور اُسکے کاموں پر اخبارات و رسائل میں تنقیدیں شایع ہوا کرتی ہیں۔ اور اگر عیب چیں موجود ہیں تو داد دینے والے بھی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔

لائق سکرٹری کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ انکی خدمت میں کچھ دوستانہ گذارش انجمن کے آیندہ پروگرام کی نسبت کروں۔ اور چونکہ ماضی ہمیشہ مستقبل پر اثر ڈالتا ہے کچھ گذشتہ فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کی طرف بھی اُنکی توجہ مبذول کروں۔

(۱) انجمن کی مطبوعات عموماً بہت غلط چھپی ہیں۔ حسن ظاہری کا تو شاذ و نادر ہی خیال رکھا گیا ہے

خراب لکھائی، چھپائی، اور ایک ہی کتاب میں متعدد قسم کے کاغذ لگانا غالباً انجمن کی نظر میں عیوب میں داخل نہیں ۔ مثال کے لیے ایک تازہ کتاب مشاہیر یونان و روما کو لیجیے ۔ اسکے ابتدائی اوراق اچھے کاغذ کے ہیں لیکن بقیہ اوراق اُس سے ادنے درجے کے کاغذ کے ہیں ۔ ابتدائی صفحات میں سطریں بھی کم ہیں، لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے، لیکن آگے چل کر سطروں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے اور چھپائی بھی ویسی صاف نہیں رہی ۔ دریاے لطافت، علم الارض وغیرہ کا بھی یہی حال ہے ۔ میں یہ اعتراف کرنے کے لیے تیار ہوں کہ ہر کتاب اس اہتمام کی مستحق نہیں جو دار المصنفین نے سیرۃ نبوی کے چھپوانے میں کیا ہے، لیکن اس قسم کے عیوب سے تو ہر کتاب کو بری رہنا چاہیے۔ میری رائے میں انجمن کو چاہیے کہ وہ ایک اوسط معیار کاغذ، لکھائی، چھپائی، تقطیع، جلد وغیرہ کے متعلق قائم کرلے اور انجمن کی کتابیں عموماً اُسی کے مطابق شایع کی جائیں ۔ اسکے لیے انجمن کو خاص مطبع جاری کرنے کی ضرورت ہے ۔ مالی نقصان کا احتمال بہت کم ہے ۔ چونکہ انجمن خود ایک ماہانہ رسالہ بھی نکالنے کا ارادہ رکھتی ہے اور سال بھر تک مطبع کے لیے کافی کام اُسکے پاس رہے گا۔ دوسرے مطابع بھی انجمن کی کتابیں بے نفع کے تو چھاپتے نہیں ۔

(۲) بعض مضامین ایسے ہیں جن میں تجربہ حاصل کرنا موجودہ صورت حالات میں ہندوستانیوں کے لیے گویا ناممکن ہے ۔ ایسے مضامین پر اگر عمدہ کتاب درکار ہو تو معمولی ہندوستانی مولف سے کتاب لکھوانے کے بجاے کسی مستند انگریزی تصنیف کا ترجمہ کرانا مناسب ہے ۔ انجمن نے "تاریخ یونان قدیم" تالیف کرانے میں بڑی غلطی کی ہے ۔ اسکے متعلق تمام مواد یونانی میں ہے جس سے ہندوستانی یکسر ناآشنا ہیں، اور انگریز براہِ راست مستفید ہوتے ہیں ۔ انگریزوں نے اس مضمون پر بڑی کد و کاوش سے کتابیں لکھی ہیں جن کا ترجمہ بآسانی ممکن تھا ۔

(۳) بعض کتابیں ایسی ہیں جو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوسکتیں، اور اگر ہوتی بھی ہیں تو اُن کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے کیونکہ ترجمہ میں زور بیان قائم نہیں رہ سکتا ۔ ایسی کتابیں ترجمے کے لیے ایسے لوگوں کے سپرد ہونی چاہییں جو اُردو پر قدرت رکھتے ہیں اور خود بھی انشاپرداز ہیں تاکہ حتی المقدور زور بیان باقی رہے ۔ پلوٹارک کی کتاب ہے تو سیر میں، اور اس میں محض واقعات ہی واقعات مندرج ہیں ۔ لیکن جذباتِ عالیہ کو برانگیختہ کرنا جو اسکا مقصد اصلی ہے وہ بجز زورِ بیان

پورا نہیں ہو سکتا۔ اُردو ترجمہ مجھے افسوس ہے کہ سب کچھ ہے لیکن زوردار نہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی یہ تعریف کہ " اُردو ترجمہ بلحاظ طرزِ بیان، سلاست، و اظہارِ مطالب انگریزی ترجمہ پر فوقیت رکھتا ہے" اس صورت میں کہ اُردو میں خود انگریزی سے ترجمہ ہوا ہے اور اصل یونانی تک ہندوستانی مترجم کی رسائی نہیں، بجو مدح نہیں تو اور کیا ہے؟

(۴) انتخابِ کلام میر کی ضرورت نہ تھی کیونکہ نواب عماد الملک سے صاحبِ ذوق کا انتخاب موجود ہے۔ اسکے علاوہ بھی اگر دیکھا جائے تو انتخاب میں کافی دقتِ نظر سے کام نہیں لیا گیا ہے بھرتی کے اشعار داخل ہوگئے ہیں لیکن وہ اشعار جو میر کے بہتر نشتروں میں شمار ہو سکتے ہیں رہ گئے ہیں۔ اُردو کی ایک مفید تر خدمت ہوتی اگر انتخاب کے بدلے پورا کلیات صحت کے ساتھ شایع کیا جاتا۔ بازاری نسخے بالکل غلط اور نہایت خراب چھپے ہوئے ہیں۔

(۵) دریاے لطافت گو آسان فارسی میں ہے لیکن اُردو ترجمہ اسکے دائرۂ فیض رسانی کو وسیع تر کر دیتا۔ خاص خاص طبقوں کی گفتگو جو اس کتاب میں انشانے نقل کی ہے اسکی تشریح فارسی میں ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ فارسی تشریحیں حذف کر دی جاتیں اور عام بول چال میں ان گفتگوؤں کا ترجمہ درج کر دیا جاتا۔ اس سے نہ صرف حجم کم ہوتا بلکہ کتاب کے سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی

(۶) ۱۹۱۶ء میں انجمن نے چار کتابیں شایع کی تھیں لیکن اسپر سکرٹری نے مطبوعات کی کمی تعداد کا عذر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ " اگرچہ اس سال کتابوں کی تعداد کم ہے لیکن انجمن نے آیندہ کے لیے کتابوں کے تیار کرانے میں زیادہ کوشش کی ہے"۔ اور اسکے بعد اُن تیرہ ۱۳ کتابوں کا تذکرہ کیا تھا جو ۱۹۱۷ء میں انجمن شایع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ۱۹۱۸ء کی رپورٹ میں اُن میں سے کُل چار کتابوں کا ذکر ہے۔ اور اس میں سے بھی دو اس وقت تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اور دو اُس وقت شایع ہوئیں جب ۱۹۱۹ء کے چھ مہینے گذر چکے تھے۔ اور ۱۹۱۸ء وہ سال ہے جس میں انجمن کی آمدنی ہر سال سے زیادہ رہی ہے۔ اگر انجمن کی " زیادہ کوشش" کا نتیجہ یہی ہے تو کم کوشش ہی پہ لوگ قناعت کر سکتے ہیں۔

(۷) اصلاحِ اُردو، اور ترویجِ اُردو بھی اس انجمن کے فرائض میں داخل ہیں۔ لیکن چونکہ انجمن کی تمام تر توجہ اشاعتِ کتب کی طرف مائل رہی، وہ ان فرائض کو اب تک بالکل

ادا نہ کر سکی۔ اس سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہے کہ انجمن کے آیندہ پروگرام میں اس کام کا کوئی تذکرہ نہیں اور یہ مجھے گذشتہ سے مستقبل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور اب میں انجمن کے نئے پروگرام کی نسبت کچھ کہوں گا۔ اسکے مطالعہ کے بعد مجھ پر جو اثر ہوا وہ یہ ہے کہ انجمن کے ارباب حل و عقد نے اس بات کا امتیاز نہیں کیا ہے کہ اُردو کی کون سی ضرورتیں اہم ترین ہیں اور کون کام مقدم ہونا چاہیے اور کون موخر۔ کس کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے اور کون سر دست ملتوی کیا جا سکتا ہے۔

(۸) ترویج و استحفاظِ اُردو جو غالبًا اُردو کا سب سے مقدم اور اہم کام ہے۔ اور جو انجمن کے مقاصد میں داخل ہے، نئے پروگرام میں اس قابل بھی نہیں سمجھا گیا کہ سرسری الفاظ میں بھی اسکا تذکرہ کیا جائے۔ دوسری زبانوں کے حامی رات دن کوشاں ہیں کہ اُردو کے حلقۂ اثر کو اپنے قبضے میں لے آئیں۔ لیکن ہماری انجمن شاید مہاتما گاندھی کی مقلد ہے کہ مقاومتِ خاموش پر عامل ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس وقت خاموشی سے کام لیا گیا تو اُردو کو عام ملکی زبان بنانے کا موقع ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائیگا اس کام کے لیے ہم لوگوں نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ یہ محض اُردو کی ذاتی خوبیاں ہیں جو اسکو اسقدر ہر دلعزیز بنائے ہوے ہیں۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر لکچروں کا انتظام کرنا چاہیے مختلف زبان کے اخبارات میں مضامین شایع کرنے چاہییں۔ اور کسی مرکزی مقام پر سالانہ جلسہ پابندی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ لکھنؤ کانفرنس مفید چیز تھی، اور کلکتہ میں بھی اسکا انتظام چنداں دشوار نہ ہوتا لیکن وہ کون سی وجہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس اس قسم کی پہلی اور آخری کانفرنس ثابت ہوئی؟ کیا سکرٹری صاحب اسپر روشنی ڈالیں گے؟

(۹) اصلاح اُردو کا کام بھی پس پشت ڈال دیا گیا ہے؛ حالانکہ جیسی ادبی طوائف الملوکی آج کل پھیلی ہے، اُسکے لحاظ سے یہ مسئلہ یقینًا محتاجِ التفات ہے۔ اُردو کی درسی کتابوں کی غلطیوں کے متعلق مختلف یونیورسٹیوں اور ٹکسٹ بک کمیٹیوں کو ضرور لکھنا چاہیے اور اُن پر اثر ڈالنا چاہیے کہ وہ غلط اُردو کو رواج دینے کے جرم سے بچیں۔ اصلاحِ اُردو کے لیے انجمن کو خاص رسالہ نکالنا چاہیے۔ لیکن نہ جانے سکرٹری صاحب کو اتنا تامل و تذبذب کیوں ہے۔ اگر جنگ کے زمانے میں معارف نکل سکا اور اس شان کے ساتھ تو انجمن بھی جنگ کا عذر پیش نہیں کر سکتی۔ رسالہ اگر اچھا نکلا تو قدر دانوں کی اب بھی کمی نہیں۔

(۱۰) ترویج و استحفاظ اردو کے بعد میرے خیال میں سب سے زیادہ فوری توجہ کا محتاج یہ کام ہے کہ اردو کی قدیم کتابیں (نظم و نثر) شایع کی جائیں۔ گو انجمن نے دریائے لطافت شائع کردی ہے اور نکات الشعرا کی اشاعت کا خیال کر رہی ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کام کی اہمیت کا کافی احساس انجمن کو نہیں۔ میں تو ان کتابوں کی اشاعت علم و حکمت کی کتابوں کے ترجمہ سے بھی زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔ اس خیال سے نہیں کہ یہ کتابیں فی نفسہ اخلاق اور شائستگی پھیلانے میں مدد و معاون ہوں گی بلکہ اس خیال سے کہ یہ کتابیں آج دستیاب ہوتی ہیں اور کل نایاب ہو جائیں گی۔ اور ترجمہ کا کام ہر وقت ممکن ہے۔ ان کتابوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان سے زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے اور تاریخ اردو کی ترتیب میں ان سے بڑی مدد ملے گی۔ ان کتابوں کی اشاعت بلا لحاظ عمدگی مضامین کرنی چاہیے۔ ولی سے قبل یا اُسکے معاصرین کی کتابیں علی الخصوص قابل توجہ ہیں۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم نے دیوان عبداللہ قطب شاہ اور ابو الحسن تانا شاہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ولی کا دیوان بھی اب کمیاب ہے۔ میر حسن، مصحفی، قائم وغیرہ کے تذکرے بھی نکات الشعرا سے کم قابل قدر نہیں۔ اسی ضمن میں اور بہت سی کتابیں ہیں جو گو اتنی قدیم نہیں لیکن جن کی اشاعت ضروری ہے مصحفی، سودا، قائم، آبرو، حسرت، جرأت وغیرہ مشہور اور مستند اساتذۂ اردو کا مکمل کلام اس وقت تک طبع نہیں ہوا ہے۔ اگر انجمن نے خیال نہ کیا تو تھوڑے دنوں میں مفقود ہو جائے گا۔ اور یہ بہت بڑا ادبی گناہ ہوگا جسکی جوابدہ انجمن ہوگی۔

(۱۱) میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ انجمن یہ امتیاز نہیں کرتی کہ کون کام زیادہ مقدم ہے اور کون ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ اسکی مثال اس سے بڑھ کر نہیں مل سکتی کہ انجمن کا ارادہ علامہ ایڈورڈ براؤن کی "ادبی تاریخ ایران" کا ترجمہ شائع کرانے کا ہے۔ باوجودیکہ اردو میں سخندان فارس اور شعر العجم کی سی کتابیں موجود ہیں۔ کم از کم اسکی فوری ضرورت کو سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔ کیا یہی وقت، یہی ہمت، یہی روپیہ اردو زبان کی تاریخ کی ترتیب میں صرف کیا جائے تو انسب نہ ہوگا؟ آب حیات انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے لیکن تحقیق و تدقیق کا بہترین نمونہ نہیں۔ تحقیق و تفحص کے لیے اردو میں ابھی بہت وسیع میدان باقی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام دشوار ہے، اسکے لیے صرف عربی فارسی کی واقفیت کافی نہیں بلکہ متعدد ہندوستانی زبانوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اسکے علاوہ اسکا مواد بھی منتشر ہے۔ اردو کی قدیم قلمی کتابیں کچھ ہندوستان

میں ادھر اُدھر طاق نسیاں پر رکھی ہوئی ہیں، کچھ انگلستان کے کتبخانوں میں ہیں۔ ان کتابوں کی فراہمی ضروری ہے۔ میری رائے میں اگر اُردو کے متعلق تحقیقات عالیہ (ریسرچ) کے لیے انجمن کی طرف سے لائق اشخاص کو وظائف دیے جائیں تو کام نکلنے کی امید ہوسکتی ہے۔ اگر انجمن کے ارباب حل و عقد جامعۂ عثمانیہ کو اس پر آمادہ کریں تو مالی دقتیں بھی حل ہو جائیں۔

(۱۲) سائنس و فلسفہ کی کتابوں کے متعلق اب تک انجمن کا یہ مسلک رہا ہے کہ ابتدائی کتابیں شایع ہوتی رہی ہیں مگر اب جبکہ جامعۂ عثمانیہ کا سررشتۂ ترجمہ و تالیف قائم ہے تو ابتدائی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کا کام انجمن کو اسکے سپرد کر دینا چاہیے اور خود سائنس و فلسفہ کی مستند کتابوں کا ترجمہ شایع کرنے پر کمر ہمت باندھنا چاہیے۔ ایک مشہور اہل قلم کی رائے درج کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا:-

"کوئی زبان اُس وقت تک مستقل الوجود نہیں کہی جاسکتی جب تک تمام مستند زبانوں کے کم از کم کلاسیکل لٹریچر کا اس میں بیشتر حصہ فراہم نہ ہو۔ ہمارے ہاں اگر خود بھی ارسطو، ڈیکارٹ، لاک، اور کینٹ پیدا ہو جائیں جب بھی اُردو اُس وقت تک یونانی، انگریزی، فرانسیسی، اور جرمن زبانوں سے بے نیاز نہیں شمار کی جاسکتی جبتک ان مصنّفین کے کارنامے ہماری زبان میں موجود نہ ہوں۔۔۔۔۔ اس لیے اگر اُردو کو کوئی مستقل بالذات زبان بنانا ہے تو اسکی اہم اور مقدم ترین خدمت یہ ہے کہ سب سے اوّل دوسری زبانوں کا کلاسیکل سرمایہ اس میں منتقل ہو جائے۔ جو لوگ کسی فن پر مجتہدانہ تصنیف کر سکتے ہیں اُن کا ذکر نہیں لیکن جن کی کائنات ادھر اُدھر سے نوچ کھسوٹ کے مطالب کو اُلٹ پھیر کر ایک نئی کتاب بنا دینا ہے وہ اگر اسکے بجائے اپنے مذاق کی کسی مستند اور کلاسیکل کتاب کا ترجمہ کرنے کی قدرت رکھتے ہوں تو ہمارے خیال میں بدرجہا زیادہ مفید خدمت ہوگی۔ خود اس فن کے مسائل تو وہی جائیں گے لیکن سب سے بڑا نفع یہ ہوگا کہ اُردو داں جماعت اس کتاب اور اسکے مصنّف سے واقف ہوسکے گا۔ اور اُسکے وجود کے لیے اجنبی زبان کی دست نگری اُٹھ جائیگی۔"

چونکہ دار المصنّفین کا بھی یہی مسلک ہے، اس لیے بہتر ہوگا اگر انجمن، سررشتۂ ترجمہ و تالیف، و دار المصنّفین تینوں اپنے اپنے فرائض مختص کرلیں۔ اور باہم اشتراک عمل کے ساتھ کام کریں۔

(۱۳) جامعۂ عثمانیہ کی بنا کے سبب سے اصطلاحات علمیہ کا کام نسبتہً آسان ہوگیا ہے، لیکن اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ حتی الوسع بڑے بڑے عربی الفاظ سے احتراز لازم ہے۔ اگر مناسب ہندی اور فارسی الفاظ مل سکیں تو اُن سے کام لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چونکہ ہم اُن کو بچپن سے سنتے

آسکتے ہیں اُنکی حقارت مناسب نہیں۔ گھر والوں کی اگر ہم ہی قدر نہ کریں گے تو غیر کیا اُنکی بات پوچھیں گے؟

(۱۴) انجمن کی مطبوعات پر عموماً یا اسلامی رنگ چڑھا ہوا ہے یا انگریزی۔ عہد جدید کی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو ہندوؤں کے علوم و فنون۔ اور قدیم فلسفہ و شاعری سے بحث کرتی ہو۔ موجودہ "کتاب الہند" کی اشاعت کا بھی زیادہ تر یہ خیال محرک معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دستار فخر کے لیے ایک نیا طرہ ہاتھ آئے۔ بہ استثنٰی مثالوں سے قطع نظر کرکے سنسکرت سے مسلمانوں کی بے اعتنائی مُسلّم ہے۔ حالانکہ ہندوؤں کا قدیم فلسفہ، اُنکی شاعری، اور اُنکا ڈراما آج بھی عالَم سے خراجِ تحسین وصول کررہا ہے۔ میکس مولر نے ساری زندگی ہندوؤں کے قدیم لٹریچر کے مطالعہ میں بسر کردی۔ مشہور جرمن شاعر گیٹے کالیداس کے "شکنتلا" پر سر دُھنتا تھا۔ حیف ہے کہ یورپ والے تو سنسکرت کے ساتھ اتنا التفات کریں اور مسلمان جن کا ہندوؤں سے چولی دامن کا ساتھ ہے یہ بے پروائی برتیں۔ اُردو میں بلاواسطہ سنسکرت سے بہت کم کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں اور اگر ہوئی بھی ہیں تو ادبی نقطۂ نظر سے ترجمے بالکل ناقص ہیں۔ میرے خیال میں اُردو کی بہت بڑی ضرورت کا ارتفاع ہو جائیگا اگر ہندوؤں کا قدیم فلسفہ اور اُن کی شاعری اردو میں منتقل ہو سکی۔ اُردو شاعری میں معانی رنگ کی بہت بڑی کمی ہے۔ یقین واثق ہے کہ سنسکرت شاعری کے مطالعہ کا اُردو شعرا پر زبردست اثر پڑے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اُردو کا دعوے مشترک زبان ہونے کا زیادہ زوردار ہو جائے گا۔

(۱۵) اُردو کی داغ بیل برج بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ بھاشا سے بے اعتنائی کرنا خودکشی میں داخل ہے۔ بھاشا کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ اُردو کے قدیم لٹریچر میں اُن کا شمار ہو سکتا ہے۔ اور اُن کا مطالعہ ہر شیدائے اُردو پر واجب ہے۔ تلسی داس، کبیرداس، سورداس وغیرہ کی تصانیف اگر اُردو رسم الخط میں ضروری نوٹس کے ساتھ شایع کی جائیں تو فائدہ سے خالی نہیں۔

(۱۶) یونان کا قدیم لٹریچر زندۂ جاوید ہے۔ اور یورپ باوجود ایں ہمہ ترقی یونان کی شاگردی کا دم بھرتا ہے اور ابھی تک یونانی لٹریچر سے بے نیاز نہیں۔ یونان کی رزمیہ نظم ایلیڈ اپنی آپ نظیر ہے۔ ڈراما نویسی میں سفوکلیس، یوری پائیڈیس، ارسٹوفانیس وغیرہم کی مثال نہیں مل سکتی۔ یونان کا فلسفہ تو ایسا ہے کہ اسکا مطالعہ ہر شخص کے لیے جو ادعائے شائستگی رکھتا ہے ناگزیر ہے۔ دُنیا کی تمام متمدن زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوگیا ہے لیکن اُردو ابھی تک محروم ہے۔ مسلمانوں نے ایک بار قبل بھی یونانی

لٹریچر سے خوشہ چینی کی تھی۔ لیکن ادبیات سے بے پروا رہے تھے اب موقع آگیا ہے کہ اسکی تلافی کی جائے۔

(۱۷) اُردو میں کوئی لغت ایسا نہیں جس میں الفاظ اور محاورات کے معانی کیساتھ ساتھ اُن کی تاریخ سے بھی بحث کی گئی ہو۔ کام کی دشواری میں شبہہ نہیں، لیکن خدا کا نام لیکر اسکی ابتدا ضرور کرنی چاہیے۔

(۱۸) ڈراما کا حصہ ہیئت اجتماعیہ کی حالت بگاڑنے یا سدھارنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اُردو میں ڈراما کی جو گت بنائی گئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اگر تہذیبِ ذوق انجمن کے مقاصد میں شامل ہے تو انجمن کو ڈراما کی حالت زار پر متوجہ ہونا چاہیے۔ سنسکرت اور یونانی لٹریچر سے اسکے عمدہ نمونے اہلِ ملک کے سامنے پیش کرنے چاہییں۔ موجودہ زمانہ میں انگریزی میں شیکسپیر اور فرانس میں مولیر بہت بڑے اُستادِ فن گذرے ہیں۔ انکی تصانیف کا ترجمہ بھی اگر عمدہ طور پر کیا جائے تو مذاقِ عام کی درستی میں مدد دے گا۔ انجمن کو اوریجنل ڈراما لکھنے کے لیے بھی شاعروں کو ہمت دلانا چاہیے اور انعامات مقرر کرنے چاہییں۔

(۱۹) ناول کی حالت ڈراما سے کچھ اچھی ہے۔ گو میں اعتراف کرتا ہوں کہ ڈراما کے خلاف اس میں ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔ اور قدیم تصانیف میں بھی بعض بعض قابلِ قدر ہیں۔ انگریزی سے جو ناول اُردو میں لیے گئے ہیں اُن میں ایک بھی ایسا نہیں جو مذاقِ سلیم برداشت کرسکے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ظفر علی خاں جیسے صاحبِ ذوق نے بھی ترجمہ کے لیے رینالڈس کے ناول کو چُنا۔ انجمن کو اس صنفِ سخن کے بھی عمدہ نمونے ڈکنس۔ تھیکرے، مس آسٹن، وکٹر ہیوگو وغیرہم کی تصانیف سے پیش کرنا چاہیے۔

(۲۰) تاریخ ہند کی ترتیب کا خیال عمدہ ہے۔ انگریز مصنفین نے مسلمانوں کے عہد کی جو تاریخیں لکھی ہیں اُن میں سیاسی اغراض بھی پوشیدہ ہیں۔ اور تاریخ نویسی میں جہاں یہ خیال آگیا مصنف بے تعصبی کے ساتھ نہ واقعات ہی کو بیان کرسکتا ہے اور نہ اُن پر بے لاگ رائے زنی ہی کرسکتا ہے۔ انجمن کو ترتیبِ تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ تاریخ ہند کا سارا مسالہ اُردو میں منتقل کیا جائے کہ غیر زبانوں کی دریوزہ گری کی ضرورت باقی نہ رہے۔

(۲۱) میں خوش ہوں کہ انجمن انگریزی کے علاوہ یورپ کی دوسری زبانوں سے بھی خوشہ چینی کرنا چاہتی ہے۔ اور سید راس مسعود صاحب فرانسیسی سے دو کتابیں ترجمہ کر رہے ہیں۔ بعض فرانسیسی

مستشرقین نے جن میں گارسن دی تاسی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ تذکرہ ہے، اُردو پر بھی توجہ کی ہے، اور اس کے متعلق تحقیق و تدقیق کی ہے۔ انکی کتابوں کا اگر اُردو میں ترجمہ کیا جائے، تو تاریخ اُردو کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہماری زبان کے متعلق علمائے یورپ کا کیا خیال ہے۔

ان صفحات میں میں نے اختصار کے ساتھ وہ راہ دکھلانے کی کوشش کی ہے جو میری رائے میں ترقیِ اُردو کی صحیح راہ ہے۔ اگر اس ضمن میں انجمن کی بعض کوتاہیوں کا بھی تذکرہ آگیا، تو اُسکی غرض انجمن کے کارناموں کی تنقیص نہیں۔ موجودہ سکرٹری کے متعلق جو میری رائے ہے اُسکو ابتدا ہی میں لکھ چکا ہوں۔

و۔ ق۔ ع۔ و

کس کام کے یہ نالے خاموش ذرا بیٹھے — گل پر نہ اثر ہو کچھ بلبل کا گلا بیٹھے
الفت میں کسی کی دل آخر یہ ہوا کیا ہے — ہم یاد کریں تجکو تو ہم کو بھلا بیٹھے
اسوقت ہے دل مضطر سنبھلے تو لیں اُس سے — آیا ہے اگر ناصح کہ دو کہ ذرا بیٹھے
ہم زندہ دلوں کو ہے ہستی و عدم یکساں — اس بزم سے جب اُٹھے اُس بزم میں جا بیٹھے
دھوپ اُسکی گلی میں تھی چلنے میں مزے آئے — دیوار کا سایہ تھا سایہ سے جدا بیٹھے
جو خواب میں دیکھا تھا پھر تجکو دکھا یارب — پہلو میں وہ بیٹھا تھا شوخی سے پھرا بیٹھے
ہر وقت یہی دُھن ہے دیدار کسی جا ہو — جسکو تری حسرت ہو وہ چین سے کیا بیٹھے
قیدیٔ قفس چھوٹے اب جوشِ خوشی دیکھو — اس شاخ پہ آ بیٹھے اُس شاخ پہ جا بیٹھے
بڑھتی ہی گئی رونق کوچہ کی ترے ظالم — دو مر کے اگر اُٹھے چار اہلِ وفا بیٹھے
جتنی ہو خوشی کم ہے وہ اور مرا پہلو — بیٹھے تو سہی آکر مانا کہ ذرا بیٹھے
بدبخت ہوں میں ایسا جیسا ہوں رہوں دُنیا — سایہ تو بھلا سایہ سر پر جو ہُما بیٹھے
اُمید وفا ہم تو رکھتے تھے بہت دن سے — یہ کیا کہ جفا سے بھی تم ہاتھ اُٹھا بیٹھے
بھولے وہ بنے چپکے بیٹھے ہیں سرِ محفل — کہتی ہے یہی چتون ہو جسکی قضا بیٹھے
جو بات کہی نازک ہونٹوں پہ ہنسی آئی — محفل میں حسینوں کی چپکے نہ قضا بیٹھے

شیخ محمد عالیجاہ، قضا۔

# تذکرہ

## مصنفہ مولانا ابوالکلام

اِس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے میں مولانا کے بعض اکابر خاندان کے حالات ہیں دوسرے حصے میں خود مولانا کے۔ پہلا حصہ جو تیار ہو تمام تر مولانا کا لکھا ہوا ہو اور زمانہ نظربندی کی ایک یادگار تصنیف ہو۔ کتاب میں جابجا کثرت کے ساتھ ضمنی مباحث و معارف آگئے ہیں جنکو مولانا نے خاص اپنے طرز میں لکھا ہو۔ کتاب کی ہر فصل بجاے خود ایک مستقل رسالہ ہو علی الخصوص دعوت و تبلیغ امت اور مقام امامت کی نسبت کئی فصلوں میں مشرح بحث کی گئی ہو۔

ضخامت تین سو صفحے ½ رائل سائز۔ درجہ خاص اور درجہ اوّل میں ہاف ٹون فوٹو۔

کتاب **البلاغ پریس** میں نہایت اعلیٰ اہتمام کے ساتھ چھپی ہو۔ مصارف طبع کا اس سے اندازہ کیا جائے کہ درجۂ خاص اور درجۂ اول میں کاغذ فی ریم عسہ/ سے مئہ تک کا اور درجۂ دوم میں مئہ/ فی ریم کا لگانا پڑا ہو۔

**قیمت** :- درجہ خاص (لائبریری ایڈیشن) جلد ہاف مراکو۔ سات روپیہ آٹھ آنے۔

درجہ اول مجلد پانچ روپیہ آٹھ آنہ۔ درجہ دوم مجلد چار روپیہ۔

ایک ہزار درخواستیں پہلے سے رجسٹرڈ ہو چکی ہیں تھوڑے سے نسخے اور بچیں گے۔ فرمایش میں جلدی کیجیے ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں مرحوم "الہلال" کیطرح لوگ اسکی بھی تلاش کرینگے اور نہ ملنے پر افسوس۔

**منیجر البلاغ پریس ۴۵ رپن لین کلکتہ**

نئی کتاب — ضروری کتاب

# مخبر حقیقت

## حق و باطل کا قطعی فیصلہ

حقیقی صراط المستقیم کی بتانے والی۔ ایمان کو مضبوط کرنے والی۔ اسلام کے فرقوں کو متحد کرنے والی۔ عیسائیوں کو مسلمان کرنے والی۔

## مضامین کتاب

۱ علاوہ دیگر کتب انبیا کے خاص حضرت عیسی کی انجیل سے رسالت آنحضرت صلعم کا ثبوت ۲ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت ۳ جناب سیدہ کی بزرگی اور عظمت اور مخصوص مصائب زندگی کا ثبوت ۴ پورے واقعہ کربلا کا ثبوت یعنی یزید کے فوجی افسروں کا امام حسین علیہ السلام سے زمین کربلا پر جنگ کرنا۔ امام حسینؑ کا ذبح کیا جانا۔ پھر یزید کے انھیں افسروں کا مکہ معظمہ کو ویران اور برباد کرنا اور حرم کعبہ کو جلانا اور یہ ثبوت کہ وفات آنحضرت صلعم سے تا مرگ یزید کن لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں میں قتل و فساد ہوا۔ مہدی آخر الزماں کی خوشخبری۔

کل ثبوت واضح اور محکم۔ حجت خدا ہی۔ منکر کے لیے سوائے انکار کے تردید کی قطعی گنجائش نہیں ہی۔ خدا پرستوں کو نیز اُن لوگوں کو جو خدا یا رسالت یا آل رسول کی عظمت کی بابت شک میں ہیں ضرور پڑھنا چاہیئے۔ روحانیت اور آخرت کا قوی احساس پیدا ہو جاتا ہی۔

کتاب کے ملنے کا پتہ: سید ممتاز حسین عفی عنہ وطن چڑھائی محمود نگر چوک لکھنؤ

## نوٹ

قیمت فی جلد ۱۲ غربا کے لیے ۸ مفلس تعلیم یافتہ حضرات کے لیے جو مسلمانوں کی شہادت پر مفت

سر ہنری طامس بکل کی لاجواب
**تاریخ تمدن** کتاب ہسٹری آف سولزیشن کا
ترجمہ۔ فلسفہ تاریخ کی یہ بہترین کتاب ہے
جسمین تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیے
گئے ہین جسطرح طبیعات وغیرہ علوم کے اصول
مدون ہوے ہیں۔ دو جلد قیمت عا

انگلستان کے
**تاریخ اخلاق یورپ** مشہور و معروف
علامہ دار عقلیت اڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی
لاجواب کتاب کا ترجمہ جسمین یونان و روما
اور دیگر قدیم اقوام کے مذاہب فلسفہ اور
اُن کے اخلاقی ثمرات کی
تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہے
قیمت جلد اول ے

**مشاہیر یونان و روما** حکیم پلوٹاک یونانی کی لاجواب کتاب
پلے ریلل لائوز کا ترجمہ جسمین یونان و
روما کے اولوالعزم مدبرین و رنامور شہنشاہوں کے
سوانحی حالات اور ان کے بیش بہا خیالات
درج کرکے از راہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا
تقابل کیا گیا ہو۔ انگریزی مترجم کو اس
کتاب کے ترجمہ کے صلہ مین ناٹٹ کا
لقب دیا گیا۔ جس سے کتاب کی قدر و قیمت
کا اندازہ ہونا چاہیے۔ مغرب کو عزت سے
بکال کر اوج کمال پر پہونچانے مین اس
لاجواب کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حب وطن
ایثار کامل بے نفسی جان نثاری اور
اولوالعزمی کی زندہ اور سچی تصویرین ان
اوراق مین صاف نظر آئینگی۔
قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ

اردو زبان مین یونان
**تاریخ یونان قدیم** کی سب سے پہلی جامع
و نافع تاریخ قیمت عیصر

ہندوؤن کا اصلی مذہب
**رہنمایان ہند** کیا ہی؟ اور اس مین
کیا کیا تبدیلیان ہوئی ہین؟ کرشن جی
سدارتھ، گوتم بدھ کی تعلیمات شنکر اچارج،
رامانج، رامانند، گورکھ ناتھ اور کبیر کی
تلقینات اور باوا جی سوداس تلسی داس
اور دیو کے حالات۔ قیمت۔ عیصر

عہد مغلیہ کے ہندو امرا
**امراے ہنود**
ذی نوزدا اکابر و مشاہیر
عہد داران امرا کے حالات قیمت عا

**ایکسو سے زائد مصنفین اردو کی مکمل تصانیف کی فہرست منگا کر دیکھئے**

**نپولین اعظم** اس نامور
فاتح اور
شہنشاہ کی
مکمل سوانح عمری
پانچ جلدون مین قیمت للعہ

اسٹینلی لین پول کی مشہور تاریخ
**مسلمانان اندلس** کا اردو ترجمہ قیمت عہ

علامہ ابوریحان بیرونی مصنف
**البیرونی** کتاب الہند کی سوانح عمری اور
ان کی تصانیف پر تبصرہ قیمت عیصر

عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ مین
**شباب لکھنؤ** لکھنؤ کی درباری حالت عیصر

یعنی اسلام کی ایک جلیل القدر
**فتح قسطنطنیہ** اور مہتم بالشان فتح کی
تاریخ مؤلفہ حاجی بدر الدین احمد بی اے عیصر

از شیخ محمد شوکت علی بی اے
**محاربات طرابلس** یعنی ہسٹری آف ینیٹ

نامہ نگار اخبار مانچسٹر گارڈین سابق
ممبر پارلیمنٹ کی لاجواب کتاب ود دی
ٹرکس ان طریپولی کا ترجمہ جسمین جنگ
طرابلس کے چشمدید حالات ترکی افواج کی
کیفیت خطۂ اسلامیہ طرابلس کے جغرافیائی
ملکی۔ قومی اور معاشرتی حالات ادیبانہ
و مورخانہ شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے
ہیں اور اسی وجہ سے کتاب جنگ کے
بعد بھی ایک مستقل تاریخی تصنیف کی حیثیت
سے پڑھی جانے کے لائق ہی۔ حجم ۲۵۰ صفحے
معہ تشریحی نقشون کے قیمت عیصر

بیت المقدس کی قربانگاہ پر
**محاربات صلیبی** جو عظیم الشان قربانیان
چڑھائی گئی ہیں اُن کے مفصل حالات قیمت عیصر

علوم طبیعہ کی ان تمام فنون
**علوم طبیعہ کی تاریخ** اور ایجادون کی تشریح
جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لیکر
انیسوین صدی تک وقتاً فوقتاً عمل میں
آتی رہی ہیں مسائل کی تحقیقات کے علاوہ
یہ بھی بتایا گیا ہو کہ قدیم و جدید حکمانے ان علمی
دریافتوں اور ایجادوں میں کیا کیا حصہ لیا
مضامین کی وضاحت کیلیے صدہا تصویرین دیگئی
ہیں قیمت ہر دو جلد عہ

اس مین مذہب کی ابتدا و ترقی کا
**تاریخ مذہب** حال اور نیز بڑے بڑے
مذاہب مثلاً بابلی اور اسوریہ مصر اور چین اور
دیگر ممالک و اقوام کے مذہب کی مختصر تاریخ
درج ہے۔ قیمت ۸ر

مصریون کے قدیم رسم و رواج طرز معاشرت
**تاریخ مصر** عادات وغیرہ کے مفصل حالات قیمت

رجسٹرڈ نمبر ل ۸۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# النّاظر

قیمت سالانہ ۵

قیمت ششماہی ۳

ایڈیٹر- ظفر الملک علوی

| | | |
|---|---|---|
| نمبر ۱۲۵ | ماہ نومبر ۱۹۱۹ء | جلد ۲۱ |


(فہرست مضامین)



الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

قیمت فی پرچہ ۵

قیمت فی پرچہ ۱۵

پرنٹر و پبلشر:- اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم


# الناظر

نمبر ۱۲۵ جلد ۲۱ — ماہ نومبر ۱۹۱۹ء


## ہندوؤں کا علم ادب

بنگال کے نامور فاضل سر رومیش چندر دت نے عرصہ ہوا ایک نہایت ہی قابل قدر کتاب لکھی تھی جس کا نام "دی سویلزیشن آف اینشینٹ انڈیا" ہو۔ کتاب کی خوبی کی ادنی دلیل یہ ہو کہ ہماری یونیورسٹی میں بی اے کے نصاب میں اس کو جگہ دی گئی۔ میرے عزیز کرم منشی ولایت احمد صاحب مرحوم نے اس قابل قدر کتاب کو اُردو میں ترجمہ کیا اور ۱۹۱۱ء میں ایک عالمانہ اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ کتاب کا ایک جز و بڑی تقطیع کے دو سو صفحات پر شایع کیا۔ منشی صاحب کا ارادہ تھا کہ بقیہ اجزا کی ایک جلد بعد کو شایع کرینگے لیکن اُن کی بیوقت وفات کے باعث دوسری جلد شایع نہ ہو سکی۔

منشی ولایت احمد مرحوم کا خاندان عرصہ سے ریاست جے پور میں سکونت پذیر ہو اور اس سبب سے وطن اور اعزاے وطن سے ان میں کے اکثر اصحاب یک گونہ بیگانہ ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ خاکسار کو اس وقت تک ان حالات کا علم نہیں ہوا۔ حال ہی میں ایک عزیز شفیق سے تمام حالات معلوم ہوئے تو میں نے اِس قیمتی کتاب کے کل نسخے بغرض اشاعت اپنے پاس منگوالیے ہیں اور انشاء اللہ بقیہ مسودات فراہم کرکے دوسری جلد کی اشاعت کا بھی انتظام کرسکوں گا۔

لائق مترجم کی قابلیت اور محنت کی پوری داد تو وہی اصحاب علم دے سکیں گے جو الناظر بک ایجنسی سے "قدیم ہندوستان کی تہذیب"[1] کا ایک نسخہ طلب فرما کر اس کے مطالعہ سے لذت اندوز ہوں گے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقدمۂ مترجم کے بعض بعض مقامات کی سیر کرادی جائے، تاکہ ارباب ذوق کو کتاب کی طرف اُسی قدر توجہ ہوسکے جس قدر کہ اُس کی جلد ثانی کی اشاعت کے لیے اِس وقت درکار ہے۔ و ہو ہذا۔

**نظم یا کاویہ** وہ شخص جو سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتا بمشکل ہی ہندوؤں کی نظم سے متعلق رائے قایم کرنے کی قابلیت رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خوش آیند اثر جو اس زبان کی نظم کے سننے سے دل پر طاری ہوتا ہے وہ نہ تو ترجمہ سے پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی اور طریقہ سے۔ جب کوئی شاعر کسی کنواری لڑکی کے ہونٹوں کو بندھوا جیوا پھول سے تشبیہ دیتا ہے یا یوں کہتا ہے کہ اُس کے رخساروں پر مہوکہ کی شعاعیں اپنی تابانی ڈال رہی تھیں تو کیونکر ترجمہ اُس کے اثر سے وجدانی کو متاثر کرسکتا ہے؟ یا دوسرا شاعر جب اس طرح گل افشانی کرتا ہے کہ اُس کے گال چنپا کی پنکھڑی کے مانند تھے تو فرمایئے کہ کس کا خیال ایسی نظم کی جادو خیز لطافت تک رسائی حاصل کرنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ ان کے اقسام نظم اور اوصاف سخن میں سے خصوصیت کے ساتھ یہاں ایک ناٹک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

**ڈراما۔ یا۔ ناٹک** اس فن کے مشہور شاعر کالیداس اور بھوبھوتی گزرے ہیں۔ ان شاعروں میں سے ہر ایک کی تین تین کتابیں فن مذکور میں لاجواب تسلیم کی گئی ہیں اول الذکر شاعر بلحاظ لطافت بیان و نفاست زبان کے سب پر فوقیت رکھتا ہے اس کا کلام کیا ہے گویا جادو کا منتر ہے۔ ادھر منھ سے نکلا اُدھر سننے والا بیخود کا بیخود رہگیا۔ موخرالذکر شاعر ان تمام خصوصیات کے ساتھ جو اُس کی ذات میں مساوی درجہ پر تھیں اس فن میں ایسا ید طولیٰ رکھتا تھا کہ سماں باندھ دیتا تھا۔ وہ اُس کا مردانہ لب ولہجہ اور اعلیٰ درجہ کا شجاعانہ جوش۔ سچ یہ ہے کہ اسی کا حصہ تھا۔ سنسکرت زبان کے شاعروں کی طبعی آزادی اور اُن کی شہرت کا بہت بڑا سبب اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت بیانیہ کی

---

[1] یہ کتاب قیمتی الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے ملیگی۔

مدد سے ہر کیفیت کا نظروں کے سامنے نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ اُن کے بیشتر مضامین گویا راحت و آرام اور غور و فکر کے وہ مناظر (سین) ہیں جو الگ تھلگ جنگلوں اور دریا کے لالہ زار کناروں پر واقع ہیں جہاں مہکتی ہوئی ہوا اور نسیم فرحت افزا چلتی اور صاف و شیریں پانی کے چشمے لہریں لیتے نظر آتے ہیں۔ یہی نقشہ اوجین کے گرد و نواح کی اوس سرزمین کا ہو جس کا خاکہ "مالتی اور مادہو" کے نویں سوانگ (ایکٹ) میں دکھایا گیا ہو۔ جہاں جنگل، پہاڑ، ٹیلے، گانوں اور شفاف ندیاں ایک وسیع پُر فضا اور مختلف الکیفیت منظر میں ہر طرف معلوم ہوتی ہیں۔ اِس خوشنما مقام کے مرکز میں شہر واقع ہو جس کے مینار مندر برج اور پھاٹک قریب کے چشمے میں اپنا عکس ڈال رہے ہیں۔ کنج اور نخلستان چشمہ کے کناروں پر شروع مینھ کے برسنے سے سرسبز و شاداب ہوگئے ہیں اور سبزہ زار برسات کی ننھی جھڑی کے تار نہ ٹوٹنے سے لہلہانے لگے ہیں جو دودھیلی گایوں کے آرام کی جگہیں ہیں۔ بعض۔ بعض وقت وہ اپنی فکر کو ایسا اونچا لیجاتے ہیں جہاں پہاڑ زمین کی جبین پر شکن کی صورت میں محسوس ہوتے ہیں اور کالی بیلی آندھیاں بگولے کی طرح اُٹھتی دکھائی دیتی ہیں۔ اِس اعلیٰ قسم کے بیان میں بھوبھوتی بالخصوص سب سے سبقت لیگیا ہو، مختلف جگھوں میں اُس کے وحشت خیز کوہستانی مناظر کے جذبات اور اُس کی خیالی پہاڑیوں اور پُر رعب سنسان جنگلوں کے بیانات جو گوداوری کے سرچشمہ کے چاروں طرف واقع ہیں عظمت و جبروت سے پُر ہیں۔ اُس کے نہایت ہی موثر بیانوں میں ایک وہ بیان ہو جبکہ اُس کا ہیرو آدھی رات کے وقت مرگھٹ کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہو۔ جس جگہ دور دور تک راکھ کے ڈھیر اور جلتے ہوے لکڑ پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چتا میں آگ کی چنگاریاں چلکتی نظر آتی ہیں۔ بھوت پریت کی ڈراؤنی صورتیں پشاچ اور نشاچر کی بھیانک آوازیں کانوں میں چلی آتی ہیں۔ دل ہے کہ آپ ہی آپ سہا جاتا ہو جان نکلی آتی ہو۔ کوئی تاڑ سا قد لیے سامنے چلا آتا ہو کوئی لال لال دیدے نکالے کھڑا ہو کسی کے لمبے لمبے دانت ہیں کسی کے گلے میں کھوپڑیوں کا ہار پڑا ہو۔ کوئی چیخ چیخ کر رو رہا ہو، کوئی ٹھٹھے مار کر ہنستا ہو۔ کوئی بھن بھنی بولی میں کچھ بک رہا ہو، کوئی تالیاں بجا بجا کر ناچ رہا ہو کسی کے مُنھ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں، اندھیرا ہو کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ پیچھے سے بیبو ماروکا غُل ہوتا چلا آتا ہو، جنگل ہو کہ بڑا سائیں سائیں

کر رہا ہو، تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈراؤنی صورتیں سب کی سب غایب اور بھیانک آوازیں خود بخود موقوف ہو جاتی ہیں۔ پھر وہی مرگھٹ کا سنسان میدان آنکھوں کے سامنے ہو۔ ہمارا ہیرو کبھی تو چونک کر اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا ہو کبھی سر جھکا کر اُسی ہو کے عالم میں قدم بڑھا کر چل کھڑا ہوتا ہو اب سنتا ہو ہوا کی شدت سے درختوں کی پتے کھڑکھڑا رہے ہیں ہوا کی سنسناہٹ اور نالہ کی گھڑگھڑاہٹ سے جی بیٹھا جاتا ہو، اُلو کا بولنا گیدڑوں کا چیخنا اور کتوں کا رونا ایسی وحشت پیدا کرتے ہیں کہ بیچارے کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سنسکرت کا شاعر کسی دلی جوش کے اظہار میں اُن تمام لوازم کو ترک کر دیتا ہو جن سے وہ جوش گھنگور گھٹا کی مانند اُمنڈ آیا ہو بلکہ وہ اس منظر کے مخصوص نقش و نگار اور اپنے جوش کے تمام مناسبات کی تصویر ایسی ہو بہو اُتارتا ہو کہ انجان آدمی بھی معاً پہچان جائے جو وقت کوئی شاعر کسی سایہ دار کنج کا چربہ کھینچتا ہو تو کہتا ہو کہ درختوں کے جھنڈ پھلے ہوئے ہیں سیاہ تمالا اپنی شاخیں بڑھائے نیم کے زرد پتوں کی بلائیں لے رہا ہو۔ آم کا درخت اپنے پُرانے ٹہنے کسی اونچے پیپل کے ہلتے ہوئے پتوں میں پھیلائے ہو کوئی بیل رسی کی طرح جھک کے چو طرف پھیلی جاتی ہو۔ اسوک اپنے لال بھبوکا پھلوں کے گچھے نیچے کو لٹکائے ہوئے ہو، مادھوی اپنی سفید برف جیسی پنکھڑیوں کی بہار دکھا رہا ہو جب درختوں کی پتیاں ہلتی ہیں تو کلیوں کا مینھ برسنے لگتا ہو۔ دھیمی دھیمی ہوا اُن کی بو باس سے بسی ہوئی ہو۔ مکھیوں کی بھن بھناہٹ اور ندی کی سرسراہٹ کچھ جُدا ہی سماں دکھا رہی ہو۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے دل کا کنول کھلا جاتا ہو کسی طرف سے کوئل کی کوک گھڑی گھڑی کانوں میں آرہی ہو۔ ایک سمت سے کوکلے کی آواز پاس کے درخت پر سنائی دیتی ہو۔ غم کا مارا عاشق بھی اِدھر اُدھر پھر رہا ہو اور اپنی غمزدہ حالت کو تسکین دیتا جاتا ہو۔ یکایک آم کے بور کا خوشبو سے بسا ایک جھونکا آتا ہو اور ساری کلفت کو دل سے اُڑا لیجاتا ہو آخر چنبلی کے ایک کنج میں تھک کر بیٹھ جاتا ہو اور اپنی گل اندام معشوقہ کی یاد میں اپنے آپ کو بھی بُھلا دیتا ہو۔

یہ ہو سنسکرت کی وہ لطافت انگیز شاعری جس کے سننے سے وجدان پر فوراً ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہو۔ یہ ہو سنسکرت کی وہ دلکش شاعری جس کے پرزور اثر سے اسی وقت ہم

خاص اُس شے تک پہونچ جاتے ہیں جس کو ہم کبھی حسِ ظاہری کے ذریعہ سے نہیں دریافت کرسکتے اور یہ ہو سنسکرت کی وہ فرحت بخش شاعری جسمیں نہ کہیں مبالغہ کی بو ہو نہ استعارہ کی رعایت مگر دل ہو کہ پڑا خود بخود مزے لے رہا ہو۔ طبیعت ہو کہ آپ ہی آپ شگفتہ ہوئی جاتی ہو اور قوت مدرکہ ہو کہ بیساختہ لوٹی جاتی ہو۔ دم بدم مُنھ سے واہ وا نکلتی ہو۔ قلب پر سرور کی حالت چھائی ہوئی ہو۔ سامعہ سننے سے بس ہی نہیں کرتا۔ غرض کہ سنسکرت کی شاعری واقعیت و فطرت کے بالکل مناسب واقع ہوئی ہو جس کی مثال اور زبانوں کی شاعری میں کمتر پائی جاتی ہو۔

**فلسفہ یا تتو وچار** منو نے فلسفہ کی جانب بہت کم توجہ کی ہو۔ ہاں اُس کے مجموعہ قوانین کے اوّل باب میں اتفاق سے اِس مضمون کا کہیں کہیں ذکر آگیا ہو۔ مگر اخیر زمانہ کے ہندوؤں نے فلسفہ پر خوب خوب عقل آرائیاں کی ہیں جس سے ان کی ذہانت و فطانت کا معقول ثبوت مل سکتا ہو۔

منو کے مجموعۂ قوانین کے پہلے ہی باب سے اُس کا مذہبی غلو عیاں ہوتا ہو اور (ان قوانین کے برخلاف جو مختلف زمانوں کے موضوعہ ہیں) غالباً اِس باب سے ان لوگوں کی راے کا اظہار ہوتا ہو جو اس کے عہد میں موجود تھے۔

اس باب کے خاص مضامین میں باری تعالیٰ کی ماہیت روح کی حقیقت پیدائش عالم کی کیفیت یا طبیعات اور ما بعد الطبیعہ کے علاوہ اور باتوں کا اس قدر کم بیان ہو کہ اس سے اس کا حال نہیں کھُلتا کہ اس زمانہ میں حکما کے فرق ایسے ہی تھے جیسے کہ اب ہیں۔ مگر پھر بھی ان دقیق مطالب کی جانب اِس طرح اشارہ کیا گیا ہو کہ گویا لوگ اُن مطالب سے آگاہ تھے اور اُن مصطلحات کو جن کو حکما اس وقت بھی استعمال کرتے ہیں اُسی طرح کام میں لاتے تھے۔ کہ گویا اُن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مباحث کے اُن اصول کی رو سے جن پر ہندوؤں کی مختلف قسم کی حکمت قایم ہوئی ہو ظاہر ہوتا ہو کہ ہندو شروع ہی سے وہ اصول جانتے تھے۔

ہندوؤں میں فلسفہ کے چھ قدیم فرقے یا اسکول حسب ذیل ہیں جو شٹ درشن کے نام سے مشہور رہیں۔

۱۔ پہلا میمانسا (علم شریعت) جس کی بنیاد مہرشی جیمنی نے رکھی تھی۔
۲۔ پچھلا۔ میمانسا یا ویدانت (علم توحید) جس کے بانی بیاس جی تھے۔

۳۔ نیاسے (علم منطق) یا گوتم کا منطقی فلسفہ۔
۴۔ ویشیشک۔ کنادکے علم ذرات کا اسکول۔
۵۔ سانکھیا۔ یا کپل کا دہریہ اسکول۔
۶۔ یوگ۔ یا پتنجلی کا خدا پرست فرقہ۔

اخیر کے دو فرقے اکثر مسائل میں متفق ہیں۔ اور سانکھیا کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

اس تقسیم سے وجود فلسفہ کی حالت کا پورا پورا اندازہ نہیں ہوتا۔ میمانسا کا پہلا فرقہ فن تقریر سکھاتا ہو کہ ویدوں کے مطلب سمجھنے اور اُس کی شرح کرنے میں مدد ملے۔ بایں وجہ یہ فرقہ محض نکتہ چینی اور تعریفیں کرنے کا فرقہ ہو اور اس سے یہ غرض رکھی گئی ہو کہ جو فرائض ویدوں میں معین ہیں اُن کی تحقیق و تفتیش کی جائے۔ پس یہ مذہبی کام انجام دیتا ہو اور حکمت کے فرقوں میں شمار ہونے کے لائق نہیں ہو۔ برعکس اس کے اور جو فرقے ہیں اُن کی مختلف شاخیں ہیں اِن میں سے ہر شاخ جداگانہ فرقہ سمجھی جاتی ہو۔ یہاں یہ ضرور نہیں کہ حکمت کے تمام فرقوں کے اختلافات بیان کیے جائیں۔ اس لیے منجملہ مذکورۂ بالا چھ بڑے فرقوں کے فقط دو متفقہ فرقوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہو۔

یہ دونوں فرقے سانکھیا اور ویدانتا کہلاتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا سانکھیا والے کہتے ہیں کہ مادہ ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہیگا۔ اِس فرقہ کی اعلیٰ شاخ خدا کے وجود کی منکر ہو۔ دوسرا فرقہ تمام اشیاء کا خالق خدا کو بتاتا ہو۔ مگر اِس فرقہ کی ایک شاخ مادہ کے وجود کا انکار کرتی ہو۔

ہندوستان کے تمام دہریہ و خدا پرست فرقوں کے اصول و قواعد اپنے مقصود میں توافق کی نسبت رکھتے ہیں جو نہایت درجہ کی مسرت یا تناسخ اور تمام جسمانی بار اور تکالیف سے نجات حاصل کرنے کے طریقے سکھاتے ہیں۔

دہریہ۔ اور خدا پرست فرقوں کا بیان جو سانکھیا کے مشترکہ نام سے شہرت رکھتے ہیں۔

علم کا مقصد۔ یہ فرقہ جیسا کہ مذکور ہوا دو شاخوں میں منقسم ہو۔ ایک وہ جو کپل سے علاقہ رکھتی ہو اور دہریت کی تعلیم دیتی ہو۔ دوسری وہ جو پتنجلی سے تعلق رکھتی ہو اور خدا کے وجود کا اقرار کرتی ہو مگر اِن دونوں کا مفصلۂ ذیل رایوں پر اتفاق ہو۔

نجات صرف علم حقیقی و عرفان کامل سے ہی حاصل ہو سکتی ہو۔

علم افعال و اعمال کے ذریعہ سے نہیں آتا بلکہ یہ علم مادّی دنیا کے قابل محسوس و غیر قابل محسوس اُن امتیاز کرنے والے اصولوں کی بنا پر حسی و ادراکی اصل سے حاصل ہوتا ہو جو غیر مادی روح ہی؛

حصول علم کے وسائل | علم، پرکش۔ انومان اور شبد تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہو۔

**پرکش** (ظاہر) وہ علم ہو جو آنکھ کان وغیرہ حواس ظاہری سے فہم میں آئے۔

**انومان** (قیاس) اور یہ تین پرکار کا ہو: ابر کو دیکھ کر پانی برسنے کا قیاس کرنا (۲) دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا گمان کرنا (۳) جزو کی حالت پر نظر کر کے کل کا اندازہ کرنا۔

**شبد** (کلام) یعنی ودیا۔ اس سے مقصود گرو کے اقوال ہیں۔

وہ اصول (تتو) جن کا علم مذکورۂ بالا تین قسم کے علموں سے حاصل ہوتا ہو شمار میں پچیس ہیں۔

۱۔ مادہ (پرکرتی یا پردھان) ستوگن۔ رجوگن۔ تموگن۔ ان تینوں گنوں کی مساوی حالت کو مادہ کہتے ہیں۔ مادہ کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذرّوں کا ابتدائی ترکیب کے ساتھ دوسری حالتوں میں مبتدل ہو جانا یعنی اُن کا کثافت کے باعث اشکال مختلفہ قبول کر لینا۔ اُسی کو پیدائش (سرشٹی) کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پرکرتی ہی سرشٹی کی علت غائی ہو۔ یہ خالق ہو مگر مخلوق نہیں ہو۔

۲۔ جس وقت مادہ (پرکرتی) کا روح (پرش) سے اتصال ہوتا ہو تو اس اتصال کی وجہ سے تغیّر راہ پاتا ہو اور اُسی تغیر کا نام عقل (بدھی) ہو۔

۳۔ **انانیت** (اہنکار) کا منبع عقل ہو۔ یہی خود بینی کی جڑ ہو۔

۴۔۸۔ **انانیت** سے لطیف و غیر محسوس پانچ عناصر (پنچ تن ماتر) ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ایسے لطیف ہیں کہ حواس خمسہ سے اُن کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

اِن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ آواز۔ (شبد)

۲۔ لمس۔ (سپرش)

۳- شکل - (روپ)
۴- ذائقہ - (رس)
۵- بو (گندھ)

۹-۱۹- اہنکار ہی سے گیارہ اندریاں وجود میں آتی ہیں۔ منجملہ ان کے پانچ گیان اندریاں ہیں اور پانچ کرم اندریاں ہیں۔ اول الذکر آنکھ کان۔ ناک۔ زبان کھال اور آخر الذکر ناطقہ ہاتھ پانوں آلات بول و براز سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور گیارھویں اندری دل (من) ہے۔

۱۰- ۱۱- مذکورہ بالا (۴-۸) پنچ ماترسے پانچ استھول مہابھوت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔
آواز سے اکاش
لمس سے ہوا
شکل سے آگ
ذائقہ سے پانی
بُو سے مٹی

۲۵- سب سے آخری تو روح ہے یہ نہ کسی سے پیدا ہوئی ہے اور نہ کسی کو پیدا کرتی ہے۔ وہ سب سے جُدا ہے۔ وہ ایک وجود ہے ابدی غیر متغیر منفرد اور غیر مادی۔ اور روحیں بے شمار ہیں۔ مادہ ہمیشہ سے ہے وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اُسی سے سب پیدا ہوئے ہیں۔ وہ سب چیزوں کی علّت ہے۔ مگر مخلوق نہیں ہے۔ عناصر خمسہ حواس عشرہ اور مَن یہ سولہ چیزیں انانیت اور پنچ تن ماتر سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور ان سے کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اسی واسطے یہ فقط معلول ہیں۔

سانکھیامت میں پیدائش کے متعلق اس طرح بحث کی گئی ہے کہ پرش یعنی روح کے اتفاق سے پرکرتی میں ایک طرح کی قوت آجاتی ہے۔ اور اس میں رفتہ رفتہ ایک حالت کے بعد دوسری حالت پیدا ہو کر پیدائش کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ روح اگرچہ فی نفسہ مطلق العنان ہے لیکن تعلقات کے باعث خود کو مقید خیال کرتی ہے۔ جس سے اُس میں دو قسم کی خواہشیں ظہور کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اُن سے تمتع اٹھانا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اُن سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔

بدھی - اہنکار - پنچ تن ماتر - من - حواس عشرہ - ان سترہ تتو سے لطیف جسم (سوکشم شریر)

ترکیب پاتا ہو۔ یہ جسم توو کے ابتدائی لوب کے سبب پرکرتی سے بنتا رہتا ہو اور روح اس کو قبول کرلیتی ہو اُس لطیف جسم کی نسبت یہ کہا گیا ہو کہ وہ مختار و آزاد ہو۔ مگر روح جب تک کثیف جسم اختیار نہیں کرتی اُس وقت تک اُس میں کسی قسم کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ کثیف جسم حقیقت میں ایک غلاف ہو جو لطیف جسم پر چڑھا ہوا ہو جس کے ذریعہ سے وہ نفع اٹھانے کی قابلیت رکھتا ہو۔ کثیف جسم (استھول شریر) آکاش۔ ہوا۔ پانی۔ آگ۔ خاک سے مل کر بنتا ہو اور جب روح نکل جاتی ہو تو نیست و نابود ہو جاتا ہو۔ لیکن لطیف جسم اعمال کے لحاظ سے نوع بنوع قالبوں میں گشت لگاتا پھرتا ہو اور اِس طرح اُس کی مدت معینہ پوری ہو جاتی ہو۔

اب پرکرتی کی ماہیت سے بھی واقفیت ضروری ہو۔

ستوگن۔ رجوگن۔ اور تموگن کی مساوی حالت کو پرکرتی کہتے ہیں یہ گن محض صفات و اعراض ہی نہیں خیال کیے جاتے بلکہ وہ خود جوہر ہیں جو مادہ میں محفوظ ہیں۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ آپ مادہ ہیں۔ ستوگن کشادگی و سرور کو ظاہر کرتا ہو۔ رجوگن فاعلیت حسد اور بینائی کو نمایاں کرتا ہو۔ تموگن ظلمت تمنا اور رہن پر دلالت کرتا ہو۔ یہی تینوں صفات تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

تنجلی کائنات | بخلاف اس کے تنجلی کا یہ عقیدہ ہو کہ ان روحوں کے علاوہ ایک اور روح بھی ہو جس پر ان برائیوں اور بدیوں کا جن کے اثر سے اور ارواح متاثر ہوتی ہیں۔ کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ اچھے افعال یا اُن کے نتائج سے بے تعلق ہو وہ تصورات یا ایسے خیالات سے جو آتے جاتے رہتے ہیں بری ہو۔ وہ زمان و مکاں سے الگ ہو اور دانندۂ نہاں و آشکارا ہو یہی روح ذات باری تعالیٰ ہی جو حاکم علی الاطلاق ہو۔

اس مذہب والوں کا طریق عمل اُن کے مخصوص عقائد سے منکشف ہوتا ہو۔ دونوں کے عندیہ میں علم کا مقصود یہ ہو کہ روح کسی طرح مادہ کے تعلقات سے نجات پائے اور یہ اہم کام دھیان یا مراقبہ کی مدد سے پورا ہوتا ہو۔

قطع نظر اس کے یہ موحد حضرات جب تپ اور مجاہدات کو عمل میں لاتے ہیں اور اس سریع الاحساسی کے ذریعہ سے استغراقات اور دھیان کے مضامین پیدا ہوا کرتے ہیں لیکن دوسرے فرقہ کے پیرو مادہ اور مادہ کے لاینحل و ادق مسائل پر بحث کیا کرتے ہیں۔ موحد توو کے

تیع اپنا سارا وقت ریاضت میں صرف کرتے ہیں۔ یا وہ قطعاً محویت کے عالم میں علائق دنیوی سے بیزار و متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہو کہ وہ اپنے آپ کو صاحب کشف سمجھتے ہیں۔

پتنجلی کی کتاب جو موحدانہ فرقہ کی اصل کتاب ہو جسمانی و روحانی ریاضتوں پر کامل طور سے حاوی ہو۔ اس میں لکھا ہو کہ خاص خاص باتوں کے تصورات میں اس طرح ڈوب جاؤ کہ دنیا و مافیہا سے کچھ علاقہ نہ رہے حبس دم کرو اور حواس کو بیکار کرکے معینہ طریقوں پر مستقل طور سے قایم کرو۔ اس طرح کی ریاضتوں کے کرنے سے انسان مرتاض ہو جاتا ہو۔ اس کو ماضی و مستقبل اور پوشیدہ یا دور کی چیزوں کا علم ہونے لگتا ہو یہاں تک کہ دوسرے لوگوں کے خیالات و خدشات بھی اس کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس میں ہوا کی سی سرعت پیدا ہو جاتی ہو۔ شیر کی مانند جری ہو جاتا ہو اور ہاتھی کی مثل قوی بنجاتا ہو۔ وہ ہوا پر اُڑتا پانی پر چلتا اور پاتال لوک میں آسانی چلا جاتا ہو۔ وہ طرفۃ العین میں کل کائنات کا حال جان لیتا ہو۔ سوا اس کے خرق عادات و کشف حالات کے حصول کی غرض سے ایسے مجاہدات کاملہ و ریاضات شاقہ کے قواعد بھی تعلیم کئے گئے ہیں جن سے وہ سرور موفور اور انبساط بے غایت کے باعث بہشت کے سے لطف اُٹھایا کرتا ہو۔

**الغرض** اس مسلک کا اعلیٰ مقصد یہ ہو کہ جس وقت تک انسان کو پرکرتی اور مادی علل و اسباب کا گیان نہیں ہوتا اُس وقت تک وہ دکھ درد سے چھٹکارہ پاکر موکش نہیں حاصل کر سکتا۔

ویدانت یا اُترا میمانسا | **ویدانت** دو لفظوں (شبدوں) ویدا اور انتا سے مرکب ہو۔ بیاکرن کے قاعدے کے موافق اس میں دیرگھ سندھی واقع ہوئی ہو اسی واسطے اُس کے معنی انتہاے وید کے ہیں۔ یہ وہ مسلک ہو جس پر چلنے سے انسان ایک ایسے عالم میں جا پہونچتا ہو جو ہمارے عالم سے بالکل جُدا اور نرالا ہو۔ یہ وہ راہ ہو کہ جس نے اس میں قدم رکھا اور روحانیت کے اثر سے بیخود ہو گیا یہ وہ طریق ہو جس کا رہرو عالم مثال یا عالم ناسوت کی طرف پھر کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ وہ آستہ ہو جس کا سالک تمام علائق سے قطع نظر کرکے صرف خدا ہی کا ہو رہتا ہو۔ یہ وہ جادہ ہو جس کا مسافر کسی طرح بھٹکتا ہی نہیں۔ یہ وہ مارگ ہو جس میں ہر ساعت حیات ابدی و سرور سرمدی کا لطف حاصل ہوتا ہو۔ اور یہ وہ پنتھ ہو جس کا پیرو آنکھیں بند کئے سب کچھ دیکھتا ہو اور ہمارا [illegible] اُس کی نگاہ میں ایک بے بود ہستی معلوم ہوتی ہو۔ یہ ویدوں کے مدون بیاس کی جانب منسوب

کیا جاتا ہے۔ اس کے خاص اصول یہ ہیں "خدا زمین و زمان کا خالق برحق۔ علانیہ و پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا اور دنیا سے فانی کائنات دنیا پیدا کرنے والا ہے۔ پیدائش خلق اس کے فرمان واجب الاذعان کا ایک ادنیٰ شمہ ہے۔ وہ دنیا کی فاعلی و مادی دونوں حالتوں کا سبب ہے۔ کل اشیاء انتہا پر پہونچکر اُسی پر منتہی ہوتی ہیں" وہ ذات بحت" اور روح مجرد ہے۔

ارواح کاملہ اُسی وجود کی شعاعیں ہیں۔ وہ اس سے اس طرح نکلتی ہیں جس طرح کسی شعلہ سے شرارے اور وہ پھر اُسی کی جانب رجعت کر جاتی ہیں۔

روح (خدا کے ایک جزو کی مثل) نامتناہی لازوال مدرک، ذی شعور اور فطری ہے۔ وہ سریع السیر ہے گو قدرتی حالت اُس کی لایق سکون ہے۔

اس کو قادر مطلق و خالق برحق نے کام کرنے کے لیے بنایا ہے۔

روح جسم کے زندان خانہ میں اس طرح بند ہے جس طرح کوئی شے غلاف کے اندر بند ہوتی ہے یا یوں کہیئے کہ چند غلافوں میں لپٹی ہوتی ہے۔ روح کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی اس کی قوت مدرکہ یا حواس خمسہ کو زیادہ کرتی ہے۔ دوسری حالت ارادہ کو ترقی دیتی ہے۔ تیسری حالت قواے حسّی کو بڑھاتی ہے۔ یہ تینوں حالتیں تناسخ کے تمام درجات میں شروع سے آخر تک روح کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں جو اس بے بود جسم کے نشو و نما کا سبب خیال کی جاتی ہیں۔

چوتھا غلاف جسم کا کثیف و دبیز ہے۔

روح کی حالتیں باعتبار جسم کے یہ ہیں۔

بیداری کے وقت وہ مستعد و متحرک اور ایک اصلی و حقیقی صفت سے علاقہ رکھتی ہے۔ نیم خوابی کے وقت اس پر ایک وہمی و مجازی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ نوم شدید میں وہ ذات الٰہی سے ہمقریب ہوتی ہے مگر اُس سے واصل نہیں ہوتی۔ موت کے بعد وہ اس ظاہری چولہ سے نجات پاتی ہے۔ پھر وہ چاند میں جاتی ہے پھر وہ رقیق ہو جاتی ہے اور مینھ کی طرح برستی ہے۔ جس کو نباتات زمین سے کوئی جذب کر لیتا ہے اور جب کوئی جانور اُس کو کھا لیتا ہے تو اُس کے جنین میں پرورش پاتی ہے۔

اس آواگون کے بعد جس کی مدت اُس کے اعمال پر موقوف ہے وہ رستگاری حاصل کرتی ہے

نجات کے اقسام تین ہیں ایک کابل یعنی منزہ عن الجسم جس کے بعد روح برہما میں منجذب ہو جاتی ہو۔ دوسرے جبکہ وہ برہما کے مقام پر فائز ہوتی ہو۔ تیسری قسم بمقابلہ دونوں کے بہت مختصر ہو جس کی وجہ سے زندگی ہی میں وہ یزدانی قوتوں میں سے کچھ کچھ قوتیں حاصل کرلیتی ہو اور اس کی یہی قوتیں سرور ونشاط کے لیئے کارآمد سمجھی گئی ہیں۔ مگر عمل کے لیے ناکافی ہیں یہ دو پچھلی قسم کی نجاتیں معین طریقوں میں قربانی اور غایت استغراق کے ذریعہ سے ممکن الحصول ہیں۔

یہ گروہ کرم ایزدی و قدرت سرمدی کے نامتناہی ہونے اس کے غفار ہونے اور دوام کرم کے مؤثر ہونے اور بہت سے چیدہ امور پر بحث کیا کرتا ہو دہرم کرم کی تاثیر کا بیان اس گروہ کی پرانی کتابوں میں نہیں ملتا۔ البتہ یہ ویدانیتوں کے اس فریق کا مسئلہ ہو جو بھگوت گیتا پر چلتا ہو۔ اس مسلک اولین کا وہ گروہ جو قاعدہ کا بہت پابند ہو، موکش کا ہونا محض فضل خدا پر منحصر جانتا ہو اور قدرت الٰہی کو اُن مسلسل اسباب کے ذریعہ سے جن کا بیان ہو چکا ہو محدود سمجھتا ہو۔

یہ بالبداہتہ ظاہر ہو کہ اس گروہ والے مذکورۂ بالا فرقہ سے مادہ کی قدامت اور عالم کو حق تعالیٰ کی مرضی و قدرت کی طرف منسوب کرنے کے باعث بالکل اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ویدانت کے ابتدائی معلمین یہاں تک کہ اُس کے یورپین مترجم (التھاکار) بھی مادہ کے وجود میں آنیکے منکر ہیں۔ منجملہ ان کے ایک فرقہ کا عقیدہ ہو کہ ذات باری تعالیٰ نے اپنے وجود میں سے مادہ کو پیدا کیا ہو اور وہ اس کے ارادوں کی تکمیل کے بعد پھر اُسی میں مل جائے گا۔ اس مادہ سے جو اس نہج پر پیدا ہوا تھا تمام کائنات کا ظہور رہا۔ اور اس کو روح انسانی پر انواع انواع اثرات ڈالنے کا اختیار دیا۔ دوسرے فرقہ کا عقیدہ ہو کہ خدا نے مادہ کو نہیں پیدا کیا نہ وہ موجود ہو بلکہ وہ بغیر کسی واسطے کے روح انسانی پر مسلسل اثرات ڈالتا ہو جن کا وجود میں آنا پہلا فرقہ مادی دنیا کے ذریعے سے خیال کرتا ہو۔ فریق اول یہ کہتا ہو کہ ہر شے خدا کے وجود سے موجود ہو۔ دوسرا قائل ہو کہ سوائے خدا کے کوئی شے موجود نہیں ہو۔ یہی آخری مسئلہ زمانۂ حال کے ویدانیتوں میں جاری ہو۔ اگرچہ غالباً اس فرقہ کے بانیوں اور قدما میں جاری نہ ہو۔

دونوں فرقوں کے لوگ اسکے متفق ہیں کہ جو اثر طبیعت میں پیدا ہوتا ہو وہ باقاعدہ ترتیب پیدا ہوتا ہو پس دنیا کو بے اصل جاننے والا فرقہ سبب اور اثر پر ٹھیک اسی طرح بحث کرتا ہو جسطرح دنیا کو اصل ماننے والا فرقہ بحث کرتا ہو۔

دونوں ارادۂ الٰہی کے قائل ہیں اور نہیں خیال کرتے کہ مادہ کی خاصیت یا خدا کی

صفات میں کوئی ایسی بات بھی ہو جس کی وجہ سے اس کا ارادہ محسوس ہو سکے۔

دونوں۔ اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ روح خدا کی ذات کا ایک اصلی جزو ہو اور پھر وہ اُسی ذات میں واصل ہو جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ کس طرح خدا کی ذات سے الگ ہوئی۔ خصوصاً وہ لوگ جو دنیا کو بے بنیاد سمجھتے ہیں اس بات کے بیان کرنے سے عاجز ہیں کہ جس صورت میں روح خدائے تعالیٰ کے وجود کا ایک اصلی جزو یعنی اس کا عین ہو۔ تو پھر اس کو خدا تعالیٰ نے یہ یقین دلا کر کیوں دھوکہ میں ڈالا کہ پھر وہ کیا چیز ہو؟ جو عالم کون و فساد کی تاثیرات سے متاثر ہوتی ہو۔

**منطقی فرقہ یا نیائے سکشا سمپردائے** برہمن علم منطق کے بھی بڑے دلدادہ تھے اور بیشمار کتابیں انھوں نے اس علم میں تحریر کی تھیں۔ بعض ان میں بڑے بڑے عالم اور مصنف گذرے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ منطقیوں کے بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے لیکن کل فرقوں کے ماخذ گوتم اور کنا د کے مذہب سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے اول الذکر نے منطقی الہیات پر، آخر الذکر نے طبیعات یا حسی مضامین پر توجہ مبذول کی ہو۔ گو مذکور الصدر دونوں فرقے بعض بعض امور میں ایک دوسرے سے تباین کلی رکھتے ہیں۔ پھر بھی عموماً اُن مطالب میں توافق کی نسبت رکھتے ہیں جن پر انھوں نے اپنے مباحثہ کی بنیاد قایم کی ہو۔ لہٰذا اُس اعتبار سے اُن کو ایک ہی اصل کی دو ایسی فرع جاننا چاہیئے جو باہم ایک دوسرے کے نقصان کو پورا کرتی ہیں۔

**ارسطو کے منطقیانہ مسائل سے مشابہت** جب اس فرقہ کے مسائل کا مقابلہ جو ان دونوں کے اجتماع سے قائم ہوا ہی۔ ارسطو کے مسائل سے کیا جاتا ہو تو معلوم ہوتا ہو کہ یہ فرقہ تجنیس ترکیب اور ترتیب پر توجہ کرنے اور ایک بد اسلوب تضیہ پانچ مراتب کا جن میں سے دو بالکل بیکار ہیں قائم کرنے میں ارسطو کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو۔

کنا د کے فرقہ کی منطق میں اُن حالتوں کا شمار چھ ہو جن کا ترجمہ معقولات (پدارتھ) کیا گیا ہو یعنی صفت، حرکت، اجتماع، خصوصیت اور اتحاد یا تعلق قلبی۔ بعض لوگ ساتویں حالت کو اور مستزاد کرتے ہیں اور وہ معصیت ہو۔ ارسطو کے نزدیک اول کی تین حالتیں حالتوں میں شمار ہوتی ہیں باقی کی حالتیں حالتوں میں شمار نہیں ہوتیں۔ اس کے سوا ارسطو نے اور جو دس حالتیں قرار دی ہیں وہ متروک ہیں۔

جن مضامین پر ہندوؤں کے دونوں فرقوں نے بحث کی ہو اکثر اُن مین کے وہی ہیں جن پر ارسطو نے بحث کی ہو، مثلاً حواس، عناصر، روح اور اس کی مختلف قوتیں، زمانہ، خدا وغیرہ مگر بیشتر مضامین جو ارسطو کے نزدیک اول درجہ کے ضروری ہیں ہندوؤں سے رہ گئے ہیں۔

وہ مشہور تر تطابق جو ہندوؤں اور یونانیوں میں پایا جاتا ہو یہ ہو کہ کل ہندوؤں کے فرقے حواس خمسہ پر ایک اندرونی حس کو (جسے وہ ارادہ کہتے ہیں) اور اضافہ کرتے ہیں جو باقی کے پانچوں حواسوں پر قبضہ رکھتی ہو یہ ارسطو کے اُس تسلیم شدہ حس سے حس کو وہ عام حس یا اندرونی حس کہتا ہو مطابقت تام رکھتی ہو۔

گوتم کے فرقے کے بوجب عام تجنیس | گوتم فرقے کی تجنیس بمقابلہ کناد کے فرقے کے بہت زیادہ کامل اور قریبِ فہم ہو۔ اُس کے کسی قدر نمونوں کا بیان اُس تفصیل کو بخوبی خاطر نشین کر دے گا جو یہ فرقہ اپنی تجنیس کی کرتا ہو۔

تقریری مراتب | تقریر کے مراتب کی تقسیم (۱) سولہ عنوانوں یا درجوں میں کی گئی ہو (۱) دلیل (۲) وہ شے جو معلوم اور ثابت کی جائے (۳) شک (۴) علت (۶) ثبتہ حقیقت (۷) ایک باقاعدہ تقریر یا قضیہ (۸) وہ تقریر جس سے بیہودہ پن ثابت کیا جائے۔ (۹) تعیین یا تحقیق (۱۰) مقدمہ (۱۱) مناظرہ (۱۲) اعتراض (۱۳) دلیل (۱۴) انحراف (۱۵) تذلیل (۱۶) تردید۔

اس تقسیم کی جو تقسیم کی گئی ہو وہ زیادہ تر معقول و بالترتیب ہو۔

پہلا عنوان دلیل | دلیل کے چار اقسام ہیں۔ بدیہہ، نتیجہ۔ تقابل اور مقولہ (یا شہادت)

دلیل کے اقسام چہارگانہ میں سے نتیجہ تین طرح کا ہوتا ہو ایک صغریٰ جیسے علت سے معلول معلوم ہوتا ہو۔ دوسرا کبریٰ جیسے معلول سے علت دریافت ہوتی ہو تیسرا مماثل۔

دوسرا عنوان۔ جو اشیائے معلول عہ ثابت کی جائیں ان کی تقسیم در تقسیم | جو اشیائے ثابت کی جاتی ہیں وہ بارہ ہیں۔ روح، جسم، آلات حس محسوسات، قوت مدرکہ، ارادہ، شرحت، خطا، تناسخ، اعمال کا ثمرہ، تکلیف و کوشش یعنی نجات۔

روح | پہلی شے قابل اثبات روح ہو۔ اس کے خاصیتوں کی نوتوں اور اس کے وجود کے دلائل کامل طور پر بیان کیا گیا ہو۔ روح کی چودہ صفات ہیں۔ تعداد، مقدار، کثرت، وصل، فصل، علم، ادراک

رنج دراحت - خواہش - نفرت - ارادہ - لیاقت - نالیاقتی - اور قوت متخیلہ

جسم | روح کے بعد دوسری ثابت ہونے والی شے جسم ہے، اُس کی بحث اور تشریح زیادہ وضاحت سے کی گئی ہے، مگر بعض باتیں، جو علم طبیعات سے تعلق رکھتی ہیں اُس میں شامل کردی گئی ہیں۔

آلات حس | اس کے بعد آلات حس ہیں - اِن کا مخرج سانکھیا فرقے کے مثل معرفت کو قرار دیا ہے - بلکہ اُسی فرقے نے مثل آلات کو اندرونی چھٹے حس کے ساتھ شریک کردیا ہے لیکن پانچ آلات حرکت کا فرق علیحدہ نہیں کیا گیا ہے جن کے شمار سے سانکھیا فرقے نے حس کے گیارہ آلات قایم کیے ہیں۔

محسوسات | دوسرے عنوان کی تقسیم ثانی میں محسوسات ہیں اور اُن کو اُن اصطلاحات میں شامل کیا ہے جن میں کنادکے فرقے نے حالتوں کا شمار کیا ہے۔

منجملہ محسوسات کے اوّل نمبر شے کا ہے - اُس کی نو قسمیں ہیں - مٹی - پانی - روشنی - ہوا - اکاش کی نہایت لطیف ہوا - زمان - مکان - روح - اور ارادہ - اِن میں سے ہر ایک کی صفات کو اچھی طرح تحقیق کیا گیا ہے - اُس کے بعد دوسری حالت یعنی صفت کا ذکر کیا جاتا ہے - صفات تعداد میں چوبیس ہیں، سولہ جسمانی - جیسے رنگ، مزہ، بو، احساس، تعداد، مقدار، تجرد، وصل، فصل، تقدم، تاخر، ثقل، رقت چسپیدگی - اور آواز علاوہ اِن کے آٹھ روحانی ہیں - جیسے تکلیف، راحت، خواہش، نفرت، ارادہ، نیکی بدی، اور استعداد - اِن میں سے ہر ایک کی تحقیق بہت مفصل کی گئی ہے۔

علم ہیئت یا جوتش | ہندوؤں نے علم ہیئت کو اِس درجہ کمال پر پہونچایا تھا کہ موجودہ زمانہ میں بھی وہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے - اِس علم کی قدامت دقیقہ شناس لوگوں کی دوربین نظروں پیش ایک کرہ پیش کرتی ہے - جس کو ہمارے کرہ سے کوئی نسبت ہی نہیں اور ایک ایسے عالم کی سیر سے مسرور کرتی ہے جہاں ہر طرف قدرت کی عجیب وغریب نیرنگیاں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔

اِس میں شبہ نہیں کہ یورپ کے فلک رفعت ہیئت دانوں نے اگرچہ نقطۂ اولی کی بابت کچھ بحث کی ہے مگر ابھی تک اس کا کوئی قابل اطمینان فیصلہ نہیں ہوا۔

کیسینی - بیلی اور ہیئے فر وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ مشاہدات جو سنہ عیسوی سے ۳۰۰ برس پہلے مرآۃ خیال میں منعکس ہوئے تھے ابتک قایم وثابت ہیں - اور اس زمانہ کی ترقی کا کافی ثبوت ہیں۔

تمام ہیئت داں ہندو جوتشیوں کی تحقیقات کو قبولیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر اُس معمولی فنا کی صحت جو اُنھوں نے آفتاب و مہتاب کے متعلق قرار دی تھی بغیر کسی حجت و تکرار کے موجودہ تحقیقات کے مقابلہ سے دریافت ہو سکتی ہی۔ مسٹر بنٹلی جو ہندوؤں کے دعاوی کے سخت مخالف ہیں، اپنی سب سے آخری تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ ہندوؤں نے منطقۃ البروج کی تقسیم ستائیس قمری منازل میں (جو بہت قدیم تحقیقات خیال کی جاتی ہی) سنہ عیسوی سے ۱۴۴۲ برس قبل کی تھی۔ پس اس قول سے ثابت ہوا کہ یہ تحقیقات ۱۵ ویں صدی میں پیشتر سنہ عیسوی کے ظہور میں آئی تھی۔

تقویم کی نسبت جوتش کا وہ قاعدہ جو ویدوں سے نکالا گیا تھا اُس کی بابت یہ ظاہر کیا جاتا ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ سے پہلے چودھویں صدی میں مرتب ہوا تھا۔ اور پراسر علم ہیئت کا اول مصنف جسکی تصانیف کے کچھ کچھ اجزا بڑے بڑے باقی رہ گئے ہیں تقریباً اسی زمانہ میں موجود تھا۔

وہ ترقی جو ہندوں نے ریاضی کی دوسری شاخوں میں کی تھی اس وقت تک بمقابلہ اُس ترقی کے جو ہیئت میں کی گئی ہو زیادہ حیرت خیز ہی۔ مسٹر بنٹلی کی راے کے مطابق "سوریہ سدھانتہ" جو سب سے اخیر زمانہ ۱۰۹۱ء میں لکھا گیا تھا۔ لیکن عام طور پرہ دین یا ۶ صدی کا علمی کارنامہ قرار دیا ہو، علم مثلث کے ایک قاعدہ پر مشتمل ہی جو نہ صرف یونانیوں ہی کے نزدیک ثابت نہیں تھا بلکہ اُن کل مثبتہ دعووں کو متزلزل حالت میں رکھتا ہو جن کا ۶ ٹی صدی تک یورپ میں نام و نشان بھی نہ تھا۔

علم ہندسہ یا ریکھا گنت | ہندوؤں نے علم ہندسہ کے متعلق جہاں تک تجربہ حاصل کیا تھا اور جسقدر سلیقہ اشکال ہندسیہ کے حل کرنے میں بہم پہونچایا تھا وہ اُن کے شلوں کے متنوع نمونوں سے ہویدا ہی خصوصاً وہ اصول جن سے وہ ہر سہ ضلعوں کے معلوم ہونے پر کسی شے کا رقبہ دریافت کر لیا کرتے تھے انھیں کا ایجاد تھا۔ اور یہ بات یورپ کو اس وقت تک نامعلوم تھی جب تک کلیوس نے (سولھویں صدی میں) اس کو شایع نہیں کیا تھا۔ علاوہ اسکے یورپ اُن کے دائرہ کے محیط کی نسبت نصف قطر کی اس مقدار کے علم سے بھی بے خبر تھا جس کو اُنھوں نے ایک وضع خاص سے بذریعہ

بذریعہ استعمال ایک پیمانہ اور ایک اکائی کے نصف قطر اور دائرہ کے متعلق ظاہر کیا تھا۔ یہ مقدار جس کی تحقیق اب یورپ نے نہایت جانکاہی سے کی ہو۔ اِس سے پہلے ہندوستان کے باہر نامعلوم تھی۔

حساب یا انک گنت | **بھارت** دیش کے رہنے والوں نے حساب میں بھی بیحد دعد مشق حاصل کی تھی۔ یہ امر مسلم ہو کہ انھوں نے عشراتی قاعدہ (کسور اعشاریہ) میں علامتیں ایجاد کی تھیں اور اِسی تحقیق انیق کے باعث جس نے اُن کو بیشمار نفع بخشا تھا علم الاعداد میں وہ یونانیوں سے فوقیت رکھتے تھے۔

جبر و مقابلہ یا بیج گنت | **معلوم** ہوتا ہو کہ ہندو جبر و مقابلہ میں بھی تمام اقوام سے بڑھ چڑھ کر تھے! اس علم میں برہم گپتا اور بھاسکرا چاریہ (جو ۶ ٹی اور ۱۲ ویں صدی میں ہوئے ہیں) کی کتابیں زیادہ قابل قدر ہیں۔ مگر ان دونوں لائق شخصوں نے آریہ بھٹ سے استفادہ کیا تھا جس کے زمانہ میں یہ علم اپنے اعلیٰ درجے پر پہونچا ہوا تھا۔ گو صاف طور پر ۵ ویں صدی سے پہلے اس کا پتہ نہیں چلتا مگر یہ بھی غیر ممکن نہیں خیال کیا جاتا کہ وہ قریب قریب ڈایوفینٹس جبر و مقابلہ کے یونانی مصنف کے زمانہ یعنی سنہ ۳۶۰ء میں شاید موجود تھا۔

اس سے بحث نہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو تقدم کا فخر حاصل ہو۔ لیکن اِس میں بھی کلام نہیں کہ ہندو اپنے حریفوں پر اُس کوشش کی وجہ سے جس کو اُنھوں نے اِس علم میں صرف کیا تحسین کے سزاوار ضرور ہیں۔ نہیں کچھ آریہ بھٹ ہی ڈایوفینٹس پر فضیلت نہیں رکھتا۔ (جیسا کہ اس کے علم سے اُن مساواتوں کے حل کرنے میں جن میں متعدد مجہول مقداریں شامل ہوں عمل کیا گیا تھا یا اوّل مرتبہ وہ طریقہ جو اوّل درجہ کے عام سوالات کے حل کرنے میں برتا گیا تھا منکشف ہوتا ہو) بلکہ وہ اور اُس کے جانشین بھی اُن جبر و مقابلہ جاننے والوں پر جن کی تحقیقات ایک ضعطہ کی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور جو ہمارے زمانہ کے قریب پیدا ہوئے تھے ممتاز تصور کیے جاتے تھے۔ نہیں نہیں صرف آریہ بھٹ ہی جبر و مقابلہ کا موجد نہیں سمجھا جاتا ہو بلکہ اس بات کے یقین کرنے کے لیے بھی کافی وجوہ ہیں کہ اُس کے زمانہ میں ہی یہ علم اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ گیا تھا۔

**طب یا ویدک** | اس فن کے سب سے اوّل مصنف چرک اور سشرت ہوئے ہیں ان کی واقفیت فن طب میں نہایت مفید و وسیع تسلیم کی جاتی ہے اُن کا کیمیائی تجربہ بہت کچھ تعجب میں ڈالتا ہے۔ وہ خوب جانتے کہ کیونکر گندھک اور شورہ کا تیزاب تیار ہوتا ہے وہ اور اور اقسام کے مرکبات سے بھی ماہر تھے۔ یہی وہ قوم تھی جس نے کشتوں کی ایجاد میں اپنے آپ کو مٹا دیا تھا۔ وہ اپنے معالجات میں اکثر سنکھیا کا بھی استعمال کرتے تھے۔ اُن کی جراحی بھی ویسی ہی عجیب ہے جیسی اُن کی طب عجیب ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ علم تشریح سے محض بے بہرہ تھے تو اور بھی تعجب بالائے تعجب ہوتا ہے۔ اُن کی ابتدائی تصانیف میں ۱۲۷ قسم کے جراحی آلات سے کم نہیں مذکور ہوئے ہیں۔ وہ اپنی طب میں نجوم اور سحر سے بھی مدد لیا کرتے تھے اور سیارہ کی مخصوص منازل کا لحاظ رکھکر علاج کیا کرتے تھے۔ اسلامی تاریخوں سے تحقیق ہوا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں دو طبیب صالح اور منکہ نامی حاضر رہتے۔ جن کی اعانت سے مسلمانوں نے اپنی علمی پیاس بجھانے کی غرض سے سنسکرت کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

**علم تاریخ یا کالنی پورن ودیا** | ہندو ایک کامل دورہ کی مدت یعنی بید الشش سے فنا ہونے تک کے زمانہ کو کلپ کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام سہستر بھاگ بھی ہے کلپ کی تعداد چار ارب بتیس کروڑ برس بتائی گئی ہے۔ اس کی تقسیم یوں کی گئی ہے کہ اکہتر چترجگی کا ایک منوتر ہوتا ہے اس کے آخر میں ایک ست یگ کی برابر سندھی ہوتی ہے۔ پھر مع سندھی کے ایسے ہی ایسے چودہ منونتر شمار کیے جاتے ہیں اور ست یگ سا دینکلپ کے شروع میں پندرہ سندھی کہی جاتی ہیں پس اس طرح ہزار مہایگ تک دُنیا قائم رہتی ہے۔ یہ برھما کا ایک دن سمجھا جاتا ہے اور اسی کا نام کلپ ہے اسی کے برابر رات بھی سمجھنا چاہئے۔ اس شمار سے واضح و لائح ہوا کہ وید کے رشیوں نے چودہ حصے اور اپنی اصطلاح میں چودہ منوتر قرار دیے ہیں پھر ان چودہ منتروں میں سے ہر ایک منوتر کے اکہتر ٹکڑے کئے ہیں جن کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے یہاں یگوں کی تعداد بلحاظ سال کے مقرر کی گئی ہے۔ اول ست یگ۔ یہ سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار برس کا ہوتا ہے۔ دوسرا ترتیا یگ۔ بارہ لاکھ چھیانوے ہزار برس کا تیسرا

دواپریگ آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار کا۔ چوتھا کل یگ چار لاکھ بتیس ہزار برس کا غرضکہ چتر یگی مہایگ کی میزان تینتالیس لاکھ بیس ہزار برس کی محسوب ہوتی ہو۔ پھر اکہتر چتر یگی یا ایک منونتر کے تیس کرور تریسٹھ لاکھ بیس ہزار برس مقرر ہیں۔ پھر چودہ منونتر یا دو مہایگ سے چار ارب انتیس کرور تریسٹھ لاکھ بیس ہزار برس ہوتے ہیں۔ منونتروں کے بیچ میں جو سندھی ہوتی ہو اُس کے دو کرور اُنسٹھ لاکھ بیس ہزار برس شمار میں آتے ہیں پھر ۶ مہایگ اسنے گئے ہیں برابر ایک کلپ یا سہسر بھاگ یا ایک برہم دن کے جو چار ارب بتیس کرور برس کا قرار دیا گیا ہو!!

اب یہ بتایا جاتا ہو کہ اس مرتبہ دنیا کو پیدا ہوے کس قدر عرصہ گذرا۔ سو واضح رہے کہ اس مرتبہ دنیا کو پیدا ہوے چودہ منونتروں میں سے جن کا نام آگے چل کر بتایا جائیگا صرف چھ منونتر گذرے ہیں۔ اور یہ ساتواں (دیوسوت) منونتر گذر رہا ہو ان چودہ منونتروں کے نام یہ ہیں۔ سوایمبھو، سوارچش، اُتم، تامس، ریوت، چاکشش، دیوسوت، ساورنی، دکش ساورنی، برہم ساورنی، دھرم ساورنی، رودر ساورنی، دیو ساورنی، چندر ساورنی، یہ ساتواں دیوسوت منونتر ہو جسکا اٹھائیسواں کل جگ اب موجود ہو۔ علاوہ ازیں کل جگ کے چار چرن یعنی چار حصے ہیں جن میں سے یہ پہلا حصہ گذر رہا ہو۔ کل جگ کی تعداد چار لاکھ بتیس ہزار برس رکھی گئی ہو، یہ پہلا چوتھائی حصہ ہو جسمیں سے ۵۰۰۹ سال منقضی ہو چکے ہیں اور ابھی ایک لاکھ دو ہزار نو سو اکیانوے برس باقی ہیں۔ اس کے تمام ہونے پر دوسرا چرن شروع ہوگا۔ مختصر یہ کہ ہندوؤں کے حساب سے زمین کی پیدائش کو ایک ارب ۵٦ کرور ۰ لاکھ ۵۳ ہزار چھیاسٹھ سال ہوے ہیں!!!

پرانوں کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہو کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے دو برابر کے سلسلے یعنی سورج بنسی اور چندر بنسی اجودھیا اور گنگا جمنا کی سرزمین میں جُدا جُدا راج کرتے چلے آتے تھے پھر مہابھارت کے خاتمے پر سہدیو مگدھ کا راجہ ہوا اُس سے پینتیسویں پشت میں اجات سترو نے راج کیا۔ اسی زمانہ میں ساکھیا یا گوتم بدھ مذہب کے بانی اس قالب عنصری میں اپنے کرشمے دکھا رہے تھے اجات سترو سے چھٹا راجہ نند امسند حکومت پر بیٹھا۔ اس سے نواں راجہ چندر گپت ہوا اور اس کے بعد تیسرا راجہ اسوک گذرا۔ یہ راجہ بدھ مذہب کا بہت بڑا حامی تھا۔ اس کی شہرت تمام ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان خاندانوں کے ختم ہونے پر اندھرا خاندان نے حکومت کا رنگ جمایا پھر گپتا خاندان

مگدھ میں قایم ہوا۔ اور اسی طرح رفتہ رفتہ ہندو راج پاٹ کا خاتمہ ہوگیا۔

علم جغرافیہ یا بھوگول ودیا | **ہندوؤں** نے بہ نسبت اور علوم کے جغرافیہ میں بہت کم ترقی کی تھی جس حد تک وہ ریاضی اور فلسفے میں بڑھے ہوئے تھے اسی قدر وہ جغرافیہ میں گھٹے ہوئے تھے اُن کے نظام ارضی کی روسے میرو کا پہاڑ گویا دنیا کے مرکز پر واقع ہی۔ یہ ایک مخروطی شکل کا بلند پہاڑ کہا جاتا ہو اسکے اطراف قیمتی پتھروں سے تعمیر کیئے ہوئے ہیں۔ اس کی چوٹی پر زمین کی بہشت بنی ہو یہ ہندوستان کے شمال میں اونچے اونچے پہاڑوں کے نزدیک بیان کیا جاتا ہو لیکن یہ اُن پہاڑوں کے سلسلہ کا کوئی حصہ نہیں ہو نہ اُن لوگوں کے تصور میں جو دیوتاؤں کے علم سے واقف تھے **اس** کا خارجی وجود محسوس ہوتا تھا۔ یہ زمین کے سات ہم مرکز منطقوں یا محیطوں سے گھرا ہوا ہو جو سات سمندروں کے ذریعہ سے تقسیم ہوئے ہیں۔

**ان** منطقوں یا دائروں کا سب سے اندرونی منطقہ جمبودیپ کہلاتا ہو جو شامل ہو ہندوستان کو اور آب شور کے سمندر سے محصور ہو۔

**باقی** کے چھ منطقے دودھ۔ شراب۔ رس وغیرہ سمندروں کے باعث ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔

**جمبودیپ** کا نام تو کبھی ہندوستان ہی سے منسوب کیا جاتا ہو اور کبھی وہ بھارت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہو۔

۴۱

**ہندوؤں** کی قدیم کتابوں میں ہندوستان کی قسمتیں جو ازروے جغرافیہ کی گئی ہیں پائی جاتی ہیں اور اُن کے شہروں اور پہاڑوں اور دریاؤں کی فہرستیں بھی موجود ہیں اگرچہ اُن کی ترتیب غیر مربوط و نادرست ہو تاہم اُس سے اکثر زمانۂ حال کے مشہور شہروں اور قدرتی بناوٹوں کا پتہ چل سکتا ہو۔

**لیکن** اُن کے جغرافیہ میں ہندوستان کے اُدھر ایسا اندھیرا چھایا ہوا ہو جس کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے جغرافیہ داں ہر طرف ٹٹولتے پھرتے ہیں اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

# حکیم سقراط

(۱)

فلسفۂ اخلاق کا یہ معلم اول جناب مسیح کی ولادت میں ابھی چار سو ستر سال کی مدت باقی تھی کہ مدینۃ الحکما، اثینا، کے ایک غریب گھرانے مین پیدا ہوا۔ باپ، سافرانکس، پیشۂ سنگ تراشی سے بسر اوقات کرتا تھا، اور ماں، فیناریت، پیشۂ قبالت سے نادار شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

بچپن اور آغاز شباب، حکیم کی زندگی کے یہ دونوں زمانے اثینا کے اُس زریں عہد میں گذرے، جبکہ پرکلیس جیسا آتش بیان، بالغ نظر اور اولو العزم ماہر سیاست اپنی حسن و تدبیر علوے ہمت کے جوہر دکھا رہا تھا۔

**تعلیم** | حکیم کے بچپن کے حالات تفصیل کے ساتھ نہیں معلوم تاریخ سے اتنا پتہ چلتا ہو سافرانکس نے اثینوں کی دستور کے مطابق بیٹے کو اتنی تعلیم ضرور دلوائی تھی جس قدر اُس عہد کے ایک معمولی اثینوی شہری کے لیئے لازمی خیال کی جاتی تھی، حکیم کے بعض سوانح نگاروں کے بیانات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ یونانی علوم و فنون کے اکثر شعبوں میں اُسے دستگاہ وافر حاصل تھی، مگر یہ تیقن کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ حکیم نے بچپن ہی میں اپنے تئیں ان علوم سے آراستہ کیا یا آگے چل کر اُن کی جانب توجہ کی۔

حکیم نے اپنا آبائی پیشہ بھی سیکھا تھا۔ اور اپنی دنیوی زندگی کی ابتدائی چند منزلیں اسی صناعت کے سہارے سے طے کریں۔ مگر افتاد طبع سے مجبور تھا، یہ راہ دل کو نہ بھائی، اور بہت جلد اس سے الگ ہونا پڑا۔

**حالات عصریہ** | حکیم کی عام سیرت اور اُس کے مخصوص خط و خال کے تفصیلی بیان سے پہلے حالات عصریہ کا ایک مختصر سا خاکہ پیشکش کر دینا بیجا نہ ہوگا، کہ اُس کی روشنی مین حکیم کے خصائص اخلاق کے بعض امتیازی پہلو اور اُس کے عدیم المثیل نظام فلسفہ کی بعض نمایاں خصوصیتیں بڑی وضاحت و صفائی کے ساتھ نظر آئیں گی۔

یونانی سورماؤں کی سرفروشیاں، دارا ئے عجم کی ٹڈی دل فوجوں کا منھ پھیر چکی ہیں، اتحاد نسلی و ملی کا جوش ہر قلب کو گرما رہا ہے، اتھینا جو اس قیامت زا طوفان کی پر خطر موجوں سے سفینۂ ملت کو سالم و غانم بچا لایا ہے، منتشر یونانیوں کی مختلف الالوان فکری تحریکات کا مرکز ثقل بنا ہوا ہے۔ فوجی و سیاسی قیادت کے ساتھ، علمی و ادبی سیادت کا تاج بھی اسی کی جبین ناز پر چمک رہا ہے۔ پرتعلیس کی بلند نظر ہنر نوازیاں ارباب کمال کو ہر سمت سے سمیٹ رہی ہیں، فیڈیاس، میران، و پالیکلیٹس جیسے یگانۂ روزگار ارباب ہنر کی صناعیاں۔ اتھینا کے معابد و معاہد عامہ، کو صورت تراشی کے اُن ناقابل تقلید نمونوں سے سجا رہی ہیں، جو صدیوں تک دیکھنے والوں کو عہد پرتعلیس کی عظمت و جلالت کے افسانے سناتی رہیں گی، اپالوڈورس زیاکسیس و پارسیاس، کی سحر کار شبک دستیاں، تصویر کشی کے وہ کمالات دکھا رہی ہیں، محاسن فطرت کی نقاشی کی جن سے بہتر مثالیں سرزمین یونان کی آغوش میں اب شاذ و نادر ہی نظر آئیں گی،

اسکیلس کی قدرت بیان، معبودوں کی رفعت شان، اُن کی ہمہ گیر سطوت و اقتدار اُن کی مطلق العنان و غیر مسئول فرمانفرمائی، اُن کی غیر محدود قوت انتظام و تعذیب اُن کے فیصلوں کی ناقابل تردید قطعیت، نوع بشری کی زیردستی کوتاہ نظری، اور اُس کے اعمال و افعال کی جزا و سزا کے ساتھ ایک ناگسل وابستگی کا سماں جس خروش طوفان آور کے ساتھ اہل اتھینا کو دکھا رہی ہے۔ یونان کی ادبی تاریخ اس کی نظیر اب نہ پیش کر سکے گی۔ سافاکلیس بھی اسی معمورہ غم کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ مگر اک انداز نو کے ساتھ، اس خدائے سخن کی ٹریجڈیز میں، کرختگی کی جگہ نرمی و نزاکت نے، سادگی کی جگہ شیریں ادائی نے، غضبناک و سنگدل معبودوں کی جگہ مہربان و رحم دل دیوتاؤں نے، اور خوف بھری خدا پرستی کی جگہ محبت آمیز تسلیم و رضا نے لے لی ہے۔

یوری پائیڈلیس بھی اس عہد کا ایک نامور ٹریجڈی نویس ہے جو روش عام سے کترا کر چلتا ہوا اور نئی آن سے اسٹیج پر آتا ہے، لب و لہجہ میں نہ وہ بلندی و شکوہ ہے جو اس کے پیشروؤں کا طغرائے امتیاز تھی، اور نہ وہ مذہبیت و شان تقدس، مگر اپنے عہد کی حیات عمرانی اور عام افکار کی امتیازی خصوصیتوں کی آئینہ داری بڑی ثروت نگاہی کے ساتھ کرتا ہے۔ ایمان و اعتقاد

کی جگہ الحاد و تشکیک کا اندھیرا نظر آتا ہو۔ اور اخلاص عمل کی پوری افادیت وغرضمندی سے مغلوبیت سے مغلوب ہوا چاہتی ہو۔

آرسٹوفانیس اس عہد کا مشہور کمیڈی نولیس ہو اُس کی قدامت پرستی ہر مذرت طرازی و اختراع کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھ رہی ہو۔ کبھی وہ قدیم کیش و آئین کی خوبیوں کی موت پر سینہ کوبی کرتا ہو، اور کبھی دورجدید کے ہر طرز نو کی مٹی خراب کرنے پر اتراتا ہو۔

اِس زمانہ کے نامور مورخ، ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائیڈلیس ہیں۔ اول الذکر کی تحریر گو جذبۂ قدامت پسندی کی رنگ آمیزیوں سے یکسر پاک نہیں، تاہم اپنے عہد کی نئی روح کی گرمی سے بہت کچھ متاثر نظر آتی ہو۔ معجزات و خوارق کو اُس میں جگہ ضرور ملی ہو، مگر نظر و تفکر، عقلیت و تشکیک کی مثالیں بھی سرے سے نایاب نہیں۔

موخرالذکر سرتاسر مقتضیات عصریہ کے سانچے میں ڈھلا نظر آتا ہو، اس کی باریک نگاہیں ایک نکتہ سنج مورخ کی شان سے اکارگاہ عالم میں سلسلۂ علت و معلول کا سراغ لگانا چاہتی ہیں وہ جانتا ہو کہ فطرت بشری کی ساخت ہی کچھ اس ڈھنگ کی واقع ہوئی ہو، کہ جماعات کی فلاح کیلیے مذہب کا وجود ضروری ہو۔ مگر واقعات و حوادث کی توجیہ و تکشیف کی بنا معجزات و خوارق پرکیوں قائم کی جائے؟ ضوابط اخلاق کا ازبس ضروری ہونا بھی اُس کی نظروں سے مخفی نہیں، مگر اُن کی بنیاد تمامتر معبودوں کے جوشِ انتقام یا اُن کے جذبۂ نیک پروری پرکیوں رکھی جائے؟ تھوسی ڈائیڈلیس اپنے عہد کے مفاسد و محاسن کی مصوری جس صحت و خوبی کے ساتھ کرتا ہو، اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

فلسفہ و سائنس کی نوعیت و ارتقاء کا مفصل بیان اِس مضمون کے دوسرے حصہ میں آئے گا، اس مقام پر ایک سرسری نظر پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ارباب فلسفہ و سائنس کی نگاہیں ابتک کائنات عالم کے عناصر ترکیبی اور اُن کے ضوابط امتزاج کے اکتشاف و اختبار میں مصروف کار تھیں، اور نفس انسانی کی سرشت، اُس کے ارتقاء اور اُس کے پراسرار طریق کار کے کشف و توضیح کی طرف کسی کے قدم نہ تھے، اعیانِ مرئیۂ ذواتِ مادیہ پر تو ارباب فکر کی نظریں پڑ رہی تھیں، مگر تصورات جامعہ و مفاہیم کلیۂ تعریفات عامۂ حدود تامہ

کے اخذ و تشکیل کی جانب کسی کی توجہ نہ تھی۔ مادیات کے ساتھ اس سرگرم اعتنا کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو اخلاقیات سے کسی کو کچھ سروکار نہ رہا۔ اور دوسری جانب مذہب کا احترام دلوں سے اُٹھ گیا، اور روایات مذہبی کی وقعت و قیمت افسانوں سے بھی فروتر سمجھی جانے لگی۔ آزادی و حُریت کا یہ سیلاب طوفان خیز یہیں نہیں رُک جاتا، آگے بڑھتا ہے، اور قوانین حکومت کا پاس و لحاظ بھی اپنے ساتھ بہالیجاتا ہے۔ اب مادیت اپنا گلا آپ گھونٹتی ہے؛ آداب و مراسم اخلاق کا استیصال کر چکی، احکام و روایات مذہب کا مضحکہ اُڑا چکی، ضوابط سلطنت کی جی بھر کے مٹی خراب کر چکی گر، کہ کرو ونہ یافت ہے، تشکیک سفسطہ کا لباس پہنکر آتی ہے اور ارباب سائنس کے باہم متصادم و متضاد نظریات کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے" بھلا یہ تھی مغز مدعیان علم اسرار کائنات کا کیا کھوج لگائیں گے؟ اُن کی ژولیدہ ہمائی دیکھیئے؛ اپنی اپنی بولیاں سب بول رہے ہیں، مگر امر حق کسی پر روشن نہیں ہوتا۔ اور سچ پوچھیئے تو ہماری نگاہیں اتنی تیز ہی نہیں جو سطح کو نفوذ کر جائیں اور حقائق عالیہ کو براے العین دیکھ لیں۔ ظواہر پر ہمیں قناعت کرنی چاہیئے۔ اور جستجوے حقیقت کا سودا اپنے سر سے نکال ڈالنا چاہیئے"۔ مگر ان آفات فکری و اخلاقی کے نرغے میں گھرا ہوا دیکھ کر، یونانی دماغ کی نسبت ہمیں یہ نتیجہ نہ نکال لینا چاہیئے کہ نوع بشری کے ارتقاء ذہنی کے عرصے پایاں میں اب کبھی اس کا نام و نشان بھی نظر نہ آئے گا۔ اس کے بالکل برعکس، وہ اپنے تئیں ان عظیم الشان مساعی کے لیے تیار کر رہا ہے جو بارگاہ فلسفہ و سائنس میں اُسے مسند اولیت پر جگہ دلائیں گے۔ الحاد و تشکیک کی گرم بازاری ضرور ہے مگر دلوں کو سکون نہیں فضائل اخلاق پر لاریب بے اعتباری کی نگاہیں پڑ رہی ہیں۔ مگر جذبات کی بے قید سیری لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتی، ایک طرف تو اکتساب علم کی وہ آتش شوق جو ازل سے روح انسانی کو گرمی حیات بخش رہی تھی، نئے جوش کے ساتھ بھڑکنا چاہتی تھی، اور دوسری جانب وہ فضائلے اخلاق، جو نوع بشری کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے از سر نو اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، اب ضرورت ہے ایک ایسے زمانہ سنج و نکتہ رس فلسفی کی جو اس کشمکش افکار و معتقدات کے علل و اسباب کو سمجھکر، سائنس و مذہب، سیاست و اخلاق کی عمارتیں نئی بنیادوں پر قائم کرے، علم و فلسفہ کی فضا کو وسعت دے، اور مذہب و اخلاق کی بنا علم و حکمت پر رکھے؛ کارکنان قضا و قدر نے سقراط کو ایک باریک نگاہ، دقیقہ رس، و صحیح الفکر دماغ دے کر بھیجا

کہ وہ اِس عظیم الشان خدمت کو انجام دے

**حلیہ** کوتاہ قامت، فربہ گردن، آنکھیں بڑی اور اُبھری ہوئی، ناک چوڑی اور بیٹھی ہوئی، نتھنے پھولے ہوئے، دہانہ پھیلا ہوا، ہونٹ موٹے، پیٹ آگے کو نکلا ہوا، یہ ہیں خصائص صوری اس انسان کے جس کی قسمت میں ازل سے مملکتِ فکر کی تاجداری و فرمان فرمائی لکھی تھی! شہوت پرستی کے ان روشن معالم کو دیکھ کر، کون باور کر سکتا تھا کہ فلسفہ اخلاق کی بنیاد اسی شخص کے ہاتھوں پڑنے والی ہے؟

**سیرت** حکیم تنومند، قوی جثہ، اور غایت درجہ متحمل و بلاکش واقع ہوا تھا جس فوق عادت عزم و ثبات، صبر و استقلال کے ساتھ وہ عرصۂ کارزار کی صعوبتوں کا مقابلہ کرتا، اُسے دیکھ کر اُس کے رفقا محو حیرت رہ جاتے، اور بعض تو اس خیال سے الم یاب بھی ہوتے کہ حکیم اپنی اس پامردی و قوت تحمل کے اظہار سے ہماری بے صبری اور بودے پن کا مضحکہ اُڑانا چاہتا ہے۔ حکیم کی قوت تحمل کا یہ عالم تھا کہ شدید سے شدید موسمی تغیرات بھی اُس کے عام انداز معیشت پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے۔ جو لباس وہ گرمیوں میں پہنتا، وہی ایام سرما میں بھی زیب تن رہتا؛ چاہے ایام گرما میں حرارت آفتاب سے زمین گرم ہو اور خواہ جاڑوں میں، شدت برد سے برف پوش، حکیم ہمیشہ برہنہ پا رہتا؛

غذا ہمیشہ سادہ اور مقدار میں تھوڑی کھاتا۔ شراب سے احتراز کرتا۔ اور اُن تمدن زائیدہ ذمائم اخلاق سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھتا، جو اُس کی عہد لطیف و شائستہ ایتھنز کی زندگی کے اجزا غیر منفک سے ہو گئے تھے۔

سقراط، گو اپنے عہد کے مذہب مروج کے بہت سے بیہودہ و پادر ہوا افسانوں سے یکسر منکر تھا، تاہم اُن آداب و ضوابط مذہبی کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کرتا جو کسی اصول اخلاق کے صریح خلاف نہ ہوتے۔

حکیم کا افلاس اُس کی مسرت آگیں قناعت، و سیر چشم خود اطمینانی کی پُر سکون سطح کو قطرہ برابر بھی ناہموار نہ کر سکتا۔ حکیم کی منازل حیات کا مشعل راہ، تمام تر یہ بلند نظر خیال تھا کہ حیات انسانی کی غایت الغایات، نفس بشری کی تطہیر و تکمیل ہے؛ اور اس رفیع الشان مقصد کے حصول کے لئے

لازمی ہو کہ انسان اپنے تئیں مادّی ضروریات کے بندِ اسیری سے الی حدالامکان آزاد رکھے۔ اس اصولِ عالی کے ہمہ گیر اثر نے خانگی امور کے نظم و اصلاح کی طرف سے حکیم کو اِس قدر بے پروا کر دیا تھا کہ اس کا بار تمامتر اُس کی بیوی غریب زانتھی پے کو اُٹھانا پڑتا۔ زانتھی پے خلقۃً تیز مزاج واقع ہوئی تھی، اور اُس پر اہل و عیال کی طرف مفلس شوہر کی یہ ناگوار بے اعتنائی۔ تنگ آکر اکثر حکیم سے دست و گریباں ہو جاتی، اور جی بھر کے صلواتیں سناتی، مگر وہ دم بخود سُنتا۔ اور سُن کر پی جاتا۔ اور اپنے دوستوں سے کہا کرتا کہ "چونکہ میری خواہش یہ ہو کہ میں اپنی زندگی اپنے ہموطنوں سے بحث و مکالمہ میں گذاردں، اس لیے عمداً میں نے اِس آتش خو عورت سے شادی کی ہو کہ اگر اس کی تیغ زبان کے جبر کے برداشت کر گیا، تو پھر اوروں کے لعن طعن، سب و شتم کی مجھے کچھ پروا نہ ہو گی۔"

یوں تو نوعِ بشری کا وہ کون فرد ہو جس کا دل خاکِ وطن کی محبت سے لذت آشنا نہیں مگر حکیم کو اپنے زاد بوم "اثینا" سے جو انس تھا، اُس کی نظیر بہت پرستارانِ وطن کی تاریخ میں خال خال ہی نظر آتی ہو؛ تمام عمر میں اُس نے تین یا چار دفعہ سے زیادہ اثینا کے حدود سے باہر قدم نہیں رکھا؛ اور وہ بھی سیر و سیاحت کی غرض سے نہیں؛ بلکہ اپنے اُسی جذبۂ وطن پرستی سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ تھا، مگر حکیم کا دامنِ اخلاق تنگ نظری و پست حوصلگی کے دھبّوں سے پاک تھا، اور اُس کی فضائے ہمدردی بے حد وسیع تھی،

حکیم کو اپنے رفقا سے غایت درجہ الفت تھی، مگر وہ اُن کی اخلاقی کمزوریوں اور فکری لغزشوں سے کبھی اغماض نہ کرتا۔ جادۂ اخلاق پر قدم جمائے رکھنے کی اُنھیں تاکید کرتا، اور اپنی دنیوی معاملات میں بھی انھیں معقول و برمحل مشورے دیتا۔ حکیم اپنے دوستوں کی ذہنی تربیت پر بہت زور دیتا کہ اُس کے نزدیک اخلاقی لغزشیں تمامتر عکوس ہوتی ہیں امراضِ فکری کا،

اس انس و محبت کے صلہ میں حکیم کے رفقا بھی اس کا بڑا احترام کرتے اور اسے اپنا رہبر و معتمد جانتے۔

سقراط تمام عمر سیاساتِ مُلک سے کنارہ کش رہا، اُس کے جذبۂ وطن پرستی کو دیکھتے وہ ظاہر بین نظریں جو سطح سے نیچے اُترنا نہیں جانتیں، ضرور اس تناقضِ عملی سے حیرت میں

آجائیں گی۔ مگر امعانِ نظر سے دیکھئے تو یہی واقعہ حکیم کے سچے حب وطن پر شاہد قوی ہے۔ سقراط جیسے سحربیان خطیب وحقیقت آگاہ نباض فطرت کے لیے اہلِ ایتھنا جیسی زود انفعال و متلون مزاج طبع جماعت کی قیادت سے متمتع وبہرہ اندوز ہونا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر ایک طرف تو وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ایتھنا کے معاشرتی اسقام وسیاسی امراض کی علت اولی ابنائے وطن کی ذہنی و اخلاقی پستی و بے بضاعتی ہے، اور دوسری جانب یہ المناک سما بھی اُس کے پیش نظر تھا کہ جس کسی نے بھی سیاسیات ملک میں ہاتھ ڈالا، مقتضیات عصریہ سے مجبور ہو کر اُسے ضوابط و اخلاق کو خیرباد کہنا پڑی، اب اگر سقراط سیاسی معاملات میں دراندازہوتا، تو اول اُسے اپنی زندگی کے اُس وحید مقصد سے ہاتھ اٹھالینا پڑتا جسے وہ ابنائے وطن کی فلاح کے لیئے ازبس ضروری جانتا تھا، اور دوسرے، اسے اپنے قواعد اخلاق بھی اہل ایتھنا کی ہوس سیئون کی ناپاک قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دینا پڑتے، لیکن حکیم نہ اپنے اصول اخلاق کو شکست ہوتے دیکھ سکتا تھا اور نہ اپنے ہموطنوں کی علمی واخلاقی تربیت کی طرف سے، کہ مفاسد عصریۂ وطنیہ کا علاج وحید تھی، پل بھر کے لیئے بھی غفلت برت سکتا تھا۔

**خصائص عقلی** حکیم کے خصائص ذہنی کی فہرست میں سرعنوان اس کا فوق عادت محیرالعقول ملکۂ زمانہ شناسی ہے۔ اپنے عہد کے حوائج ومصالح کا جسقدر صحیح اندازہ حکیم نے لگایا، اس کی نظیر اکابر قائدین عالم کی تاریخ بھی مشکل سے پیش کر سکے گی۔ طبیعات وما بعد الطبیعات کی طرف سے صرف نظر کر کے، تمام تر اخلاقیات پر زور دینا، حکیم کی زمانہ سنجی وفطرت شناسی پر شاہد وقاطع ہے۔

جدت ذہن، تیزی فکر، دقت نظر، قوت تخئیل زوراستدلال، حاضردماغی سقراط کے خصائص عقلی کے نمایاں خط وخال ہیں۔ کبھی کبھی وہ مراقبہ ومکاشفہ میں بھی اسطرح ڈوبا ہوا نظر آتا کہ اُسے اپنے آپ تک کی خبر نہ ہوتی۔

حکیم کی نظری خصوصیات کے بیان میں اُس کی پرجوش وقوی مذہبیت اور اُس کی تحیرخیز "صدائے غیبی" کا مختصر تذکرہ ناموزوں نہ ہوگا۔

**صدائے غیبی** سقراط اپنی زندگی کے ذی شان ونازک مواقع پر ایک آواز غیبی سنا کرتا جو اُسے اُس مخصوص راہ کار سے روک دیتی جسے وہ اختیار کرنے والا ہوتا۔ اِس آواز غیبی کے ارشادات ہمیشہ

سلبی ہوتے، یعنی وہ بعض اعمال سے محترز رہنے کی ہدایت تو ضرور کرتے، مگر کسی خاص طریق عمل کے اختیار کرنے پر کبھی زور نہ دیتے۔ زنافان بیان کرتا ہو کہ جب کسی موقع پر یہ آواز نہ سنائی دیتی تو حکیم اس سکوت کو معبودوں کی رضا کی علامت سمجھتا۔

اب اس صدائے غیبی کی تشریح و توجیہ میں حکیم کے سوانح نگاروں و مورخین فلسفہ کی کئی ٹکڑیاں ہوگئی ہیں۔ کوئی اس سے حکیم کی توہم پرستی و اختلال حواس پر استدلال کرتا ہو اور کوئی اسے ضمیر یا حس باطنی کا صرف ایک مظہر قرار دیتا ہو مگر ڈاکٹر زیلر اور اُن کے ہمنواؤں کی توجیہ پسندیدہ و قرین قیاس معلوم ہوتی ہو۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ "آوازِ غیبی" سقراط کی فوق عادت "اندازہ دانی کی بے حد وسیع اور اُسی کے ساتھ اتنی ہی دقیق قوت" کا ایک کرشمہ تھی، اور بس، اس ملکۂ اندازشناسی وانجام اندیشی کو حکیم نے اس قدر ترقی دے لی تھی، اور حالات ماحول کا اندازہ وہ اس تیزی وصحت کے ساتھ لگا لیتا تھا، اور افعال و اعمال کے عواقب و نتائج........ اس وضاحت و صفائی کے ساتھ قبل از وقوع اُس کے پیش نظر ہو جاتے تھے کہ وہ اپنی اس محیر العقول و بے خطا انجام بینی و اندازہ سنجی کی، بجز اس کے، کہ یہ ایک الہام ربانی ہو، اور کوئی توجیہ نہ کر سکا۔

**مذہبیت** لڑکپن ہی سے حکیم کے دل میں یہ خیال جاگزین تھا کہ وہ مادر وطن کی کوئی بڑی ہی اہم خدمت انجام دینے کے لئے خلق ہوا ہو، اور جوں جوں یہ منظر روشنی میں آتا گیا کہ اس کے مشورے اُس کے اتباع و احباب کے حق میں بہرصورت مفید ہوتے ہیں، اُس کے اس خیال کو تقویت ہوتی گئی۔ حکیم کا یہ اعتقاد روز بروز زور پکڑتا جاتا تھا کہ ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے اس پر تقدس و مذہبیت کا رنگ و روغن چڑھا کر اُسے اور بھی چمکا دیا۔ حکیم کے ایک گرمجوش پرستار، کیرے فان کے سوال پر ڈولفیا کے "دار الکہانت" سے یہ اعلان صادر ہوا کہ "سقراط اس عہد کا دانا ترین شخص ہو" حکیم اس جواب کو سُن کر حیرت میں آگیا، کہ اپنی کائنات علم سے وہ اچھی طرح باخبر تھا جب اس جملے کے معنی اُس کی سمجھ میں نہ آئے، تو اُس نے اثینا کے مشہور ارباب سیاست، شعراء و معلمین سے ملنا شروع کیا۔ ان اکابر زمانہ سے بحث و گفتگو کے بعد فوراً ہی اُسے نظر آگیا کہ جس علم و کمال کے یہ لوگ حصہ دار بتائے جاتے ہیں، اُس کی حقیقت "جہل مرکب" کے سوا کچھ نہیں، اور یہ کہ جہالت و بے علمی میں یہ مدعیان کمال اس کے ہمرتبہ ہیں، فرق صرف اس قدر ہو کہ اسے اپنی جہالت و

ہیچمدانی کا علم ہو اور یہ اس سے بھی بے خبر ہیں۔ اب حکیم نے ڈلفیا کے اعلان کے یہ معنی لگائے کہ در پردہ معبود ایتھنا کی طرف سے مجھے یہ ارشاد ہوا ہو کہ میں اپنے ہموطنوں کو ان کی علمی بے بضاعتی کا یقین دلادؤں، اور اُن کے دل میں جستجوے حقیقت کا سچا ذوق پیدا کردوں۔

سقراط کی زندگی سر تا سر اسی قوی اعتقاد سے متاثر نظر آتی ہو؛ اور دم تسلیم تک وہ اپنے تئیں مامور من اللہ سمجھتا رہا۔

**تصویر کا دوسرا رُخ** حکیم کے فضائل اخلاق کا جو دلکش و تقدس آب مرقع ناظرین کے پیش نظر ہو، اُسے دیکھ کر وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ سقراط، سیرتِ بشری کے متعلق، اُس ہمہ گیر کلیہ سے مستثنیٰ ہو جو ہمیں یہ بتاتا ہو کہ نفس انسانی کے مظاہر میں یکرنگی و یکسانیت کی جستجو، ایک سعی بے حاصل ہو،

کبھی کبھی، اور بالخصوص ملکی و مذہبی اعیاد کے مواقع پر، حکیم ہمیں ان ضوابط اخلاق سے کیسر آزاد نظر آتا ہو جن کی وہ اپنے متبعین کو تعلیم دیا کرتا تھا۔ مگر اس مقام پر ہمیں دو باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے۔ اول یہ کہ حکیم کی عشرت پرستی و آوارہ مزاجی کی جس قدر روایتیں بیان کی جاتی ہیں، ان میں حصہ غالب کا راوی آرسٹاکسنیس ہو، جو مورخین کے حلقہ میں بڑی بے اعتباری کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو؛ اس نے سقراط اور اس کی تعلیمات کے متعلق ایسی بے بنیاد و بے پادر ہوا باتیں بیان کی ہیں جو کسی صورت نہیں باور کی جاسکتیں۔ دوسرے یہ کہ ضبط نفس و اعتدال عمل کا جو تخئیل حکیم کے ذہن میں قائم تھا، وہ اُس سے بالکل مختلف تھا جو آگے چل کر کلبیین کے نظام اخلاق کا حجرِ اساسی قرار پایا۔ جذباتِ التذاذ و خواہشات نفس کا ایک اسیر بے پناہ ہوجانا سقراط اس سے ضرور بیزار تھا، مگر اب ہر نوع کے لذائذ و نعائم سے یکسر دائماً مجتنب رہنا اور پہاڑوں کے دروں میں وحوش و بہائم کی سی زندگی بسر کرنا؟ تو وہ اس کا بھی روادار نہ تھا۔ اور پھر یہ ایک مُسلم اخلاقیاتی حقیقت ہو کہ معیار اخلاق ہمیشہ بدلتا رہتا ہو؛ آج جن عوائد اخلاقیہ کو ہم نفرت و تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ اب سے دو ہزار برس پیشتر وہ چنداں قابل نفریں نہ سمجھے جاتے رہے ہوں؟

**حکیم کا مشن اور اُسکا عام انداز معیشت** حکیم نے اپنے آبائی پیشۂ بُت تراشی کو کب خیرباد کہی، قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ فلسفہ کا چسکا اُسے

بروشباب ہی سے تھا۔ ڈلفیا کے دار الکہانت سے کیرے فان کو جو جواب ملا، سمندِ طبع پر ایک اور تازیانہ ہوا۔

اب حکیم ہمہ تن وطن کی خدمت میں منہمک تھا۔ اندھیرے ہی منھ وہ ایتھنا کی عام شاہراہوں درسگاہوں، بازاروں، نزہت گاہوں اور دیگر معاہد معاشری میں نظر آتا، اور جو کوئی بھی اُسے مل جاتا، بے تکلف اُس سے گفتگو کرتا؛ امیر، غریب تعلیم یافتہ، ناتعلیم یافتہ، ارباب سیاست، شعرا، اہلِ صناعت، فوجی، اُس کے لیے سب یکساں تھے؛ اور تو اور، وہ ان عورتوں سے بھی ملنے میں تکلف نہ کرتا، جو اپنے حسن وجمال یا اپنی علمی وادبی قابلیتوں کے لیے مشہور تھیں۔ موضوع کی کوئی قید نہ تھی، مگر معمولی سے معمولی، اور مبتذل سے مبتذل مباحث کا رُخ بھی وہ فلسفۂ وقواعدِ اخلاق کی طرف پھیر دیتا، اور چند ہی لمحوں کے بعد سُننے والوں کو نظر آنے لگتا، کہ سقراط کا مخاطب اب تک اپنے تئیں جن علوم کا مالک سمجھ رہا تھا اُن کی وہ ابجد بھی نہیں جانتا۔ سقراط کی بے رحم ناقدانہ موشگافیوں نے ایتھنا کے مدعیانِ فضل وکمال کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر لوگ اور بھی اُس کے دشمن ہو رہے تھے، کہ جہاں وہ اوروں کی بے علمی و جہالت کا راز طشت از بام کر دیتا ہے، وہاں وہ اپنے آپ کو، اپنی بے خبری و ہیچ مدانی کے بیجا یا نہ اعتراف سے، دوسروں کی تضحیک وتحقیر کا نشانہ نہیں بننے دیتا۔ حکیم کے اس جہاں سے نرالے اندازِ گفتگو نے بہت سے لوگوں کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ اُس کا واحد مطمحِ نظر اپنے ہمعصر علما کی تذلیل وتضحیک کے سوا کچھ نہیں۔ اِس خیال کو اِس سے اور بھی تقویت ہوتی کہ سقراط دوسروں کے افکار وتصورات پر تو نقد وامتحان کی روشنی ڈالتا۔ مگر خود کسی مسئلہ کی توضیح و تشریح شاذ ونادر ہی کرتا۔

مگر کیا ہمیں باور کر لینا چاہیے کہ سقراط کا بار بار اپنی بے علمی کا علیٰ رُؤس الاشہاد اعتراف کرنا تصنع محض تھا؟ نظر وتفکر اِس کی اجازت نہیں دیتا۔ حکیم کا یہ اعتراف بے علمی پیدا وار تھا علم کے اُس عظیم الشان وسیع تخیل کا جو اُس کے پیش نظر متمثل تھا۔ علم کے اِس ہمہ گیر مفہوم کے سامنے، حکیم اپنی کائنات علم واقعۃً لاعلمی کے برابر سمجھتا تھا، اور پھر، وہ اُس سے اپنے ابنائے وطن کے یہ بھی ذہن نشیں کرا دینا چاہتا تھا کہ اِن لوگوں نے علم کا جو تخیل اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے وہ

نظر و انتقاد کی خفیف سی خفیف روشنی کا بھی تحمل نہیں کرسکتا۔ وہ اس حقیقت کو بھی بے نقاب اُن کے روبرو پیش کرنا چاہتا تھا کہ ہمیں اکتساب علم کے لئے، خزانۂ فطرت سے جو شاعر ملے ہیں، عام اس سے کہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، اُن کی تگاپو کا دائرہ نہایت ہی محدود ہے" اِس وہ ایک نادان سبق آموز دانائی تھا، ہاں، وہ ایک تشنہ لب جویائے حقیقت تھا، اور یاران وطن کو بھی اُسی شاہراہ پر لگانا چاہتا تھا۔ وہ راستہ کے خطروں سے باخبر تھا، مگر منزل رسی سے مایوس نہ تھا

(باقی)

محمد عبد المجید

# "محسوسات حکیمانہ"

## از جناب منشی شبیر حسن خان صاحب جوشؔ رئیس ملیح آباد لکھنؤ

(۱)

زندگی کہتی ہے" غافل! میں فنا کا باب ہوں"　چھیڑتے ہیں ساز غم جس سے میں وہ مضراب ہوں"
"عافیت سے دور رکھتی ہوں، اذیت سے قریب"　"منتشر با دل کا سایہ ہوں، پریشاں خواب ہوں"!!!

(۲)

ڈر دُنیا سے" بے شرمی پہ یہ مجبور کرتی ہے　خرد کے آئینے کو دوست بن کر چور کرتی ہے
امیدوں کو نیا کرتی ہے، کُہنہ جسم انساں کو　فنا کے پاس لاتی ہے، خدا سے دور کرتی ہے

(۳)

عبادت کرتے ہیں جو لوگ جنت کی تمنا میں　عبادت تو نہیں ہے اک طرح کی وہ تجارت ہے
جو ڈر کر نار دوزخ سے خدا کا نام لیتے ہیں　عبادت کیا، وہ خالی بزدلانہ ایک خدمت ہے
مگر جب شکر نعمت میں جبیں جھکتی ہے بندہ کی　وہ سچی بندگی ہے، اک شریفانہ اطاعت ہے

(۴)

دل کا ایمان کے خورشید سے مشرق ہونا　رہبر عقل کا فطرت کے موافق ہونا
راستگوئی کی ہے دراصل یہ جامع تعریف　نطق کا وضع الٰہی سے مطابق ہونا

(۵)

زندگی کیا لذّتِ عصیاں کی" ناداں غور کر — برق رو دھارے یہ اک تنکا ہو جو بہہ جائے گا
دیکھتے ہی دیکھتے لذّت فنا ہو جائے گی — اور عذاب اُس کا ہمیشہ کے لیئے رہ جائے گا

(۶)

اک وبا ہے عالمِ اخلاق میں اُس کا وجود — تجھ میں اک ذرہ بھی غیرت ہو تو اس ظالم سے ڈر
اُس کمینے سے حذر کر، بھاگ اُس منحوس سے — خرچ کر ڈالے جو "عزت" اور بچائے "مال و زر"

(۷)

انداز دلنشیں سے بصد عشوہ و ادا — لیلےٰ کی طرح پردۂ محمل میں بیٹھ جائے
بہتر نشانہ باز وہی ہے جو سونچ کر — ایسی درست بات کہے دل میں بیٹھ جائے

(۸)

رات کی خامشی میں تیرا خیال — دافعِ غم ہے وجہِ تسکیں ہے
"برق" سے بھی ہی بڑھ کے کچھ "شفاف" — "خواب" سے بھی زیادہ شیریں ہے

(۹)

بے وجہ نہیں ہے یہ پھڑکنا دل کا — یوں آگ کے مانند بھڑکنا دِل کا
ہاں، زیست کا قفل توڑ دینے کے لیئے — "ضرباتِ مسلسل" ہیں دھڑکنا دِل کا!!!

(۱۰)

آتی ہیں ٹھہر ٹھہر کے سانسیں — اب موت سے لو لگا رہا ہوں!!
منزل ہے قریب" خوف غالب!! — رُک رُک کے قدم اُٹھا رہا ہوں!!!

# "وہ کہاں گیا؟"

(۱)

زمانۂ طفلی بھی عجب پرلطف زمانہ ہوتا ہے۔ نہ ماضی کا خیال نہ حال کی فکر اور نہ مستقبل کا سوچ۔ چاہے آپ اس کو بچپن کی لاپرواہی پر محمول کریں یا عدم توت فکری پر بہرحال کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو بچپن کی دلچسپ زندگی کا حال سوچکر ایک آہ سرد نہ بھرتا ہو۔

میں بھی زمانۂ طفلی میں ایک پرلطف زندگی بسر کرتا رہا۔ مگر جیسے ہی شباب آیا میری زندگی کا وہ دلچسپ ورق اُلٹ گیا۔ نہ وہ ہنسی خوشی رہی نہ وہ بے غمی رہی۔ اور نہ ماں باپ کی اگلی سی نظر عنایت۔ خیر یہ باتیں قابل برداشت تھیں کیونکہ ہر شخص کو یہ باتیں پیش آتی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت یا ناقابل برداشت مصیبت یہ تھی کہ میرے دل سے سکون و اطمینان جاتا رہا۔

جیسے جیسے میں اپنی عمر کے دشوار منازل طے کرتا جاتا تھا، ویسے ویسے اطمینان اور دُور بھاگتا تھا۔ اپنی چالیس برس کی عُمر کا ایک بڑا حصّہ میں نے صرف تلاش اطمینان میں بسر کیا۔ لیکن حصول اطمینان کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کیا غلط ثابت ہوا۔ اور اطمینان کی موہنی صورت دیکھنا نصیب ہوئی۔ پہلا طریقہ کسب زر۔ دوسرا متعصبانہ مذہبی زندگی۔ تیسرا ترک تعلق دنیاوی تھا۔

(۲)

گرمی کا موسم تھا۔ شام کے وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں حسب عادت مشغول سیر تھا۔ دریا کے کنارے کی سبز گھاس کسی طرح مخملی فرش سے کم نہ تھی۔ دریا کی روانی، صاف پانی میں شفق کا عکس غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی پیلی پیلی کرنیں بلکہ ہر شخص کے دل بہلانے کو کافی تھیں۔ مگر جس کا دل ہی رنجیدہ ہو اُسے کون خوش کرسکتا ہے؎

کہتا ہے کون یار کی محفل اداس ہے — کوئی نہیں اُداس مرا دل اُداس ہے

میں اپنے خیالات میں غرق دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ نہ معلوم اس حالت

میں کتنی دور چلا گیا۔ ایک جگہ پہونچ کر مجھ کو مجبوراً رک جانا پڑا۔ کیونکہ دریا دوسری سمت کو بہنے لگا تھا۔ اور سامنے جانے کا راستہ نہ تھا۔

میرے مسلسل خیالات کا سلسلہ چونکہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس وجہ سے میں نے گرد وپیش دیکھنا شروع کیا۔ اور کوشش کی کہ کسی طرح اُن خوشنما مناظر سے دل بہلاؤں۔ دریا اسی طرح آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ چونکہ پوری طور پر رات ہو گئی تھی۔ اس لیئے ماہتاب بھی نکل آیا تھا ماہتاب کی ٹھنڈی اور فرحت بخش کرنیں سطح آب پر لوٹ رہی تھیں۔ پانی میں اُن کا عکس اتنا بھلا معلوم ہوتا تھا کہ سوض تحریر میں نہیں آسکتا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور ہوا کی حرکت سے پانی بھی متحرک ہو جاتا تھا۔ لہریں آتی تھیں اور میرے پاؤں میں ٹکرا کر فنا ہو جاتی تھیں۔ کچھ خودرو پھول کھلے ہوئے تھے اور ہوا سے اُن کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ غرض یہ دلچسپ و دلکش مناظر دراصل دل بہلانے کے لیئے کافی تھے۔ مگر میرا دل۔ کمبخت دل جیسا پژمردہ تھا ویسا ہی رہا۔

(۳)

اس عالم میں نہ معلوم کتنی دیر گذر گئی یکایک مجھ کو خیال آیا کہ اب گھر چلنا چاہیئے۔ اس خیال سے میں اپنی جگہ سے اٹھا مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ اس مقام پر میں اکیلا ہی نہ تھا بلکہ ایک شخص اور بھی موجود تھا۔ میں اُس کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ خیال ہوا کہ اس کو کہیں دیکھا ہے۔ مگر بار بار خیال کرنے پر بھی خیال نہ آیا کہ وہ کون ہے اور اُسے کہاں دیکھا ہے۔

اس شخص کا سن سترہ یا اٹھارہ برس کا ہوگا۔ اُس کے چہرہ سے ایک ایسا بھولا پن ٹپک رہا تھا۔ جس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ بہرحال میں نے خود ہی پیش قدمی کی۔ اور پوچھا۔

میں: "آپ کون ہیں اور آپ کا اسم مبارک کیا ہے؟"

وہ: "میں خود اسی فکر میں ہوں کہ میں کون ہوں سو آپ کو کیا بتا سکتا ہوں؟"

میں: "چہ خوش۔ آپ کو اپنا نام تک نہیں معلوم"

وہ: "نام تو اپنا کون نہیں جانتا۔ لیکن اپنی حقیقت کا واقعی اب تک مجھ کو علم نہیں ہے"

میں: "حقیقت سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ صرف نام دریافت کرتا ہوں"

وہ:" میرا نام اطمینان دل ہے۔"

(۴)

میں نام سن کر خاموش ہو رہا۔ اور اُس کے حسن صورت اور عجیب جوابات پر تعجب کرتا رہا۔ مجھ کو تعجب میں دیکھ کر وہ بولا۔

وہ:" میرا خیال ہے کہ جناب کو میرے جوابات سے رنج پہونچا ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔"

میں:" جی نہیں۔ رنج تو نہیں پہونچا۔ لیکن آپ کی عجیب منطق اب تک سمجھ میں نہ آئی۔"

وہ:" دیکھئے۔ بظاہر انسان چند عناصر کا مجموعہ ہے۔ لیکن دراصل اس جسم ظاہر کے اندر ایک جسم باطن بھی ہوتا ہے۔ اُسے جسم لطیف بھی کہتے ہیں۔"

میں:" جسم لطیف سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

وہ:" جب تک یہ دو جسم ملے رہتے ہیں۔ انسان سکون سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور جب جُدا ہو جاتے ہیں تو انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔"

میں:" اور علیحدگی کیسے ہوتی ہے؟"

وہ:" علیحدگی اسوقت ہوتی ہے جب انسان اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے۔"

اس کے بعد وہ اُٹھا اور کہا۔" تم جسم مادی ہو اور میں جسم لطیف ہوں۔ نہ میرے بغیر تم اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے ہو اور نہ تمھارے بغیر میں۔ لہذا آؤ ہم تم مِل جائیں؟"

اُس نے مجھے زور سے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ لیکن فوراً ہی وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ جس کے بعد سے میرے دل میں سکون کا جاں بخش دریا جوش مارنے لگا۔ اور میں سوچنے لگا۔" وہ کہاں گیا۔"

عاکی۔ لکھنوی

# ایک طلسم

## ماخوذ از مروج الذہب مسعودی

زمانۂ گزشتہ کی قابل قدر یادگار روانم کو یاد کر کرکے ہم کہاں تک روئیں۔ اور کہاں تک مرثیہ پڑھیں زمانہ کی ناقدر ہاتھوں کی بدولت تم سب مٹ گئے اور مٹتے چلے جاتے ہو! زمین تم کو کھا گئی اور ان کو بھی کھا گئی جو تمھارے جاننے والے تھے۔ حتی کہ تمھارے نشان تو نشان تھا، نام تک مٹ گیا افسوس تا ایں جا رسید۔

خلفائے بنی امیہ کے عہد میں جن دنوں عبدالملک بن مروان کی طرف سے اُس کا بھائی عبدالعزیز بن مروان مصر کا گورنر تھا، ایک دن اُسکے حضور میں دفائن اور خزانوں وغیرہ زمین تلے کا حال بتانے والا ایک شخص حاضر ہوا۔ عبدالعزیز نے باتوں ہی باتوں میں اُس سے کہا کوئی دفینہ و حال تو بتائیے۔ جسکے جواب میں اُس نے ایک قبر کا نام لیا کہا کہ اُس میں خزانہ ہے۔ اور اسکی تصدیق اس طور سے ہو سکتی ہے کہ وہاں کی تھوڑی زمین کھودنے پر سنگ مرمر اور رخام کا فرش ملے گا جسکے نیچے پھر کھدائی جاتے جاتے ایک خالی اور بوسیدہ دروازہ پر ختم ہوگی۔

اُس دروازے کے اکھیڑنے پر سونے کا ایک ستون نظر آئے گا، جسکے بالائی حصہ پر ایک مرغ بیٹھا ہوگا۔ اُس کی آنکھوں میں جو سرخ یاقوت جڑے ہیں وہ اس قدر قیمتی ہیں کہ ساری دنیا اُس کے معاوضہ کے لیے کافی ہو تو ہو، اُس کے دونوں بازو یاقوت اور زمرد سے مرصع ہیں۔ اور سونے والے توان ست سونے کے تیروں کا کچھ حصہ نکل کر اُس مرغ کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے!

یہ تعجب آمیز گفتگو سن کر اُس کو ایک کچھ ایسا شوق بڑھا کہ عام طور پر حکم دیدیا کہ وہ مقام کھودا جائے اور جو لوگ اُس کو کھودیں گے اور کام کریں گے اُن کو ہزارہا درم دیئے جائیں گے، یہ مقام ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ اس وجہ سے بہت فاصلے سے کھدائی کا کام شروع ہوا۔ جو جو پتے پتہ دینے والے نے سنگ مرمر اور رخام کے فرش وغیرہ کے بتائے تھے چونکہ وہ دستیاب ہوتے جاتے تھے اس وجہ سے عبدالعزیز کا اشتیاق روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، اور اُسی طریقے سے روزانہ اُس کے مصارف بڑھتے

بڑھتے جاتے تھے۔ مسلمانوں کا کام بہت زور و شور سے جاری کہ ایک بیک مرغ کا سر نمودار ہوا یہ سر کے نمایاں ہوتے ہی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی چاروں طرف پھیل گئی یہ غیر معمولی روشنی اُس مرغ کی آنکھوں سے نکل رہی تھی۔ دونوں آنکھوں میں بڑے بڑے دو یاقوت جڑے تھے جس کی یہ ساری تجلی تھی۔ رفتہ رفتہ کھودنے والوں پر اُس کے دونوں مرصع بازو بھی نمودار ہوئے اور پھر اس کے پاؤں بھی۔ اس مرغ والے سونے کے ستون کے علاوہ ایک اور ستون بھی نظر آیا، جو بجائے خود ایک عمارت کا حکم رکھتا تھا، یہ عمارتی ستون مختلف پتھروں وغیرہ سے تعمیر کیا گیا تھا جنمیں متعدد کمرے تھے اور چھتیں بالکل تراش دار تھیں۔ اسکے دروازے بڑے بڑے اور مسلسل طاقوں کی ایک خوشنما قطار تھی اُن میں طرح طرح کی رکھی ہوئی مورتیں اور بنی ہوئی صورتیں بڑے لطف کے ساتھ اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ سونے اور مختلف جواہرات کے علیحدہ علیحدہ ڈھیر تھے۔ عبدالعزیز بن مروان یہ خبر پاتے ہی فوراً سوار ہو کر بڑے ذوق شوق کے ساتھ اُس موقع کے اوپر پہونچا، اور جو حیرت انگیز طلسم رونما ہو رہا تھا اس کو بہت دلچسپیوں کے ساتھ بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ تمام خلقت کا یہاں ہجوم تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج کوئی بہت ہی عالیشان میلہ اس جگہ لگا ہے۔ ایک مقام پر ڈھلے ہوئے تانبے کا زینہ لگا ہوا تھا، جو اوپر تک گیا تھا اُس کو دیکھ کر ایک شخص اوپر جلدی جلدی چڑھنے لگا، سارے ناظرین حیرت زدہ یہاں کی ہر چیز کو دیکھ رہے تھے، اس زینے کی چوتھی سیڑھی پر جب اُس چڑھنے والے نے قدم رکھا ہی تو زینہ کے داہنی اور بائیں طرف سے دو ننگی تلواریں اپنا کاٹ اور تڑپ دکھاتی ہوئی نکلیں اور گو اُس چڑھنے والے نے اپنے بچانے میں ہر طرح کی کوشش کی مگر یہ دونوں نکلنے والی تلواریں قضائے مبرم کے دونوں ہاتھ تھے جنہوں نے طرفۃ العین میں اُس چڑھنے والے شخص کا کام تمام کر دیا اور پھر یہ دیکھا گیا کہ اُس شخص کے کٹ کٹ کے ٹکڑے نیچے گرے۔ اس کے گرتے ہی وہ ستون جھوکے لے لے کے ہلنے لگا اور اس پر وہ بیٹھا ہوا مرغ کچھ عجیب شان سے اُڑا کہ دیکھنے والے حیرت زدہ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ اور یہ صدائیں دوش ہوا پر سوار ہو کر دور دور تک پھیل گئیں۔ مرغ کے اُڑتے ہی نہایت خوش نوا صدائیں اس میں سے نکلیں۔ اُس کے بعد اُس مرغ کے اُڑتے ہی ایک گرم ہوا چلی جس کی وجہ سے جس قدر تماشائی ارد گرد کھڑے تھے سب اُس طلسمی غار میں گر پڑے اُس گڑھے کے اندر جس قدر بھی مزدور وغیرہ جن کی تعداد ایک ہزار بیان کی جاتی ہے، موجود تھے،

سب کے سب فوراً مر گئے۔ اور عبدالعزیز نے یہ حال دیکھ کر ایک چیخ ماری اور کہا " یہ بھی عجیب رخنہ نکلا ہے۔ اس سے کیا امید رکھنی چاہیئے، نعوذ باللہ " اُس کے بعد جس قدر بھی مٹی وغیرہ اُس میں سے نکالی گئی تھی وہ سب اُسی ہی میں ڈلوا دی گئی اور وہ مرجانے والے تماشائی سب اسی کے اندر توپ دیے گئے! اور بالآخر (وہ) طلسم کی جگہ اچھا خاصا (گورِ غریباں) بن گیا۔ گئے تھے دفینہ نکالنے کے لیے اور اتنی جانیں دفن کر آئے۔ اور مصارف گھاتے میں۔ ہائے۔ افسوس

مسعود الرحمٰن ثاقب

# غزل

عشاق نے گھیرا ہے جو نکلے ہیں وہ گھر سے
قربان ہوے جاتے ہیں دیدار کے تر سے

اے سوزِ درونِ دل آگ لگائے گا کدھر سے
اُٹھے گا دُھواں قلب سے پہلے کہ جگر سے

اُٹھیں گے نہ کوچے سے جدا ہوں گے نہ گھر سے
زندہ نہیں تو اُٹھے گا جنازہ ترے در سے

داغِ دلِ سوزاں جو بڑھے داغِ جگر سے
خورشید نمودار ہو پہلوئے قمر سے

دُنیا کا بُرا ہے مگر اچھوں سے ہے اچھا
دشمن کو بُرا کون کہے دوست کے ڈر سے

رہتے ہیں اُدھر کان لگائے ہوے وہ بھی
نالے کی صدا رات کو آتی ہے جدھر سے

جس سمت سے ہم سجدہ اُسے کرنے بڑھے تھے
منہ پھیر لیا اُس بُت کافر نے اُدھر سے

آغوش میں میرے نہیں آتے تو نہ آئیں
بچ کر وہ کہاں جائیں گے آغوشِ نظر سے

مرجانے دو تم پیار سے دیکھو نہ دمِ نزع
اُلجھے گا مرا تارِ نفس تارِ نظر سے

جب بیٹھتے ہیں بیٹھنے دیتا نہیں درباں
اُٹھتے ہیں تو اُٹھا نہیں جاتا ترے در سے

کچھ ایسے مسلمان بھی ہیں اے بت کافر
اللہ کو سجدہ نہیں کرتے ترے ڈر سے

قبروں کے نشاں کہتے ہیں رو بیٹھ کے دم بھر
او دیکھنے والے ہمیں عبرت کی نظر سے

بھولے سے بھی اب نام تم اُس کا نہیں لیتے
پہلے تو محبت تم کو بھی تھی جگر سے

حکیم۔ ام۔ جگر صدیقی زمیندار لسوان

# الحمد للہ

اے آسمان کو نیلا رنگ اور ریحانوں کو خوشنائی عطا فرمانے والے تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تو سب سے اچھا رحیم ہی۔ جب میرے چاروں جانب خطرناک تاریک لہریں منڈلا رہی تھیں تو نے مجھے روشنی دکھائی۔

---

میرے خانہ برانداز دشمنوں سے کہہ دو کہ وہ مشق ستم میں مصروف رہیں اور میں اُس بیکسوں کے مددگار کو بلاتا ہوں جس نے ہر مصیبت میں میرا ساتھ دیا ہی وہ میری جانب ہی اور مجھے کسی کا خوف نہیں ہی۔ وہ میرے مددگاروں کا مددگار ہی۔

---

یہی اچھا ہی کہ ہم خدائے قدیر پر اعتماد کریں نہ کہ احسان فراموش انسان پر۔ ہاں مجھے اُسی بھروسہ ہی اور مجھے کسی رستم وقت یا دنیا پرست شاہزادے کی امداد کی ضرورت نہیں۔

---

میرے دشمنوں نے مجھے شہد کی مکھیوں کی طرح حلقے میں لے لیا ہی۔ اُنھوں نے میرے تباہ کرنے کی قسم کھائی ہی۔ لیکن اُسی کی عزّت وجبروت کی قسم وہ میرے ساتھ ہی وہ میری مدد کرے گا۔ اور یہ سب تباہ و برباد ہوں گے۔

---

وہی میری قوت ہی اور وہی میری کوشش۔ میرے دشمنوں کو اگر میری موت کا یقین ہی تو وہ غلطی پر ہیں میں زندہ رہوں گا اور میرے بازو اُس قادر مطلق کے احکام کی تعمیل کرینگے۔

---

ہاں تو اے قادرِ مطلق کھول دے میرے لیئے سچائی اور مسرت کا دروازہ جس میں داخل ہو کر تیری حمد و ثنا کروں۔ پھر تیرے نام اور تیری قوت سے اپنے آہنی بازوؤں کو مطلب براری

کے لیے جنبشِ دل۔

---

اے ڈوبتی ناؤ کے بچانے والے اس وقت کشتی منجدھار میں ہے خبر لے۔ تو میرا ناخدا ہے میرا پریم ایشور ہے۔ تو داتا ہے۔ ہاں تو ہی ہے جس کی تحمید میں ہمیشہ مصروف رہوں گا۔

---

ہے پرم آتما! میری زبان نہیں کہ تیری توصیف اور تیرا شکریہ ادا کر سکے۔

شبیر مارہروی

---

# غزل

وہ اسیرِ شوق جو خو کردۂ بیداد ہو
زندگی دشوار ہو اُس کی اگر آزاد ہو

کیوں گرفتارِ محبت آپ کا آزاد ہو
خستۂ بیداد پر کیوں یہ نئی بیداد ہو

کچھ کہے افسانہ اپنی بھی نگاہِ آرزو
اے نگاہ آشنا تیری اگر امداد ہو

تو تو مثلِ نوگلِ خنداں ہے لبریزِ نشاط
حیف ہے صد حیف گر عاشق ترا ناشاد ہو

ہے خدا ہی حافظ اُس صیدِ محبت پیشہ کا
جو گرفتارِ ہوائے الفتِ صیاد ہو

جور سے باز آ کے دیتے ہو تغافل کی سزا
تم ستم ایجاد ہو کوئی ستم ایجاد ہو!

بیمِ رسوائی ہو تجھ کو کیوں شہیدِ ناز سے
خاک میں جو مل چکا ہو اُس سے کیا فریاد ہو

رنج اُس کو کیوں کہوں جس میں تمہاری ہو خوشی
شاد میں بھی ہوں اگر تم بندہ پرور شاد ہو

باعثِ تسکیں ہو شاید ذکر عیشِ رفتہ کا
چھیڑ دے وہ داستاں وحشت جو تجھ کو یاد ہو

کلکتہ

رضا علی وحشت

# تحفۂ نیلگری

مجھ کو کشش جمال قدرت
لائی جو وطن سے سوئے غربت
کی سیر ہر ایک گلستان کی
دیکھی رنگینی اک جہاں کی
دولت یہ مگر کہیں نہ پائی
جو نیلگری میں ہاتھ آئی
کب آئی نظر عروس قدرت
بے پردہ اور اتنی خوبصورت!
کونور۔ ولنگٹن اور اوٹی
میں نے سب کی بہار لوٹی

## درخت

کسار حریف صد چمن ہے
جو پیڑ ہے سرو قد دلھن ہے
ہے سبز درخت کی جو کونپل
ہر پنکھڑی اُس کی سُرخ مخمل
پوشاک ہری ہے۔ لال زیور
اطلس پہ ٹکی ہے سُرخ جھالر
آتا ہے نہیں کچھ سمجھ میں اپنی
کہئیے انھیں پھول یا کہ پتی
جنگل میں اک آگ سی لگی ہے
ٹھنڈک بھی مگر یہ آنکھ کی ہے
نیچے جنگل ہیں جھاڑیاں ہیں
اوپر اونچی پہاڑیاں ہیں
چوٹی پہ کہیں کہیں ہیں جنگل
ہر پیڑ ہے جس میں دیو ہیکل
ہے چیڑ کہیں، کہیں صنوبر
ایک ایک سے راستی میں بڑھکر
شمشاد۔ دیار۔ یوکلپٹس
ہیں دن کو فرشتے شب کو راکس
موٹے موٹے بڑے بڑے ہیں
عفریت کی طرح سب کھڑے ہیں

ہے سوئے فلک ہر اک کا میلان ان سے پیدا پہاڑ کی شان

## چڑیاں

ہے نغمۂ طیور کا وہ دلکش سب کرتے ہیں جس کو سُن کے عش عش
پیڑوں پہ یہ کیا پھُدک رہے ہیں سرمست ہیں اور چہک رہے ہیں
کیا ناچ رہے ہیں گا رہے ہیں بس پھُولے نہیں سما رہے ہیں
ظاہر ہے کہ اُن کا ننھا سا دِل ہے حِسّ غم و طرب کے قابل
رکھتے ہیں غرض ضمیر یہ بھی ہوتے ہیں اثر پذیر یہ بھی

## چشمے

نالے دِن رات چل رہے ہیں چشمے سیماب اگل رہے ہیں
بچوں کی طرح بچھڑ رہے ہیں موتی آنکھوں سے جھڑ رہے ہیں
پانی ہے چٹانوں سے نکلتا غل شُور مچاتا اور مچلتا
چلنے سے کبھی نہیں یہ تھکتا رستے سے کبھی نہیں بھٹکتا
ٹھوکر پہ یہ کھا رہا ہے ٹھوکر جز شوق کوئی نہیں ہے رہبر
طے کر کے پہاڑ اور صحرا کترا کے چٹان اور ٹیلا
رہتا ہے پہونچ کے تا بمنزل مانع نہیں اُس کو کوئی مشکل
گر پڑ کے یوں ہی ہر ایک نالا ہو جاتا ہے ہمکنار دریا
کس زور سے نالہ بہ رہا ہے کچھ اپنی زبان میں کہہ رہا ہے
گر ہو طلب کمال تُجھ کو گر کچھ ہو سرِ مآل تجھ کو
مقصود اگر ہو کامرانی کر میری طرح کلیمؔ پانی

یوں چھاتی پہ تو بھی رکھ لے پتھر	مگر یوں ہی کوہ و دشت سے سر
جنگل ہو ۔ پہاڑ ہو کہ صحرا	رہ دشت طلب میں جادہ پیما
مستی ہو جنوں ہو ہوش کے ساتھ	توفیق عمل ہو جوش کے ساتھ

## ایک قدیم وحشی قوم

پہلی وہ بھارت ماں کی اولاد	تھا جس سے کبھی یہ ملک آباد
تھی جان سے بے عزیز جس کو عصمت	دولت میں یہی تھی ایک دولت
ناموس کے حفظ میں تھا اعجاز	بس ایک یہی تھا باعث ناز
بھاگی ہوئی فاتحوں کے ڈر سے	لینے کو پناہ شور و شر سے
بیچاری بسی ہوئی ہے جاکر	دشوار گزار چوٹیوں پر
ادبار نے ہر طرف سے گھیرا	تو آکے یہاں لیا بسیرا
آنکھوں سے جہاں کی یہ نہاں ہے	بے نام و نشان ہے ۔ لامکاں ہے
دل نے یہ کہا کہ دیکھ چل کے	تاریخ قدیم کے یہ پتلے
گو آج ذلیل و خوار ہیں یہ	کس عہد کے یادگار ہیں یہ!
ہیں گرچہ یہ وحشی اور جاہل	جمعیت دل ہے ان کو حاصل
حاجت اُن کی قلیل ہوگی	قدرت اُن کی کفیل ہوگی
یہ حرص و ہوا سے ہونگے آزاد	ہوں گے ہر اعتبار سے شاد
دنیا سے جو بے نیاز ہوں گے	کیسے وہ پاکباز ہوں گے!
تھا خضر طریق شوق دیدار	دشوار نہ تھا نظر میں دشوار
جا دیکھے پہاڑ پہ بصد کیف	وہ نیستی کے بقیۃ السیف

گھر اُن کے ہیں مثل آشیانہ — اور طرز معاشرت ہو وحشیانہ
ہیں ایسی بہیمیت کی تصویر — کیجئے انھیں جانور سے تعبیر
خوں ہو گیا اپنی آرزو کا — امید، قیاس کا تھا دھوکا
اخلاق سے ہوتے ہوتے عاری — پہونچی ہے یہاں تک اُن کی خواری
ناموس کا اب انھیں نہیں پاس — باقی نہیں آبرو کا احساس
اب بیچتے ہیں متاع عصمت — لے لے کے حقیر سی یہ قیمت
القصہ ہے اب یہ قوم ٹوڈا — عبرت کی نگاہ کا تماشا
یہ زار ہوا اب آشکارا — ہوں دشت و جبال یا صحارا
سچ تو یہ ہے نہیں کچھ آسان — جمعیت خاطر پریشان
گر خانۂ دل میں ہو نہ حاصل — باہر ہے تلاش سعی باطل

## ڈوڈا بیٹا کے مناظر

ہے کتنا بلند ڈوڈا بیٹا! — تا چرخ ہے جس کا ڈانڈا میڈا
اُس نے تو حقیقۃً ملا دیے — قلابے زمین و آسماں کے
اونچا کوئی نو ہزار فٹ ہے — آتی ہے نظر یہاں سے ہر شے
ندی۔ وادی۔ پہاڑ۔ میدان — معمورہ۔ خرابہ اور بیابان
سب سر بفلک جبل یہاں سے — دیتے ہیں دکھائی صرف ٹیلے
چھوٹا، بڑا، ادنیٰ اور اعلیٰ — باقی نہیں اُن میں فرق اصلا
ارذل ہو کہ اشرف الخلائق — ادنیٰ ہے نہ وہ، نہ یہ ہے فائق
کثرت کا یہ دیکھ کر تماشا — ہو جاتی ہے خیرہ چشم بینا

رہتی نہیں وقعت اپنی حاشا — اگ گھاس کی پتی سے زیادہ
لو اُٹھے وہ وادیوں سے بادل — اور چھا گئے اُن کے چار سُو دَل
بادل ہیں کہ ہیں یہ بحرِ ذخّار — ٹاپو سا بنا ہوا ہے کہسار!
ہے سارا جہاں نظر سے غائب — مغلوب ہیں سب اور ابر غالب
قدرت کا غرض ہر ایک ذرّہ — ہے چشمِ خرد کے حق میں پردہ
اب ابر نیا یہ روپ لایا — ہے دُھوپ کہیں، کہیں ہے سایہ
تاریک کہیں کہیں اُجالا — ابلق ہے پہاڑ اب سراپا
یعنی کہ ہیں روز و شب ہم آغوش — ہیں ساری عداوتیں فراموش

## بادلوں کی اٹھکیلیاں

دامن پہ بچھی ہے سبز مخمل — اور چوٹی پہ کھیلتے ہیں بادل
اک دوسرے کو یہ ریلتے ہیں — یا آنکھ مچولی کھیلتے ہیں
یہ نیچے ہیں تیز رو بلا کے — جب دیکھو۔ ہیں گھوڑے پر ہوا کے
چوٹی پہ کبھی ہیں جا دھمکتے — دامن میں کبھی ہیں آ دبکتے
پیچھے سے پہاڑیوں کے جھانکیں — چپکے سے ہمیں یہ آ کے ڈھانکیں
بچوں کی طرح کبھی یہ مچلیں — ہر وقت نیا یہ رنگ بدلیں
اُجلے، نیلے، کبھی ہیں کالے — یہ روئی کے نرم نرم گالے
ہے سخت مزاج میں تلوّن — چڑھ جائے ابھی کچھ اور اگر دُھن
بن جائیں یہ بھولے بھولے بادل — متوالے، سیاہ مست، پاگل
ہیں کف بدہن۔ گرج رہے ہیں — یا طبل فلک پہ بج رہے ہیں

اقلیم زمیں پہ آسماں کی — ہوگی کوئی دم میں اب چڑھائی
وہ دینے لگی سنائی جھنکار — چلنے لگی بجلیوں کی تلوار
باڑھیں بارش کی چل رہی ہیں — توپیں موتی اگل رہی ہیں
یہ رعد یہ برق اور بارش — در اصل ہے جنگ کی نمائش
یہ جنگ و جدل ہے کھیل گویا — ہے ان کا بگاڑ میل گویا
رشتہ ہے زمین و آسماں میں — کچھ باتیں ہیں حال کی زباں میں
یہ ابر نہیں پیامبر ہیں — اور وجہ وصال ہمدگر ہیں
ہے ارض و سما میں ساز ان سے — مخفی نہیں کوئی راز ان سے
اقلیم زمین و آسماں میں — ہیں ایک سفیر درمیاں میں
ہے صلح و صلاح ان کے دم سے — عالم میں فلاح ان کے دم سے
یہ تفرقۂ بلند و پستی — سچ پوچھو تو ہے فریب ہستی
سمجھے ہوئے ہیں جنھیں ہم اضداد — رکھتے نہیں خارجی وہ بنیاد
ہے پست و بلند کہنے کی بات — بے اصل ہیں سارے اختلافات

ہے زیر کوئی نہ کوئی بالا
بالا ہے فقط خدا تعالیٰ

مسلم

# راہیِ عدم سے دو باتیں

ہائیں! ارے! یہ میرے دل میں کون چٹکیاں لے رہا ہے؟ اُف یہ درد کیسا؟ کیا کسی کی یاد میرے دل میں آئی ہے؟ ہاں بیشک ایسا ہی ہے۔ یہ میرے پیارے دوست یوسف کی یاد ہے۔ یوسف! پیارے یوسف! افسوس تم مجھ کو چھوڑ کے چلے گئے۔ اور میری اپنی محبت کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ تمہاری خیالی تصویر آنکھوں میں پھرتی ہے جس وقت تمہاری یاد آتی ہے دل تڑپ جاتا ہے کلیجہ میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب ہم تم ایک جان دو قالب تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کھیلتے کودتے تھے، تم روٹھ جاتے تھے ہم مناتے تھے، تمہارا روٹھنا ہم کو یاد ہے تمہارا منانا تم کو یاد ہوگا۔ تمہاری یاد جب کبھی آتی ہے ایام گزشتہ کی یاد دلا جاتی ہے۔ کل تمہاری قبر پر گیا تھا حسرت برس رہی تھی، نرگس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہاری قبر کو دیکھ رہی تھی۔ اور زبان حال سے تمہاری قبر پر یہ نوحہ پڑھ رہی تھی "یوسف تجھے موت آئی جوانی میں تھی" خود حسرت سرہانے کھڑی انگشت بدنداں تھی کہ یوسف تیرے سہرے کے پھول کس قدر جلد کملا گئے، تو نے باغ دنیا کی پرفزا بہار کی نہ تو سیر کی اور نہ اس کی شادابی سے کوئی فائدہ اُٹھایا، باغ دنیا سے اس قدر جلد جی اُکتا گیا؟ ابھی تمہارا سن ہی کیا تھا جو اس قدر جلد جانے کی پڑ گئی۔ دنیا میں آخر اور لوگ بھی ہیں اور تم سے زیادہ عمر رکھتے ہیں، مگر اُن کا دل اس طلسم کدہ سے نہیں گھبرایا۔ تم میں کون سی خوبی تھی؟ ہاے اپنی نئی نویلی دلہن کا بھی خیال نہ کیا۔ میں بھی کھڑا اس کی گفتگو سنتا رہا، اور نہ سنتا تو کیا کرتا؟ زمین سخت تھی آسمان دور، ورنہ میں خود آکر تم کو سمجھاتا بجھاتا منت و سماجت کرتا بہر صورت تم کو واپسی کے لیے راضی کرتا، اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور میرا کہنا مانتے۔ کیا تم کو نہیں یاد ہے کہ تم اکثر مجھ سے خفا ہو جاتے تھے میں پھر تم کو راضی کر لیتا تھا۔ تم ہزار نہیں نہیں کرتے مگر پھر آخر کو راضی ہی ہو جاتے۔ یوسف! سچ کہنا تم تو کبھی اکیلے دروازے کے باہر بھی نہ جاتے تھے بغیر میرے تم کبھی سیر کو بھی نہ جاتے۔ اب آخر تم کو کیا ہو گیا۔ یہ تیرہ و تاریک کوٹھری میں جس پر لاکھوں من مٹی کا بوجھ پڑا ہے، تم کو کیونکر چین آیا۔ تم کیسے وہاں آرام سے لیٹے ہو۔ انسانی ہستی کا سایہ بھی کبھی دیکھنے میں نہ آتا ہوگا۔ باوجودیکہ تمہارے پہلو میں تمہارے ہی بھائی بند لیٹے ہیں، جو کبھی تمہارے

پسینہ پر خون گرانے کو تیار تھے، تمھاری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے۔ اگر کبھی تم بے کل ہوتے تھے انکی راتوں کی نیند اُڑ جاتی تھی۔ افسوس! اب وہ کیسے بے خبر لیٹے ہیں کہ تمھارا بھول کر بھی نام نہیں لیتے آنا جانا تو درکنار، معلوم نہیں کہ وہ کیسی دُنیا ہو جہاں بھائی بھائی کا شریک نہیں۔ کیا اُن کا خون بالکل سفید ہوگیا؟ تمھاری قبر کا یہ حال ہو کہ جابجا سے اینٹیں کھُلی ہوئی ہیں۔ چیونٹیوں اور بھیڑ بکریوں کا ہجوم رہتا ہو کوئی اتنا بھی نہیں کہ اُن کو وہاں سے بھگائے، لڑکوں نے جابجا لکیریں بنا رکھی ہیں۔ افسوس اُن لکیروں کو ثبات ہو مگر تمھاری زندگی کو ثبات نہ تھا، ہاں یوسف! سچ کہنا تم کو بھی ہماری یاد کبھی آتی ہو تم بھی ایسے ہی بے چین ہوتے ہو؟ تمھارا بھی ہمیں دیکھنے کو جی چاہتا ہو؟ ابھی کل کی بات ہو جب تم مجھ کو "بے مروت" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ کیوں صاحب اب بے مروت کون ہو؟ ہم یا تم؟ قبر کی تنہائی میں کس نے مُنھ چھپایا؟ ہم نے یا تم نے؟ پیارے یوسف! تمھاری طبیعت میں کس قدر جلد تغیر ہوگیا، ہم پہروں تمھاری یاد میں رویا کرتے ہیں تم کبھی بھول کر بھی اِدھر کا رُخ نہیں کرتے۔ پہروں اسی فکر میں پڑا رہتا ہوں کہ ہائے میرا سچا اور جاں نثار دوست یوسف اس دنیا سے اُٹھ گیا اور میں اکیلا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں؎ روے مانند بلبلۂ رفتن کا مضمون ہو دنیا کے تفکرات اسے ڈالتے ہیں جانِ حزیں میں ہو، بلا سے مر ہی جاؤں تو اِن جھگڑوں سے نجات ملے، دنیا کی تکالیف سے پیچھا چھُٹے تم سے ملوں۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ ملک جہاں تم نے اب بود و باش اختیار کی ہو کس کا ہو، وہاں کا بادشاہ کون ہو؟ اور کیا مذہب رکھتا ہو؟ ہندو ہو یا مسلمان؟ عیسائی ہو یا یہودی؟ پارسی ہو یا آتش پرست؟ اِس دُنیا سے اور اِس مُلک سے کس قدر فاصلہ ہو؟ راستہ کا کیا حال ہو؟ سنسان جنگل ہیں یا کچھ آبادی بھی ہو، شروع شروع میں جب تم گئے تو وہاں کے باشندے تم سے کس طرح پیش آئے؟ اُن کا طرزِ معاشرت کیا ہو، حکومت کا کیا حال ہو؟ اندھی نگری چوپٹ راج تو نہیں ہو؟ قوانین کیسے ہیں آسان یا سخت؟ یہاں کا سا تو عالم نہیں کہ بے حکم پتہ بھی نہیں ہل سکتا؟ جس کو تاکا اس کو مارا سیدھا سر ہلایا اور نافرمانی کی نہیں کہ قید خانہ (قبر) کی کوٹھری ہو اور مظلوم ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہو جاتے ہیں سنوا ہو نہ فریاد۔ سر ہلانے کی بھی اجازت نہیں۔ اگر کچھ خلاف مرضی حاکم (خدا) نکل گیا تو یہ کہکر کہ دنیا دارالجزا ہو فوراً سزا دی جاتی ہو۔ علما مقدس کتاب کا حوالہ دیکر حاکم (خدا) کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں، اور مجرم کھڑا ہی کھڑا دیکھا جاتا ہو اس کی زندگی ناپائدار ثابت کردی جاتی ہو۔ ابھی کل کا واقعہ ہو کہ چند اشخاص کی

غلط فہمی سے لاکھوں انسانی بستیاں خاک پر پڑی لوٹتی ہوئی دکھا دیں۔ ایک شخص کی نافرمانی قوم کی نافرمانی سمجھی جاتی ہے۔ سچائی کے راستہ میں ہزاروں دشوار گذار راستے حائل ہو گئے ہیں۔

**جواب** اے غفلت کی نیند سونے والے! ہوش میں آ۔ کیا کہتا ہے۔ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ مگر ہاں تیرے سوالات کا جواب دوں گا۔ لیکن تو نے بعض ایسے سوالات کئے ہیں جو تیری ناقص عقل میں کبھی نہیں آسکتے۔ اس لیے مختصر جواب دوں گا۔ یہاں دوست ہیں نہ اغیار، عزیز و اقربا بیشک ہیں مگر وہ اپنی اپنی تکلیف میں پریشان ہیں تیری تنہائی کہاں تک کہاں، جس روز سے دنیا کو خیرباد کہا اور قبر کے گوشہ میں منھ چھپایا وہ جسم جس پر مجھ کو ناز تھا اور جس کی ذرا سی تکلیف مجھ سے نہ دیکھی جاتی تھی اس قبر میں ہے، روح ایک اور جہاں میں بھیجدی گئی ہے جس کا پتہ میں خود نہیں جانتا۔ راستہ اس کے لیے صاف اور ہموار ہے جس کے اعمال گناہوں کے دھبہ سے پاک ہیں۔ ایک گردش میں وہاں سے یہاں انسان آسکتا ہے، ہر مذاہب کے لوگ دکھائی دیتے ہیں، قبر پر بھیڑ بکریوں کا ہجوم تو کیا، کلیرین میں تو کیا، مجھ کو اس سے کوئی تکلیف نہیں پہونچتی، حکومت جس کی وہاں ہے وہ اسی کی یہاں بھی ہے، فرق اتنا ہے، دُنیا کی عنان حکومت قضا و قدر کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے مگر کوئی کام بے مرضی بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ تم نے اپنی حالت خود ہی خراب کر رکھی ہے۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے، ظلم و جبر دنیا ہی تک رہتے ہیں۔ بڑے بڑے سورما اور بہادر جو دنیا میں ظالم اور جابر کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، آج مصیبت میں مبتلا ہیں، کوئی اُن کا ساتھی نہیں، خدا ظالم اور جابر نہیں، وہ جو کچھ کرتا ہے مصلحتِ وقت دیکھ کر کرتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ تمھاری سمجھ میں نہ آئے، علما ہاں میں ہاں نہ ملائیں تو کیا کریں، وہ بھی تو اسی بادشاہ کی اقلیم میں رہتے ہیں جہاں تم، پھر وہ وہاں سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں، اگر خلاف کہیں بھی تو اُن کے اوپر آفت آتی ہے ہر تکلیف میں خدا ہی کو یاد کرو، جس نے ڈالی ہے وہی کاٹے گا۔ صبر و شکر سے کام لو۔ دنیا کی ذرا سی تکلیف تم سے سہی نہیں جاتی عاقبت کی تکلیفیں تم کیسے جھیلوگے، صداقت اور راستی کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دینا، دنیا میں بھی اسی خدا کی بادشاہت ہے جو راستی اور صداقت کو ہمیشہ عزیز رکھتا ہے، اس میں شک نہیں کہ راستی کے راستہ میں بہت سی رکاوٹیں پڑ گئی ہیں، بعض اوقات جان تک آ بنتی ہے مگر اس کا خیال نہ کرو ہمیشہ راستی ہی کو مد نظر رکھو بالآخر فتح ہے، پھر کیسی فتح کہ عاقبت کی تکالیف سے ہمیشہ کے لیے نجات پا جاؤ گے، میرا حال ان تین اشعار میں مخفی ہے:-

"وہ ہمارا پیکرِ نازک جو تم کو یاد ہو — آج خاکِ قبر سے اُس پر ہنوں کے بار ہیں"
"پھول کیسے باغ کیسا عقل ہو تیری کہاں — گنج تنہائی ہو اور افعی گلے کے ہار ہیں"
"بس زیادہ بات کر سکتے نہیں لے گھر کو جا — دل میں آزردہ نہ ہونا کیا کریں لاچار ہیں"

محمد نصیر احمد عبّاسی

—×— (·×·) —×—

# تقریب

دو مہینہ سے ناظرین کرام **حقیقت** کا اشتہار الناظر میں دیکھ رہے ہیں۔ اس اخبار کا پہلا نمبر ۲۴ر اکتوبر ۱۹ء کو شایع ہوا تھا اور اس وقت سے برابر ہر جمعہ کو پرچہ نکلتا رہتا ہے۔ اس وقت تک چھ پرچے شایع ہو چکے ہیں۔ ہمارا حقیقت اپنی صوری و معنوی خصوصیات میں ہندوستان بھر کے موجودہ اُردو اخبارات سے جداگانہ روش رکھتا ہے کاغذ کی گرانی کے باعث عموماً سب اخبارات ادنےٰ درجہ کے گھٹیا کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں، مگر حقیقت میں چکنا سفید کاغذ لگایا جاتا ہے جس کی قیمت اس کے مقابلہ میں اس وقت بھی دُگنی ہے، اخبارات کے لیے عام طور پر چھوٹا پیمانہ پسند کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت مرحوم مسلم گزٹ کے پیمانہ پر شایع کیا گیا ہے جو پایونیر۔ انڈپینڈنٹ وغیرہ انگریزی اخبارات نے رکھا ہے ان ظاہری خصوصیات کے سوا حقیقت کے مضامین اور ترتیب کا رنگ بھی جدا ہے، حقیقت کے تمام مضامین میں منقولات اور ہندوستان کی خبروں کو چھوڑ کر ایک خاص ادبی رنگ ہوتا ہے جس سے اُردو کے دیگر اخبارات عام طور پر معرّیٰ ہوتے ہیں۔ ایڈیٹوریل مضامین اور نوٹ علاوہ اس کے کہ نہایت شستہ و سلیس عبارت میں لکھے جاتے ہیں واقعات حاضرہ کے متعلق قیمتی معلومات سے لبریز ہوتے ہیں، شذرات میں واقعات پر دلچسپ لطیف پیرایہ میں تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اُس کے بعد مضمون خاص کے عنوان سے کوئی مفید اور پُر از معلومات مضمون ہوتا ہے۔ مطبوعات جدیدہ کی تنقید میں حقیقت نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ جس سے اُردو لٹریچر کی رفتار ترقی کا اندازہ لگانے میں کافی مدد ملے گی، بحرِ مراسلات میں خاص خاص شہروں کے نامہ نگاران خصوصی کے خطوط اور عام مراسلتیں ہوتی ہیں جنمیں سے اول الذکر

بہت ہی دلچسپ اور ادبی حیثیت سے لائق داد ہوتے ہیں۔ اور حقیقت کا یہی امتیاز شاید سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے، کیونکہ حقیقت کے جتنے قلمی معاونین ہیں وہ سب کے سب جدید تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے انشا پرداز بھی ہیں۔ اور اس طرح حقیقت ایک گریجویٹ کے بجائے گویا نصف درجن تعلیم یافتہ اصحاب کی مشترکہ دماغی محنت سے تیار ہوتا ہے۔

حقیقت میں عام خبروں کا ذخیرہ کم ہوتا ہے، اور چاہیئے بھی یہی۔ اس لیے کہ خبر رسانی کا کام روزانہ اور ہفتہ میں دو یا تین بار شایع ہونے والے پرچے اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن ولایتی ڈاک اور انگریزی اخبارات کے کارآمد اور مفید مطلب تراجم سے حقیقت کا ہر پرچہ مالا مال ہوتا ہے۔ اور ممالک غیر کی ضروری خبروں کا خلاصہ ایسی خوش سلیقگی کے ساتھ درج کیا جاتا ہے کہ بیک نظر اور بغیر کسی محنت کے ناظرین اخبار ہفتہ بھر کے واقعات عالم سے واقف ہو سکتے ہیں۔

حقیقت سیاسی حیثیت سے کسی فریق کا متبع نہیں کہا جا سکتا۔ گو اس کا انداز تحریر مدعیان اعتدال سے ملتا جلتا ہے، اور ان تمام خصوصیات کے باوجود سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے۔

ناظرین الناظر سے خاص طور پر اس اخبار کی خریداری کی سفارش کی جاتی ہے اور یقین ہے کہ ان میں سے اکثر اصحاب کو نمونے کا پرچہ بھی پہونچا ہوگا۔ جن صاحب کو نہ ملا ہو وہ مینیجر حقیقت لکھنؤ کے نام ایک کارڈ لکھ کر منگا لیں۔

دہلی سے ایک پندرہ روزہ اخبار "نسائی" ہمارے کرمفرما مسٹر عباس حسین قاری ایڈیٹر تمدن نے نکالا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ فرقہ نسواں کو سیاسیات سے لذت آشنا کیا جائے۔ مقصد نہایت اچھا ہے، خداوند کریم مسٹر قاری کی کوششوں کو بارور کریں اس لیے کہ گاڑی کے دونوں پہیے ساتھ ساتھ گردش کریں گے تو رفتار ملکی یقیناً بہت ہی تیز ہو جائے گی۔ یہ بحث بالکل جداگانہ ہے کہ یہ رفتار ہماری قومی ترقی کا باعث ہوگی، یا اس کے برعکس نتائج پیدا کرے گی۔ جو لوگ اقوام یورپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں اور میں مانتا ہوں کہ عام رجحان اسی طرف ہے اُن کے نزدیک تو شاید قومی عروج اُس وقت تک اپنے منتہائے کمال پر نہیں پہونچ سکتا جب تک مرد اور عورتیں کشاکش ہائے ہستی کے جملہ منازل میں باہمدگر دوش بدوش نہ ہو جائیں۔ لیکن ایک اور فرقہ بھی ہے جو تہذیب جدید کی ملمع کاریوں سے دھوکہ نہیں کھاتا۔ اور یقین رکھتا ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے تفریق جنسی کا راز انواع انسانی کے اندر ایک خاص تقسیم عمل میں

مضمر رکھا ہو جس کے مِٹ جانے کے بعد وہی نتائج پیدا ہونا لازمی ہیں جو قوانین فطرت کی عدم تابعیت سے ہمیشہ ظہور پذیر ہوتے ہیں - بہرحال اگر "نسائی" کے ذریعہ ملکی حالات سے عورتوں کی بے خبری رفع ہو جائے تو یہ بجائے خود نہایت مفید خدمت ہوگی - البتہ عورتوں کا دامن سیاسیات کے خارزار میں اُلجھا کر اُنھیں اپنی خانہ داری کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دینے کی کوشش نہ کی جائے تو اچھا ہو "نسائی" کا سالانہ چندہ عہ ہو جو اصحاب اپنے گھر کی خواتین کو پڑھانا چاہیں - وہ منیجر صاحب نسائی - ٹلیا محل دہلی سے نمونہ طلب کریں -

دہلی ہی سے خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنی اہلیہ خواجہ بانو کی طرف سے ایک رسالہ "اُستانی" نکالا ہو جس کی ظاہری حیثیت خواجہ صاحب کی دیگر تصنیفات کے مانند اپنے طبقہ کے سب رسائل سے ممتاز ہو مگر مضامین میں ابھی تک کوئی خصوصیت ایسی نہیں نظر آتی جو اُستانی کو دوسرے پرچوں سے ممتاز بنانے والی ہو، یہ اور بات ہو کہ خود خواجہ صاحب کی عام تحریریں اپنی سادگی اور جدت کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں کے لیئے یکساں طور پر دلچسپ ہوتی ہیں، تاہم ممکن ہو کہ رفتہ رفتہ اُستانی میں کچھ ایسی خصوصیات نمودار ہونے لگیں جو اُس کو عورتوں کے لیئے مخصوص طور پر مفید بنا دیں - اُستانی کی سالانہ قیمت عہ ہو -

شیرکوٹ ضلع بجنور سے ایک اچھا اخبار مولوی مظہر الدین صاحب نے نکالا ہو جو الہلال اور جمہور وغیرہ کلکتہ کے اخبارات میں سب ایڈیٹر رہ کر اخبار نویسی کا کافی تجربہ حاصل کر چکے ہیں - "دستور" ہفتہ میں دو بار شایع ہوتا ہو اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہو، قیمت سالانہ ہے

مرادآباد سے ایک نیا اخبار حال ہی میں نکلا ہو جس کا خاص امتیاز یہ ہو کہ کاغذ، لکھائی چھپائی میں نہ صرف مرادآباد کے دیگر اخبارات سے بلکہ شاید ہندوستان بھر کے تمام اخبارات سے بہتر ہے - پہلے پرچہ میں حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی تصویر بھی تھی اور شاید آیندہ بھی تصاویر کا سلسلہ جاری رہے، لیکن ظاہری آب و تاب کے سوا **اقبال** میں کوئی اور خصوصیت ابھی نمودار نہیں ہوئی ہو البتہ لب و لہجہ کسی قدر آزادانہ معلوم ہوتا ہو قیمت سالانہ سے رہ ہو جو اسکی ظاہری حالت کے لحاظ سے کم ہے -

لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار **ریفارمر** کے نام سے نکالا گیا ہو جس کی حالت اپنی ظاہری و معنوی حیثیتوں سے پنجاب کے ادنےٰ درجہ کے اخبار سے مشابہت رکھتی ہے - البتہ نام وزن دار ہے -

**تاریخ تمدن** کتاب ہسٹری آف سولیزیشن کا ترجمہ۔ یہ ہنری طامس بکل کی لاجواب فلسفہ تاریخ کی بہترین کتاب ہے جسمین تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیے گئے ہین جس طرح طبیعات وغیرہ علوم کے اصول مدون ہوے ہیں۔ دو جلد قیمت ۸ مع

**تاریخ اخلاق یورپ** انگلستان کے مشہور و معروف دانشمند ڈبلیو۔ ای۔ ایچ لیکی کی لاجواب کتاب کا ترجمہ جسمین یونان و روم اور دیگر قدیم اقوام کے مذاہب فلسفہ اور اُن کے اخلاقی حالات کی تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہے قیمت جلد اول ۲ مع

**مشاہیر یونان و روم** حکیم پلوٹارک یونانی کی لاجواب کتاب پیرلیل لائوز کا ترجمہ جسمین یونان و روم کے اولوالعزم مدبرین اور نامور شہنشاہوں کے سوانحی حالات اور ان کے بیش بہا خیالات درج کرکے ازراہ تبصرہ ایک کا دوسرے کا مقابل کیا گیا ہے۔ انگریزی مترجم کو اس کتاب کے ترجمہ کے صلہ مین "نائٹ" کا لقب دیا گیا جس سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیئے۔ مغرب کو جس ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہونچانے مین اس لاجواب کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حب وطن ایثار کامل بے نفسی جان نثاری اور اولوالعزمی کی زندہ اور سچی تصویرین ان اوراق مین صاف نظر آئین گی۔ قیمت جلد اول ۳ جلد دوم ۴

**تاریخ یونان قدیم** اردو زبان مین یونان کی سب سے پہلی جامع و مانع تاریخ قیمت ۱۲ مع

**رہنمایان ہند** ہندوؤن کا اصلی مذہب کیا ہے؟ اور اُس مین کیا کیا تبدیلیان ہوئی ہین؟ کرشن جی، سدارتھ، گوتم بدھ کی تعلیمات، شنکر اچاریہ، رامانج، رامانند، گورکھ ناتھ اور کبیر کی تعلیمات اور باوا جی سوامی تلسی داس اور جے دیو کے حالات۔ قیمت ۱۲ مع

**امرائے ہنود** عہد مغلیہ کے ہندو امرا و نامور اکابر و مشاہیر عہدہ داران و امرا کے حالات قیمت ۲ مع

**نپولین اعظم** اس نامور فاتح اور شہنشاہ کی مکمل سوانح عمری پانچ جلدون مین قیمت ۱۰

**مسلمانان اندلس** اسٹینلی لین پول کی مشہور تاریخ کا اردو ترجمہ قیمت ۱۲

**البیرونی** علامہ ابوریحان بیرونی مصنف کتاب الہند کی سوانح عمری اور ان کی تصانیف پر تبصرہ قیمت ۱۲ مع

**شباب لکھنو** عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ مین لکھنؤ کی درباری حالت ۱۲ مع

**فتح قسطنطنیہ** یعنی اسلام کی ایک جلیل القدر اور مہتم بالشان فتح کی تاریخ مؤلفہ حاجی معین الدین احمد بی اے ۱۲ مع

**محاربات طرابلس** یعنی سٹرای این بینٹ

نامہ نگار اخبار مانچسٹر گارڈین سابق ممبر پارلیمنٹ کی لاجواب کتاب "دی ٹرکس ان ٹریپولی" کا ترجمہ جسمین جنگ طرابلس کے چشم دید حالات ترکی افواج کی کیفیت خطۂ اسلامیہ طرابلس کے جغرافیائی ملکی، قومی، اور معاشرتی حالات ادیبانہ و مورخانہ شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور اسی وجہ سے کتاب جنگ کے بعد بھی ایک مستقل تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پڑھی جانے کے لائق ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحے مع ۴ تشریحی نقشون کے قیمت ۱۲ مع

**محاربات صلیبی** بیت المقدس کی فرمانبرداری جو عظیم الشان قربانیان چڑھائی گئی ہین اُن کے مفصل حالات قیمت ۱۲ مع

**علوم طبعیہ کی تاریخ** علوم طبعیہ کی ان تمام فنون اور ایجادون کی تشریح جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لیکر انیسوین صدی تک وقتاً فوقتاً عمل مین آتی رہی ہیں مسائل کی تحقیقات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم و جدید حکما نے ان علمی دریافتوں اور ایجادوں میں کیا کیا حصہ لیا مضامین کی توضیح کے لیے صدہا تصویرین دی گئی ہیں قیمت ہر دو جلد ۱۲

**تاریخ مذہب** اس میں مذہب کی ابتدا و ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذاہب مثلاً بابلی اور اسوریہ مصر اور چین اور دیگر ممالک و اقوام کے مذہب کی مختصر تاریخ درج ہے۔ قیمت ۸

**تاریخ مصر** مصریون کے قدیم رسم و رواج طرز معاشرت عادات وغیرہ کے مفصل حالات قیمت ۱۲

**ایکسو زائد مصنفین اُردو کی مکمل تصنیفون کی فہرست منگا کر دیکھئے**

رجسٹرڈ نمبر — اے ۸۷۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فیس سالانہ ۳ر — فیس ششماہی ۲عہ


# الناظر


ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۲۶ | ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء | جلد ۲۱


(فہرست مضامین)




نظرے خوش گذرے ہم

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

قیمت فی پرچہ ۵؍

پرنٹر و پبلشر اسحاق علی علوی

قیمت فی پرچہ ۵؍

# قابل دید کتابین

**فلسفہ تعلیم** - حکیم ہربرٹ اسپنسر کی لاجواب کتاب کا ترجمہ۔ جسکے مطالعہ سے مسئلہ تعلیم پر نہایت صاف روشنی پڑتی اور بڑی حد تک اس منزل دشوار مین رہنمائی ہوتی ہو۔ قیمت عہ

**تاریخ التعلیم** - ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج جنھون نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کے لیئے وقف کر رکھی ہو اور فن تعلیم کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہو کہ مسلمانان ہندوستان مین کوئی دوسرا شخص ایسا نہین جو اس قدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو۔ یہ کتاب انھین کے رشحات قلم سے نکلی ہو اور اس قابل ہو کہ تمام اصحاب جو ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہین اس کا مطالعہ فرمائین قیمت عصر

**اساس التعلیم** - بچون کی ابتدائی تعلیم کن اصولون پر ہونی چاہیئے۔ علمی اور عملی تدابیر معہ متعدد عکسی تصاویر قیمت عہ

**فلسفہ اجتماع** - علم النفس کی لاجواب کتاب جسمین اُن کیفیات و حسیات نفس کا بیان ہو جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہین۔ قیمت عصر

**فلسفہ ازدواج** - جسکے متعلق مولانا حالی مرحوم نے یہ قیمتی راے ظاہر فرمائی تھی کہ ہر متاہل اور غیر متاہل شخص کا فرض ہو کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک بار بار پڑھے اُسکی ہدایتون پر عمل کرے اور جس ہدایت پر خود نہ عمل کر سکتا ہو اسپر اپنے متاہل دوستون اور عزیزون اور اُن نوجوانون کو جو عنقریب اس جوے کو اپنی گردنون پر رکھنے والے ہین ان پر عمل کرنے کی تاکید کرے ایک جلد منگا کر ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت عصر

**القول الاظہر** - علامہ ابن مسکویہ نے صانع عالم کا ثبوت دلائل فلسفہ سے پھر مسئلہ نفس اور اسکے ادراکات کا بیان اور نبوت کا اثبات بڑی خوبی سے کیا ہو۔ مسئلہ ارتقا جو ڈارون کا نظریہ کہا جاتا ہے اُس کا ذکر اس کتاب مین موجود ہو۔ قیمت عہ

**الناظر بک ایجنسی کی**

**مکمل فہرست**

**مفت بھیجی جاتی ہے**

**القمر** - چاند کی ماہیت و حقیقت پر علم ہیئت و ریاضی کی رو سے بحث۔ جدید معلومات کا ذخیرہ ۸

**علم المعیشت** - یعنی اصول اکنامکس یا اقتصادیات پر اردو مین سب سے پہلی جامع و مستند کتاب جس کی خوبی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہو کہ اُس کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اپنی کتاب علم الاقتصاد کے متعلق لکھا کہ اب اسکے پھر چھپنے کی ضرورت نہین تمثیلات تمام تر ہندوستان کی دی گئی ہین۔ اور ہر مسئلہ کا انطباق اسی ملک کے حالات سے کیا گیا ہو قیمت للعہ

**مقدمات الطبیعات** - پہلی مکمل کتاب طبیعات پر قیمت عیصر

**طبقات الارض** - پہلی مکمل کتاب ارضیات پر قیمت عیصر

**مبادی سائنس** - علم حیوانات، نباتات اور معدنیات کے تمام ابتدائی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہین قیمت عہ

**رموز فطرت** - سائنس کے ابتدائی و بنیادی مسائل قیمت ۸

**انسان** - انسان کی حقیقت و ماہیت سائنس کے اصولون پر قیمت ۸

**تحفہ سائنس** - یعنی شیخ فیروز الدین بی اے ایم ایس سی پروفیسر علوم طبیعات علی گڈھ کالج کے سائنٹفک مضامین کا مجموعہ (حصہ اول) جسمین شبنم کی سرگذشت۔ زمین کا وزن۔ چاند کی سیر آثار قیامت۔ اعجاز سائنس، انتہاے سائنس نہ دکھائی دینے والی روشنائی۔ فلسفہ فطرت وغیرہ مضامین قابل دید ہین۔ پروفیسر صاحب موصوف سائنس کے مسائل کو نہایت سہل اور عام فہم عبارت مین بیان کرتے ہین تاکہ اردو خوان اصحاب پوری طرح مستفیض ہو سکین قیمت عہ

**رسالہ علم نباتات** - اس فن کی اردو زبان مین یہ پہلی کتاب ہو۔ قیمت عیصر

**کفایت شعاری** - ڈاکٹر اسمائلز کی مشہور کتاب تھرفٹ کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۸

**رسالہ علم فلاحت** عہ **رسالہ علم برق** عہ

الناظر بک ایجنسی لکھنو

# کافوری جنتری

# سنہ ۱۹۲۰ء

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ سنہ ۱۹۲۰ء کی کافوری جنتری نہایت خوبصورت اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور بلا قیمت و محصولڈاک قدردانوں کے پاس بھیجی جاتی ہے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ پر دس متفرق جگہ کے شریف لکھے پڑھے اشخاص کے نام اور پورا پتہ لکھکر بھیجدیجئے مذکورہ بالا جنتری بواپسی ڈاک آپکی خدمت میں روانہ کردیجائیگی۔

## ہمیشہ تندرست رہنے کی ترکیب

یہ آپ جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی خون سے ہے اور اس لئے خون کا صاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ خون کے صاف کرنے اور رکھنے کی ترکیب بھی بہت ہی آسان ہے اور وہ یہ کہ ڈاکٹر ایس۔ کے برمن کا آیوڈائڈ سالسہ نہایت درجہ مفید ثابت ہوا ہے۔ اس میں کسی چیز کا پرہیز نہیں ہے اس سالسہ میں خاصکر پوٹاشیم۔ ایوڈائڈ وغیرہ کیک آزمودہ ادویات ملاکر بنتا ہے اسلئے تمام سالسوں سے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ گرمی آتشک گنٹھیہ وغیرہ یا پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے اگر خون بگڑ گیا ہو تو اسکو استعمال کیجئے خون بگڑنے کی دو وجہ ہیں۔ آتشک گنٹھیہ۔ ایسے عارضہ میں پارہ ملی ہوئی ادویہ کے استعمال سے خون بگڑ جاتا ہے۔ پوری حالت کی فہرست منگاکر دیکھئے۔ قیمت فی شیشی دو روپیہ عار محصولڈاک چھ آنہ ۶ر

## قوت کی گولیان

۳۶ برس سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں طاقت دینے والی مشہور دوائیں فاسفورس الکینڈ وامیانہ ملاکر یہ گولیان بنی ہیں۔ اسلئے مغز۔ ریڑھ۔ رگ اور خون کو طاقت دینے کا خاص دعویٰ رکھتی ہیں زیادہ محنت جوانی کی خرابی و بے اعتدالی خواہ کسی وجہ سے ہو ان گولیون کے استعمال سے اول ہی روز سے فائدہ ظہور میں آتا ہے بدن میں قوت اور مزاج میں گرمی معلوم ہونے لگتی ہے۔ چہرہ پر رونق جوانی میں ضعیفی کی سی حالت ٹوٹتے ہوئے جسم میں دوبارہ جوش لاتی ہے۔ قیمت ۴۰ گولیونکی شیشی دو ہفتہ کی خوراک کا ایک روپیہ۔ محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک ۵ر

دیکھئے جناب اڈیٹر صاحب مخبر دکن کیا تحریر فرماتے ہیں۔ ہمنے ڈاکٹر صاحب کی تعریف پر خیال کرکے تیس گولیان منگائیں اسکے تیر بہدف اثر اور فوائد پر نظر کرتے ہیں تو ان گولیون کی قیمت بجائے ایک روپیہ کے تیس روپیہ رکھنی چاہئے تھی

## ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

# لکھنؤ کے جدید ہفتہ وار اخبار

# حقیقت

## میں

## کیا ہوتا ہی؟ اور کیا نہیں ہوتا؟

(۱) یورپ کے بہترین رسائل واخبارات کے ترجمے
(۲) ملک کی حقیقی ضروریات کی وکالت
(۳) قوم کے جذبات کی صحیح ترجمانی
(۴) اقتصادی اعداد و واقعات
(۵) محققانہ تعلیمی مسائل
(۶) پُرزور سیاسی مضامین
(۷) اصلاح معاشرت
(۸) ملک کے مشہور شہروں کی مخصوص خبریں
(۹) ممالک اسلامی کے صحیح و مستند حالات
(۱۰) مسائل حاضرہ پر پُر مغز مقالات
(۱۱) دلچسپ علمی و ادبی مباحث
(۱۲) مطبوعات جدیدہ پر نقد و تبصرہ

(۱) خوشامد اور تملق
(۲) تصنع وریاکاری
(۳) زباں درازی و درشت کلامی
(۴) تعصب وعناد
(۵) عامیانہ زبان
(۶) دل آزار و اشتعال انگیز الفاظ
(۷) مبالغہ وناراستی
(۸) ذاتی حملے
(۹) خشک و بے مزہ لٹریچر
(۱۰) فرسودہ اور دقیانوسی خبریں
(۱۱) مذہبی مناقشے۔
(۱۲) ادنیٰ مذاق اور ہزلیات

شائقین ایک پرچہ بطور نمونہ منگاکر دیکھیں پھر خریدار بنیں

**قیمت سالانہ ۵ ششماہی ۳**

**المشتہر۔ منیجر اخبار حقیقت۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱ جلد ۲۱ — ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

## ماہ گذشتہ

الناظر ایک عرصہ سے اپنی اشاعت مین سابقہ وقت یعنی انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کا پابند نہین رہا۔ مین چاہتا تھا کہ دو تین نمبر جلد جلد نکال کر پھر اُسے وقت پر لے آؤن لیکن اس مین کامیابی نہ ہوئی۔ اسی اثنا مین مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر الناظر مین ہر ماہ کے قومی و ملکی معاملات پر مختصر تبصرہ لکھنے کا التزام کیا جائے تو شاید ناظرین الناظر کے لیے پرچہ زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔ لیکن اگر الناظر پہلی تاریخ شایع ہو تو یہ انتظام جیسا چاہیے نہین بن سکتا کیونکہ یہ قطعاً ناممکن ہوگا کہ مہینہ کی آخری تاریخون کے واقعات پر اس صورت مین کچھ لکھا جا سکے اس لیے آیندہ سے الناظر وسط ماہ مین انشاء اللہ شایع ہوا کرے گا اور کوشش کی جائے گی کہ ماہ گذشتہ کے تحت عنوان ہر مہینہ ایڈیٹر اپنے خیالات اور رایون کا اظہار کر سکے۔

نظرے خوش گذرے کا عنوان علیٰ حالہ قایم رہے گا جسمین متفرق امور پر حسب سابق بحث کی جائے گی۔

جن ناظرین نے سال گذشتہ مجھے اس امر پر توجہ دلائی کہ اس عنوان سے جب کوئی پرچہ خالی ہوتا ہے تو ان کو سخت مایوسی ہوتی ہے مین اُن کی اس قدر افزائی کا بدل ممنون ہون۔ انشاء اللہ سال رواں مین اُن کے تعمیل ارشاد کی پوری سعی کی جائے گی۔ ظفر الملک

دسمبر کا مہینہ اپنے آخری دنون کے اجتماعی مظاہرون کی بنا پر اہل ہند کے واسطے ایک غیر معمولی اہمیت و دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، سوشل کانفرنس اور دوسری مرکزی قومی و ملکی مجالس کے سالانہ جلسے ہر سال تمام ملک کے تعلیم یافتہ اور دردمند لوگون کو زائرین کی طرح کشان کشان اپنی طرف بلاتے ہین۔ پہلے جب مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ساتھ ساتھ ہوتے تھے تو مسلمانون کی جمعیت کثیر

ایک مقام پر اور ہندوستان کی مخلوط آبادی خصوصاً ہندو اور پارسی اصحاب دوسری جگہ جمع ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب چند سال سے مسلم لیگ کے جلسے کانگریس کے ساتھ ہونے لگے ہیں جسکی وجہ سے مسلمانوں کی جمعیت دو ٹکڑوں میں منقسم ہوگئی ہو اور گو مجھے اس وقت سے کانفرنس کی شرکت کا موقع کم ملا ہے کہ چشم دید حالات کی بنا پر کوئی رائے ظاہر کی جا سکے۔ لیکن مسلمانوں کے عام احساس اور مسلم لیگ میں شرکت کرنے والے اصحاب سے واقفیت ہونے کی بدولت غالباً یہ قیاس غلط نہ ہو کہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجتماع ویسا پُرشوکت نہ ہوتا ہوگا جیسا اب سے چند سال پہلے ہوا کرتا تھا۔ خود مسلم لیگ کے جلسے بھی اس قدر بے رونق ہوا کرتے ہیں کہ کم از کم میں تو ہر سال لیگ کے جلسوں سے مکدر ہی آتا تھا۔ اس دفعہ خانگی مجبوریوں نے امرتسر کے عظیم الشان نظاروں کی دید سے محروم کردیا۔ لیکن جو اصحاب وہاں تشریف لے گئے تھے اُن کو بھی غالباً مسلم لیگ کی حالت زار دیکھکر بہت افسوس ہوا ہوگا۔

---

دسمبر کے قومی جلسوں سے دو ہفتہ قبل عمال حکومت کی طرف سے نام نہاد جشن صلح کی تقریب منانے کی کوشش کی گئی۔ یہ تقریب اگر خالص سرکاری تقریب ہوتی تو شاید کسی کو اس میں عذر نہ ہوتا لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس قسم کی جتنی کارروائیاں کی جاتی ہیں اُن کے متعلق مشتہر کیا جاتا ہو کہ اہل ملک نے اسمیں پورے جوش و خلوص سے حصہ لیا۔ اُسی لیے خلافت کانفرنس و مشترکہ کانفرنس منعقدہ دہلی کو اس کی ضرورت پڑی کہ وہ اس جشن میں شرکت نہ کرنے کا مسلمانوں اور اُن کے ہمدرد ہندو بھائیوں کی طرف سے اعلان کرے اور نہ صرف اعلان کرے بلکہ اپنی ماتحت جماعتوں کے ذریعہ عدم شرکت کو مؤثر بنانے کی جد و جہد کرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے شہروں میں جہاں کے باشندے اپنی سیاسی بیداری اور اپنے رہنماؤں کی جرأت مردانہ کی بدولت عمال سرکاری کے اشارہ چشم پر ہر اچھے اور بُرے کام میں شریک ہونے کو آمادہ نہیں ہوجاتے۔ ایک طرف اگر مسرت صلح کا سامان فراہم کیا گیا تھا تو دوسری طرف صف ماتم بھی بچھی ہوئی نظر آتی تھی۔ باقی وہ اصحاب جو حکومت کی پرستش کرنے میں اپنی عزت سمجھتے اور اپنے معبودوں کے ہر جا و بے جا حکم کی تعمیل کے لیے غلامانہ تیار رہتے ہیں انھوں نے جشن صلح کی تقریب میں ہر جگہ کافی حصہ لیا اور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں جہاں آسمانی خدا کے بجائے خداوندان دنیا کی حکومت مانی جاتی ہو تو کافی اولوالعزمی کے ساتھ ہولی منائی گئی۔ مسلمانوں کے قومی رہنماؤں میں سے آنریبل مسٹر مظہر الحق اور جناب راجہ صاحب محمود آباد کے سوا شاید کوئی تیسرا شخص نہیں بتایا جا سکتا جس نے جشن صلح میں کوئی نمایاں حصہ لیا۔

تمام سربرآوردہ کانگریسی لیڈرون نے جس جوش و خلوص کے ساتھ اس مسئلہ مین مسلمانون کی ہم آہنگی کی ہو اُس کا شکریہ نہین ادا ہو سکتا لیکن اعتدال پسند گروہ جسکے متعلق انگلو انڈین اخبارات روزانہ شہادت دیتے ہین کہ اس دسیع براعظم مین تمے لطیف کے تمام ذخیرون کا ٹھیکہ اُن کے لیئے مخصوص ہوگیا ہو اس بارہ مین بھی کانگریسی لیڈرون کے ساتھ اتفاق نہ کرسکا۔ اگرچہ مسائل خلافت وٹرکی مین وہ مسلمانون کے ساتھ دلی ہمدردی ظاہر کرتا رہتا ہو۔ اُس کی یہ عنایت بھی کچھ کم لائق احسان مندی نہین۔

ہندوستان جیسے مفلس مُلک کو ایک ایسی تقریب مین حصّہ لینے پر مجبور کرنا جس سے اہل ہند کو قطعاً کوئی دلچسپی نہین ہو سکتی تھی۔ ارباب حکومت کی دانشمندی کی دلیل نہین سمجھی جاسکتی۔ حالانکہ جنگ اگر واقعتہً ختم ہو چکی ہوتی اور آفتاب صلح کی روشن کرنون نے ہندوستانیون کے تاریک خانہ ہاے دل کو ذرا بھی تابناک بنادیا ہوتا تو یقین رکھنا چاہیئے تھا کہ ہمارے رسم پرست ارباب وطن جشن کی تقریب پر اپنے حوصلہ کے مطابق اور مقدور سے زائد صرف کرنے کو تیار ہوجاتے۔ برطانوی مدبرین کے لیئے اب بھی ایک موقع باقی ہو۔ وہ مسائل ترکی و خلافت اسلامیہ کو مسلمانون کی خواہشات کے مطابق طے کردین پھر دیکھین کہ اہل ہند کس جوش و ولولہ کے ساتھ جشن صلح مناتے ہین۔

عمال حکومت اور مدبرین برطانیہ کے طرز عمل سے ابد وزبردز اس بات کا یقین بڑھتا جاتا ہو کہ حسن تدبیر اور معاملہ فہمی کی صفتین جو ایک متمدن قوم کا طغرائے امتیاز ہونا چاہیئے۔ اُن کی جماعت سے مفقود ہوتی جاتی ہین۔ یا کم سے کم اُن کی ہواے توسیع مُلکی کے ماتحت آتی جاتی ہین۔ جس کا نتیجہ دنیا کے امن اور خود برطانیہ کی عظمت و اقتدار کے منافی ہو۔

حکومت ترکی کا تقسیم و تجزیہ شاید کہ انگلستان اور یورپ کے سیحی مدبرین کو کچھ دنون کے لیئے خوش و خرم بنا سکے لیکن مسلمانان عالم اور دنیا کے دوسرے ہمدردان نوع انسانی کے لیے یہ واقعات کچھ کم سبق آموز نہون گے اور گو اُس وقت تک کہ اُن کی آواز کمزور اور اُن کے قوی مضمحل ہین ممکن ہو کہ وہ اپنی قوت و اثر کا کوئی معقول مظاہرہ نہ کرسکین۔ لیکن وہ وقت دور نہ سمجھنا چاہیئے جب دانشمندان یورپ کو اپنی قوتون کے غلط استعمال پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔

بے شک ہندوستانی مسلمان ابھی اپنی سیاسی بیداری اور اپنی اجتماعی زندگی کا کوئی ثبوت نہین دے سکے ہین۔ اور اسی وجہ سے غالباً مدبرین برطانیہ اُن کے جذبات و خواہشات سے بے التفاتی برتنا آسان سمجھتے ہین

لیکن کیا بدبخت روس کے عالم آشکارا حالات پر اُن کی نظر نہیں کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس قوم کو زار کے بیرحمانہ تشدد نے تمدن جدید کے ثمرات سے ایک بڑی حد تک محروم کر دیا تھا، آج وہ ایک عالم کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہو۔ مسلمان بھی آخر روسیون ہی جیسے انسان ہین۔ پھر حکومت برطانیہ انھین کیون مجبور بنا تی ہو۔ کہ وہ ہندوستان کے امن پسند شہری کی حیثیت چھوڑ کر روسی بالشویکون کا وطیرہ اختیار کرین۔ ہمارے اینگلو انڈین احباب جو بالشویکون کو گالیان دیتے ہوے نہین تھکتے کبھی اس پر بھی غور فرمانے کی تکلیف گوارا کرتے ہین کہ روسی دہقانیون کو بالشویک بنانے والے اسباب کیا تھے۔ اُن کی عقل ودانش پر آفرین ہو کہ وہ ہندوستان مین بالشویک تحریک کو پھیلانے کا خود سامان کر رہے ہین۔ اور اطمینان کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہین۔ حالانکہ لارڈ سیڈنہم اور اُن کے ہمنواؤن نے تجاویز اصلاح کے خلاف جو جد وجہد کی تھی اُس سے کہین زیادہ تگ ودو خود ان یورپین اصحاب کو حکومت ٹرکی کے تحفظ واستقلال کے متعلق کرنا چاہیے تھی کہ آج ہندوستان کا امن وسکون بہت کچھ اسی مسئلہ سے وابستہ ہو۔

*

نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاسون سے پیشتر ہی بادشاہ انگلستان کے نام سے وہ اعلان شائع کیا گیا جسے بعض اصحاب اہل ہند کی آزادی کا وثیقہ کہتے ہین۔ حالانکہ اس سے قبل ملکہ وکٹوریہ کا وہ اعلان بھی جو ۱۸۵۷ء کی بدنظمیون کے بعد شائع ہوا تھا اسی لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ حیرت ہوتی ہو کہ ہندوستان کے وہ ارباب دانش ورائے جنھین دنیا کی تاریخ اور قومون کے عروج وزوال کی داستانین ازبر ہین بعض اوقات کیسے بے بصیرت ہو جاتے ہین کہ مدبرین مغرب کی دلفریب باتون مین آکر واقعات اور حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہین۔ بے شک اس اعلان مین یہ خوشخبری دی گئی ہو کہ ملک معظم نے جدید مسودہ قانون پر اپنی منظوری صادر فرما دی اور ساتھ ہی اُس کے یہ بھی مژدہ سُنایا گیا ہو کہ جن باشندگان ہند پر سیاسی گناہون کی پاداش مین طرح طرح کی قیود عائد تھین اُن کے اُٹھا لینے کا حکم نافذ کیا گیا ہو لیکن کیا واقعی یہ چیزین ایسی ہین کہ اُن کی بنا پر اس اعلان کو آزادی کا وثیقہ قرار دیا جاسکتا ہو۔

جدید آئین کے متعلق کانگریس نے جو تجویز منظور کی ہو اس سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہو کہ اس "وثیقۂ آزادی" کو اہل ہند کی اکثریت کیا سمجھتی ہو۔ اور اگر وزراے برطانیہ نے کمال فطانت کے ساتھ بادشاہ انگلستان کی پرشکوہ شخصیت کو اس موقع پر سپر نہ بنایا ہوتا تو اُس وقت یقیناً نیشنل کانگریس کی طرف سے زیادہ صفائی اور بیباکی سے ظاہر ہو سکتی اور انھین معلوم ہو جاتا کہ اہل ہند اُن کے عطایا کی کیا قدر وقیمت جانتے ہین۔

رہیا گنہگاران سیاسی کی آزادی، سو یہ فی الحقیقت وزراے برطانیہ کا کوئی احسان نہین کہ انھون نے بیگناہون کو عذاب مظالم سے نجات پانے کا حق دیا۔ بلکہ حق یہ ہو کہ اس مین بھی دانایان فرنگ کی خودغرضانہ دانشمندی کے آثار ہویدا ہین۔ جنرل ڈائر کی شہادت نے ہمارے حکمرانون کے طرز عمل کو مہذب دنیا کی بارگاہ مین جس بے دلاویز اور ناپسندیدہ صورت مین پیش کیا تھا اُس کے بعد فیاضی و انصاف پسندی بلکہ ترحم کی یہ بارش غالباً محتاج تشریح نہین رہتی۔

ملک معظم کے اعلان مین یہ خواہش بھی ظاہر کی گئی ہو کہ اہل ہند اور کارفرمایان حکومت دونون اپنے اتحاد عمل سے جدید آئین کو کامیاب بنائین۔ اگرچہ ہم اس بات کے قائل نہین کہ ایک پابند آئین فرمان روا کے اعلان کی تعمیل پورے جوش و خلوص کے ساتھ ممکن العمل ہوسکتی ہو کیونکہ اہل ہند اگر اپنی قدیم روایات شاہ پرستی کی بنا پر یہ باور بھی کرلین کہ جو کچھ اُن کے سامنے ہوا ہے لارڈ کرزن اور مسٹر لائڈ جارج کے نفوس مقدسہ کی ہوا نہین لگی لیکن ہمارے ذی ہوش حکمران اور اینگلو انڈین عقلا تو اپنے ملک کے نظام کو نظر انداز نہین کرسکتے۔ تاہم اگر اس آئین کے ذریعہ اہل ہند آزادی کی کسی حقیقی منزل پر پہونچ جائین تو کم سے کم اس ملک کے باشندے تو ضرور اس اعلان کی حرف بحرف تعمیل پر آمادہ ہوجائیں گے۔

کہا یہ جاتا ہو کہ قوانین کی جو قسط آج ہمین عطا ہوئی ہو اُس سے ہندوستان مین ذمہ دار حکومت کی بنیاد پڑجائے گی اور پھر رفتہ رفتہ اہل ہند اُس منزلت پر پہونچ جائین گے جو دنیا کی دوسری مہذب اقوام کو حاصل ہو لیکن کیا یہ دریافت کیا جاسکتا ہو کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی سی قومون مین آج ذمہ دار حکومت کی طرح اسی قسم کے قوانین سے ڈالی جارہی ہو۔

انڈین نیشنل کانگریس کے ارکین کو اگر شاہ انگلستان کا نام لیکر مرعوب نہ کیا جاتا تو ہم یقین ہو کہ وہ یہ مطالبہ کرتے کہ جسطرح کنیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ مین ذمہ دار حکومت قایم ہو۔ یا جیسے پولینڈ، آرمینیا، فلسطین، عرب کو حق انتخاب حکومت بخشا جارہا ہو اُسی قسم کا آئین اس ملک میں فوراً نافذ کیا جائے جسکے بعد قانون اسلحہ، قانون مطابع اور قانون تحفظ ہند جیسے آزادی شکن اور نامنصفانہ قوانین سے اہل ہند کی جکڑبند ناممکن ہوجاتی۔

لا ریب ہندوستان نے ابھی مغربی تہذیب و شایستگی مین ایسا ید طولیٰ حاصل نہین کیا ہو کہ ممالک متحدۂ امریکہ کی سی حکومت یہان قایم ہوسکے لیکن کیا ڈیڑھ سو سال تک برطانوی استادون کے سامنے زانوے ادب تہ کرچکنے کے بعد آج سنہ ۱۹۲۰ء مین وہ اس قابل بھی نہین ہو کہ جنوبی افریقہ کے وحشی بوئرون اور بلقان کے

نیم مہذب سلانیوں کی قدر و منزلت اُسے حاصل ہو۔

مسٹر ملک اور دیگر رہنمایان مُلکی کے اِس بیان مین ذرا شبہ نہین ہو کہ اہل ہند اسوقت بھی اپنے او پر کامل آزادی نہین نہین پوری ذمہ داری کے ساتھ حکومت کرنے کی کافی صلاحیت رکھتے ہین اور اگر اب نہین رکھتے تو سمجھنا چاہیے کہ آئندہ بھی کبھی یہ اہلیت اُن مین نہین پیدا ہو سکتی۔ اِس لیے کہ جب تک ہندوستان مین اس قسم کی بد اخلاقی مسلط ہو جیسے کہ قانون اسلحہ کیا ممکن ہو کہ ہندوستانیون مین وہ ہمت مردانہ اور جوہر انسانیت نشوونما پاسکے جو ایک آزاد یا ذمہ دار حکومت کا لازمہ ہو۔

وحشی افغانی، بداخلاق چینی اور خونخوار روسی آج اپنے اپنے ملکون پر صرف اس وجہ سے حکمران ہین کہ وہان قانون اسلحہ کو رواج دیکر انسانون کو بے دست و پا نہین بنایا گیا۔

مدبرین برطانیہ کو اسی جنگ مین تجربہ ہو چکا ہو کہ ہندوستان اپنی وسعت آبادی کے باعث جس آسانی کے ساتھ جنگ یورپ کو ختم کر دے سکتا تھا محض اس بنا پر نہین کر سکا کہ یہان کے باشندے اسلحہ کے استعمال سے بیگانہ بنا دیے گئے۔ ورنہ ارض قدیم مین جو آگ لگی ہوئی تھی اُس کے بُجھانے کے لیے نئی دنیا کے پُر امن باشندون کو زحمت گوارا کرنے کی حاجت نہ ہوتی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا یہ مطالبہ کم سے کم سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان مین کامل ذمہ دار حکومت قائم ہونے کی کوئی قریبی میعاد مقرر ہو اور میعاد کے طور پر ایک طرف وہ تمام جابرانہ قوانین منسوخ کر دیے جائین جو انگلستان یا امریکہ حتی کہ برطانوی نوآبادیون مین اگر رائج کیے جاتے تو آج وہان بھی اسی قسم کے انقلاب رونما ہوتے جیسے کہ روس مین واقع ہوے اور دوسری طرف اہل ہند کو کامل شخصی آزادی حاصل ہو جو متمدن اور مہذب ممالک کی موجودہ تمام ترقیات کا سرچشمہ اور انسانون مین حقیقی شرافت اور اصلی خودداری پیدا ہونیکا منبع ہو اور اگر وزرائے برطانیہ اہل ہند کو دائمی غلامی مین رکھنا ہی اپنے مفاد قومی اور عروج ملکی کا واحد ذریعہ سمجھتے رہے تو شاید وہ دن دور نہین جب کانگریس اور مُسلم لیگ کی متحدہ آواز مجلس اقوام کے سامنے یہ مطالبہ کرین کہ ہندوستان برطانوی سایۂ عاطفت سے نکل کر کامل آزاد حکومت قائم کرنا چاہتا ہو۔

اہل ہند اس بات سے ناواقف نہین کہ جب تک وہ غیر اقوام کے حملون کی مدافعت کے ناقابل ہین اُن کے لیے آزادی کا خواب دیکھنا گویا اپنی بربادی کا سامان کرنا ہو۔ لیکن خدارا ان کو ایسا مجبور نہ بنایا جائے کہ وہ اپنی ہلاکت اور دنیا کے تہ و بالا ہو جانے سے بے پرواہ ہو جائین۔ اور وہ دلیرانہ اختیار کر بیٹھین جنھون نے آج دنیا کی سلطنتون کو

تاجدارون سے خالی کر دیا ہے۔

ہندوستانیون سے زیادہ امن پسند کوئی قوم پردۂ دنیا مین نہین لیکن اُن کی اَمن پسندی کا یہ صلہ تو نہونا چاہیئے کہ اُن کی حالت چوپایون کی سی بنا دی جائے۔

یہ کہ ایک ہندوستانی پیکر برطانوی وزارت کا رکن بنا کر دارالامراء مین بٹھا دیا گیا یا مجلس جنگ اور صلح کانفرنس مین ہندوستان کو نمائندگی کا حق دے دیا گیا ہر چند کہ بجائے خود قابل احترام اور موجب افتخار ہو لیکن جب ہم دیکھتے ہین کہ اس کے بعد بھی جنوبی افریقہ مین ہمارے ساتھ غلامون کا جیسا برتاؤ کیا جاتا ہو اور خود ہندوستان مین ہمارے بھائی زمین پر رینگنے کے لیئے مجبور بنائے جا سکتے ہین تو ناممکن ہو کہ موجودہ حالت ہمارے لیئے وجہ تسلی ہو سکے یا ذمہ دار حکومت کی کوئی ایسی قسط ہمین مطمئن کر سکے جسکے رو سے ہم اقوام عالم کی بزم مین اپنا سر بلند کر سکین۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہو

حضرت مسیح کا یہ قول کتنا صحیح ہو کہ انسان کو دوسرے کی آنکھ کا تنکا تو دکھائی دیتا ہو پر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہین پڑتا۔ چنانچہ مدبرین برطانیہ پر تو روز روشن کی طرح عیان ہو کہ آرمینیا، فلسطین، شام، عرب اور عراق عرب کے باشندے ترکی حکومت کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہین لیکن انھین بھولے سے بھی کبھی یہ یاد نہین آتا کہ مصر اور ہندوستان کے رہنے والے بھی کم سے کم اپنی موجودہ غلامانہ زندگی پر قانع نہین ہین۔ حالانکہ ترک جیسی حکومت کرنے کے ناقابل قوم کے ماتحت صوبجات کے بسنے والے اگر حق انتخاب حکومت سے مستفید ہونے کے سزاوار سمجھے جا سکتے ہین تو برطانیہ عظمیٰ کی سی باسلیقہ اور اعلیٰ درجہ کی خوش انتظام حکومت کی وفادار رعایا کے حقوق آزادی تو یقیناً بہت زیادہ قابل اعتنا ہین۔

اصل یہ ہو کہ مغربی تہذیب باوجودیکہ مادی ترقیات کے لحاظ سے منتہائے عروج پر پہونچ گئی ہو مگر روحانیت سے قطعاً معرّیٰ ہو۔ اسی وجہ سے صداقت و دیانت کا معیار مغربی قومون مین اس قدر پست ہو کہ وہ عدل و انصاف کی حقیقی ماہیت سے کبھی آشنا نہین ہو سکتے اور اس زرین مشورے پر عمل کر سکتے ہین ؎

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھین ناگوار ہوتا

مسلم لیگ پر اگرچہ ان معاملات کے متعلق جداگانہ تبصرہ کی ضرورت نہین اس لیئے کہ سیاست ملکی مین کانگریس لیگ دونون کا مطمح نظر یکسان ہو۔ البتہ اس کی گاؤکشی ترک کیئے جانے کی تجویز کا خیر مقدم ضروری معلوم ہوتا ہو کہ ذریعے سے ہند و مسلمانون کے درمیان رابطہ اتحاد زیادہ مستحکم ہو جائے گا۔

ہمین معلوم نہین کہ بزرگان لیگ نے اپنی اس تجویز کو عملی طور پر کارگر بنانیکی کیا راہ سوچی ہو کیونکہ محض کسی تجویز کا مسلم لیگ جیسی مصروف خواب مجلس مین منظور ہوجانا توحقیقی طور پر موثر نہین ہوسکتا۔ اگر عہدہ داران لیگ فی الحقیقت چاہتے ہین کہ مسلمانان ہندوستان اس تجویز پر عمل پیرا ہون تو انھین اول تو عام مسلمانون کو پوری سرگرمی کے ساتھ اس طرف متوجہ کرنے کی موثر تدابیر اختیار کرنا چاہیئے۔ اور دوسرے یہ امر بھی نہایت ضروری ہو کہ غریب نادار مسلمانون کو جن اقتصادی مشکلات کی وجہ سے گاؤکشی کا ترک کرنا دشوار و گران معلوم ہوتا ہو اُن کے رفع کرنے کی بھی باقاعدہ کوشش کرنا چاہیئے۔

گو مسلم لیگ نے خلافت اور حکومت ترکی کے بارہ مین غالبًا اس وجہ سے زیادہ سرگرمی کا اظہار نہین کیا کہ اس مقصد کے لیئے خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی امرتسر مین منعقد کیا گیا تھا۔ چنانچہ خلافت کانفرنس نے جیسی توقع تھی پوری آزادی کے ساتھ مسلمانون کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ اینگلو انڈین حلقون مین اگرچہ ترکون کے ساتھ اظہار ہمدردی ایک ایسی معصیت کبیرہ ہو کہ ان کا بس چلے تو ہندوستان کے تمام مسلمانون کو جزائر انڈمان مین آباد کرنے کیلیئے بھیجدین لیکن انھین غصہ کرنے کے بجائے فی الحقیقت ہمارا شکرگذار ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے خیالات کو چھپاتے نہین بلکہ آزادی کے ساتھ بیان کرکے برطانوی مدبرین کو ایک عظیم الشان خطرہ سے آگاہ ہونے کا موقع بہم پہونچاتے ہین۔ افسوس ہو کہ تعصبات کی وجہ سے انسانی عقلون پر پردے پڑجاتے ہین ورنہ اگر حکومت برطانیہ کے ارباب حل و عقد مسٹر محمد علی کے اُس لاجواب مضمون سے رہنمائی قبول کرتے جو "ترکون کا انتخاب" کے عنوان سے کامریڈ مین شایع ہوا تھا۔ تو نہ صرف یہ کہ جنگ اس درجہ طوالت پذیر نہ ہونے پاتی بلکہ آج برطانوی مدبرین اور دنیا کے امن پسند باشندے ایک حقیقی اور پائدار صلح کی لذتون سے محروم نہ رہتے۔

اگر مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ اور وزارت برطانیہ کے دیگر مقتدر اراکین اب بھی مسلمانون کے مشورون پر کاربند ہون اور صلح کانفرنس کی اُن تجاویز کو تسلیم نہ کرین جو دنیاے اسلام کو عمومًا اور مسلمانان ہند کو خصوصًا ہمیشہ کے لیئے اُن سے بد دل کرنے کا ذریعہ ہونیوالی نظر آتی ہین تو یقینًا یہ دنیا بہت جلد امن و سکون کی نعمتون سے مالامال ہوجائیگی۔

برطانیہ عظمیٰ کا جو اقتدار مجلس صلح مین ہو اُسکے لحاظ سے کوئی شخص ایک لمحہ کے لیئے یہ باور نہین کرسکتا کہ ترکی حکومت کے بارہ مین جو تصفیہ مجلس صلح کریگی اس کی ذمہ داری برطانوی مدبرین پر عائد نہین ہوتی کیونکہ اگر ممالک متحدہ امریکہ کی حکومت کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ ترکی حکومت کے کسی صوبہ کی حکم برداری قبول کرنے سے انکار کرشے تو برطانیہ عظمیٰ کو جس کی وسیع مملکت مین کرورون مسلمان آباد ہین اراکین صلح کانفرنس ہرگز مجبور نہین کرسکتے کہ وہ عراق عرب فلسطین یا آرمینیا کی حکم برداری کا بار گران اُٹھائے لیکن اگر مسٹر لائڈ جارج کی راے عالی مین مجاہدین جنگ صلیبی کے جلے پھپھولے پھوڑنے یا اقتدار شاہنشاہی کی توسیع کرنے کا اس سے بہتر موقع نہین میسر آسکتا تو پھر بجز اس کے کچھ عرض کرنے کی گنجائش باقی نہین رہتی کہ

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

---

# ہماری تعلیمی پستی

(بسلسلۂ الناظر ماہ دسمبر ۱۹[illegible]ء)

ہماری تعلیمی پستی کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کے ذکر کے لیئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہو۔ تاہم اختصاراً اُن کو ہم تین حصوں میں بیان کرسکتے ہیں اور اگر اُن نقائص کی تلافی کردی جائے تو بہت کچھ اصلاح کی شکل نکل سکتی ہو (۱) طریقۂ تعلیم کے نقائص (۲) مصارف کی ضررساں کمی (۳) یورپین و ہندوستانی اسٹاف کی موجودہ تفریق اور اُن کی تنخواہوں کا تفاوت۔

اگر سچ پوچھو تو حقیقی تعلیم کسی قوم کی اسی وقت ہوسکتی ہو جب جملہ علوم و فنون اور لٹریچر (ادب) کی تعلیم اُسی ملک کی قومی زبان میں دی جا وے اور تاریخ، ادب، مذہبی کورس وغیرہ کی عمارت اس قوم کی گذشتہ عظمت کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہو۔ اپنے ملکی بھائیوں کی تعریف کریں گے کہ انھوں نے اپنی خداداد قابلیت وذہانت کی وجہ سے اپنی لیاقت کا سکہ غیر ملکوں پر بٹھا دیا تاہم جس بات کے ہم متلاشی ہیں وہ تو بغیر اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کیے نہیں ہوسکتی موجودہ طریقۂ تعلیم کا یہ اثر ہو کہ تحصیل علم کو واقعات زندگی سے کوئی ربط نہیں ہو۔ اس وجہ سے دل پر وہ ایک بارِ گراں سا معلوم ہوتا ہو۔ یہ طریقہ قوائے ذہنی کو بالکل پارہ پارہ اور بے حس کردیتا ہو حالانکہ برعکس اس کے طریقۂ تعلیم کچھ اِس اسلوب پر ہو کہ بچوں کی نشو و نما میں موید ہو۔ یہ طریقہ ہمارے نوخیز بچوں اور لڑکیوں کو اِس بات پر مجبور کرتا ہو کہ وہ دوسروں پر بھروسہ کریں اور خود مجہول مطلق بنے رہیں علاوہ ازیں چونکہ مدرسوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اِس لیئے لڑکوں کے اخلاق بُرے اور عادات مذموم ہوتے جارہے ہیں اور اخلاق کی خرابی قوائے ذہنی کی کمزوری کا باعث ہوتی ہو غرضکہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں وہ روحانیت کا جذبہ، وہ یکسوئی کا خیال اور وہ اتحادِ عمل کا ولولہ نہیں پیدا ہونے پاتا جس سے کہ بچوں میں حب قومی کی آتش بھڑک اُٹھے اور اُن کے قلوب کو گرما دے۔ ہم کو تاریخ پڑھائی جاتی ہو لیکن ہمارے ہیروز کے کارنامے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترستی رہتی ہیں۔ البتہ عالمگیر کے ظلم شاہجہاں کی عیش پرستی، جہانگیر کی مےنوشی اور محمود غزنوی کی بت شکنی کی داستانوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اِس قسم کی قومیت کے خیال سے بیگانہ تصانیف وکتب زنگ کی طرح بچوں کے قومی جذبات میں

لگ جاتی ہیں جو پھر ساری عمر کے واسطے اُن کے خیالات کو خراب کر دیتی ہیں۔ ان سے بجائے اس کے کہ بچوں میں ہیرو ورشپ کا خیال ترقی پذیر ہو۔ نفاق و عناد کے شعلے اور بھی بھڑک اُٹھتے ہیں اور یہ خیالات کچھ اس طرح ایام طفولیت میں طبائع پر اثر کر جاتے ہیں کہ ساری عمر ایمان بن کر ہمارے بچوں کے دماغ میں گھر بنائے رہتے ہیں۔ غرضکہ افضل ترین طریقۂ تعلیم وہی کہا جا سکتا ہے جو قومیت کی شاہراہ تک پہونچنے کا ایک ذریعہ ہو۔ مسٹر جادو ناتھ سرکار مولف تاریخ اورنگ زیب" نے کچھ عرصہ ہوا ماڈرن ریویو میں ایک مضمون لکھا تھا جسکا اقتباس دیکر ہم مروجہ طریقۂ تعلیم کے نقائص دکھانا چاہتے ہیں۔ "ایک غیر مکمل زبان میں تعلیم دیے جانے سے ہندوستانی طلبہ کی عمر کا بیش قیمت حصہ محض تضیع اوقات میں برباد ہوتا ہے جس کے باعث اُن کی ذہانت و قابلیت کبھی اس درجہ تک نہیں پہونچ سکتی جس درجہ تک مغربی ممالک کے طلبہ ترقی کر جاتے ہیں حالانکہ جتنے سال ایک ہندی نوجوان کو میٹرک پاس کرنے میں لگتے ہیں اس سے دو تہائی مدت میں انگلستان میں طلبہ کیمبرج یا آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں داخلہ کا استحقاق پیدا کر لیتے ہیں اور تین سال یونیورسٹی میں گذرنے کے بعد گریجویٹ ہو جاتے ہیں گویا ہمارے یہاں کے میٹرک اور وہاں کے گریجوٹیوں کی مدت تعلیم برابر ہوتی ہے" ہندوستانی کالجوں اور اسکولوں میں کچھ ایسا کورس رکھا جاتا ہے کہ اس سے بجز اس کے کہ گورنمنٹ کے لیئے کارآمد کلرک پیدا ہوں اور کوئی فائدہ نہیں۔ دماغ کو بیکار اور ذہانت کو غارت کرنے کی ذمہ داری تمامتر اس طریقۂ تعلیم پر ہے۔ کثرت سے مضامین رکھے جاتے ہیں اور پھر خواہ اُن سب سے طالب علم کو ذوق ہو یا نہ ہو یونیورسٹی کو اس سے غرض نہیں۔ عمر کا ایک بڑا حصہ اُس کے نذر ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کو چشموں کی ضرورت زمانہ طالب علمی ہی میں پڑ جاتی ہے۔ پھر امتحانات کا طریقہ بھی بدترین کہا جا سکتا ہے مغربی ممالک میں تو محض پروفیسروں کی جانچ پر ترقی کا انحصار ہے جو نہایت ہی بہتر طریقہ کہا جا سکتا ہے ہمارے یہاں اگر کوئی بچہ کسی مضمون میں ناکامیاب ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ دوسرے سال محض اسی ایک مضمون میں اس کا امتحان ہو اور اُس کو موقع مل سکے کہ اس مضمون کی خامی کو رفع کر سکے۔ از سرنو کل مضامین میں اُس کو امتحان دینا پڑتا ہے جس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا علاوہ ازیں یہاں کی یونیورسٹیوں میں کسی خاص علم کو درجۂ تکمیل تک پہونچانے کی سہولتیں بہت کم ہیں۔ انگلستان میں دو طرح کے امتحانات ہوتے ہیں۔ ایک میں محض معمولی کامیابی ہوتی ہے۔ دوسرے میں

اعزاز کے ساتھ. قبل اسکے کہ اعزاز (آنرز) والا طالب علم یونیورسٹیوں کے کلاسوں میں داخل ہو اس کو ابتدا ہی سے خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ اوران خاص مضامین کے پڑھانے کے لیئے خاص اُستاد مقرر رہتے ہیں جو روزانہ لڑکے کو اس خاص مضمون کا جسمیں وہ خصوصیت کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے، دو ایک گھنٹہ سبق دیتے ہیں، جب وہ یونیورسٹی کے درجوں میں پہونچتا ہے تو وہاں ہر علم کی علحدہ علحدہ چیرز (کرسیاں یا جگہیں) مقرر رہتی ہیں۔ اس کے لکچرار علحدہ ہوتے ہیں۔ تعلیم کے لیئے علحدہ خاص اوقات طالب علموں کو دیئے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاں کے سے معلم نہیں کہ نام کو تو وہ ٹیوٹر (معلم) ہیں لیکن اصل میں اپنے لڑکوں سے خفیہ پولیس کا کام لیتے ہیں۔ اس طریقہ تعلیم کے نقائص کو ریونڈ مسٹر ایڈمانڈ ریوز نے نہایت شرح و بسط سے دکھایا ہے، جرمنی، فرانس، بلجیم اور اٹلی میں محض ادب یا بعض دیگر علوم کی تعلیم کا نام تعلیم نہیں بلکہ صنعتی تعلیم کا ان ممالک میں ایسا معقول انتظام ادبی تعلیم کے دوش بدوش جاری ہے کہ گویا دونوں لازم و ملزوم قرار پا گئے ہیں صنعتی تعلیم کا مفصل ذکر تو ہم آئندہ اپنے کسی دوسرے مضمون میں کریں گے۔ تاہم یہاں اتنا کہنے سے ہم باز نہیں رہ سکتے کہ صنعتی تعلیم کی جانب اول ہی سے کچھ ایسی بے التفاتی برتی گئی کہ آج تک اس شعبہ میں ذرہ برابر ترقی کے آثار نظر نہیں آتے اور اسی تعلیمی نقص کا نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں خال خال لوگ ایسے نکلنے پائے ہیں جنھوں نے کوئی نئی ایجاد کی ہو۔ یہاں کے تعلیمی نقائص کو دیکھ کر اکثر ذی حیثیت لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا ہے کہ بچپن ہی سے اپنے بچوں کو ولایت بغرض حصول تعلیم بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ سول سروس وغیرہ کے امتحانات میں کامیاب ہوسکیں لیکن اس میں مصارف کثیر اُٹھانا پڑتے ہیں۔ اس طریقہ کو ہم پسندیدہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ بچوں میں ہماری قومی خصوصیات اکثر مفقود ہو جاتی ہیں خواہ وہ لنکنز ان یا انر ٹمپل کے گریجویٹ ہوں یا مڈل ٹمپل اور گریز ان کے لیکن جب گورنمنٹ کو قومی یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ اسلامی یونیورسٹی نام رکھنے کی اجازت دینے میں اس قدر گریز ہے تو قومی خصوصیات کے ساتھ تعلیم دینے کی اجازت دینے اوران درسگاہوں کے ڈگری یافتوں کو تسلیم کرنے میں گورنمنٹ سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔

لیکن یہاں تعلیم گو ممالک یورپ کی طرح اعلیٰ لائنوں پر نہ دی جاتی تھی تاہم عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے کے بعد جب ہمارے تعلیم یافتہ حضرات انگلش لٹریچر و رسالہ جات و اخبارات کو صحیح طور پر مطالعہ کرنے اور متمدن ممالک کے رعایا و بادشاہ کے تعلقات اور آئینی طرز حکومت کے فوائد ان کے ذہن نشین ہونے لگے

تو ایک گروہ ملکی فدائیوں کا پیدا ہوا جس نے ہندوستان کے سیاسی مسائل پر اپنے سمندِ قلم کو جولانی دینا شروع کیا اور پیاز کے چھلکوں کی طرح حقیقت حال کو ظاہر کر دیا۔ اور اُنھوں نے اُن عہود و مواثیق کے ایفا پر زور دیا جو گورنمنٹ برطانیہ اُس کی پارلیمنٹ اور اراکین مجلس وزرا اہلِ ہند سے کرتے چلے آرہے تھے۔ تب تو شاہ پسند مدبران انگلستان کے کان کھڑے ہونا شروع ہوئے۔ ان ہونی بات یہ ہوئی کہ لارڈ کرزن جیسے استبداد پرست شخص یہان کے وائسرائے ہوئے۔ اُنھوں نے تین ہی سال بعد اعلیٰ تعلیم کے دروازوں کو اہل ہند پر بند کرنے کی تدابیر نکالنی شروع کین: چنانچہ بعض بعض کالج ( [illegible] ) کے پردے مین توڑ دیے گئے۔ اسکولوں اور کالجوں کی فیسیں زیادہ کر دی گئیں اور مصارف تعلیم اس قدر بڑھا دیے گئے کہ غریب اور متوسط الحال لوگوں کی اولاد کے لیے ان اخراجات کا برداشت کرنا یا دوسرے لفظون میں تعلیم حاصل کرنا غیر ممکن ہوگیا کالجان اور اسکولوں میں ہر درجہ کیلئے طلبہ کی تعداد مقرر کر دی گئی کہ اس سے زائد لڑکے نہ داخل ہوسکیں یہ طریقہ بظاہر نہایت معقول تھا لیکن اس میں جس قباحت کا سامنا ہوا وہ یہ کہ سیکڑوں بچے میٹرک اور اسکول لیونگ پاس کرکے کالجوں میں جگہ نہ ملنے کے باعث مارے مارے پھرنے لگے۔ اور ناکامیاب طالبعلموں کا تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں رہتا۔ تتبع تو غیر ممالک کا کیا گیا لیکن سرکار کا فرض تھا کہ کالج اور اسکول اسی نسبت سے برابر بڑھاتی رہتی جس سے کہ عام تعلیم ترقی پذیر ہورہی تھی پھر یہ دقت جو آج سیکڑوں طالب علموں کو درپیش رہتی ہے وہ رفع ہو جاتی۔ لیکن اس طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی۔ گو ہم بھی اس خیال کو پسند کرتے ہیں کہ طلبہ کو زمانہ طالب علمی میں سیاسی معاملات میں عملی حصہ نہ لینا چاہیئے۔ تاہم اس کو کوئی خود دار اور محب وطن شخص ہرگز پسند نہیں کرسکتا کہ اپنے ملک کی آیندہ کی امیدوں اور نونہالوں کو قطعی طور پر مجبور کیا جائے کہ وہ قومی لیڈروں اور سیاسی رہنماؤں کے لکچروں کو نہ سنیں۔ ایسی سختیوں اور ایسی قید و پابندی کی حالت مین بھلا کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آگے چل کر قابل شہری بن سکیں گے ان ہی ایام میں ایک سرکلر سر ہربرٹ رزلے نے جاری کیا تھا جو بعد کو "رزلے سرکلر" کے نام سے یاد کیا جانے لگا اس کا منشا یہ تھا کہ طالب علم تو درکنار خود استاد بھی سیاسیات سے دور رہیں غرضیکہ سیاسیات کو طالب علمون کے واسطے ایسا جان لیوا خیال کیا گیا کہ نہ صرف طالب علموں اور استادوں کو سیاسی جلسوں کی شرکت سے روکا گیا بلکہ والدین پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے

سمجھدار لڑکوں کو جو کالجوں کے اعلیٰ درجوں میں زیر تعلیم ہوں ایسے جلسوں کی شرکت سے روکین جن میں ملکی معاملات پر تقریریں ہونے کا خیال ہو اور یہ سب اس لیے کیا گیا کہ ایسے جلسے لڑکوں میں حب قومی اور آزادی اور حریت کی روح پھونکنے کا سبب ہوتے ہیں اور ہمارے بیورو کریٹ حکام کیسے طالب علموں کی اس خرابی کو ٹھنڈی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی سرکار نے طالب علموں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا تھا کہ "قانون تحفظ ہند" کے نام سے عفریت سیاسیات نے ایک پری جمال کا بھیس بدلا اور اس بارگاہ ناز نے اس معشوقانہ بے رحمی سے نوجوان طالب علموں کو گھائل کرنا شروع کیا۔ کہ سارا ملک چلا اٹھا۔ پھر صرف قانون تحفظ ہند ہی نہیں بلکہ خود استاد بعض اوقات اپنے شاگردوں کی گردن میں ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے اعلیٰ حکام کے حضور میں سرخرو بننے کے لیئے جاسوسی کا کام انجام دیتے ہیں استاد جو مشرقی ممالک میں مثل باپ کے سمجھا جاتا ہو۔ ایسا بداخلاق بن جاتا ہو کہ خود اپنے ہی شاگردوں کے خلاف جھوٹ سچ خبریں دیتا ہو۔ لیکن محکوم ممالک میں نہ جانے کتنی اس طرز کی بداخلاقیوں کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں۔

اپنے ملک میں تعلیم کی اشاعت کافی طور سے نہ ہو سکنے کے باعث ہم صرف تعلیمی مصارف کی کمی کو قرار دے سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری بجٹ میں فوجی اور انتظامی مصارف کی مد میں آئے دن ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہو لیکن تعلیمی مصارف کی مد میں نہایت ہی تساہل برتا جا رہا ہو۔ حالانکہ ان مصارف کی کمی نے سرکاری آمدنی کو بھی ایک طرح نقصان پہونچایا ہو کیونکہ صنعتی تعلیم جس کا ذکر تفصیلی طور سے ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں کریں گے، اگر کافی طور سے دی جاتی اور اس پر دریا دلی سے روپیہ صرف کیا جاتا تو آج ہوا کا رخ ہی پلٹا ہوا نظر آتا اور آج ہندوستان دنیا کے متمدن ممالک کی صف میں ایک غریب اور محتاج ملک کی حیثیت سے نہ نظر آتا۔ اس کی مالی حالت، اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی کہ اس عالمگیر جنگ میں گورنمنٹ برطانیہ کو امریکہ کا منھ نہ دیکھنا پڑتا بلکہ خود ہندوستان خاصی مالی امداد دے سکتا۔

ایک مورخ نے حقیقت حال کا کیا اچھا انکشاف کیا ہو کہ جرمنی کو جینیا کی شکست اور فرانس کو سیڈان کی شکست کے بعد محض تعلیم ہی کے باعث یہ عروج کا دن دیکھنا نصیب ہوا۔ برطانیہ عظمیٰ کو کیمبرج لیڈز برنگھم گلاسگو، سنیڈ ہرسٹ، وولیچ، اور اڈنبرا کی سی درسگاہوں پر جس قدر ناز ہو تھوڑا ہو اور یہی سبب ہو کہ انگلستان

سمندر کی ملکہ بنی ہوئی ہے یہ مثل زبان زد عام ہو رہی ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کے مقبوضات میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ درسگاہیں چند لاکھ روپیہ کے صرف سے نہیں تیار ہو پائی ہیں بلکہ کروڑوں اور اربوں روپیہ کے صرف کے بعد آج ہم اُن کو ایسی حالت میں دیکھتے ہیں کہ جس پر رشک آتا ہے۔ لیکن مصارف تعلیمی کو تو ایک طرح کی تجارت سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ جسطرح نہریں اور باغات ابتدا میں تو خرچ چاہتے ہیں لیکن بعد کو خاطر خواہ آمدنی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح علمی کاموں پر روپیہ صرف کرنا ضایع نہیں جاتا بلکہ قریب ہی زمانہ میں اُس کے فوایدسے سرکار اور رعایا دونوں بہرہ اندوز ہونے لگتے ہیں،

اہل کانگرس ابتدا سے ہر سال اس بات پر زور دیتے چلے آرہے ہیں کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ اپنے سالانہ بجٹ میں تعلیمی مصارف کے لیے زیادہ روپیہ رکھا کرے اور فوجی و سول اخراجات کو کم کر کے صنعت و حرفت اور عام تعلیم کے اخراجات نکالے کیونکہ گورنمنٹ برطانیہ کے دامن عدل و حق پرستی پر ایک بدنما داغ ہے کہ وہ اہل ہند کی تعلیم کی طرف اتنی سرگرمی کا اظہار نہیں کرتی جتنا کہ دیگر شعبجات مثل فوج ریلوے وغیرہ پر کرتی ہے۔ اس سال کے سالانہ بجٹ کو پیش کرتے ہوئے مسٹر شنکارن نائر نے یہ مژدہ سُنایا تھا کہ جس وقت ۱۹۱۵ء میں انھوں نے تعلیم کی ممبری کا چارج لیا تھا اُس وقت گورنمنٹ سوا چار کروڑ روپیہ جملہ اقسام تعلیم پر صرف کرتی تھی۔ سال گزشتہ یہ رقم پانچ کروڑ ہوگئی۔ اور یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ سال آئندہ چھ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ جس قدر چیخ پکار کا یہ نتیجہ تو نکلا کہ تعلیمی مصارف کو بڑھانے کی طرف گورنمنٹ کا قدم کچھ کچھ سُبک خرامی کو چھوڑتا جا رہا ہے اب سے ۲۵ سال قبل تو حالت قریب قریب محرام کی تھی کیونکہ ۱۹۰۲ء میں مسٹر گوکھلے نے اپنی بجٹ اسپیچ میں دکھایا تھا کہ ۸۶-۱۸۸۵ء سے ۹۰-۱۸۸۹ء تک یعنی پانچ سال کی مدت میں سرکاری امداد ایک کروڑ ۴ لاکھ سے محض ایک کروڑ ½ ۱۳ لاکھ تک بڑھ پائی تھی یعنی چھ فی صدی سے بھی کم حالانکہ انگلستان میں تعلیمی مصارف پندرہ برس میں ½۴ ملین پونڈ (¾۶ کروڑ روپیہ) سے بڑھ کر ½ ۱۱ ملین پونڈ (¼ ۱۷ کروڑ روپیہ) ہوگئے یعنی ڈیڑھ سو فیصدی کا اضافہ ہوگیا تھا اور اُس پر بھی لارڈ روزبری نے اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مسٹر تلانگ نے کانگرس ۱۸۸۳ء میں اپنی تقریر میں بیان کیا تھا کہ گورنمنٹ ہند تعلیمی مصارف کے لیئے اپنی آمدنی کا محض ایک فیصدی دیتی ہے۔ ابھی کمی خراجات اور

بجا قطع و برید ہی کا نتیجہ ہی کہ اس وقت تک ابتدائی تعلیم ملک میں نہیں پھیل پائی ہی۔ ۱۹۱۱ء میں جب مسٹر گوکھلے نے اپنا مشہور مسودہ قانون امپیریل کونسل میں سات برس کی مسلسل محنت کے بعد پیش کیا تھا تو گورنمنٹ نے مسٹر موصوف کی فراہمی اعداد کی داد دیتے ہوئے یہ کہکر اس بل کو مسترد کر دیا کہ گورنمنٹ اپنے بجٹ میں مزید مصارف کے لیے کوئی مدقایم کرنے سے مجبور ہی، حالانکہ قدرتی صدود (سائنٹفک فرانیٹر) کے خیال کو اس قدر ضروری اہم سمجھا گیا کہ کروروں روپیہ پر پانی پھر رہا ہی۔ اخبار نیو انڈیا میں مسٹر اسنوڈن ممبر پارلیمنٹ نے ایک بیش بہا مضمون انگلستان کی تعلیمی حالت پر لکھا ہی۔ اس مضمون کے دوران میں وہ فرماتے ہیں "جس طرح کسی قوم کی سلامتی کا راز یہ ہی کہ وہ اپنی حفاظت کے لیئے دلیرانہ تدابیر اختیار کرے اسی طرح تمدنی صلاح اور اخلاقی ترقی کا دار و مدار تعلیم پر ہی" لیکن ہم کہیں گے کہ تعلیم پر محض اصلاح تمدن ہی کا انحصار نہیں ہی بلکہ قوم کی مالی حالت کا راز بھی تعلیمی ترقی ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں کسی قسم کا کاروبار اور صنعتی کام بلا تعلیم حاصل کیئے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر سچ پوچھیئے تو ہندوستانی صنعتوں کی تباہی کا اصل سبب یہی ہی کہ یہاں کے کاریگر اور صناع جاہل رہ گئے۔ درانحالیکہ دیگر ممالک کے صناع تعلیم پاکر انواع اقسام کی چیزیں ایجاد کرنے لگے۔ اب ان ممالک کی ایجادات کے مقابل ہماری فرسودہ مصنوعات اور کہنہ صناعیوں کا نام کوئی کیوں لینے لگا۔ اس جگہ پر مناسب معلوم ہوتا ہی کہ مصارف تعلیمی کا وہ نقشہ جو کسی دوسری جگہ ہم دے چکے ہیں پھر دیا جائے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہندوستان مصارف تعلیمی کے معاملے میں دیگر ممالک سے کس قدر پیچھے ہی۔

| نام ملک | مصارف تعلیمی فی کس | نام ملک | مصارف تعلیمی فی کس |
|---|---|---|---|
| آسٹریا | ۶ر | بلجیم | ۶ر |
| فرانس | ۶ر | جرمنی | ۷ر |
| برطانیہ عظمی | ۱۱ر | روس | ۲ر |
| ہندوستان | ایک پیسہ! | کناڈا | ۱۰ر |

ابتدائی تعلیم کے اعداد آخری بجٹ کے مباحثہ کے دوران میں آنریبل مہاراجہ سر منیدرا چندر نندی کے

سوال کا جواب دیتے ہوئے سرشنکارن نائر ممبر تعلیمات نے حسب ذیل پیش کیے تھے جو چشم عبرت وا کرنے کو کافی ہیں:-

برطانوی ہندوستان میں کل روپیہ جو جملہ شعبہ جات تعلیم پر ۱۲-۱۹۱۱ء میں صرف کیا گیا اس کا اوسط فی کس ۴۵۶ تھا۔ اور ابتدائی تعلیم کے مصارف کا اوسط فی کس ۱۱۵ تھا۔ مقابلۃً ابتدائی تعلیم کا یہ حال ہے:-

| | | |
|---|---|---|
| ہندوستان | سنہ ۱۹۱۱ء | ،۰۷۹ |
| انگلستان اور ویلز | سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء | ۱۰،۰۰۰ |
| فرانس | سنہ ۱۹۱۱ء | ۳،۳۶۴ |
| جرمنی | سنہ ۱۹۱۱ء | ۷،۹۱۰ |
| جاپان | سنہ ۱۹۱۱ء | ۱،۶۶۷ |
| متحدہ امریکہ | سنہ ۱۹۱۲ء | ۱۶،۵۷۰ |

کیسے سبق آموز، کیسے عبرتناک، کیسے تحیر خیز۔ اور کیسے پرافسوس ہیں یہ اعداد؟ اس کا اندازہ تو کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل حق و صداقت آزادی و حریت اور رحم و انصاف کے امن ہیں۔ خود انگلستان جس کی ہر اچھی چیز ہمارے لیے نقل کا ایک نمونہ ہے ہم سے تعلیمی مصارف میں کس قدر آگے ہے لیکن ہندوستان کی نا قابلیت اور جبری تعلیم سے غیر موزونیت کا ذکر کیا جائے تو ہم ریاست بڑودہ کا ذکر کرینگے۔ وہاں کے علم دوست اور زمانہ شناس حکمران کی صاحبان علم کی قدردانی کے واقعات کو اگر اس جگہ بے محل تصور کیا جائے تو آؤ ذرا وہاں کے تعلیمی مصارف کا اندازہ کریں۔ ریاست بڑودہ میں اس سال تعلیمی مصارف کی مد میں ۲۲ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا۔ اس سے پیشتر سالانہ تعلیمی مصارف ۹ لاکھ تھے جو ریاست کے محاصل کا ۱/۲ حصہ ہوتے ہیں۔

موجودہ نظام تعلیم کا ایک اہم اور نہایت ہی قابل توجہ و اصلاح طلب نقص یہ ہے کہ تعلیم خواہ ابتدائی ہو یا اعلیٰ ہر ذمہ دار جگہ کو گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس کی سیاسی پالیسی میں تغیرات کے ساتھ نظام تعلیمی میں تبدیلیاں اور جدتیں ہوا کرتی ہیں حالانکہ تعلیم کے حق میں اس سے زیادہ برباد کن کوئی دوسری پالیسی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ممالک میں تعلیمی معاملات تمام تر رعایا کے ہاتھ میں رکھے گئے ہیں جس میں کسی کرزن صفت شخصیت کو مداخلت کا اختیار ہے اور نہ کوئی لوفرن مرتبت ہستی تغیرات اور تبدیلیوں کی مجاز۔

ہمارے ملک میں تعلیمی ملازمت کی دو شاخیں رکھی گئی ہیں، ایک انڈین سروس اور دوسرے پراونشل سروس

یعنی اعلیٰ جگہیں تقریباً کل کی کل صاحبان یورپ سے پُر ہیں۔ رہ گئے ہندوستانی وہ غریب ہماری عمر پر تحصیل سوں میں گذرنے کے بعد بھی مشکل سے ادنیٰ سروس کے حقدار ثابت ہوتے ہیں۔ اِس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہو کہ ایک نقشہ دیکر یہ دکھلایا جائے کہ ہندوستان مین تعلیم کی اعلیٰ جگہوں اور ادنیٰ مناصب کی تنخواہوں مین کیا نسبت قایم ہو

| افسران تعلیمی کی تنخواہین | | پروفیسرون اور لکچررون کی تنخواہین | |
|---|---|---|---|
| نام ملک | تنخواہ سالانہ | نام ملک | تنخواہ سالانہ |
| کناڈا | ۱۵ ہزار ۶ سو تیس روپیہ | ممالک متحدہ امریکہ | ۴۶۸۰ روپیہ |
| ممالک متحدہ امریکہ | ۱۵ ہزار ۶ سو تیس 〃 | انگلستان | ۱۵۰۰ 〃 |
| اسکاٹلینڈ | ۱۸ ہزار سے ۲۲ ہزار پانچ سو تک 〃 | آسٹریا | ۵۴۰ 〃 |
| | | جاپان | ۴۶۵ 〃 |
| انگلستان | ۲۷ ہزار 〃 | پرتگال | ۳۰۰ 〃 |
| ہندوستان | ۳۶ ہزار 〃 | ہندوستان | ۱۵۰ 〃 |

نقشۂ بالا کے بعد یہ ذکر فضول ہو کہ اول الذکر تنخواہوں کے پانے والے کون حضرات ہیں اور آخر الذکر جگہیں کن بدقسمت لوگون کے لئے مخصوص ہین!

یہ ایک اصول موضوعہ سا قرار پا گیا ہو کہ تعلیمی معاملات مین غیر ملکی عنصر کا غلبہ ہمیشہ مضرت رساں ہو۔ علم النفس کا یہ عالمگیر مسئلہ ہو کہ جب تک کوئی معلم اپنے شاگردون کے جذبات و حسیات کو بخوبی سمجھ نہیں پاتا اُس وقت تک وہ خاطر خواہ تعلیم ہرگز نہین دے سکتا۔ یورپین پرنسپل اور انسپکٹران ہمارے روایات سے ناواقف ہوتے ہین ہمارے حسیات سے ناآشنا اور ہماری زبان سے نابلد۔ چنانچہ انگلستان کا مشہور مضمون نویس لوئی اسٹیونسن لکھتا ہو جب تک زبان مین پوری مہارت نہو اُس وقت تک اہم ترین جذبات محبت انسان کے دل ہی مین مخفی رہتے ہین" بیشک ہمارے جذبات کی شدت و منزلت ہمارے مطالبات کی اہمیت کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہو جو ہمارے مزاج سے مانوس ہو تا ہو۔ ہماری ضروریات زندگی سے کامل آگاہی اُسی وقت ممکن ہو جب ہماری فطرت اور جغرافیائی حالات اور عادات کا بغور مطالعہ کیا جا چکا ہو۔ ۱۵۔۱۹۱۲ء کی پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ

مین یہ تجویز پیش کی گئی تھی بلکہ اُس کے نفاذ پر زور دیا گیا تھا کہ جو لوگ انگلستان سے بُلائے جایا کرین وہ صرف عہدہ پرنسپلی کے لیئے طلب کیئے جائین اور اگر پروفیسر خاص حالت مین طلب کیئے جائین تو ان ہی مضامین کے لیئے بُلائے جایا کرین جنمین ہندوستان کا معیار تعلیم یورپ کے برابر نہ ہو لیکن آج کل کی حالت ناگفتہ بہ ہو: ۳۰ برس کے زائد عرصہ کے بعد محض چھ ہندوستانی انڈین تعلیمی سروس مین داخل ہو پائے ہین ہندوستانی کو خواہ کتنا ہی قابل کیون نہ ہو اکثر بلکہ تقریباً سو فیصدی پروفیسری کی حالت مین عمر گزار دینا پڑتی ہو برعکس اس کے انگلستان کی یونیورسٹیون کے نکلے ہوے نوجوان سینیر پروفیسری کے عہدہ پر فائز ہو جاتے ہین جسطرح دیگر سروسون مین رنگ روپ کی تفریق جائز رکھی گئی ہو اسی طرح سے تعلیمی شاخ مین بھی سکا چلن رائج ہو۔ اس مرتبہ کے پبلک سروس کمیشن نے جو رپورٹ دی ہو اس مین سفارش کی ہو کہ پروانشیل اور انڈین ایجوکیشنل سروس کی ناگوار تفریق مٹا دی جائے، اور دونون کو ایجوکیشنل سروس کا نام دیا جائے۔ لیکن ساری سروس کے دو حصہ کر دیئے جائین: درجہ اول و دوم۔ درجہ اول مین ۲۶۴ اسامیان رکھی جائین۔ اور موجودہ ایجوکیشنل سروس کے ۱۹۹ ممبرون کو اس درجہ مین داخل کر کے باقیماندہ ۶۵ عہدون پر نصف کا انتخاب یورپین اسٹاف سے اور نصف کا ہندوستانی اسٹاف سے کیا جائے۔ چونکہ اس وقت ایجوکیشنل سروس مین قریب قریب کل اراکین یورپین ہین اس لیئے نتیجہ یہی نکلے گا کہ انہی کا عنصر غالب رہے گا اور ۲۶۴ جگہون مین سے محض ۱۳۲ اسامیان ہندوستانیوں کو ملسکین گی تنخواہون کا یہ حال ہوگا کہ ہندوستانیون کی تنخواہین ساڑھے تین سو روپیہ ماہانہ سے شروع ہو کر پچاس روپیہ سالانہ کی ترقی سے ساڑھے بارہ سو تک پہونچ سکین گی اور یورپین حضرات ۵۰۰ ماہانہ سے شروع کر کے ۵۰ سالانہ ترقی کے ساتھ ۱۵۰۰ تک ترقی کر پا وینگے فرق محض یہ رہیگا کہ یورپین پروفیسر ۱۵۰۰ تک محض ۲۰ برس مین ترقی پا جایا کرینگے اور ہندوستانیون کو اٹھارہ برس مین اتنی تنخواہ مل پاوے گی۔ ان ترقی یافتہ انگریز و ہندوستانیون مین سے دس فیصدی کو ڈیڑھ ہزار تک ترقی دے جاوے گی اور ان مین سے دس فیصدی کو دو ہزار تک اسطرح درجہ اول مین انگریز و ہندوستانی مساویانہ حیثیت سے ترقی کرتے رہین گے البتہ رفتار مین فرق رہیگا۔ ظاہر ہو جسکی ابتدا ۵۰۰ ماہانہ سے ہوگی وہ ۳۵۰ والے سے بازی لے ہی جاویگا تاہم اگر ان تجویزات پر سنجیدگی کے ساتھ عملدرآمد شروع ہو گیا اور مثل بیشتر کے کمیشنون کی رپورٹون کے محض کاغذی کارروائی پر اکتفا نہ کیا گیا تو اس صورت مین ممکن ہوگا کہ قابل اور لایق ہندوستانی جو محض کمی تنخواہ کے باعث تعلیمی ملازمت پر دوسری جگہون کو ترجیح دیتے ہین خوشی سے پروفیسری اور پرنسپلی قبول کرین گے اور اس صورت مین بہت کچھ ادی

ترقی کی امید کی جاسکتی ہو رہ گئی دوسرے درجہ کی اسامیان اُن کے اسٹینڈرڈ ڈھائی سو روپیہ ماہانہ سے ابتدا کریں گے اور پانچ سو تک پہونچکر اُن کی ترقی رُک جائے گی۔ البتہ اُن سے پندرہ فیصدی کو پانچ سو سے آٹھ سو تک ترقی کرنے کا موقع ملا کرے گا۔

مسئلہ تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہو کہ جس کی طرف ہر حکومت کی تمام تر توجہ مبذول ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ملکون کی مادی، ذہنی، اخلاقی، سیاسی اور ہر طرح کی ترقی کا دارومدار محض تعلیم پر ہو۔ اس لیے ہمارے خیال مین گورنمنٹ کو تعلیمی مسئلہ پر سنجیدگی سے کان دہر کر جلد سے جلد اُس کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ہمارا تو عقیدہ ہو کہ ہر ملک اسی وقت ترقی کر سکتا ہو جب کہ سب سے پہلے اعلیٰ سے اسفل تک تعلیم اور صنعت و حرفت کو خاموشی سے ترقی دے لے اُس کے بعد دیگر سیاسی امور کی جانب توجہ کرنا سودمند ہوتا ہو لیکن ہم تو عجب کشمکش مین پڑے ہوے ہین حصول اصلاحات کے لیئے پہلے ہمارے لیڈران کا وطیرہ یہی رہا ہو کہ رفتہ رفتہ حسب ضرورت وقت گورنمنٹ سے اصلاحات کی استدعا کرکے اُن کو خوش نیتی کے ساتھ حاصل کرتے رہنا چاہیئے لیکن بیس برس کے تلخ تجربے نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان مین بیوروکریٹ گروہ کے آگے جو جملہ امور پر دخل جمائے ہوے چلا آرہا ہو کسی کی پیش نہین جاتی۔ مجنونانہ منتین اور عاشقانہ خوشامدین کی جائین لیکن اس لیلیٰ صفت گروہ کی معشوقانہ نہین ہی کا جواب خاموشی ہوتی ہو اس سبب سے اِن رہبرانِ قوم کا خیال پلٹ گیا کہ سب سے پہلے سیاسی جدوجہد کو ترجیح دینی چاہیئے۔ کیونکہ جب بیوروکریٹک دیو کو زیر کرکے حکومت خود اختیاری کی عنان آپ ہی کے دست مین ہون گے

اس وقت عہد زرین جسکے افسانے پُرانی کتابون مین بہت کچھ پڑھتے ہین پھر واپس آنے لگا اور ہندوستان اس قابل ہو جائے گا کہ اِن تمام مذکورۂ بالا اصلاحات کو عملی صورت دے۔ ہماری بھی تمنا ہو کہ تعلیمی معاملات مین گورنمنٹ بعض ضروری اصلاحات جلد سے جلد عمل مین لائے کیونکہ یہی ایک صورت ان ہندوستانیون کی اشک شوئی کی ہوسکتی ہو جو تعلیمی حیثیت سے مطالبات کر رہے ہین لیکن اس بارگاہ حریت آزادی سے کوئی جواب نہین ملتا جس نے کناڈا کی مشکل کشائی کی جس نے آسٹریلیا کو شرمندۂ احسان کیا اور جس نے جنوبی افریقہ کو آزاد کیا۔

تعلیمی معاملات مین اصلاحات کا ذکر ہم ایک جگہ کر چکے ہین۔ اب پھر چند ضروری اور نہایت ہی اہم اصلاحات کی طرف ارباب حل وعقد کی توجہ مبذول کرتے ہین ہندوستان کی سرکاری و غیر سرکاری یونیورسٹیون مین غیر سرکاری عنصر کی آمیزش غالب رکھی جائے۔ بلکہ ہم تو یہان تک کہین گے کہ چند دنون کے بعد انتظامی معاملات مین بالکل آزادی دے دی جائے۔ ہندوستان کی صحیح نیابت اسی وقت ہوسکتی ہو جب تعلیمیافتہ جماعت مین سے اہل ہند کے منتخب قائم مقام

یونیورسٹیز کے ممبر بنائے جائیں اور ہر ایک غیر سرکاری درسگاہ اور مجلس تعلیمی کو یونیورسٹی کے لیئے ممبروں کے انتخاب کا حق عطا کیا جائے (سینیٹ۔ اور سنڈیکیٹ میں ہندوستانی عنصر خاص طور سے غالب رہنا چاہئیے۔ وائس چانسلر اور رجسٹرار یونیورسٹیز لازمی طور پر غیر سرکاری ہندوستانی ہوا کریں جو بذریعہ انتخاب اس عہدہ پر مقرر کیئے جاویں بحالت موجودہ یہ جائز ہوسکتا ہو کہ چانسلر یونیورسٹی اعلیٰ افسران سرکاری گورنر جنرل یا حاکمان صوبہ میں سے کوئی ہو جاوے لیکن چانسلر کو یہ اختیار کسی طرح نہ ہونا چاہیئے کہ یونیورسٹی بورڈ کے فیصلے کو مسترد کر دے تعلیمیات میں یونیورسٹی کو مصالح سلطنت اور سیاسی ضروریات سے ہر نوع آزاد رہنا چاہیئے، ان اصلاحات کے سوا ایک یہ بھی اصلاح ضروری ہو کہ یونیورسٹی کے رکن پیشوایان مذہب بھی رکھے جایا کریں تاکہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم بچوں کو کافی طور پر دی جایا کرے۔ اور وہ قومی بچوں کے اخلاق و عادات کو سدھارنے کے درپے رہا کریں، یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہو کیونکہ انگلینڈ کی یونیورسٹیز میں اسقف اعظم کو بڑے اختیارات حاصل ہو رہے ہیں تعلیمی کورس کے نقائص ہم بیان کر چکے ہیں، درسی کتابیں اور نصاب تعلیمی کچھ ایسا بے ڈھنگا سا رکھا گیا ہو جس سے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اخوت حب قومی اتفاق خودداری عزت نفس ایجاد و اختراع کا مادہ بہت کم پیدا ہونے پاتا ہو تحقیقات اور آزادی نام کو بھی نہیں پائی جاتی تاریخیں ایسی پڑھائی جاتی ہیں جن سے نفاق اور منافرت ترقی پذیر ہوتی ہو۔ کالیداس جیسے شاعر ملا بدایونی جیسے مورخ اور علامہ سعداللہ جیسے مدبر بھلا اب کہاں ؟ ہم نے یہ بھی سُنا ہو کہ چندر گپت اشوک شیر شاہ، مان سنگھ، نورجہاں سعادت علی خان۔ حیدر علی اور اہلیا بائی جیسی قابل عزت ہستیاں ایک زمانے میں اسی خاک پاک ہند سے پیدا ہوئی ہیں لیکن ع یہ قصے ہیں جب کے کہ آدم جوان تھے و۔ اب تو کوئی چراغ لیکر بھی ڈھونڈھے تو قابل لائق بہادر اور مدبر لوگوں کی افسوسناک کمی نظر آئے گی سا ورنہ تاریخیں ہی ایسی پڑھائی جاتی ہیں کہ جن کے اذکار فرزندان وطن کے قلوب کو گرما دیں اہل ملک کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ مذہبی مناقشوں کو مٹا کر اور ہند کی خدمت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے درپے بن جاویں۔ ہندو مسلمان بودھ جین اور عیسائی سب اسی ایک مورتی کے سامنے جھک جاویں پھر شراب محبت میں سرشار ہو کر خودی سے بیخودی میں ہو جاویں "ہند دیش" ۔ الغرض ان کے نزدیک ویسا ہی قابل عزت ہو جیسا "رحم دل اشوک اور "جاہل دلیر" سیواجی کی ویسی ہی قدر کریں جیسی "مہربان اور نیک نفس" ہمایوں کی۔ ہندہ گیا طریقہ تعلیم اس کے لیئے اتنا کہنا کافی ہو کہ خود انگلستان میں جو ہمارا رہنما ہو آج محسوس کیا جا رہا ہو کہ وہاں کے طریقۂ تعلیم میں خامیاں ہیں۔ آج اس جنگ نے وہاں ایسا حیرت افزا انقلاب پیدا کر دیا ہو کہ ان کے

وزیر تعلیم باوجود جنگی مصروفیتوں کے دن رات اصلاح تعلیم کی اُدھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں چنانچہ حال میں ویسٹ منسٹر کے چیچ اسکول کے ممبروں کو مخاطب کرکے دیسی تعلیم کے متعلق صاحب ممدوح نے جو تقریر کی تھی اُس میں لکھایا تھا کہ دیہی مدارس میں باغبانی کاشتکاری اور دیگر دستکاریوں کی تعلیم دینے کی سخت ضرورت ہے اور کاشتکاروں کو جدید قسم کے آلات کشاورزی کا استعمال سکھانا بھی دیہی مدارس کا فرض ہونا چاہیئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دیہات میں تعداد طلبہ کے کم ہونے کے باعث گو تعلیم میں دقت واقع ہوتی ہے اور روپیہ بھی زیادہ صرف ہوتا ہے تاہم ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ معلم و متعلم کے باہمی تعلقات زیادہ مضبوط پائے جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر طالب علم کے حالات سے براہ راست واقفیت رکھتا ہے اور آسانی سے اُس کے چال چلن وغیرہ کی نگرانی کر سکتا ہے۔ جہاں کہ ہندوستان جہاں دس گاؤں میں نو گاؤں بلا اسکول کے ہیں اور جن جگہوں میں اسکول ہیں بھی وہاں ایک ٹیچر پچاس پچاس چالیس چالیس لڑکوں کو بھیڑوں کے گلوں کی طرح ہانکا کرتا ہے۔ اور مدرس بھی آٹھ یا دس روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والا کالجوں اور اسکولوں میں بھی تنخواہیں ہندوستانی پروفیسروں اور ٹیچروں کی جیسی کچھ قلیل رکھی گئی ہیں وہ ہم اوپر دیگر ممالک متمدنہ سے مقابلہ کرکے دکھا چکے ہیں۔ تنخواہ کی یہ قلت ہرگز قابل اور لائق لوگوں کو محکمہ تعلیم کی طرف رُخ کرنے کی ترغیب نہیں دے سکتی۔ پروفیسروں اور ہیڈ ماسٹروں کی عام جلسوں اور سرکاری تقریبات میں ویسی عزت و توقیر نہیں کی جاتی ہے جس کے وے مستحق سمجھتے ہیں۔ یورپین پرنسپل پروفیسر تو مدعو بھی کر لیے جاتے ہیں غریب ہندوستانی پروفیسروں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ریاست بڑودہ میں روشن خیال مہاراجہ جملہ سرکاری تقریبات اور درباروں میں کالج کے یورپین و ہندوستانی پروفیسروں سے ہاتھ ملاتے اور اپنے علم دوست ہونے کے باعث ان لوگوں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس عزت افزائی ہی کا نتیجہ ہے کہ قابل لوگ کھنچے چلے جاتے ہیں۔ مسز بیسنٹ نے گذشتہ کانگرس کے پریسیڈنشل ایڈریس میں ہندوستان کی تعلیمی حالت کا جو خاکہ پیش کیا تھا اُس کو مختصراً بیان کرکے ہم اپنے مضمون کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ مسز موصوفہ لکھتی ہیں:-

مردم شماری کے لحاظ سے ہندوستان میں آبادی کا محض ۹،۲ حصہ تعلیم پا رہا ہے جن بچوں کی عمریں اسکول جانے کے قابل ہیں۔ اُن میں سے محض ۴،۲ زیر تعلیم ہیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں جو اعداد گورنمنٹ نے شائع کیے تھے اس کی رو سے سارے برطانوی ہندوستان میں ۴۵ لاکھ بچے مختلف علمی درسگاہوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ اور یہ تعداد گورنمنٹ کی ساٹھ برس کی تعلیمی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ مقابلہ انگلستان و ویلز میں چار کروڑ آبادی میں سے ساٹھ لاکھ بچے زیر تعلیم تھے۔ انگلستان میں سنہ ۱۸۷۰ء اور سنہ ۱۸۸۰ء کے درمیان [illegible] مفت تعلیم پر زور دیا گیا اور محض دس برس کے عرصہ میں ۲۲۱۲

فیصدی سے ترقی کرکے سو فیصدی لڑکے تعلیم پانے لگے۔ ۱۸۷۲ء میں جاپان میں اسکول جانے کے قابل لڑکوں کی نسبت ۲۰ فیصدی تھی۔ چوبیس برس کی کوشش کے بعد ۹۲ فیصدی ہوگئی اور چار برس بعد سو فیصدی ہوگئی۔

بڑودہ میں ابتدائی تعلیم جبری و مفت دی جاتی ہے۔ ٹراونکور میں ۸۱ فیصدی لڑکے اور ۳۳.۲ فیصدی لڑکیاں سال گذشتہ میں زیر تعلیم تھیں۔ میسور میں یہ نسبت ۵۰.۴ لڑکوں کی اور ۹.۰۷ لڑکیوں کی ہے۔ ریاست بڑودہ نے اپنے یہاں اسکول کے قابل جانے والے بچوں پر سال گذشتہ ۶ ر فی کس صرف کیا تھا اور برطانوی ہندوستان میں محض ۲ ر فی کس صرف کیا گیا۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۲ء تک تعلیمی مصارف میں سرکاری بجٹ میں محض ۷۵ لاکھ کا اضافہ ہو پایا تھا۔ حالانکہ اسی عرصہ میں مال گذاری میں آٹھ کروڑ کی فوجی مصارف میں ۱۴ کروڑ اور سول مصارف میں آٹھ کروڑ کی بیشی عمل میں آئی تھی اور ریلوے پر پندرہ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا (بقول مسٹر گوکھلے) اسی رفتار کو دیکھ کر مسٹر گوکھلے نے طنزاً کہا تھا۔ اگر تعلیمی ترقی کی رفتار یونہی رہی تو ۱۱۵ برس میں لڑکے اور ۶۶۵ برس میں لڑکیاں تعلیمی برکات سے بہرہ اندوز ہو پاویں گی۔

عزیز (اسیونی)

مضمون بالا جس شرح اور قابلیت سے لکھا گیا ہے اس کی داد تو ناظرین کرام سے ضرور ہی ملے گی ہم صرف اتنا اضافہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اگر دوسرے علم دوست اصحاب بھی ہندوستانی مسائل کے مطالعہ پر اسی طرح اپنا وقت عزیز صرف فرمائیں اور اپنی معلومات سے اردو داں اصحاب کو مستفید فرماتے رہیں تو یہ ایک عظیم الشان قومی خدمت ہوگی ہمارے ہندو برادران وطن میں تو بہت سے لائق افراد ایسے موجود ہیں جو ان مسائل کا مطالعہ کرنا اور ان سے اہل ملک کو آگاہ کرتے رہنا اپنی مسرت زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہیں لیکن مسلمانوں میں شاید ہمارے عزیز دوست کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اتنی زحمت گوارا کرتا ہو

یہ مضمون جو غالباً مسٹر عزیز کے بزرۂ تالیفات کا ایک جزو ہے ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا تھا مگر افسوس ہے کہ بعض الکل اتفاقی اسباب کی بنا پر اس کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوئی جس کے لئے امید ہے کہ لائق مضمون نگار اپنے ناچیز بھائی کو معاف فرمائیں گے۔ اس اثنا میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی طولانی رپورٹ بھی شائع ہوگئی جو نہ صرف نہایت قیمتی مواد و معلومات سے لبریز ہے بلکہ جس میں نہایت اہم و نتیجہ خیز سفارشات بھی کی گئی ہیں اور ہم اپنے دوست کے شکرگزار ہوں گے اگر وہ تازہ ترین معلومات اور مذکورہ کمیشن کے سفارشات کو موضوع بنا کر اس بحث میں ایک مضمون اور تحریر فرمائیں۔

# تاریخ کی ورق گردانی

## حملون کے خدشے

یون تو ہر ملک کی تاریخ شاہد ہو کہ اس ملک مین ایسے وقت بھی آئے ہین جب اسے کسی بیرونی دشمن کے واقعی یا فرضی حملے کا خوف ہوتا رہا ہو لیکن انگلستان کی تاریخ اس امر کے بہت سے دلچسپ مناظر پیش کرتی ہو انگلستان کے عہد قدیم سے موجودہ زمانہ تک متعدد مرتبہ اس ملک کو بیرونی غنیم سے سابقہ پڑتا رہا ہو۔ اکثر اوقات محض افواہ نے اس کے باشندون اور حاکمون کا خون خشک کیا ہو۔

تازہ ترین مادہ سلسلۂ مضامین ہو جو ۱۹۱۴ء کے محاربۂ عظیم سے نو دس سال پیشتر انگلستان کے متعدد اخبارات و رسالجات مین شائع ہوتا رہا۔ اس وقت بعض مدبرون کا خیال تھا کہ انگلستان کو قدرتی استحکامات کے علاوہ مدافعت کے مصنوعی طریقون سے بھی مضبوط بنایا جائے۔ کیونکہ اُن کی دوربین نظرون مین جرمنی یا کسی دوسری طاقت کے زبردست حملہ کا امکان تھا۔ بعض ان خیالات کا جواب استہزا سے دیتے تھے۔ اُن کی رائے مین کوئی دشمن ایسا نہ تھا جس سے ایسے حملے کا خدشہ ہو۔ اور اگر اسکا امکان بھی ہو تو وہ اپنے ملک کے قدرتی وسائل کا اس قدر کافی یقین کرتے تھے کہ کوئی زبردست سے زبردست غنیم بھی اُن پر غالب نہین آسکتا۔ اس کے ثبوت مین وہ الزبتھ کے زمانہ کے بحری حملۂ ارمیڈا کا واقعہ پیش کرتے تھے کہ کتنا بڑا بیڑہ حملہ آور ہوا لیکن قضا و قدر نے اُس کو انگلستان پہونچنے ہی نہ دیا۔ سمندر مین باد مخالف کے تھپیڑون نے انھین آپس مین دست بگریبان کر کے فنا کر دیا۔

بہرحال اس زمانہ مین بھی حملہ کے امکان کے خیالات کثرت سے تھے۔ تشویش اور گھبراہٹ اُن مضامین کے لفظ لفظ سے ظاہر تھے۔ ان کا خلاصہ یہ تھا کہ جرمنی ہم پر ضرور حملہ کرے گا اور وہ اپنی فوجین لڑا بیڑا کے ساحل پر اتارنے مین کامیاب ہو جائے گا۔ ساڑھے چار سال لڑائی رہی لیکن اس انتہا پسند گروہ کے خیال نے حقیقی صورت اختیار نہ کی۔ دوسرے فریق کی رائے صائب نکلی۔ انگلستان کے بیڑے نے ساحل جرمنی ہی کا محاصرہ کر لیا جس سے اس کا بیڑا اپنی بندرگاہون سے باہر نہ نکل سکا۔ گو دو چار مرتبہ اُس کے چند جہازون نے ساحل انگلستان پر چھاپے مارے لیکن یہ سب بے وقعت تھے۔ ایسے شبخون تو ہماری سرحد کے محسود و مہمند بھی مار کے چھپتے پھرا کرتے ہین۔ ہوائی جہازون نے لندن پر وقت بے وقت گولے بھی برسائے لیکن اس کا جواب جرمنی کو بھی دے دیا گیا کہ اُس کے

ہوائی مستقروں پر تاخت کی گئی۔ اور سٹنڈ اور ڈنبروڑ کے ہوائی جہازوں کے گودام تباہ کر دیے گئے۔ ان ناکام حملوں کے علاوہ جرمن اور کچھ نہ کر سکے۔ لڑائی ختم ہو گئی اور انگلستان کو اپنی تاریخ کے دیگر رزمیہ زمانوں کی طرح اس دفعہ بھی فاتحانہ گردن فرازی نصیب ہوئی۔

اس سے تقریباً ساٹھ برس پہلے ایسے ہی حملے کے خدشے انگلستان والوں کو پریشان کر رہے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں زار نکولس نے ترکوں کو مرد بیمار کا لقب دے کے اُن کی سلطنت کی تقسیم تجویز کی۔ لیکن انگریزوں نے اس سے اختلاف کیا۔ کیونکہ ان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس ہمدردی میں زار روس کی توسیع سلطنت کی قدیم خواہش نہاں ہے۔ زار نے سلطان سے چند مطالبات کیے جن کے مسترد کیے جانے پر اُس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور مالڈیویا اور والیشیا اُس کے صوبوں پر فوراً قبضہ کر لیا۔ اس پر برطانیہ اور فرانس جس جس کے بعد ترکوں کے حامی بن کے شریک جنگ ہو گئے۔ آخر ۱۸۵۶ء میں اس جنگ میں روسیوں کو شکست فاش ہوئی لیکن انگریزوں کو بھی اس کے بار گراں نے سرگرداں کر دیا۔ ۱۸۴۹ء میں ہندوستان میں بھی انگریز سکھوں سے مصروف پیکار تھے۔ اُس فساد روس کی طویل و زبردست لڑائی نے انگلستان کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں کہ ۱۸۵۵-۵۶ء میں ہندوستان میں غدر کا سانحہ پیش آیا۔ اور اُسی زمانہ میں چین سے انگریزوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔ ان واقعات نے انگلستان کے رہے سہے حواس بالکل باطل کر دیے تھے۔ اسی اثنا میں فرانس کے اندرونی حالات پھر بدامنی کی صورت اختیار کرنے لگے۔ اس وقت وہاں کی حکومت نپولین سوم کے ہاتھ میں تھی۔ ایک اطالوی اورسینی نامی نے شہنشاہ پر بم پھینکے جو ناکام رہے۔ ان لوگوں نے انگلستان میں پناہ لی اور وہاں بم وغیرہ تیار کرنے لگے۔ اور وہیں اپنی تجاویز میں کامیابی حاصل کرنے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس صورت حال نے سلطنت فرانس کو مشتعل کر دیا جس نے انگلستان سے مطالبہ کیا کہ وہ ایسے لوگوں کو پناہ نہ دے۔ اور آئندہ ایسے شخصوں کا قلع قمع کرے۔ ان دنوں لارڈ پامرسٹن وزیر اعظم تھا اُس نے سازش ہائے قتل و خون کا قانون تیار کیا جس کا منشا یہ تھا کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے جو سرزمین انگلستان پر غیر ممالک کے بادشاہوں کے قتل و خون کے منصوبے سوچیں یا تدابیر اختیار کریں۔ مگر لارڈ مذکور کا یہ قانون نہایت عمدہ و انصاف پر مبنی تھا لیکن اس سے کمیٹی میں برہمی پھیل گئی۔ لارڈ پامرسٹن جیسا زبردست شخص خود غیر ہردلعزیز ہو گیا اور اسے بعد میں مستعفی ہونا پڑا۔ یہ زمانہ بھی انگلستان پر نہایت نازک گذرا ہے۔ ان دنوں بھی اس کے باشندوں کو دن رات فرانسیسی حملے کا خوف و خطر رہتا تھا۔ فرانسیسی کھلم کھلا انگریزوں کو بُرا بھلا کہتے تھے اور اپنے شاہنشاہ کو انگلستان پر حملہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اُس زمانہ کا ایک بالکل نایاب مضمون ایک رسالہ میں ان الفاظ سے شروع ہوا تھا۔ یہ الفاظ اُن لوگوں کی دلی کیفیت کا

نہایت صفائی سے مجلا آئینہ مین

"جب ۱۹۹۹ء کے پس وپیش فیلڈ مارشل ڈوگن اپنی آخری عمر مین وجلی خاندیج لکھا ہوا سنہ ۱۹۰۵ء کی دس کی انگلستان سے خوفناک اور دہشت انگیز لڑائی کے زمانہ کے مشہور وزیر جنگ کی غیر سرکاری خط وکتابت شرح و مبسوط حاشیون کے ساتھ شایع کریگا تو غالباً ہمارے پوتے اس غفلت کا نہ سمجھ قال کی کوتاہیون اور ناکامیون کے اصلی وجوہات کو بخوبی سمجھ سکین جن کو ہم اُن کے دادا اپنی قبرون کے کنارون پر سمجھنے سے قاصر ہین۔

اور جب کوئی آئندہ وزیر جنگ اپنے فرصت کے لمحون مین بیسوین صدی کی آگاہی کے لیئے اپنے پیشرو اعظم مسٹر سکرٹری ہربرٹ (سڈنی ہربرٹ وزیر جنگ م ۱۸۶۱) کے کارنامے تحریر کریگا تو یقیناً آینوالی نسلون کو اس بات کے جانچنے کا جو ان دنون ہم لوگون کے لیئے تو راز سربستہ ہے موقع ملے گا کہ کیا ان پریشانیون اور اندیشون کی کچھ بنیاد تھی جو حملون کے متعلق قوم کے دلون کو مضطرب کر رہے تھے؟

انگلستان کی الگ تھلگ جائے وقوع، اُس کے بلند پہاڑ، اُس کے طوفانی سمندر، جاڑون کا دھوان دھار کہر وپالا ایسے زبردست استحکامات ہین جو کسی اور یورپی ملک کو نصیب ہی نہین۔ یہ مالدار ہے، گنجان آباد ہے، اس مین کوئلہ لوہے۔ شمشیر، اور تقریباً ہر قسم کے سامان حرب کی نہایت افراط ہے، ریلون کا ایک جال ہر طرف بچھا ہوا ہے۔ حب الوطنی نمک حلالی، بہادری، ذکاوت مین اُس کے سپوتون کا کسی دوسرے ملک کے باشندے مقابلہ نہین کر سکتے۔ ان برکات کی موجودگی مین یورپ کی تمام قومون کی نسبت اُس کو ایسے حملہ کا قطعی خوف نہین ہونا چاہیئے بلکہ سب سے زیادہ اُس کو اس کے دفع کرنے کی طاقت ہونی چاہیئے۔ باین ہمہ یورپ کے سارے ملکون مین صرف انگلستان ہی ایسا ملک نظر آتا ہے جو حملہ کے ڈر سے مرا جاتا ہے۔"

۱۸۵۸ء مین لارڈ پامرسٹن کو اپنی جگہ خالی کرنی پڑی اور لارڈ ڈربی نے وزارت قایم کی لیکن ایک اصلاحی بل کے مسترد ہونے پر اُس کی بجائے ایک اور وزارت قائم ہوئی جس کا صدر اعظم پھر پامرسٹن قرار پایا۔ نپولین سوم کا ارادہ انگلستان سے دست بگریبان ہونے کا نہ تھا۔ اُس نے انگلستان کے ساتھ ۱۸۶۰ء مین ایک تجارتی عہدنامہ کیا۔ جسمین اُس نے انگلستان کی پیش کردہ تجاویز منظور کرلین جنکی رُو سے قرار پایا کہ انگریزی مال درآمد پر فرانس مین بہت کم محصول لگایا جائیگا۔ اور اُس کے بدلے مین فرانس کی شرابون اور دیگر سامان پر برطانیہ بھی یہی طریقہ مرعی رکھے گا۔ یہ عہدنامہ بہت زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ کیونکہ انگلستان کی پارلیمنٹ نے تو باشندون کی خواہشات کے مطابق یہ شرائط تجویز کی تھین لیکن فرانس

کی طرح سے شاہنشاہ نے اپنی رعایا کے جذبات کے خلاف شرائط منظور کی تھین۔ جب نپولین تخت سے اترا تو یہ عہدنامہ بھی اُس کے ساتھ ختم ہو گیا۔

انڈنون بھی اس خوف و ہراس کی ذمہ داری پارلیمنٹ کے سر تھوپی جاتی تھی۔ مدبر اور سپاہی یہی کہتے تھے کہ قصور پارلیمنٹ اور قوم دونون کا ہو۔ وہ پارلیمنٹ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ افسران انتظامیہ کے اختیار مین کافی وسائل نہین دیئے جاتے۔ اور قوم اس لیئے قصوروار تھی کہ یہ اپنے حاکمان وقت کے ہر فعل کو شبہ کی نظر سے دیکھتی اور اسمین مین میکھ نکالتی تھی۔ پارلیمنٹ اور قوم کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم نے جو حجاب لگا رکھا ہو ملک کی مدافعتی کارروائیون مین نہایت انہماک کیا جاتا ہو اور آئندہ بھی احتیاط سے کارروائی ہوتی رہے گی لیکن ان باتون کے باوجود سب دیکھتے تھے کہ حکومت کرنے والی جماعت کی ناقابلیت اور حرص و آز نے ملک پر بہت بُرا اثر ڈال رکھا ہو اس بدگمانی نے بیچینی کی صورت اختیار کر لی حقیقت مین جمہور اپنے نہایت اہم امور سے بالکل بےخبر رکھے جاتے تھے اور خود رہنمایان ملک کو سکوت و اخفا کا حکم تھا۔ اگر کسی افسر کے خلاف نہایت حزم و احتیاط سے بھی کوئی اعتراض کرنے کی جرات کرتا تو اُس کے ہم مشرب ہم جماعت اس معاملہ مین کوئی ایسا شاخسانہ نکال دیتے جس سے وہ الزام تو خبط ہو جاتا الٹی وہ لے دے غریب معترض پر کی جاتی کہ اس کو کہین قدم جمانا مشکل ہو جاتا۔

موجودہ زمانہ مین بھی سیاست کی سب سے بڑی گتھی یہی ہو۔ جنگ جرمن کے زمانہ مین بھی باشندگان انگلستان یہی شور و غل کیا کرتے تھے کہ انھین لڑائی کی پوری پوری خبرین نہین دی جاتین۔ اُن کی قسمتین ایسے لوگون کے ہاتھون مین دے دی گئی ہین جو جمہور کے اعتماد کا اچھا صلہ نہین دیتے اُن کی یہ شکایت بجا بھی تھی۔ دو ایک واقعات ناظرین کے ذہن مین اب بھی تازہ ہون گے۔ جرمنون نے لوسی ٹینیا جہاز ڈبویا تو انگریزی قوم کو اس کی خبر امریکہ کے اخبارات سے معلوم ہوئی۔ باشندون کے قتل پر عہدہ داران کی طرف سے تو انکار ہی رہا لیکن اسکے جواب مین امریکہ کے اخبارات نے اس خوفناک منظر کی تصاویر بھی شایع کرنا شروع کر دین جس سے مجبوراً ان عہدہ دارون کو خاموش ہونا پڑا۔ اسی طرح ایک بڑے جنگی جہاز کی غرقابی کا ذکر اب اُس کے بعد صلح ریوٹر کے تارون مین کیا جاتا ہو۔ اس پر ہندوستانی اخبارات نے بھی تعجب کیا تھا۔

اسی سال کا ذکر ہو جنگ افغانستان ختم ہو گئی سرکاری مراسلات سے جو کچھ ظاہر ہوا اُس سے انگریزی پبلک مطمئن نہ ہوئی۔ جب افغانستان سے صلح ہوئی۔ اور باوجود اخفا کے شرائط صلح کی اہمیت ملک والون کو معلوم ہوئی تو اخبار بین حضرات کو معلوم ہو کہ وہان والے کس قدر برہم ہوے۔ اُنھون نے پارلیمنٹ مین کیا کیا سوال کئے کہ لارڈ کرزن کو

شافی جواب بن نہ آیا تھا مجبوراً اسے اخبارات نے سختی سے یہ ریمارک کیئے کہ جنگ کے حالات ملک سے چھپائے جاتے ہیں جس صلح کو فاتحانہ کہا جاتا ہے وہ دراصل سیاسی ہزیمت ہے۔

دوران جنگ میں جب وزارت بدلی تو مسٹر اسکوتھ و لارڈ گرے پر بھی اخفاے حالات کا الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ حکومت کی باگ ڈھیلے اور نکمے ہاتھون میں ہے۔ مسٹر لائڈ جارج کی وزارت کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ اسی قسم کی اندیشہ ناک صورت پیدا ہوئی تھی جسمین اُن کی وزارت کا قیام مشکل نظر آنے لگا تھا لیکن وہ اپنی ہوشمندی اور تدبر سے پبلک کا اعتماد حاصل کرنے مین کامیاب ہوئے اور رسیدہ بود بلاے ولے بخیر گذشت!

یہ واقعات کم و بیش ہمیشہ پیش آتے رہتے ہین حاکمان وقت حق بجانب بھی ہین اگر اخفا اور احتیاط سے کام نہ کیا جائے تو بہت سے خطرون کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ ان تازہ حالات کے تذکرہ کے بعد مین اب اکیس برس پہلے کے تاریخی حالات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہین دیکھتا حقیقت یہ ہے تاریخ ہر صدی مین اکثر واقعات مین مماثلت کثیر پیش کرتی ہے جس سے تاریخ دان حیران رہ جاتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کا امریکہ سے برطانیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اُس مین برطانیہ کی سپاہ کچھ سرخروئی حاصل نہ کرسکی تھی لارڈ امہرسٹ اس وقت کمانڈر انچیف تھا۔ یہ بھی بادشاہ کی مہربانی تھی کہ میعاد سے زیادہ یہ عہدہ اُس کے قبضے مین رہا۔ آخر کبر سنی اور انتہائی ضعف نے اُسے اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے پر مجبور کردیا۔ بادشاہ کا بیٹا ڈیوک آف یارک اُس کا جانشین بنایا گیا جو فرانس مین نپولین کے خلاف صرف بیکار رہنے کے بعد ابھی ملک کو واپس آیا تھا سرکاری اطلاع مین اُس کو نہایت تجربہ کار اور جنگجو پُر جوش نوجوان ظاہر کرتی تھین لیکن اُس زمانہ مین آجکل کے سے انتہا پسند لیڈر بہت کم تھے۔ جو جیرہ دست ذی رتبہ لوگون کے مُنھ آنے کی جرأت کرتے۔ اور جو تھوڑی بھی کر بیٹھتا اپنے مُنھ کی کھاتا۔ کاغذات اس زمانہ کی انتظامی حالت کو افسوسناک ظاہر کرتے ہین۔ رعایا کا روپیہ بیدردی سے چارون طرف خرچ کیا جاتا تھا۔ باقاعدہ فوج، مسلح پولس، دیہاتی و شہری افواج جہان کہین حملہ کا خدشہ نظر آتا ہزارہا کی تعداد مین بھڑک دار لباس مین چمکرلا دکھاتی پھرتین۔ بیڑہ جسمین نیلسن بھی تھا سیکڑون غیر معروف بہادرون سے جو نیلسن سے بھی زیادہ ہوشیار تھے معمور تھا۔ بایںہمہ انگلستان مین توحش و اضطراب کی لہر چارون طرف پھیلی ہوئی تھی بیڑہ پر سب اطمینان و اعتماد کی نظرین ڈالتے تھے لیکن بری سپاہ کو باوجود اس کی کثرت کے اعتبار کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ سپاہ بالکل بادشاہ اور اُس کے لواحقین کے قبضہ اقتدار مین تھی۔ رعایا اور پارلیمنٹ صرف اُس کے اخراجات کے متکفل تھے!

بایں ہمہ شاہی کمانڈر انچیف کو بادشاہ کے متعلق نظر افسر نہایت پختہ کار اور اپنے کام سے اس قدر واقف

ظاہر کرتے تھے کہ وہ مصائب امریکہ کے ظاہر شدہ فوجی نقائص کو دور کر رہا ہے۔ اُس نے اعلیٰ درجے کے فوجی افسر مہیا کر لیئے ہین۔ وہ کہتے تھے کہ اُس کا شاندار رتبہ اور وسیع آمدنی کسی کام مین ذاتی منفعت اور قطع بریدے کے خیال کو حائل نہین ہونے دے سکتی۔ غرضکہ ڈیوک آف یارک کو ان لوگون نے برطانوی سپاہ کا جو اس وقت اپنی ابتری کی وجہ سے نہایت اصلاح کی محتاج تھی، اصلاح کرنے والا، نجات دینے والا مشہور کر رکھا تھا۔ لیکن اس قسم کی امین ڈیوک مذکور سے ایسے عالی مرتبت شخص کے لیئے مہیا ہو جانا کچھ تعجب خیز نہین۔

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ اُس زمانہ کے راز ہاے سربستہ لارڈ کارنوالس کے ذاتی کاغذات و خطوط کی اشاعت سے طشت از بام ہو گئے ہین۔ جن کا اُس زمانہ مین محض اشتباہ بغاوت و بدخواہی متصور ہو کے قابل سزا ٹھہرتا۔ لارڈ کارنوالس سے ہندوستانی طالب علم بخوبی واقف ہین۔ پیدائشی سپاہی ہونے کی وجہ سے اُس نے جرمنی اور امریکہ مین کارہاے نمایان انجام دیے۔ بعد ازان وہ ہندوستان کو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف مقرر کر کے بھیجا گیا۔ وہان سے مراجعت کے بعد وہ کئی سال تک توپخانہ و ذخیرہ کا افسر اعلیٰ رہا۔ مسٹر پٹ وزیر اعظم نے پارلیمنٹ مین اُسے جگہ دینی چاہی جس سے اُس نے انکار کیا۔ پھر وہ دوبارہ ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا لیکن ۱۷۹۸ء مین آئرلینڈ مین بغاوت پھیل جانے کی وجہ سے اُسے بعجلت تمام وہان سے بُلا کے ڈبلن لارڈ لفٹننٹ و کمانڈر انچیف کی حیثیت مین بھیجا گیا۔ اُس کے بعد ۱۸۰۲ء مین فرانس کے ساتھ عہدنامہ امیلینز طے کرنے مین شریک کیا گیا۔ اور ۱۸۰۵ء مین اپنے تیسری مرتبہ تقرری گورنر جنرلی مین غازی پور کے مقام پر فوت ہوا۔

اِس شخص کے خطوط سے اس وقت کے مُلکی توحش اور خوف و ہراس پر بہت زبردست روشنی پڑتی ہے کہ انگلستان والون کو فرانسیسیون کی جانب سے حملہ آوری کا بجا خطرہ تھا، یا بیجا۔ اور اپنے ملک کی بدنظمی و قابل تردد حالت کے ارباب حل و عقد ذمہ دار تھے یا خود رعایا۔

ان دنون جارج سوم قریب قریب پاگل تھا۔ اُس کا ولی عہد اس قدر غیر ہر دل عزیز تھا کہ بادشاہ کے مشیر اور رعایا کا کثیر حصہ غرضکہ سب دعا مین لگے رہتے تھے کہ بادشاہ جلد تندرست ہو جائے۔ انھین ولیعہد کے نگران سلطنت مقرر ہونے سے اس قدر تنفر تھا! لارڈ کارنوالس کے کاغذات رعایا کے اِس تنفر کو حق بجانب ثابت کرتے ہین۔ وہ اپنے والدین سے نہایت شرمناک طریقہ سے لڑ پڑا تھا۔ اور پٹ سے بھی اُس کی تکرار ہو گئی تھی اور وہ مخالف گروہ کا سرگرم رُکن بن گیا تھا۔ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۰ء مین اپنے بھائی بشپ لچفیلڈ کو لکھا کہ تم کہتے ہو کہ مجھ پر کسی بڑے آدمی کے خفا مراتب ملحوظ نہ کرنے کا الزام رکھا جاتا ہے۔ اس سے صریح دروغ اور نہین ہو سکتا کیونکہ مین نے اس شخص کے ہر خط کا

فی الفور جواب لکھ کے پہلے جہاز سے روانہ کر دیا ہے۔ اُس کے خطوط کا لہجہ گو میرے متعلق نہایت لطف و کرم کا ہے لیکن مجھے بذات خود نہایت ناپسند ہے۔ کیونکہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نہایت نامعقول اور غیر منصفانہ تجویز ایسی ہوتی ہے جسکو مجھے ہمیشہ نامنظور کرنا پڑتا ہے۔ اور اُن میں سٹریٹ کو نہایت بیجا طور سے متہم کیا گیا ہے۔ اور بعض دیگر معتمد اشخاص پر ناجائز الزامات قائم کئے ہیں جن کا اگر کم از کم میرے خطوط میں ذکر نہ کیا جائے تو نہایت مناسب ہو۔"

ولیعہد کے تین چار مفصل خط بھی شائع کئے گئے ہیں جن سے مذکورۂ بالا انگریز مورخ کی رائے میں اپنے زمانہ کا نہایت شریف اور عام آدمی اول درجہ کا نالائق اور دیدہ دلیر سیاہ باز ثابت ہوتا ہے۔ ایک میں اُس نے گورنر جنرل سے یہ تجویز کی تھی کہ علی خان نامی ایک کالے آدمی کو جو بنارس میں فوجداری کا اعلیٰ جج تھا ہٹا کے اس کی جگہ لندن کے ایک بنئے کے بیٹے ملفورین ٹریولسیس کو مقرر کر دیا جائے۔ لارڈ کارنوالس نے جواب لکھا کہ علی ابراہیم خان گو دیسی ہے لیکن ہندوستان کا ایک نہایت قابل اور معزز عہدہ دار ہے اور اُس کی برطرفی نہایت دشوار اور غیر ہر دلعزیز ثابت ہوگی۔ بفرض محال اگر اس کا عہدہ خالی بھی ہو تو بھی بنئے کا بیٹا بوجہ اپنی نوعمری اور ناتجربہ کاری کے اس اہم مرتبہ کے ناقابل ہے۔ ولیعہد کو اپنے والدین سے ایک یہ بھی شکایت تھی کہ اُسے کوئی اعلیٰ فوجی رتبہ کیوں نہیں بخشا جاتا۔

لارڈ گرنیول ڈیوک آف یارک کے فوجی اتالیق اور لارڈ کارنوالس کی باہمی خط و کتابت سے ڈیوک مذکور کی لیاقت اور قابلیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں جیسا کہ شاہی خاندانوں کے افراد کے متعلق رواج ہے وہ برطانوی فوج کا کرنل مقرر کر دیا گیا۔ دو تین سال پرشیا کی فوجی تماشین دیکھنے کے بعد جسکا مقصد اُس کے فوجی علم کا اضافہ تھا اُسے جنرل بنا دیا گیا۔ مذکورۂ بالا دونوں شخصوں کے خطوط سے جو ڈیوک کے ہوا خواہ اور بہی خواہ تھے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہادر خوش طبع، کمزور آدمی تھا۔ اُس میں فوجی قابلیت مطلق نہ تھی۔ کام بالکل نہ کر سکتا تھا۔ نہایت شراب خوار اور چوسر کا نہایت شائق تھا، بے حد مسرف مزاج اور عیاش تھا اور ان کے علاوہ اُس میں اسی قسم کے اور عیوب بھی تھے سنہ ۱۷۸۹ء میں اُس کے اتالیق گرنیول نے کارنوالس کو لکھا کہ اس خاص معزز آدمی کی روش الاّن کما کان ہے اور آئندہ کسی اصلاح کی توقع نہیں۔ اسوقت ڈیوک کی عمر ۲۷ سال کی تھی سنہ ۱۷۹۱ء میں اُس کی شادی ہوگئی۔ اور اُس کے دو سال بعد جب کارنوالس ہندوستان سے واپس آیا تو اس نے اس ناہموار شخص کو فی الواقع فلنڈرس فرانس میں بہت بڑی انگریزی فوج کی کمان کرتے اور آسٹریا کی روسی اور ڈچ فوجوں کے ہمراہ فرانسیسوں سے جنگ کرتے پایا۔ اُس کے عیوب کا اُس کے والدین نے دس ہزار برطانوی سپاہیوں کی جانیں اور انگلستان کی عزت آبرو اُس کو سپرد کرتے وقت بالکل خیال نہ کیا۔ اس متحدہ فوج میں بڑی مشکلات پیدا ہونی شروع ہوگئیں۔ اُس کے افسر ایک دوسرے پر جائز طور سے ناقابلیت کا

الزام لگاتے تھے۔ یا تو متحدہ افواج بڑھتی جا رہی تھیں بہت سے مقامات پر اُن کا قبضہ ہو گیا تھا یا [illegible] فرانسیسیون سے منہزم ہو کے ڈیوک کو ڈنکرک کا محاصرہ بھی اٹھا لینا پڑا۔ جولائی مین اس کا محاصرہ شروع ہوا تھا، ۸ ستمبر کو وہ اُٹھا یا گیا، ۷ اکتوبر کو لیونز بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۶ ار کو فرانسیسیون نے وٹگنیز کی فتح سے آسٹریون کو نیدرلینڈ مین بالکل مغلوب کر دیا۔ اور سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی اُنھون نے آسٹریون اور پرشیا والون کو رائن سے پرے دھکیل دیا۔ ۱۲ دسمبر کو طولون جہان برطانوی بیڑہ لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ نپولین نے فتح کر لیا۔ اِس موقع پر ایک شخص نے جس کا نام اب تک ظاہر نہین کیا گیا اور جو پٹ اور کارنوالس دونون کا معتمد علیہ تھا ۱۱ نومبر ۱۷۹۶ء کو ایک زبردست خط لکھا جس مین فوج کی بدنظمی اور بے ترتیبی باہمی مناقشات وغیرہم کا ذکر کر کے خدا کا واسطہ دیتے ہوئے خواہش کی تھی کہ اگر ہمین فرانس مین صرف بیکار رکھنا ہے تو جلد کوئی انتظام کیجیے۔ ورنہ ہمین یہان سے نکالیے۔

اِس اطلاع پر پٹ نے فوراً بادشاہ سے گفت و شنید کی اور اُس سے اُس کی فی الفور واپسی کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ کو مانتے ہی بن پڑی۔ ڈیوک گھر آیا اور فوراً تمام ملک کی فوجون کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ لارڈ کارنوالس نے اس عجیب تقرری پر نہایت تلخ آوازہ کسا تھا "خدا ہی جانتا ہے کہ اِس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ اگر فرانسیسی حملہ کرین اور وہ ضرور ساحل پر اتر کے حملہ کرینگے تو مین اپنے گانون کلفورڈ کی حفاظت اس نئے سپہ سالار کو سپرد کرنا مطلق پسند نہ کرون گا۔"

کارنوالس سچا نکلا ۱۷۹۶ء کے آخر مین امیر البحر دی غالی کے زیر کمان ایک بیڑا جنرل ہوش اور پندرہ ہزار آدمیون کو لیے ہوئے برسٹ سے آئرلینڈ کو روانہ ہوا۔ دسمبر کے تند بحری طوفانون نے فرانسیسی جہازون کو منتشر کر دیا۔ تھوڑا سا حصہ خلیج بنتری مین پہنچ سکا۔ وہ جہاز جس مین دی غالی اور ہوش تھے غائب تھا۔ امیر البحر بائی دٹ نائب کمانیر نے بغیر حکم افسران اعلیٰ فوج اتارنے مین تامل کیا۔ آئرلینڈ کی سیاسی متحدہ جماعت نے جس نے امداد کا وعدہ کیا تھا چون بھی نہ کی۔ اس خلیج کو موسم زیادہ خطرناک بنا رہا تھا۔ مجبور ہو کے باقی ماندہ جہازات گرتے پڑتے فرانس کو واپس ہوئے جہان دی غالی اور ہوش چند روز تک نیوفاؤنڈلینڈ کے ساحلون پر کہر اور طوفان مین گھومتے رہنے کے بعد اُن سے دو گھنٹے پہلے پہنچے ہوئے تھے۔ اس موقع پر انگلستان کے قدرتی وسائل نے اس حملہ کا نہایت عمدہ سد باب کیا لیکن اگر طوفان حائل نہ ہوتا تو مورخین کی رائے مین یہ فوج بے دیکھے اور بلا مقابلہ ساحل پر اتر جاتی اور بغیر کسی جانی نقصان کے آئرلینڈ مین گھس جاتی۔

اس کے بعد سال بھر تک [illegible] گھبراہٹ مین بنا رہا ہے۔ انگلستان کا مالیاتی انتظام مسٹر [illegible] اس کے

سپرد تھا لیکن یہ شخص محض کروفر کا شائق تھا اور سوائے طمطراق کے ملک کی حفاظت کا کچھ انتظام نہ کر سکا چنانچہ لارڈ کارنوالس نے اوائل ۱۷۹۸ء میں ڈیوک ویلی کو لکھا تھا: "اب ہماری حالت وہ ہو گئی ہے جس کا مجھے عرصہ سے اندیشہ تھا۔ ہمارے دوستوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور ہر لحظہ ہمین فرانسیسی حملہ کا خطرہ رہتا ہے جسکے لیے فرانسیسی نہایت زبردست تیاریان کر رہے ہیں۔ ہماری مقامی افواج کی بہادری اور وفاداری مین کلام نہین لیکن ڈیوس ڈنڈاس کا طریقہ اور معمولی پیدل فوج کی قطعی عدم موجودگی میرے ہر وقت بار خاطر رہتے ہین۔ اور فرانسیسی افواج کی اس ملک مین نقل و حرکت کی آسانی کا نقشہ میری آنکھوں مین کھنچے رہتے ہین"۔

ان ہی دنون مین ۱۷۹۸ء مین بغاوت برپا ہو گئی۔ وزرا کے دباؤ سے مجبور ہو کے لارڈ کارنوالس نے جسکو وہ ہر شکل سے عہدہ برآ ہونے والا آدمی تصور کرتے تھے آئرلینڈ کی لارڈ لفٹنٹی سپہ سالاری کا متحدہ عہدہ قبول کر لیا۔ بہ نسبت آئرلینڈ ایسا غیر وفادار اور بے امن ملک تھا جسکو کوئی جنگی سے جنگی حکومت بھی نہین بنا سکتی۔ اُن کے خطوط جو ڈبلن سے ڈیوک پورٹلینڈ کے پاس آئے اُن سے اُس کے زیر کمان فوج کی سرکشی سفاکی اور شوریدہ سری کی کیفیت خوب ظاہر ہوتی ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہین "ہمارے دوستون کی سخت گیری اور ان کی اس کو مذہبی جنگ بنانے کی حماقت نے ہماری فوجون کی تندی کو بڑھا دیا جو قتل و غارت سے محظوظ ہوتے ہین اور صلح و آشتی کے کل طریقون سے نہایت متنفر ہین"۔

لیکن لارڈ مذکور کے قوت فیصلہ استقلال اور مزاج نے سب باتون پر غلبہ حاصل کر لیا۔ آدھی گرمی کے گذرنے تک بغاوت بلا غیضہ و رہی خونریزی کے ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنی توجہ اس فوجی جھگڑے کی جو اس وقت آئرلینڈ مین بیرونی اور اندرونی دشمنون کے مقابلے کے لیے جمع کیا گیا تھا ترتیب و انتظام پر مرکوز کرنے کی کوشش مین ہی تھا کہ حملہ آور حقیقت مین آ ہی گیا۔ اس موقع پر ۱۷۹۸ء مین برطانوی افواج کی عادات تعلیم و خصائل کا ایک نمونہ ملاحظہ کرنا خالی از لطف نہ ہو گا۔

خط بنام لفٹنٹ کرنل — — پیدل فوج

جناب عالی — مجھے یقین ہے کہ آپ — — نزہت خانہ کا ممبر ہون۔ اندرین صورت مین بحث ذیل پیش کرنے کی جرأت کرتا ہون یعنی ہر ایک شریف آدمی خمر کے فوری اثر مین مختلف اثرات کا تابع ہے اُس کے اثبات مین اپنے اور لفٹنٹ — کے متعلق ایک تازہ حال بیان کرون گا۔ میرا رجحان قلّ غبارہ اور انکا سمہرا دراز خواب و غفلت۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ ہر ایک نام نزہت خانہ مین تین چیزین لازمی ہین ماحصل یہ کہ پہلا قسم کے لیے جو چندہ

پر تھیں ہمیں اطلاع دی کہ دشمن پیش قدمی کر رہا ہے۔ فوجیں فوراً جمع کی گئیں جن کو ایک رات پیشتر طلوع آفتاب سے ۲ گھنٹہ پہلے مسلح ہو جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ فوجیں اور توپیں پہلے ہی ایک عمدہ مقام پر قائم کی گئیں جہاں وہ سات بجے تک رہیں۔ ۱۶۰۰ یا ۱۷۰۰ رسالہ اور پیدل تھے، دس توپیں اور ایک ہوٹزر اُن کے پاس تھیں۔ زمین قدرتاً نہایت مضبوط تھی فرانسیسیوں کی تعداد صرف ۷۰۰ تھی کیونکہ انھوں نے ۲۰۰ کلاآر میں اور ۱۰۰ والینہ میں چھوڑ دیے تھے۔ وہ ایک ہزار سے زیادہ تعداد میں ساحل پر نہیں اترے۔ اسمیں چھوٹے بڑے سب شامل ہیں۔ اُن کے ہمراہ ۵۰۰ باغی باشندے بھی تھے جو توپ کی پہلی ہی آواز پر فرار ہو گئے۔ فرانسیسیوں کے پاس صرف ۲ توپیں اور ۵۰ سے ۴۰ تک سوار تھے۔ ہماری فوج کی سرکشی بہت بڑھی ہوئی تھی البتہ توپخانہ نے خوب کام کیا۔ اور لارڈ ڈوڈن کی مقامی فوج والے بھی حکم کے اشارے پر پڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، مختلف وجوہ سے قیاس کیا جاتا ہے کہ ہماری دو پلٹنوں کو پہلے ہی سے توڑ لیا گیا تھا۔ اسی امید پر فرانسیسیوں نے حملہ کرنے کی جرأت کی ورنہ ہمارے جیسے نہایت کثیر لشکر پر ایسی قلیل تعداد کا حملہ یقیناً نہایت بےجگری اور جانبازی کا کام ہے۔ علاوہ ازیں فرانسیسیوں کی کلاآر اور والینہ کو واپسی کا راستہ سر ٹامس چاپ مین اور جنرل ٹیلر نے روک لیا تھا جب افواج بچاؤ کے امکان سے بغیر منتشر ہوئیں اُس وقت تک کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہمارے آدمی کم مرے تھے۔ اور فرانسیسیوں کو بہت نقصان پہونچا تھا اُن کے چھ افسر اور ۷۰ سے ۸۰ تک آدمی مارے گئے۔ اُن کی قلیل تعداد اور مقابلہ کی قلت وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ نقصان واقعی زیادہ ہوا مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے آدمی دس منٹ اور قائم رہتے تو تمام معاملہ ہمارے فائدہ پر ختم ہوتا لیکن بلا حکم انھوں نے تھوڑے تھوڑے آدمیوں پر گولیوں کی بوچھار شروع کر دی اور وہ بھی اُن کے نشانہ کی زد میں آنے سے پہلے ہی۔ ان کو روکنا ناممکن تھا اور انھوں نے اس کے بعد ہی زمین چھوڑ دی۔"

اگرچہ فرانسیسیوں نے تعاقب کی مطلق کوشش نہیں کی لیکن لیک کے منہزم لشکر نے تو آم پر جا کے دم لیا جو میدان جنگ سے ۴۰ انگریزی میل کے فاصلہ پر تھا۔ اسی روز شام کو انھوں نے پھر بھاگنا شروع کیا اور ناقلون پر آکے ٹھہرے۔ گویا ۲۴ گھنٹہ میں ۷۰ میل بھاگے۔ مورخوں نے مذاق سے اس معاملہ کا نام کیبل بار کی دوڑ رکھا ہے لیک کا کل توپخانہ فرانسیسیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ حملہ کی خبر جب لارڈ کلایو کو معلوم ہوئی تو اپنی فوج والوں کی مزاج دانی کی وجہ سے اُس نے خود مغرب کی طرف کوچ کیا۔ اور راستہ میں دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے جس طرح بنا فوج جمع کرتا چلا گیا۔ اس اثنا میں فتحمند فرانسیسیوں کا تہر کا ابتال در پکڑ سے ہو۔ ۲۰۰ پیدل فوج ۳۰۰ سوار اور ۲ توپوں کو لے کے اُن پر حملہ کرنے کے لیے لپکا مقابلہ ہوا زبردست

مقابلہ کے بعد پسپا ہوا۔ اور اس کی توپیں فرانسیسیوں کے ہاتھ آئیں۔ اب فرانسیسی لیٹریم کی جانب اس امید میں بڑھے کہ شاید یہاں انھیں میو کے فاقہ زدہ کسانوں سے زیادہ مضبوط اور کارآمد مددگار ملیں۔ کرافورڈ جس نے بعد میں ہسپانیہ کی جنگ میں بہت ناموری حاصل کی، ۷ ستمبر کو فرانسیسیوں پر بالی نامک کے قریب حماقت سے حملہ کر بیٹھا جس کو فرانسیسیوں نے بُری طرح پسپا کیا۔ ٹھیک اسی وقت ۸ ستمبر کو لارڈ کارنوالس اپنے عظیم اور خاص لشکر کے ساتھ بالی نمک کے مقام پر آ پہونچا اور ہمبرٹ کے مقابلہ میں آ ڈٹا۔ اس خوفناک موقع پر پچیس ہزار آدمیوں سے زیادہ فوج سے محصور ہو کے ہمبرٹ نے نہایت استقلال سے اپنی مٹھی سی فوج کو صف آرا کیا، یقیناً کسی اور غرض کے لیے نہیں بلکہ صرف فرانسیسی جھنڈے کی عزت عظمت برقرار رکھنے کے لیے۔ اُس کی پچھلی فوج پر کرافورڈ نے سختی سے حملہ کیا جس نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے لیکن باقیماندہ فرانسیسی اور آدھ گھنٹہ تک نہایت دلیری سے مدافعت کرتے رہے انھوں نے نہایت ہوشیاری سے اس حالت میں بھی لارڈ روڈن اور اُس کے سواروں کو اسیر کر لیا لیکن جنرل لیک کے خاص لشکر کے نمودار ہو کے شریک جنگ ہونے پر اُن کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۷۴۶ لشکری تھے اور ۹۶ افسر۔ ۲۲ اگست کے بعد اُن کے ایک ۲۰۰ آدمی کام آ چکے تھے۔

سرکاری اطلاعوں میں بالی نمک پر انگریزوں کا نقصان صرف ۳ قتل اور ۱۳ زخمی ظاہر کیا گیا کیسل بار اور دیگر مقامات کے نقصان کا کہیں ان میں ذکر نہیں ہے۔

پانچ سال بعد پلاؤڈن نے اپنی کتاب "حالت آئرلینڈ کا تاریخی موازنہ" میں ہمبرٹ کی حملہ آوری کا مفصل ذکر کیا ہے اس میں وہ لکھتا ہے "انگریزی سلطنت کی طاقت و درخشانی پر یہ نہایت ذلت آمیز دھبہ رہ گیا کہ ۱۱۰۰ فرانسیسیوں کی نہایت ادنیٰ فوج ایسی سلطنت میں اتر آئی جس میں ڈیڑھ لاکھ سے بھی زیادہ مسلح فوج موجود تھی انھوں نے اُن چند چھ ہزار آدمیوں کی جماعت کو جو اُن کے حملے کے مقابلے کے لیے تیار تھی نہ صرف منتشر کر دیا بلکہ وہ ہمارے ملک میں اپنے لیے توپیں اور گولہ بارود مہیا کر سکے، شہروں پر قبضہ کیا، ملک میں ڈیڑھ سو میل کوچ کرتے ہوئے سلطنت کے عین قلب میں، ... برابر اپنے فاتحانہ ہاتھوں میں ہتھیار لیے رہے۔"

اگرچہ لارڈ کارنوالس جنرل لیک اور لیفٹننٹ ہربرٹ ٹیلر کے ذاتی خطوط میں اپنی خوف زدہ فوج کی بیرحمی سرکشی اور بدرویہ پر نفرت و حقارت کا اظہار نظر آتا ہے لیکن حسب دستور سرکاری مراسلت میں خالص تعریف مندرج ہے۔

خوف و ہراس کا زمانہ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ نپولین جو اُس زمانہ میں فرانسیسیوں کا شاہنشاہ بن گیا تھا برابر انگلستان پر حملہ آوری کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن باوجود بعض نالائق فوجی منتظموں کی عدم توجہی کے جس کی شکایت لارڈ کارنوالس

وغیرہ کے خطوط میں کثرت سے پائی جاتی ہو. انگریزی قوم پر اُنکے دشمن کے خوف سے یکدل ہوگئی تھی اور دل سے اپنے بادشاہ کی پشت پر کھڑی تھی. نپولین کو دیگر مقامات پر جو کامیابیاں نصیب ہوئیں اُس کی وجہ یہی تھی کہ وہ قومیں اپنے بادشاہوں سے ناراض تھیں، اُن میں آپس میں مناقشات تھے. لیکن انگلستان کی صورت بالکل جداگانہ تھی. دن بدن اس قوم کا اتفاق بمقابلہ دشمن کے مقابلہ کے لیے بڑھتی جاتی تھی. لیکن نپولین کو اپنی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ اُس نے ایک تمغہ کی تیاری کا حکم دیا جسکو فرضی طور سے لندن میں ڈھلا ہوا بتایا گیا. گویا انگلستان کی فتح قبل از وقت مکمل ہوگئی تھی. اس میں شک نہیں کہ نپولین کی حملہ آوری انگلستان کی تدبیر نہایت ہوشیاری سے تیار کی گئی. وہ جانتا تھا کہ لشکر سے بھری ہوئی کشتیاں رود بار انگریزی سے پار نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ راستہ انگریزی جنگی جہازوں سے محفوظ نکیا جائے. چونکہ اس وقت شاہ ہسپانیہ انگلستان کے معاملہ میں اُس کا دوست تھا اس لیے اُس کے پاس تین بیڑے تھے. دو فرانسیسی طولون اور برسیٹ میں اور تیسرا ہسپانوی کیڈز میں. اُس نے خیال کیا کہ علحدہ علحدہ ان میں سے کوئی انگریزی بیڑہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس لیے تینوں ایک جگہ جمع ہوکر رود بار کو اس وقت تک محفوظ رکھ سکتے ہیں جب تک اس کی فوجیں پار ہوں. لہذا طولون کا بیڑا کیڈز گیا اور وہاں سے ہسپانوی بیڑے کو ساتھ لے کے جزائر غرب الہند کی طرف روانہ ہوا جیسا نپولین نے خیال کیا تھا. نلسن نے جو بحیرہ روم کے برطانوی بیڑہ کا امیر البحر تھا دونوں بیڑوں کا تعاقب کیا. وہ اُن کی جستجو میں ہی تھا کہ دونوں بیڑے نپولین کی تدبیر کے مطابق چپکے سے یورپ واپس آگئے تاکہ برسیٹ کا ناکہ بند کرنے والے انگریزی جہازوں کو منتشر کرکے برسیٹ کے محصور بیڑے کو ہمراہ لے کے رود بار کو نلسن کی غیر حاضری میں روک لیں یہ تدبیر کسی قدر کامیاب ہوئی. نلسن نے دشمن کے ۳۰ جہازوں کا جزائر غرب الہند تک ۱۳ جہازوں سے تعاقب کیا جب وہ اُسے نہ ملے تو وہ فوراً واپس ہوگیا. اُس کے پہونچنے سے پہلے فرانسیسی متحدہ بیڑہ خلیج بسکے میں پہونچ گیا جہاں سر رابرٹ کلدار نے اُس کا صرف پندرہ انگریزی جہازوں سے مقابلہ کیا دو ہسپانوی جہاز غرق ہوے اور باقی بیڑہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اُس نے فوراً کیڈز کو راہ فرار اختیار کی. اِسطرح انگلستان فرانسیسی حملہ سے بچ گیا لیکن نپولین کے غرور نے [illegible] کو اور نیچا دکھایا! بندرگاہوں میں جہازوں کے بند رہنے سے تنگ آکے اُس نے امیر البحر کو حکم دیا کہ کھلے سمندر میں نکل کے انگریزوں کا مقابلہ کرے. باول ناخواستہ امیر البحر نے بیڑا نکالا لیکن ۱۸۰۵ء میں نلسن نے جنگ طرلفا لگر میں اُسے شکست دی. فرانسیسی اور ہسپانوی بیڑے تقریباً بالکل تباہ ہوگئے. اس لڑائی میں گو نلسن کام آیا لیکن اُس روز سے انگریزی بحری تفوق میں پھر کوئی سد راہ نہ ہوا.

۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۵ء کے زمانہ میں انگلستان والوں پر خوف وہراس کا بوس سوار رہتا. اِسطرح بخیر و خوبی ختم ہوا.

مین اوپر ذکر کر چکا ہون کہ سنہ ۱۷۹۹ء مین حملآورون کے خدشون سے انگلستان والون کے دلون مین وہمہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نپولین کے زمانہ مین حملآورون کے متعلق جنبش تو ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ صرف خیالات نے ہی لغزش کی اور عرصہ تک لوگ پریشان رہے، موجودہ محاربہ عظیم سے پہلے بھی اسی قسم کی خیالی تصویرون نے دماغون مین تلاطم برپا کر دیا تھا لیکن جنگ ہونے کی صورت مین بھی برطانوی بیڑہ غنیم کا سد راہ بنا رہا۔ اور نہایت خوبی سے انگلستان غالب آیا۔ ان فتحمندی کے ایام مین ہمارے ملک کی بابت بھی ایسے ہی اندیشے ظاہر کیے جاتے ہین اور خواہ مخواہ ہمین خوفزدہ کیا جاتا ہے چنانچہ ۱۲ دسمبر کا لندن سے ریوٹر کا تار مظہر ہے کہ اخبار ٹائمز مین آج ایک مشہور انکشاف ہوا ہے جس مین یہ قبل از وقت امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ بولشیوک روس کو بالآخر چھوڑ کے وسط ایشیا مین اپنے آپ کو قائم کرینگے آنردے بحیرہ خزر اور کثیر حصہ وسط ایشیا پر اُن کا قبضہ بتایا جاتا ہے وہ شرقی ساحل بحر خزر پر کراسنوڈسک پر حملہ کرنے والے ہین مزید برآن وہ افغانستان سے بھی عمیق تعلقات قائم کر رہے ہین۔ اور کابل مین اُن کے جاسوس ہندوستان کے ذریعہ برطانیہ پر حملہ کرنے کی تلقین کر رہے ہین خبر ملی ہے کہ سیکڑون ہندو ماسکو مین اس تحریک مین زیر تربیت ہین۔ ان مین بعض ہندوستان کو روانہ ہو چکے ہین اور انکے لیے روپیہ بھی مہیا ہو گیا ہے۔ ٹائمز اپنے افتتاحیہ مین متمطراز ہے کہ جنرل ڈینکن اور امیر البحر کولچک کے شکست یاب ہونے کی صورت مین سوویٹ افواج کا رخ ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے افغانستان کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ اِس مضمون مین یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ شکست کے نتائج بہت جلد ہندوستانی سرحد پر محسوس کیے جائینگے اِسی قسم کی متوحش خبرین سنہ ۱۹۱۹ء کے ہیجینی رولٹ کے زمانہ مین دی گئی تھین کہ سلنگفورس کا ایک پیام پکڑا گیا ہے کہ بالشیوک تحریک جون جولائی مین ہندوستان مین پھوٹ پڑے گی چنانچہ اِس ہیجینی کو اِس پیام سے منسوب کیا گیا۔ لیکن ہم کو انگلستان جیسی زبردست سلطنت کے زیر نگین گھبرانے کی ضرورت نہین ہے۔ دنیا کی تاریخین ہمین ہمت و استقلال کا سبق دیتی ہین۔ انگلستان جو ہمیشہ ایسے ہی خطرات سے فاتحانہ نکلا ہے ہمیشہ حکمران ہے اور یقین ہے کہ ٹائمز کی رائے یا انکشاف مذکورہ بالا واقعات کی طرح فرضی ثابت ہوگا۔

محمد ظفر (ایم اے)

# غزل

(از سید محمد ہادی مچھلی شہری بی اے ایل ایل بی وکیل علی گڈھ)

بر طرح مشاعرہ علی گڈھ :-

عنایت ہے توجہ ہے کرم ہے قدردانی ہے

مری صورت سے خود ظاہر مرا سوز نہانی ہے
مرا انداز حسرت پردہ پوش بے زبانی ہے

گرفتار بلا مقتول تیغ بدگمانی ہے
ترے وابستۂ غم کی بلا مین زندگانی ہے

معطر تیری خوشبو سے مشام لنترانی ہے
ترا حسن محبت زاہبا رجاودانی ہے

وہ آتے ہین عیادت کے لئے اللہ ری قدرت
مرا اندوہ حرمان رونما ے کامرانی ہے

ترے غم کو دل بیتاب سے کیونکر جدا کر دون
اسی پر منحصر تاب و توان زندگانی ہے

اُسے کیونکر یقین آئیگا میری جان نثاری کا
کہ اظہار وفا مشروط شرط بے زبانی ہے

مقدر لوٹا لتا ہے اس کو یکھین کیسے حصے مین
ستم اس کا بھی اک گلدستۂ باغ جوانی ہے

خدا جانے پس نظارہ دل کا حشر کیا ہوتا
ہمارے حال پر احسان مرگ ناگہانی ہے

شب امید مین بھی ہے وہی افسردگی دل کی
مرا اندیشۂ غم پردہ دار کامرانی ہے

نہین معلوم جو شعر غم مین کیا منھ سے نکل جائے
بیان حال دل ممنون طرز بے زبانی ہے

مجھے کھٹکا لگا رہتا ہے یون اس کے تلون کا
کہ اس کے لطف پر میرا مدار زندگانی ہے

غرور حسن نے اس کے مجھے برباد کر ڈالا
گلوے شوق پر تیغ جفاے لن ترانی ہے

سکون مرگ حاصل دیکھیے کب ہو محبت مین
دل محزون پریشان بلاے زندگانی ہے

خدا جانے کہان مجھ کو جنون شوق لیجاتا
میری وامان دگی منت گزار ناتوانی ہے

خدا وہ دن دکھائے وہ بیاباں پہلی
مری قسمت کی کوتاہی ترا عہد جوانی ہے

قیامت دل مین رہنا دل سے آفت ہے جدا ہونا
مری امید کی بھی کیسی غضب مین زندگانی ہے

مری واماندگی ہادی ہے صورت سنگ منزل کی
مری افسردگی تمہید شوق کامرانی ہے

# سیرت عمر بن عبدالعزیز

مصنفہ

## حضرۃ الاستاذ مولانا عبدالسلام ندوی مدظلہ

موجودہ زمانے مین جبکہ علماے سلام کی ذات سے فضل وکمال کا چراغ گل ہوگیا ہے، اسلامی تمدن کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کی بنیاد بھی متزلزل ہوگئی ہے، فن تاریخ مین بہت سے حاطب اللیل مورخین پیدا ہوگئے ہین، ہماری ادبی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے، علوم وفنون کے دفتر کا ایک ایک ورق اڑ چکا ہے، اور ہماری قوت ادراک پر بہت سی ضافی خوبیان مسلط ہوچکی ہین، مولانا عبدالسلام صاحب کی تحریر کا کوئی صفحہ ہاتھ آجاتا ہے تو ہم سمجھتے ہین کہ لیمیا ہاتھ آگئی۔

دو برس کا زمانہ گذرا جب اُن کی ایک اہم کتاب انقلاب الامم کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اگرچہ ڈاکٹر لی بان کی ایک کتاب کا ترجمہ تھی تاہم اُنھون نے اپنے زور قلم کی بدولت اُس مین جو سحر کاریان دکھلائین اُن کی وجہ سے وہ اُردو علم ادب کا ایک معجزہ قرار پائی۔ اور اس کو اُن لوگون نے تسلیم کیا جو ہماری ادبی عمارت کے ستون مانے جاتے ہین۔

سیرت عمر بن عبدالعزیز مولانا کی دوسری تصنیف ہے، جو حال مین شائع ہوئی ہے، یہ کتاب حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حالات مین ہے، جو خاندان بنو امیہ مین واسطۃ العقد کا درجہ رکھتے ہین، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حالات مین اگرچہ اُردو زبان مین متعدد کتابین لکھی گئی ہین، تاہم ان سب کا ماخذ صرف چند سیاسی تاریخین ہین، جن مین اُن کے اخلاق وعادات، فضائل ومناقب اور مجددانہ کارنامون کا ضمناً تذکرہ ہے، اور اِسی لیئے اِن کتابون مین حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، وہ بالکل دھندلی اور ناتمام ہے، مولانا نے اِس کمی کے پورا کرنے کی طرف خاص توجہ کی ہے، اور اِس مقصد کے لیئے سیرۃ العمرین ابن جوزی اور طبقات ابن سعد کو سامنے رکھا ہے، جن مین اُن کے اخلاقی واصلاحی کارنامے نہایت تفصیل سے مذکور ہین۔

دیباچہ مین مولانا نے خلافت بنو اُمیہ کے آغاز، اُس کے علل واسباب، اور اُس کی سیاسی تاریخ پر مفصل تبصرہ لکھا ہے، اُس کے بعد بنو اُمیہ کے رقبۂ حکومت، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نام ونسب، تعلیم وتربیت، دورِ حکومت

زمانۂ خلافت، غزوات، فتوحات، وفات، اخلاق و عادات اور اعمال و عبادات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہی اُس کے بعد اُن کی زندگی کے تمام کارناموں مثلاً تجدید و اصلاح، اشاعتِ اسلام، احیاءِ شریعت، تدوین حدیث، اشاعت تعلیم، عمارات، رفاہ عام کے کام اور شہروں کے آباد کرنے کا تذکرہ کیا ہی، پھر سیاست و حکومت کے عنوان مین فرائض خلافت، خصوصیاتِ حکومت، اقامت عدل، اور نظام حکومت کے انقلاب پر بحث کی ہی، آخر مین مآثر بنو اُمیّہ کا عُنوان قائم کیا ہی جس مین بنو اُمیّہ کی کثرتِ فتوحات، مُلکی انتظامات، عمارات، اولیات، ایجادات، علوم و فنون کی اشاعت، اور تدبیر و سیاست پر گفتگو کی ہی، اور خاتمہ مین سلطنت بنو اُمیّہ کے زوال پر ایک مفصل مضمون لکھا ہی جس مین اُس کی تباہی کے اسباب بیان کیے ہین۔

مولانا تمدنی تاریخ کے عالم خصوصی ہین، اس بنا پر انھون نے اس قسم کے جو مضامین اس کتاب مین لکھے ہین وہ دوسری کتابون مین نہین مل سکتے، باقی کتاب کے اور مضامین بھی ترتیب و تسلسل جدت ادا، طرز بیان، زور قلم اور صحت اخذ کا بہترین نمونہ ہین، اور اس طرح مجموعی حیثیت سے یہ کتاب حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تمام سوانح عمریون سے بڑھ گئی ہی۔

ادبی حیثیت سے۔ اگرچہ کتاب کا ہر صفحہ، ہر سطر، بلکہ ہر فقرہ تک اُردو انشا پردازی کی جان ہی، تاہم اُس مین وہ مقامات خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہین جہان مولانا کا خاص رنگ نمایان ہوا ہی، مولانا ایک مستقل لٹریچر کے بانی ہین جس کی ابتدا الہلال سے ہوئی ہی۔ اور جس کا سب سے زیادہ نمایان مظہر فلسفۂ لبنان کا مضمون ہی، جو معارف مین شائع ہو چکا ہی۔ بہرحال اس کتاب مین بھی جہان تک تمدنی تاریخ کا تعلق ہی، مولانا کا خاص رنگ بھرا ہی مثلاً:

"مذہب، سیاست، اخلاق، تمدن، غرض نظام عالم کے کل اجزا جب زنگ آلود ہو جاتے ہین تو خدا ایک مصلح ایک لقا مراد ایک مجدد کو پیدا کرتا ہی جو ان تمام چیزون کو جلا دیکر آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہی"

"اُن کی خلافت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہی کہ انھون نے جمہوریت کی سپرٹ کو جو بالکل مردہ ہو گئی تھی از سرِ نو زندہ کیا" "زمانۂ قدیم کا نظام سلطنت، اس زمانہ کے نظام حکومت سے بالکل مختلف تھا، آج سلاطین کی شخصیتین بدل جاتی ہین، نظام حکومت اُلٹ پلٹ جاتا ہی، شخصیت کی جگہ جمہوریت لے لیتی ہی، لیکن سلطنت کے اعضا و جوارح یعنی عمال پر اس کا کوئی اثر نہین پڑتا، لیکن قدیم زمانہ مین سلاطین کی شخصیت کا تغیر و تبدل گویا نظام سلطنت کا انقلاب کلی تھا، اور یہ انقلاب حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت مین سب سے زیادہ نمایان

نمایان نظر آتا ہی، انھون نے تخت حکومت پر متمکن ہونے کے ساتھ ہی اُن تمام مفاسد کی اصلاح کرنی چاہی جن کا مادہ حضرت امیر معاویہ کے زمانہ ہی سے روز بروز پختہ ہوجاتا تھا؟

"خود حضرت عمر بن عبدالعزیز کو نظر آتا تھا کہ اُن کے لیے جس قسم کے اعوان و انصار کی ضرورت ہی وہ سرکاری دفترون مین نہین مل سکتے، اس لیے وہ اپنی نگاہ کو دور دور تک دوڑاتے تھے، اور جہان کہین کوئی مرغ بلند آشیان نظر آتا تھا اُس کو اس جال مین پھنسانا چاہتے تھے جسمین خود گرفتار ہوچکے تھے"

"حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی ان تمام مظالم کی طرف توجہ کی اور عدل و انصاف کا منارہ بلند کیا؟"

"ولید نے جو عمارتین تعمیر کروائین ان مین جامع مسجد دمشق، مسجد نبوی، اور مسجد اقصیٰ، تمدن اسلام کے چہرہ کا آب و رنگ ہین"

"لیکن جب تک اہل عرب کی قومی طاقت کا رُخ غیر قومون کی طرف رہا، اُن مین باہم کسی قسم کا تصادم نہین ہوا، لیکن حضرت امیر معاویہ کے زمانہ مین یہ دونون طاقتین باہم ٹکرائین؟"

اس کتاب مین بعض نئی ترکیبین، اچھوتی تشبیہین اور جدید استعارے بھی نظر آتے ہین، مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ کے اُن باکمال لوگون کو جو مذہب، علم اخلاق، اور سیاست کے علمبردار تھے، اور جنھون نے زمانہ کی ناموافقت کی وجہ سے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی مرغ بلند آشیان کی ترکیب اضافی سے تعبیر کیا ہی جو درحقیقت نہایت لطیف استعارہ ہی۔ اسی طرح ایک مقام پر زمانہ کو ایک صبا رفتار گھوڑے سے تشبیہ دی ہی جس کی باگ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پھیر کر عہد صحابہ سے ملا دی، یا مثلاً ایک جگہ بنو ہاشم کو قبلہ گاہ عالم کے لفظ سے یاد کیا ہی، جو سرتا پا واقعیت ہی۔ اور یہ مولانا کی ایسی خصوصیت ہی جس مین وہ اُردو کے تمام موجودہ انشا پردازون سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہین۔

اسی طرح کتاب مین بعض عربی الفاظ بھی آگئے ہین، مثلاً نیاحت، سفہا، ایتلاف، احیا، امحا، وغیرہ لیکن جو لفظ جس موقع پر استعمال کیا گیا ہی۔ اس خوبی سے کیا گیا ہی کہ اُس کی ثقالت دور ہوگئی ہی اور کلام مین [illegible] روانی برجستگی زور و اثر، اور جوش پیدا ہوگیا ہی، اور یہی کمال انشا پردازی ہی،

کتاب مین بعض جگہ عربی عبارتون کا ترجمہ بھی ہی اور یہ وہ مقام ہی جہان مولانا کی انشا پردازی کا اصلی جوہر نمایان ہوتا ہی، ترجمہ، تصنیف سے بھی زیادہ مشکل چیز ہی، لیکن مولانا کو اُس مین خاص کمال حاصل ہی، چنانچہ ہم بعض مقامات کا ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہین:۔

"لوگو! مجھ پر خلافت کا بار بغیر اس کے کہ مجھ سے رائے لی جاتی، یا میں اُس کا خواستگار ہوتا، یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا، ڈال دیا گیا، میری بیعت کا جو قلادہ تمھاری گردنون مین ہے، مین اس کو خود نکال لیتا ہون اب جس کو پسند کرو اپنا خلیفہ مقرر کرو؟"

"مجھے تمھارا خط ملا، اور جیسا تم نے لکھا ہے مین ویسا ہی جواب دون گا، تمھاری ابتدائی حالت یہ ہے کہ تمھاری مان نباتہ سکون کی لونڈی ہے، جو حمص کے بازارون مین ماری ماری پھرتی تھی، اور شراب کی دوکانون مین جایا کرتی تھی، اُس کو ذبیان بن ذبیان نے مسلمانون کے مال غنیمت سے خریدا، اور تمھارے باپ کو ہدیۃً دیا، اسی سے تم پیدا ہوے تو کس قدر بُری ہو مان اور کس قدر بُرا ہو بچہ! اُس کے بعد تم نشو ونما پاکر ایک معاند اور ظالم ہوے، تمھارا خیال ہے کہ مین ظالمون مین سے ہون مین نے تم کو اور تمھارے خاندان کو خدا کے مال سے جس مین اہل قربیٰ، مساکین، اور بیواؤن کا حق ہے محروم کر دیا، لیکن مجھ سے زیادہ ظالم اور مجھ سے زیادہ خدا کے عہد کو چھوڑ دینے والا شخص ہے جس نے تم کو بچپن اور سفاہت کی حالت مین مسلمانون کی ایک چھاؤنی کا افسر مقرر کیا..... اس تقرر کا بجز محبت پدری کے اور کوئی مقصد نہ تھا بس ٹھیکا رہو تجھ پر اور ٹھیکا رہو تیرے باپ پر! قیامت کے دن تمھارے کس قدر مدعی ہون گے، اور تمھارا باپ اپنے مدعیون سے کیونکر نجات پائیگا؟..... مجھ سے زیادہ ظالم اور مجھ سے زیادہ خدا کے عہد کا چھوڑنے والا وہ شخص ہے جس نے قرۃ بن شریک جیسے اُجڈ بدو کو مصر کا عامل مقرر کیا، جس نے راگ، باجے، لہو ولعب، اور شراب خواری کی اجازت دی..... اگر تم فروخت کیے جاؤ، اور تمھاری قیمت یتیمون، مسکینون اور بیواؤن پر تقسیم کی جائے تو کافی ہو گی کیونکہ تم مین سب کا حق ہے!!"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے خدا اور رسول کی حمایت مین خروج کیا ہے لیکن تم کو اس کا مجھ سے زیادہ حق نہین ہے، آؤ! ہم تم باہم مناظرہ کر لین، اگر ہم حق پر ہون تو تم عام لوگون کی طرح حلقۂ اطاعت مین داخل ہو جاؤ، اور اگر تم حق پر ہو تو ہم اپنے معاملہ پر غور کرینگے"!

"قیدیون کو اس سے بے نیاز کر دو کہ وہ بیڑیان ہلاتے ہوے نکلین کہ لوگ اُن کو صدقہ خیرات دین کیونکہ یہ ایک بڑا جرم ہے کہ مسلمانون کی ایک جماعت جو جرائم کی پاداش مین قید ہو، اس طرح نکلے..... مسلمان کی پیٹھ بجز حق شرعی کے ہر حالت مین محفوظ ہے"!

کہان وہ لوگ جن پر حضرت عمر بن الخطاب حکومت کرتے تھے، اور کہان اس زمانہ کے لوگ جو سیرا

خیال ہو کہ بادشاہ کی روش رعایا کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے زمانہ میں حضرت عمر کی روش اختیار کرے تو لوگوں کے گھروں میں لوٹ ڈال دی جائے، ڈاکے پڑنے لگیں اور باہم جنگ و جدل ہونے لگے۔ اس لیئے والی کا فرض ہو کہ وہ روش اختیار کرے جو اُس کے زمانہ کے لیئے موزون ہو"

بہرحال یہ کتاب علمی، ادبی، تاریخی، غرض ہر حیثیت سے ہماری زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہو اور اُس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو موجودہ فن سیرت نگاری کی رُو سے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ورنہ آج کل ہماری زبان کی جو حالت ہو، اس میں جس قسم کے پیشہ ور مصنفین پیدا ہو رہے ہیں، اور جس قسم کا سطحی مذاق پھیل رہا ہو۔ اُس کی موجودگی میں ایسی مستند صحیح، دلچسپ اور جامع تصنیفات کی کہاں امید ہو سکتی ہو؟

(دار المصنفین اعظم گڈھ) سعید انصاری

# "جذبات قدسی"

کیون مجھ سے پھیر لی آنکھ اُس غیر آشنا نے ۔ کیا میں شریک رہا تھا دامنگیر ادا کی
سوزِ محبت اب کیا چھوڑے گا مجھ کو زندہ ۔ یہ آگ ہو لگائی انداز برق زا کی
مٹتا ہے دل کے ہاتھوں میرا ابھی نقش ہستی ۔ وہ کیا وفا کرے گا جس کو ہو خو جفا کی
رنج و فراق جانان اب ہم اُٹھائیں کب تک ۔ آخر کچھ انتہا ہے آلام جانگزا کی
شوقِ لقا میں پہلے مُنھ آنسوؤن سے دھویا ۔ ہاتھوں کو پھر اُٹھا کر اُن کے لیئے دعا کی
بیمار ہجر تم بن جانبر نہ ہو سکے گا ۔ شائد اجل دوا ہو اس درد لا دوا کی
کیونکر تمھیں سناؤں کس طرح تم سنوگے ۔ دلدوز داستان ہو قلبِ غم آشنا کی
دل پر نشانِ اُلفت کا نقش فی الحجر ہیں ۔ اس آئینہ میں دیکھو تصویر ہو وفا کی
راتیں پہاڑ سی وہ کاٹے کٹیں نہ جن پر ۔ کرتے رہے دعائیں زلف رسا کے شا کی
کھلتی ہے زلف پیچان ہوتا ہو دل پریشان ۔ ساعت اب آرہی ہے انبزدنی بلا کی
اُن کی سنہری زلفیں بکھریں تو کیا غضب ہو ۔ جانسوز بجلیاں ہیں اِس دلربا گھٹا کی
تارے کہاں سے آئیں کس طرح جگمگائیں ۔ سب آج شام ہی سے افشان میں لقا کی
ظلمت سواد ہو کر بڑھتی گئی شب غم ۔ گھٹ گھٹ کے رہ گئے ہم تاب و توان کہاں کی
انجام اہل اُلفت عبرت کا آئینہ ہے ۔ اُس دشمن وفا نے کیا مجھ پہ کم جفا کی

سید محمد جعفر قدسی (جائسی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# نظرے خوش گذرے

مسلم کانفرنس لکھنؤ کی بربادی پر جو رائے زنی ستمبر کے الناظر مین کی گئی اُسی سے ملتے جلتے خیالات اخبار مشرق گورکھپور کے کسی نامہ نگار نے بھی جو اُس جلسہ مین شریک تھے اخبار مذکور مین ظاہر کیے تھے جسپر مولوی عبدالباری صاحب نے ایک طولانی خط ایڈیٹر صاحب مشرق کے نام اپنی برات کے اظہار مین تحریر فرمایا۔ یہ خط اخبار مذکور مین چھپ گیا تھا مگر قبل اس کے کہ الناظر مین اُس کے متعلق کچھ لکھا جائے مسٹر نذیر حسین بی اے سکرٹری راجہ صاحب محمود آباد نے ہمدم مورخہ ۴ دسمبر مین ایک طولانی مراسلت چھپوائی جسمین انھون نے اپنے آقائے نامدار کو قطعی طور پر بری الذمہ قرار دیتے ہوے ان سب واقعات کو کافی تفصیل سے بیان کردیا جن کا الناظر مین بالاجمال تذکرہ کیا گیا تھا۔

مسٹر نذیر حسین کی تحریر نے فرنگی محل مین جو اضطراب پیدا کیا ہوگا اس کا اندازہ ہر شخص نہین کر سکتا تاہم اس واقعہ سے لوگون کو کچھ پتہ لگ جائیگا کہ اس مراسلت کے شایع ہونے کے بعد بجاے اسکے کہ فرنگی محل سے کوئی جواب اس مضمون کا شایع ہوتا ایک خط راجہ صاحب محمود آباد کے پاس بھیجا گیا جسے اگرچہ ہمین بچشم خود دیکھنے کا اتفاق نہین ہوا لیکن جسکے مضمون پر ہمین ایک معتبر ذریعہ سے آگاہی حاصل ہوگئی ہے۔

اس خط کا مفہوم صرف اس قدر تھا کہ اگر راجہ صاحب (جو مولوی عبدالباری صاحب کے سیاسیات قومی مین دخیل ہونے اور اُن کے سیاسی منزلت کے نشو و نما پانے کا ذریعہ ہوے) اُن کی مخالفت کرینگے تو مولوی صاحب کے لیے میدان سیاست مین مقاومت دشوار ہو جائیگی غرضکہ ہمارے مخبر کے الفاظ مین یہ تحریر ایک ہجو نامہ کے مانند تھی جو فرنگی محل کے دار العلم والعمل سے والی قیصر باغ کی خدمت مین بھیجی گئی۔

فرمانروائے فرنگی محل نے تو "سر رشتہ باید گرفتن بہ میل" پر عمل کرکے اس تحریر کا جواب براہ راست مالک ہمدم کی خدمت مین بھیجدیا لیکن مولوی عبدالباری صاحب کے عقیدت کیشون مین سے دہلی کے بعض اخبارات کو تاب نہ ہوئی اور انھون نے اُن لوگون کو گھرے ڈپٹے دکھانا شروع کیے جو اُن کے خیال مین مولوی صاحب کی ناخدائی کے منکر ہین۔ چنانچہ سب سے پہلے اخبار کانگرس دہلی مین ایک ایڈیٹوریل شایع کیا گیا جسمین واقعات کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق اگرچہ ایک جملہ بھی نہین تاہم ایڈیٹر صاحب نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے یہ قرار دیکر کہ لکھنؤ مین مولوی صاحب کے خلاف ایک سازش قائم ہے چند ان سازشیون کو مخاطب کرکے چند نصائح کے دریا بہا دیے۔

اسکے بعد اخبار خطیب دہلی نے ایک نوٹ لکھ کر خاکسار ایڈیٹر الناظر کو ہدف ملامت بنایا غنیمت ہو کہ دیگر اخبارات کا مقیاس الحرارت حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہوا ورنہ شاید یہ بحث عالمگیر ہوجاتی۔ اور الناظر کی محدود گنجائش میں اس کے متعلق کچھ لکھنے کا موقع باقی نہ رہتا۔

یہ بحث جس قدر طول پکڑ گئی ہو اُسکی مناسبت سے تو اب بھی الناظر میں لکھنا ممکن نہیں تاہم بعض حقیقتوں کو ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہو۔ سب سے پہلے ہم مولوی عبدالباری صاحب کے خط کو لیتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنی خواہش صدارت کی تردید کرتے ہوے فرماتے ہیں:-

"جب میں واپس آیا اور ۱۲ بجے تو اس وقت جلسہ کے لوگ آئے اور تمام علما کو بلائے گئے معلوم ہوا کہ سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر صاحب آگئے ہیں۔ اور سب جلسہ بھرا ہوا ہو صرف علما کی دیر ہو۔ ہم لوگ ایک گھنٹہ وقت سے دیر کرکے گئے مگر وہاں کوئی کارکن جلسہ کا ہمکو دکھائی نہ دیا۔ نہ سکرٹری تھے۔ نہ صدر استقبالیہ تھے اور نہ ذمہ دار ممبر تھے ایک گھنٹہ کامل اور انتظار کیا۔ آخر میں نظمیں شروع کرائیں جب لوگ گھبرانے لگے تو برابر بلانے کے لیے لوگوں کو سکرٹری صاحب اور صدر استقبالیہ صاحب اور سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر کے پاس بھیجا مگر جواب یہ آتا تھا کہ ابھی تک کچھ طے نہیں ہوا ہو دو تین آدمی بگڑے ہوے ہیں کہ ہم جلسہ میں شریک ہوں گے اور صدر عبدالباری ہوں گے تو اُن کی کمزوریاں ظاہر کر دینگے یا خود اُٹھ کے چلے آئیں گے" (مشرق مورخہ ۳۰- اکتوبر ۱۹۱۹ء)

حالانکہ صورت واقعہ یہ نہ تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ چند اصحاب کو مولوی صاحب کی صدارت سے اختلاف تھا اور اُن کا اختلاف فی الواقع حق بجانب بھی تھا۔

لیکن جس وقت کا مولوی صاحب ذکر فرماتے ہیں اُس سے بہت پیشتر یہ اصحاب محض اس جلسہ کی اہمیت کو نقصان سے بچانے کی خاطر اپنے دلی ارادے اور یقین کے خلاف اس بات پر رضامند کر لیئے گئے تھے کہ اگر مولوی صاحب صدر منتخب ہوں تو وہ نہ تو مخالفت کریں اور نہ جلسہ سے اُٹھ آئیں۔ اور اس واقعہ کی اطلاع خود ایڈیٹر الناظر نے مولوی صاحب کو اُسی وقت کر دی تھی جبکہ صاحب موصوف معہ دیگر مولوی صاحبان کے جلسے میں تشریف لاتے ہیں۔ مولوی صاحب اگر اپنے حافظہ پر زور ڈالیں گے تو یقیناً اُن کو یاد ہو گا کہ اس ناچیز نے جس وقت یہ خبر سنایا ہو کہ اب کسی کو اختلاف باقی نہیں ہو آپ بے کھٹکے صدارت فرمائیں۔ تو ساتھ ہی یہ بھی دریافت کیا تھا کہ آپ نے کوئی صدارتی خطبہ بھی تیار کیا ہو اور جب اُس کا جواب نفی میں ملا تو فی البدیہہ یہ تجویز بھی پیش کر دی گئی تھی کہ جو خطبہ صدارت آنریبل سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر صاحب کے لیئے تیار ہوا ہو اُسی کو آپ پڑھ دیں۔ اور آپ اس پر رضامند بھی

ہوگئے تھے۔ یہ اتفاق ہو کہ خطبۂ صدارت کے مطبع سے آنے میں دیر ہوئی اور آفتاب کی تمازت نے حاضرین کی کثرت یا حوارئین کے ذوق و شوق اور کرسی صدارت کی اضطراب افزا کشش نے مولوی صاحب کو اس قدر از خود رفتہ کر دیا کہ ذرا سی تحریک پر مولوی صاحب غیظ و غضب کا مجسمہ بن گئے۔ اور بغیر اس کے کہ کہیں سے مخالفت کی کوئی صدا بھی بلند ہو جلسہ کو اپنی ناموزون اور بے سر و پا تقریر سے بدمزہ بنانے کا سبب ہو گئے۔

اگر واقعۃً مولوی صاحب کو صدارت کا خیال نہ تھا تو جیسے ہی اس ناچیز نے اُن کی صدارت سے اختلاف رکھنے والوں کی رضا مندی کا حال بیان کیا یا خطبۂ صدارت کے متعلق استفسار کیا تھا۔ مولوی صاحب فرما دیتے کہ ان کو صدارت منظور نہیں ہو تاکہ خاکسار فوراً آنریبل سیٹھ صاحب یا آنریبل مسٹر فضل الحق کو جا کر بلا لاتا اور یہ سارا قصہ ہی پاک ہو جاتا۔

- باقی رہا ایڈیٹر صاحب کانگریس کا یہ ارشاد کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا عبد الباری میں ترفع اور نمود عظمت کا جذبہ کام کر رہا ہوا اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے علو مرتبت میں روز افزون اضافہ ہوتا رہے۔ اُن کی یہ بھی خواہش تھی کہ مجلس استقبالیہ کا اور اُس کے بعد کانفرنس کا صدر اُن کو بنایا جائے اور ہر ایک موقع پر وہ اس کی آرزو کرتے ہیں کہ اُن کے نام و نمود اور شہرت کو بڑھایا جائے۔ تب بھی ہم دریافت کرتے ہیں کہ اگر ان میں فی الواقع یہ جذبہ موجود ہی تو آپ اُس کی مخالفت کیون کرتے ہیں۔ کیون نہیں آپ ان کی اس خواہش کو پورا کرتے اور اُن سے وہ کام لیتے جس کے وہ اہل ہیں۔"

تو اس میں ہمارے اور ایڈیٹر صاحب کانگریس کے درمیان شدید اصولی اختلاف ہو۔ یہاں تنہا مولوی عبد الباری کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر وہ شخص جس کا ظاہر و باطن یکسان نہ ہو یا جو قومی خدمت محض ذاتی نام و نمود کی خاطر کرتا ہو، ہمارے نزدیک اس قابل ہو کہ اُس کی قلعی کھولی جائے۔ ایڈیٹر صاحب کانگریس کو اختیار ہو کہ وہ خان بہادرون آنریبل ممبرشپون اور دوسرے خطاب زدون سے لیکر سی آئی ڈی کے محترم اراکین تک اُن کی اہلیت کے مطابق کام لیتے اور حسب ضرورت اُن کے نمود و ترفع میں مدد دیتے رہیں۔ باقی جو لوگ جو اخلاق کا معیار اس حد نظر سے بلند رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن سے اُس کی توقع فضول ہو۔

ایڈیٹر صاحب کانگریس معاف فرمائیں اگر یہ عرض کیا جائے کہ جو جانشین رسول نمود و نمائش کا خوگر اور ترفع و عظمت کا خواہاں ہو وہ قطعاً قوم کی غائبانہ رسائی کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اُس کی ذات قومی میدان عمل میں ایک سراب سے زیادہ ہستی نہیں رکھتی اور ہر بہی خواہ ملت کا فرض ہو کہ اس چمک دمک سے دام سے قوم کو بچائے۔

ر کانگریس اگر واقعات کی بنا پر یہ ثابت کرسکتا کہ مولوی صاحب کی یہ خواہش نہ تھی" کہ مجلس استقبالیہ کا اور اُسکے بعد کانفرنس کا صدر اُن کو بنایا جائے" تو اُس کو یہ ناصحانہ انداز شایان ہو سکتا تھا۔ مگر بحالت موجودہ شاید اُس نے محسوس نہین کیا کہ وہ خود کسی قدر مضحکہ انگیز بن گیا ہو۔ کیا اُس کے ناظرین اِس قسم کی تحریرون سے یہ نتیجہ نکالنے مین حق بجانب نہ ہون گے کہ ایڈیٹر کانگریس بھی مسلک مصلحت کوشی و کاسہ لیسی کا موید ہو۔

ایڈیٹر کانگریس کو زیبا ہو کہ وہ ان تمام عبا پوش اور زرین قبا ہستیون سے "وہ کام لے جسکے وہ اہل ہین" باقی اِس خاکسار کو تو اِس اصول پر کچھ زیادہ اعتماد نہین۔ ورنہ قومی لیڈری کی کئی نشستین خالی تھین۔

اب تک سمجھا یہ جاتا تھا کہ ایڈیٹر صاحب کانگریس جو مولانا ابوالکلام کی انشا طرازیون کی نقل اُتارتے اور حریت پسند نیشنلسٹون کے قدم بقدم بلکہ اُن سے چند فرسخ آگے چلنے کی کوشش کرتے ہین تو خود اُن کے دل مین بھی اس جذبہ کا کچھ اثر موجود ہوگا۔ جو مولانا ابوالکلام اور دیگر احرار کو عام سیاسی لیڈرون سے ممتاز بنائے ہوئے ہو مگر اِس تحریر نے ایڈیٹر کانگریس کے چہرہ سے غازۂ حریت کو دور کرکے اُنھین اپنے اصلی رنگ مین نمودار کردیا اور ہم خوش ہین کہ بہت جلد اُن کے خیالات اور عقائد کا راز افشا ہوگیا جعلی سکے ملک مین اِس قدر رائج ہین کہ اصلی اور نقلی کے درمیان امتیاز بہت دشوار ہو جاتا ہو۔ اخبار نویسون مین بھی ایسی "کالی بھیڑین" بہت ہین جنکے الفاظ کی طمطراق اور دعاوی کے بلند آہنگی سے قوم کے اکثر افراد ہمیشہ دھوکہ کھاتے رہتے ہین۔ لیکن ملمع سازی اور ابلہ فریبی کا راز ایک نہ ایک دن طشت از بام ہوکر رہتا ہو۔ اور ہم خوش ہین کہ ایڈیٹر صاحب کانگریس کے نقش و نگار رسالہ ہی کے ذریعہ ظاہر ہوگئے۔

ایڈیٹر کانگریس کا یہ بیان کہ "اگر مولانا عبدالباری سے بعض کمزوریون کا اظہار ہوا ہو (بربنائے تصریح مراسلت) تو دنیا لکھنؤ کی دوسری پارٹی سے بھی کچھ بہت خوش عقیدہ نہین ہو جسکی روح رواں مسٹر خلیق الزمان، منشی احتشام علی، مولوی ظفر الملک ایڈیٹر الناظر اور مراد آباد کے مشہور اخبار نویس قاضی عبدالغفار اور شاید دہلی کے بعض نامور اصحاب بطریق پشت پناہ اِس پارٹی کی جان ہین"

ایک بہتان محض ہو۔ اگر ایڈیٹر صاحب کانگریس کو صحیح حالات کا علم نہین تو انھین حاجت بھی کیا تھی کہ اپنے دام پر اِس عنقا رزو ڈالین کہ جہان رسائی نہ ہو وہان پر بیجا ٹکرا کر دکھائین۔ اُن کے واسطے دہلی مین بیٹھکر لکھنؤ کی حالت سے بے خبر ہونا کچھ قابل اعتراض نہین ہوسکتا۔ مگر یقیناً ایک ذمہ دار اخبار نویس کے لیے یہ قطعاً نازیبا ہے کہ وہ بات کی تہ تک کے لیے مشق دروغ بافی کیا کرے۔

اڈیٹر کانگریس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جن چار اشخاص کو اُس نے مولوی عبدالباری صاحب کی مخالف پارٹی کی روح رواں قرار دیا ہے اُن میں خود باہم اس قدر شدید اختلاف خیال موجود ہے کہ وہ سب ایک پارٹی نہیں بن سکتے ماسوا اس کے خاکسار اڈیٹر الناظر تو قطعاً اس قسم کی فرقہ بندیوں سے بے تعلق ہے پھر اس پارٹی کے دیگر اراکین کو بھی اُس سے کم و بیش اسی قسم کی شکایتیں ہیں جن پر آج اڈیٹر صاحبان کانگریس و خطیب اپنا اپنا زور قلم صرف کر رہے ہیں -

غالباً اڈیٹر کانگریس نے یہ خیال کیا کہ منشی احتشام علی صاحب صدر مجلس استقبالیہ چونکہ خاکسار اڈیٹر الناظر کے بھائی ہیں اس لیئے دونوں ایک ہی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ وہ "خاندان کا کوڑی" پر ہرگز زبان طعن دراز نہ کرتا - مگر اُس کا گمان بالکل بے بنیاد ہے - بے شک منشی احتشام علی صاحب خاکسار کے بھائی اور بڑے بھائی ہیں - لیکن مذہب، سیاسیات، اصول معاشرت غرضکہ ہر اُس شے سے متعلق جہانتک ضمیر کے فیصلہ کا سوال در پیش ہوتا ہے ہم لوگ بالکل جُدا گانہ بلکہ بالاکثر باہمدگر بالکل مخالف روش اختیار کرتے ہیں - مسٹر خلیق الزمان اور قاضی عبدالغفار صاحب سے اس میں شبہ نہیں ہے کہ بہت سے معاملات میں خاکسار کو اتفاق رہا کرتا ہے لیکن خاکسار کا سابقہ طرز عمل اڈیٹر صاحب کانگریس کو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہونا چاہیئے کہ اڈیٹر الناظر کو اپنا ضمیر ان دوستوں کی خاطر سے زیادہ عزیز ہے - باقی اگر کوئی شخص یہ طے کرے کہ وہ اپنی سمتوں کو ہر شے پر مقدم رکھے گا تو اُس سے کوئی شکوہ و شکایت کا محل نہیں ہو سکتا - جھوٹ بولنا اور بہتان لگانا سب اُس کے لیئے جائز ہو جاتا ہے -

اڈیٹر صاحب خطیب کی نوحہ خوانی کا ماحصل یہ ہے کہ اڈیٹر الناظر باوجودیکہ خود ان کمالاتِ علمی و عملی صوری و معنوی سے بے بہرہ ہے جو دوسری بڑی ہستیوں میں پائے جاتے ہیں - لیکن وہ سب سے احتساب کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے - اور اسی سے وہ اڈیٹر الناظر کو ہماری قوم کے واحد محتسب کے طعن آمیز الفاظ سے یاد کرتا ہے - افسوس ہے کہ اڈیٹر کانگریس کی طرح مدیر خطیب بھی غصہ میں آ گیا - ورنہ اُس کا اعتراض اس قدر بے محل نہ ہوتا - اڈیٹر صاحب خطیب غور فرمائیں گے تو اُن کو یاد آ جائے گا کہ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں بلکہ بیسیوں دفعہ خود اُنھوں نے بھی یہ خدمت احتساب انجام دی ہے - کیا اُس وقت انھوں نے کبھی غور کیا تھا کہ جن لوگوں کے افعال پر وہ نکتہ چینی کر رہے ہیں خود ان کے مقابلے میں کتنے عظیم الشان کارہائے نمایاں کر چکے ہیں - نکتہ چینی یا انتقاد کے فرائض کے متعلق اڈیٹر صاحب خطیب ذرا تفکر و تدبر کریں تو اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ اڈیٹر الناظر سے ان کی یہ توقع کس قدر خلاف انصاف ہے کہ جن لوگوں پر اعتراض کرتا ہے اُن سے بہتر خدمات کا وثیقہ پیش کرے ع سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست -

اگرچہ اِس بات کی بہت ہی کم امید ہو کہ ہماری ناچیز صداے احتجاج مولانا فضل الحسن حسرت موہانی اور اون کی بیگم صاحبہ کی روش مین کوئی تغیر پیدا کرسکے گی تاہم ہمارا فرض ہو کہ ہم اُن کی بدعت پردہ شکنی پر اپنے دلی حزن و ملال کا اظہار الناظر کی وساطت سے کرین۔

دسمبر ۱۸ء مین جب کانگرس کا اجلاس دہلی مین منعقد ہو رہا تھا۔ اور ہمین ایک کرمفرا کی زبانی اس واقعہ کا علم ہوا کہ بیگم حسرت موہانی کانگرس کے پلیٹ فارم پر بے پردہ و نقاب تشریف فرما ہوئی تھین تو ہم نے اُسی روز مولانا کی خدمت مین باادب و اصرار تمام عرض کیا کہ وہ مسلمان نوجوانون کے واسطے ایک نہایت ہی بُری نظیر قایم کررہے ہین۔ اُس وقت اور اُس کے بعد علی گڈھ مین مولانا سے جو گفتگوئین ہوئین اُن کی بنا پر ہمین توقع تھی کہ آئندہ اس بارہ مین احتیاط برتی جائے گی لیکن اس دفعہ ایک قدم اور آگے رکھا گیا یعنی بیگم صاحبہ موصوفہ نے سوشل کانفرنس کے جلسہ مین رسم پردہ کی مخالفت مین ایک تقریر بھی فرمائی۔

مولانا حسرت اور اُن کی بیگم صاحبہ پردہ شکنی کو اس بنا پر جائز سمجھتے ہین کہ قرآن مجید مین ہاتھ اور چہرہ کو مستور رکھنے کا حکم نہین دیا گیا ہو۔ اور قرآن پاک مین جس پردہ کا حکم دیا گیا ہو اُس پر ہندوستان مین کوئی عمل درآمد نہین ہوتا۔ ہمارا منصب تو نہین کہ ہم قرآن پاک کے احکام کی کوئی تفسیر بیان کرسکین لیکن ہم یہ ضرور عرض کرنے کی جراءت کرینگے کہ مولانا اور اُن کی بیگم صاحبہ فریضۂ نماز کی ادائی مین جو ترتیب ملحوظ رکھتے ہین اس کا بھی تو کہین قرآن شریف مین ذکر نہین ہو۔ مسلمانون کے تمام فرقے حتیٰ کہ غیر مقلد بھی تک اِس بات کو تسلیم کرتے ہین کہ کلام الٰہی مین جن امور شرعیہ کے متعلق صریح احکام نہین موجود ہین اُن کے بارہ مین حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قدسی اور خود حضرت سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ اور اُن کے صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین علی الخصوص خلفاے راشدین رضی اللہ عنہما کا عمل حجت ہو چنانچہ پردہ کے متعلق فقہاے اسلام نے اپنے اجتہاد کی بنیاد انھین حجتون پر رکھی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور اُن کے بعد صحابہ رسول کی بی بیون سے لیکر اس وقت تک کے تمام اکابر دین کے گھرانون مین پردہ کا شدید اہتمام اس بات کی دلیل ہو کہ جو تفسیر بیگم صاحبہ نے سوشل کانفرنس مین بیان کی ہو وہ شرعاً قابل قبول نہین ہوسکتی۔

باقی رہا یہ امر کہ ہندوستان مین شرعی پردہ کا رواج نہین ہو تو اول تو سرے سے ہمین اسی مین شک ہو دوسرے اگر ساری دنیا کے مسلمان بھی کسی حکم شرعی کی خلاف ورزی کرنے کے گناہ مین مبتلا ہون تو اس کی وجہ سے نہ تو کوئی شرعی حکم بدل سکتا ہو اور نہ کسی مسلمان کے لیے زیبا ہو کہ اُسکے خلاف طرز عمل اختیار کرنے کو جائز قرار دے۔

جہان تک ہمین علم ہو اکثر متشرع لوگ اس وقت بھی پورے پورے شرعی پردہ کے پابند ہین لہٰذا اگر بیگم حسرت چاہین تو وہ بھی تھوڑی سی کوشش کے بعد شرعی پردہ پر عمل پیرا ہوسکتی ہین۔

پردہ مسلمانون کا ایسا قدیم شعار ہے کہ ہمارے دشمن ایک عرصہ سے مسلمانون کے زوال واقتدار کا سبب اسی کو قرار دیتے رہے ہیں لیکن مخالفین کے پے بہ پے حملون کے باوجود اس وقت تک نہ صرف علماے مذہب بلکہ عام طور پر انگریزی خوان شرفا تک اسکو ترک کرنے پر آمادہ نہین ہوے۔ جہلا کی ایک کثیر تعداد جہان طرح طرح کے شرک و بدعت مین مبتلا ہو پردہ کی برکتون سے بھی محروم رہی لیکن جہلا کا طرزِ عمل باوجودیکہ کثرت آراء انھین کی ہو۔ مولانا حسرت جیسے غیور مسلمان کے واسطے سند نہین ہوسکتا۔

پردہ کی عام منفعتون اور مضرتون سے قطع نظر کرکے ہم اس نقطۂ خیال پر مولانا کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہین کہ دنیا کے دوسرے معاملات کی طرح کسی دینی مسئلہ یا مذہبی شعار کے متعلق اجتہاد کرنے سے پہلے کیا مسلمانون کا یہ فرض نہین ہو کہ اپنے دینی مقتداؤن اور مذہبی پیشواؤن سے مشورہ کرلیا کرین بے شبہ علما کے درمیان خود اس وجہ عقائد کا اختلاف ہوگیا ہو کہ کسی ایک طبقہ کے علما کا فتویٰ تمام مسلمانون کے واسطے دلیل و سند نہین بن سکتا لیکن بہرحال کوئی نہ کوئی طبقۂ علما تو ضرور ایسا نکلے گا جسکے فقہی استنباط پر مولانا حسرت اور اُن کی بیگم صاحبہ کا اعتماد ہو۔ کاش! اسی جماعت کا فتویٰ حاصل کرلیا جاے تاکہ مذہبی معاملات مین اجتہاد کرنے کی ذمہ داری تو عاید نہو۔ اس لیئے کہ جو لوگ اس قسم کے اجتہاد کی اہلیت نہین رکھتے اُن کے لیئے یہ ایک معصیت کبیرہ قرار دی گئی ہو۔ ماسوا اسکے اگر مذہبی معاملات مین اجتہاد کا یہ طریقہ رواج پا جائے گا تو تھوڑے ہی دنون مین مغربی تمدن کے شیدائیون کے ہاتھون مسلمانون کے تمام شعائر ایک ایک کرکے رخصت ہو جائیں گے اور بجز چند علماے مذہب کے پھر شاید کوئی مسلمان ایسا نظر آئے گا جسکے دل مین شعائر مذہبی کا احترام باقی رہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مولانا حسرت کو بارگاہِ الٰہی سے عزم کا ثبات اور ارادہ کا استقلال عطا ہوا ہو اور یہی وجہ کہ سیاسی رہنماؤن مین ہم کسی مسلمان کو اُن کا ہمسر نہین جانتے لیکن اگر حکیم شیرازی کا یہ قول صحیح ہو کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن  کہ جاہا سپر باید انداختن

تو یقیناً یہ موقع عزم و استقلال کی نمائش کا نہین بلکہ سپر اندازی کا ہو۔

ہم مولانا حسرت سے بصد منت التجا کرتے ہین کہ وہ جماعت علما کے کسی محترم طبقہ سے اپنے اس طرزِ عمل کے جواز کا فتویٰ حاصل کرکے شایع کردین تاکہ اُن دیگر مسلمانون کے واسطے بھی پردہ شکنی کی راہ صاف ہو جائے۔

علماء کے فتوون پر عمل کرنے کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتے ہین۔ اور اگر جیسی کہ ہمین توقع ہے یہ ممکن نہین ہو تو پھر اُن کو چاہیئے کہ گذشتہ را صلوٰۃ و آیندہ را احتیاط پر عمل فرمائین۔ انھین اس بات کا ہرگز خیال نکرنا چاہیئے کہ وہ برادران وطن جو مولانا کے سیاسی مجاہدات کی بنا پر مسلمانون سے زیادہ اُن کی عظمت کرتے ہین اُن کے اس فعل کو کسی قسم کی کمزوری یا تلون مزاجی سے تعبیر کرینگے اس لیئے کہ مولانا اس حقیقت سے یقیناً نا آشنا نہین ہو سکتے کہ اپنے قول یا فعل کی غلطی کا اعتراف سب سے بڑا مجاہدۂ نفس اور برگزیدہ ترین صفت انسانی ہے۔ مہاتما گاندھی کی جو عظمت آج ہندوستان مین ہے اُسمین اس بات نے کوئی کمی نہین کی کہ ستیاگرہ کے متعلق اُنھون نے اپنے اندازہ کی غلطی کا علی الاعلان اعتراف کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بعض اصحاب اُن کے اس فعل کو حد درجہ کی کمزوری اور ناعاقبت بینی سے تعبیر کرتے ہین لیکن مخالفین تک اُن کی صداقت شعاری کے اس بیمثل کارنامہ پر تحسین و آفرین کہنے کو مجبور ہو گئے۔

مولانا حسرت اور مہاتما گاندھی مین اگرچہ طبعی رجحانات اور عقائد سیاسی دونون کے لحاظ سے بہت فرق ہے لیکن جور و ظلم کی افواج سے مقابلہ کرنے اور حق و صداقت کی قوت کے سامنے سر تسلیم جھکا دینے میں یقیناً دونون ہم مشرب ہین اور ہمین یقین ہے کہ ہم نے جو صورت اوپر تجویز کی ہے اُس پر اگر مولانا عمل فرمائین گے تو پھر اُن سے محل شکایت نہ رہے گا۔ آخر مین ہم مولانا کو یقین دلانا چاہتے ہین کہ اگر علماے کرام کا وہ طبقہ جو ہماری عقیدت و ارادت کا مرکز ہے مولانا کے اجتہاد کو برسر حق اور جائز قرار دیدے تو باوجود اسکے کہ ہم پردہ شکنی کے مخالف ہین سب سے پہلے ہم خود اس فتویٰ کی تعمیل پر آمادہ ہو جائین گے اور اگر ہمارا اندازہ غلط نہین ہے تو انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانون کی تعداد کثیر اس بارہ مین مولانا کا ساتھ دینے مین قطعاً دریغ نہین کرے گی۔

---

ہمین ایک دوست سے یہ معلوم کرکے بہت ہی رنج ہوا کہ آخر ستمبر مین ایک جلسہ مین ایک مقتدر قومی لیڈر جب کسی تجویز پر تقریر کرنے کے واسطے کھڑے ہوے تو اُن کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ تقریر نہ کر سکے اور بیٹھ گئے پھر دوبارہ ہمت کر کے اُٹھے مگر اب بھی زبان پر قابو نہ چلا۔ اور بالآخر وہ اپنی نشست پر گر گئے لوگون کو ابتداءً شبہ ہوا کہ کسی قسم کا عارضہ لاحق ہو گیا مگر معلوم ہوا کہ یہ سب ام الخبائث کی کرشمہ سازیان تھین۔ العظمۃ للہ۔

یہ واقعہ اس قدر الم آگین اور روح فرسا ہے کہ کسی تبصرہ کا محتاج نہین لیکن ہم ان مقتدر لیڈر صاحب کی خدمت مین یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہین کہ اُن مین ذرہ برابر بھی غیرت و حیا ہو گی تو وہ اب اس بداخلاقی سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو جائین گے اور اگر خدانخواستہ اُن کو اپنے نفس پر اتنا قابو نہو تو کم سے کم آئندہ کسی قومی مجلس کو تو وہ اپنے تمسخر

کی عزت سے سرفراز فرمائین

قانون ملکی نے بے شبہ شریعت اسلامیہ کے علی الرغم اس قسم کی بداخلاقیون کو ناقابل گرفت قرار دیا ہو لیکن مسلمانون کو زیبا نہین کہ اپنے ابتذال کی نمائش کے لیئے قانون ملکی کو سپر قرار دین۔

سنتے ہین کہ امرتسر کے انگریزی ڈپٹی کمشنر نے قومی مجالس کے زمانہ مین چندون کے لیئے شراب کی فروخت حکماً بند کردی تھی۔ خدا کرے کہ مسلمانون کے لیئے ہر زمانہ مین حکومت کی طرف سے شراب نوشی کو ممنوع قرار دیدیا جائے تاکہ جو مسلمان خوف خدا نہین رکھتے وہ قانونی تعزیر ہی کے اندیشہ سے اس معصیت سے بچ جائین۔

---

مسٹر محمد علی اور دیگر نظربندون کی رہائی ہرچند کہ نہایت درجہ مسرت کا سبب ہونا چاہیئے تھی اور ہم دیکھتے ہین کہ عام طور پر مسلمان اس موقع پر خوشی کا اظہار بھی کر رہے ہین لیکن جہانتک ہمارا تعلق ہو۔ موجودہ حالت مین ہم اپنے تئین خوش و خرم دیکھنے کے بجائے دلگرفتہ پاتے ہین۔ دلگرفتگی کا سبب تو یقینی نہین ہو کہ ہمارا تعلق ان معظم و محترم ہستیون کے ساتھ دیگر ابنائے ملت سے کم ہو۔ یا ہم بعض رہنمایان قومی کی طرح ان محبوب لیڈرون کی آزادی کو ذاتی اثر و اقتدار کے منافی جانتے ہین۔

ہان یہ ضرور ہے کہ "رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت" کا خیال رہ رہ کر دل مین چٹکیان لیتا اور ہمین بیتاب کردیتا ہی۔ اسکے علاوہ یہ بھی اندیشہ ستاتا ہی کہ ان نظربندون مین سے جو مخلص اور صاحبان عزم ہین وہ ترکی حکومت کے تقسیم و تجزیہ یا اقتدار خلافت کے زوال کو گوارا نہین کر سکتے اور شاید اپنی ناگواری کو چھپا نہ سکنے بلکہ اسکے برملا اظہار پر اصرار کرنیکی پاداش مین اب کی آزادی کے بجائے انھین اپنے سرون سے سبکدوش ہونا پڑیگا۔ ہرچند کہ موت کا ایک وقت معین ہو اور اس لیے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی یا کسی دوست کی زندگی کے خاتمہ پر صبر اختیار کرے لیکن موت آنے سے پیشتر موت کا تخیل یقیناً خالی از درد نہین ہوتا۔

جو لوگ مسٹر محمد علی اور دیگر نظربندون کو اپنے اپنے شہرون مین دعوت دیکر بلا رہے ہین اور اُنکے اعزاز مین مسرت کے مظاہرے اور جلسے کر رہے ہین شاید اُنکے دل اس قسم کے وسوسون اور اندیشون سے قطعاً پاک ہین یا وہ اس گمان مین ہین کہ وزراے برطانیہ کے نظام عمل مین کوئی مناسب تبدیلی واقع ہوگئی ہو جسکی بنا پر صلح کانفرنس کے تصفیہ کی طرف سے وہ مطمئن ہین۔

ہم اگرچہ اپنے دینی بھائیون کی مسرت اندوزیون مین خواہ کتنی ہی عارضی کیون نہو حارج ہونا پسند نہین کرتے لیکن یہ ضرور گوش گذار کرنا چاہتے ہین کہ جب تک ترکی کی حکومت کے متعلق صلح کانفرنس کا آخری فیصلہ شائع نہو اُس وقت تک انکو چاہیئے کہ اپنے دینیہ جوش اور توقعات کو محفوظ رکھین وما علینا الا البلاغ

**تاریخ تمدن** - ہنری طامس بکل کی لاجواب کتاب ہسٹری آف سولیزیشن کا ترجمہ۔ فلسفہ تاریخ کی یہ بہترین کتاب ہے جسمین تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیئے گئے ہیں جس طرح طبیعات وغیرہ علوم کے اصول مدون ہوے ہین۔ دو جلد۔ قیمت عا

**تاریخ اخلاق یورپ** - انگلستان کے مشہور و معروف علمبردار عقلیت اڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی لاجواب کتاب کا ترجمہ۔ جسمین یونان و رومہ اور دیگر قدیم اقوام کے مذاہب فلسفہ اور اُن کے اخلاقی ثمرات کی تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہی۔ جلد اول ے ر جلد دوم عا ر

**مشاہیر یونان و رومہ** - حکیم پلوٹارک یونانی کی لاجواب کتاب پیرلل لوز کا ترجمہ۔ جسمین یونان و رومہ کے اولالعزم مدبرین اور نامور شہنشاہوں کے سوانحی حالات اور اُن کے بیش بہا خیالات درج کرکے ازراہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا تقابل کیا گیا ہی۔ انگریزی مترجم کو اس کتاب کے ترجمہ کے صلے مین "نائٹ" کا لقب دیا گیا جس سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیئے۔ مغرب کو تعر ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہنچانے مین اس لاجواب کتاب کا بہت بڑا حصہ ہی۔ حب وطن ایثار کامل بے نفسی و جان نثاری اور اولوالعزمی کی زندہ اور سچی تصویرین ان اوراق مین نظر آئینگی۔ قیمت جلد اول عا ر جلد دوم عا ر

**تاریخ یونان قدیم** - اردو زبان مین یونان کی سب سے پہلی جامع و مانع تاریخ قیمت عیصر

**رہنمایان ہند** - ہندوؤن کا اصلی مذہب کیا ہی؟ اور اس مین کیا کیا تبدیلیان ہوئی ہین؟ کرشن جی سدارتھ گوتم بدھ کی تعلیمات شنکراچارج راماننج، راماننداگورو نانک اور کبیر کی تلقینات اور بابا جی سورداس تلسی داس اور جے دیو کے حالات۔ قیمت عہ ر

**امرائے ہنود** - عہد مغلیہ کے ہندو امرا و وزرا اکابر و مشاہیر عہدہ داران و امرا کے حالات قیمت عا ر

**نپولین اعظم** - اس نامور فاتح اور شہنشاہ کی مکمل سوانحعمری پانچ جلدون مین قیمت عللعہ ر

**مسلمانان اندلس** - اسٹینلے لین پول کی مشہور تاریخ کا اردو ترجمہ قیمت عہ ر

**البیرونی** - علامہ ابوریحان بیرونی مصنف کتاب الہند کی سوانحعمری اور اُن کی تصانیف پر تبصرہ۔ قیمت عیصر

**شباب لکھنؤ** - عہد نصیرالدین حیدر بادشاہ مین لکھنؤ کی درباری حالت قیمت عہ ر

**فتح قسطنطنیہ** - یعنی اسلام کی ایک جلیل القدر اور مہتم بالشان فتح کی تاریخ مؤلفہ حاجی بدرالدین احمد بی اے قیمت عیصر

**محاربات طرابلس** - از شیخ محمد شوکت علی بی اے۔ یعنی مسٹر ای این بینٹ نامہ نگار اخبار مانچسٹر گارڈین سابق ممبر پارلیمنٹ کی لاجواب کتاب ود دی ٹرکس ان ٹریپولی کا ترجمہ جسمین جنگ طرابلس کے چشمدید حالات ترکی افواج کی کیفیت خطہ اسلامیہ طرابلس کے

جغرافیائی، ملکی، قومی، اور معاشرتی حالات اور بیانہ و مورخانہ شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہین۔ اور اسی وجہ سے کتاب جنگ کے بعد بھی ایک مستقل تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پڑھی جانیکے لائق ہی حجم ۵۰۲ صفحے معہ ہم تشریحی نقشون کے قیمت عیصر

**علوم طبیعہ کی تاریخ** - علوم طبیعہ کی ان تمام دریافتون اور ایجادون کی تشریح جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لیکر انیسوین صدی تک وقتاً فوقتاً عمل مین آتی رہی ہین۔ مسائل کی تحقیقات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہی کہ قدیم و جدید حکما نے ان علمی دریافتون اور ایجادون مین کیا کیا حصہ لیا۔ مضامین کی وضاحت کے لیے صدہا تصویرین دی گئی ہین قیمت ہر دو جلد عیصر

**تاریخ مذہب** - اس مین مذہب کی ابتدا و ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذاہب مثلاً بابلی اور اسوریہ مصر اور چین اور دیگر ممالک و اقوام کے مذہب کی مختصر تاریخ درج ہی۔ قیمت ۸ ر

**تاریخ مصر** - مصریون کے قدیم رسم و رواج طرز معاشرت عادات وغیرہ کے مفصل حالات قیمت ۸ ر

**ہندوستان کی قدیم تہذیب** - یعنی سر رومیش چندر دت آنجہانی کی لاجواب کتاب کا اردو ترجمہ جسکی یہ تعریف کافی ہی کہ الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے کورس مین داخل کر لی گئی۔ قابل مترجم منشی ولایت احمد مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ لائق دید ہی قیمت عا

**حالات گوکھلے** - آنریبل مسٹر گوکھلے کی جو عظمت اہل ہند کے دلون مین ہی اسکے لحاظ سے یہ افسوس کے قابل بات تھی کہ انکی کوئی سوانحعمری اردو زبان مین نہ تھی۔ مسٹر مظہر حسین خان بی اے نے یہ کمی پوری کر دی ہی قیمت ۸ ر

**ایوین اور مصنفین اردو کی مکمل تصانیف کی فہرست منگا بھیجیے**

**کلیات نعت** ۔ حضرت محسن کاکوروی کا نعتیہ دیوان قیمت عـہ

**المیزان** ۔ مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر پر محققانہ تبصرہ جسمین مرزا دبیر کی شاعری سے تفصیلی بحث کی ہے اور اُن کے محاسن شاعری اور فصاحت و بلاغت کا مشرح تذکرہ کیا ہے کتاب کی خوبی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ خود مولانا شبلی مرحوم نے مصنف کی بے تعصبی و قابلیت کا اعتراف کیا ہے قیمت سے ر

**قومی مثنوی** ازجناب حاجی مولوی احمد علی صاحب رئیس بہار شریف ۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی مسدس نظم ہے جسمین مسلمانون کی حالت بیان کرکے اُن کے نقائص دور کرنے کی مناسب تدبیرین بیان کی گئی ہین ۔ اور مصنف علام نے اپنے کمال شاعری سے اصلاح قوم کا کام نہایت خوبی سے لیا ہے ۔ قیمت ۱۲ ر

**مجموعۂ کلام شبلی** مولانا شبلی کا اردو دیوان قیمت ۱۲ ر

**شرح دیوان غالب** ۔ از مولانا نظم سید حیدر طباطبائی نظم لکھنوی قیمت عـٰہ

**صبح امید** ۔ مولانا شبلی نعمانی کی قابل دید مثنوی قیمت ۴ر

**مثنوی العید و بیم** ۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی لاجواب نظم قیمت ۴ر

**واقعات کربلا** ۔ میر انیس مرحوم کے بہترین مرثیون کے منتخب بندون سے مسلسل داستان تیار کی ہے اردو مین رزمیہ نظم کا بہترین نمونہ ہے عـہ

**خیابان تجلی** انتضا علی تجلی کاکوروی کی نظمین ۴ر

**کنولا** ۔ نواب احمد شفیع خان فیروز آبادی کا ناول ۲ جلد قیمت عـٰہ

**تسخیر فرانس** ۔ شکسپیر کے لاجواب ڈرامے ہنری دی ففتھ کا ترجمہ قیمت ۸/

**زود پشیمان** ۔ مسٹر عبدالماجد بی اے کا قابل دید ڈراما قیمت ۸/

**محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش** مسٹر مُسلم کا دلچسپ فسانہ قیمت ۳ر

**بیان خسرو** ۔ حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری مصنفہ مولوی شبلی نعمانی قیمت ۱۰ر

**دیوان حالی** ۔ مولانا حالی کا دیوان ۲۵ سال بعد دوبارہ چھاپا گیا ہے ۔ فوراً منگا لیجیے قیمت عـٰہ و عـہ

جب کوئی
اُردو کی کتاب خریدنا ہو تو
**مصنفین اُردو**
کا ایک نسخہ منگا کر ہماری فہرست
ضرور ملاحظہ کر لیجیے

**عورتون کی انشا** بیگم صاحبہ مسٹر صفدر علی کی یہ لاجواب انشا شریف خواتین کے لیے ادب اردو کی بہترین سبق آموز ہے جسے پنجاب کی حامی اُردو گورنمنٹ بک کمیٹی نے تمام ملک کی کتب خانون کے لیے پسند و منتخب کیا ہے کوئی شریف گھرانا اس کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیے عـہ

**شوکت آرا بیگم** ۔ ایک دانشمند خاتون کی قابل دید تصنیف جسمین افسانہ کے دلکش پیرایہ مین خواتین کو تعلیم حاصل کرنے اور جدید معاشرتی اصول کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے حجم ۲۷۵ صفحے قیمت عـٰہ

**سعیدہ کے خطوط** ۔ ایک لڑکی کی کہانی خود اس کی زبانی ۔ جذبات حسن و عشق اور مقتضیات فطرت انسانی کا ایک جدید اسلوب بیان عـہ

**ازواج النبی صلعم** حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی سوانح عمریان ۔ ۱۲ر

**ازواج الانبیا** ۔ حضور سرور کائنات کے سوا دیگر انبیا علیہم الصلوۃ والسلام کی بی بیون کا مفصل تذکرہ قیمت عـہ

**مولانا شبلی کے مضامین**

| | |
|---|---|
| زیب النسا بیگم | ۱/ |
| جہانگیر | ۲/ |
| اسلامی حکومت | ۲/ |
| کتبخانہ اسکندریہ | ۸/ |
| مسلمانون کی گذشتہ تعلیم | ۱۰/ |
| اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر | ۱۲/ |
| آغاز اسلام | ۸/ |
| اسلامی مدارس | ۲/ |

**مولانا حالی کی نظمین**

| | |
|---|---|
| شکوہ ہند | ۲/ |
| بیوہ کی مناجات | ۲/ |
| عرض حال | ۱/ |
| بچھوا اور ایکی کا مناظرہ | ۱/ |
| مناظرہ رحم و انصاف | ۱/ |
| مناظرہ تعصب و انصاف | ۱/ |
| حب وطن | ۱/ |
| مسدس ننگ خدمت | ۱/ |

**ڈاکٹر اقبال کی نظمین**

| | |
|---|---|
| شکوہ | ۲/ |
| جواب شکوہ | ۳/ |
| فریادامت | ۳/ |
| بلال | ۱/ |
| نالۂ یتیم | ۲/ |
| شمع و شاعر | ۲/ |
| مکمل ترانہ | ۲/ |
| اکبری اقبال | ۳/ |

رجسٹرڈ نمبر ا ۷ ۸ ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

[illegible] [illegible]

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۲۸ | ماہ فروری سنہ ۱۹۲۰ء | جلد ۲۲

## فہرست مضامین




قیمت فی پرچہ ۵

الناظر پریس لکھنؤ مین چھپا

قیمت [illegible]

پرنٹر و پبلشر: اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

جنوری نمبر میں یہ امید ظاہر کیا گیا تھا کہ انشا اللہ آئندہ سے الناظر وسط ماہ میں شائع ہوا کرے گا مگر اس دفعہ ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جسکی وجہ سے الناظر کا یہ پرچہ بھی بتاخیر شائع ہو رہا ہے اور آئندہ کے متعلق بھی ہنوز اطمینان نہیں۔

شہر کے کاتبوں نے متحد ہو کر حلف لے لیا ہے کہ جو شرح اجرت ان کی انجمن نے طے کر دی ہے اُس سے کم پر کام نہیں کرینگے۔ حالانکہ یورپ امریکہ میں جہاں مزدور پیشہ جماعت زیادہ منظم حالت میں ہے اور اس نے بہت کچھ قوت حاصل کر لی ہے کہ معاملات حکومت میں روز بروز اس کا دخل بڑھتا جاتا ہے جب کبھی اس قسم کا کوئی تصفیہ ہوتا ہے تو بالآخر سرمایہ داروں اور اس جماعت کے درمیان کسی نہ کسی نہج سے سمجھوتہ ہو جاتا ہے مگر حلف کے بعد پھر سمجھوتے کا کیا ذکر ایڈیٹر الناظر اپنے عقائد و اصول کی بنا پر ہر قسم کے کاریگروں اور مزدوروں کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتا ہے اور اس وجہ سے کاتبوں کے مطالبات کو بڑی خوشی سے منظور کر لیتا۔ بلکہ اپنے انہیں اصولوں کی بنا پر اپنے کارخانہ کے تمام کارکنوں کو ہمیشہ دوسروں سے زیادہ اجرت دینے اور اُن کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور اُسکا منتہائے نظر یہ ہے کہ اگر جملہ کارکن رضامند ہو جائیں تو وہ ان سب کو اس کاروبار کے نفع میں شریک بنانے اور اس طرح اشتراکیت کے اعلیٰ ترین مقصد کی انتہائی منزل تک پہنچ جائے۔ لیکن کاتب صاحبان کی موجودہ روش اشتراک کے بجائے استبداد کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے اسلئے جس طرح عمال حکومت اور رہنمایان قوم کے جبر و تعدی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اُسکے فرائض میں داخل ہے مجبوراً اس قوت کے سامنے سر جھکانے سے بھی اُسے انکار ہے چنانچہ کئی ہفتوں سے اُسکی یہ کوشش ہے کہ جملہ مالکان مطابع اور دیگر وہ اصحاب جنہیں کاتبوں سے سروکار ہے اس نئے خطرہ کا مقابلہ کرنے میں اسکا ساتھ دیں۔ اگر اس مقصد میں کامیابی ہو گئی جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے تو غالباً جلد تصفیہ کی کوئی صورت نکل آئے گی اور اگر خدا نخواستہ ہماری ان کوششوں میں ناکامی ہوئی تو اپنے اصولوں کے لحاظ سے فرض ہوگا کہ خاکسار کم سے کم اپنے تئیں تو اس غلامی میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھے۔ اس لئے جب تک کہ یہ کشمکش ختم نہ ہو جائے الناظر (حقیقت جسکا انتظام بھی خاکسار کے تحت میں ہے) اگر وقت سے نہ شائع ہو سکے تو ناظرین کرام ہماری معذوریوں پر نظر رکھکر معاف فرمائیں۔

خاکسار ظفر الملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۲ جلد ۲۲ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۰ع

## ماہ گذشتہ

جنوری کا مہینہ اور خصوصاً اُسکی پہلی تاریخ ان اصحاب کے لیئے ایک خاص کشش اور اہمیت رکھتی ہے جنھون نے سال سابق مین عمال حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی مستعدی اور فرمان برداری کے اظہار کا کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا تھا۔ وہ مہینون بلکہ شاید برسون سے صاحب لوگون کی رضاجوئی کی دُھن مین اپنی تمام دینی و دنیاوی مصالح کو بھولے ہوے تھے۔ مہینہ کے تیس یا سال کے تین سو پینسٹھ دنون مین سے ایک دن بھی انھون نے ایسا مشکل گذرنے دیا ہوگا کہ اپنے ارضی یا یون کہیئے کہ عارضی خداوندون کی پرستش سے ذرہ برابر بھی غفلت یا کوتاہی برتی ہو۔ اپنے آقایان ولی نعمت کے خاطر اپنی نہین کا اپنی راحت و آرام اور اپنے مال و عزت کے ایثار مین انھون نے کبھی دریغ نہین کیا۔ بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور جب کبھی انھین موقع ملا۔ اپنے ملک اور اپنی قوم کے اغراض و فوائد کو پامال کرنے سے بھی نہین ہچکے۔ اور یہ سب کیون؟ محض اس لیے کہ جب دربار انگلستان مین نوروز منایا جائے تو اُنکی وفادارانہ خدمات اور غلامانہ اطاعات کے صلہ مین کوئی خطاب ان کو بھی عطا ہو۔ جنوری کی پہلی تاریخ کو اگرچہ عام طور پر اخبارات کے دفاتر مین تعطیل رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی خطاب زدہ طبقہ کے اکثر افراد کو اُس روز اگر آپ تلاش کرین تو ضرور کسی نہ کسی اخبار کے دفتر کا چکر لگاتے ہوے پائین گے۔ اگر اخبارات کے دفتر سے اُن کو کوئی مفید

مطلب خبر نہین ملتی تو پھر وہ ایڈیٹران اخبارات کے بنگلون کی طرف دوڑتے نظر آئین گے، جہان گورنمنٹ گزٹ آیا کرتے ہین۔ حالانکہ وہ جانتے ہین کہ اس روز ڈاک خانہ مین بھی تعطیل ہوتی ہے مگر ان کا قلبی اضطراب اور اُن کے امیدون کا التہاب ایک لمحہ کے لیئے انھین چین نہین لینے دیتا۔ تار گھر، ڈاک خانہ، ٹاؤن ہال۔ صاحب ضلع کی کوٹھی، اخبارون کے دفاتر، عام کتب خانے۔ غرضکہ اس ایام سعید مین اس طبقہ پر ان مین سے ہر ایک کی زیارت کرنا واجب ہوتا ہے مگر [illegible] کے سوا امیدوارون کی تعداد کثیر کو حصول مدعا مین کامیابی نہین ہوتی اور "امیدوار بودہ باشند" کی صدائین گرد و پیش کے خاموش مگر متبسم در و دیوار سے نکل کر کانون کی راہ اُن کے دل و دماغ پر تسلط حاصل کر لیتی ہین۔ لیکن آفرین ہے اُن کے عزم و استقلال پر کہ مایوس ہو کر اپنی مساعی جمیلہ سے دست کش نہین ہو جاتے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ تن دہی اور جانفشانی کے ساتھ متاع ضمیر و جنس ایمان لیکر بازار عمل مین مصروف سوداے وفا ہو جاتے ہین۔

جنوری آیا اور گذر گیا۔ اور باوجودیکہ قدرے تشنگان خطاب کو سیراب کر گیا۔ پھر بھی حرمان نصیب مخلوق کی تعداد بیشمار رہی اور ہم نہین جانتے کہ ہم دوسرے چند بامرادون کی مسرت و عشرت مین شریک ہو کر ان کی خدمت مین نذر تہنیت و مبارکباد پیش کرین۔ یا اقلیت کو نشۂ کامرانی مین مست چھوڑ کر اکثریت کی بزم عزا مین شریک ہون اور اُن کی بدبختی پر آنسو بہائین۔

(۵)

خلافت کانفرنس امرتسر کی تجویز کے مطابق ایک وفد سر برآوردہ مسلمانان اور ہندو لیڈرون کا بسرکردگی مسٹر شوکت علی بی اے ہز ایکسلنسی لارڈ چیمسفورڈ کے پاس اس غرض سے حاضر ہوا کہ اہل ہند کو عموماً اور مسلمانون کو خصوصاً صلح کانفرنس مین ٹرکی حکومت کے معاملات کا قابل اطمینان تصفیہ نہ ہونے کے باعث جو اضطراب پہنچ رہا ہے اُس کا پوری طرح اظہار کیا جائے۔ اور حکومت ہند کو بتایا جائے کہ حکومت ٹرکی کے تجزیہ اور اقتدار خلافت کو کمزور کرنے کی جو کوششین اراکین صلح کانفرنس اور علی الخصوص مدبران برطانیہ کی طرف سے عمل مین آ رہی ہین اگر آخری تصفیہ بھی انھین کی بنیاد پر ہوا تو نہ صرف یہ کہ جن اصول عدل و انصاف پر مسٹر لائڈ جارج اور پریسیڈنٹ ولسن دنیا کے امن و امان کی پائدار بنیادین قائم کرنے کے خواب دیکھتے رہتے ہین وہ حرف غلط بن جائین گے بلکہ ان کارروائیون کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے چالیس پچاس کروڑ مسلمانون کے دل غم و غصہ سے معمور ہو جائین گے اور اُن کا مذہبی فرض ہوگا کہ اس تصفیہ کو بدلنے کے لیئے انتہائی

جلد جلد کرین جسکے باعث قوی اندیشہ ہو کہ دنیا کے کل حصون مین جہان مسلمانون کی کوئی معقول تعداد آباد ہو سخت بے امنی پیدا ہو جائےگی۔ برطانیہ عظمی کے زیر اقتدار چونکہ اسکی مسیحی رعایا سے زیادہ مسلمانون اور ہندوؤن کی آبادی ہو اس لیے اس ڈیپوٹیشن نے اپنی عرضداشت مین یہ بھی لکھا تھا کہ وزراے برطانیہ کو اہل ہند کے نمایندہ کی حیثیت سے اس مسئلہ کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا کر ہمارے مطالبات کو تسلیم کرانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

ایک فرقہ کی نگاہون مین اس ڈیپوٹیشن کا جانا بالکل بے سود تھا۔ اور لارڈ چیمسفورڈ کے مایوس کن جواب نے غالباً اسکی گنجایش باقی نہین رکھی کہ اس خیال کے لوگون کی اصابت راے مین شک کیا جائے۔ کیونکہ لارڈ چیمسفورڈ نے جہان زبانی ہمدردی کے اظہار مین کافی فیاضی سے کام لیا وہین اپنے (مدبرین برطانیہ کے) دل کا حال بھی کہہ دینے مین دریغ نہین کیا یعنی یہ کہ ترکی حکومت کو چونکہ لڑائی مین شکست ہوگئی ہو اس وجہ سے کوئی سبب نہین کہ وہ اسکا خمیازہ نہ بھگتے یا یون سمجھیے کہ حکومت ترکی کے مقبوضات پر انگلستان و فرانس وغیرہ کو جو تسلط حاصل ہوگیا ہو اُسے برقرار رہنا چاہیے۔

جو لوگ اس مشورے کو ہمیشہ غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہین کہ "جسکی لاٹھی اسکی بھینس" اور دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہین کہ چھوٹی چھوٹی اقوام کی آزادی کے خاطر یہ جنگ لڑی گئی تھی، ان کو شاید یہ بتانے کی ضرورت نہین کہ یہ دنیا محض اندھون اور لایعقل لوگون سے آباد نہین ہو جو ہر مرتبہ لفظون کے پھیر اور دلیلون کے پیچ مین پڑکر دھوکہ کھاتے رہین۔ اگر یورپ اور اتحادی "قوت" ہی کو تمام دنیاوی قضیون کا فیصلہ کن سمجھتے ہین تو انھین اس امکان کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ دنیا مین دوسری قومین اور خصوصاً وہ جنکی آبادی انسانی ہستیون کے ایک خمس سے کم نہین "قوت" سے اگر آج محروم ہین تو ہمیشہ اسی محرومی کی حالت مین نہین رہ سکتین۔

لارڈ چیمسفورڈ کے جواب خشک و تلخ کے بعد ارکان ڈیپوٹیشن کی طرف سے جو اعلان شائع کرایا گیا ہو اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے کہ کم سے کم ایک دفعہ تو مسلمانون نے پوری آزادی اور صفائی کے ساتھ حکومت کو اپنے حقیقی جذبات سے واقف کر دیا۔ ہم نے دہلی کی خلافت کانفرنس مین چاہا تھا کہ ایک رزولیوشن مین یہ ظاہر کر دیا جائے کہ اگر برطانوی مدبرین اپنی مذہبی عصبیت کے باعث اسلامی جذبات کو ٹھکرا دینگے تو پھر اسکے بعد مسلمانون سے اسکی توقع رکھنا فضول ہوگا کہ ان کی وفاداری بھی علی حالہ قائم رہے گی۔

وہ اگر اسکے بعد بھی حکومت سے وفادار ہیں تو اُسکے یہ معنی ہیں کہ وہ اسلام کی توہین اور اقتدار خلافت کی بربادی کو بخوشی گوارا کرتے ہیں۔ مگر سبجکٹ کمیٹی کے ممبر نہونے کے باعث ہم اسپر زور نہ دے سکے۔

ہمیں معلوم ہو کہ جن علمانے دوران جنگ میں ترکون کے خلاف مسلمانان ہند کو لڑنے سے باز نہیں رکھا۔ اُن میں سے اکثر اب اپنی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور اُن کا خیال ہو کہ جو معصیت کبیرہ ہمارے بھائیون سے محض پیٹ کی خاطر یا دوسرے اثرات کے تحت سرزد ہوئی ہو اُسکی تلافی اگر کچھ ہو سکتی ہو تو اسی قدر کہ بقا وتحفظ اقتدار اسلام کے خاطر خود اپنے تئین فنا کر دین۔

مسٹر محمد علی نے سال گذشتہ جو خط لارڈ چیمسفورڈ کے نام لکھا تھا۔ اس مین سُنا ہی کہ بڑی وضاحت کے ساتھ اسلامی احکام کے رو سے مسلمانان ہند پر جو ذمہ داریان عائد ہوتی ہین اُن کو بیان کر دیا تھا اسکے بعد ہز ایکسلنسی نے جو جواب دیا اسکا نتیجہ سوا اسکے کیا ہو سکتا ہو کہ مسلمانون مین حکومت برطانیہ کی طرف سے کمال بے اعتمادی پیدا ہو جائے۔ اور وہ سمجھ لین کہ جسطرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن صرف اپنے مطلب کو پیش نظر رکھتے تھے موجودہ حکومت برطانیہ بھی صرف اُن عیسائی باشندون کے مفاد سے غرض رکھتی ہو جن کی رنگت گوری ہو۔ کالی قومین محض اس امر کی تصدیق کے لیئے برطانوی شہریت کے حقوق سے سرفراز کی جاتی ہین کہ

چو احمق در جہان باقی ست کس مفلس نمی ماند

مگر جائے حیرت ہو کہ خود برطانیہ کے کثیر التعداد مدبرین اور تقریباً وہ تمام انگریز جنھین ہندوستان مین کسی معقول مدت تک رہنے کا اتفاق ہو چکا ہو۔ وزرائے انگلستان کو اپنی پے بہ پے عرضداشتون مین یہ جتا چکے ہین کہ ترکی حکومت کے تجزیہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھر کے مسلمان عموماً اور ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان خصوصاً برطانوی حکومت سے بددل و بیزار ہو جائین گے، لیکن وزیر اعظم اور موجودہ وزارت کے اکثر کنسرویٹو اراکین پر مذہبی عصبیت کا ایسا بھوت سوار ہو کہ وہ اسلام کی عظمت پر ایک ضرب شدید لگائے بغیر نہین رہنا چاہتے۔

ہمین اسلام کے مستقبل کی طرف سے قطعاً مایوسی نہین ہو۔ اس لیئے ہم وزرائے انگلستان کی اس روش سے خائف نہون گے۔ بلکہ اب روز بروز یہ خیال دل مین جاگزین ہوتا جاتا ہو کہ انگلستان کا اقبال و عروج منتہائے کمال کو پہونچ چکا ہو اور جسطرح ترقی کے تمام مدارج طے ہو جانے کے بعد قانون فطرت یہ ہو

کہ دورِ تنزل و انحطاط شروع ہو جائے۔ انگلستان میں بھی رجعت شروع ہو گئی ہے

غالباً ۱۸۵۸ء میں کسی انگریز تاجر کی ایک طنز آمیز تحریر میں یہ فقرہ میری نظر سے گذرا تھا کہ جب حکومت روما اپنے منتہائے عروج پر تھی اور اُسکے دارالسلطنت میں دنیا بھر کے باج گذاروں اور ملکوں ملکوں کی دولت کا اجتماع تھا تو کسی رومی کو خواب میں بھی یہ خیال نہ گذرتا ہوگا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب انگلستان (جسکے لیئے کبھی روما کی غلامی موجب افتخار تھی) کا ایک فرد (یعنی ایڈورڈ گبن) حکومت روما کے انحطاط و زوال کی تاریخ کئی مجلدات میں لکھے گا۔ اور اُس نے ساتھ ہی ساتھ یہ ڈینگ بھی ہانکی تھی کہ برطانوی حکومت ایسی پائدار اور مستقل بنیادوں پر قائم ہوا اور اسکی وسعت و ترقی کے لیئے ابھی دنیا کے اتنے عظیم الشان ممالک باقی ہیں کہ اُسکے مستقبل کی طرف سے قطعاً بے فکر رہنا چاہیئے ہمارا ماتھا اُسی وقت ٹھنکا تھا کہ برطانوی عظمت کے لیے اب خیر نہیں۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ خود اسکے مدبرین اور وزرا آج کلھاڑیاں لیئے ہوئے اپنی عظمت و اقتدار کے درخت کو کاٹ رہے ہیں۔

—•×•—

مسٹر محمد علی قید فرنگ سے نجات ملنے کے دن سے انگلستان جاتے وقت تک شہر بشہر پھرنے اور مختلف جلسوں اور جلوسوں کی شرکت کرنے میں مصروف رہے اور اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ لوگوں نے اپنی محبت و ارادت کے اظہار میں افراط و تفریط سے کام لیکر نہ صرف اپنے وقت، جوش اور روپیہ کو رائگان کیا بلکہ ان کی موجودگی سے جو فوائد حاصل کرنیکا موقع تھا اُسے بھی تلف ہو جانے دیا۔ مثلاً لکھنؤ میں تمام وقت جلوس اور دیگر رسمیات کی نذر ہو گئیں اور جب شام کو مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی نے ایک مشترکہ جلسۂ عام کے سامنے مسئلہ خلافت اور خلافت ڈیپوٹیشن کے متعلق تقریریں کیں اور فراہمی سرمایہ کی تحریک پیش ہوئی تو حصول مدعا میں کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ ہمارے مخالفین حق بجانب ہوں گے۔ اگر وہ یہ نتیجہ نکالیں کہ اہل لکھنؤ کے سامنے جب روپیہ کا سوال پیش ہوا تو اُن کی خاموشی نے

گرجان طلبی مضائقہ نیست　　　گر زر طلبی سخن درین ست

کا منظر رونما کیا۔ حالانکہ یہ سب محض ہماری تماشہ پسندی اور رسم پرستی کے کرشمے تھے جدید تعلیم یافتہ گروہ اگر اہل یورپ کی تقلید میں نئے نئے سوانگ تیار کرتا رہتا ہے تو علمائے فرنگی محل بھی رسمیات کی گرفت سے آزاد نہیں۔ ہمارے مسٹر خلیق الزمان ناراض ہیں کہ علمائے فرنگی محل نے ان مہمانان محترم

سر پر مولانا کی دستار فضیلت باندھنے اور اپنے مدرسہ کے طلبا کا ایڈریس سُنانے مین نہایت قیمتی وقت ضایع کرلویا۔ بیشک یہ وقت اُن نمائشی ظاہرداریون کا نہین۔ لیکن ہمارے دوست معاف کرین اگر ہم خود ان کے انتظام جلوس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرین اس لیئے کہ وقت اور روپون کا اُسکی بدولت بھی کچھ کم اسراف نہین ہوا۔

مسٹر محمد علی نے رفاہ عام مین جو تقریر کی تھی ہم سمجھتے ہین کہ مسلمانون کے دلی جذبات کی اس مین پوری ترجمانی کیگئی۔ یہ بالکل جُداگانہ بات ہے کہ بوجہ ایک محکوم قوم ہونیکے مدبرین و وزرائے برطانیہ مسلمانون کے جذبات کو قابل لحاظ نہ سمجھتے ہون اور اس بنا پر جو اصحاب ان حقیقی حالات کو اُن کے سامنے بیان کرین اُن کی باتون پر وہ کافی لحاظ نکرین۔ لیکن وہ لوگ جو اس بات کا یقین رکھتے ہین کہ جب دلون پر حکومت نہین رہتی تو رفتہ رفتہ اس حکومت کا ظاہری اقتدار بھی جاتا رہتا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہین کہ مسٹر محمد علی جس مشن پر انگلستان گئے ہین اُسکی کامیابی یا ناکامی کے کیا نتائج ہونے والے ہین۔

ہمارے علم مین گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر یعنی جس وقت سے کہ ہندوستان مین انگریزی اقتدار قائم ہوا آجتک [illegible] ایک سے کوئی وفد ایسا نہین گیا جس کا مقصد اس قدر اہم ہو اور جسکی عدم برآری کے ساتھ ایسے عظیم الشان نتائج وابستہ ہون۔ مسٹر محمد علی ہین تو بظاہر ایک ایسی قوم کے فرد جس سے زیادہ بیکس شاید یہود کو چھوڑکر اسوقت دنیا مین کوئی طبقہ نہین لیکن قضا وقدر کی یہ ایک عجیب نیرنگی ہے کہ نصرت مسلمانان عالم کی دلی خواہشین اور تمنائین بلکہ خود حکومت برطانیہ کی قسمت اُن کی مٹھی مین دیدی گئی ہے اور اگرچہ اسکی توقع نہین ہے کہ ہماری نحیف آواز ہزارہا میل کی مسافت طے کرکے مسٹر لائڈ جارج اور کابینۂ انگلستان کے ہر فریق کے ذمہ دار رہنماؤن تک پہونچ سکے۔ لیکن ہم اپنی مقامی حکومت سے ضرور یہ چاہتے ہین کہ وہ مدبرین و وزرائے برطانیہ کو مسٹر محمد علی کے مشن کی اصلی نوعیت اور حقیقی اہمیت سے آگاہ کردے تاکہ وہ اپنی عظمت و فتحمندی کے غرور مین کہین اس چیونٹی کو حقیر نہ جانین جس کی بدولت فیل حکومت کی حالت چند ساعت مین دگرگون ہوجاسکتی ہے

x • x • x

سید نبی اللہ صاحب بیرسٹر نے الہ آباد کے موقر انگریزی روزنامہ "انڈیپنڈنٹ" مین ایک عجیب وغریب مضمون لکھا ہے جسکا مفہوم عام طور پر شاید کم سمجھا گیا ہوگا اور کم سے کم جو لوگ انگریزی زبان مین کافی مہارت

دیکھنے اور سید صاحب کی قابلیت سے واقف ہین اُن کے لیئے تو یہ مضمون ایک معمّہ ہو۔ لیکن چونکہ سید صاحب
نے اِس مضمون مین اپنے نام نامی کے ساتھ اپنا عہدہ مسلم لیگ بھی درج کیا ہو۔ اِس لیئے جو اصحاب مسلم لیگ
یا مسلمانون کے عام سیاسی مفاد سے دلچسپی رکھتے ہین غالباً ان کا یہ اندیشہ غلط نہو کہ سید صاحب کے
اِس مضمون کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ جہان تک ہم اُس کا مفہوم سمجھ سکتے ہین سید صاحب یا اُن کی
زبان قلم سے کوئی دوسرے صاحب اس بات کے آرزومند ہین کہ جسطرح سر جان ہیوٹ سابق
لفٹننٹ گورنر صوبجات متحدہ نے مہاراجہ صاحب بنارس کو خودمختار حکمران کے درجہ پر پہونچا دیا ہو اُسیطرح
سر ہارکورٹ بٹلر جو تعلقداران اودھ کے نہ صرف پرانے دوست ہین بلکہ انجمن تعلقداران اودھ کے رکن
بلکہ اُن کی برادری مین بھی داخل ہوگئے ہین۔ اپنے عہد حکمرانی مین صوبہ اودھ کے تعلقدارون مین سے
ایک یا دو صاحبون کو اسی منزلت پر فائز کردین۔ ہم ابھی اُن اصحاب کا نام لینا نہین چاہتے جو
بٹلر صاحب کی عنایت فرمائی سے بڑا ہونے کی بجا طور پر توقع کرسکتے ہین لیکن ہم اپنا فرض سمجھتے ہین کہ سید صاحب
کی اس تحریک سے اپنے اختلاف کا اظہار کردین۔ یہ عجیب تماشا ہو کہ دنیا مین جسقدر آزادی اور جمہوریت کا
میلان بڑھتا جاتا ہو بعض طبائع اسیقدر انانیت اور استبداد کی حمایت مین غلو کرتی جاتی ہین۔ یورپ کو
تو گذشتہ جنگ نے تقریباً شخصی اقتدار سے ایک بڑی حد تک آزاد کردیا ہو۔ مطلق العنان حکمران تو ایک بھی
باقی نہین اور جو محدود الاختیار بادشاہ اس وقت نظر آتے ہین۔ ہوا کا رُخ بتا رہا ہو کہ اُن کا تصرف و
اقتدار بھی زیادہ دنون قائم نہین رہ سکتا۔ ایشیا جسے انانیت کا قدیم ترین گہوارہ اور مطلق العنانی کا سب سے پرانا
مرکز تصور کیا جاتا ہو وہان بھی آزادی کی روح عرصہ سے نمودار ہو۔ جاپان، چین، ایران اور برطانوی
مقبوضات کو چھوڑ کر بہت ہی قلیل رقبہ اور نہایت ہی کم آبادی انسانون کی رہ جاتی ہو۔ جہان بالکل
خودمختار حکمرانی کے آثار موجود ہین۔ ہندوستان کی خودمختار ریاستون مین بھی بعض بعض جگہ جمہوریت کی
تخم ریزی ہوچکی ہو۔ بڑودہ، ٹراونکور، میسور وغیرہ ہندو ریاستون کے علاوہ ہندوستان کی سب سے
بڑی دیسی ریاست (حیدرآباد دکن مین بھی) جسے ہم مسلمانان ہندوستان سلطنت مغلیہ کی یادگار سمجھتے ہین
آئینی حکومت کی داغ بیل پڑگئی ہو۔ چنانچہ ہز اگزالٹڈ ہائنس میر عثمان علیخان نظام حیدرآباد دکن نے
سر علی امام صاحب کو بلاکر اپنی مجلس انتظامی و باب حکومت کا صدر بنایا ہو اور حال ہی مین اُن کو ہدایت
کی ہو کہ حیدرآباد کی لیجسلیٹو کونسل (مجلس واضع آئین و قوانین) کو ایسے طریقے پر وسعت دیجائے کہ

رعایا کے ہر طبقہ کو اس مین نمایندگی حاصل ہو اور ان نمائندون کو معاملات ملکی مین کافی طور پر حصہ لینے کا موقع مل سکے۔

ہم نے ڈیڑھ سال ہوے جب ہز اگزالٹڈ ہائنس کو محی الملت والدین کا لقب دیئے جانے سے اختلاف کیا تھا اور ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اسکے کیا نتائج ہون گے۔ ایک سال کے اندر ہی اندر ہمارے خطرات کی ایک بڑے حد تک عملی توثیق ہو گئی۔ لیکن بخیال اسکے کہ ہز ہائنس کی بارگاہ مین الناظر کی طرف سے بعض بدگمانیان پیدا کرا دی گئی تھین ہم نے قصداً معاملات ریاست کے متعلق اس عرصہ مین کچھ لکھنے سے پرہیز کیا۔ بہرحال اب ہمین یقین ہے کہ خود ہز اگزالٹڈ ہائنس کو ہماری نیت اور رائے کا اندازہ ہو گیا ہو گا اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہین کہ حضور ممدوح کی اس مبارک تجویز سے اپنا دلی اتفاق ظاہر کرین لیکن یہ توقع رکھین کہ جیسے جیسے باشندگان ملک مین سیاسی بیداری پیدا ہوتی اور جمہوریت کی روح ترقی پاتی جائے گی حضور نظام بھی اپنے ملک مین رعایا کو امور مملکت مین حصہ دار بناتے جائین گے۔

ان حالات مین سید صاحب کی یہ تحریک ہمارے نزدیک نہایت ہی ناانصافی پر مبنی ہے کہ برطانوی ہندوستان کے وہ باشندے جو عرصہ سے ایک قسم کی آئینی حکومت کے عادی ہین اور جن کو توقع ہو سکتی ہے کہ اس ملک مین جلد سے جلد ذمہ دار حکومت قائم ہو جائے گی اور اسطرح اُن مین کا ہر فرد براہ راست یا بالواسطہ اپنے ملک کی حالت سنبھالنے مین حصہ دار بنجائے گا دفعتاً قلم کی ایک گردش سے کسی مطلق العنان خود مختار رئیس کے غلام بنا دیے جائین۔

بے شبہ ہمارے صوبہ کے تعلقدارون کو آج بھی اپنے علاقہ کے بسنے والون پر کافی اقتدار حاصل ہے لیکن موجودہ حالت مین غالباً وہ اُن کے ساتھ زیادہ جبر و تعدی نہین کر سکتے اس لیے کہ قانون کے رو سے اُنھین اپنے حقوق کی حفاظت کا پورا حق حاصل ہے مگر خود مختار ہو جانے کے بعد تو پھر خود انکی زبان بمنزلہ قانون کے ہو جاتی ہے۔

اس سے کوئی صاحب یہ نتیجہ نکالین کہ راقم الحروف غیر ملکی تصرف و اقتدار کے دوام کا خواہان ہے نہین بلکہ اسکے فی الفور رخصت ہو جانے کا بھی ذرا اُسے افسوس نہ ہو گا لیکن ریاستون اور خود مختار رئیسون کی حالت موجودہ قطعاً ایسی نہین کہ برطانوی ہند کا باشندہ اُسپر رشک کرے۔

# فوق البشر کا زوال

## مہلک فلسفہ کا استیصال

**مہلک فلسفہ کی ابتدا** اس انوکھے عنوان کو دیکھکر پڑھنے والون کو اُلجھن ہوگی کہ فوق البشر سے کیا مراد ہی اور اُسے زوال کیسے لاحق ہوا ہی؟ "فوق البشریت" کا بانی ایک پاگل فیلسوف تھا اُسکی مجنونانہ مگر مہلک تعلیم کو اورون نے اپنے حسب منشا پاکر بے چون و چرا قبول کرلیا۔ اور اُسکی اشاعت مین دماغ سوزی اور جان فشانی سے کام لیا۔ اُسی زہریلی حکمت نے رفتہ رفتہ وسعت اختیار کرلی۔ اور ایک قوم کے ذوالاقتدار افراد بھی اُس کے مرید ہوگئے۔ اور دنیا کو فوق البشریت کا حلقہ بگوش بنانے کے لیے فکرمند ہوے۔ اس تشویش سے بالآخر اس ہنگامہ کے اسباب بہم پہونچنے لگے جس نے اگست ۱۹۱۴ء مین ہولناک صورت اختیار کرلی۔ اس کا دوسرا نام اُس کے حامیون نے "تمدن" تجویز کیا تھا۔ اسکی ماہیت کیا تھی؟ بلجیم پولینڈ۔ سرویہ اور فرانس کے شمالی اضلاع سے پوچھو۔ بے پناہ شہرون کی بہت کنائی سے معلوم کرو۔ انسانی حکمت کا بہترین نمونہ اور صناعی کا اعلیٰ ترین کمال۔ ایمس کے گرجا کے کھنڈرون لووآن کی تباہ یونیورسٹی اور اُس کے لاثانی قلمی نسخون کی خاک کے ڈھیر کو اول بدل کر دیکھو۔ لوسی ٹینیہ کے زیرآب مسافرون سے استفسار کرو۔ پھر پتہ لگ جائیگا کہ یہ کیسا تمدن اور کیسی فوق البشریت تھی۔ مگر شکر کا مقام ہی راستی اور حق۔ تہذیب اور انسانیت کے وکیلون نے اس ہوے کو ہمیشہ کے لیئے سپرد زمین کر دیا۔ اسے اُس کے مخبوط الحواس موجد کی قبر مین اتار دیا۔ اس ناپاک امانت کو اسکے چیلون سے چھین جھپٹکر احتیاطاً اُسکے پاس پہونچا دیا۔ ساڑھے چار سال کے قریب اس مذموم فلسفہ کی بیخ کنی مین مصروف ہوئے۔ اور ایک سال اُسکی قیامت کے انسداد کی تجاویز کی اختراع مین لگا۔ اس جن کو اب بوتل مین بندکر کے جہنم مین بھیج دیا ہی۔ تاکہ اپنے باوا شیطان کے پاس رہے اور اس دنیا کو اُسکی ہیبت شکل سے دہشت نہو۔

**فوق البشریت کا آغاز** فوق البشریت کا کب اور کہان آغاز ہوا تھا۔ اب اِس سوال کا جواب بہم پہونچایا جائیگا کیونکہ ابتدا مین اس پر بحث کرنا لازمی بات ہی۔ فوق البشر کے لیئے انگریزی لفظ سپرمین (Superman) ہی۔ اِس سے مراد یہ ہی کہ انسان اپنے ہمجنسون مین لاثانی اور اُن سے برتر ہو۔ دراصل یہ اصطلاح نیٹشے کی تھی یا لوجی

(الٰہیات سے) مستعار ہے اور بائبل مین بھی بار بار استعمال ہوئی ہے اس سے مراد مسیح یسوع ہین جو مسیحی عقیدہ کی روسے "فوق البشر" ہین - اور فقط اس حیثیت سے وہ آدمی کے لیے کمال کا نمونہ لاثانی اور بنی آدم کے نجات دہندہ ہوسکتے ہین یہ مسیحی تعلیم کے روسے آپ کے سوا اور کوئی فوق البشر کہلانے کا حق دار نہین ہے مگر جرمنی کے باؤلے حکیم نیٹشے (نی شے) نے جو مذہب کا دشمن اور خدا کو ٹھٹھون مین اڑایا کرتا تھا - اِس اصطلاح سے اپنے حسب منشا معنی منسوب کیئے اور ایسا انسان قرار دیا - جو اپنے جنون سے سب باتون مین افضل تر ہو - ہوتے ہوتے اِس سے مراد اہل جرمنی قرار پائے جنھون نے نیٹشے کی تعلیم کو قبول کر کے اپنی روزانہ اور قومی زندگی اس کے تابع کر دی - اور وہ فوق البشر [illegible] کہلانے لگے -

حلیم الطبع حکیم | نام نیٹشے سلافی زبان سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی "حلیم الطبع" ہین مگر در اصل اس پر برعکس نہند نام زنگی کافور" صادق آتا ہے - نیٹشے فی الواقع "حلیم الطبع" نہ تھا اسکی شیخی اور رعونت فرعون سے ہزار درجہ بڑھکر تھی - ابھی جمہور کو اس کی اصلیت کما حقہ علم نہین ہے - ورنہ وہ کبر و نخوت کے لیے فرعون کے بجائے نیٹشے استعمال کرین - یہ ۱۸۴۴ء مین پیدا ہوا - اور ۱۹۰۰ء مین مرگیا اس کا باپ کسی مہیائی گرجہ کا پادری تھا ۱۸۶۷ء مین تھوڑے عرصہ تک یونانی حکما کی طرح فوج مین بھی رہا - اور ۱۸۷۰ء کے معرکہ فرانس و پرشیا کے دوران مین کچھ عرصہ تک ڈولی برداروں مین بھرتی ہو کر کام کرتا رہا ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۸۷۹ء تک باسل کی یونیورسٹی مین السنہ قدیم کا پروفیسر بھی رہا اُس کے بعد دس برس دائم المریض ہو کر آوارہ گردی کرتا رہا اور اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال پاگلون کی طرح ٹکرمارتے بسر کیئے - آخر کار ایک پرائیوٹ پاگل خانہ مین جان دی - یونان کے ادبیات اور فنون لطیفہ سے اُسکے ذہن پر بہت اثر ہوا - بالفاظ دیگر نیٹشے نے اپنا فلسفہ کچھ تو یونانی ادیبون اور صناعون سے اور کچھ بیالوجی (علم الحیوٰۃ) کے اصولون سے اخذ کیا تھا - نیٹشے کے سب سے بڑے انگریز چیلے ڈاکٹر سیولی نے ۱۹۱۰ء مین یہ خیال ظاہر کیا تھا :- کیا آپ مجھ سے اس کا ثبوت چاہتے ہین کہ نیا فلسفہ (نیٹشے کی تعلیم) دنیا کے تمام بحری بیڑون سے بڑھ کر بنی آدم کا دشمن ثابت ہوگا ؟" اس نے اپنے فلسفہ کو چار کتابون مین بیان کیا ہے جو اسکے جنون سے معرا تخیل بچتہ اور فکر صائب کے انجام ہین - ان کے تام جائے قل و زڈم [illegible] [illegible] "زرتشتر" Zarathustra "بیانڈ گڈ اینڈ ایول" Beyond Good and Evil

اور نیٹشے (Genealogy of Morals) "جینیالوجی آف مارلز" کے اقوال ملاحظہ ہون "گھٹیا تدبیر سیاست کا وقت گذر گیا ہو۔ اگلی صدی کے دوران مین عالمگیر حکومت کے لیے معرکہ ہوگا۔ اس وقت سیاست اعظم نمایان ہوگی" یہ ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۵ء کا قول ہو۔ پھر ایک اور جگہ کہتا ہو میری حکمت علمی کا اصل اصول یہ ہو۔ دنیا کا کون مالک بنے گا؟ پھر کہتا ہو "جنگ اور شجاعت سے وہ کارہاے نمایان عمل مین آتے ہین جو ہمسایہ کی محبت سے کبھی ظہور پذیر نہین ہوتے۔ بدنصیبون کو تمھارے ترس سے کوئی فائدہ نہین پہونچتا۔ بلکہ تمھاری بہادری سے وہ محفوظ رہتے ہین" وہ دوسری جگہ کہتا ہو "نفرت۔ شر۔ ظلم۔ اشتیاق۔ اقتدار۔ اور وہ باتین جو مذموم قرار دی جاتی ہین۔ استقرار۔ تقویت کے حیرت انگیز عمل سے متعلق ہین اور گویہ عمل عقل و دانش سے معرّا و ضرر رسان ہو مگر دراصل یہی ایک ایسا طریقہ ہو جس سے بنی آدم کا قیام دوامی محفوظ و قائم چلا جاتا ہو" "ہمارا یہ خیال ہو کہ (انسان) کی تمناے زیست کی اصلاح اور تقویت کی اشد ضرورت ہو۔ تاکہ وہ ارادت اقتدار مین منتقل ہوجاے' ہماری یہ بھی راے ہو کہ سنگ دلی۔ سفاکی۔ ظلم۔ غلامی۔ دل کا خوف۔ رازداری۔ انتہا درجہ کی بے باکی۔ بہلانے اور بہنسانے کی ترکیب۔ اور ہر قسم کی شیطانی۔ ہر ایک معیوب اور پر گناہ حرکت جو جور و ستم اور ظلم و تعدی پر مبنی ہو اور انسان کی درندون کی سی تند خوئی۔ اور خود پروری۔ اور سانپ ایسی عیاری و مکاری سے بنی نوع انسان کی فطرت اعلیٰ وارفع بنتی ہو۔ جیسے صدیون سے مذکورۂ صدر صفتون کی ضدین سے اُسکی ترقی کی جاتی ہو موجودہ آدمیون کو فوق البشر بنانے کے خیال مین اُلجھا ہوا کہتا ہو "جنگلی بھیون کا شیر بننا لازمی ہو اور بھیڑ کو ن سے مگرمچھ پیدا ہونے ضروری ہین۔ کیونکہ اچھے شکاری کے لیے اچھا شکار ہاتھ آنا چاہیے۔۔۔۔۔۔ اے بھلے اور انصاف پسند لوگو! تمھاری بہت سی صفتین مضحکہ خیز ہین اور اسی طرح تمھارا خوف شیطان بھی ہنسی مذاق کے قابل ہو۔ اِس سے مجھے تمھاری بابت شکوک اور اندیشے پیدا ہوگئے ہین۔ اور مین تمھاری ان باتون پر دل ہی دل مین ہنستا ہون۔ مین تصور کرتا ہون کہ میرے فوق البشر کو تم شیطان کے نام سے موسوم کروگے۔" ایک اور جگہ کہتا ہو "ان مہذب قومون کے جامہ کے اندر درندۂ مضمر ہو جسے سفید درندہ کہنا چاہیے۔ جو بوٹ مار اور دار و گیر کی خواہش مین غلطان و پیچان پھرتا ہو کبھی کبھی یہ درندہ بندشون سے آزاد ہو کر جنگل کو واپس بھاگ جانے کی کوشش بھی کرتا ہو" اور اقتباسات بھی دیے جاسکتے ہین۔ مگر بسر دست بس ہون گے اپنے موقع پر اور اقتباس ہون سگے۔

**نیٹشے کا فلسفہ اخلاق کیا ہے**

پہلے مذکور ہوا کہ نیٹشے کے تخیل کو کچھ تو یونانی ادبیات اور فنون سے اور کچھ بیالوجی کے اصولون سے تحریک ملی تھی۔ اول الذکر سے اُس نے دنیا کی نسبت یہ گمان قائم کیا کہ وہ اخلاقی اصول پر مبنی نہین ہو گو اُسے حسنِ خوبی سے آراستہ کیا جا سکتا ہو۔ موخرالذکر سے اُس نے یہ تصور حاصل کیا کہ اگر فوق البشر ارتقا کے عمل مین گرفتار ہو جائے تو دنیا ایک انوکھے حُسن سے پیراستہ ہو سکتی ہو ان دونون سے اُسکے فلسفہ کے اصول اولیہ اور قضایا ماخوذ ہوئے۔ زندگی کو اُس نے غیر اخلاقی قرار دیا اور دنیا کو حسن کا اچھا بتایا۔ جو نہ اچھی اور نہ بُری ہو۔ یعنی نہ تو وہ دل فریب ہو اور نہ ہی کریہ صورت انسان کے جملہ اعمال اور ارادے۔ اخلاقی محرکے سے بے کانہ ہین۔ "دنیا مین مظاہر اخلاقی نہین ہین۔ فقط اُن کی اخلاقی تشریح ممکن ہو" لوگون نے اپنے خیال سے ان باتون کو اخلاق سے آراستہ کر رکھا ہو۔ درحقیقت یہ اس سے معرا ہین اور ہمارے کامون کی اخلاقی قدر و قیمت ہمارے ذہن کی تراش ہو۔ نیٹشے پوچھتا ہو "کیا ہمارے ارادون اور کامون کی خوبی اور خوبی بھلائی اور بُرائی حقیقی قدر و قیمت سے آراستہ ہو؟" اس کے جواب مین موجودہ اخلاقی خیالات پر نظر غائر ڈال کر کہتا ہو۔ یہ قدر و قیمت اضافی ہو مطلق نہین۔ اخلاقی خیالات نسل سے علاقہ رکھتے ہین اور ایک نسل کے خیالات دوسری سے مختلف اور متخالف ہین۔ اور نیز یہ خیالات زمانہ سے بھی نسبت رکھتے ہین اور رفتار زمانہ کے مطابق اُن مین تغیر و تبدل واقع ہوتا ہو۔ چنانچہ وہ کہتا ہو۔ خیر و شر کا جو دائمی قرار دیے گئے ہین۔ عدم وجود ہو سب چیزین تغیر پذیر ہین۔ جو بات اب اچھی ہو اور مفید ہو وہ پچھلے زمانہ مین معیوب تھی لیکن حالات کے انقلاب کے سبب سے وہ اب کارآمد بن گئی ہو۔ آجکل کا اخلاق ارتقا کی ایک صورت ہو۔ اور یہ قابل الزام ہو۔ نیٹشے کے استدلال کے رو سے سچ جھوٹ قوم یا قبیلہ کے استفادہ کا قاعدہ ہو۔ سچ قابل تعریف ہو۔ کیونکہ اس سے قوم کو صحیح اور مفید اطلاع ملتی ہو کہ وہ کن باتون کی توقع رکھے۔ جھوٹ قابل الزام ہو۔ کیونکہ اس سے قوم بے خبر رہتی ہو۔ وہ پوچھتا ہو "کیا قوم کا فائدہ ہماری طرز عمل کا معیار آخری ہو سکتا ہو؟" نیٹشے کو اس سے انکار ہو۔ پھر وہ کہتا ہو۔ اخلاق کا منبع ضمیر ہو۔ جو ہمارے اعمال کو اچھا یا بُرا قرار دیتا ہو۔ کیونکہ ہم فعل مختار ہین۔ اور جب اس کا ناجائز استعمال کیا جاتا ہو تو ہمارا ضمیر ہمین تازیانے لگاتا ہو۔ نیٹشے کے نزدیک یہ خرافات ہو۔ وہ اختیار فعل سے صاف منکر ہو۔ اُس کی رائے مین قانون توارث ( ) اور گرد و پیش کے حالات جن کے درمیان ہماری تربیت ہوتی ہو، ہمارے افعال کی محرکات ہین جسے فعل مختاری کے نام سے پکارا جاتا ہو۔ وہ اُس کے نزدیک خاص مرور کی پیچیدہ حالت ہو جس مین شخصیت کا محالا اظہار پاتی ہو۔

اور جو لوگ فعل مختاری پر زور دیتے ہین یہ اُن کا عارفانہ مکر ہو جس سے وہ اپنے ہم جنسون کو اپنے دام فریب مین پھنسا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہین فعل مختاری اور ضمیر دونون ہی قابل لحاظ نہین ہین ـ جیسے صناع اپنی تصویر کو دیکھکر اُس کی خوبی پر خوش ہوتا ہو۔ اسی طرح قوم یا قبیلہ اپنی حسن پسند قابلیت کے وسیلہ سے اپنے افعال سے قدر و قیمت منسوب کرتا ہو۔ کیا ہم ایسے بیوقوف بن جائین کہ اپنی حسِ حسن پرست کے حکم سے اپنے اعمال کی قدر و قیمت قرار دین ؟" بقول نیٹشے جو باتین قوم کے حق مین مفید ہوتی ہین انھین کو اخلاق قرار دیا جاتا ہو۔ اور اُسے وہ قومی اخلاق پکارتا ہو۔ جب ایک بات رائج ہو جاتی ہو تو باقی افراد اُسکی پیروی کرتے ہین اس انوکھے فلسفی کی رُو سے قوم غلامون کا مجموعہ ہو۔ مگر آقا بھی ہین اور غلام بھی۔ مسبوق الذکر معمولی زندگی پر قانع نہین رہ سکتے۔ بلکہ وہ اسکی بہتات کے خواہان ہین۔ زندگی بقول نیٹشے " ارادت زیست" کا نتیجہ نہین ہو۔ جیسا ڈاروِن کا خیال تھا۔ اور نہ ہی دنیا مین کشاکش زیست کے علامات ہویدا ہین۔ جسمین بقاے بہترین حیاں ہوتا ہو۔ بلکہ زندگی " ارادتِ اقتدار و حکومت" سے ماخوذ ہو۔ اور دنیا مین اقتدار کے لیئے جد و جہد ہو رہی ہو۔ جسمین زبردست نہ صرف بازی ہی لے جاتا ہو بلکہ اقتدار و حکومت حاصل کرتا ہو۔ چنانچہ وہ لکھتا ہو " زندگی عیش و عشرت خوش حالی اور فارغ البالی کی حالت کا نام ہو بلکہ مضحکہ خیز فضول خرچی اُس کا لازمہ ہو۔ جہان کہین کشاکش ہو۔ تو وہ اقتدار اور غلبہ کے لیے ہوتی ہے، سچ پوچھو تو زندگی مار دھاڑ چھین جھپٹ۔ غصب و جبر۔ کم زور اور زبردستون کی پامالی سختی اور ظلم۔ اور دوسرون سے اپنی آسایش کا کام لینے کا عمل ہو۔ سچائی کا معیار یہ ہو کہ ہمین اپنی قوت کی ترقی کا احساس ہو" اس اصول کے رو سے " جسکی لاٹھی اُسکی بھینس " کا پرانا قول درست ثابت ہوتا ہو۔ جس طریقہ سے میسری اقبالمندی اور قدرت مین توسیع ہو۔ درست اور راست ہو۔ مگر قدرت ہر ایک کے نصیب مین نہین بلکہ قیصر جولیس اور نپولین اعظم جیسے چیدہ اشخاص ہی اس سے بہرہ یاب ہوتے ہین۔ چونکہ قدرت ہی راستی کا معیار ہو۔ اس لیئے زور آور جو اصول قائم کرے وہ برحق اور اسکا اخلاق صحیح ہو۔ قوم یا غلامون کا اخلاق جھوٹا اور نادرست ہو۔ سچائی اور رحم زندگی کی شرط لازمی ہو۔ اور غلام کو اُس کے سوا کسی اور بات کی توقع نہین رکھنا چاہیئے۔ اسکے لیے یہی معیار ہو۔ مگر آقا کا معیار اس کے متبائن ہو۔ وہ قدرت اور غلبہ کا خواہان ہو۔ اور قدرت فقط جنگ آزمائی سے حاصل ہوتی ہو اور جنگ مین سب روا ہو۔ رحم معیوب ہو چنانچہ نیٹشے کہتا ہو " یہ امر ضرور قابل لحاظ ہو کہ آدمی کس مقصد کے لیے جھوٹ بولتا ہو آیا اس سے کسی کو برباد کرنا منظور ہو

یا بجا نات جمہوریت - سوشل ازم - اور مسیحیت زیر دستوں کی حمایت اور لحاظ کی تائید کرتے ہیں۔ مگر اس بائولے فلاسفر کے نزدیک وہ قدرت کے اس قاعدہ کے جس سے زور آور زبردستوں پر حکومت کرتا ہے نقیض ہیں - اسی وجہ سے وہ مسیحی مذہب کی تعلیم کو نہایت بے دردی اور سختی سے قابل الزام قرار دیتا ہے - اُس کا معمول صلح و آشتی دوستی اور محبت نہیں ہے - بلکہ شمشیر بران ہے - جو قدرت کے حصول کے واسطے میان سے باہر آتی ہے اور یہی حقیقی دہر پرستی ہے - جس کا نیٹشے بانی ہے - یہی دنیا داری جسے اگلے حکیم اور بانیان مذاہب معیوب ٹھہرا گئے تھے۔ نیٹشے کے خیال کی رو سے بہت ہی مستحسن اور کلید حیات اور یہی حکمت عملی ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے "جنگ مقدس دیوتا یا لو مجسم ہے جو حکومتوں کو پاک کر کے مقدس ٹھہراتا ہے قومی سِل کا علاج بہت دشوار ہوتا ہے - نیک مقصد کی جنگ آرائی بجائے خود متبرک کام ہے - بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ مفید جنگ سے سب مقاصد و اغراض پاک ٹھہرتے ہیں - اگر زبردست حکومت قائم کرنے کے مقصود کو نظر انداز کر کے دولت مندی کے پیچھے افراد قوم پڑ جائیں - تو اُس کا تدارک جنگ آرائی ہے - زاد بوم اور اپنے بادشاہ کی محبت سے جو جنگ کی جاتی ہے اُس سے جو تحریک اور خواہش وجود میں آتی ہے وہ اخلاقی صورت پکڑ کر اعلیٰ تر منزل مقصود کی طرف اشارہ کرتی ہے" اسی وجہ سے اُس کے چیلوں نے جنگ یورپ جاری کی تھی - کہ عام جرمن بنیا گری کے انہماک میں مبتلا ہو کر عالمگیر حکومت کے تصور کو فراموش کر گئے تھے۔ نیٹشے کہتا ہے "تمھاری ارادت سے یہ بات نکلنا چاہیئے: فوق البشر جہان کا مفہوم اور اس کا مترادف ہو گا" میں تمھیں تاکید کرتا ہوں - دنیا پر اپنے کو قربان کر دو - ان کی بات کا یقین مت کرو جو تمھیں اگلے جہان کی سُنہری امیدوں سے بہلاتے ہیں میں اس آدمی کو عزیز رکھتا ہوں جو اس غرض سے خون پسینہ ایک کرتا ہے اور روپیہ کماتا ہے کہ اس سے فوق البشر کا مکان تعمیر کرے"

<u>فوق البشر کا تصور</u> | پہلے تو نیٹشے کے نزدیک فوق البشر فرد واحد تھا اسی وجہ سے وہ نپولین کا ذکر بار بار کرتا ہے - اور اسے قابل تقلید نمونہ ٹھہراتا ہے - مگر رفتہ رفتہ افراد فوق البشر کا خیال قائم ہوا اس کا یہ تصور تین بڑے مرحلوں سے گذرا - اوّل - امرا کا گروہ - جو یورپ پر حکمران ہو - دوم - افراد فوق البشر کی یورپی قوم سوم - فوق البشر افراد کی قوم پہلے وہ یورپ کی حکومتوں کے اتحاد کے خواب دیکھتا تھا اور قوم پرستی کا مخالف تھا - تمدن یورپ کی یک رنگی اور اقتصادیات یورپ کی موافقت پر زور دیتا تھا - اور اُس زمانہ کا چشم براہ تھا - جب اہل یورپ ادب و احترام سے "اچھے یورپین" کہلائیں گے اور اُس کے نزاسے

محاورہ مین وارثان یورپ زور جواہر سے لدے ہوئے۔ مالکان یورپ کہلانے والے تھے۔ اور اس اعتبار سے وہ نپولین۔ گیتی ( Goethe ) بیٹ ہوبن اور ہاٹن کا ہم خیال تھا جو قومیت کے تنگ دائرہ سے باہر پرواز کرتے تھے۔ فوق البشر کی کیا خصوصیات ہین نیٹشے کے تصور مین اُسے اقتدار اور غلبہ کا عاشق ہونا چاہیئے۔ وہ صلح و امن کا حامی نہین بلکہ جنگ و جدل کا طالب۔ وہ دو چار سال مین معرض ہستی مین آنے کو نہ تھا۔ بلکہ ایک نسل گذر جانے کے بعد پیدا ہوگا۔ مگر موجودہ پشت کا یہ فرض منصبی ہو کہ اُسکی ولادت کے لیئے راستہ تیار کرے۔ تمنائے اقتدار قائم ہو۔ آئندہ زمانہ مین اُس کا تجسم ہوگا اس مقصد سے وہ اعلیٰ قسم کے تنومند اور زبردست بچے پیدا کرنے اور چیدہ بچون کی خاص تربیت کے اہتمام کے لیئے قانون خاص پاس کیئے جانے پر زور دیتا ہو۔ کیونکہ اس وسیلہ سے اسے یہ امید ہو کہ شجاعت پھر پُرعزت زندگی حاصل کرے گی۔ اور ایک ایسے زمانہ کا آغاز ہوگا جو شجاعت و مردانگی کو علم مین منتقل کرے گا۔ اور خیالات اور اُن کی اشاعت کے لیئے جنگ کرے گا" جنگ یورپ کے دوران مین یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ جرمن لوگ اپنے نرالے تمدنی خیالات" کی خاطر لڑ رہے ہین۔ اُنھون نے اپنے گرد کی بانی پر حرف بحرف عمل کیا۔ بنی آدم کو یُوجنکس ( Eugenics ) کے قاعدے سے سدھارنے کی جو تعلیم نیٹشے نے دی تھی۔ اُسکی وجہ سے بہت سے نیکدل آدمی جو اپنی قوم اور نسل کی قوائے طبعیہ اور رسمیہ کے سدھارنے کے خواہان تھے اُس کے مرید ہوگئے۔ اسی وجہ سے اُسکی کتابون کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی اور اُسکے مرنے کے بعد اُسکی عزت و حرمت ہونے لگی۔

نیٹشے کا مذہب اِس سے پہلے نیٹشے کے فلسفہ کا مختصر بیان کیا گیا جو اخلاق اور حکمت عملی پر حاوی ہو۔ یعنے حاسۂ اخلاقی کی ابتدا ماہیت۔ اور اُسکے احکام کی نوعیت کی نسبت اُس مخبوط الحواس کا کیا خیال ہو۔ پھر یہ بتایا گیا کہ انسان کا منتہائے کمال کیا ہونا چاہیئے۔ اور یہ نیٹشے کی انوکھی بولی مین فوق البشریت کا ڈھکوسلہ ہو۔ اب اُسکے مذہب پر نظر ڈالنا مناسب ہو۔ اُس کے نزدیک اس دنیا کا صانع "کوئی ادنیٰ قسم کا دیوتا" تھا جسکی بھونڈی دست کاری سے ایسی بھدی دنیا وجود مین آئی جسمین نیٹشے جیسا کامل خدا رہنے کو مجبور ہوا"۔ وہ اس دنیا کو سدھارنے کا خواہان تھا۔ اِس وجہ سے ہر قسم کے اعلیٰ ترین خیالات اور بہترین دستورون کے درپے تخریب رہا۔ اور جا و بیجا ان پر نہایت بیدردی کے ساتھ حملے کرتا تھا جن کی زد سے کوئی تصور کوئی عقیدہ۔ کوئی اصول۔ اور کوئی طریقہ محفوظ نہ رہا جسکی مہذب دنیا مین اتنی قدر و قیمت ہو۔

اُس کا اصل اصول یہ تھا جس سے وہ تحریک پذیر ہوتا تھا۔ جو کچھ موجود ہے۔ وہ سب خرافات ہے، جن
چیزوں کو ان کے استفادہ اور خوبی سے اور جن باتوں کو اُن کے فطری حسن کے باعث ہم عزیز رکھتے
ہیں نیٹشے کے نزدیک وہ توہم پرستی اور حماقت ہے۔ وہ وسیع ترین معنی میں بُت شکن تھا۔ چونکہ بہشت احمقوں کا ڈھکوسلا ہے
اس واسطے گرجاؤں کے مینار منہدم کر دیے جائیں۔ تاکہ وہ آسمان (بہشت بریں) کی طرف اشارہ نہ کریں۔
خدا کا نام ناموس عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے۔ جو دنیا نیٹشے بنانے کے درپے تھا اس میں
کوئی بات اور جگہ مقدس نہ تھی۔ وہ فرعونی کبر کے ساتھ کہتا ہے "چاہے کوئی دیوتا ہوں" وہ اپنی ہمہ جا ضوری
اور راستی کا ثبوت پیش کریں۔ وہ اپنے کفر میں اعتدال سے کوسوں آگے بڑھ گیا۔ آخر کار پاگل ہو گیا۔
جسے عوام خدا کی مار قرار دینگے۔ مسیحی مذہب اور اُس کے بانی سے نیٹشے کو بعید نفرت تھی۔ کیونکہ عہد جدید
(انجیل) میں اُسکے نزدیک کوئی سچی" فیاضانہ۔ اور صادقانہ بات نہ تھی۔ رچرڈ واگنر سے اُس نے
محض اس وجہ سے دیرینہ دوستانہ عاق کر دیا کہ اُس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں مسیح یسوع کو اپنا مکتی داتا
تسلیم کیا۔ وہ افلاطون سے بھی بعید ناراض ہے۔ کیونکہ وہ مسیحی مذہب کے بانی کے نزول سے پہلے پکا عیسائی
ہو گیا تھا۔ نیٹشے کا خیال ہے کہ انکار حق اور ریاست برحق اور لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیئے وہ پہلو بہ پہلو
رہنے چاہیئیں"۔ وہ مساوات اور جمہوریت پر ہنسی اڑاتا ہے اور فخریہ کہتا ہے" ہماری کوشش اختلافات کو
بڑھانا اور مساوات کو ملیا میٹ کرنا ہے"۔ پھر نیٹشے کہتا ہے کہ سقراط کے زمانہ سے "سب باتوں اور خیالوں کو
کمال اخلاقی کے نصب العین کے تابع کرنے کی کوشش ہوتی چلی آتی ہے اور وہ سقراط کی نسبت کہتا ہے کہ وہ
اخلاقی جنون میں مبتلا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نیٹشے اخلاق کا دشمن تھا وہ روحانیت سے صاف انکاری۔
اور خدا کو مذاق میں اُڑایا کرتا تھا۔ بلکہ وہ روح کے وجود ہی سے منکر تھا۔ فوق البشر ہی اُس کے لیئے
سب کچھ تھا دیکھیئے کیسی خوفناک دیدہ دلیری اور بے باکی سے کہتا ہے:" خدا مر گیا ہے اب صرف انسان
باقی ہے"۔ پھر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے:" میں صرف ایسے خدا پر ایمان لاؤں گا جو ناچ کر دکھائے"۔ اسکا
انجام یہ ہوا کہ اُس نے بالواسطہ دہریت پر زور دیا۔ گویا اپنا نیا مذہب نہیں چلایا "زمین کے ہو کر رہو ان
لوگوں کی بات کو باور نہ کرو۔ جو فوق القدرت امیدوں سے تمہیں گمراہ کرتے ہیں"۔ گویا محسوسات کی پرستش اور
خود پر زور دیا۔ ایثار علی النفس اور بے غرض محبت نیٹشے کے نزدیک مذموم ہیں۔ اسی وجہ سے
نفس پرستی کو خیر اور ایثار کو شر قرار دیا۔ مسیحی کی تعلیم یہ ہے کہ دوسروں کے لیئے دکھ اٹھانا اور اپنی راحت اور

شادمانی قربان کرنا سراسر حماقت اور گناہ ہی اُسکے نزدیک جو کچھ ہی۔ انانیت ہی۔ انسان کا خدا اس کردہ تعلیم کے روسے خود پرستی ہی۔ نیٹشے کی دنیا کا خدا بیکس (شراب و خرمستی کا دیوتا) ہی۔ اور زندگی مجنونانہ خوشیون کا مسلسل جشن ہی۔ جیسے رومی لوگ رات کے وقت دام ارگیون کی طرح اپنے پیارے دیوتا بیکس (Bacchus) کی خوشنودی کے لیئے شراب پی کر حسین عورتون کے ساتھ رات بھر ناچتے اور دل بہلاتے تھے۔ اِسی طرح نیٹشے اپنے مقلدون کو اسی دیوتا کی پوجا کی تلقین کرتا ہی۔ اِسی سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ فوق البشریت کا مذہب کیسا خطرناک اور ہمارے موجودہ مذہبی خیالات اور اخلاقی تصورات کا سراسر تیاٹن ہی۔

نیٹشے کے چیلے نیٹشے کے فلسفہ کو جرمن کے دو آدمی نے تمام و کمال قبول کرکے عوام کے درمیان پھیلانے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے۔ ٹرائشکے مشہور مورخ تھا اور برن ہارڈی مشہور سپاہی مصنف ہی اُنھون نے زبان اور قلم کے وسیلہ سے نیٹشے کی تعلیم کو مشتہر کیا جس سے رفتہ رفتہ جرمن کے سب تعلیم یافتہ اور ہوشیار آدمی متاثر ہوگئے۔ بلکہ ہر طبقہ کے لیڈرون کا دستور العمل اس کے اقوال بن گئے۔ جیسا کہ دوران جنگ مین ظاہر ہوا۔ اُنھون نے اپنے کو فوق البشر افراد تصور کرنا شروع کردیا۔ اور اپنے تمدن کو دنیا مین پھیلانے کے لیئے اپنے گرد کے حسب ارشاد جنگ شروع کردی مگر دنیا اس زہریلے تمدن کی محتاج نہ تھی۔ اِس لیئے اُسکے حامیون اور مقلدون کی ایسی گوشمالی کی کہ ہمیشہ تک یاد رکھین گے۔ اور دست تاسف مل مل کر اپنے پیرو مرشد کو کوستے، کاٹتے رہین گے۔ ٹرائشکے۔ فشٹے۔ ناؤمن۔ لاسن۔ اور دیگر عالمون نے اقتدار اور قدرت کی پرستش قائم کرنے مین کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ اقتدار او غلبہ ان کا مذہب بن گیا۔ اس کے روسے "بین الاقوام عہدنامے۔ معاہدے۔ مراعات۔ حقوق۔ راست گوئی۔ آبرو۔ اخلاق انسانیت۔ ایمانداری وغیرہ کچھ حقیقت نہین رکھتی۔ بلکہ قدرت اور غلبہ ہی سب کچھ ہی۔ چاہے وہ ملکی ہو یا جنگی قومی ہو یا اقتصادی باقی سب باتین خاک اور دھول ہین" یہ میکسی ملٹن ہارڈن کا خیال ہی۔ برن ہارڈی کہتا ہی "سلطنتون کے اختلافات حق سے نہین۔ بلکہ زور سے رفع دفع ہوسکتے ہین حکومت کا اصول قوت مین ہی"۔ جنرل فرسے تاگ کہتا ہی "ہمارے دشمن ہماری عزت فقط اُسی حال مین کرینگے کہ اُن کے ساتھ سفاکی سے پیش آئین۔ جیسا کہ ہم اس وقت کر رہے ہین"۔ یہ دوران جنگ کے درمیان خیال ظاہر کیا گیا تھا جنرل کلاؤزدیلس کہتا ہی "رحم اور انسانیت کے جذبہ سے ہمین اپنی تلوار کی دھار کند نہین ہونے دینی چاہیئے"

ٹرائٹشکے کے نزدیک ترقی کا محرک اصلی جنگ ہی۔ یہ ایک مقدس عمل اور خدا کا فرمودہ ہی محض خواہش سے جنگ وجدل دنیا سے رخصت نہین ہوسکتی" برن ہارڈی کہتا ہی "جنگ وہ قانون ہی جس سے قومین ترقی کرتی ہین۔ نوآبادیان حاصل کرنے کے واسطے جنگی پیشقدمی کرنا ضروری ہی۔ اور یہ حق اعظم ہے ہر ایک بات کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ بزور شمشیر کرنا مناسب ہی۔ کمزورون کو معدوم اور زور آورون کو غالب اور قائم رہنا چاہیئے۔

جرمن تمدن کی بربادی | اور بہت سے اقتباسات پیش کیئے جاسکتے ہین۔ مگر ہمارے مطلب کے لیئے یہی بس ہین اس سے جرمن تمدن کا نمونہ ظاہر ہی کہ دنیا نے کیسی ہولناک وحشت سے رستگاری پائی ہی۔ اس ناپاک فلسفہ کی بیخ کنی کا سہرا برطانیہ فرانس امریکا اور اُن کے معاونون کے سر بندھنا چاہیئے۔ جنھون نے سوا تین کھرب روپیہ صرف کیا۔ اور تین کروڑ بیس لاکھ جوان قربانی کیئے ساڑھے چار سال تک خونخوار جنگ آرائیون مین قوم کے کمانے والے اور تنومند مرد وعورت مصروف رہے۔ اسکے علاوہ ضمنی وتجارتی مصروفیتون کے معطل رہنے سے جو نقصان مالی ہوا وہ فوجی مصارف سے بھی زیادہ ہی۔ اور جو لوگ جنگ کے بالواسطہ نتائج سے ہلاک ہوے وہ مقتولون کے قریب قریب ہین۔ جب ان اعداد پر غور کیا جائے۔ اور یتیمون اور بیواؤن کی گریہ وزاری کا لحاظ کیا جائے۔ اور ان تمام مصائب کو مدنظر رکھا جائے۔ جو جنگ کے سبب سے مشرق ومغرب کی قومون پر نازل ہوئی ہین تو حق وانصاف راستی اور انسانیت۔ مذہب واخلاق کی حفاظت بہت خوفناک دامون پڑتی ہی۔ مگر یہی وہ باتین ہین جن کی بدولت انسان حیوان سے ممتاز اور انکی انسانیت کا زیور ہین یہ وہ بیش قیمت نادر الوجود ورثہ ہی جو اگلون سے جنھون نے اپنے خون سے اسے متبرک کیا ہی ہمین ملا ہے اسکی خبرداری اور نگہبانی ناپاک آمیزشون سے اُسے بیلوث رکھنا ہمارا سب سے بڑا مقدس فرض ہی اگر ہم لاپرواہی سے کام لیتے۔ تو ہمپر مجرمانہ غفلت کا الزام عائد ہوتا۔ اور امانت مین خیانت ہوتی۔ یہ وہ باتین ہین جنکی آبرو داری کے لیئے نیک نفس اپنی جان پر کھیل گئے۔ یہ وہ مبارک اصول ہین جنکی صداقت پر مسیح۔ انبیا اور سقراط نے اپنے بیش قیمت خون سے مہر لگائی۔ زرتشت وغیرہ نے اپنی مصائب سے مہر کی ہی۔ اس نے جو سے آتی خوفناک قیمت ان انمول اور نایاب جواہرات کے مقابلہ مین معمولی بات ہی۔

جے آر رائے۔ لاہور

# انسان پر تعلیم کا اثر

زمانہ کا اثر مثل اور باتون کے تعلیم پر بھی پڑتا ہی جس زمانہ مین شخصی حکومت کا زور ہو وہان حکومت سے سب کام لیا جاتا ہی اور حکومت کا اثر اسکولون کے نصاب تعلیم پر پڑتا ہی۔ اسکول تو درکنار مذہب پر بھی انھین تحکمانہ خیالات کا اثر نظر آتا ہی اور اُس کا اثر سوسائٹی پر بھی پڑتا ہی۔ بادشاہ کو ظل اللہ سمجھتے ہین۔ اور اُسکے حقوق منجانب اللہ سمجھے جاتے ہین۔ بادشاہ کے احکام پر اعتراض کرنا سخت ممنوع ہی۔ اسی طرح سرداران قبائل کے اختیارات ہین ہر گھر میں باپ کے اختیارات اور بڑے بوڑھون کا ادب و لحاظ رکھا جاتا ہی۔ بچوں کے طرز تعلیم کے طریقہ میں بھی ایسا ہی تحکمانہ برتاؤ ہوتا ہی۔ استادون کا درجہ بہت بڑا سمجھا گیا ہی۔ طالب علم اپنے استاد کو بجائے باپ کے سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی بڑی عزت و تعظیم کرتے ہیں۔ اور اُسکے حکم کی نافرمانی گناہ سمجھتے ہین اس طرز تعلیم کے متعلق خیال ہی کہ اوائل عُمری کے چند سال مین بچون کو مہذب اور تمیزدار بنانے کے لئے استاد اپنی حکومت کو پوری طور پر برتے اور بچون میں فرمان برداری کی عادت ڈالے۔ آغاز شباب تک یہ حکومت قائم رکھی جاتی ہی۔ کئی سال کی تحکمانہ طرز تعلیم مین طالب علم کو بہت ہی فرمان بردار بنا لیا جاتا ہی اور وہ جوان ہو کر بھی اپنی مشکلات کے حل کرنے مین استاد کی امداد کا دست نگر رہا کرتا ہی اور استاد کی راے پر چلتا ہی۔

اس طرز معاشرت مین یہ فائدہ ضرور ہی کہ جب تک بچون کو سوسائٹی کا پورا تجربہ نہ ہو جائے۔ اور اُن مین سمجھ کا مادہ نہ بڑھے۔ یہ نہایت ضروری ہی کہ گھر کے کسی بزرگ کے زیر اثر رہ کر تعلیم حاصل کرین۔ غلام اور رعایا بادشاہ کی فرمان برداری کو اپنا مذہبی فرض سمجھین۔ مگر انسان کو اپنی راے قائم کرنے کی نہ مہارت و جراءت ہوتی ہی اور نہ کسی معاملہ مین وہ اپنی آزادانہ راے قائم کر سکتا ہی۔ وہ ہی لکیر کا فقیر بن جاتا ہی جب اُس کو بچپن ہی سے یہ سکھایا جائے کہ فرمان برداری سب سے اعلی ترین خصلت ہی تو وہ کسی بات پر اپنی آزادانہ راے کیسے قائم کر سکتا ہی۔ اُسکی عقل اور غور و فکر کو محدود کر دیا جاتا ہی۔ جیسا اگلے لوگ کرتے آئے ہین۔ وہ بھی بلا سوچے سمجھے وہی کرتا ہی۔ ایسے شخص سے تابعداری خوب ہوتی ہی۔ وہ فرمان برداری کی مشین بن جاتا ہی۔ مگر کوئی اُسکی ذاتی راے نہین ہوتی۔ نہ اُس مین استقلال کا مادہ ہوتا ہی۔ نہ ایسا شخص اپنے خیالات کو جمع کر کے ترتیب دے سکتا ہی کبھی اِسکی راے پر چلتا ہی کبھی اُسکی راے پر چلتا ہی غرض عجیب کشمکش مین اُسکی زندگی بسر ہوتی ہی۔ نہ وہ خود اپنی

زندگی سکون اور چین سے گذار سکتا ہو، نہ دوسرون کی زندگی چین اور آرام سے گذارنے دیتا ہو۔ اطمینان چین آرام سے زندگی کا گذارنا بھی ایک بہت بڑا فن ہو جو بغیر تجربے کے اور بغیر سیکھے ہوئے نہیں آتا۔

طالب علم کو اگر ہمیشہ بچہ بنا رکھنا منظور ہو تو اس سے بہتر اور کوئی ترکیب نہین ہو کہ اُسے چون و چرا نہ کرنے دے۔ اُس سے ذاتی رائے قائم کرنے کا مادہ مفقود ہو جائے گا۔ جب تک استاد اسکے سامنے بیٹھا ہو یا وہ والدین کی نظرون کے سامنے ہو، اُس وقت تک وہ مرعوب خائف اور مہذب ہو، جہان یہ لوگ اُسکی نگاہون سے اوجھل ہوے۔ پھر سب باتین بالاے طاق ہین۔ ایسی باتون کا اثر بچون پر خطرناک پڑتا ہو وہ ہمیشہ چھڑی کے ذریعہ سے کام کرتا رہتا ہو۔ اور ایسے طالب علم جن کی قوت ارادی کو ڈرا ڈرا کر بالکل زائل کر دیا جاتا ہو اُن کی شخصیت ہمیشہ کے لیے اُن سے خیرباد ہو جاتی ہو۔ کسی نئی بات سوچنے کا اُن مین مادہ ہی نہیں ہوتا۔

جس شخص نے کبھی آزاد ہوا مین سانس نہ لی ہو اُس سے کیا امید ہو سکتی ہو کہ وہ اپنی قوم اور اپنے مُلک کے لیئے کارآمد اور مفید بنے گا اور شخصیت کا اُس مین کیا نام و نشان رہے گا۔

آزادی رائے کو حاصل کرنے کے لیئے یورپ نے بڑی دقت اور دشواری سے خود کو پروٹسٹنٹ بنا کر روم کا تھلک پاپاؤن کے پنجہ سے چھڑایا۔ مگر انیسوین صدی کی سائنس نے اپنی تیز روشنی سے ان کی آنکھون کو بند کر دیا تھا۔ اس بیسوین صدی مین جا کر اب پھر وہ اپنی اصلی حالت پر آ گئے ہین۔ یعنی آزادی راے کی نعمت اُن کو حاصل ہو گئی۔

جمہوری ممالک مین ہر شخص کو اپنی فلاح و بہبودی کی کوشش کرنا ہوتی ہو۔ سب کے اختیارات برابر ہوتے ہین اور مُلک کے تمام باشندے بغیر کسی ترغیب و ترہیب کے اپنی خوشی اور مرضی سے حکومت کے کامون مین حصّہ لیتے ہین۔ اور یہ ضروری بات ہو کہ وہی کام ٹھیک طور پر انجام پا سکتا ہو جس مین کوئی لالچ نہ ہو۔ امریکہ مین جتنے اسکول جاری ہین اُن مین یہ کوشش کی جاتی ہو کہ طالب علم کو شخصیت کا مادہ پیدا کرنے کا موقع دیا جائے۔ وہ خود اپنی ملکی معاملون کو مذہب کے اہم مسائل کو سوچے سمجھے اور اپنی راے قائم کرے اُنکی راے پر بحث مباحثہ کرکے اُس کو صائب الراے بناتے ہین۔

امریکہ کے اسکولون مین تمام استادون کا یہی خیال رہتا ہو کہ محض علم سکھانے کی بہ نسبت بچے کے چال چلن کا سدھارنا اچھا ہو۔ چونکہ تمدن مین ہر چیز کی بنیاد خود مختاری پر رکھی گئی ہو۔ اس لیئے شخصی زندگی کی بنیاد بھی خود مختاری پر ہونا چاہیئے۔ ہر استاد کے لیئے یہ ضروری بات ہو کہ اپنے حکم مین اپنے شاگردون کی راے بھی ضرور شامل

کرے جب طالب علم یہ سمجھ لین گے کہ استاد کا حکم اُن کے فائدے کی چیز ہو تو وہ نہایت خوشی سے اُس حکم کو بجا لائین گے۔

تعلیم کا اصل مقصد یہ ہو کہ کسی شخص مین اُسکے حقوق و فرائض کے خیالات پیدا ہو جائین محض کثیر الحجم کتابون کے لادنے سے کوئی طالب علم عالم نہین ہو سکتا۔ اگر تعلیم سے طالب علم کے چال چلن پر کوئی مفید اور کارآمد اثر نہین پڑا تو ایسی تعلیم بے سود ہو۔ طالب علم زندگی کے اہم مسائل پر کوئی اچھی راے قائم نہین کر سکتا۔ نہ اُس مین شخصیت کا مادہ پیدا ہو سکتا ہو۔

ہر شخص کی زندگی مین ایسے واقعات پیش آتے ہین کہ اُسکو اُن پر ایک راے قائم کرنی پڑتی ہو اور اکثر ایسا ہوتا ہو کہ مدتون کے پُرانے خیالات کو چھوڑ دینا پڑتا ہو اور کسی نئی بات کو شروع کرنا ہوتا ہو۔ اِس تذبذب مین صائب راے قائم کرنا بہت دشوار ہوتا ہو۔ اور جب تک صائب راے قائم نہ کی جائے زندگی کے بہت سے مفید حصّے ادھورے رہ جاتے ہین۔

برسون کے تجربہ سے یہ بات یورپ والون پر ثابت ہو گئی ہو کہ جس تہذیب کی بنیاد تجارت پر رکھی جاتی ہو وہ قابل اعتماد نہین ہو اور ایسی تعلیم جس مین مذہب کا کچھ حصّہ شامل نہ ہو اُس کا اثر طالب علمون پر خراب پڑتا ہو۔

تجارتی تہذیب مین یہ خرابی ہو کہ رقابت اور حسد پیدا ہو جاتا ہو اور سوسائٹی سے محبت کا مادہ زائل ہو جاتا ہو۔ اِن مسائل پر بہت دنون سے غور و خوض کیا جا رہا ہو۔ اور یورپ کے اکثر عالمون نے مان لیا ہو کہ جس سوسائٹی نے حکومت کے پنجہ سے چھوٹ کر آزادی پر کمر باندھ لی تو سائنس کی ترقی نے اوس مین الحاد اور زندقہ کے خیالات پیدا کر دیئے اُس مین دہریت آگئی۔

تجارت کی ترقی نے انسان کو چاندی سونے کی بُت پرستی سکھائی۔ مگر اب مادی خیالات کا زور کم ہوتا جاہو اور بڑے بڑے سائنس دان خدا کے قائل ہو رہے ہین۔

اِن مادی خیالات کے توڑنے کے لیے وسط یورپ کے دو مشہور فلاسفرون نے حصّہ لیا ہو جنکا نام پروفیسر لوکن اور پروفیسر فارسٹر ہو، اگرچہ اِن دونون کا طرز عمل بالکل جُدا گانہ ہو، مگر مقصد ایک ہو کہ سوسائٹی کو بجائے تجارت کے مذہب کی بنیاد پر ڈالا جائے۔ پروفیسر لوکن انسان کی حقیقت پر بحث کرتے ہوے لکھتے ہین کہ:-

"انسان کو انسان بنانے والی شے اُسکے فرائض اور حقوق ہین۔ اور انسان کا جوہر اسی مین نظر آتا ہو

کہ وہ اپنی روحانی قوت سے اپنے نفس امارہ پر غالب آجائے۔ . . . . . . . . . . . . . . . .
جس شخص میں یہ قوت نہو وہ انسان نہیں بلکہ ایک سستے محض ہو۔ . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . محض علمی لیاقت ہونے سے
یہ روحانی قوت انسان میں نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ قوت ارادہ کے درست کرنے سے ہوتی ہو
علم حاصل کرنے سے کوئی شخص عالم نہیں ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کے خمیر میں
روحانی مادہ بھر دیا ہو وہ طرز تعلیم کس کام کی جو اس بات کو نظرانداز کردے
. . . . . . . . . . . . . . . . . . . تعلیم کے معنی یہ نہیں
ہیں کہ بچے کے دماغ پر بہت سی کتابیں لاد دی جائیں۔ اصل تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ قضا و قدر نے جو
خوبیاں اُس بچے کے خمیر میں رکھی ہیں اُن کو ترقی ہو۔ اصل تعلیم اور تربیت کے لیے ان باتوں
کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ کہ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ طالب علم کی روحانی ترقی بھی ہوتی جائے۔
. . . . . . . . . . . . . . . . . . . بچہ کو ایسی تعلیم دی جائے
کہ جب وہ بڑا ہو تو اُس میں سمجھنے کا مادہ ہو اور وہ سوچ سمجھ کر کام کرے۔ ہر معاملہ میں اپنی رائے قائم
رکھے۔ اور مذہب کو بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے (ریفارمس ریویو۔ فروری)

پروفیسر صاحب حکومت اور آزادی دونوں کو ملانا چاہتے ہیں یعنی حکومت والی طرز معاشرت میں جو فرمان برداری اور وفاداری کے اثرات ہیں۔ تہذیب کی آزادی میں جو اچھی رائے قائم کرنے کی خوبی ہو ان دونوں باتوں کو اپنے طرز تعلیم میں ملا رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ انسان مذہب کو چھوڑ دے کیونکہ اُن کو اچھی طرح معلوم ہوگیا ہو کہ انسان میں روحانی قوت موجود ہو۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ انسان آنکھیں بند کرکے لکیر کا فقیر ہوجائے۔ اُن کی یہ کوشش ہو کہ انسان کو اتنی آزادی ہو کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے مذہب کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرے۔ اُسے اتنی آزادی دی جائے کہ وہ آزاد رائے قائم کرے۔ اپنے ارادوں اور اپنی قوتوں پر خود مختار بنے، یعنی عالم بھی ہو اور عامل بھی۔

تحصیل علم کا انھوں نے یہ مقصد رکھا ہو کہ انسان عالم بن کر عامل ہوجائے۔ یہی خیال فارسٹر صاحب کا ہو اور وہ بھی اُن کے ہمخیال ہیں۔

ان دونوں صاحبوں کی طرز تعلیم کو مسٹر ہیپ نے سوئٹزرلینڈ کے ایک اسکول میں خود آزما کر دیکھا۔ وہ

اس شہر کے ایک ایسے اسکول میں ماسٹر مقرر ہوئے جہاں لڑکوں کو خوب زدوکوب کی جاتی تھی اور اُن کو خائف رکھا جاتا تھا کلاس کی یہ حالت تھی کہ جہاں ماسٹر صاحب ایک دو منٹ کے لئے کلاس سے باہر گئے اور لڑکوں نے وہ شور و غل مچانا شروع کیا کہ خدا کی پناہ۔ اس اسکول کے تمام معلم گویا پولس کے افسر تھے۔

ایسے اسکول میں پہونچتے ہی انھوں نے تحکمانہ برتاؤ شروع کیا۔ اُس کا یہ اثر ہوا کہ جب تک یہ درجہ میں بیٹھے رہتے تھے۔ اسی وقت تک اُن کے رعب و داب اور چھڑی کے ڈر سے بچے خاموش بیٹھے رہتے تھے مگر اُن کے باہر جاتے ہی سب لڑکے شور و غل مچانا شروع کر دیتے تھے۔ چونکہ یہ نئے نئے اسکول میں مقرر ہوئے تھے اس لیے امتحاناً اسکول کا سب سے مشکل درجہ اُن کے سپرد کیا گیا تھا تین مہینہ تک یہ پریشان رہے۔ اُنھوں نے بہت لڑکوں کو مارا۔ مگر سوائے اسکے کہ بچوں کو مارنے سے اُن کو بھیا بنا دیا جائے۔ اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر لاچار ہو کر انھوں نے پروفیسر یوکن کے طرز تعلیم کو اختیار کیا۔ مگر جہاں پہلے پہلے حکومت جتائی ہو۔ وہاں آزادی اور خود مختاری دینا بالکل خلاف عقل تھا۔ انھوں نے اپنے درجہ کے طالب علموں کو مہذب بنانے میں جو کوشش کی وہ انھیں کے زبان سے سننے کے قابل ہے:

"میں نے دیکھا اور مجھے اس بات کا پورا پورا تجربہ ہو گیا تھا کہ جسمانی سزا دینے سے بچہ استاد کا دشمن ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ بچوں کو مارنا چھوڑ دیا اور اُن کے گھروں پہ جانا شروع کیا۔ اُن کے والدین سے ملا۔ اُن کے گھر کی حالت سے واقفیت حاصل کی۔ اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوا۔ بچوں کی دلجوئی کی۔ اُن کی علمی مشکلات کو بڑے بھائی کی طرح دور کرنا شروع کیا۔ میں نے بتدریج بچوں کو خود مختار بنانے کی کوشش کی۔ میں جو کچھ حکم دیتا۔ اُس پر بچوں ہی سے بحث کرا دیتا تھا کہ یہ اُن کے فائدے کی بات ہے کہ نہیں۔ کچھ دنوں میں یہ صورت بہت مفید اور کارگر ثابت ہوئی۔ کچھ عرصہ میں مجھے چند منٹ کے لئے اپنا درجہ چھوڑنا پڑا۔ درجہ چھوڑنا تھا کہ درجہ میں غدر برپا ہو گیا۔ دوسرے دن میں نے اس بدتہذیبی کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اگر تم میں سے کوئی ماسٹر ہوتا تو اس حالت کو دیکھ کر کیا کرتا؟ اور جب ماسٹر درجہ سے باہر چلا جائے تو تم کو کیا کرنا چاہئے اس بات پر بچوں میں بہت بحث رہی۔ آخر انھوں نے اپنے آیندہ طرز عمل کے لیے یہ رائے تجویز کی کہ ہمارا

ماسٹر خواہ درجہ مین ہو یا نہ ہو۔ ہم کو خاموشی کے ساتھ اپنا سبق یاد کرنا چاہیئے۔ اِس تجویز کے بعد لڑکون نے کبھی شور نہین کیا۔ اور ان مین شرم و حیا کا بھی مادہ بڑھ چلا۔ ایک سال کے بعد لڑکون نے بطیب خاطر یہ اقرار کر لیا کہ "اب شرارت نہین کرینگے"۔ مین نے بچون کو سمجھایا کہ ان کو مارنے سے خود ان کا بہت بڑا نقصان ہو یعنی جسمانی آزار کے علاوہ اُن سے شرم و حیا زائل ہو جاتی ہو"۔

(پیرنٹس ریویو فروری)

بچون کی عادت درست کرنے کے لیئے اُن مین شرم و حیا کا مادہ بڑھانا چاہیئے۔ اگر یہ مادہ نہین ہو تو انسان بیحیا بنکر جانور سے بھی بدتر ہو جائیگا۔

انسان کی تمام ترقی اُس کی ذاتی کوشش پر منحصر ہین اور تعلیم کا یہ بھی مقصد ہو کہ طالب علم مین ذاتی کوشش کرنے کا مادہ بڑھایا جائے۔ اگر طالب علم کے تمام علمی مشکلات اُستاد کے ذریعہ سے حل ہوتے رہے تو اس کو اپنے دماغ سے محنت لینے کی عادت کبھی نہین پڑے گی۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ اُس کا فائدہ ہو تو وہ خود کوشش کرے۔ اُسی کی چیز اُسی کے کام آئے گی۔ اگر کوئی دوسرا شخص کھانا کھائے تو اُس سے اس کو کیا فائدہ ہوگا۔ اپنا کھایا ہوا کھانا خون اور قوت بڑھائے گا۔ وہ جس قدر ہضم ہو سکے گا اتنا ہی زیادہ مفید ہوگا کوئی شخص اپنی کوشش اور شوق سے جتنا پڑھ سکتا ہو کسی دوسرے کے دباؤ سے اتنا نہین پڑھ سکتا۔ اِس لیئے طالبعلم کی تعلیم و تربیت اِس طریقہ پر ہو کہ اُس مین علمی۔ اخلاقی۔ روحانی قوت ترقی کرے۔ مدارس مین ڈسپلن پیدا کرنے کے لیئے فوجی طرز عمل نہ برتا جائے۔ بچے کے شوق کو لیئے ہوئے اُس سے کام لیا جائے۔

پروفیسر لوکین کی طرز تعلیم مناسب معلوم ہوتی ہو کیونکہ اُنھون نے Liberty اور Authority کی خوبیون کو شیر و شکر کی طرح ملا دیا ہو۔ مسٹر ہیپ نے پروفیسر موصوف کی طرز تعلیم کی پیروی کرکے جو کامیابی حاصل کی ہو وہ قابل تقلید ہو۔

اگر مقامی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مدارس کے استاد پروفیسر لوکین کی طرز تعلیم کی پیروی کرین تو اُنھین بھی مسٹر ہیپ کی طرح ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

قیصر (بھوپال)

# قومی لیڈر

اشعار ذیل حکیم محمد یوسف صاحب نیر متوطن اورنگ آباد ضلع بلند شہر نے ۱۹۱۶ء مین لکھے تھے۔ اس سال کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ مین منعقد ہونے والے تھے اور محمود آباد پارٹی نے ملازمان ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی دعوت دی تھی مگر ارباب علی گڈھ نے نہ صرف اس دعوت کو رد کر دیا بلکہ سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیئے قوم کی رائے عامہ کے خلاف آنریبل میان محمد شفیع صاحب کا انتخاب کیا جنکی رجعت پسندی اور حکومت پرستی ضرب المثل ہو رہی تھی۔

یہ اشعار اُس وقت ہدیہ انجمن ارباب کانفرنس ۱۹۱۶ء کے زیر عنوان الناظر پریس مین ایک ورق پر چھاپ کر جلسہ ہاے کانفرنس و لیگ مین تقسیم کردیے گئے تھے حال ہی مین اسکا ایک نسخہ کاغذات مین نکل آیا ناظرین الناظر کی لطف اندوزی اور خود شاعر کے کلام کی حفاظت کے خیال سے یہان اسکی نقل درج کی جاتی ہے۔

بتاؤن کیا کہ مجھ پر بن گئی اے راز دان کیسی — امانت ہو گئی حق مین مرے بارِ گران کیسی
کیسی کو کیا خبر وہ جکڑا ہوا ہے بند بند اپنا — اسیرِ حرصِ دُنیا کے لیے آزادیان کیسی
اگر سمجھے تو ہم سمجھے یہ گُر الحق مُرّ کا — دروغِ مصلحت آمیز مین ہین خوبیان کیسی
خوشامد کا ثمر اور اُسکی لذت، کیا کہون ہمدم — رہین منتِ احساس ہے میری زبان کیسی
کوئی الزام دے ملت فروشی کا تو دینے دو — وباے عام مین تخصیص کیا وہ حد بندیان کیسی

خمار نشۂ خوابِ گران سے چونکنے والے — یہ ہے کابوس بیداری یہان بیداریان کیسی
بہت مشکل ہے چڑھنا بھینٹ قربانگاہ قومی پر — یہ قبل از مرگ واویلا، یہ آہ و زاریان کیسی
امید چارہ سازی اور پھر مجبور مطلق سے — ہین عقلِ نارسا کی دیکھنا لاچاریان کیسی
سمونا جھوٹ کا سچ مین اگر اب بھی نہ ہم سیکھے — تو ہون دنیا مین جینے کی بھلا تیاریان کیسی
خطاب اور نوکری یا اور ایسی ہی کوئی قوت — نہ ہو گر ہاتھ مین اپنے تو برخورداریان کیسی

ہے بیباک خود عیار اپنی لیڈرون کی حضرت نیر — لباسِ شیر مین کرتے ہین رد بہ بازیان کیسی

# ایرانِ نو

اس زمانہ میں جبکہ دولت برطانیہ اور ایران کے درمیان ایک جدید عہد نامہ پر دستخط ہوئے ہیں اور اُس عہد نامہ کی خامیوں اور کمزوریوں پر خاصی بحث ہو رہی ہے غیر مناسب نہ ہوگا کہ ایران کی تاریخ جدید پر ایک نظر کی جائے۔ تاریخ جدید کو اگر تفصیل سے دیکھنا ہو تو "انقلاب ایران ۱۹۰۵ تا ۱۹۰۹"[1] [illegible] مطبوعہ کیمبرج (سنہ ۱۹۱۰ء) میں واقعات جدیدہ کا بہت تفصیلی حال مل سکتا ہے۔ دوسری کتاب جو ایران سے دلچسپی رکھنے والے کو کافی واقعات سے آگاہ کر سکتی ہے۔ وہ نظام الملک کرمانی کی تاریخ بیداری ایرانیان ہے لیکن اِس کتاب کا مقدمہ (۲۷۰ صفحہ) پہلی جلد (۵۵۳ صفحہ) دوسری جلد (۲۴۰ صفحہ) اب تک طبع ہو چکے ہیں (سنہ ۱۹۱۲ء) دوسری جلد کے اختتام پر بھی ابھی جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کے بعد کے واقعات کا ذکر نہیں اِس لیے اِس کتاب میں ۵ راگست سنہ ۱۹۰۶ء کو مظفر الدین شاہ قاچار کے مشروطہ دینے کا ذکر نہیں ہوا اور نہ مجلس قومی کے افتتاح (۷ راکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء) کے واقعات درج ہیں۔ البتہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کے پیشتر کے حالات کے لیئے یہ تاریخ نہایت ہی بیش قیمت معلومات مہیا کرتی ہے۔ بہت سے ایسے فرامین اور حکم ناموں کی نقلیں اِس کتاب میں موجود ہیں۔ جن کا کسی دوسرے ذریعہ سے ملنا محال ہے۔

ایران[2] کی تاریخ کی ابتدا سے سنہ ۱۹۰۶ء تک ایران میں عملاً شخصیت کا دور تھا۔

سنہ ۱۸۴۸ء کا سال ایک یادگار سال ہے جس نے دوسرے بہت سے دوسرے ملکوں کے ساتھ ایران میں بھی بیداری کے آثار پیدا کیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شاہ کے زمانہ حکومت کے آخری اور ناصر الدین شاہ کے ابتدائی ایام میں بابیوں نے خاندانِ قاچار کی حکومت کے بقا کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ بابی تحریک گو بظاہر ایک مذہبی تحریک تھی لیکن اُسکی تہ میں سیاسی اغراض کا پرتو نظر آتا تھا۔ اُسی زمانہ میں ایران کے بہترین وزرا میں سے ایک یعنی مرزا تقی خان امیر کبیر کے ہاتھ میں قلمدان وزارت تھا اور گو اُس نے بابی تحریک کا

[1] مصنفہ پروفیسر براؤن۔

[2] اس دور کا اجمالی حال مسٹر آر۔ جی۔ واٹسن Watson کی کتاب History of Persia from the beginning of the 19th Century to the year 1858. میں مل سکتا ہے۔

نہایت سختی سے قلع قمع کیا تاہم اُنکی غیر مفتوح ہمت استقلال اور دور اندیشانہ سیاسی نظر تھی جس نے موزعین مشروطہ کو مجبور کیا۔ کہ اسے اس عظیم الشان عمارت کا بانی قرار دیں جو اُس کے نتیجہ "مشروطہ ایران" کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی لیکن وہ استبداد کا زمانہ تھا جس کو "استبداد کبیر" کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو ۲۰۰۰ سال ایران میں رہا۔ اس کو "استبداد کبیر" اس لیے کہا گیا کہ ۲۳ جون ۱۹۰۸ء سے ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء تک کا زمانہ "استبداد صغیر" کہا جاتا ہے۔

تاریخ ایران کے وہ ایام جن میں حصولِ مشروطہ کی کوشش جاری تھی۔ ذیل کے پانچ دوروں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ ایام ابتدائی۔

۲۔ پہلا دور آئینی (۵ اگست ۱۹۰۶ء سے ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء تک یا پہلی مجلس (ایرانی پارلیمنٹ) کا دور (۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء تا ۲۳ جون ۱۹۰۸ء)

۳۔ استبدادِ صغیر: اس زمانہ میں حکومت ملی باقی نہ تھی اور محمد علی سابق شاہ ایران نے دوبارہ خود مختارانہ طرز حکومت جاری کیا (۲۳ جون ۱۹۰۸ء۔ ۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء)

۴۔ دوسرا دور آئینی (۱۶ جولائی ۱۹۰۹ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء تک) جس کا خاتمہ روسی الٹیمٹم (۱۲ نومبر و ۲۹ نومبر) نے کیا۔ مسٹر مارگن شسٹر جو وزیر مال تھے نکالے گئے۔ روسیوں نے شمالی ایران پر حملہ کیا۔ اور اپنے نمک خواروں سے مل کر تبریز اور رشت میں مظالم و خونریزی کی (دسمبر ۱۹۱۱ء اور جنوری ۱۹۱۲ء)

۵۔ زمانۂ موجودہ نہ تو دور استبداد ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ عملاً حکومت ملی ہی موجود ہے۔

## ۱۔ ایام ابتدائی

اس دور کی ابتدا کی کوئی خاص تاریخ نہیں مقرر کی جا سکتی لیکن اس کو دو حصوں میں بآسانی تقسیم کر سکتے ہیں (۱) زمانۂ تعلیم (۲) زمانہ جبکہ جناب عالی بر اثر مظالم اور خود مختارانہ احکامات سے عاجز ہو کر کھلم کھلا مخالف ہونے لگے۔

زمانۂ تعلیم میں دو شخص تھے جنھوں نے حریت کی روح ایرانیوں میں پھونک دی اوّل سید جمال الدین الافغان (۱۸۳۸-۹۷ء) اور دوسرے پرنس ملکوم خان نظام الدولہ (۱۸۳۳-۱۹۰۸) اول الذکر نے اپنا کام "مشرق قریبہ"

میں ۱۸۷۱ء سے شروع کیا جب انھوں نے مصر و قسطنطنیہ کا پہلا سفر کیا ہو۔ اُن کی تحریک نے ایران میں عمل کی صورت ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیان اختیار کی اور اُسکے ساتھ ہی وہ بہت ذلت سے ایران سے نکالے گئے۔ وہ جانے کو تو ایران سے چلے گئے لیکن تا دمِ مرگ ایران کا خیال اُن کے دل سے نہ نکلا یکم مئی ۱۸۹۶ء کو سید کے ایک پیرو مرزا رضا کرمانی نے ناصر الدین شاہ کو قتل کیا جس نے سید کے خلاف ایرانی خاندان شاہی میں اور بھی آگ لگا دی۔

پرنس ملکوم خان کا ماہوار رسالہ "قانون" لوگون کی راے میں آئینی تحریک کی بنیاد رکھنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ ۲۰ر فروری ۱۸۹۰ء سے جاری ہوا۔ اور قریب ساڑھے تین سال جاری رہا۔ اور کل اہم نمبر نکلے تمباکو نوشی کے سلسلہ میں ۱۸۹۱ء میں ایران میں بلوہ ہوا۔ اور اس بلوہ کو انقلاب کا پیش خیمہ تصور کرنا چاہیئے۔ اصل تحریک کی ابتدا دسمبر ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہو۔ خاص واقعات درج ہیں۔

## سنہ ۱۹۰۵ء

۱۱ر دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء علاء الدولہ نے عین الدولہ کے اشارہ پر کچھ سیدون اور سوداگرون کو اس لیے سزا دی کہ انھون نے شکر کی قیمت میں اضافہ کر دیا تھا لیکن سزا دہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار بند ہو گئے۔ اور ایک عام جلسہ اِس حرکت کے خلاف آواز بلند کرنے کو مسجدِ شاہ میں ہوا۔

۱۲ر دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء۔ ملاؤن، طالب علمون، سوداگرون کی دو ہزار کی جماعت سید محمد طباطبائی اور سید عبداللہ بہبہانی کے ساتھ طہران چھوڑ کر شاہ عبدالعظیم کے مقبرہ پر صداے احتجاج بلند کرنے کو اقامت پذیر ہوئی۔ یہ "ہجرتِ صغریٰ" کہلاتی ہو۔

## سنہ ۱۹۰۶ء

۱۲ر جنوری۔ شاہ اور وزرا کے درمیان مسلسل نامہ و پیام کے بعد مہاجرین کو شاہ کا دستخطی فرمان ملا۔ جو اسی دن عوام کی آگاہی کے لیئے مسجد میں پڑھا گیا۔ "عدالت خانہ" کے قائم کیئے جانیکا وعدہ کیا گیا۔ عین الدولہ اور علاء الدولہ معزول کیئے گئے۔ اور بہت سے مطالبات جو عوام کی طرف سے علماء اور ملاؤن نے کیئے منظور کئے گئے۔ اور اس دن بقول صاحب تاریخ بیداری ایرانیان پہلی بار سرزمین ایران میں "زندہ باد ملت ایران" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ طہران میں شخصیت پر جمہوریت کی فتح کی خوشی میں اُسی دن روشنی کی گئی۔

۱۷ر جنوری۔ مرزا حسن رشدیہ مجد الاسلام کرمانی اور مرزا آقا اصفہانی قلات کو جلاوطن کئے گئے۔

۲۱ جون سپاہیوں نے ایک لیڈر کو جسے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا تھا چھڑانے کی کامیاب کوشش میں پندرہ آدمی مع سید حسین اور عبدالمجید کے مارے گئے۔ عوام کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ موجودہ حقوق کے معاملہ میں انھیں دھوکا دیا جا رہا ہو لیکن گورنمنٹ نے اس بے چینی کا نہایت ہی سختی سے مقابلہ کیا۔

۶ جولائی سید محمد طباطبائی نے بہت بڑے مجمع میں وعظ کہا اور موجودہ مظالم اور بد انتظامیوں کی برائیاں کیں اور "عدالت خانہ" کی سخت ضرورت جتائی۔

جولائی۔ طلبا اور سوداگروں کی بہت بڑی تعداد مع بڑے بڑے علماء کے طہران چھوڑ کر قم کے متبرک شہر میں جا بسے۔ اس کو "ہجرت کبری" کہتے ہیں۔ اسی درمیان میں سوداگروں اور دکانداروں کی ایک جماعت برٹش قونصل مسٹر گرانٹ ڈف کی اجازت سے برٹش قنصل خانہ واقع طہران میں پناہ گزین ہوئی جنکی تعداد بڑھتے بڑھتے تیرہ اور ۱۴ ہزار کے درمیان جا پہونچی۔

۵ اگست۔ مظفر الدین شاہ آخر کار مجبور ہوئے اور مشروطہ مجلس (پارلیمنٹ) عطا کی گئی۔ عین الدولہ معزول کیا گیا۔ اور مقتول سیدوں کے اعزا کی مدد کا وعدہ کیا گیا۔ چند ہی روز بعد اس دن کی خوشی منائی گئی۔ بس کو "فتح ملی" کے نام سے پکارا جاتا ہو۔ اسلامی حساب سے یہ واقعہ ۱۴ جمادی الثانی کو ہوا۔ اور دوسرے سال اسی تاریخ کو (۲۵ جولائی ۱۹۰۷ء) بہت ہی تزک و احتشام سے "جشن ملی" کے نام سے اس دن خوشی منائی گئی۔

## ۲۔ مشروطہ اول

(۵ اگست ۱۹۰۶ء سے ۲۳ جون ۱۹۰۸ء تک)

۱۹ اگست۔ مجتہدین عظام کی موجودگی میں رسم افتتاح مجلس ادا کی گئی اور وہ تین دن تک شاہ کے مہمان رہے۔

۹ ستمبر قانون انتخاب جاری ہوا۔

۱۸-۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ اہل تبریز کی بہت بڑی تعداد محمد علی مرزا ولیعہد کے مظالم سے تنگ آکر برٹش قنصل خانہ میں پناہ گزین ہوئی۔

۷ اکتوبر۔ فصیح الدولہ کی زیر صدارت مجلس کا پہلا جلسہ ہوا۔

۲۳ نومبر۔ اینگلو رشین لون تعدادی ۴ لاکھ پونڈ کے لینے سے مجلس نے انکار کر دیا۔

۲۵ رنومبر۔ اخبار "مجلس" جاری ہوا۔

۲۷ دسمبر۔ اخبار "ندائے وطن" جاری ہوا۔

## ۱۹۰۷ء

۸ رجنوری۔ مظفر الدین شاہ کا انتقال۔

۱۹ رجنوری۔ محمد علی شاہ کی تخت نشینی ہوئی لیکن نہ مجلس کو کسی قسم کی باقاعدہ اطلاع دی گئی اور نہ کوئی ممبر جلسۂ تاجپوشی میں مدعو کیا گیا۔

۷ رفروری۔ طہران میں وکلائے تبریز کی آمد۔ وکلا میں ایک سید تقی زادہ بھی تھے جن کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

۱۰ رفروری۔ مجلس نے بادشاہ کو ایم ناس کی معزولی پر مجبور کیا جو بلجیم کا رہنے والا اور محکمہ محصولات کا افسر اعلیٰ تھا۔

۱۷ رمارچ۔ مشیر الدولہ نے وزارت سے استعفا دیا۔

۲۶۔ اپریل۔ امین السلطان یا اتابک اعظم وزارت کے لئے بلائے گئے جس کو انھوں نے منظور کیا۔

۲۹۔ اپریل "حبل المتین" طہران سے شایع ہونا شروع ہوا۔

مئی ۱۹۰۷ء۔ رحیم خان نے اپنے لڑکے کی مدد سے ایک سازش کی جسکا منشا یہ تھا کہ تبریز میں بےچینی پیدا کی جائے۔ اور سرغنا مشروطین کو قتل کیا جائے۔ خیال تھا کہ خود محمد علی شاہ پردہ کے پیچھے سے ان تپلیون کو حرکت دے رہا تھا۔

۲۹ رمئی۔ شاہ کے یوم ولادت کی خوشی میں شہر میں آراستگی ہو رہی تھی لیکن لوگوں نے تمام ساز و سامان درہم و برہم کرنا شروع کیا اور دوبارہ نہ لگانے دیا جب تک کہ بادشاہ نے رحیم خان کو عدالت عالیہ Ministry of Justice کے سپرد نہ کردیا۔

۳۰۔ مئی "صور اسرافیل" ہفتہ وار جاری ہوا۔

جون شاہ کے بھائی سالار الدولہ نے ہمدان میں بلوہ کر دیا۔ اس کو نہاوند کے تاریخی میدان جنگ میں شکست دی گئی۔ اور اُس نے اس شرط پر اطاعت اختیار کی کہ اسکی جان خطرے میں نہو۔ ۲۲ رجون کو بادشاہ

کے توام مقام کے سامنے اُس کو ہتھیار رکھنا پڑے

۲۵- جولائی - حصول مشروطہ کی خوشی مین جشن ملّی منایا گیا۔

۳۱- اگست - انیگلو رشین اگریمنٹ پر دستخط ہوے اور امین السلطان یا اتابک اعظم کو تبریز کے ایک صراف عباس آقا نے جبکہ وہ مجلس سے جارہے تھے گولی ماری - نصف گھنٹہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا - اور قاتل نے خود کشی کرلی۔

۴ ستمبر - سر سسل اسپرنگ رائس ([illegible]) کا مشہور میمورینڈم (یادداشت) انیگلو رشین اگریمنٹ کے خلاف ایرانیون کی بیچینی کو رفع کرنے کی غرض سے وزیر خارجۂ ایران کے پاس بھیجا گیا اور دس دن بعد "حبل المتین" مین شائع ہوا۔

۱۰ ستمبر - احتشام السلطنت مجلس کے صدر منتخب ہوے۔

۱۳ ستمبر - نصراللہ خان مشیر الدولہ نے انتقال کیا اور سعداللہ وزیر خارجہ بنائے گئے۔

یکم اکتوبر - شاہزادگان ایران اور امراے دربار نے مجلس مین آکر مشروطہ کی طرفداری کی قسم کھائی

۲- اکتوبر - سعداللہ مستعفی ہوے اور نئی وزارت ناصر الملک کی زیر صدارت بنائی گئی - یہ وزارت بھی ۱۴- دسمبر کو مستعفی ہوگئی۔

۱۶- اکتوبر - عباس آقا - امین السلطان کے قاتل کا چہلم نہایت جوش و خروش سے اُس کے طرفدارون نے منایا۔

۶- نومبر - اخبار "روح القدس" نے ایک سخت اور تہدید آمیز مضمون شاہ کو مخاطب کرکے لکھا اسلیئے مجلس کے حکم سے ضبط کیا گیا۔

۱۲- نومبر - شاہ محمد علی مجلس مین آیا اور پھر مشروطہ کی طرفداری کی قسم کھائی۔

۱۵- دسمبر - واقعۂ میدان توپ خانہ "جسمین شاہ کے مقرر کردہ بدمعاشون نے خلاف قانون افعال کی ابتدا کی - ناصر الملک کی گرفتاری اور شاہ کی ناصر الملک کو تباہ و برباد کردینے کی دھمکی لیکن برطانوی سفیر کی مداخلت سے معاملہ طول نہ کھینچ سکا - دوسرے ہی دن ناصر الملک نے یورپ جانے کی غرض سے ایران چھوڑ دیا۔

۲۲- دسمبر - مجلس کی فتح اور شاہ کی شکست - نظام السلطنت نے نئی وزارت بنائی اور ظل السلطان کو

طہران چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔

## ۱۹۰۸ء

فروری۔ شاہ پر بم چلایا گیا لیکن ناکامی ہوئی۔

اپریل۔ احتشام السلطنت نے مجلس کی صدارت سے استعفا دیا اور ممتاز الدولہ صدر بنائے گئے بہت سے مخالفین مشروطہ جنہوں نے گذشتہ دسمبر مین خلاف قانون کارروائی کی تھی۔ یا آتش پرست فریدون کے قتل مین شریک تھے جلاوطن کیے گئے۔ جن مین سے خاص منیع حضرت اور مقتدر نظام تھے۔

مئی۔ شاہ اور مجلس مین کشیدگی شروع ہوئی۔

۲-جون۔ روسی وزیر M. De Hartwig اور انگریزی قونصل مسٹر مارلنگ نے شاہ کی طرفداری مین تہدید آمیز مداخلت کی۔

۴-جون۔ ایرانی کاسکون کے ہمراہ جو ایک روسی کاسک کے زیرکمان تھے۔ شاہ طہران سے بھاگ کر باغ شاہ مین پناہ گزین ہوا۔

۵-جون۔ چند امراء شاہ کے بلانے پر باغ شاہ گئے لیکن وہ کرسے گرفتار کر لیے گئے۔

۱۱ جون۔ شاہ نے مارشل لا کا اعلان کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ لوگ جو مسجد سپہ سالار مین جمع ہین منتشر نہون گے تو گولہ باری کا حکم دے دیا جائیگا۔

۱۳-جون۔ شاہ نے آٹھ ہر دلعزیز بہی خواہان ملک کے نکالے جانے مطابع کو اپنے تحت مین لانے اور قومی والنیٹرون کے ہتھیار رکھانے کا مطالبہ کیا۔

۲۳-جون "توپ بندی مجلس" یعنی مجلس پر گولہ باری "ضربہ حکومت" یا "واقعہ ارتجاعیہ" ( Reactionary ... ) روسی برگیڈ کے افسرون کی عملی مدد سے ہوا۔ عوام کے کئی ہر دلعزیز لیڈر گرفتار کئے گئے۔ اور باغ شاہ مین شل قیدیون کے شاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ ان مین سے ایک حاجی مرزا ابراہیم آقا مار دے گئے۔

۲۴-جون مرزا جہانگیر خان۔ اڈیٹر "صور اسرافیل" اور مشہور مقرر "ملک المتکلمین" کو باغ شاہ مین پھانسی دی گئی اور کچھ قوم پرستون نے جن کو جان کا خوف تھا انگریزی سفارت خانہ مین پناہ لی۔ ان لوگون کے مکانات لوٹے گئے۔ شاہ جن کے خلاف تھا جن مین شاہ کے چچا ظل السلطان اور اُسکے چچا زاد بھائی

جلال الدولہ بھی تھے۔ اور کرنل ملیا خاں [illegible] کو ان کا فوجی گورنر مقرر کیا گیا۔
اس دور سے کے بعد [illegible] ہوئی ہے جس میں [illegible] اُنکے ساتھیوں نے روس کی
مدد سے بہت کچھ مظالم [illegible] افغانستان کی تفصیل [illegible] شدہ [illegible]

(باقی آئندہ) یوسف الزمان (آسیونی)

## غزل

ہم خموشی میں مری پنہاں مرے غم کی کہانی ہے
زبانِ قصۂ حسرت زبانِ بے زبانی ہے

اُدھر وہ کم نگاہی ہے اِدھر یہ بے زبانی ہے
ابھی محفوظ حسن و عشق کا رازِ نہانی ہے

ترے جلوے سے ہوں سامانِ عیش تجھ کو عشرت
تری یک یک ادا وابستۂ سیلابِ جوانی ہے

رکابِ اُس شہسوارِ ناز کی چھوئے کہاں قدرت
غبارِ کشتۂ حسرت کو درد ناتوانی ہے

قریبِ امتحانِ عشق آخر کب تک اسے ظالم
ترے انداز سے ثابت وفا کو کچھ بدگمانی ہے

خدا جانے تلا ہی کیوں ہے ایشاد کرنے پر
وہ بت جس کی ادا دل کو نوید شادمانی ہے

فریب دورانِ دنیا کا نہ کھانا اسے غافل
وہی ہے زندگانی جو مرادِ زندگانی ہے

تغافل کی ادا مانا کہ ہے صبر آزما لیکن
نگاہِ بے محابا اک بلائے ناگہانی ہے

محبت سے نہیں انکار لیکن اس کو کیا کہیے
میں اُن سے بدگماں ہوں انکو مجھ پر بدگمانی ہے

گرفتاری میں ہر دم دیکھتا ہوں خوابِ آزادی
قفس میں طاقتِ پرواز حسرت پر فشانی ہے

[illegible] میں وہ صدمے جو اٹھانے تھے قابل
فراقِ یار میں جیتا ہوں میری سخت جانی ہے

خبر لی ہے ضرورت کی گھڑی میں تیرے خنجر نے
گلے سے کیوں نہ لپٹا لوں کہ یارِ جانی ہے

ہم اپنے گوشۂ خلوت میں رہتے ہیں مگن ہر دم
تصور ہے کسی کا اور عیشِ جاودانی ہے

مری افسردہ طبعی کا ہوا ہے خاص کر باعث
وہ احساسِ طرب جو [illegible] شادمانی ہے

ہمارے عقدۂ مشکل کو مژدہ ہے کشائش کا
کہ اُس تیغِ ابرو کو خیالِ مہربانی ہے

مجھے بھی تھی بڑی جلدی [illegible] اک اس لئے قاتل
کہ خنجر میں ترے عمرِ رواں کی سی روانی ہے

ہمارے ریختے میں فارسی کی شان ہے وحشت
کہیں ترکیب عربی ہے کہیں طرزِ فغانی ہے

کلکتہ — رضا علی وحشت

# اسلام مین کوئی فرقہ نہین

مولانا محمد عبدالغفور صاحب عابدی حیدرآبادی نے ایک رسالہ اہل القبلہ لکھا ہو جسمین یہ ثابت کیا ہو کہ کفر یا کافر بنانے کی جو آجکل گرم بازاری ہو یہ صرف اسلامی سرد مہری کی دلیل ہو ورنہ اسلام کا فر بنانے مین بہت ہی محتاط ہو۔ اسلام دنیا مین اس واسطے نہین آیا کہ کفر کی تائید کرے بلکہ اس واسطے کہ دنیا والون کو دائرہ اسلام مین لائے۔

جب قرآن مجید مین کسی فرقہ کا نام نہین لیا گیا اور مسلمانون کو ان جداگانہ نامون سے یاد نہین کیا گیا تو پھر یہ کہنا کہ اسلام مین فرقے یا فرقہ بندی ہو ایک غیر صحیح بات ہو۔ اسلام کی اصولی اور مقدم باتین کیا ہین۔

(الف) خدا۔ اور خدا کی وحدت۔

(ب) حضرت محمد صلعم کی نبوت کا اعتراف اور انھین خاتم النبیین سمجھنا۔

(ج) قرآن مجید کو خدا کا کلام سمجھنا۔

یہ تین باتین مسلمان بننے کے واسطے اصولی ہین ان کے سوا اور جسقدر امور ہین وہ یا تو ان ہی کے تحت جداگانہ تعبیرات ہین۔ اور یا فروعات مین داخل ہین جو مسلمان یہ باتین مان کر اسلام مین داخل ہوتا ہو وہ مسلمان ہو تعبیرات جداگانہ اور فروعات کے اختلافات کی وجہ سے اِن پر مسلمان ہونے کا انکار نہین ہو سکتا جب قرآن مجید صرف سلام علیکم کہنے سے بمصداق " ولا تقولوا لمن القی علیکم السلام لست مومنا " مسلمان سمجھا جاتا ہو۔

(ترجمہ) جو شخص تم کو السلام علیکم کہے تو تم کو کوئی حق نہین ہو کہ تم اُس کو مومن نہ سمجھو)

تو کسطرح مسلمانون کو باوجود تصدیق امور بالا کے کافر قرار دیا جا سکتا ہو۔ ممکن ہو کہ کوئی صاحب اس آیت کی کچھ اور تاویل نکالین اور صورت نکالین مگر اسلام اور قرآن مجید کا تو یہی منشا ہو کہ جو شخص مسلمان ہو کر تمھین سلام علیکم کہتا ہو چاہیے جو ہو تم اُسے دائرہ اسلام مین ہی جانو۔

یہ ہوتا ہی ہو جب ہمین کوئی آکر سلام علیکم کہتا ہو تو بغیر اسکے کہ ہم اس سے اُسکے عقیدہ اور فرقہ کی بابت

دریافت کریں فوراً اُسے مسلمان ہی سمجھ لیتے ہیں۔ گویا یہ آیت عملی رنگ میں شروع ہی سے اپنا اثر دکھا رہی ہے اُسکے مقابلہ میں آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی شخص صدقِ دل سے لا الٰہ الا اللہ کہے اور رسالت کی نبوت کا اعتراف کرے تو اُس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی"۔

ایک شخص خدا کی وحدت کا معترف ہے شرک نہیں کرتا اور رسول کی رسالت کا بھی معترف اور قائل ہے تو اُس کا یا قرار ہمیں یہ کہنے کی جرأت نہیں دلاتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے کافر یا مرتد ہے ہمیں کیا حق ہے کہ اُس شخص کو جو زبان سے خود کو ان باتوں کا مصدق کہتا ہے اور مسلمان بنتا ہے خواہ مخواہ کافر قرار دیں۔ اگر وہ بعض فروعات میں اختلاف کرتا یا ان کی کوئی اور تعبیر کرتا ہے تو اس وجہ سے دائرہ اسلام سے کیسے خارج ہو سکتا ہے۔ اگر ہم خدا۔ محمدؐ اور قرآن کو مان کر بھی کافر ہو سکتے ہیں تو ہوں ایسا کافر ہی سچے یہ کفر ہمارے واسطے سو ایمان سے اچھا ہے۔

بیشک حضرت نے فرمایا ہے کہ میری امت میں ۷۳ فرقے ہوں گے۔ یہ حدیث درست ہے اس پر بھی ہم کہیں گے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ اسلام میں اصلی حیثیت سے (۷۳) فرقے ہیں۔ بلکہ یہ فروعاتی جہت اور تسمیہ یا نسبت کی وجہ سے (۷۳) فرقے ہوں گے۔ ایک شہر میں جدا جدا صدہا گھر ہوتے ہیں اور ایک ہی گھر میں بسنے والوں کے دروازے بھی اکثر جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس قدر اختلاف ہونے کے بھی اُسے ایک ہی شہر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ سب کی ایک ہی شہر میں سکونت ہے اور سب کی زندگی اُسی شہر میں متدار ہوتی ہے قرآن مجید میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"تمہاری کنبے اور قومیں صرف شناخت اور تعارف کا ذریعہ ہیں" مطلب اس کا یہ کہ ورنہ تم ایک ہی نسل سے ہو جس طرح انسان باوجود تمام قسم کی غلطیوں اور لغزشوں کے بھی حسبِ فی انسانیت سے خارج نہیں ہو سکتا اس طرح کوئی کلمہ گو اور اہل قبلہ باوجود مختلف فروعاتی اجتہادات اور تعبیرات کے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ظرف ایسا تنگ نہیں کہ اس میں آیا ہوا کوئی شخص آسانی نکل سکے۔ اُن سب جماعتوں اور گروہوں کی باتیں جو اسوقت مختلف اسلامی فرقوں سے نامزد ہیں ایک بڑی غرض مشترک ہو یا ایک جبل جس کے ساتھ سب فرقے باوجود تفریق کے بھی متمسک ہیں وہ کون سی رسی ہے؟

- محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اسلام اور قرآن مجید۔

اس رسی کا ایک سرا خدا ہے اور دوسرا سرا قرآن مجید ہے اور وسط ان دونوں کی ذات رسول ہے بمصداق
مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ اطاعت رسول مستلزم ہے اطاعت خدا کی
جو شخص صرف خدا ہی کو مانتا ہے اور رسول کو نہیں مانتا وہ بھی مسلمان نہیں ہے کیونکہ محمد صلعم کی اطاعت
اسلام میں لازمی ہے۔

جب ایک شخص خود کو مسلمان کہتا اور رسول اسلام کی بڑی سے بڑی اہم کوئی کو اپنی اعتقاد کی زنجیر کی
کڑیوں میں مقدم رکھتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یا مختلف تاویلات کے زرغے میں لاکر اسے اسلام
سے خارج کرنے کی کوشش کریں اور زور لگا کر اُسے اسلام سے نکال دیتے ہیں۔ تو برائے وصل کردن
آمدی نہ برائے فصل۔

اختلاف خیالات کی وجہ سے انسانی جماعتوں میں ہمیشہ دھڑے بندیاں ہو جاتی ہیں یا ہوتی رہتی ہیں
کیا دیگر علمی اور کاروباری اسکولوں میں دھڑے بندیاں یا فرقہ بندی نہیں ہے۔ یہ تمام دھڑے بندیاں
اور فرقے چند تعبیرات کے تحت نشو و نما پاتے ہیں اور پاتے رہیں گے۔ لیکن اگر ان میں اصولاً اتحاد ہو تو کوئی شخص
اس مرکز اصلی سے ہٹایا نہیں جا سکتا جو ان سب کا ایک اصلی مرکز ہے۔ سب مسلمانوں کا اصلی مرکز کون سا ہے
حضرت رسول کریم صلعم اور قرآن مجید۔

جو اس مرکز پر ٹھہرنا نہیں چاہتا وہ بیشک کافر ہے اور جو شخص باوجود چند در چند تعبیرات ہی کے
نہیں بلکہ چند در چند اخلاقی کمزوریوں کے بھی اس مرکز سے ہٹتا نہیں اور اس ذات اقدس کا نام لیتا ہے اور ۱
اس کے لیے سچے دل سے عقیدتمند ہو اس کو کون اس مرکز سے دور کر سکتا ہے

کیا ہم محمد صلعم اور قرآن کو مان کر بھی کافر ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اس صورت میں اور اس عقیدت سے بھی
کافر ہو سکتے ہیں تو ہوتے۔ وہ قرآن مجید میں مولائے کریم فرماتے ہیں۔

مثلاً محمد تو جن میں ہو گا اُن پر عذاب نہیں ہو گا۔ کیا محمد صلعم ہم میں نہیں ہیں یا ہم اُنھیں اپنے
آپ میں نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہم محروم ہیں اور اگر وہ ہم میں ہیں تو ہم اُن کے ہوتے کبھی کافر نہیں ہو سکتے
اور نہ ہمیں کوئی کافر بنا سکتا ہے

ہوں مخاطب لا تخف کا مجھ کو اے واعظ نہ چھیڑ میری توبہ کا سبب بنا ہے میرا شیخ زمانہ تیرا ڈر

قرآن مجید میں تو مولائے کریم فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ سے محبت چاہتا ہے وہ میرے رسول سے محبت کرے۔

گویا رسول کی محبت مستلزم محبت خدا ہے اور ہم انھیں مان کر بھی کافر کے کافر ہی رہے یہ تو دور از قیاس بات ہے جب یہ بھی کہا گیا ہو کہ "تکفیر اہل القبلۃ کفر" تو پھر کس دلیل سے ہم ایک دوسرے کو کافر کہہ سکتے ہیں اگر بعض اشخاص کی چند تعبیرات انوکھی ہیں تو آخر وہ اجتہادات اور تعبیرات ہی ہیں اسلام سے تو ایسے لوگ بھی دور نہیں ہیں۔ خدائے قدیر فرماتے ہیں تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم اس کلمہ کا بڑا جزو ذات رسول اور قرآن مجید ہے اور خدا۔

یہ باتیں مان کر ہم کبھی کافر نہیں ہو سکتے۔ ہاں بعض تعبیرات کے تحت خاطی یا گنہگار ہو جائیں تو یہ ایک دوسری بات ہے یہ تین باتیں سب اسلامی فرقے مانتے ہیں۔ ہاں آکر سب ایک ہی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں جیسے ایک فوج کے پیادے سوار باوجود اختلافات خیالات اور شکل و صورت کے بھی ایک ہی علم اور ایک ہی کمان افسر و جنرل کے تحت ہوتے ہیں۔ جتنے سپاہی اور عہدہ دار پلٹن نمبر (۳۳) میں ہونگے سب کے سب اس پلٹن میں شمار ہوں گے چاہے ہندو ہوں اور چاہے مسلمان۔ یہودی اور عیسائی یہی کیفیت سمجھو مسلمانوں کے جدا جدا گروہوں کے ناموں اور فرقوں کی وہ سب کے سب رسول کی پلٹن میں بھرتی ہیں اور اس پلٹن کا نام محمدی پلٹن ہے جب تک ہم اس پلٹن میں اور اس علم کے نیچے رہیں گے باوجود چند در چند اختلافات کے بھی ہمیں کوئی کافر نہیں بنا سکتا۔ غور کرو یہ زمانہ جو مسلمانوں کے واسطے عبرت اور ندامت کا زمانہ ہے یہ زمانہ جس میں مسلمان ہر طرح کی پستی میں جا رہے ہیں۔ یہ زمانہ جو تنازع للبقا کی صدا دے رہا ہے یہ زمانہ جو مسلمانوں کو بے اقبالی اور ادبار کی چکی میں پیس رہا ہے کیا اسوقت تکفیر کی ضرورت ہے۔ اور کیا یہ وقت باہمی منافقت کا ہے سوچو اور سمجھو دوستو۔

پہنچے گا وہی جو کہ غیور ہوگا — وگرنہ دست زمان چور ہوگا۔

میری اب تک یہی رائے ہے کہ علمائے کرام کی زبان میں تاثیر ہے اور صوفیائے عظام روحانی کشش رکھتے ہیں کیا اُن کے ہوتے اسلام میں یہ افتراق ہی پڑی رہے گی اور کیا مسلمان کلمہ گو ایک دوسرے کی توہین میں ان کو کافر بناتے جائیں گے اور اجتہادی اغلاط کی وجہ سے مسلمانوں پر کفر کا باب کھولا جائے گا۔

کلمہ گو ہو کر بھی جب کافر ہوئے — فائدہ کیا کلمہ گوئی کا ہوا
نام لیوا ہم رسول اللہ کے ہیں — جن کا نام اقدس محمد مصطفے

وہ حدودِ کفر سے خارج ہوا کلمہ جس نے اِک دفعہ بھی پڑھ لیا
مان کر احمدؐ کو بھی کافر رہے مفتی تیری عقل کو کیا ہو گیا
ہین مسلمان اہلِ قبلہ سب کے سب کلمہ گو کو کہنا کافر قبلہ ہو ظلم و جفا

جب کوئی جنس ارزان ہو جاتی ہے تو اس کی قدر نہین رہتی کفر ارزان ہو رہا ہے۔ یہ ہتھیار چلتے چلتے اگرچہ اب قریباً کند ہو گیا ہے پھر بھی پبلک اسلام اِس سے خائف و ہراسان ہو رہی ہے۔ یہ زمانہ آفتِ ارض مشترکہ پر زور دینے کا ہے زمانہ کی تیز تر روانی زور سے اسلامی کاشت کاٹ رہی ہے اس وقت فرقہ بندیون کی الجھنون مین پڑکر مسلمانون کے واسطے دوزخ کے دروازے کھول دینا اور زبردستی اُن مین ڈھکیلنا اخوت فراست اور دوراندیشی کے خلاف ہے۔ کیا ہمارے واسطے خدا کی خدائی مین دوزخ اور کفر ہی رہ گیا ہے۔ اس ترکش سے زہرآلود تیر ہی نکلتے ہین۔ اب مرہم پٹی کا وقت ہے کیونکہ ہر دل مجروح ہے اور ہر بدن مقروح یہ گیند بلا کسی اور وقت سہی۔ اسوقت دنیا ووٹون کی پرستار ہے اور ہم دن بدن اپنے ووٹ کم کر رہے ہین۔ اسلام مین کوئی فرقہ نہین ہے ہمارا نام صرف مسلمان رکھا گیا ہے اپنے اپنے فرقون مین اپنے اپنے گھرون کی طرح رہو۔ بہت اچھا فروعاتی عقائد بھی رکھو۔ زنبیل تعبیرات بھی پر کرو۔ مگر خدا کے واسطے تو تو مین مین سے اپنی جگ ہنسائی نہ کرو۔ مذہب کو ذاتیات کا بازیچہ بناؤ ذاتیات کی وجہ سے اُسے بدنام نہ کرو۔ غور کرو کہ ہم کیا تھے اور کیا بن رہے ہین۔

یاد ایام کہ آئینۂ رضوان ہم تھے باغبانِ چمنِ محفلِ جانان ہم تھے
قابلِ کفر نہ لئے مفتیِ دوران ہم تھے ہو قسم حضرت احمدؐ کی مسلمان ہم تھے
دل مین اپنے تھی محبت بھی رسول اکرمؐ شوقِ قلبی سے محمدؐ کے ثناخوان ہم تھے
منزلِ اسلام سے کیون ہمکو نکالا مفتی دیکھ اجڑی ہوئی بستی کے نگہبان ہم تھے
فتوے دے دے کے کیا ملت احمد کو پریشان اس لئے ہمکو نکالا کہ مسلمان ہم تھے

سلطان احمد

# "قوم کا خطاب مادرِ ہند سے"

اے مادرِ ہند! ہم تیرے پاس فریاد لیکر آئے ہین۔ مگر کیون؟ یہ نہ پوچھ، ہم ہر ایک کے دروازے پر گئے اور اُسکے سامنے دستِ التجا دراز کیا، مگر کہین سے ہمارا سوال پورا نہوا۔ اب پھر پچھتا کر تیرے پاس آئے ہین، اور اپنی حالت بیان کر رہے ہین، ہم کون ہین؟ یہ یاد دلانے کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ تو ایک عرصہ سے ہم سے خفا ہے اور ہماری حالت سے بے خبر ہے اس لیئے پھر ضرورت ہوئی کہ تجھکو اپنی یاد دلائین ہم وہی ہین جن کو تو نے اپنی گود مین خون پلا پلا کر پالا، ہمارے ماں باپ تیرے ہی رحم کے ہمیشہ ملتجی رہے، تو نے ان پر رحم کیا اور وہ مراتب دیئے کہ ان کا سکہ دشمنون کے دلون پر بیٹھ گیا۔ ہم بھی تو آخر انھین کی اولاد ہین، پھر ہم پر وہ شفقت اور عنایت کیون نہین ہم دن رات محنتین کرتے ہین، مگر سب بے سود اور لا حاصل ہو جاتی ہین، نہ وہ غلہ کی پیداوار ہے، نہ وہ آب و ہوا، ہماری زندگی اب موت سے بھی بدتر ہے آئے دن قحط کی تکلیفون سے تیرے ۳۲ کروڑ بچے بھوکون مرتے ہین، افسوس! تجھ کو ان کا ذرا بھی خیال نہین، ہم تیری خدمت اور سیوا کرنے کیلئے اُسی طرح تیار ہین جیسا کہ ہمارے آبا و اجداد تھے، پھر کیا تو ہمارے حال پر ذرا بھی رحم نہ کھائیگی اور ہم اسی طرح ذلت کے دریا میں غوطے کھایا کرینگے؟ اے مادرِ ہند! اگر ہم سے کوئی بات تیری مرضی کے خلاف ہو گئی ہو تو معاف کر اور ہماری حالت کو درست کر تا کہ ہم مین پھر وہی چستی و چالاکی پیدا ہو جائے ہم بھی زمانہ کی روش سے سبق حاصل کرین، ہمین پھر کشورکشائی کا شوق پیدا ہو، اور پھر ہم مین کا ہر فرد بشر بقراط و سقراط نظر آئے، ہماری جسمانی اور روحانی طاقتون کو پھر سے موجزن کر، ہماری رگون مین پھر وہی خون دوڑے جو ہمارے بزرگون کی رگون مین حرکت کرتا تھا۔ اور ہم پھر دنیا کو دکھا دین کہ باوجود اختلافِ زمانہ اور اختلافِ باہمی کے ایک زمانہ کی ٹھکرائی اور مصیبت کی ماری قوم کسطرح ترقی کے بہترین منزل کو اپنے رتبہ اور مقدرت سے گرا ہوا سمجھتی ہے، ہم پھر دنیا کو دکھا دین کہ اتحاد اور دوستی ہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کو کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہونچا سکتی ہے، ہم پھر دنیا کو دکھا دین کہ کسی قوم کی ترقی کا باعث اکثر اس کی ضرورت سے زیادہ تحقیر اور ذلت ہوا کرتی ہے، ہم پھر ایک مرتبہ دنیا کے گوش گذار کر دین کہ تائید غیبی کسی ایک خاص شخص اور قوم کے لیئے مقصود نہین بلکہ دنیا کی کل قومون کے لیئے مقصود ہوا کرتی ہے، ہم پھر ایک مرتبہ دنیا کے

نشین کرادین کہ تائید غیبی اکثر مجبور اور لاچار قوم کے لیئے ہوا کرتی ہے اور کس طرح تائید غیبی سے ہی گری اور ٹھکرائی ہوئی چشم زدون مین اقوام عالم کا مقابلہ کرسکتی ہے مگر اے مادر ہند! ہائے سب یہین اُسی وقت ممکن ہین جب تم بھی ہماری مشکل مین کام آؤ اور ہمارا ساتھ دو، دنیا کی کوئی بلا اور مصیبت ایسی نہین جو اے مادر ہند! تیرے بچون پر نہیں ٹوٹی، پھر آخر یہ غفلت کب تک رہے گی؟ دن رات فاقہ کشی کی مصیبت سے تیرے ۳۲ کروڑ بچے بالکل نڈھال ہوگئے ہین اُن کے چہرون پر اب وہ آب و تاب نہین خوشحالی اُن کی قسمتون سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی، جسمون پر صرف ہڈی اور چمڑے کے علاوہ گوشت کا کہین نام نہین جس سے اُن کی خاندانی بربادی کا پتہ چلتا ہے ابھی وہ لوگ زندہ ہین جنھون نے اے مادر ہند تیری اگلی رحمتون کے منت اُٹھائے ہین اُن کی نگاہ مین یہ زندگی ... سے کچھ اہمیت نہین رکھتا ابھی ہمارے لوگون سے اُن کی یاد نہین گئی ہے جن پر تیرے اقبال کا ستارہ درخشان تھا ابھی ان لوگون کی تصویرین ہماری آنکھون مین پھرتی ہین جو اے مادر ہند تیرے پُر فضا باغ کے شاداب اور ہونہار پودے تھے، ابھی ہمین اپنا وہ زمانہ نہین بھولا جب ہمارا سکہ ہر ایک کے دلون پر بیٹھا ہوا تھا؛ ہماری غضبناک آنکھ کا ایک معمولی اشارہ دوسری قومون کے لیئے نشتر کا کام کرتا تھا، ہماری دھمکی پیام موت سے کم نہ تھی چین اور فارس کے پُر مغز اور مغرور بادشاہون کی گردنین ہمیشہ ہمارے آستانون پر جھکی رہا کرتی تھین اور ہماری معمولی گلیون کی جاروب کشی اُن کے لیئے مایۂ ناز ہوا کرتی تھی، افسوس! اے مادر ہند آج وہی قومین جو کل ہماری ٹھکرائی ہوئی تھین برسر اقتدار ہین، اور ہمکو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہین اب تو ہی بتا اے مادر ہند! کہ ہم اپنی کشتیٔ حیات کو پانی کی اِن خوفناک اور تُند آندھیون اور طوفانون سے کس طرح سلامتی کے ساتھ لیجائین تاکہ اے مادر ہند! ہم بھی دنیا کی مجلسِ عوام مین ایک بہترین جگہ حاصل کرین کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہماری ذلت سے تیری ذلت ہے ہماری تباہی اور بربادی تیرے لیئے پیام اجل ہے، ہمارا بے چین ہونا تیرا بے چین ہونا ہے، ہماری ایک اداسی تیرے لیئے ایک ٹیس سے کم نہین ہمارے جسم کی ایک پھانس تیرے لیئے نشتر ہے، پھر آخر کیا یہ تکلیفین تجھے محسوس نہیں ہوتین کیا ہماری تڑپن تجھسے دیکھی جاتی ہے؟ اور کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ ہماری بربادی تجھپر کوئی بُرا اثر نہین ڈال سکتی ہے؟ کاش اے مادر ہند تجھے ہم پر ترس آئے۔ اور اپنے ۳۲ کروڑ بچون کو اپنی عافیت مین جگہ دے،

## جواب،

خدا نے آجتک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی  نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اے میرے نام لیوا اور میری سرزمین پر بسنے والی قوم تو یہاں سے سرک جا کسی اور ملک میں جاکر بود و باش اختیار کر میں نہیں چاہتی کہ میرا نام لیوا قوم ایسی ہو جو دنیا کی بدترین اقوام میں شمار کی جاتی ہو تو میری اس سنہری تاریخ پر ایک بدنما دھبہ لگانا چاہتی ہے جس پر میں ہمیشہ فخر کرونگی، اے کورِ مطلق اور احسان فراموش کیا مجھکو یہ نہیں دکھائی دیتا کہ دنیا کی وہ قومیں جو مجھسے ہزاروں منزل پیچھے تھیں اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئیں اور تو ابھی اسی جگہ ہے جہاں سے شاید دنیا کا سب سے پہلا باشندہ روانہ ہوا تھا۔ بھوک اور پیاس کی تاب نہ لا کر تکلیف کی سختی واقعی تو ہی ہے، اے ناعاقبت اندیش یہ تمام تکالیف کی باعث تو ہی ہے اسپر طرہ یہ ہے کہ تو الٹا مجھپر الزام لگاتی ہے کہ اب غلہ کی وہ پیداوار نہیں جو آج سے چند سال قبل تھی کاش تو اپنی آنکھیں کھول اور مجھکو یہ معلوم ہوتا کہ تیرے سے یہاں غلہ کی پیداوار میں روز افزوں ترقی ہے، فرق اتنا ہے کہ آپ اس کا ٹھیک استعمال نہیں جانتی سال رواں کی مثال لے اور دیکھ کہ سال ماقبل کی پیداوار اور موجودہ سال کی پیداوار میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن تجھکو دولت کی ہوس اسقدر دامنگیر ہے کہ اپنے باشندوں کا بھی خیال جاتا رہا صرف روپیہ کے لالچ میں غلہ کو گران قیمت پر فروخت کر کے دوسرے ملکوں کو بھجوا دیتی ہے، میں یہ نہیں کہتی کہ تو غیر ممالک کے باشندوں کی امداد نہ کر لیکن اس سے قبل کہ تو امداد کیلئے تیار ہو پہلے یہ دیکھ لے کہ اسکے بعد تیرے یہاں کس قدر بچتا ہے اور وہ تیرے سال بھر کے لیے کافی ہوگا تو اپنے کو میری اولاد کے نام سے یاد کرتی ہے کیا میری اولاد ہونے کی حیثیت سے تیرا یہ کام ہے کہ یہ خوش آئند ہو سکتا ہے کہ میرے ہی سامنے میرے ہی سینہ پر ایک دوسرے کا خون بہا دے ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ایک بڑی ہے ایک چھوٹی تو کیا بڑی شاخ اسکی کوشش کر سکتی ہے کہ وہ چھوٹی شاخ کو کاٹ کر گرا دے اور خود نشو و نما پالے، نہیں! ایک وقت آئے گا جبکہ اس عالیشان شاخ کو چھوٹی چھوٹی شاخوں کی امداد کی ضرورت ہوگی اگر اس وقت کوئی شاخ اسکے شریکِ حال نہ ہوئی تو ایکدن وہ سرسبز شاخ بھی زمین پر پڑی ہوئی دکھائی دیگی اور رفتہ رفتہ وہ درخت بھی سوکھکر گر جائے گا!"

میری نگاہ میں تم سب ایک ہو ہندو ہو یا مسلمان عیسائی ہو یا یہودی پارسی ہو یا آتش پرست میرے دربار میں مذہب اور ملت کی کوئی قید نہیں اور نہ میرا کسی مذہب سے کچھ تعلق ہے تو مجھسے مدد کی طالب ہو، کیا میں نے کبھی امداد کرنے سے انکار کیا، اور کیا میں اب امداد کرنے سے انکار کرتی ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تو خود اپنی مدد کر! جس وقت میری بھی مدد تیرے شریکِ حال ہوگی، اور پھر تیرا نام دنیا کی مشہور قوموں میں شمار ہونے لگے گا"

دنیا کی حالت دیکھ اور زمانہ سے سبق لے اگر تو خود اپنی طرف سے ترقی یا فتہ قومین پیدا ہوتی بلکہ وہ قوم خود بخود اپنی ترقی کرتی ہو اس وقت تائید غیبی بھی اسکا ساتھ دیتی ہو تیرے سامنے دنیا کی بہت سی قومون کی تاریخ بھی موجود ہو تاریخ کو بغور مطالعہ کر اور دیکھ وہ کیا چیز تھی جس نے اُن کو پستی سے نکال کر بلندی تک پہونچا دیا تو اپنی گذشتہ عظمتون پر رشک کرتی ہو لیکن تیری سمجھ مین یہ نہین آتا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے اُن کو اس درجہ تک پہونچا دیا کیا تو سمجھتی ہو کہ اُن مین یہی نفاق اور کدورتین تھین جو آج تجھ مین ہین -؟ کیا وہ بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے - کاش کہ تو خود اپنی ہی تاریخ کی ورق گردانی کرتی اور تجھکو معلوم ہو جاتا کہ وہ ترقی اور خوشحالی کی بنا صرف اتحاد پر مبنی تھی تو خود اتحاد اور ملاپ کی قدر و منزلت کو سمجھتی ہو لیکن اس پر عمل نہین کرتی آخر وہ وقت کب آئیگا جب تو اس پر عملدرآمد کریگی؟ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی قوم ذلیل اور خوار ہو سکتی ہے؟ کیا اب بھی کوئی کسر تیری خود فراموشی مین باقی رہ گئی ہو؟

تو کہتی ہو کہ اب تجھ مین قابل آدمیون کا قحط ہو تو کہتی ہو کہ اب ہمارے نسل مین قدرتاً کمزوری پیدا ہوتی جاتی ہو تو کہتی ہو کہ اب تیرے پیدا کیے ہوئے غلامون مین وہ طاقت اور قوت نہین جو ماضی حالت کو درست کر سکے یہ بھی ایک جھوٹا الزام تو مجھی پر رکھتی ہو حالانکہ اسکی وجہ بھی وہی ہو جو غلہ کی گرانی کی ہو یعنی تو دولت کی ہوس مین ایسی مدہوش ہو گئی ہو کہ تجھکو اپنے بھائیون کا بھی خیال نہین! اصل جنس مین طرح طرح کی غیر جنس اشیا ملاکر فروخت کرتی ہو پھر الٹا یہ کہتی ہو کہ غلہ مین طاقت نہین بھلا اس مین طاقت کہان سے آسکتی ہو اور کس طرح تیری نسل کی ماضی حالت درست ہو سکتی ہو جبکہ اس مین سچائی کا کہین نام نہین صداقت اور سچائی جنس نایاب ہو گئی ہو ہر شخص دروغ اور جھوٹ کو اپنا شعار ترقی سمجھے ہوئے ہو دروغگوئی کا بازار اس قدر گرم ہو کہ صداقت کی آواز کسی کے کان تک نہین پہونچتی اور اگر کسی کے کان مین پڑ بھی جاتی ہو تو وہ اسکو اسی زمرہ مین لیجاتا ہو جسمین جھوٹ درج ہو اسکی کوئی پروا نہین - تجھمین اب بھی ایسی ہستیان موجود ہین کہ اگر تو ان کو اپنا رہنما بنالے تو یقیناً تو بہت جلد اپنی حالت درست کر سکتی ہو - تجھمین اب بھی ایسے جواہر موجود ہین جن کو اگر تو ٹھیک طور سے استعمال کرے تو دنیا کی بہترین قوم مین شمار کی جا سکتی ہو تجھمین اب بھی ایسے چند دماغ موجود ہین کہ اگر تو ان کو بلاکر تو اپنی گذشتہ شان و شوکت کو پھر حاصل کر سکتی ہو - کیا تو یہ سمجھتی ہو کہ مین تیری اس حالت سے خوش ہون اور کیا تو یہ سمجھتی ہو کہ تیری ہو گری ہوئی حالت مجھسے دیکھی جاتی ہو؟ نہیں! میں تیری اس حالت پر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہون لیکن مین کیا کر سکتی ہون جبکہ خود تجھکو اپنی حالت درست کرنے کا ذرا بھی احساس نہین

دیکھ میں پھر تجھسے ایک مرتبہ کہتی ہوں کہ تیری حالت اسوقت تک درست نہیں ہوسکتی جب تک تو خود اپنی حالت درست کرنے کی کوشش نہ کریگا اگر جیسے تیرا یہی حال رہا تو خدا جانے تیرا کیا حشر ہونے والا ہے-

نصیر احمد عباسی (کاکوروی)

## غزل

(از حضرت آسی جونپوری)

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفا ہوکر

کیا جو عشق نے کاہید وشل کاہ مجھے
کشش کسی کی اڑا لیگئی ہوا ہوکر

قرار جز دل عاشق کجا حسینان را
وہ آخر آئے مرے دل میں بیاجا ہوکر

نہ پوچھ تندی و تیزی مے محبت کی
جسے یہ نشہ چڑھا رہ گیا فنا ہوکر

مرا سفینہ تلاطم میں بحر عشق کے ہے
مزا تو جب ہے خدا آئے ناخدا ہوکر

بجز تمہارے کسی کا وجود ہو یہ محال
مگر تمہیں نظر آتے ہو ما سوا ہوکر

نثار کیوں نہ کریں جان اسپر اے آسی
فلک سے جا کے لگے جسکی خاک پا ہوکر

# میرا خواب

رمضان کی بیسوین تاریخ تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ ہلکے ہلکے سیاہ بادلون نے کسی کے امید بھرے دل کے مانند ایک عجیب منظر طاری کر رکھا تھا۔ جس طرح کسی عاشق مہجور کے دل کو ہجوم ناامیدی سے تاریکی کی کبھی امید کی جھلک ایک لمحہ کے لیئے روشن کر دیتی ہو۔ اسی طرح شب کی پرسکون تاریکی مین کبھی کبھی کوئی ستارہ اپنی ایک جھلک دکھلا کر نظرون سے غائب ہو جاتا تھا۔

ایک مکان تھا آبادی سے دور، تنہا جیسا کسی ہجران نصیب کا دل۔ جس مین دو رنگین مسہریان سفید بسترون سے آراستہ بچھی تھین۔ مسہریون سے کچھ فاصلہ پر ایک تخت سرخ جاے ناز سے مزین تھا۔ اسی تخت کے ایک کنارے مین اپنے خیالات مین غرق بیٹھا تھا۔ مجھے ذرا یاد نہین کہ مین کن خیالات مین اسقدر غرق بیٹھا تھا۔ مجھے ذرا یاد نہین کہ مین کن خیالات مین اس قدر محو تھا کہ اپنی بھی خبر نہ تھی کہ کہان ہون اور وہان کوئی اور بھی تھا یا نہین۔ تاہم مین ایسی محویت کے عالم مین نظر اٹھا اٹھا کر بار بار کبھی آسمان کی طرف کبھی اپنے گرد و پیش دیکھ لیتا تھا۔ میری متجسس نگاہین کسی کی تلاش مین تھین۔ میرا دل کسی کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ جو موجود میرے دل مین ہونے کے مجھ سے پوشیدہ تھا۔ میرے سامنے ہونے پر بھی مجھ سے دور اور چھپا ہوا تھا۔ مجھے جاننے پر بھی مجھ سے ناآشنا تھا۔ مجھے اپنا کر لینے پر بھی مجھ سے بیگانہ تھا۔

مین اپنے خیال مین کسی کے آگے سربسجود تھا۔ میری تشنہ نگاہین نہایت خوشامدانہ انداز مین کسی کے پیرو[illegible] مین۔ خاکی پیرون مین لوٹ رہی تھین۔ مین ہمہ تن زبان شوق بنا ہوا کسی سے درخواست رحم کر رہا تھا۔ میرا سینہ جذبات سے لبریز تھا۔ ایسا لبریز کہ ذرا سی ٹھیس خفیف سی جنبش تمام شیرازہ منتشر کر دینے کو کافی تھی۔ پیمانہ بھر چکا تھا۔ چھلکنے کی دیر تھی۔ مین ہر چند کوشش کرتا۔ بار بار جرأت کرتا۔ اور چاہتا تھا کہ کہون ہزارون ارمانون مین سے ایک ہی کا اظہار کر سکون۔ بڑی ہمت کر کے کوئی حرف دل سے زبان تک لے بھی آیا تو میرے لبون نے ایسے وقت پر کبھی میری زبان کا ساتھ نہ دیا۔ رعب حسن اور اس غضب کا۔ پاس ادب اور اس بلا کا۔ میری ایک خاموشی مین ہزارون خواہشین پنہان تھین۔

مین ہنوز اسی بیخودی اور از خود رفتگی کے عالم مین تھا کہ کیا دیکھتا ہون کہ بادلون مین تاریک بادلون مین سے

بنورانیت صبر و سکون سوز نورانیت۔ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگی جوں [illegible] بڑھتی جاتی تھی میری حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ میں [illegible] بیتاب ہو رہا تھا [illegible] میں نے اپنے تمام جسم میں ایک عجیب قسم کی کیفیت محسوس کی میں چاہتا تھا کہ اس سے [illegible] اُسکے قدموں میں اپنا سر رکھ دوں۔ اپنے تئیں مٹا کر اس میں اسطرح [illegible] کہ دنیا کی کوئی قوت مجھے اُس سے جدا نہ کر سکے کیونکہ وہ ایک نورانیت تھی قابل لمس

میرے کان میں ایک عجیب دلکش آواز آئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید میرے کان بج رہے ہیں دوبارہ غور سے سُنا تو آواز اور بھی زیادہ دلکش اور بیخود کرنے والی تھی۔ [illegible] تھا کان لیجائے کو جن سے [illegible] آواز نکل رہی [illegible] چوم لوں۔ چوس لوں کیونکہ وہ ایک [illegible] سب سے [illegible] میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو [illegible] دینے والا میرے سر پر کھڑا ہوا اُسکے ہاتھ [illegible] ایک ہار ہے پھولوں کا [illegible] نیم شگفتہ کلیوں کا [illegible] ایک صندلی کلائیاں میری [illegible] اپنا اور شاید میرے گلے میں ہار ڈالدیا۔ اُسی آواز اُسی دلکش آواز کے ساتھ [illegible] میری آنکھوں کا اُسی مست کر دینے والی سرمگیں آنکھوں سے دوچار ہونا تھا کہ میں بالکل [illegible] تھا میری آنکھیں نیم [illegible] مجھے اپنی کچھ خبر نہ تھی۔

آہ کیا [illegible] ایک نورانیت تھی قابل لمس۔ ایک نور تھا صاحب نطق۔ ایک موسیقی تھی صاحب جسم یہ نہیں کہ سب سے بڑی بات [illegible] تھی کہ یہ وہی تھی جسکے لیئے میں عرصہ سے [illegible] آرزومند تھا۔ جسکو میری آنکھیں ڈھونڈھ رہی تھیں جسکی میرا دل تلاش کر رہا تھا [illegible] ہوا تھا جس نے مجھے اپنا کر لیا تھا۔

پھر ایسا کیوں ہوا۔ افسوس میرے پاس کچھ جواب نہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ تھوڑی دیر کے [illegible] اسی کے پاس سے ہٹ جانے سے تاریکی میں ایک نورانیت کے یکایک غائب ہو جانے سے میں [illegible] آنکھیں کھولکر جو دیکھتا ہوں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی میرے پاس تھا نہ میرے گلے میں [illegible] تھا۔ ضرور مگر کہاں؟ کیا میرے گلے میں۔ ان تاریک تاریک ہاتھوں کا ڈالا ہوا۔ اسی دلکش آواز کے ساتھ اُسی وعدہ کے نباہ کے اقرار کے ساتھ جسکی تمنا میرے دل میں دیر ازل سے تھی جسکی امید پر میں اسوقت تک زندہ تھا جسکے لیئے باوجود اس قدر بیتابی کے اس قدر بیچینی کے کبھی ایک حرف بھی زبان پر نہ آیا تھا۔

نہیں ہے، میں وہ ہار میرے گلے میں نہ تھا۔ بلکہ میرے نزدیک اسی تخت پر جس پر میں بیٹھا تھا ڈالا ہوا تھا۔
آہ۔ وہ کون تھا جس نے میری تمنائے دیرینہ امیدوں کو اس بے رحمی کے ساتھ اپنے نازک ہاتھوں سے کچل ڈالا
وہ کون تھا جو ایسی ناامیدی کی حالت میں ایک روح پرور امید کی جھلک دکھا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔
وہ کون تھا جس نے میرے شیشۂ دل کو اس بے رحمی کے ساتھ زمین پر دے مارا۔ تیر چلایا مگر نیم کش۔ زخمی کیا
مگر نیم بسمل کر کے چھوڑ چلا۔ مریض کا حال پوچھا مگر دوا کی خبر نہ لی۔ کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ پیاسے کو پانی دکھلا کر
چھپا لینے سے پیاس اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جلتی ہوئی آگ میں تیل ڈال دینے سے شعلے اور زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں
اگر وہ یہ سب کچھ جانتا تھا تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا جواب شاید وہی دے سکے؟

اے ہار اور پژمردہ اور مرجھائے ہوئے نیم شگفتہ پھولوں کے ہار کیا تو اب پھر اُسی طرح تازہ ہو کر
اُسی نکہت کے ساتھ۔ اُن ہی نازک نازک حنائی ہاتھوں سے۔ اسی مست کر دینے والی آواز کے ساتھ
اُسی جان بخش مژدہ کے ساتھ جس کی امید پر اس وقت زندہ نظر آرہا ہوں میرے گلے میں آسکتا ہے؟
میں جانتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ تو اب دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ آفتاب کی تمازت تجھے بہت جلد خشک
کر دے گی۔ ہوا تیری تر و تازگی جذب کر لے گی۔ مگر تیرا جسم خشک جسم۔ روح نکلا ہوا جسم میں برباد نہ ہونے
دوں گا۔ کیونکہ تیری نیم شگفتہ کلیاں میری اس رات کی یادگار ہیں جب میں نے تیری یاد میں وہ خواب
دیکھا تھا جو اپنی تعبیر خود تھا۔ وہی خواب تھا وہی تعبیر بھی۔ اس لیے جب تک وہ خواب یا اُس کی
تعبیر پوری نہ ہو جائے۔ ان ہی مسیحائی ہاتھوں سے میرے گلے میں دوسرا ہار نہ پڑ جائے میں تجھے
اپنے سے ہرگز جدا نہ کروں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو تجھے اپنے ساتھ قبر میں لیتا جاؤں گا۔ مرتے وقت وصیت
کر مروں گا کہ تیرے مردہ جسم کو میری نعش کے ساتھ دفن کر دیں۔

عبد الغنی خان۔ از علی گڑھ

اب ہوتے ہوتے آپ جفاکار ہو گئے — ہم رفتہ رفتہ خوگرِ آزار ہو گئے
خمخانۂ ازل کے جو میخوار ہو گئے — مدہوش کیا وہ اور بھی ہوشیار ہو گئے
آخر نہ کہتے تھے ہم دشمن نہ کیجیے — کانٹے کی طرح پھول سے خار ہو گئے
کیا پوچھتے ہو ان سے کہ کیسی کٹی بہار — جو فصل گل سے پہلے گرفتار ہو گئے
تو ارتکاب معاصی سے باز آ — حافظ تیرے گناہوں کے انبار ہو گئے

# البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل

کو مین نے غور سے پڑھا۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد عمر صاحب آسسٹنٹ سرجن اور ماہر اکس ریز ہین۔ اِس کتاب مین مرض سل کے تاریخی حالات اس کے اسباب علامات علاج تدابیر حفظ ما تقدم کے متعلق معلومات کو محنت اور جانفشانی کے ساتھ ذخیرہ بنا کر دلچسپ اور مرغوب لباس مین پیش کیا گیا ہے۔

مختلف زبانون سے معلومات کو وسیع مطالعہ کرکے ایک جگہ پر اکٹھا کر دینا ایک بڑا بھاری کام ہے جسکے لیئے ہمارے مصنف کے ابنائے ہم پیشہ اور ملک کو اُن کا مرہون احسان ہونا چاہیئے۔ اور اُن کی محنت سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے العلم علمان علم الابدان و علم الادیان جسکے معنی یہ ہین کہ علم طب و دینیات دو مختلف چیزین ہین جن کو علحدہ علحدہ رکھنا ضروری ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصنف صاحب سچّے مسلمان ہین اور اس کے اوپر قادیانی ضیاعت نہایت زور کے ساتھ نمایان ہے۔ دینی تعصب بذات خود تو بُرا نہین مگر علمی معاملات مین البتہ بے محل معلوم ہوتا ہے اسی جوش مین آکر اور انجمن اُردو کی تقلید کرتے ہوے آپ نے انگریزی اصطلاحات کی جگہ پر عربی اصطلاحات تجویز کیے ہین۔ میڈیا کے لیئے الخلل الذی یحیط قبۃ المادہ اور نیزا نکولا کی جگہ پر آلاعش عکاظی زائد من المنقب تجویز کیا ہے۔ مگر ہماری رائے مین اس کوشش مین آپ نے مونچھون کو کھینچکر داڑھی سے لمبا بنا دیا ہے۔ ہماری رائے مین مناسب ہوتا اگر آپ اس امر مین مصری اطبا کا مسلک اختیار کرتے مصنف کی محنت ہمہ وجوہ قابل تحسین ہے اور ہم اس مین ان کو کامیاب ہونے کی مبارکباد دیتے ہین۔

(کرنل) بھولا ناتھ

آئی ایم ایس سی آئی اے

# مناظرے [illegible] گندے

ریل، ڈاک، تار، مطبع اور اخبار بے شبہ تمدن جدید کے بہترین ثمرات میں سے ہیں لیکن اُس قوم کی قسمت کو کیا کہیے جسکے افراد ان نفع بخش اور راحت دہ چیزون کو بھی اپنی شرارت اور نفسانیت کا آلہ بنا لیتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہین کہ کم وبیش ایک سال سے مسلمانون کی ایک جماعت انھین تمدنی پیداوار آلات کے ذریعہ افراد قوم کے دلون مین کدورت و نفرت کے جذبات مشتعل کرنے مین مصروف ہے اور اگرچہ ہم نہین چاہتے تھے کہ اس بحث مین کسی قسم کا حصہ لین لیکن وقت روپیہ اور قوتون کے بیجا اسراف کے ساتھ ساتھ جب ہم محسوس کرتے ہین کہ اس جنگ زرگری کی بدولت کثیر افراد قوم کے اخلاق بھی برباد ہو رہے ہین تو ہم معاف کیے جائین اگر ہم خاموشی کو گناہ سمجھکر چند سطور تحریر کرین۔

ابتدا اسکی یون ہوئی کہ ایک صاحب محمد اسمٰعیل سریاوا نے جنکے دل مین غالبا اسلام اور مسلمانون کا درد تمام قوم سے زیادہ ہے ایک طولانی تحریر بعض اخبارات مین اس مضمون کی شایع کرائی کہ بمبئی مین جو داؤدی بوہرون کے ایک سرغنہ ملا طاہر سیف الدین صاحب ہین انھون نے ضوء نور الحق المبین کے نام سے ایک کتاب عربی زبان مین تصنیف فرمائی ہے اور اُس مین خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ توہین کی اور تمام فرق اسلام کے خلاف سخت زہر اگلا ہے۔ تو جی اخبارات و رسائل عموماً نکالے تو اس دعوی کے ساتھ جاتے ہین کہ اُن کے ذریعہ سے قوم و ملک کی خدمت منظور ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑکر ایک بڑا حصہ اخبارات و رسائل کا معمولی لوگون کے ہاتھون مین ہے جو حصول معاش کی تمام کوششون مین ناکام رہنے کے بعد اس غریب پر ور دروازہ پر آ بیٹھتے اور اپنی تن آسانیون کی خاطر ملک و ملت کا نام لیکر بداخلاقیون کا ارتکاب کرتے رہتے ہین مذہبی مناظرون اور سیاسی مجادلون کی گرم بازاری مین تو خیر انھین اصحاب کا بڑا حصہ تھا ہی مگر اب روز بروز نئے نئے دروازے ان بندگان غرض کے لیے کھلتے جاتے ہین۔

سریاوا صاحب کا یہ مضمون چند اخبارات کے سوا تقریباً شمالی ہند کے اکثر اخبارات و رسائل مین شایع ہوا اور ہمین ذاتی طور پر اس بات کا علم ہوگیا ہے کہ جن اخبارات و رسائل نے اس مضمون کو شایع کیا، یا اُس کی بابت مین نوٹ اور مضامین لکھے۔ ادھون نے نہایت معقول تجارت کرلی۔ تجارت بڑی سستی ہین ہوئی لیکن

جواخبار نویس اپنی ذمہ داری کو محسوس کیئے بغیر محض چند سکون کے معاوضہ مین اس فتنہ کی پرورش کرتے رہے اُن کا ضمیر شاید انھین ہمسے بہتر طریقہ پر بتا سکتا ہو کہ یہ تجارت ہو یا کیا؟

سریا واصاحب کا زور ختم ہوا تو ملا صاحب کے ارادتمندون کی طرف سے اُن کی تردید اسی دم خم کے ساتھ شروع ہوئی۔ اور اُنھون نے ایک طرف تو بعض ایسے اخبارات ہی کو توڑ لیا جو سریا واصاحب کی زرپاشیون سے کافی طور پر مستفید ہو چکے تھے حتیٰ کہ ان مین سے چند نے اپنی رجعت اور احمق بنائے جانے کا بیانگ دہل اعتراف کرنا شروع کر دیا ہو۔ اور دوسری طرف کسی مخلص درسے شیمۃ الاخلاص کے نام سے ایک رسالہ لکھوا کر کثیر تعداد مین شایع کیا۔

ردعمل کی یہ کوششین ختم نہو ئی تھین کہ مبئی کے زر د نقرہ نے دہلی کی منت سے ایک نیا سکہ "میمن برین" ڈھلوا کر ملک مین رائج کرا دیا۔ اس رسالہ مین علما و فضلا، شاعر و ادیب مصلح اور معلم غرضکہ ہر طبقہ کے نمائندون اور لیڈرون کے فتاوے کی صف بندی کر کے سریا واصاحب نے جو فساد برپا کیا تھا اسکی حمایت کا سامان جمع کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہو کہ حکومت دہلی نے اس پمفلٹ کو پریس ایکٹ کے رو سے ضبط کر کے پوری طرح شایع نہین ہونے دیا۔ لیکن جو لوگ فریقین کو اُلّو بنا کر اپنی جیبین بھر رہے تھے اُن کی تشفی کے لیئے یہ کافی نہ تھا۔ لہذا جو نسخے اس رسالہ کے شایع ہو چکے تھے ان کی تردید کے لیئے اب تک کاغذ و سیاہی فراوانی کے ساتھ بہائی اور تاجران مبئی کی دولت اس "بٹ" کی آڑ مین اُڑائی جا رہی ہو۔ چنانچہ کچھ دنون پہلے خاص لکھنؤ سے ایک رسالہ اسی نوعیت کا شایع ہوا تھا۔ مطبع عالم افروز مبئی نے اسکے بعد "آئینہ صداقت" دکھایا اور اب ایک پمفلٹ "سیف الدین علی رؤس المعتدین" میرٹھ سے وصول ہوا ہو۔

ہم نہین جانتے کہ یہ حماقتین اور یہ قزاقیان کب تک جاری رہین گی لیکن بلا لحاظ اسکے کہ جن بندگان زر کو ان ذرایع سے کافی مالی منفعت پہونچ رہی ہو۔ وہ ہمین بیشمار گالیان دین گے۔ ہم اپنا فرض سمجھتے ہین کہ ملا طاہر سیف الدین کے ارادت کیشون اور ان کے فریق مخالف دونون کو آگاہ کر دین کہ آپ دونون کو اس جنگ زرگری سے کوئی نفع پہونچنے کی تو بظاہر امید نہین البتہ آپ کے پاس جو فاضل روپیہ ہو وہ ضرور اس حماقت مین آپ کی جیب سے نکل کر ان لوگون کے ہاتھون مین پہونچ جائیگا جو آپ دونون مین سے کسی کے دوست نہین بلکہ آپ کے زبینہ کے دشمن اور اس قسم کی ملاکر زنی مین کافی مہارت رکھتے ہین۔ آپ دونون اگر کانٹھ کے پورے ہین تو ویسے ہی بد بختی سے عقل کے کورے بھی ہین۔

ہمین نہایت افسوس معلوم ہوتا ہو کہ اس بحث مین ڈاکٹر اقبال اور مسٹر عبدالماجد جیسے قوم کے مایۂ ناز افراد بھی شریک کر لیے گئے ہین۔ اور اسکی تمامتر ذمہ داری جہانتک ہمین علم ہو خواجہ حسن نظامی صاحب کے سر ہے۔

ملا طاہر سیف الدین کے حامیون نے جو تردیدی رسائل شایع کیئے ہین ان کی حقیقت و نوعیت سے ہم ناواقف نہین۔ اور اگر اُن مین خواجہ صاحب کا نام صاف صاف نہ لکھا ہوتا تب بھی ہمین یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود تھے کہ خواجہ صاحب بھی اِس تجارتی کوٹھی کے شرکا مین داخل ہین۔ جب سے خواجہ صاحب کتابون اور دواؤن کی تجارت مین باقاعدہ طور پر منہمک ہین ہمین توقع تھی کہ اِس ذریعہ سے جو آمدنی اُن کو ہو جاتی ہوگی اسپر وہ اکتفا کرینگے۔ بلکہ ہم امیدوار تھے کہ وہ کسب حلال کے ان وسائل کی موجودگی مین اپنے کمالات تصوف و روحانیت کی نمائش کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دینگے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہو کہ خواجہ صاحب ع

تناعت مس عیب را کیمیاست

کے فلسفہ پر یقین نہین رکھتے۔ ورنہ اس گندے کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہونے دیتے۔

مسر یاوا صاحب اور ان کے ہمنواؤن نے جو کچھ ابتک لکھا ہو یا ملا طاہر سیف الدین کے حامیون کی طرف سے جو تحریرین شایع ہوئی ہین ایک ایک کرکے تقریباً سب ہماری نظر سے گذری ہین اور ہم دونون مین سے کسی کو بھی لائق ستائش نہین قرار دے سکتے۔ اِس لیئے کہ یکا غذی لڑائی کسی اچھے اصول پر مبنی نہین معلوم ہوتی۔ بعبنسر ض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ملا طاہر سیف الدین نے جو کچھ اپنی کتاب مین لکھا وہ بالکل ایسا ہی ہو جیسا کہ سر یاوا صاحب کی تحریر اُسے ظاہر کرتی ہو تب بھی اُن کے اس ہنگامہ برپا کرنے سے کیا نتیجہ ہوا سوا ظاہر ہو کہ ملا صاحب کے متبعین کی اصلاح تو اس سے مقصود ہی نہ تھی سا اب رہے عام مسلمان خواہ وہ سُنی ہون یا شیعہ تو وہ ملا صاحب سے نہ پہلے کوئی تعلق رکھتے تھے اور نہ اب کوئی سروکار رکھین گے۔ اگر ملا صاحب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرح دنیا بھر میں اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہوتے، یا عیسائی آریہ اور دیگر مذاہب کے مناظرہ کرنے والون کی طرح تمام ملک مین پھیلے ہوتے تو اسوقت غیر ان کے خیالات سے تعرض کرنے کے کوئی معنی بھی ہو سکتے تھے۔ موجودہ حالت مین سوا اسکے کچھ نفع نہین پہونچا کہ جو لوگ عقائد مذہبی کے دل آزار فقرون سے ابتک نا آشنا تھے سر یاوا صاحب کی بدولت ان کو بھی

تھوڑا سا دُکھ پہونچ گیا۔

۔ اسی طرح اگر مُلا صاحب کے معتقدین یہ سمجھتے ہین کہ سرپاوا صاحب یا ان کے ہمنواؤن کی گرگدنیہ کی تردید سے انھین کچھ نقصان پہونچ سکتا ہو تو اُن کا یہ خیال بھی مبنی بہ دانشمندی نہین کہا جا سکتا اول تو ایسی صورت مین کہ خود ان کے دعوے کے بموجب مُلا صاحب کی کتاب بخصوص طور پر اُن کے مُریدین ہی کے مطالعہ کے لیئے ہو۔ عامۂ مسلمین کو اِس سے کیا غرض ہو سکتی ہو۔ پھر یہ کہ جب مُلا صاحب اپنے حیطۂ اثر کو اپنی جماعت سے باہر نہین بڑھانا چاہتے۔ تو عامۂ مسلمین کی بدگمانیان انھین کیا نقصان پہونچا سکتی ہین، اس مُلک کا قانون ہندو مسلمان عیسائی پارسی، دہریہ غرضکہ ہر مذہب کے لوگون کو اس بات کی آزادی دیتا ہو کہ وہ اپنے اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرین۔ البتہ کسی کو حق نہین کہ دوسرے مذاہب کے پیروؤن پر حملہ کرے۔ مُلا صاحب کا کوئی ایسی کتاب لکھنا جو دوسرے مذاہب کے خلاف عقائد کی تلقین کرتی ہو اور اُسے محض اپنے مریدین مین شایع کرنے کے لیئے چھاپنا یقیناً قانونی گرفت سے باہر ہو اور جو مسلمان اُس عیسائی اخبار نویس کا کچھ نہین بنا سکے جس نے پبلک مین شایع ہونے والے ایک اخبار مین حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ کی توہین کی تھی وہ بھلا کسی ایسے شخص کا کیا بگاڑ سکتے ہین جو گھر کے اندر بیٹھ کر خدا اور رسول خدا کے متعلق اپنے خاص عقائد کا اعلان کرتا ہو۔

بہرحال ہم فریقین کی خدمت مین التجا کرتے ہین کہ برائے خدا کم سے کم مسلمانون کے موجودہ اضطراب و درد مندی کا لحاظ فرما کر اور پیش نظر رکھکر کہ جو روپیہ وقت اور قوتین طرفین کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہین اُن کے صرف کے لیئے ایک دوسری بہت بڑی راہ موجود ہو۔ اِس تُوتُو مین مین کو چھوڑ دین اور اپنی ساری توجہ اقتدار خلافت اسلامیہ کے بقا و تحفظ پر صرف کرین جسکے بغیر نہ سرپاوا صاحب اور اُن کے ہمنواؤن کو زندگی کا کوئی لطف ہو سکتا ہو اور نہ مُلا صاحب اور اُن کے ارادتمندون ہی کی کوئی عزت باقی رہیگی ؎

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو می گویم     تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

---

مطلع آمدا سے وہ ناظرین کلام بخوبی واقف ہونگے جہالتاً فرنگ کے دیرینہ قدردان ہین صاحب موصوف جنگ کے زمانہ مین ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور گذشتہ سال واپس آنے کے بعد ہمہ تن ازو جان

درسائل کی خدمت مین مصروف ہین۔ پہلے وہ معاوضہ لیکر مضامین لکھا کرتے تھے اب اس سے بے نیاز ہین۔ جس کا سبب غالباً یہ ہو کہ حکومت پنجاب کی طرف سے رائے عامہ کو حکومت کے مطابق بنانے کے لیئے پبلسٹی بورڈ کا جو کارخانہ قایم کیا گیا ہو مسٹر راے بھی اسی کارخانہ سے متعلق ہین کیونکہ اس وقت ملک کا کوئی اخبار یا رسالہ شاید ہی ایسا ہو جو اُن کے فیض قلم سے استحساناً مستفید نہوتا ہو۔ اور اگرچہ اُن کے اکثر مضامین سے اہل ملک کی معلومات مین کافی اضافہ ہو رہا ہو لیکن ساتھ ہی ہمین اندیشہ ہو کہ راے عام کی رہنمائی مین ان کا مسلک قابل اعتماد نہین سمجھا جا سکتا۔ الناظر مین جو مضمون درج کیا گیا ہو بیان کے موجودہ رجحان کو نمایان کرنے کے لیئے کافی ہو۔ جنگ کے زمانہ مین جرمنون اور جرمنی کے فلسفیون کے خلاف جو کچھ کہا گیا یا کہا جاتا اسپر زیادہ اعتراض نہین ہو سکتا تھا اس لیئے کہ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہو کہ "جنگ اور عشق کے دوران مین سب کچھ جائز ہوتا ہو" لیکن اب کہ جرمنی سے صلح ہو چکی ہو اور شرائط صلح کا بار ہی اہل جرمنی کے واسطے کچھ کم بلاے دوش و جان نہین ہو سکتا۔ اس قسم کی تحریرین سواے اسکے کہ "موے پر سو درّے" کے مصداق قرار پائین اور کیا کہی جائین؟ ہمین امید ہو کہ "نیٹشے" کے متعلق ناظرین راے قائم کرنے مین ان حالات کا لحاظ کرینگے۔

———(٠)———

مسئلہ گاؤکشی کے متعلق جو کچھ گذشتہ نمبر مین لکھا گیا اُس سے غلط فہمی نہ پیدا ہونا چاہیئے۔ مسلم لیگ کی تجویز سے ہمنے اُسی نقطۂ نظر کی بنا پر اتفاق ظاہر کیا تھا جو مسلم لیگ کی سی سیاسی جماعت کا ہو سکتا ہو۔ اگر اہل ہنود اُس کا یہ مفہوم سمجھ رہے ہین کہ مسلمان اپنے مذہبی حق سے دستبردار ہو گئے یا اُن کے پاس خاطر سے اپنے دینی احکام کو نظر انداز کر دینگے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ ہندو گاے کی تقدیس کے قائل ہین اور مسلمان خدا کے سوا کسی کی تقدیس کو تسلیم نہین کر سکتے۔ لہذا جب کبھی اُنہین اُسکا شائبہ بھی نظر آئے گا کہ سُنت ابراہیمی کا اتباع کرنے یا خداوند قدوس کی تعظیم بجا لانے مین انسداد گاؤکشی کی تحریک حائل ہو وہ مجبور ہونگے کہ مسلم لیگ کے فیصلہ سے انحراف کرین۔ ہندوؤن اور مسلمانون دونون سے التجا ہو کہ باہمی اتفاق و اتحاد کی عمارت ایک دوسرے کے مذہب مین دخل دینے کی بنیاد پر قائم نہین ہو سکتی۔ بلکہ مہاتما گاندھی کی راے کے بموجب دونون کو متحد کرنیوالی اصل چیز یہ مشترکہ نصب العین ہونا چاہیئے جو ہندوستان کے متعلق کانگریس اور لیگ اور تمام دوسری ملکی انجمنون کے آئین مین داخل ہو۔

**تاریخ تمدن**۔ مسٹر ہنری طامس بکل کی لاجواب کتاب ہسٹری آف سولیزیشن کا ترجمہ۔ فلسفہ تاریخ کی یہ بہترین کتاب ہے جسمین تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیے گئے ہین جس طرح طبیعات وغیرہ علوم کے اصول مدون ہوے ہین۔ دو جلد۔ قیمت ؏

**تاریخ اخلاق یورپ**۔ انگلستان کے مشہور و معروف علمبردار عقلیت ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی لاجواب کتاب کا ترجمہ۔ جسمین یونان و روما اور دیگر قدیم اقوام کے مذاہب فلسفہ اور اُن کے اخلاقی اثرات کی تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جلد اول ے ر جلد دوم عـہ ر

**مشاہیر یونان و روما**۔ حکیم پلوٹارک یونانی کی لاجواب کتاب "پیرلل لائیوز" کا ترجمہ جسمین یونان و روما کے اولوالعزم مدبرین اور نامور شہنشاہون کے سوانحی حالات اور ان کے بیش بہا خیالات درج کرکے ازراہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا تقابل کیا گیا ہے۔ انگریزی مترجم کو اس کتاب کے ترجمہ کے صلے مین "نائٹ" کا لقب دیا گیا جس سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ مغرب کو قعر ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہنچانے مین اس لاجواب کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حب وطن ایثار کامل بےنفسی و جان نثاری اور اولوالعزمی کی زندہ اور سچی تصویرین ان اوراق مین نظر آتی ہین۔ قیمت جلد اول عـہ ر جلد دوم عـہ ر

**تاریخ یونان قدیم**۔ اردو زبان مین یونان کی سب سے پہلی جامع و مکمل تاریخ۔ قیمت عـہ

**رہنمایان ہند**۔ ہندوون کا اصلی مذہب کیا ہے اور اس مین کیا کیا تبدیلیان ہوئی ہین۔ کرشن جی۔ سدھارتھ گوتم بدھ کی تعلیمات۔ شنکر اچارج۔ رامانج۔ بابا نانک۔ گورکھ ناتھ اور کبیر کی تلقینات اور باباجی سورداس تلسی داس اور جے دیو کے حالات۔ قیمت سعہ ر

**امرائے ہنود**۔ عہد مغلیہ کے ہندو امرا و وزرا اکابر و مشاہیر عہدہ داران و امرا کے حالات۔ قیمت عـہ ر

**نپولین اعظم**۔ اس نامور فاتح اور شہنشاہ کی مکمل سوانحعمری پانچ جلدون مین۔ قیمت عـہ ر

**مسلمانان اندلس**۔ اسٹینلی لین پول کی مشہور تاریخ کا اردو ترجمہ۔ قیمت عـہ

**البیرونی**۔ علامہ ابوریحان بیرونی مصنف کتاب الہند کی سوانحعمری اور اُن کی تصانیف پر تبصرہ۔ قیمت عـہ

**شاب لکھنؤ**۔ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کی درباری حالت۔ قیمت عـہ

**فتح قسطنطنیہ**۔ یعنی اسلام کی ایک جلیل القدر اور مہتم بالشان فتح کی تاریخ مولفہ حاجی بدرالدین احمد بی اے۔ قیمت عـہ

**محاربات طرابلس**۔ از شیخ محمد شوکت علی بی اے یعنی مسٹر ای این بینٹ نامہ نگار اخبار مانچسٹر گارڈین سابق ممبر پارلیمنٹ کی لاجواب کتاب وِدھ دی ٹرکس اِن ٹریپولی کا ترجمہ جسمین جنگ طرابلس کے چشمدید حالات ترکی افواج کی کیفیت خطۂ اسلامیہ طرابلس کے جغرافیائی، ملکی، قومی، اور معاشرتی حالات ادیبانہ و مورخانہ شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہین اور اسی وجہ سے کتاب جنگ کے بعد بھی ایک مستقل تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پڑھی جانے کے لائق ہے۔ حجم ۵۰۲ صفحے مع ۴ تشریحی نقشون کے۔ قیمت عـہ

**علوم طبیعہ کی تاریخ**۔ علوم طبیعہ کی ان تمام دریافتون اور ایجادون کی تشریح جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لیکر انیسوین صدی تک وقتاً فوقتاً عمل مین آتی رہی ہین۔ مسائل کی تحقیقات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم و جدید حکمانے ان علمی دریافتون اور ایجادون مین کیا کیا حصہ لیا۔ مضامین کی وضاحت کے لیے صدہا تصویرین دی گئی ہین۔ قیمت ہر دو جلد عـہ

**تاریخ مذہب**۔ اس مین مذہب کی ابتدا و ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذاہب مثلاً بابلی اور اسوریہ مصر اور چین اور دیگر ممالک و اقوام کے مذہب کی مختصر تاریخ درج ہے۔ قیمت ۸ر

**تاریخ مصر**۔ مصریون کے قدیم رسم و رواج طرز معاشرت و علوم وغیرہ کے مفصل حالات۔ قیمت ۸ر

**ہندوستان کی قدیم تہذیب** یعنی سر رمیش چندر دت آنجہانی کی لاجواب کتاب کا اردو ترجمہ جسکی یہ تعریف کافی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے کورس مین داخل کر لی گئی۔ قابل مترجم منشی ولایت احمد مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ لائق دید ہے۔ قیمت عـہ

**حالات گوکھلے**۔ آنریبل مسٹر گوکھلے کی جو عظمت اہل ہند کے دلون مین ہے اسکے لحاظ سے یہ افسوس کے قابل بات تھی کہ انکی کوئی سوانحعمری اردو زبان مین نہ تھی۔ مسٹر مظہر حسین خان بی اے نے یہ کمی پوری کر دی ہے۔ قیمت ۸ر

ایجنسی کی تصنیفات اور دوسری کل تصانیف کی فہرست منگا لیجیے

رجسٹرڈ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسے ۷۴ م


# الناظر


ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی



| | | |
|---|---|---|
| نمبر ۱۲۹ | ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء | جلد ۲۳ |


فہرست مضامین




الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

# معذرت

کاتب صاحبان نے اپریل کے تیسرے ہفتہ مین کام شروع کردیا تھا اور چونکہ کئی خوشنویسون سے کام کرایا جارہا تھا اس لئے تین پرچون کی کتابت کا کام ماہ مئی کے اندر اندر مکمل ہوگیا تھا مگر بسبب اسکے کہ جو صاحب کاپی اور پروف کی صحت کیا کرتے تھے وہ رخصت سے بدیر واپس آئے، چھپائی دیر مین شروع ہوئی اور رمضان کا زمانہ نہوتا تو ابتک تینون پرچے تیار ہوجاتے۔ بہرحال اس وقت مارچ کا پرچہ بھیجا جاتا ہو اپریل نمبر انشاء اللہ اگلے ہفتہ حاضر ہوگا۔ اور مئی و جون کے پرچے انشاء اللہ العزیز ۲۰ جولائی سے پہلے پہلے روانہ کردیئے جائینگے اور کوشش ہوگی کہ جولائی کا پرچہ بھی اسی مہینہ کے اندر اندر شایع ہوجائے۔

# مطبوعات جدیدہ

## روح الاجتماع

یعنے ڈاکٹر لی بان فرانسیسی مصنف تمدن عرب کی لاجواب کتاب "جماعت ہاے انسانی کے اصول نفسیہ" کا اردو ترجمہ

### ازمولانا محمد ... انصاری فرنگی محل

(بنیرۂ استاذ الہند حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم و مغفور) جسکے مطالعہ سے قوم کی عام رفتار ذہنی کی حقیقت معلوم ہوجائے گی اور عوام الناس کو اپنا ہم راے بنانے یا ملکی و قومی معاملات میں ان کی رہنمائی کرنے کا ڈھب سمجھ مین آجائے گا۔ جو لوگ قومی و ملکی کام کررہے ہین اور پبلک کی بے اتفاقی و بے حسی کا شکوہ رکھتے ہین انھین اس کتاب سے پبلک کی اصلاح کرنے مین بہت مدد ملسکتی ہے قیمت ۸؍

## البرہان فی فلسفۃ القرآن

مصنفہ

### مولانا عبدالرؤف رئیس مؤلفہ

اس ضخیم کتاب کی تالیف کا منشا یہ ہو کہ قرآن پاک مین حضرت اللہ العالمین نے انسانون کی ہدایت کے لیے جس صراط مستقیم کی رہبری فرمائی ہو لوگ اُس سے پوری طرح آگاہ ہون۔ اور اپنے دنیاوی کامون مین بھی کسی وقت اس حکیم مطلق کے ارشاد کی تعمیل سے انحراف نکرین اسلام کی تاریخ کا اصلی ماخذ قرآن پاک ہی ہو اسلیئے جو لوگ کسی امر مین اسلامی صحیح اور حقیقی تعلیم کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار ہون انھین اس تالیف سے بہت مدد ملے گی۔ قیمت جلد اول ۸؍ جلد دوم ۱۲؍ جلد سوم ۸؍ جلد چہارم ۸؍ کامل سٹ ...

# وقت پر صلاح

جو دوست ہوتے ہین وہ خطرہ سے بچنے کے لیئے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہین

## ہیضہ کی مجرب دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے، کہ موسم گرما آگیا ہے اس موسم مین کھانے پینے رہنے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف رہتا ہے اس سے بچنے کے لیئے پہلے ہی ایک شیشی اصلی عرق کافور منگوا کر اپنے گھر مین ڈال رکھین جس سے اپنے یا اپنے پڑوسیونکی وقت پر حفاظت کرسکین یہ اصلی عرق کافور چھبیس سال سے تمام ہندوستان مین جاری ہے۔ یہ عرق گرمی کے دست پیٹ کے درد کیلئے اکسیر ہے قیمت فی شیشی ۸ محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک ۵ ر

## چھ مشہور دوائیون کا بکس

ڈاکٹر ایس کے برمن کی مجرب دوائین گذشتہ ۲۶ سال سے تمام ہندوستان مین استعمال ہو رہی ہین اسلیئے قدیم خریدارون کو مخاطب کرنیکی ضرورت نہین ہے صرف نئے صاحبان کے لیئے یہ مندرجہ ذیل چھ مشہور اور مجرب دوائیات کے (نمونہ کا بکس) بنایا ہے جسمین اسقدر کافی ہے ایک ایک دوا سے ہین کی آزمائش پورے طور سے ہو سکتی ہے۔ یہ سب چھ شیشیون مین بھری ہوئی خوبصورت کاغذ کے بکس مین بند رہتی ہین جنکے ساتھ اونکے حالات کی چھپی ہوئی کتاب اور استعمال کی ترکیب بھی رہتی ہے۔

## دوائیون کا نام

عرق کافور۔ ہیضہ وگرمی کے دست کی ایک ہی دوا — مقوی باہ کی گولیان۔ جیسا نام ویسا فائدہ

دمہ کی دوا۔ فوراً دمہ کو دبا دیتی ہے۔ — جلاب کی گولیان۔ آسانی سے پیٹ صاف کرتی ہین

کولا ٹانک۔ ہر ایک کے لیئے طاقت بڑھانیکی دوا — عرق پودینہ۔ درد شکم و ریاحی درد کی دوا۔

قیمت فی بکس عہ محصولڈاک ۶ ر

## گھیگھے کی مجرب دوا

ڈاکٹر ایس کے برمن کی بنائی ہوئی گھیگھا سخت اور بہت بڑا یا بہت دنون کا ہو جانے سے آرام نہین ہوتا ہے مگر تھوڑے دن کا ورم رہتے ہی علاج برابر کرنے سے چھوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی دوا ایسے گھیگھے کو آرام کرنے کا دعوی رکھتی ہے۔ دوا ایک ماہ تک کرنا چاہیئے۔ اسمین صرف بہت کم ہے۔ دوا ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی ملتی ہے جو دو ہفتہ کے لیئے کافی ہوتی ہے۔ قیمت کھانیکی دوا ۱۲ ر لگانے کی دوا۔ ۴ ر محصولڈاک ۵ ر

**ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الناظر

نمبر ۱۲۹ جلد ۲۲ | ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

## ماہ گذشتہ

وفد خلافت کی روانگی کے ساتھ ساتھ ضرورت سمجھی گئی کہ مسئلہ خلافت کے متعلق ہندوستان کے اندر پُرزور مظاہرے ہوتے رہین، حالانکہ اس سے قبل تین مرکزی کانفرنسین منعقد ہو چکی تھین، چنانچہ سندھ، بمبئی، اور کلکتہ مین جو صوبہ واری کانفرنسین ہوئین اُن کے حالات سے تمام اہلِ نظر واقف ہین۔

مسلمانانِ سندھ کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ تعلیم جدید سے بے بہرہ ہونے کے باعث اُس حقیقی بیداری سے بھی محروم ہین جسے تمدن مغربی کا ثمرِ نورس سمجھا جاتا ہی، لیکن ہندوستان مین مسلمانون کے قدمون نے سب سے پہلے جس سرزمین کو مس کیا تھا اُسکو غفلت نے تھپک تھپک کر خواہ کتنی ہی گہری نیند نہ سلا دیا ہو، ناممکن تھا کہ "السابقون الاولون" کے طرۂ امتیاز سے مفتخر ہونے کے بعد وہ احساس سے قطعی مبرا ہو جاتی۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام صوبون مین سب سے پہلے سندھ مین صوبہ داری کانفرنس ہوئی۔ اور جس جوش و خلوص کا اظہار اہلِ سندھ نے اس موقع پر کیا اُس نے بہت سی مایوسیون کو یقیناً مبدل بہ امید کر دیا۔ اور اہلِ سندھ کے طرزِ عمل کو دیکھکر اربابِ سیاست اور اعیانِ حکومت کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ مسئلہ خلافت کوئی سیاسی تحریک نہین ہی بلکہ فی الاصل یہ ایک ایسا مسئلہ ہی جسکے بعض پہلو اگرچہ سیاسات سے تعلق رکھتے ہین مگر جسکا عنصر غالب خالص معتقدات دینی اور جذبات مذہبی ہین۔

دیگر حالات سے قطع نظر کرکے صرف ایک یہ بات کہ اس کانفرنس مین سندھ کے تمام دہ چھوٹے بڑے پیر صاحبان جنھین پیری مریدی اور اسکے متعلقہ معاملات کے سوا دُنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ تھا اپنے انصار واتباع سمیت بڑے جوش و خلوص کے ساتھ شریک ہوے مسلمانون کے مذہبی تأثر کو ہویدا کرنے کیلئے کافی ہو۔

سندھ کے بعد ہی خاص بمبئی مین، کانفرنس ہوئی جہان کے لوگ اگرچہ دن رات روپیہ پیسہ بٹورنے مین منہمک رہتے ہین تاہم حیات مذہب سے ناآشنا نہین بلکہ فقدان علم کے باعث جو خرابیان عقائد و اعمال مین پیدا ہوجاتی ہین اُن سے اگر قطع نظر کی جائے تو کہا جاسکتا ہو کہ ظاہری آثار کے لحاظ سے بمبئی کے مسلمانون کو سارے ہندوستان کے مسلمانون پر تفوق حاصل ہو۔ اسکے علاوہ بمبئی ہندوستان کے جدید تمدن کا سب سے بڑا مرکز ہونے کی بھی حیثیت رکھتا ہو، جسکی وجہ سے علاوہ تاجرون کے وہان بہت سے تعلیمیافتہ اور اہل الرائے اصحاب بھی رہتے ہین، جنھین سے افسوس ہو کہ بعض نمایان شخصیتین مرض اعتدال مین مبتلا ہوکر جدید قیام اسکیم کو کامیاب بنانے کی تمنا پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار نظر آتی ہین۔ اور غالبًا اسی جماعت کا اثر بمبئی کانفرنس مین نفوذ حاصل کیئے ہوے تھا ورنہ سندھ کانفرنس مین جو تجاویز منظور ہوئی تھین لازم تھا کہ بمبئی مین کوئی قدم اُن سے آگے بڑھایا جاتا۔ بزرگان بمبئی نے بے شبہ اس کانفرنس پر اپنا بہت سا روپیہ اور اپنے بہت سے قیمتی کاروباری گھنٹے صرف کیئے۔ مہمانون کی خاطرداری اور اُن کے لیئے قیام و طعام وغیرہ کا بہتر سے بہتر انتظام کرنے مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا۔ غرضکہ ہر طرح کانفرنس کو شاندار اور بمبئی جیسے عظیم الشان شہر کے شایان شان بنانے کی کوشش کی۔ لیکن نفس مسئلہ خلافت کے متعلق اس کانفرنس مین کوئی کارروائی ایسی نہین نظر آتی جسکی نمایان خصوصیت کا اثر محسوس کیا جائے۔ اور کانفرنس کی یہ حیثیت اس درجہ واضح رہی کہ ایک معتدل اخبار کا نامہ نگار خصوصی جو اس کانفرنس مین ازابتداتاانتہا شریک تھا اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوا کہ

> ہوکوئی ایسی تجویز نہین پیش کی گئی جسکے متعلق یہ کہا جاسکے کہ وہ "تصفیہ" کی ایک صورت ہے، وہ جسکی بنا پر انگلستان مین خلافت ڈیپوٹیشن کے اراکین اور مسلمانون کے قائم مقام صلح کانفرنس سے کوئی گفت و شنید کرسکین اور اس اہم مسئلہ کا کوئی قابل اطمینان فیصلہ ہوسکے"!

واقعہ اصلی یہ ہو کہ جو لوگ اس نازک ترین زمانہ مین بھی سر ولیم و نسنٹ یا سر جارج لائیڈ کو اپنے مشورون مین شریک کرتے نہیں شرماتے اور ان کی رایون کا اثر لیئے ہوے قومی جلسون مین تشریف لاتے ہون ان سے اسکی

توقع بھی عبث ہو کہ وہ کوئی حقیقی طور پر مؤثر ہونے والی تجویز پیش کرینگے یا متطور ہونے دینگے۔ مگر مشکل یہ ہو کہ قوم کے سربرآوردہ افراد مین بالاکثر اسی قسم کی کمزوریون کا شکار ہو رہے ہین اور جو لوگ ایسے سے آزاد ہین وہ تنہا اپنی قوت پر اعتماد نہین کرتے، اور کرین بھی تو پراگندگی جماعت اور انتشار قوت سے اندیشے سد راہ ہوتے ہین۔

باقی غنیمت یہ ہو کہ بمبئی کی خلافت کانفرنس سے جو توقعات پوری نہین ہوسکی تھین ان کی پوری پوری تلافی بزرگان کلکتہ نے کردی۔ اگرچہ کلکتہ بھی وہ کلکتہ نہین رہا جو اب سے آٹھ سال پیشتر تھا تاہم خدا بھلا کرے مولانا ابوالکلام آزاد کا کہ اُنھون نے وہان کے مسلمانون مین ایک نئی روح پھونکدی ہے اور اگرچہ ان کی نظربندی کے زمانہ مین بعض واقعات ایسے پیش آئے جنکی وجہ سے مسلمانان کلکتہ پھر سابقہ جمود و سکوت کی طرف عود کر چلے تھے، لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہو کہ اس شدید ترین ابتلا نے اُنھین پھر ہوشیار کردیا۔ اور اب چونکہ مولانا بھی آزاد ہین یقین رکھنا چاہیئے کہ بیدارت کا اثر آئندہ ناپید نہونے پائے گا،

اواخر فروری مین جبکہ کلکتہ کی خلافت کانفرنس کا عظیم الشان جلسہ ہو رہا تھا۔ رائٹر نے یہ خبر سنائی کہ مجلس صلح نے جسکے اجلاس اسی زمانہ مین بمقام لندن ہو رہے تھے۔ یہ طے کیا ہو کہ قسطنطنیہ بدستور سابق حضرت خلیفۃ المسلمین کی حکومت کا دار السلطنت رہے گا۔ اس خبر سے مسلمانون کو چاہیئے تھا کہ اطمینان ہوتا۔ مگر اطمینان کے بجائے ان کا غم و غصہ اور مشتعل ہوگیا۔ اس لیئے کہ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ مجلس صلح کے اس تصفیہ نے انگلستان کے ایک وسیع طبقہ مین تعصب و عناد کا بالکل ویسا ہی جوش نمودار ہوگیا ہو جس نے صدیون تک صلیبی جنگون کے ذریعہ فلسطین کی مقدس سرزمین کو خاک و خون مین آلودہ رکھا تھا۔ ایک طرف آرچ بشپ آف کنٹربری کی سرکردگی مین بہت سے معززین برطانیہ اور معتدرارکین دارالعوام نے مجلس صلح کا تصفیہ سنکر ایک طوفان سرپر اُٹھالیا، دوسری طرف دارالعوام مین اس کا ذکر آیا تو مباحثہ کے دوران مین خود وزیر اعظم انگلستان نے اس فیصلہ کو حق بجانب ثابت کرتے ہوے جو تقریر کی اسمین دارالخلافہ پر سلطانی قبضہ کی ایسی توضیح بیان کی جس نے دول اتحاد کے منصوبون کی اصلی نوعیت بھی طشت از بام کردی۔

مسلمانون کے دل بھی آخر گوشت و خون ہی سے بنے ہین۔ پتھر کے تو نہین کہ سخت سے سخت ٹھوکرین بھی ان مین کوئی حرکت پیدا نہ کرین۔ چنانچہ جو لوگ کلکتہ کے اجلاس مین شریک تھے۔ انھون نے غم و غصہ کی اُن

کیفیات کا نظارہ دیکھا ہوگا جو ان واقعات کے بیان کیے جانے پر تمام مسلمانوں کے قلوب پر طاری ہوئی تھیں۔ دور نشینوں کو قطعاً اس حالت کا اندازہ نہیں ہو سکتا، لیکن جو قراردادیں اُس موقع پر منظور ہوئیں اُن سے ہوا کا رُخ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب نے جو مسلمہ طور پر کوئی خطیب یا مقرر نہیں ہیں۔ تقریباً دو گھنٹے تک نہایت پُرجوش تقریر فرمائی اور جو کچھ کہ صاحبانِ مصلحت کے نزدیک زبان سے نہ نکلنا چاہیے تھا بے تکلف فرما دیا۔ افسوس ہے کہ اس تقریر کا کوئی مختصر خلاصہ بھی ہماری نظر سے نہیں گذرا۔

اسی جلسہ میں یہ طے پایا کہ ۱۹ مارچ کو پھر یوم خلافت منایا جائے اور سارے ملک میں ہڑتال و جلسے کر کے مسلمانوں کا آخری پیام گورنمنٹ کو بھیجدیا جائے کہ "اگر خلافت جزیرۃ العرب اور دیگر مقامات مقدسہ کے مسائل کا تصفیہ مسلمانوں کے مطالبات اور شریعت کے خلاف ہوگا تو مسلمانانِ ہند کے لیے بڑے احکام مذہبی ناممکن ہو جائیگا کہ اُن کی دنیوی وفاداری جوں کی توں برقرار رہے"۔

دوسرا یوم خلافت جس جوش و خروش کے ساتھ سارے ہندوستان میں منایا گیا اُس سے کسی قدر مسلمانوں کی غمزدگی اور سراسیمگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگرچہ بعض مقامات پر مصلحت بین اصحاب کی رائے سے متاثر ہو کر خلافت کانفرنس کلکتہ کی تجویز کے خلاف آخری پیام کے الفاظ میں کسی قدر تبدیلی کر دی گئی تھی۔ مگر تقریباً ہر جگہ مقررین نے صاف صاف اپنے دلی خیالات کا اظہار کر دیا۔ جسکے بعد اگر گورنمنٹ برطانیہ کے ذمہ دار وزرا ہمارے مطالبات سے بے پرواہ ہو جائیں تو انھیں اپنی عاقبت بینی اور تدبر کا فاتحہ پڑھ دینا چاہیے۔

گو مسٹر محمد علی اور ان کے شرکا کو جو جواب خشک و تلخ وزیر اعظم انگلستان نے دیا۔ اُس سے تو صاف یہی عیاں تھا کہ مسلمانوں کی سوا سال کی تمام جد و جہد کے باوجود مسٹر لائڈ جارج کو ان کے جذبات کی پرکاہ کے برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔

اہلِ انگلستان کے متعصبانہ جذبات کی آتش فشانی کا ایک نتیجہ تو بہرحال ہمارے لیے مفید ہوا یعنی یہ کہ وہ لوگ جو اس سے قبل دول متحدہ کی مخاصمانہ روش کے اندر کسی قسم کے مذہبی تعصبات کو دخیل نہیں سمجھتے تھے اور اس دھوکے میں مبتلا تھے کہ حکومت ترکی سے جسقدر بیزاری ہے وہ یا تو محض جنگ میں اُسکی مخالفانہ شرکت کا نتیجہ ہے۔ یا سیاسی حیثیت سے یورپ کے دول عظام اور امریکہ کا معیار حکومت چونکہ ترکی حکومت کے

مقابلہ میں زیادہ تر آزادی و حریت پر مبنی ہو انہیں سے اتحادی ترکون کی حکومت کا تجزیہ کر دینا چاہتے ہین اب سمجھ لیجئے کہ یورپ کے سیحی باشندون نے جن جذبات کی بنا پر آج سے ساڑھے سو سال قبل تک صلیبی جنگون پر کرورون انسانون کی قربانی چڑھائی تھی باوجود مادیت اور لا مذہبی کے رواج عام کے اسوقت تک وہی جذبات و خیالات اُن کے قلوب پر حاوی ہین اور مدبرین یورپ کی ڈپلومیسی کا پردہ اس طریقہ پر فاش ہو جانے کے بعد نا ممکن تھا کہ ایسے بھولے مسلمان بھی تحریک خلافت مین ہمارے دوش بدوش نہ کھڑے ہو جائین چنانچہ ہم نے دیکھا کہ انگلستان کے لاٹ پادری کے سفر عام پر آنے کی خبر پاتے ہی بزرگان دیوبند جو اب تک اسے محض ایک سیاسی تحریک تصور کرنے کی وجہ سے خاموش تھے علی الاعلان میدان عمل مین آگئے اور اب شاید ہندوستان مین معدودے چند افراد کے سوا مسلمانون کی کوئی جماعت ایسی نہین جو بقا و تحفظ اقتدار خلافت کے لیئے جانبازی کو تیار نہو۔

کلکتہ ہی مین ولایتی کپڑے کے مقاطعہ کا اعلان کیا گیا، اور اخبارات کی روایت یہ ہو کہ مسلمان تاجران کلکتہ کے دلون پر ان سب باتون کا ایسا اثر ہوا کہ کچھ دنون کے بعد انگلستان کے بعض ایجنٹ مال کی فرمائش لینے کے لیئے ان کے پاس گئے تو انھون نے قطعاً اسوقت تک مال کی خریداری سے انکار کر دیا جب تک کہ مسئلہ خلافت کا تصفیہ مسلمانون کے مطالبات اور مذہبی احکامات کے مطابق نہ ہو جاے۔ اسی کو کہتے ہین کہ ع خدا شرے برانگیزد کہ دردے نفع ما باشد،

انگلستان جس نے ۱۹۱۴ء کی ان نازک گھڑیون مین جبکہ بظاہر آثار جرمنی کی فوجی قوت اتحادیون کو پامال کر دینے والی تھی۔ اپنی تمام مملکت کے معابد مین تائید ایزدی کے لیئے گڑگڑا کر بارگاہ الٰہی مین دعائین مانگی تھین۔ کتنی جلد اپنی اس حالت کو بھول گیا ہی اور جن لوگون کی مدد حاصل کرنے کے لیے اسوقت طرح طرح کے مواعید کئے گئے تھے۔ آج کیسی بری طرح وہ اُن کے جذبات کو ٹھکرا رہا ہو۔ بے شبہ مسلمان ڈیڑھ سو سال تک غلامانہ زندگی بسر کرنے اور اسلحہ سے محروم ہونے کے باعث آج اس قابل نہین ہین کہ حکومت سے کھلی کھلی غداری کرین مگر کیا اہل انگلستان کی تنبیہ کے لیئے کلکتہ کانفرنس کی یہ قرارداد کافی نہین ہو۔ کیا اس سے وہ اتنا نتیجہ بھی نہین نکال سکتے کہ اگر آئندہ پھر کبھی کوئی لڑائی ہوئی اور انگلستان کو ہندوستانیون اور علی الخصوص مسلمانون کی وفادارانہ امداد کی ضرورت پڑی تو اسوقت اس جنس کا ایسا قحط ہوگا کہ گویا کبھی ہندوستان مین اسکی پیداوار ہی نہ تھی۔

ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور آج پھر اسی کا اعادہ کرتے ہین کہ ہمارے نزدیک انگلستان کا عروج کمال اپنی منتہا کو پہونچ چکا اور اسکے انحطاط و زوال کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اور جسطرح حکومت روما کے کمال عروج کے عہد مین کسی رومی کو اسکا وہم و گمان بھی نہین ہو سکتا تھا کہ چند صدیون کے بعد روما کی حالت ایسی دگرگون ہو جائے گی کہ ایک انگریز مورخ (ایڈورڈ گبن) کو چار ضخیم جلدون مین روما کے انحطاط و زوال کی تاریخ لکھنے کا موقع ملے گا۔ بعینہ اسی طرح آج انگلستان کے کسی بڑے سے بڑے مدبر کو اسکا گمان بھی نہین ہو سکتا کہ گذشتہ تین سو برس کی مسلسل جد و جہد اور برطانیہ عظمیٰ کے بہترین دماغون کی متحدہ سعی و کوشش نے اسوقت انگلستان کو عظمت و اقتدار کی جس منزل پر پہونچا دیا ہے وہ اب خود اپنے ہی وزرا اور باشندون کے ہاتھون اس سے چھین رہی ہے۔ اور گو اسوقت یہ پیشینگوئی کرنا ممکن نہین کہ زوال و انحطاط برطانیہ کی تاریخ لکھنے والا کس ملک کا باشندہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ہندوستانی ہی ہو۔ لیکن اسمین شبہ نہین کہ اس تاریخ کی تدوین کا زمانہ روز بروز قریب آتا جاتا ہے۔

مسلمانون کے لیے یہ نازک ترین امتحان کا موقع ہے۔ خصوصاً ہم مسلمانان ہند کی حالت تو اسوقت قطعی طور پر بالکل ناقابل رشک ہے۔ لیکن مسلمانون کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ہلاکو خان نے دار الخلافہ بغداد کو ضرور پامال کیا۔ لیکن اسلام کے اقتدار پر اسکو دسترس حاصل نہین ہوا بلکہ ماتم و شیون کی صدائین ابھی بغداد کی گلیون مین موقوف بھی نہ ہوئی تھین کہ اندلس کی سرزمین پر ابن الاحمر کے عروج و اقبال کا آفتاب نصف النہار پر پہونچ گیا اور پھر ڈھائی سو سال تک شوکت غرناطہ کے غلغلون سے تمام عالم اسلامی گونجتا رہا۔ تباہی بغداد کے چالیس برس بعد ہی آل عثمان کی حکومت قائم ہوئی جسکی نوجوانی کے شیشے آج بھی بسبب ساز و سامان ہے اور اس چھ سو برس کے عرصہ مین ایشیا یورپ و افریقہ تینون براعظمون مین آفتاب اسلام کی ضوفشانی کے واقعات ابھی تاریخ سے محو نہین ہوئے ہین۔

لہذا آج جبکہ یورپ کی مسلسل عیاریون اور چالبازیون کی بدولت اور بدنصیبی سے خود مسلمانون کے ہاتھون ترکی کا مریض نیم جان ہو رہا ہے مسلمانون کو یقین رکھنا چاہیے کہ مادر فطرت دنیا کے کسی دوسرے حصہ مین ایک نئی اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈال چکی ہوگی جو قبل اسکے کہ ٹرکی فنا ہو۔ بیشتر اس کے کہ دنیا سے مسلمانون کے ظاہری عروج و اقتدار کے نشانات محو ہون۔ پہلے اس سے کہ اسلام کا نیر تابان پھر افق مغرب مین غروب ہوتا نظر آئے ہلال عید کی طرح خوابیدہ فضائے آسمانی پر چمکنے لگا۔ اور انشاءاللہ

چند ہی سال مین بدر کامل بنکر تمام عالم کو منور کردے گا۔

قیاس اور تخیل پر زور ڈالنے کی حاجت نہین اور خطرات کا نظم ونسق ہمارے منطقی دلائل و نتیجات کا تابع ہوکر حسب صلاح دوا اور دوسرے چارہ پیدا کرتے ہین۔ اسی طرح اقوام کے زوال و فنا یا نمود و بقا کے متعلق بھی علت و معلول کی سلسلہ جنبانی سے ہم صحیح آثار و نتائج تک پہونچ سکین۔ یہ نہین کہا جا سکتا کہ یہ جدید اسلامی سلطنت نجد و حجاز کے ریگستانون سے یا کوہ قاف اور البرز کی پہاڑیون سے، دجلہ و فرات کے دوآبہ سے یا افغانستان اور ترکستان کی وادیون سے یا دنیا کے کسی اور خطہ سے پیدا ہوگی۔ لیکن یہ ناممکن ہو کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثارون اور غلامون کی عزت و آبرو یورپ کے پُرفن مدبرون کے ہاتھون ہمیشہ کے لیئے خاک و خون مین ملجاوے اور خداوند قدوس کا دریاے غیرت و رحمت جوش مین نہ آوے، انشاء اللہ العزیز تھوڑے ہی دنون مین بساط سیاست پلٹ جائیگی اور آپ دیکھین گے کہ آج جو لوگ بیمار ترکی کے سرہانے بیٹھے ہوے نہایت بیرحمی اور کمال سنگدلی کے ساتھ اُسکے مال و متاع کی باہمی اور من مانی تقسیم مین مصروف ہین کل انشاء اللہ خود ان کے گھرون کی اینٹ سے اینٹ بج رہی ہوگی اور وہ خدا بہ رعونت و کبر کے ساتھ تمھاری عرضداشتون کو ٹھکراتے یا کید و فریب کی آڑ مین تمھاری درخواستون کو مسترد کر رہے ہین کل یہی کاسہ گدائی خدا نے چاہا تو ان کے ہاتھ مین ہوگا اور جن کو آج انھون نے بھیک کا ٹکڑا نہین بلکہ ایک جائز حق الخدمت دینے مین بقدر بخل اور اس درجہ دنائت کا اظہار کیا ہو وہی اللہ کی مرضی ہو تو ان سے اپنی بیوفائیون اور طوطا چشمیون کا اعتراف کرائینگے۔

مسلمانون کو ہراسان نہونا چاہیئے۔ اور ایک لمحہ ایک ساعت کے لیئے نہ بھولنا چاہیئے کہ خود خداوند جل و علا نے بحکم لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ کا پیام امید بھیجکر مایوسی سے منع فرمایا ہو۔ البتہ ضرورت اسکی ہو کہ مسلمان اپنے مصائب جانفرسا پر متنبہ ہوکر خود اپنے معائب، اپنی کمزوریون اور اپنی بدعنوانیون کا اندازہ لگائین اور ہمہ تن اسکی اصلاح مین سعی کرین اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کی ظاہری تدبیرون سے غافل نہون۔

اب جبکہ حکومت کو آخری پیام بھیجا جا چکا ہو تو اسکا قطعاً کوئی محل نہین کہ اس بارہ مین خود ارباب حکومت سے مزید عرض معروض کرین۔ وہ وقت بھی تھا جبکہ ہم گفت و شنید کے ذریعہ سے تصفیہ معاملات کی توقع کرتے تھے۔ اور اسوقت ہم نے الحمد للہ کہ اسمین کوئی کوتاہی نہین کی۔ ہان البتہ ہمین اپنے درمیان اتحاد عمل پیدا کرنے، اپنی قوم کو خطرات اور فرائض سے پوری طرح آگاہ کرنے اور ایک مستقل نظام عمل بنانا کہ

ساری قوم کو اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کے واسطے آمادہ کرنے کی ضرورت ہے اور آئندہ ہماری ساری توجہ ہماری تمام کوشش اور ہماری پوری ہمت اسی پر صرف ہونا چاہیے۔

خوشی کا مقام ہے کہ مہاتما گاندھی اور دیگر سربرآوردہ ہندو رہنما ہمارے ساتھ پوری ہم آہنگی کر رہے ہیں اور ان کی رہنمائی و رہبری میں ہندوستان کے کروروں ہندو بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں چنانچہ ابھی مختلف خلافت کانفرنسوں میں بھی اتحاد و یگانگی کی روح پوری طرح نمایاں رہی اور یقین رکھنا چاہیے کہ آئندہ جیسے جیسے ہندو مسلمانوں کا احساس قومیت اور جذبۂ وطنیت نشو و نما پاتا جائے گا دونوں میں اتحاد عمل اور یگانگت بڑھتی جائے گی کہ اسی پر خود ہندوستان کی آئندہ عزت و عظمت کا انحصار ہے۔

---

ہندوستان کے دو نامور اور قابل فرزندوں نے سالہا سال کی جلاوطنی کے بعد اسی ماہ میں اپنے وطن کو مراجعت کی ہے۔ لالہ لاجپت رائے جو بے شبہ خراب خانۂ پنجاب کے چشم و چراغ کہے جانے کے مستحق ہیں عرصے سے امریکہ میں تشریف رکھتے تھے اور باوجودیکہ کوئی خفیف سا خفیف جرم بھی اُن سے سرزد نہیں ہوا تھا لیکن غالباً اس سبب سے کہ لالہ صاحب کی موجودگی میں پنجاب کے خود سر لوور سید ردکام بد نصیب پنجابیوں پر وہ تمام سختیاں نہیں کر سکتے تھے جو سر مائیکل اڈوائر جیسے ظالم و جابر حکمران کے عہد حکومت میں جاسکے ان بدبخت بھائیوں پر ہونا تھیں ان کو واپسی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ مگر جب پانی سر سے گزر گیا اور کاسۂ خون چھلک چکا تو بالآخر زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کے لئے خدا خدا کر کے لالہ جی کو ہندوستان آنے کی اجازت ملی۔ لالہ جی نے اپنے قیام امریکہ کے دوران میں جو قیمتی خدمات اپنے اہل وطن کی انجام دی ہیں ان کے لحاظ سے اُن کی یہ جبریہ جلاوطنی بھی ایک طرح کی رحمت کہی جا سکتی ہے۔ بہرحال ہم ان کی معاودت وطن پر اظہار طمانیت و مسرت کرنے کے ساتھ ساتھ لالہ جی کا دلی خیر مقدم ادا کرتے ہیں۔

عزیز محترم شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹر ایٹ لا معتمد انجمن خدام کعبہ و سکریٹری اسلامک سوسائٹی لندن بھی چھ سات سال کے قیام انگلستان کے بعد ہندوستان واپس آگئے ہیں۔ مسئلہ خلافت کے متعلق آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کی جزا تو انشاء اللہ خدا کے یہاں سے ملیگی ہم صرف ان کا اعتراف کرتے اور آپ کی معاودت وطن پر دلی مسرت و طمانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ غالباً پھر انگلستان واپس چلے جائینگے۔ اس لیے کہ وفد خلافت کو آپ سے جو قیمتی مدد مل سکتی تھی اُس سے وہ محروم رہے گا۔

# قسطنطنیہ کا مستقبل

ابتداے جنگ سے اب تک ترکون کی شرکت جنگ کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے گئے ہین وہ خواہ کسی قسم کے ہون، لیکن بپایان کار جرمنی کی شکست اور ترکون کے ہتیار رکھدینے سے اتحادیون نے جو رائے بیان اختیار کیا ہے، وہ یورپ کے ناصیۂ حریت کیلئے نہایت شرمناک ہے ہرچند ان فاسدانہ خیالات سے مسلمان قطعاً ناامید و مایوس نہین ہو سکتے، تاہم یہ یقین کرلینا چاہیئے کہ یہ خیالات اور یہ مقاصد تمام اسلامی دنیا مین ایک شدید برہمی پیدا کر دینگے اور گذشتہ عالم آشوب جنگ اقوام کے بعد جب ترکون کو ان کے پانچسو سالہ وطن سے نکالا جائیگا تو ان کی تلوارین نیامون سے نکل آئینگی اور دنیا ایک بار پھر شدید و خونریزی مین مبتلا ہو جائیگی۔

صلح جس زمانہ مین اور جیسی حالت مین ہمارے سامنے پیش ہوئی، وہ زمانہ ابتدائے جنگ سے زیادہ نازک اور کمزور زمانہ تھا۔ کیونکہ آغاز حرب مین نہ یہ امید تھی کہ مقامات مقدسہ کا ایسا اندوہناک حشر ہوگا، نہ مسلمانون کے متعلق یہ گمان ہوسکتا تھا کہ ان کی فوجین مکۂ معظمہ اور بیت المقدس کے میدانون مین اپنے بھائیون کے سینون پر گولیان چلائینگی، حالانکہ سرکار عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صاف صاف فرما دیا تھا کہ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فِسْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ[1] یعنی مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ اللہ اللہ! جس رسول اور ہادی صادق و مصدوق نے یہانتک ممانعت کر دی ہو اور کہہ دیا ہو کہ خبردار تمھارے ہاتھون اور تمھاری زبانون سے کسی ایسے شخص کو بھی ضرر نہ پہونچے جس کی زبان سے کلمہ توحید نکلا ہو، اس کی امت ان مبارک و مقدس سینون کو اپنی بندوقون کا نشانہ بنائے، جن کی اطاعت و فرمانبرداری کیلئے اس نے ان الفاظ مین تاکید کر دی ہو کہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی جس نے میرے حاکم کی اطاعت کی سمجھ لو کہ اس نے میری اطاعت کی اور پھر اپنی اطاعت کی بندگی کے لئے فرمایا من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ[2] غرض مطلب یہ کہ ایک طرف مسلمان، اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرکے گوشت و پوست کے خداؤن کے آگے سربسجود ہیں

---

[1] اس حدیث کو عبداللہ بن مسعود، ابو ہریرہ اور سعد نے روایت کیا ہے غالباً ابن ماجہ کی تیسری جلد کے باب تحریم الدماء مین ہے [2] رواہ ابو ہریرہ اخرجہ النسائی فی جزء الثانی

اور دوسری طرف جنگ ختم ہوگئی تو اسوقت جب ہمارا کاروان لُٹ چکا ہوگا، جب ہمارا گھر ہم سے چھین لیا جاچکا ہوگا، جب ہمارے مقدس مقامات عیسائی حکومتون اور دولت پرست مسلمانون کے زیراثر آچکی ہونگی جب ہماری آخری متاع حیات کو بھی دشمنان اسلام غصب کرلینے کی فکرون مین مبتلا ہونگے اور سب سے زیادہ یہ کہ عالم اسلامی کا مرکز سرحدات بھی معرض خطر مین پڑا ہوگا۔ اگرچہ ہمین پہلے ہی انجام کی اِس تلخ حقیقت پر غور کرلینا چاہیئے تھا اور پیش آنے والے واقعات کے روشن وتاریک دونون پہلوؤن پر ایک جمیع اور مدبرانہ نظر ڈال لینی چاہیئے تھی۔ لیکن یہ ہمارے اعتقاد کا تزلزل اور ہمارے یقین کی وہ اضعف ترین کمزوری تھی جس سے بے ایمانی وباطل پرستی کی حد مین ملتی تھین کہ خدا کو چھوڑا، رسول عربی کو چھوڑا، لیوا برداران توحید اور جانشینان پیغمبر ہاشمی (روحی فداہ) کو چھوڑا، اور انسانون سے رشتہ جوڑکر طلائی بتون کو اپنا کلیہ آمال بنایا، زرین کرسیون کے آگے سر جھکادئے اور واہیانہ پکار اُٹھے۔

سپردم بتو مایہ خویش را تو دانی حساب کم وبیش را

نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب فروشی اور بغی وعدوان کی لعنتون مین مبتلا ہوکر امرتسر اور گوجرانوالہ مین اپنا قتل عام کرایا، فوج کے وحشیون کو عاجزانہ سلام کئے، اپنی ماؤن اور بہنون کی عصمتون کو تاراج کرایا اور بازارون مین پیٹ کے بل رینگے۔

یہ سب کچھ ہوا کہ اپنے ہی ہاتھون سے اپنی قسمت کو بگاڑا تھا، اپنی ہی گرفتاری کے لئے زنجیرین تیار کی تھین، اپنے ہی سینون مین پیوست کرنے کے لئے خنجر ڈھالے تھے۔ مگر اب کہ زخم کاری لگ چکا ہے دست عمل ہتکڑیون مین گرفتار رہے اور چارون طرف موت کی تاریکیان محیط ہورہی ہین، ہم تلافی مافات کے لئے دست عمل کو حرکت دینا چاہتے ہین اور حیات کی روشنیون کی تلاش مین نکلے ہین۔ لوگ ہنستے ہین اور ان کا ہنسنا بیجا نہین کہ خود ہم نے ان کو ہنسنے کے قابل بنایا ہے اور ہمارے ہی ان بھائیون نے جن کے پیٹون مین آج خلافت کے درد اُٹھ رہے ہین۔ کل ہلال احمر کا سامان صلیب احمر کی نذر کیا تھا، کہ اسوقت ان کے ایمان وخادع کی رخصت اسی مین تھی۔

کہنے والون نے کہا جو کچھ وہ کہہ سکتے تھے، احسان فراموشون نے طعنے دیئے جو وہ دے سکتے تھے اور طالبان عزوجاہ وشیاطین زعیمیت نے بھی درد اسلام اور غم خلافت کے باوجود اپنے جلوس نکالے اور اپنے درد واضطراب کے اظہار وبیان کے لئے لغو اور مہمل تقریرین کین، اور ہم نے سنین اور خون کے

گھونٹ پی پی کر رہیں اور نہ سنتے تو کیا کرتے کہ اپنے ناصیۂ مشؤم کے چھپکتے ہوے بدنما داغون کو کس طرح چھپا سکتے تھے لیکن باوجود ان تمام باتون کے بے غیرت بنکر اپنے زخمون کی مداواطلبی کو نکلے ہین اور چاہتے ہین کہ جن ہاتھون کو ہم نے زنجیرون مین گرفتار کیا تھا، جن گلون پر ہم نے تلوارین چلائی تھین، جن سینون کو ہم نے توپون کے نشانون سے خاک وخون مین تڑپایا تھا، انھین گرفتاریون سے نجات دلائین، خون چکان زخمون پر مرہم کے پھاہے رکھین اور جن میدانون مین ہم نے شیطان پرستانہ ملوکیت کے ڈیرے ڈالے تھے، ان کے لئے کوئی تدبیر کرین۔ لیکن کیا اس تدبیر اور ادا ے فرض کے حدود کی وسعت صرف اسی قدر ہے کہ شاندار استقبال کئے جائین، سپاسنامے پیش ہون اور جلسون مین تجویزین منظور کرلی جائین؟ اور کیا بقا وتحفظ خلافت ومقامات مقدسہ کیلئے صرف وفد لیجانے ہی کفایت کرتے ہین؟ اور کیا رہنمائی وپیشوائی کے وہ مدعیان خادع اس سے بھی زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے کوئی بغاوت کر سکتے ہین کہ اس علم کے بعد بھی کہ انگلستان کو مسلمانون کے ساتھ کوئی ہمدردی نہین بلکہ وہ ہمیشہ ان کی ترقی سے خائف ولرزان رہتا ہے اور اس کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ جس طرح بھی بن سکے مسلمانون کا سر کچل دے[5]، عاجزانہ وگدایانہ التجائین لیجاتے ہین اور کہتے ہین کہ اگر ترکون کو یورپ سے نکالا گیا تو ہمین سخت تکلیف ہوگی اور اس رنج وغم مین ہم اپنی چوڑیان توڑلین گے؟ اور کیا اس سے بھی زیادہ باطل پرستی اور فقدان ایمان کی کوئی دلیل ہوسکتی ہے کہ یہ جاننے کے بعد بھی کہ انگریز مدبر کی جو آواز بلند ہوگی وہ اسلام اور مسلمانون کے لیے سب سے زیادہ غدار آواز ہوگی[6]، تشکر وامتنان کی نذرین پیش کیجاتی ہین اور اس کے صدقے مین خلافت کی بھیک مانگی جاتی ہے؟

حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی!

آج اسلام اپنے تمام فرزندون سے، عام اس سے کہ وہ مصر مین ہون یا چین مین، ایران مین ہون یا ہندوستان مین ان کی آخری خدمتون کا طالب ہے۔ اسے اسوقت انگریزی دوکانون کے سوٹ پہننے والون اور سرون پر ہلال کا نشان چمکانے والون سے تعلق نہین، اسے اس وقت مجلس طرازیون اور تجویز سازیون کی اضعف ترین خدمت سے سروکار نہین بلکہ وہ آج اپنے فرزندون کو پکار رہا ہے جنکی موت وزیست اسلام کے مرکز سیاسی کی حیات وممات کے ساتھ وابستہ ہے اور جن کے دلون مین

---

[5] مسٹر بلنٹ۔ [6] دیکھو مسٹر بلنٹ کا مضمون انگلش مین

اسقدر قوت ایمانی موجود ہے کہ ان کے ہاتھ اسوقت بھی شل نہین رہ سکتے جب زنجیرون کے شکنجہ مین کھنچے ہون۔ سرکار عالم کا ارشاد ہے :۔ من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ [۱] تم مین سے جب کوئی کسی بات کو دیکھے جو اللہ اور اسکے رسول کے اوامر و احکام کے خلاف ہو تو چاہیے کہ اپنی ہاتھون کو حرکت دے اور اس ظلم و طغیان کو روکدے۔ اور پھر اسی کے ساتھ، کلمہ حق کے اعلان و ارشاد کیلئے قوت زبان اور زور بیان سے بھی کام لے کہ اس حالت مین افضل ترین جہاد، جہاد لسانی ہے [۲] پھر یہ کیا ہے کہ آپ چند دن کے مراثیے کرتے ہین، اور فرنگی محل کے ممبر اور مسلم لیگ . . کے اسٹیج سے ماتم گسارانہ اور کمزور آوازین بلند کرتے ہین، جو محض بے سود ہین۔ کیونکہ انگلستان کی وزارت اگر کسی قوت سے متاثر ہوسکتی ہے تو وہ ایک صرف ایک ہے۔ جسے میری زبان سے نہین، بلکہ ایک انگریز کی زبان سے سنئے، جو نہایت آزادی سے کہتا ہے :۔

"برطانوی حکومت (جہان تک مسلمانون کے معاملات سے اس کا تعلق ہے) اگر کسی قوت سے متاثر ہوسکتی ہے اور انگلستان کے دفتر وزارت پر کسی ضرب کا اثر ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ صاف صاف کہدیا جائے کہ جبتک حکومت برطانیہ دشمنان اسلام کی کارروائیون مین شریک ہے اسوقت تک ہندوستان کے کرورون مسلمان بھی وفادار نہین اور اسی کے ساتھ مسلمانون کو بھی چاہیئے کہ وہ امداد و اعانت اور اتحاد و یکجہتی کے طرز عمل کو یک قلم ترک کردین [۳]

لیکن افسوس ہے کہ آج سات کرور زبانون مین ایک زبان بھی نہین جو باوجود دعوی حق پرستی اور باوصف اظہار رنج و الم اور گریہ و ماتم، کم از کم یہی کہنے کو تیار ہوجائے، جسکا ایک غیر مسلم تمنائی ہے مسلم لیگ نے مسئلۂ خلافت کے متعلق جو تجویز پاس کی، اگر مولانا حسرت کی بلال وش ذات نہ ہوتی تو وہ تجویز اس سے زیادہ نہ تھی کہ فقیر کی آواز تھی! اور آہ نرم آہ کہ مرکزی خلافت کمیٹی قوم کا سب سے پہلا فرض تھا کہ مقاطعہ کی تجویز کو عملی صورت مین لانے کے لئے انتظام و اہتمام کرتی اور انگریزی مال کو بر سر عام آگ لگا دیتی۔ سب کی مخالفت کی۔ پھر لطف یہ ہے کہ انہون نے بھی اپنی زبان کو جنبش نہدی جو کل تک کہہ رہے تھے۔

---

[۱] رواہ ابوسعید خدری فی المسلم ۱۲ [۲] افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جابر رواہ الترمذی و ابوداؤد۔
[۳] مسٹر لینٹ کا مضمون مندرجہ الحبیث، ۱۳ ۱۹۱۳ء ۱۲

یہ بھی کیا پیروی حق ہے کہ سب ہیں خاموش
ہاں! اناالحق بھی ہو، منصور بھی ہو، دار بھی ہو

اور انتہا یہ کہ سب سے پہلے جن کے حلقوم سے ہجرت کی آواز نکلی تھی اور جو حکومت سے پروانۂ راہداری مانگتے تھے، سکوت طراز ہیں حالانکہ

در مدرسہ کس را نرسد دعوی توحید
منزل گہ مردان خدا بر سر دار ست

پھر وہ جو منصۂ عام پر تقریریں کرتے کرتے بسورنے لگتے ہیں اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ صحافت کے مالک و "مختار" ہیں، بتلائیں کہ انہیں کس بات پر ناز ہے؟

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز!
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا!

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے قافلے کے جو ساربان ہیں اور جن ارباب دین اور دانشمندان پیشوائی نے، ہماری زندگی و موت کے سر رشتے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھے ہیں، وہ ہاتھ خود ایسے ہیں کہ ابتدا امداد و اعانت کے لیے اٹھ چکے ہیں اور جس وقت قبائے خلافت کے القراض کے لیے قینچیاں تیار کیجا رہی تھیں، خاموش بیٹھے تھے۔ حالانکہ اگر بولنے کا کوئی وقت تھا تو صرف وہی کہ

نوا را تلخ تر می زن، چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خوان، چو محمل را گران بینی

مگر اسوقت جان و مال کا خوف دامنگیر تھا اور باطل کا طلسم اگرچہ حقیر تھا لیکن وہ اسی سے حیران و دل باختہ ہوگئے تھے۔ شاعر نے ایسے ہی رہنمایان ملت کے متعلق کہا تھا۔

تو اے گرد تو ہم! شوکت دریا چہ می دانی
اسیر عذر لنگی، وسعت صحرا چہ می دانی

ورنہ اگر عہد و الفضائل کی پامالی کا درد ہوتا، اگر قبائے خلافت کے چاک ہو جانے کا ماتم ہوتا، اور اگر مقامات مقدسہ کی اہانت کی فکر ہوتی تو ہماری آنکھیں رد و قبول کی ہنگامہ آرائیوں کو نہ دیکھتیں اور جلوس و استقبال کی مسرتوں کے بجائے ہندوستان کا ہر ہر گوشہ غم خلافت میں ماتم کدہ بنا ہوتا اور ہر ایک

مجلسون کی جگہ روشن مستقبل کے انتظام کی صفین ترتیب دی جارہی ہوتین۔ یعنی شان وشوکت اور آرام آسایش کے خیال بالکل باطل ہوگئے ہوتے اور سفر کئے جاتے تو ریگین کپڑون کا سوٹ اور ولایتی بوٹ پہنکر نہین، درجۂ اعلیٰ مین بیٹھکر نہین، بلکہ وطن کے بنے ہوئے اپنے قومی لباس مین اور حسرت وگاندہی کی طرح درجۂ ادنیٰ مین بیٹھکر اس ضرورت کو پورا کیا جاتا اور وہ رقمین جو ان فضول مصارف مین خرچ کی گئی ہین اور وہ رقمین جو مسرت وانبساط کی بزمون کی شرکت اور اُس کے انتظامات مین صرف ہوئی ہین اسی راہ مین ایثار کردیجاتین

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ۰

ترک جان و ترک مال و ترک سر

در طریقِ عشق اول منزل است

پنجاب کی مظلوم آبادی اظہار مسرت کرسکتی ہے کہ اسکی دادرسی ہوئی ہے۔ لاہور اور امرتسر کے محبان وطن اپنی رہائی وآزادی کی مسرت کے جلسون مین شریک ہوسکتے اور پھولون کے ہار پہن سکتے ہین کہ اک دنیا ان کی باعث بے چین ہوگئی ہے۔ مگر آپ بتلائیے کہ استقبال کے جلسون کے ہجوم دیکھنے اور پھولون کے ہار گلے مین ڈالنے کا آپ کو کیا حق ہے؟ جب آپ کے گھر مین ماتم بیٹھی ہین۔ جب آپ کے بھائیون کے گلے پر چھریان پھیری جارہی ہین۔ جب آپ کی مان چند لمحون کی مہمان ہے اور باپ کا دم لبون پر، تو خدارا مجھے بتلائیے کہ آپ کس طرح خوشی وشادی کی بزمون مین شریک ہوسکتے اور استقبال کے جلوس اور خیر مقدم کے ہار گلے مین ڈال سکتے ہین۔

جب خزان ہوگئی آخر تو رہا ہم خزان
جنکی قسمت مین ہو کلفت انھین راحت کیسی

ایسی حالت مین جبکہ مقامات مقدسہ غیر محفوظ ہین، کہ مکہ معظمہ اور بیت المقدس مین انگریزی فوجین موجود ہین، مدینہ منورہ دنیا پرست مسلمانون کی قبضہ مین ہے، جسکی وجہ سے اس دیار مقدس مین انگریزی فوج کے افسر اونٹون اور گھوڑون پر بیٹھکر نکل سکتے ہین اور قسطنطنیہ مین بھی اتحادیون کا ہائی کمشنر نہین بلکہ برطانوی ہائی کمشنر موجود ہے، ہمین اپنے گھرون کو ماتم کدہ بنالینا چاہیئے۔ اپنے اوپر کھانا اور پینا، سونا اور جاگنا حرام کرلینا چاہیے کہ ہم اس کا مردان کے گروہ ہین جس کے ایک بادشاہ نے ایک مسلمان عورت کی صدائے درد ومصیبت سنکر قسم کھائی تھی کہ جب تک روم کے قیدخانے کو مسمار

نہ کرونگا اور ظالم اپنے ظلم کے پاداش کو نہ پہونچیں گے، پھرے سرکو بالین و بستر کا آرام حاصل کرنیکا کوئی حق نہیں !

اسی کے ساتھ ہمارا اولین فرض یہ بھی ہو کہ حکومت سے مقاطعہ کرلیں اور اتحاد و شرکت کا سکی فرو عمل (پالیسی) ترک کردیں اور ریفارم ایکیٹ کو بھی نفرت کے ساتھ ٹھکرادیں اگرچہ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کو کتنا ہی فائدہ کیوں نہ پہونچے کہ ہمیں دنیا کی خود غرض بادشاہتوں کے قانون فوز و فلاح کی پابندی اور خیر مقدم کی ضرورت نہیں جبکہ ہمارے پاس خدا ے قوی و توانا اور ذوالجلال والاکرام کے احکام اور مدینہ منورہ کی بارگاہ اقدس کا قانون اصلاح موجود ہے۔ اور پھر جب ہمیں ہدایت کی گئی ہو کہ اس رشتہ کو مضبوط پکڑلیں، جو اللہ اور اس کے رسول نے قائم کیا ہے اور ان حدود سے باہر نہ ہوں جو کتاب و سنت نے قائم کردی ہیں اور جن کے استحکام و رسوخ کے لئے کہا گیا ہے اشداء علی الکفار رحماء بینھم یعنی اب وقت آگیا ہے کہ تم بھی نرمی اور مصالحت کے طرز عمل کو بھلادو اور کافروں کے ساتھ سخت ہوکر، آپس میں ایسے نرم اور رحم دل اور متحد ہوجاؤ کہ وطن اور مرز بوم کے امتیازات کو مٹادو اور باہمی تنازعات و اختلافات کو بھی فراموش کردو۔ اگر وائسرائے ہم سے اس بات کے طالب ہیں کہ حکومت سے تعلقات شگفتہ رکھے جائیں اور کنگ جارج کی بھی یہی تمنا ہے تو انھیں سن لینا چاہیئے کہ یہ طلب و تمنا نا قابل عمل ہے اور فرمان شاہی حکم الٰہی نہیں کہ ہم اپنے مطالبات سے باز آجائیں اور اللہ کی جنت النعیم کو چھوڑکر شیطان کی بہشت شداد کو پسند کرلیں جبکہ وحی ربانی کی صدائیں پیہم سامعہ نواز ہورہی ہیں والمتقین واغلظ علیھم اور جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ صریح ظلم وستم کئے جارہے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس زرین اصول حیات کو نظر انداز کردیں جسکی طرف اللہ اور اسکے رسول نے رہنمائی کی ہے۔ یعنی:۔

فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم جو شخص تم پر ظلم کرتا ہے اور تمہارے درپے آزار ہے، چاہیئے کہ تم بھی اسکے ساتھ اسی طرح پیش آؤ۔

پس کوئی ضرورت نہیں کہ ہم کسی کے پاس اپنے اغراض لیجائیں اور جب اپنے مطالبات پیش کرچکے ہیں اور صرف واقعہ کو نہایت صفائی سے بتلا دیا گیا ہے، لیکن اسپر کوئی توجہ نہیں کی جاتی اور جب ۱۷ جنوری ۱۹۲۰ء کا مشرق قریب و نیر السیٹ ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کو

مسلمانون کے مطالبات کے پورا کرنے پر اصرار ہے۔ لیکن انگلستان جس کا وزیر اعظم وعدہ کر چکا ہے اور خود کنگ جارج نے دوران جنگ مین طمانیت بخش پیام بھیجا تھا کہ مسلمانون کے ساتھ کوئی زیادتی نہین کیجائیگی، محترم مقامات جنگ کے شعلون اور مرکز خلافت بلکہ دولت عثمانیہ انجام کے نتائج سے اثرات سے محفوظ و مصئون رہینگے اور ان مواعید کے معاوضہ مین نقد وفاداری کو حاصل کیا گیا تھا! اپنی ساری قوت صرف کر دیتا ہے کہ ترکون کو یورپ سے نکال باہر کیا جائے اور اپنی مسلمان رعایا کو اطمینان وتسکین دلاکر امداد واعانت کی اپیل کرنے والے کنگ جارج بھی ان امن شکن کاروائیون اور مجلس عالیہ کی تجاویز ومشروعات کو چشم روشن اور دل شاد سے دیکھ رہے ہین۔ لہذا ہمین اب وفد بازیون اور تجویز سازیون مین وقت ضایع کرنے کی ضرورت نہین کہ اصل چیز تو عمل ہے، باقی سب ہیچ اور بے سود اور نہ وفاداری کی شہنائی اور طنبورہ کے راگ مین کوئی قوت واثر پوشیدہ ہے کہ التجائین پیش کیجاتی رہین اور ایوان حکومت رفع اضطراب کے لئے بے بنیاد اور جھوٹے وعدے کرتا رہے۔ ظلم وعدوان تاکے؟ مصلحت دوستی وشیطان پرستی تاکجا؟ اور فکر مستقبل سے غفلت، اللہ سے بغاوت اور یوم الدین کی پرسشون سے بےخبری کب تک۔ یاد رکھو۔

زوال دولت عثمان زوال شرع وملت ہے

ہماری زندگیان جو ابتک قائم ہین۔ ہمارے مقامات مقدسہ کی حفاظت کے جو کچھ وعدے کئے گئے ہین، ہمارے اندر جسقدر بھی بھیجی وبیداری پیدا ہو رہی ہے، اور دنیا مین جتنی بھی ہماری عزت ہے اور مسجد کے صحنون مین جہان بھی اللہ اکبر کی صدائین بلند ہوتی ہین۔ ان سب کی بقاو حیات کا سرچشمہ ایک ہے، اور وہ سرچشمہ دولت عثمانیہ ہے! یون تو ساری دنیا ہمارا خاندان ہے اور جہان بھی کسی کے گلے پر چھری چل رہی ہو، ہمین مضطرب وبیقرار ہو جانا چاہیئے کہ ہم جس خدا کے بندے ہین وہ رب العالمین ہے، جس رسول کی امت ہین، وہ رحمۃ للعٰلمین ہے، اور پھر ہمارے لئے بھی یہ کہا گیا ہے وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا۔ ہم نے تم کو ایک عدل وتوسط کی قوم بنایا کہ تم اپنے اعمال وافعال اور مقاصد حیات وامر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بنا پر دنیا کے لئے نمونہ بنو اور پیغمبر تمہارے لئے نمونہ بنے لیکن وہ روحانی تعلق جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ہوتا ہے کہ ایک ہی صراط مستقیم اور

دنیا سے حق و صداقت کے راہ رو اور کوچہ گرد ہین - وہ خون کے رشتون کا تعلق جو بھائی کو بھائی سے ہوتا ہے کہ سب ایک ہی باپ (ابراہیم کے) بیٹے ہین' اضطراب و بیقراری کے درجات بڑھا دیتا ہے محبت و الفت و جوش حمایت و فداکاری کے جذبات مین اضافہ کر دیتا ہے اور ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم تمام دنیاوی بادشاہون کے احکام کی تعمیل ترک کر دین اور باہم سب ایک ہو جائین :-

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون اور متفق و متحد ہو کر اسی ایک خدائے واحد ذوالجلال کی جبل متین کو پکڑلین' جسکی طرف روز ازل سے ہمین دعوت دی گئی ہے :-

واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا' یہ اتحاد و اتفاق' اسدرجہ قوی اور شدید ہو کہ اگر ایک مسلمان' مراکش مین مبتلائے مصیبت ہو' اگر ایک مسلمان کی گردن' ایران مین پھانسی کی رسی مین لٹک رہی ہو' اگر ایک مسلمان کا سینہ بصرہ - بغداد' مصر و طرابلس اور شام و عراق مین گولیون سے چھلنی کیا جا رہا ہو تو تمام مسلمان کہ امت واحدہ ہین اور ایک جسم کے اعضا و قویٰ' علم اس سے کہ دنیا کے کسی حصۂ زمین پر آباد ہون' اپنے تئین مبتلائے مصیبت سمجھین' اپنے گلون پر پھانسی کے پھندون کے نشان محسوس کرین اور اپنے اوپر گولیون کے پیوست ہونے کے درد و کرب اور تکلیف و انتزاع کی تمام کیفیات طاری کرلین' احمد و مسلم' نعمان بن بشیر سے روایت کرتے ہین کہ حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

مثل المومنین فی توادھم مسلمانون کی مثال' باہمی مودت و رحمت اور عطوفت وتراحمھم وتعاطفھم' مثل الجسد وہمدردی مین بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک جسم اذا اشتکیٰ لہ عضو تداعیٰ لہ کی کہ اگر اس کے ایک عضو مین کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے سائر الجسد بالسھر والحمیٰ - یا کانٹا چبھ جاتا ہے تو سارا جسم اس تکلیف مین شریک ہو جاتا ہے -

اور اگر ایک مسلمان کی آنکھ بھی رنج و الم کے آنسوؤن سے خالی ہو' اور اگر ایک مسلمان کا دل بھی درد و اضطراب اور انتشار و بے چینی کی ان کیفیات سے ناآشنا ہو' جس مین' اس کے دوسرے بھائی مبتلا ہون' تو وہ مطرود و روسیاہ انسان' اللہ اور اس کے رسول کے حضور مردود و ملعون ہون اور اس کے ملائکہ کی لعنت و پھٹکار' ان کے خرمن زندگی پر بجلیون کیطرح گرے

یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ وکاین من قریۃ عتت عن امر ربھا و رسلہ فحاسبنٰھا حسابًا شدیدًا و عذبناھا عذابًا نکرا ؟ فذاقت وبال امرھا وکان عاقبۃ امرھا خسرا ۔ اعد اللہ لھم عذابًا شدیدًا فاتقوا اللہ یا اولی الالباب الذین امنوا۔

لیکن' ان تمام تعلقات کے ساتھ جب ایک اور تعلق بڑھ جاتا ہے' اور جب ان تمام رشتون کے بعد ایک اور مقدم تر رشتۂ خلافت اسلامیہ کا اور اضافہ ہو جاتا ہے اور جب ہم دیکھتے ہین کہ آج صرف دولت عثمانیہ ہی ہمارے قافلہ جہان بانی کی یادگار اور آفتاب اقبال کی شعاع امید ہے' یعنی شومی اعمال سے اب وہی ایک تلوار ہمارے ہاتھون مین باقی رہ گئی ہے' جو اسلام کی حمایت مین بلند ہو سکتی ہے تو ہمارے فرائض بہت زیادہ شدید ہو جاتے ہین تمام انسانون سے ہمارا ایک رشتہ ہے کہ سب کی نوعیت ایک ہے' مسلمانون سے دو ہین ایک نوعی دوسرا دینی لیکن ترکون سے ہمارے تین رشتے ہین ایک رشتہ نوعی ہے دوسرا رشتہ اخوت دینی ہے اور تیسرا سب سے قوی تر رشتہ خلافت خدمت حرمین شریفین اور حفاظت کلمہ حق کا ' پس ان کی زندگی' ہماری زندگی ہے' ان کی عزت ہماری عزت ہے' ان کا نفوذ و اقتدار' ہمارا نفوذ و اقتدار ہے اور ہر وہ مسلمان' جو اسلام اور کلمۂ حق کے بقاء اعلان اور عزت وحرمت کا خواستگار ہے' اس کا فرض دینی ہے کہ جو ترکون کا دشمن ہو اسے اپنا دشمن سمجھے' جو ترکون کا مخالف ہو' اُسے اپنا مخالف سمجھے اور جب کبھی ترکون پر مصیبت آئے تو یہی نہ سمجھے کہ مسلمانون پر مصیبت آئی ہے بلکہ یہ سمجھے کہ اسلام پر مصیبت آئی ہے اور کلمۂ حق کفر و شرک کے نرغہ مین بے کس وبے بس ہے ۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک	چراغ کشتۂ محفل سے اُٹھیگا دھوان کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیے پرزے	فضائے آسمانی مین اُڑینگی دھجیان کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنون کی جب نگاہین ہین	تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیان کب تک

اصل تو یہ ہے کہ یہی جواب تک کہا گیا ہے' صریح عدوان وطغیان تھا کیونکہ حکومت و فرمانروائی تو صرف اللہ کے واسطے ہے اور اس مین کوئی اسکا شریک و ساجھی نہین ان الحکم الا للہ پھر کیا یہ ضلالت اور گمراہی نہ تھی کہ اللہ اور اُس کے رسول کے وفادار

ہونے کے بجائے انسانون کی اطاعت کا اسوقت بھی حلف لیا گیا جب دلون کا کھوٹ ظاہر ہو چکا تھا؟ اور کیا اسکو شرک اور بغاوت نہین کہتے کہ غیر اللہ سے خلافت کی بھیک مانگی گئی، شکریے ادا کیے گئے اور اس حکم کے بعد بھی کہ لیس للکافرین علی المسلمین سبیلا دشمنان اسلام کے سامنے اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کے نذرانے پیش کئے گئے

يا ايها الناس ما غرك بربك الكريم الذی خلقك فسوىك فعدلك فی ای صورة ما شاء ركبك - كلا بل تكذبون بالدين وان عليكم لحفظين كراما كاتبين يعلمون ما تفعلون ان الابرار لفی نعيم وان الفجار لفی جحيم يصلونها يوم الدين وما هم عنها بغائبين وما ادراك ما يوم الدين ثم ما ادراك ما يوم الدين يوم لا تملك نفس لنفس شيئا والامر يومئذ لله ٥

اے مغرور انسان! بتلا کہ تجھے کس چیز نے اپنی محبت کرنے والے خدا سے باغی کر دیا ہے؟ وہ کہ جس نے تجھے پیدا کیا، تیری ساخت درست کی، تیری خلقت کو اعتدال بخشا، اور جس طرح چاہا تیری ظاہری شکل و صورت کی حسین و خوبصورت ترکیب کی پھر یہ کس کی وفاداری ہے جس نے تجھے اس سے باغی کر دیا ہے؟ اور یہ کس کی اطاعت و فرمانبرداری کے حلقے ہین جو تم نے اپنی گردن مین ڈال لئے ہین؟ حقیقت یہ ہے کہ تجھے اسکی حکومت و بادشاہی کا یقین ہی نہین، حالانکہ اسکی طرف سے تیرے اوپر ایسے نگران کار مقرر ہین جو ہر آن و ہر لحظہ تیرے افعال و حرکات کا حساب کرتے رہتے ہین اور تیری کوئی بات بھی ایسی نہین ہوتی کہ انسے پوشیدہ رہے۔

پس اے سرکش اور ظالم انسان! یقین رکھ کہ وہ دن دور نہین، جب اللہ کی اطاعت گذار بندے، عزت و مراد اور فتح و کامرانی کے عیش و نشاط اور سرور و انبساط کے لطف اٹھا رہے ہون گے اور بدکار و نافرمان، نامرادی و ہلاکت کے عذاب مین مبتلا ہونگے اور اسوقت کوئی قوت اور کوئی ذات بھی ایسی نہ ہوگی کہ اللہ سے ان کی سفارش کرے اور اللہ کے قہر و عتاب کے دردناک عذابون سے انکو نجات مل سکے۔

پھر وہ تمام لوگ جنہین اللہ اور اس کے یوم الدین پر ایمان ہے، وہ تمام لوگ

جنہیں اس روز آخر کی پرسشوں کا خوف ہے' اور جانتے ہیں کہ اللہ کا قہر و عذاب کس درجہ شدید اور دردناک ہوگا' چاہیئے کہ تمام پرستش گاہوں سے اپنے سر اٹھالیں' تمام فرمانروائی کے درباروں سے تعلقات قطع کرلیں اور تمام فراعنہ و طواغیت سے بے نیاز ہو کر کہدیں :

فاقض ما انت قاض ! — اے دنیوی طاقتوں پر مغرور ہونے والے بادشاہ !
انما تقضی ھذہ الحیوۃ — تو جو کچھ کرنے والا ہے کرگذر ! تو تو صرف دنیا کی اس
الدنیا ! انا آمنا بربنا — زندگی اور گوشت و پوست کے جسم پر حکومت چلا
یغفرلنا خطایانا — سکتا ہے' پس شوق سے چلا دیکھ۔

ہم تو اپنے پروردگار اور اس کے ملائکہ مومنین کے جنود قاہرہ پر ایمان لاچکے ہیں اور ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ غفور الرحیم ہمارے گناہوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیگا اور ان شیطانی قوتوں کو تاراج و پامال کردیگا' جنہوں نے دنیا کو ہمپر تنگ کردیا ہے یہ دنیوی سزاؤں کے تازیانے اور تنگ و تاریک کوٹھریوں کے قیدخانے تو آخرت کی کھیتی کا سامان ہیں :—
الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر اور وما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب' وان الآخرۃ لھی الحیوان ہمیں تو اسکی راہ صداقت سے پھیرنے کے لئے اس عالم کون و فساد کی کوئی قوت بھی کفایت نہیں کرسکتی۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم !

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یعنی اب ہمیں صاف صاف کہدینا چاہیئے کہ یوروپین وزارت کو ہماری طرف سے اختیار ہے کہ وہ مسلمانوں کے شیرازہ قومی کو منتشر کردینے اور اُن کے واحد مرکز اتحاد کو چھین لینے کی جیسی چاہیئے دلیلیں تراشے اور برطانیہ عظمی کے ارباب حل و عقد بھی شوق سے اپنے ان تمام وعدوں کو بھلادیں جنکی بنا پر ہم نے اسکی عزت کو قائم رکھنے اور اسکی حکومت و بادشاہی کی حفاظت کیلئے اپنی قربانیاں کیں اور دنیا میں ایک ایسے ایثار کا ثبوت دیا کہ دنیا کی تاریخ میں فقید المثال ہے۔ لیکن اسے یاد رکھنا چاہیئے' اس جوش اور قوت عمل کو جو مسلمانان عالم میں پیدا ہورہا ہے اور جسکی قوت دن بدن عالمگیر اور قوی ہوتی جاتی

ہے ؛ یعنی اب وہ وقت دور نہین جسکے متعلق شاعر نے کہا ہے ۔

آسمان ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش | اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اسقدر ہوگی ترنم آفرین باد بہار | نگہت خوابیدہ غنچہ کی نوا ہوجائے گی
آ ملینگے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک | یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہوجائے گی

شب گریزان ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

کوئی شک نہین کہ گذشتہ جنگ مین برطانیہ عظمیٰ کو ایک زبردست فتح حاصل ہوئی ہے اور اس کے مقبوضات کی فہرست بھی بہت طویل ہوگئی ہے لیکن کیا کسی نے قانون قدرت کو بھی دیکھا ہے کیا کسی نے اس عالمگیر قوت اور تسلط کو بھی دیکھا ہے جو دلون مین پیدا ہو رہا ہے اور جس کے لئے ہم اس جنگ کے ممنون ہین

ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند | پھر سلیمی کی نظر دیتی ہے پیغام خروش

ہر چند ترکون کو یورپ سے نکال دینے اور سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کر دینے کی اسکیم حادثاتِ قطع نہین ہے، بلکہ کم و بیش دو صدی سے یورپین طاقتون کا واحد نصب العین یہی رہا ہے کہ ترکون کو یورپ سے نکال دو تب ہی تم ترقی کر سکتے ہو یہان تک انگریزون نے بھی جن سے زیادہ ابتدا دول یورپ مین ترکون کا کوئی دوست اور خیر خواہ نہ تھا اور آستانۂ حکومت سے بازار تجارت تک ہر انگریز کا یہی خیال تھا کہ ترک مشرقی لباس مین انگریز ہین، دفعتہً اپنی فرد عمل بدل دی اور مصر، عراق۔ قبرص، حجاز وغیرہ پر قبض و تسلط کی چالین چلنی شروع کردین۔ لیکن اس طویل زمانہ مین ان ارادون کو قوت سے فعل مین لانے کا کوئی مناسب موقع نہین ملا اور دولت اسلامیہ کی قطع و برید کا مسئلہ، جس کے ساتھ چالیس کروڑ نفوس کی زندگیان وابستہ ہین اور جنکی آبادیون سے کائنات کا ہر ہر گوشہ معمور ہے خاطر خواہ حل نہ ہوسکا اور یہ خواہش بھی کہ کم از کم ہر منہ مین ایک بوٹی اور ہر ہاتھ مین ایک ہڈی آجائے پوری نہ ہوسکی۔

ہرچند خیالات اب بدلتے جاتے ہین اور ہر وہ دن جو گذرتا ہے، ملک گیری کی خواہش مین اضافہ کرنے والا ہوتا ہے لیکن اگر صرف ان اطلاعات کو صحیح سمجھ لیا جائے جو اب تک ہمین رائٹر ایجنسی کے ذریعہ ہوئی ہین اور جن کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نہین تو چالیس کرور مسلمانون کا

مرکز خلافت بروسہ یا قونیہ ہوگا اور قسطنطنیہ اس تمام نہاد یورپین جمہوریت کے ماتحت ہوگا جس سے اک دنیا کا دل خون ہو رہا ہے اور جس کی تمثال بربریت دنیا بارہا دیکھ چکی ہے۔ یا اگر مسلمانون کے حال زار پر بہت عنایت کی گئی تو ان کی بیش بہا جانی قربانیون اور مالی فداکاریون کے صلہ مین ان کے دینی و دنیوی پیشوا کو قصر یلدیز مین نظر بند کر دیا جائیگا، اور اسلامبول، صلیبستان کی صورت مین بدل جائیگا۔ یعنی باسفورس اور درۂ دانیال پر اجادیون کا بین الاقوامی قبضہ ہوگا کہ جس وقت چاہین کوئی الزام رکھکر گولہ باری شروع کر دین!

بدقسمتی سے خود ہم نے اپنی شومی اعمال اور حکومت پرستی کے جذبات فاسدہ سے مدتون کی تمناؤن کے بعد، دشمنان اسلام کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنی دیرینہ آرزوون کو عاشقانہ آرزو نہ رکھین اور جہان تک بن سکے مسئلہ شرقیہ کا ایسا حل کرین کہ مسلمانون کی جماعت قومی کا یا تو بالکل خاتمہ ہو جاے اور یا اگر وہ زندہ رہین تو اسطرح کہ قلیون کا کام کرین اور حکومت و فرمانروائی سے انہین کوئی تعلق نہ ہو۔ حالانکہ یہ کسی انسانی طاقت کے بس کی بات نہین کہ جسم کو روح سے اور عرض کو جوہر سے جدا کر دے! **کنسائز ڈکشنری اوف ریلیجس نولج** مین لکھا ہے۔ "اسلام دنیوی طاقتون کی محرومی و نامرادی سے بجائے کمزوری کے اور ترقی کریگا"۔

**ولیم میور**، اسلام کے مٹنے ہی یہ جلاتا ہے کہ

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کیونکہ حسین ابن علی کی شہادت اگرچہ اسلام کے خصائص روحانی کی شہادت تھی لیکن اس حادثۂ کرب و بلا کے بعد اسلام نے جس قدر دینی اور دنیوی عروج حاصل کیا، وحوش تتار کے قتل و خونریزی اور بغداد کی تباہی و بربادی کے بعد مسلمانون نے جو ترقیان کین اور جس طرح دنیا کے دور دراز گوشون مین فاتحانہ پہونچا اور توحید و خداپرستی کی صداے روح پرور سے کائنات کی زندگی مین انقلاب پیدا کر دیا، اس سے آج کون بے خبر ہے۔ دولت بنو امیہ کا جب خاتمہ ہوا تو ایک طرف بغداد کی شان و شوکت کی تاسیس ہوئی اور دوسری طرف اندلس کی اقبال مندیون کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

پھر جب ان حکومتوں کا خاتمہ ہوا، اور جب سلجوقیون اور دیلمیون کی حکومت وغیرہ مٹنی کے چراغ بھی گل ہوئے تو ! ایوبیون اور زنگیون، ترکون اور مغلون نے طبل و علم سنبھالے، اور سب جانتے ہین کہ ان کی حکومتین کیسی زبردست اور عظیم الشان تھین۔ شاعر نے اسی تاریخ عروج و زوال پر کہا ہے۔

اسلام کی فطرت مین قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دین گے !

بلا شبہ اسوقت ہم بیکس ہین، محروم ہین، نامراد ہین اور مختصر یہ کہ ہمارے ہاتھ بھی خالی ہین۔ لیکن ہمارے پاس وہ ہے جو کسی کے پاس نہین، ہمارے پہلوؤن مین وہ ہے جس سے دنیا خالی ہے۔ اور ہمارے دلون مین اس ایمان و ایقان کی روح حقیقت کار فرما ہے

جو نظام دہر مین پیدا بھی ہے پنہان بھی ہے !

اور جس کے ہوتے نہ ہمین دولت کی ضرورت ہے نہ امارت کی، نہ فوجون کی ضرورت ہے نہ ہوائی جہازون کی بلکہ ہم ساری دنیا سے بے نیاز ہین، تمام کائنات سے مستغنی ہین۔ مگر نہ دنیا ہم کو چھوڑ سکتی ہے اور نہ کائنات ہم سے علیحدہ ہو کر ایک لمحہ کے لئے زندہ رہ سکتی ہے، اس لئے کہ یہ جو کچھ ہے، ہمارے ہی لئے ہے اور دین و دنیا کی عزتین بھی صرف ہمارے ہی ساتھ وابستہ ہین۔

اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ عزت صرف خدا کے لئے ہے، اس کے رسول کے لئے ہے اور مسلمانون کے لئے۔

دوسری جگہ، دنیاوی کامیابیون کے متعلق فرماتا ہے -

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون زمین کے وارث تو صرف ہمارے نیک بندے ہی ہو سکتے ہین اور ہون گے۔

جو صرف مسلمان ہین، جنہون نے باطل کی پرستش کا اقرار نامہ نہین لکھا اور جنہون نے سب سے پہلے اپنے جذبات و داعیات کے اظہار کے لئے جہاد لسانی کیا، پھر تکلیفین برداشت کین اور برابر اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام دنیا کو سناتے رہے کہ

وہ جنہون نے اس سے بغاوت کی، اپنی خواہشون اور جوع الارض کی تمناؤن کے باعث انسانون کا خون بہایا - اس ایک کو صاحب اولاد بنایا اور شرک مین مبتلا ہوئے - آگے چلکر اس عہد ابتلا و مصیبت اور عاقبت کی کارروائیون کے متعلق فرماتا ہے :-

وان کادوا لیستفزونك من الارض لیخرجوك منها واذاً لا یلبثون خلافك الا قلیلا -

یہ لوگ تمہین ملک سے دل برداشتہ کر رہے ہین کہ یہان سے پریشان ہوکر نکل جاؤ - پس اگر ایسا ہوا تو یقین رکھو کہ یہ بھی تمہارے بعد چند روز سے زیادہ نہین رہنے پائین گے اور بالآخر انہین بھی نکلنا پڑیگا اور یا تمہارے مفتوح بنکر رہین گے -

ان تمام باتون کے بعد باطل کے استیلا و قوت سے نڈر ہوکر اعلان و ارشاد کا حکم دیتا ہے اور آخری فتحمندیون کا اسطرح یقین دلاتا ہے :-

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون، وکان حقاً علینا نصر المومنین -

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست اور چاہنے والے ہین، نہ اُن کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ کبھی غمگین ہو سکتے ہین - کیونکہ انکو فتح و نصرت دینا تو ہمارے لئے ضروری ہے - کسی طرح نہین ہو سکتا کہ ہم غیرون کو فتحیاب کرین اور مسلمان ناکام رہ جائین !

پھر یہ کیا ہے کہ آپ التجائین کرتے ہین اور وفد لیجاتے ہین کہ خلافت کی بھیک مانگین اور پھر یہ کیا ہے کہ آپ کو صحت کی طلب ہے، عزم کی تلاش ہے، قوت کی جستجو ہے حالانکہ صریح جہالت و شقاوت اور کھلی گمراہی و ضلالت ہے - ہمین صرف عمل کرنا اور اللہ سے دعا مانگنی چاہیئے اور اسی کی اعانت پر ایمان کامل اور اپنی فیروزمندیون اور کلمہ توحید پر غیر متزلزل یقین کی ضرورت ہے کہ یہی ہمارے بازار حیات کی واحد جنس متاع ہے - اقبال نے کہا ہے -

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے

پس جن کا خیال ہے کہ اسلام روم و ایران کے تباہ ہو جانے سے مٹ جائیگا اور جو سمجھے ہین کہ اسلام افغانستان اور دکن کے اسلامی ریاستون کے مٹا دینے سے برباد

ہو جائیگا وہ غلطی پر ہین کہ

نشۂ مے کو تعلق نہین پیمانہ سے

ان جذبات و معتقدات سے قطع نظر کرکے' اس مسئلہ پر سیاسی روشنی مین بھی ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ صحافت مغربی کا کیا فتویٰ ہے۔

قسطنطنیہ کے مستقبل کا فیصلہ صرف یہی نہین کہ مسلمانون کے مرکز خلافت ہونے کے باعث ایک اہم مسئلہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا فیصلہ صلح و جنگ کا فیصلہ ہے اور یا مسٹر بلنٹ کے الفاظ مین "پہلے سے زیادہ خونریزی و پریشان کن بے ترتیبی"!

۱۹۱۳ء مین گرینفک نے لکھا تھا:۔

"بعض مسائل ایسے ہوتے ہین' جن کا غیر منحل رہنا ہی بہتر ہوتا ہے اور انہی مہمات مسائل مین ایک مسئلہ شرقیہ بھی ہے"

پروفیسر اسپنسر ولکنسن نے ایک موقعہ پر اثناء تقریر مین کہا:۔

"تمام بین الملکی سوالات حل ہو سکتے ہین' لیکن مسئلہ شرقیہ کا سوال قطعاً غیر منحل ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی عظیم ترین ڈپلومیسی بھی اسکے آگے مسکین ہو جاتی ہے"

نیر ایسٹ کے ایک مضمون نگار نے لکھا تھا:۔

کوئی شک نہین اگر ترکون کو یورپ سے نکال دیا گیا اور مسلمانون کی یورپ مین حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو ہماری حکومت وسیع ہو جائیگی اور ترکون سے ان کی گذشتہ جنگون کا انتقام بھی لے لیا جائیگا لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ترکون کا یورپ سے نکالدیا جانا اور ہماری حکومت کا وسیع ہو جانا بہت زیادہ خونریزیون کا باعث ہوگا"

فیگارو کا خیال تھا:۔

مسئلہ شرقیہ کا حل بہت زیادہ خطرناک اور دنیا کے امن و امان کا دشمن ہے"

مسلم آوٹ لک مین کسی فرانسیسی اخبار کا اقتباس شایع ہوا تھا کہ:۔

ترکون کا یورپ مین رہنا' ہماری حکومتون کے بقاء و قیام کیلئے بہت زیادہ مفید ہے"

راونڈ ٹیبل مین کسی نے لکھا تھا کہ:۔

یورپ سے ترکی حکومت کا خاتمہ کردیا گیا تو اگرچہ عیسائی حکومتون کی ایک خواہش پوری ہوجائیگی
مگر پھر یورپ مین زندہ رہنا دشوار ہو جائیگا "

مسٹر چارلس روڈسٹر نے ترکی اور مقدونیہ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوے کہا تھا:۔

مقدونیہ کی حالت پہلے سے اسقدر زیادہ نازک ہوگئی ہے کہ وہان امن وعافیت ڈھونڈے
بھی نہین ملتی "

ایک اور مدبر نے مسئلہ خلافت کے حل پر مضمون لکھتے ہوئے نہایت زور سے لکھا تھا کہ:۔

سرویون اور بلغاریون، یہودیون اور یونانیون، جیوسٹ اور ہیمبرگ فرقون کی باہم برادرکش
رقابتین اور مہلک نفرتین اسدرجہ شدید ہین کہ بلقان کی آزادی کے بعد وہان ایک متنفس بھی زندہ
نہین رہ سکتا اور اسکے زبردست اثرات سے یورپ کی کوئی سلطنت بھی نہین بچ سکتی جو مبتلائے
مصیبت نہو " مسٹر شاپ نے ایک جلسہ مین بحیثیت صدر یہ پرزور الفاظ زبان سے نکالے تھے

ہم جس قدر مسئلہ شرقیہ کے حل کیطرف زیادہ متوجہ ہوتے ہین، وہ اسی قدر خطرناک ہوتا جاتا ہے"
"اسلامک ورلڈ" کے مقالہ نگار نے لکھا تھا:۔

جب کوئی شہنشاہی پردۂ انقراض کے پیچھے جاتی ہے تو بے ترتیبیون کی حکومت کا اعلان
ہوتا ہے، لہذا ہمین ایسی تجاویز پر وقت ضایع نہین کرنا چاہئے، جو نا قابل عمل ہون اور جن کا
عمل پذیر ہونا مصیبتون کا رونما ہوتا ہے "

یہ ان لوگون کے خیالات ہین جنہین ترکون سے کوئی ہمدردی نہین اور جنہون نے اس
مسئلہ پر بھی کبھی غور نہین کیا کہ جب ترکون کو ان کے وطن سے نکالا جائیگا تو وہ اس اخراج وانتزاع
حکومت کی کہانتک تاب لاسکینگے اور پھر اسکا انجام کیا ہوگا بلکہ انہون نے جو کچھ کہا ہے محض ان
خطرات کی بنا پر کہا ہے جو یورپ سے ترکی حکومت کے خاتمہ کے بعد باہمی تعلقات کی کشیدگیون
اور ہوسناکیون کے باعث رونما ہو جائینگے، لیکن اسی کے ساتھ ان لوگون کے خیالات پر اطلاع
بھی ضروری ہے جو مشرق مین ترکون کے نفوذ اور شاہانہ اقتدار سے واقف ہین اور ان کے
قوت بازو کی شجاعت و بسالت کے کارنامے بھی بارہا دیکھ چکے ہین۔

گذشتہ ماہ کے نیر ایسٹ مین ایک مضمون نگار نے قیصر ولیم کے خط کا ایک فقرہ نقل کیا ہے

جس کے خاص الفاظ یہ ہین :-

" سلطان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے اور قسطنطنیہ کے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے پہلے یورپ کو اپنی اندرونی حالت، باہمی تنازعات، ملک گیری کی خواہشات کے تصادم اور مسلمانان عالم کے عالمگیر اتحاد اسلامی کی الٰہی قوت، مرکز خلافت کیساتھ ان کی عقیدت اور ترکون کی قوت بازو اور شجاعت کا اندازہ کر لینا چاہیئے "

عرصہ ہوا کہ لندن کے ایک ماہوار عیسائی رسالہ (دی سینٹ) نے لکھا تھا :-

قسطنطنیہ کا سلطان صرف ایک دنیوی فرمانروا ہی کی حیثیت نہین رکھتا بلکہ وہ دینی و دنیوی نقطۂ نظر سے بھی مسلمانون کا پیشوا ہے اس کا دائرۂ حکومت جغرافیہ کے حدود مین قید نہین کیا جا سکتا کہ اس کا نفوذ و اقتدار عالمگیر ہے، وہ ساری دنیا کے مسلمانون کا پیشوا ہے اور اس سات کرور مسلمان آبادی پر بھی حکومت کرتا ہے جو اگرچہ تاج برطانیہ کے زیر فرمان ہے لیکن حقیقی رعایا صرف اپنے سلطان اور خلیفہ وقت کی ہے، جسکی اطاعت ان کے ایمان کا ایک جزو ہے،

ایک منصف مزاج اڈیٹر نے عین اُسوقت جبکہ دوران جنگ مین مسئلہ خلافت اور اماکن مقدسہ کے متعلق یورپ مین اخبارات مین بحث ہو رہی تھی لکھا تھا:-

یہ مسلمانون کا مذہبی عقیدہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصۂ زمین پر آباد ہون اور کسی قوم کے ماتحت، لیکن وہ سب ایک ہین، آپس مین بھائی بھائی ہین اور سیدھے بالراست سلطان ترکیہ کے زیر فرمان، جنھین دولت بنو عباس کے آخری تاجدار محمد عباسی نے تبرکات اور نشان و علم تفویض کر کے خلافت سپرد کر دی تھی " اسی عالمگیر اتحاد اسلامی کی قوت سے مرعوب ہو کر ولیم میور نے اپنی کتاب مباحثہ اسلامی مین لکھا ہے -

" اگرچہ مسلمانون کے ملکی اقتدار کا زمانہ گذر چکا ہے لیکن اس مفلسی و تہیدستی کی حالت مین بھی یورپ کی تمام طاقتین جو قوت و اثر بروے کار لا سکتی ہین وہ اسلام کی روحانی قوت کے مقابلہ مین مشت غبار ہے "

مسٹر ہارنیجیس نے کسی سے دوران گفتگو مین کہا تھا -

مسلمانون کا خلیفہ خواہ قوی ہو یا ضعیف لیکن امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے وہ ۳۰ کروڑ

مسلمانوں کا وزن اپنے ساتھ رکھتا ہے "

اس کے علاوہ ان مآل اندیش انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تقریرین اور اخبارات کے مضامین بھی بے وقعت نہین جو انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات پر ظاہر کئے ہین اور خود برطانوی حکومت بھی دیکھ رہی ہے کہ مسلمانان ہند کا طرز عمل کس حد تک تبدیل ہوتا جاتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ مین مسلمان اپنے سلطان اور امام و خلیفہ کے دینوی اقتدار کے قیام کیلئے کیا کچھ کرنے کو آمادہ ہوتے جاتے ہین -

عرب، ترکون سے باغی ہوئے - مسلمانون نے شام اور فلسطین کے میدانون مین اپنا خون بہایا، مصر نے زمانۂ جنگ اطمینان سے گذار دیا، لیکن نہ عربون نے اس لیے بغاوت کی تھی کہ غیرون کی غلامی و محکومی کے طوق و زنجیر گلے مین ڈالین[۱] - نہ مسلمانون نے اس لیے سرفروشی کی تھی کہ مقامات مقدسہ کی توہین کی جائے[۲] - اور اُن کے زور بازو کی بدولت فتح پاکران ہی کے گلون پر چھریان چلائی جائین اور نہ مصری اس لئے خاموش رہے کہ ان کے مرکز خلافت کو عیسائی اپنا تخت حکومت بنالین اور جس ملک کو انہون نے دولت اسلامیہ سے ایک مدت معینہ پر اصلاح انتظام کی غرض سے لیا تھا، اور جہان کی فوجون کے متعلق بھی یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ جنگ کے موقعون پر سلطان کا دست و بازو ہونگی، اسپر قبضہ کرلیا جائے، اور ان فوجون کو دولت اسلامیہ کی مخالفت مین لڑایا جائے اور قوم پرستون کا قلع قمع کر دینے کے لئے فوجی حکومت کرائی جائے!

[۱] وہ یہ سن چکے ہوں گے کہ عربی اخبارات سے یہ معلوم ہوا تھا کہ شام مین عربون کی ایک سیاسی انجمن قائم کی گئی ہے، جس مین آزادی و خودمختاری کا اعلان کر دیا گیا ہے اور جاہل عربون نے ترکون کے ماتحت رہ کر بھی ایسی ترقی کر لی ہے کہ تجویزون کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے -

[۲] میسوپوٹیمیا کمیشن کی رپورٹ مین جنرل ٹاؤنشنڈ کا خط دیکھئے، جس مین انہون نے مسلمان افواج کی ناراضی و برہمی کی طرف اشارہ کیا ہے، جب وہ سلمان پاک کے مزار کے اطراف مین خیمہ زن تھین - اور اسکے قہر و عذاب کے خوف سے انہون نے حملہ سے انکار کردیا تھا - ۱۲

بغداد، جن شورشون کا مرکز بن رہا ہے، عراق مین جو دقتین پیدا ہو رہی ہین، شام کے آغوش سے بغاوتون کے جو دریا بہ رہے ہین۔ ایران مین جو طوفان اٹھ رہا ہے، فلسطین مین جن معرکون سے مقابلہ کرنے پڑتے ہین، مصر کی حالت جس قدر نازک ہوتی جاتی ہے ہندستان جسقدر برہم ہوتا جاتا ہے، قسطنطنیہ مین ترک جن تیاریون مین سرگرم ہین، اناطولیہ مین مصطفی کمال جس انتظام مین منہمک ہین، مولوی برکت اللہ، مولوی محمد، مولوی عبید اللہ اور مولوی سیف الرحمن جس شاندار مستقبل کے اہتمام مین معروف و مشغول ہین۔ انور پاشا کو جن عزائم و مقاصد نے خانہ بدوش بنا رکھا ہے اور بالشویزم کو دن بدن جو تقویت حاصل ہوتی جاتی ہے، اِس کا سنگ بنیاد خلافت، مقامات مقدسہ اور مسلمانون کی آیندہ بقا و حیات اور حکومت و سلطنت کے اہم مسائل ہین۔ لہذا اگر یورپ دنیا مین امن و سلامتی کا متمنی ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنے خنجر ہلاکت کو مسلمانون کے خون سے آلودہ نہ کرے اور توسیع حکومت کے تباہ کن خیال سے باز آجاے، ورنہ صرف یورپ کی زمینین ہی باہمی رقابتون اور توسیع حکومت کی مساعی کے تصادم سے لالہ زار نہ ہونگی بلکہ تمام دنیا انسانون کے خون سے گلنار ہو جائیگی، دنیا کے ہر حصہ مین مسلمانون اور عیسائیون کے درمیان اک شدید مذہبی جنگ چھڑ جائیگی اور یہ بھی محتاج بیان نہین کہ ترکون کو جب ان کے گھر سے نکال دیا جائیگا جب ان کی حکومت ان سے چھین لی جائیگی اور مقامات مقدسہ پر عیسائی حکومتین فرمان فرما ہو جائینگی، تو نہ صرف ترک بلکہ تمام مسلمان بالشویک جماعت سے مل جائینگے، اور عیسائی دنیا بالشویک جماعت سے جسقدر سراسیمہ و پریشان ہے، اسوقت اس سراسیگی اور خوف و ہراس کی بجلیان اپنی اصلی شان مین نمودار ہو کر چمکینگی اور برق و خرمن کی داستان ایک بار پھر تازہ ہوگی!

لنڈن ٹائمز، جو ترکون کا جانی دشمن ہے اور مسلمانون کے جائز مطالبات ذرہ برابر وقعت نہین دیتا، جب ترکون کے سوئٹ حکومت سے مل جانے کا خیال کرتا ہے انور پاشا، مصطفی کمال اور مولوی برکت اللہ وغیرہ کی دعوت حق کو سنتا ہے اور خود اپنے گھر کے اندر یہی نظام حکومت کے عناصر پاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس لحاظ سے ترکون کا قسطنطنیہ مین رہنا ضروری ہے۔

وائسرائے نے وفد خلافت کے سپاسنامہ کے جواب مین جو تقریر کی اور دولت علیہ کے ساتھ جس ہمدردی کی نمائش کی، وہ حاکمانہ نقطۂ نظر سے تسلی بخش اور طمانیت فرما سہی لیکن جیساکہ خود اس کے سیاق وسباق سے پایا جاتا ہے، اس کا مطلب اس سے زیادہ نہین ہے کہ جس حکمت عملی سے مصر کی حکومت خدیویہ، جمہوریہ کی ریاست اسلامیہ اور طالیس کی افریقی عرب حکومت کا خاتمہ کیا گیا ہے، اسی ڈپلومیسی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کا بھی گلا گھونٹ دیا جائے اور قسطنطنیہ پر بالواسطہ یا بلا واسطہ قبضہ کرلیا جائے۔ زیادہ عرصہ نہین گذرا کہ ویسٹ منسٹر گزٹ کے مقالہ نگار نے لکھا تھا:۔

"اتحادی سلطنتوں کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ وہی طریقے اختیار کرین جو برطانیہ عظمی نے مصر مین اختیار کئے ہین"۔

آپ فرماتے ہین کہ ہمین رائٹر ایجنسی کی اطلاعون پر اعتنا نہین کرنا چاہیے لائڈ جارج کی تقریرون، رابرٹ سیسل، کرزن، اور کنسٹربری کی کوششون کو بھی بے بنیاد سمجھنا چاہیے۔ ترک نظربندون کی داستان مصیبت اور ان مساعی کو بھی فراموش کردینا چاہیے جو تنہا حکومت برطانیہ، انور پاشا، مصطفےٰ کمال، طلعت پاشا، کاظم بے اور مولوی سیف الرحمن وغیرہ کی مخالفت مین کررہی ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کی نظربندی کے پراسرار واقعات اور وجوہ واسباب بھی نظر انداز کردینے چاہئین جنکے باعث وہ اب تک گرفتار مین۔ لیکن سوال یہ ہے کہ واقعات کو کس طرح چھپایا جاسکتا ہے اور حقیقتین کیونکر پوشیدہ رکھی جا سکتی مین۔ آگ جل رہی ہے تو دھوان اٹھیگا چراغ گل نہین ہوا ہے تو روشنی ہوگی، آفتاب نکل رہا ہے تو تاریکی کا طلسم ٹوٹے گا اور خنجر چل رہا ہے تو خون کی ندیان بھی جاری ہونگی۔

گرد آنرا می نہ بینی در نظر     فہم کن اما بہ اظہار اثر

ہم تسلیم کئے لیتے ہین کہ رائٹر ایجنسی نے اب تک جو اطلاعین شائع کی ہین یکسر غلط ہین اور جرمنی مسائل صلح بکقلم صحیح[۱] لیکن کیا ان غلط بیانیون کی پاداش مین رائٹر ایجنسی محق

---

[۱] حالانکہ اتحادیون نے جرمنی سے جن شرائط پر صلح کی ہے وہ بالکل وہی شرائط ہین جو گذشتہ برس جبکہ جرمنی فوجین فرانس کے میدانون مین فاتحانہ بڑھ رہی تہین دول اتحادی اور دنیا مین ایک ہنگامہ رستخیز برپا تھا بعض لوگ نے ...

وار نہیں؟ کیا جن اخبارات نے ان تاروں کو شایع کیا ہے، ان پر مفاد عامہ تحفظ امن اور آزادی کے قوانین عائد نہیں ہوسکتے؟ جن کا ہندوستان میں بیک اشارہ چشم وابرو نفاذ ہوسکتا ہے۔ ٹائمز کو اگر یقین ہے کہ رائٹر ایجنسی نے جو اطلاعیں دی ہیں، صحیح نہیں، تو انہیں خود کوئی حتمی تردید کرنا چاہیے اور اپنی خطرناک وشر انگیز تقریر کو واپس لینا چاہیے جس میں علی الاعلان رائٹر ایجنسی کے بیانات کی تصدیق وتائید کی ہے اور دبی دبان سے وہی کچھ کہدیا ہے جو کرزن اور لائڈ جارج کی دبانون سے نکل چکا ہے۔

محض زبانی ہمدردی اور مجلس صلح مین اسلامی جذبات کی کمزور نمایندگی وترجمانی فضول ہے، جس طرح صرف زبانی اظہار وفاداری فضول ہے! حکومت برطانیہ کو سن لینا چاہیئے کہ اس سے زیادہ ہم خاموش نہین رہ سکتے اور نہ اب صبر کی حد باقی ہے، ہمین حکومت کی خوشنودی سے زیادہ اپنا مذہب عزیز ہے اور مشین گن کے گولون سے زیادہ اللہ کے قہر وجلال کا خوف ہے پس اگر یہی صورت حال رہی تو ہم انسانون کے وفادار نہین رہینگے بلکہ اللہ سے وفاداری کرین گے، اس کے رسول کی اطاعت کرین گے اور ان احکام پر عمل پیرا ہون گے، جن کیطرف اللہ کا دین قیم ہماری ہدایت کر رہا ہے۔ وللہ عاقبۃ الامور

ہرچند انگریزی اخبارات ترکی حکومت اور مسائل صلح کے متعلق جو خیالات ظاہر کر رہے ہین، ان مین اگرچہ کسی قدر مسلمانون کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے لیکن حقیقۃ مکتب العین سب کا ایک ہی ہے اور ہم موافقت ومخالفت کے اس باریک نقاب مین چھپے ہوئے خوفناک خد وخال اور بھیانک صورت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہین اتقوا فراسۃ المومن (الحدیث)

ٹائمز نے لکھا ہے کہ ترک اگر قسطنطنیہ سے نکال دیے گئے، تو اس سے مسلمانون کی

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) وزیر اعظم جرمنی نے دوسری جنگی کانفرنس مین جو بمقام ورسیلز منعقد ہوئی تھی اتحادیون کی درخواست مصالحت پر ظاہری تعیین اور جس مین اتحادیون نے ہوائی ذریعون سے حاصل کر کے جرمنی صلح کی ہو کا جھنڈا بقول لائڈ جارج اور چرچل لکھنا ہے کہ جو شرائط زیادہ ... گو مین اطلاعات تمام تر غلط ہیں کہ جرمنی ان کے قبول کرنے کیلئے تیار نہین یہ تقریر ایک شاہکار حلقہ کی علم و واقفیت کیلئے کتابی صورت مین شائع کر دی گئی

عقیدت اور اس روحانی تعلق مین کیا خلل آجائیگا - جو حادث الوقوع ہے[له] اور ان کی خلافت
کو ایسا کیا گزند پہونچ جائیگا کہ مسلمان مضطرب و بیقرار ہین - لیکن شاید اسے ان محرکون

---

له تاریخ اگر انگریزی وعدون کی طرح جھوٹی نہین ہے، تو اس حادث الوقوع کی حقیقت و اصلیت کا نظارہ جدیدی کے صفحات مین اس خط سے مل سکتی ہے جو انگریزون نے ٹیپو سلطان کو رام کرنے کے لئے حضرت خلیفۃ المسلمین کے پاس سفیر بھیجکر حاصل کیا تھا کہ ایک مسلمان صرف خلیفۃ المسلمین ہی کی قوت سے متاثر ہو سکتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو قابل قتل ہے! علاوہ ازین اگر مسلمانون مین گذشتہ تیس برس سے بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہین اور اب انھون نے اپنے ان فرائض کو محسوس کر لیا ہے جسے صبح بنارس اور شام اودھ کی رنگینیون مین فراموش کر چکے تھے تو آپ ان کی غفلت و نادانی کو کیون دلیل پکڑتے ہین یورپ کی تاریخ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ اسکی بیداری کی تاریخ اور جذبات کی ابتدا مسلمانون کے مذہبی جہاد اور صلیبی جنگون سے شروع ہوتی ہے - پس اگر ہمین بھی یورپ نے اپنی صلیبی جنگ جویانہ تعصب دھر کے نشتر چبھو کر بیدار کر دیا ہے تو آپ کے یہ خاوعانہ دلیلین ہمین اپنے فرائض سے باز نہین رکھہ سکتین - آج تک ہمین یورپ کے اقرارنامون اور شاندار وعدون کی صداقت پر کس قدر اطمینان رہا، لیکن اب ہم قطعاً یورپ کی کسی آواز کو نہین مان سکتے خواہ وہ کیسی ہی قوت اور ایمانداری سے کیون نہ کہی جائے اور خواہ وہ آواز کنگ جارج ہی کی کیون نہ ہو - ہمارا ایمان ہے کہ یورپ کی کسی بات پر اعتبار نہین کرنا چاہیئے! اور واقعات نے ہمین سبق دیا ہے کہ ہمین اب یورپ کو بالکل بائیکاٹ کر دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہونچے - چار سو برس کا واقعہ ہے کہ ایک سفیر نے انگلستان کے ایوان وزارت مین اس خوشخبری سے اپنی تقریر کو شروع کیا تھا کہ دولت عثمانیہ قریب المرگ ہے - اس پر کامل نو قرن گذر گئے تا آنکہ گلیڈاسٹن کا زمانہ آیا اور ۱۸۷۶ء مین انگریزی جذبات کی سربمہر حقیقت عالم آشکارا ہوئی اور جسے عملی حیثیت سے سین سٹی فانو اور برلن کانگریس کے معاہدون نے اور بھی تشت ازبام کر دیا - پھر تو یہ راز دلون کے بطون سے نکل کر زبانون اور چہرون پر ناطق و نمودار ہو گیا تھا! سنہ مین نیر الیسٹ کے صفحات پر جب ہم نے عرب کے متعلق انگریزی پالیسی کا مطالعہ کیا، ٹائمز مین عراق کے متعلق برطانیہ کے خواہش" ہماری نظر سے گذرا، جنگ بلقان مین جب ہماری آنکھون کے سامنے انگریزی اور روسی قوا سے یونی و بگری ترکون کے خلاف متحرک ہوئے جب سقوطری مین بلغاری فوجون کے ساتھ انگریزی لشکر بھی داخل ہوا جب

اور مذہبی جہاد ون پر اطلاع نہین جو فتح قسطنطنیہ کے ساتھ وابستہ ہین اور غالبًا اسکا ذکر بھی الغرض نہین جانتا کہ قسطنطنیہ نہایت شدید جانی و مالی قربانیون کے بعد حاصل کیا گیا ہے اور پانچ سو برس سے ترکون کا دار السلطنت اور مسلمانون کا مرکز خلافت ہے۔ بلاشبہ مسلمانون کے اس روحانی تعلق کو کوئی صدمہ نہین پہونچ سکتا جو ہندوستان کے مسلمانون اور ترکون کے درمیان ہے، جو کرہ ارض کی مسلم آبادی اور حضرت خلیفۃ المسلمین کے باہم قائم ہے۔ لیکن یہ روحانی تعلق کا سوال نہین، غیرتون اور حمیتون کا سوال ہے۔ جس طرح کوئی انگریز اپنے وطن اور دار السلطنت کو چھوڑنے کیلئے طیار نہین ہو سکتا، بالکل اسی طرح، بلکہ اس سے زیادہ کوئی مسلمان اسے بھی گوارا نہین کر سکتا کہ قسطنطنیہ کو ایک بار مرکز خلافت بنانے کے بعد ایک عیسائی بین الدول حکومت کے ماتحت دیکھے، اور ان کے خلیفہ اور مذہبی پیشوا کو جو چالیس کرور اسلامی آبادی کا دینی و دنیوی حاکم و فرمانروا ہے اس کے آبائی وطن سے بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا جائے۔ ہمین اس حقیقت سے انکار نہین کہ وطن سے مہزوم سے مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہین پڑ سکتا کہ مسلمان جہان بیٹھ جائے وہی اس کا گھر ہے اور جہان چلا جائے، وہی اسکا وطن۔ لیکن ہمین ایڈریانوپل کے جانیکا غم نہین، ہم دردہ دانیال اور باسفورس کیلئے متالم و سوگوار نہین اور نہ ہم قصر یلدیز، بازار ستنف، سرا شاخ ندین اور غلطہ پل کیلئے روتے ہین۔ بلکہ ہمین رونا تو ان ہڈیون سے جدائی کا ہے جو قسطنطنیہ مین مدفون ہین، ہماری آنکھین تو ان مسجدون کیلئے اشکبار ہین جن کے گنبد اس زمین مقدس پر بلند ہین اور جنکی عزتین خاک آلود ہو جائینگی جس طرح، کانپور اور شکرپور کی مسجدون کو تباہ کیا گیا، جس طرح بلغاری دحوش اور یونانی مراکش مین قوم پرستون کی سرکوبی کیلئے حریت پرست انگلستان نے فوجین بھیجین، جب مصر قبرس، کریٹ، یونیا، سقطہ، البانیا، ہرسک اور بوسنیا کے واقعات پیش آئے اور یہ ہنگامہ کا جاقو بیدردی سے دولت اسلامیہ کے جسم پر چلنے لگا تو مسلمان بیدار ہوے، ان کی غفلت و جہالت کا جمود و خمول دور ہوا اور ایک عام بیداری امت اسلامیہ مین پیدا ہو گئی۔ اب آپ اسے حیات بعد الموت کہئے یا حادث الوقوع اتحاد اسلامی کا جذبہ۔ لیکن اس قدر تو مسلم ہے کہ اس بیداری کا باعث یورپ اور سب سے زیادہ انگلستان ہے، جسکے متعصبانہ جذبات اور ملک گیری کی خواہشات نے ہمارے جسمون مین بیداری کی روح پھونکی ایک امریکی اخبار نویس نے جس پہلے لکھ چکا ہے کہ مسلمانون کی جدوجہد فتاحی و بیداری کی تاریخ جنگ طرابلس سے شروع ہوتی ہے جس مین ہر موقع پر انگریزی فوجین ترکون کے خلاف پیش پیش رہین۔

بربرہ کے ہاتھون آورنہ کی مسجد سلیم اور کریٹ اور سمرنا کی بیسیون مسجدین بے حرمت کی گئین اور وہان گھوڑون کے اصطبل اور پیشاب خانے بنائے گئے۔ مختصر یہ کہ ہم قسطنطنیہ کے لئے نہین روتے کہ وہ یورپ مین ہے بلکہ ہماری آہ وفغان اور نالہ و بکا تو صرف اس وجہ سے ہے کہ قسطنطنیہ ہماری حاکمانہ شوکتون اور شاہانہ عظمتون کا قبرستان ہے، وہان ہماری مردہ قومیت کو زندہ کرنیوالے مدحت اور جمال الدین کے مزار ہین اور وہ ہمارے دینی و دنیوی امام، بایزید، سلیمان اعظم، مرحوم عبدالمجید اور محمد فاتح کا مدفن ہے۔ یاد رکھو کہ ہم حکومت وسلطنت کے کسی قطعۂ زمین کیلئے نہین روتے بلکہ جامع آیا صوفیہ کے لئے روتے ہین۔ جہان شدید ترین مذہبی جہاد اور قربانیون کے بعد اسلام کا ہلالی پرچم نصب کیا گیا تھا اور جہان پانچ سو برس سے گلبانگ توحید اور اللہ اکبر کی صبح پرور صدائین سامعہ نواز ہوتی ہین، وہان اب مسیحی دنیا کی کوششون بالخصوص حکومت برطانیہ کی متعصبانہ مساعی سے ناقوس کلیسا کا شور وغوغا برپا ہوا کریگا اور اسی مقام مقدس کو عیسی اور روح القدس کی افسانہ سرائی اور تثلیث پرستی کا گرجا بنا دیا جائیگا۔

آپ کو ادعای فیروزمندی کی شراب نے سرشار کر رکھا ہے اسلئے آپ اس وہم مین مبتلا ہین کہ اگر ترکون کو قسطنطنیہ سے نکالدیا گیا تو ہندوستان مین امن وامان رہیگا۔ پس شوق سے آپ اپنی یہ آرزو نکال دیکھئے کہ ہم بھی اب یہی چاہتے ہین (قسم بخدا) ہنوز خونہائے مجاہدین عمر فاروق وحیدر کرار در شرائین ما جاریست، وہنوز احساسات مردان عہد صلاح الدین ومحمود غزنوی وبابر وآقا محمد فاتح در اعصاب ما متمکن می باشد۔ ببین کہ سرہائے ما چگونہ بابدان شکستی می کند، ببین کہ چطور خونہائے ما از تنگی مجاری خود فریاد می کند، وببین کہ دلہاے ما چسان در سینہ ہای ما می طپد، ببین کہ بازوہائے ما از کسالت اعتدال پسندی وصلح جوئی تا چہ حد خستہ است، ببین کہ سینہ ہائے ما برائے نفس و ابدان ما برائے ارواح تنگ گردیدہ۔

لا تسقنی ماء الحیاۃ بذلۃ بل فاسقنی بالعز کاس الحنظل
ماء الحیاۃ بذلۃ کجہنم وجہنم بالعز اطیب منزل

آپ غرور فتحمندی مین ہمارے جذبات کو ٹھکرا دینا چاہتے ہین، پس ٹھکرا دیکھئے اور جو جی مین آئے کر لیجئے کہ اپنا تو بقول جوہر یہ عقیدہ ہے۔

کچھ بھی وہاں نہ خنجر قاتل کا بس چلا
روح شہید رہتی ہے لاش وکفن سے دور

اور اللہ کے فضل و کرم سے جس عالم میں ہیں، اسکی کیفیت ہی دنیا جہان سے نرالی ہے۔
لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔!

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
قاتل سے وہ لیکن یہ کہے جائے کہ ہاں اور

لیکن، یقین کیجئے کہ ابتلاء و آزمائش کی ان دشواریوں کے بعد وہ وقت دور نہیں، جب آخری کامیابیوں کا تاج ہمارے سر پر ہوگا اور جنھیں آج ہمارے فنا کر دینے پر اصرار ہے، ان کی گردنیں انجام کار ہمارے ہی آستانۂ عز و جلال پر جھکی ہونگی۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم وارثین۔

ہم نے ارادہ کیا کہ جو لوگ کمزور اور ضعیف کئے گئے ہیں انپر احسان کریں، انھی کو سرداری اور برتری بخشیں اور ناتوانوں کو طاقتور انسانوں کی جماعتوں کا وارث بنائیں!

دولت و حکومت کے طبل و نشان، آپ ہم سے لیتے ہیں، لیجئے کہ یہ صرف آفتاب کا سایہ ہیں اور انھیں کبھی قیام و دوام نصیب نہیں ہو سکتا۔ قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر۔ اگر آپ کی قوت و توانائی بہت بڑھ گئی ہے تو اللہ آپ کی قوت و توانائی کو بڑھاتا ہی جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کو آپ کے مقابلہ میں شکست ہوئی ہے، تو اللہ ان کو ہزیمت ہی دینا چاہتا ہے کہ آپ کو غرور و سربلندی اور سرشار کر دے اور ہمیں ہمارا عجز یاد دلائے اور بیدار کر دے ہر قوم کی تاریخ حیات اسی سے شروع ہوتی ہے۔

وہ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اس شکست و فتح میں ہمارے اور دوسروں کیلئے، بڑی ہی بصیرتیں پوشیدہ ہیں اور وہ قانون کو اور ڈھیل دے رہا ہے کہ اب بھی باز آجائیں۔ لیکن جیسا کہ آثار سے ظاہر ہے، دنیوی قوتوں پر غرور کرنے والوں نے اپنی وارفتگی کو نہ چھوڑا تو پھر اللہ بڑا ہی قوی توانا ہے۔ اور ایک مضمحل ہاتھ

کی تلوار تمام دنیا کے سامان اسلحہ سے زیادہ زبردست - کون نہین جانتا کہ صلح حدیبیہ مین مسلمانونکو شکست ہوئی تھی، مگر ایسا کون ہے جسے علم نہین کہ اس سرو قامتی کے بعد ہی کافرون کو سبزہ پائمالی بننا پڑا - ولا تحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون انما یؤخرہم لیوم تشخص فیہ الابصار مہطعین مقنعی رؤسہم لا یرتد الیہم طرفہم وافئدتہم ہواء -

ہو سکتا ہے کہ ایک قوم کی حکومت غیرون کے لئے تکلیف دہ ہو، لیکن فرمانروائی کی اہلیت اسمین موجود ہو، بعید نہین ہے کہ ایک حکومت شخصی ہو لیکن اسکی شخصیت انصاف کو پامال نہ کرتی ہو - محال نہین ہے کہ ایک نظام عمل غیر جمہوری ہو لیکن اسکے ماتحت رعایا ہر طرح آزاد ہو، اس کے سینہ مین نام نہاد تہذیب اور فرضی شائستگی کا خنجر پیوست کرنا، اسے حریت و آزادی کے محض خود غرضانہ حیلون کی اسلحہ سے ہلاک کر دینا اور اسکی زندگی کے باغ کو اپنے قومی تعصبات اور ملک گیری کی خواہشات کی بنا پر جمہوریت کے نام سے تاراج کر دینا اور ایک خود ساختہ بین الاقوامی حکومت تاسیس کرنا کھلی سازش اور بالکل عیان ظلم و جفا کاری ہے جس کی نظیر دنیا کی کوئی تاریخ پیش نہین کر سکتی -

آپ جس قوم کی قسمت کا اس بیدردی سے فیصلہ کرنا چاہتے ہین وہ وحشی قوم نہین ہے بلکہ سامان تہذیب و تمدن کی مالک ہے، اسوقت جبکہ یورپ وحشت و بربریت کے قعر عمیق مین پڑا تھا - ترکون کی تہذیب و تمدن کا اختر اقبال آسمان پر چمک رہا تھا - اور آج بھی اگر نمائشی تہذیب اور ادعائی مدنیت کی آوازون کیطرف سے اپنے کان بند کر لئے جائین تو ترکون مین تمام یورپ سے زیادہ تہذیب ہے - وہ چاہتے تو آرمینیا اور کریٹ کے باغیون کو دردناک سزائین دے سکتے تھے، پادریون کی داڑھیاں پکڑ کر انھین مار بھی سکتے تھے اور یہ بھی دشوار نہ تھا کہ باغی چلا دئے جاتے ہاتھون پر انگارے رکھ دئے جاتے، بر سر عام سزائے تازیانہ دیدی جاتی اور پیٹ کے بل رینگوایا جاتا، جس طرح تہذیب کی سب سے بڑی دعویدار قوم نے امرتسر اور لاہور مین کیا - لیکن وہ جو آج کہتے ہین کہ ترکون کی تاریخ حکومت بہت تاریک اور وحشیانہ ہے، بتلائین اور ثبوت دین کہ ترکون نے آج تک کس پر ظلم کئے اور اپنی کس محکوم رعایا کیساتھ وہ برتاؤ یا اس سے کم وحشیانہ طریقے اختیار کئے جو انگریزون نے ہندوستان مین اختیار کئے ہین فیجی اور جنوبی افریقہ مین اختیار کئے ہین - مصر اور سوڈان مین اختیار کئے ہین -

مناسب ہوگا کہ تہذیب و شائستگی اور جمہوریت و آزادی پرستی کی تعریف کر دی جائے - کیونکہ

یورپ اور عضویت کیساتھ انگریزی تہذیب و شائستگی اور جمہوریت و آزاد پرستی کا دائرۂ عمل بالکل وہی ہے جو ہماری دنیائے تہذیب میں وحشت و درندگی کو دیا گیا ہے! اور اس لحاظ سے اگر ترک یورپ کے معیار تہذیب پر پورے نہیں اترتے تو یہیں اپنی انسانیت اور یورپ کی وحشیانہ تہذیب سے محروم ہونے کا اعتراف ہے۔

میں اسوقت ترکوں کی تہذیب سے تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ موضوع ایک مستقل مضمون کا طالب ہے اور انشاء اللہ کسی فرصت میں مورخانہ حیثیت سے اسپر نظر ڈالونگا لیکن یہاں اسقدر بتلا دینا ضروری ہے کہ یورپ کو کچھ جن چیزوں کی اختراع و ایجاد پر ناز ہے وہ سب ترکوں کے خرمن کے پژمردہ پھول ہیں۔

قاموس العلوم (انسائیکلوپیڈیا) سب سے پہلے سولھویں صدی میں ایک ترک (چلپی آفندی) نے لکھی تھی۔ فوجی شفاخانوں کے انتظام اور اس کے تمام متعلقات کا علم یورپ نے ترکوں ہی سے حاصل کیا تھا، فوجی باجا، پیدل فوج، توپ خانہ اور انجنیرنگ میں ترکوں نے جسقدر ترقی کی تھی، اسی کی شعاعیں ہیں جو یورپ میں چمکتی نظر آتی ہیں۔ صنعت و حرفت، آزادی تجارت اور علوم و معارف کا جسقدر چرچا تھا، وہ اگرچہ یورپ کی عنایت سے اب باقی نہیں رہا تاہم اگر آپ چاہیں تو تاریخ کے صفحات آپ کی کافی رہنمائی کرینگے، اور کسیقدر ایڈورڈ کرسی کی تاریخ روم بھی آپکو، اس تابندہ فضل و کمال کی روشنیوں کا پتہ دے سکیگی۔

یورپ سمجھتا ہے کہ ہم نادان ہیں اور آب شور و آب شیریں میں تمیز نہیں کرسکتے لیکن اسے یاد رکھنا چاہئے کہ عہد خود فراموشی گیا اور اب ہمارے لئے آگ اور سونے کے منافع و مضار کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ صاف صاف سنئے کہ یورپ کی تہذیب و تمدن محض نمائشی ہے اور اسکی حریت دوستی و جمہوریت پرستی بالکل مکر و فریب ہے۔ اور مشرق کی تاریخ کے صفحات اس قسم کی نمود و نمائش اور ضرع و فریب سے خالی ہیں۔ یعنی آپ کی حکومت میں شہری آبادی پر، بغیر اعلان و اطلاع، ہوائی جہازوں سے گولہ باری کیجاتی ہے اور فوج کے ایک وحشی افسر کو امن پسند مجمع پر گولیاں چلانے کے لئے چھوڑا جاتا ہے، جو عدالت میں بھی بلاخوف لومۃ لائم کہتا ہے کہ ہاں، میں نے گولیاں چلائیں، ہندوستانیوں نے ظلم کئے کہ وہ اسی کے مستحق تھے اور افسوس ہے میرے پاس کافی سامان حرب نہ تھا جس کے باعث اگر تیسر

اب تک آباد ہو۔ اور ترکون کی حکومت مین باوجود آرمنی اور البانی، روتیلی اور کریٹی آبادی کے باغی ہوجانے اور سلطانی فوجون پر حملے کرنے اور الکھون مسلمانون کو بے خان و مان کردینے انکے گھرون مین آگ لگا دینے، ان کے بچون کو سفاکانہ ذبح کرنے اور ان کی عورتون کو بے عصمت کرنے کے اس قسم کے وحشیانہ اور غیر انسانی طریق حکومت کو جائز نہین رکھا جاتا بلکہ لطف وکرم کی بارش کی جاتی ہو، البانیون کو حقوق دیے جاتے ہین، اور ارمنیون کے ساتھ مراعات کی جاتی ہین، رومیلیا کیلئے انھی کی قوم کا حاکم مقرر کیا جاتا ہے۔ کریٹ کو آزاد کیا جاتا ہو اور ان نمک حرام پادریون سے بھی تعرض نہین کیا جاتا جو بر سرعام ترکون کی تباہی کی دعا مانگتے، اور علی الاعلان بغاوت و فساد پر وعظ کہتے ہین۔ آپ کی حکومت مین یہ ایک عام بات ہو کہ محکوم قوم کے علماء و شیوخ اور داعیان حق و صداقت و فداکاران ملت کو گرفتار کیا جاتا ہے اور وہان جب کوئی پادری یا قسیس کسی راستے سے گذرتا ہو تو پولیس کا سپاہی اسے سلامی دیتا ہو۔ آپ کے ہان محکوم قوم کے اکابر و اعاظم کو علانیہ سزا گستاخانہ دیجاتی ہے اور وہان ان کے گھرون مین عزت و حرمت کے لاشے لے جاتے ہین اس حال مین کہ ان کی زبانون پر ترکون کیلئے سب وشتم اور اعلان قتل کے اور کچھ نہین ہوتا۔ مختصر یہ کہ یورپ کا نظام مساوات کو مٹاتا ہے، انگریزون کا آئین سلطنت تہذیب و شائستگی اور صداقت و راست بازی کو پائمال کرتا ہو اور ترکون کے نظام سلطنت مین کوئی تبدیلی نہین ہوتی، جب ترکون اور البانیون کے باہمی مناقشات پیش ہوتے ہین اجب مسلمانون اور یہودیون کے مقدمے عدالت مین داخل ہوتے ہین تو وہ نہ کسی یہودی کی آنکھ کی قیمت پچیس روپے قرار دیتی ہے اور نہ کسی ترک قاتل کو یہ لکھکر بری کردیتی ہو کہ قاتل نشے مین تھا اور خود مقتول بھی پہلے سے بیمار تھا، یا اسے ہیضہ ہوگیا تھا اور اسکی تلی بھی خراب تھی!! انکے ہان نہ ریلون کے سفر مین ترکون اور یہودیوں کے درمیان کوئی وجہ امتیاز قائم کیا جاتا ہے نہ مسلمانون اور عیسائیون کے بیٹھنے کے کمرون مین اختلاف ہوتا ہو اور نہ ایوان حکومت مین محکوم قوم کی تذلیل و اہانت کے طریقے اختیار کئے جاتے ہین!!! پھر کیا وجہ ہے کہ آپ گھروالون کو خانہ بدوش کرکے اپنی خودغرضانہ جمہوریت دوستی و حریت پرستی کی داد دینا چاہتے ہین، اور ترکون سے ان کی مقبوضات چھین لینے کے درپے ہین کہ انھین شائستگی سکھا ئینگے۔ حالانکہ ابھی آپ ہی کو نہین معلوم کہ تہذیب کے معنی کیا ہین اور اسکا دائرہ عمل کسقدر وسیع ہے۔ بفرض محال اگر آپ تہذیب سے واقف بھی ہین تو کیا

کیئے حکومتوں کا تباہ کرنا اور اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالنا بھی ضروری ہے! آپ کہتے ہین کہ ہم عراق کو تہذیب سکھانے کے بعد چھوڑ دین گے، بغداد سے شائستگی کا درس دینے کے بعد اپنی حکومت اٹھالین گے، لیکن خدارا ایک مثال تو بتلا دیجئے کہ کسی جگہ سے آپ نے قدم جمانے کے بعد اپنا قبضہ اٹھایا بھی ہو! مصر کے متعلق آپ نے یہی کہا تھا" مگر باوجودیکہ امریکہ ان کی خود مختاری کو تسلیم کر چکا ہے اور کنگ جارج کا منشاء بھی یہی ہے کہ مصر کو اب آزاد کر دیا جائے مگر وہان اب تک کشمکش جاری ہے ہندوستان ڈیڑھ سو برس سے کامل طور پر آپ کے زیر حکومت ہے، لیکن اب تک وہ کامل ذمہ دار حکومت کا مستحق نہین سمجھا جاتا۔ آئرلینڈ مین حکومت کی قابلیت پیدا ہوگئی ہے مگر جوع الارضی حرص و آز، اسکو آزاد کرنے کے لئے طیار نہین! امریکہ کے متعلق بھی اخیر وقت تک آپ کی یہی رائے تھی کہ وہ حکومت کے ناقابل ہے، مگر آج اسکی تو یہ حالت ہے کہ اس نے پندرہ برس کی مدت مین فلپائن کو حکومت کے قابل بنا دیا اور اسے کامل ذمہ دار حکومت دیدی لیکن، ہندوستان سے اسکی وہ قابلیت بھی چھین لی گئی جس کا وہ سرمایہ دار تھا۔ یعنی پہلے اسی زمین سے وہ لوگ پیدا ہوئے تھے جو وزارت کے اہم فرائض انجام دیتے تھے اور آج سوائے چند ہندوستانیون کے، جن کا ایمان صاحب کا ارشاد اور جن کا خدا صاحب کا وجود ہے تعلقہ داری (کمشنری) کے بھی ناقابل ہین!

ہمین تسلیم ہے کہ دولت عثمانیہ کے ماتحت جس قدر عیسائی آباد ہین، آزادی کے مستحق ہین لیکن دولت عثمانیہ کی قطع و برید سے پہلے اپنی آنکھ کے شہتیر کو دیکھ لیجئے کہ انتخاب حکومت کا مسئلہ اسی وقت طے ہوسکتا ہے جب ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانون کو بھی انتخاب حکومت کا حق دیدیا جائے مصر کے مسلمانون کو بھی انتخاب حکومت کا حق دیدیا جائے۔ آرمینیا اور کردستان کے مسلمانون کو بھی انتخاب حکومت کا حق دیدیا جائے، شام اور وان کے مسلمانون کو بھی انتخاب حکومت کا حق دیدیا جائے ایشیائے کوچک اور یمن کے مسلمانون کو انتخاب حکومت کا حق دیدیا جائے، اور طرابلس و بنغازی اور الجزیرہ کے مسلمان بھی آزاد کر دئے جائین کہ بقول جان اسٹوارٹ مل، ایک قوم کا دوسری قوم پر حکومت کرنا محض بے معنی ہے اور اس سے زیادہ اس کے کوئی معنی نہین کہ حاکم قوم جوع الارض حرص و آز کے لعنت مین گرفتار ہے۔ رہا اناطولیہ جہان مسلمانون اور عیسائیون کی تقریب قریب مساوی آبادی ہے، سو اناطولیہ تمام مناقشات سے پاک ہے۔ عرب، ارمن، چرکس، ترکمان، یونانی اور

یہودی باہم اسطرح مختلط و ممزوج ہین کہ قومیت و مذہبیت کے سوال قطعًا فضول اور بیکار ہین کیونکہ ان مین سے کوئی ایک بھی بلقانی اقوام کی طرح اپنا مرکز جاذبیت و جاابیت نہین رکھتین جس کی وجہ سے ترکون سے نفرت اور قومی غرور کے جذبات بھی پیدا نہین ہوتے۔ لیکن جو ملت عثمانیہ چاہے وہ آزاد ہو یا زیر اثر، اگر اناطولیہ کو اس سے علیحدہ کیا جائیگا تو اس علحدگی یا سقوط کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اناطولیہ جو اب تک جغرافیہ مین ایک حیثیت رکھتا ہے عربون اور یہودیون مین تقسیم ہو کر ارمنون اور یونانیون مین پراگندہ ہوکر، چرکس اور ترکمانون مین ٹکڑے ٹکڑے ہوکر، ایک قریہ اور ایک قصبہ کی طرح بے حیثیت ہوجائیگا۔ سمرنا اور رتھریس جب یونان کے قبضہ مین ہونگے تو اناطولیہ کو ایک بندرگاہ کی ضرورت ہوگی اور قسطنطنیہ جو ایک بندرگاہ ہے ملک کا طالب ہوگا۔ یعنی ترکون سے اناطولیہ کا چھین لیا جانا، صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ قسطنطنیہ پر بھی ان کی حکومت قائم نہین رہ سکتی کیونکہ اقتصادی نقطۂ نظر سے اناطولیہ حکومت شاخ زرین پر قبضہ کرنا چاہیگی کہ جب تک گولڈن ہارن پر اس کا تسلط نہوگا، تجارتی ترقی مین اسے دشواریان پیش آئینگی۔

علاوہ ازین اناطولیہ، ترکون کا وطن ثانی ہے اور وہان اگرچہ ان کی بیشتر حصہ آبادی، زراعت پیشہ ہے، لیکن انھون نے اپنی قومیت کو محفوظ رکھا ہی۔ اسلئے اناطولیہ بھی کسی یورپین حکومت کے ماتحت نہین رہ سکتا۔

جب آپ حق انتخاب حکومت کی تبلیغ کر رہے ہین اور مردون کو زندگی کے منصۂ وجود پر لانا چاہتے ہین تو کیا یہ انسانی حق صرف انھی کو مل سکتا ہے جو مسیح کی امت ہین اور جن کے مذہب کی اولین دعوت ترک دنیا، اور رہبانیت ہے۔ لیکن اگر آپ کی عدالت انصاف کا یہی فیصلہ ہے تو کیا ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی نیک و بد ہر رائے کیساتھ پابندی کا عہد بھی کرلین! جب ایک شخص ہماری زندگی کا خاتمہ کردینے پر آمادہ ہے، جب ایک نابکار ہستی اسلام کے مٹادینے کے درپے ہے، اور جب ایک بندۂ حرص و آز نے ارادہ کرلیا ہے کہ قسطنطنیہ کو جس طرح بھی بن سکیگا ترکون کے قبضہ سے آزاد کرادیگا، اور مسلمانون کے خلیفہ سے اس کا دنیوی اقتدار چھینکر پائے تخت کی طرح عضو معطل بنادیگا تو اول تو یہ کسی کے اختیار کی بات نہین اور اگر کسی کو دعویٰ ہے کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے اور اسلام کو بھی شکست دے سکتا ہے تو میدان مین آئے

اور اپنے دل کی آرزو نکال دیجئے۔

آخر تو ہیں ہم مدعی صبر و تحمل
رہ جائے نہ دل میں ترے ارمان جفا دیکھ!

اس حقیقت سے ہمیں انکار نہیں کہ تکمیل عیسائیت کیلئے یورپ سے ترکوں کا اخراج ضروری ہو لیکن حق انتخاب حکومت اور آزادی و جمہوریت، تہذیب و شائستگی اور حضارت و عمرانیت کا یہ بھی کوئی جزو ہے؟ برطانیہ کے ذمہ دار ارکان حکومت کو زمانہ جنگ میں جب کبھی امداد کی ضرورت ہوئی یہی کہا کہ برطانیہ، اس جنگ میں حق اور انصاف کیلئے شریک ہوا ہے، لیکن کیا حق اور انصاف، اسی باطل اور ظلم کو کہتے ہیں؟ کرزن، کرنل ایڈمنڈ ڈکارسن کے جو خیالات ہیں اور رابرٹ سیسل ابتدا سے جن طیاریوں اور کوششوں میں مشغول و منہمک ہیں، کونسٹر بری اپنے جوش مذہبی میں جو کچھ کہہ رہا ہے، کیا حکومت برطانیہ نے ابتدائے جنگ میں بھی یہ کہا تھا اور کیا سیسل کو وہ زمانہ یاد نہیں جب اس نے کنگ جارج کی طرف سے یہ اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ بالکل محفوظ رہیں گے اور مسلمانوں کا مرکز خلافت اور ترکی مقبوضات پر متخاصمین کی فتح و نصرت کے نتائج کا بھی کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان تنگ ظرفوں کو فیروزمندی کی شراب نے بدمست کر دیا ہے اور اگر لائڈ جارج بھی ان احسانوں کو بھول گیا ہے جو مسلمانوں نے اسکی قوم اور حکومت کیساتھ کئے ہیں تو ہمیں بھی اب اسکی پرواہ نہیں۔ لیکن اسقدر سمجھ لینا چاہئے کہ

یہ میں نے مانا کہ آج خنجر، رگِ گلو بھی نہیں رہیگا
کرینگے قاتل کے او ستمگر ہمیشہ تو بھی نہیں رہیگا

قسطنطنیہ ہمارے لئے ایک متبرک مقام ہے، اگرچہ بیت المقدس کی طرح نہ سہی، وادی غیر زرع بیت اللہ الحرام کی طرح نہ سہی، مدینہ منورہ کے گنبد خضرا کی طرح مقدس و محبوب اور دلنواز نہ سہی، تاہم اس کا یہ تقدس کہ آثار قیامت میں اس کا ذکر موجود ہو، اس کا یہ تقدس کہ اسکی سرزمین پر جامع ابو ایوب انصاری تعمیر ہے، اس کا یہ تقدس کہ اس کے ایک حصہ زمین پر بجائے ناقوس کے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور سینٹ پال کے گرجا کے میناروں پر صلیب کی جگہ اسلامی پرچم لہراتا ہے؛ بہت زیادہ ہے اور وہ ہماری حیات سیاسی کیلئے روضۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ تمام مقامات مقدسہ سے بھی

زیادہ مقدس و عزیز ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے اب وہی ایک حکومت ہے جو اسلام کی حمایت مین تلوار اٹھا سکتی ہے اور وہی ایک زمین ہے جسکا چپہ چپہ اسلامی حکومت کی عظمتون کا مدفن ہے۔ اس سرزمین کا ذرہ ذرہ مسلمانون کی شان و شوکت اور جلالت و بزرگی کا شاہد ہے اور اسکی زندگی کے ساتھ خادمان اسلام کی شجاعانہ روائتین زندہ ہین!

اناطولیہ کو چھوڑ دیا جا سکتا ہے اگرچہ وہ ترکون کا وطن ثانی ہے، ترکستان سے ہاتھ اٹھائے جا سکتے ہین کہ وہ مسلمانون کی فاتحانہ عظمتون سے خالی دامن ہے۔ چین مسلمان اپنا وطن چھوڑ سکتے ہین کہ وہ ان کا اصلی وطن نہین ہے، اور ہندوستان کے مسلمان بھی اپنے آٹھ سو سالہ دار السلطنت کو چھوڑنے کیلئے طیار ہین کہ وہ ان کا دار الخلافہ نہین ہے۔ لیکن قسطنطنیہ کو نہین چھوڑ سکتے کہ وہ ہماری متحدہ قومیت کا واحد نمائشگاہ ہے، وہ ہمارے ارمانون بھرے دل مین امنگین پیدا کرنیکا تنہا ذریعہ ہے اور غلامان پیغمبر ہاشمی روحی فداہ کی شجاعت و بہادری کا آخری مجسمہ۔ مختصر یہ کہ قسطنطنیہ ایک ایسا مقام ہے جو مکہ کے بیت اللہ کے بعد، طیبہ کے مقدس خطہ زمین کے بعد، کربلا کی تپتی زمین کے شہید اعظم کے مرقد کے بعد مسلمانان عالم کا روحانی مرکز ہے اور عالمگیر اتحاد اسلامی کا واحد مرکز انضباط۔

پس جبکہ اس وحشیانہ جذبہ کا محرک اصلی اسلام کی شکست اور عیسائیت کی فتح کا جذبہ ہے اور جسپر روغن قاز کی مالش کرکے، جمہوریت کی صورت مین پیش کیا جاتا ہے، تو دشمنان اسلام کو یقین کر لینا چاہئے کہ جب تک دنیا مین ایک مسلمان بھی زندہ ہے، وہ مسلمان نہین، جو ترکون کا دشمن ہے، جس نے چاندی، سونے کے چند سکون پر اسلام سے، اس کے رسول سے اور اپنے خلیفہ سے بغاوت کی کہ وہ بلاشبہ کافر ہے اور اس سے تعلق رکھنا بھی ناجائز اور مجربہ فسق نا ممکن ہے کہ دنیا کی کوئی قوت ترکون کو یورپ سے بوریا بستر اٹھانے پر مجبور کر سکے۔ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

پھر بہار آئی ہے تجھ مین اے گلستان غم نہ کھا
وہ چلی آتی ہے فوج عندلیبان غم نہ کھا
گو کہ شب آخر ہوئی اے شمع تو زاری نہ کر
پھر وہی محفل وہی تیرا شبستان غم نہ کھا

ابو الخیر مودودی کان اللہ لہ ۲۳۔ فروری ۱۹۲۰ء

یہ آخری سطرین لکھ رہا تھا کہ دفعۃً اتحادیون کی مجلس عالیہ کے فیصلہ آخری سنانے کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ برطانوی ہائی کمشنر مقیم قسطنطنیہ کو بھی ہدایت بھیجدی گئی ہے کہ وہ باب عالی کو اس امر کی اطلاع دیدے کہ اسے اگرچہ قسطنطنیہ سے محروم نہین کیا جائیگا، لیکن وہ دہنیال بلکہ باسفورس پر ضعیف ترین اتحادیونکی فوجی حکومت قائم کی جائیگی - اس کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ فیصلہ صرف اسی صورت مین قائم رہ سکتا ہو جب وہ سختیان، جن کا ارمنی نشانہ بن رہے ہین فوراً روک دی جائین ورنہ بصورت دیگر صلحنامہ مین ترمیم کر دی جائے گی - ہرچند ضرورت یہ تھی کہ اس اطلاع کیساتھ ہی تمام ہندوستان مین ایجی ٹیشن شروع کر دیا جاتا اور تمام مسلمان انگریزی حکومت سے مقاطعہ کر لیتے اور بازارون مین انگریزی مال کو جلا دیا جاتا، انگریزین مسلمانون کی کوٹھیون مین رہتے ہین خالی کرالی جاتین اور جلسے کئے جاتے تاکہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ آج سے ہماری وفاداری کا خاتمہ ہے اور ان مسائل و فرائض پر غور کیا جاتا جو اس حالت مین مذہب کیطرف سے ہم پر عائد ہوتے ہین - لیکن اسقدر بتلا دینا ضروری ہے کہ باسفورس پر اتحادیون کی فوجی حکومت کا قائم ہونا اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ ترک قسطنطنیہ مین بھی نہین رہ سکتے جیسا کہ ارکان حکومت کی تقریرون اور انداز کلام سے یہی پایا جاتا ہے کہ آنبائے پر بین الاقوامی قبضہ کے یہ معنے ہین کہ قسطنطنیہ کو توپون کی زد پر رکھا جائے کہ جب موقعہ ہو گولہ باری کر دی جائے - کیونکہ برطانوی ہائی کمشنر نے اپنی پر اسرار تحقیقات سے پتہ لگایا ہے کہ آرمینیا مین ۷۰ ہزار عیسائیون کا خون ہو رہا ہے اور ظاہر ہے کہ جب برطانوی محکمۂ تفتیش کی یہی رفتار رہیگی تو ترک کس طرح قسطنطنیہ مین رہ سکتے ہین - لیکن ان پانچ لاکھ ترکون کے قتل کا کون ذمہ دار ہے جو یونانیون نے سمرنا مین کئے ہین، ان بچون کی لاشون کا کون ذمہ دار ہے جو اس جرم مین جلا دئے گئے کہ مسلمان ہین ان عورتون کی بے عصمتی کا کون ذمہ دار ہے جو عیسائی تہذیب کا نشانہ بنین؟ خود آرمینیا مین عیسائیون نے دس لاکھ مسلمانو قتل کیا جس کا باب عالی نے اپنی یادداشت مین ذکر کیا ہے، لیکن شاید دس لاکھ مسلمانون کا قتل کر دینا تو معمولی بات ہے کہ امرتسر مین ۹ انگریزون کے قتل پر تمام پنجاب مین مارشل لا جاری کر دیا گیا تھا - بہرحال اب ہمین وفاداری کی زنجیرین اپنے پاؤن سے کاٹ دینی چاہئین اور جو کچھ فرائض عائد ہوتے ہین ان کیلئے اُٹھ کھڑا ہونا چاہئے -

# درس امید

خیر باہمین بھی امید ہے کہ مصیبت راحت سے بدلجائے گی

(ٹینی سن کی نظم یادگاری مین سے)

اس پرانے جنگل مین ہوا کس زناٹے سے چل رہی ہو صنوبر کے درختون سے کیسی ناگوار سائین سائین کی آواز آرہی ہے نیم خشک چنار کے پتون مین کیسی تیز کھڑکھڑاہٹ ہے۔ بہی کے درختون مین کیسا سناٹا سا ہے۔ کیسا وحشت ناک منظر ہے جسمین فانی زندگی کے عجیب وغریب پہلو مستور ہین۔"

یہ الفاظ اسوقت میری زبان سے نکل رہے تھے جب خزان کی ایک بھیانک رات کو مین قدرت اور اوسکے اسرار پر غور کرتا ہوا گھومتے گھومتے جنگل کے گھنے جھنڈ ون مین جا پہنچا تھا اور خوفناک طوفان کے اثر کو محسوس کر رہا تھا مین ٹھہر گیا۔ اپنے افسردہ خیالات مین محو شاہ بلوط کے درخت سے کمر لگاکے بیٹھ گیا۔ مین آسمان کیطرف نظر اٹھا کے ان سیاہ بخارات کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگا جو خدا جانے کسطرح اور کہان سے جمع ہو کے آسمان کی وسیع سطح کو تیرہ وتار کر رہے تھے۔ یکایک بادلون کے ایک روزن سے اکتوبر کے چمکدار چاند کی صاف وشفاف کرنین مجھ پر پڑنے لگین۔

روشنی اچانک پڑنے لگی تھی مرے دل مین خیالات نے بھی پلٹا کھایا۔ مین سوچ رہا تھا کہ انسان کی ہستی کے مصائب اور تکالیف اس وحشتناک طوفان اور گھنا ؤنے بادلون کیطرح ہین۔ روشنی نے میری آنکھون مین چکاچوند پیدا کی اور مین نے آواز سُنی گویا میرے خیالات کی صدائے بازگشت تھی" یہ وہ چاند ہے جو بہشت مین چمکتا تھا" یہ رات کے پرندے کی آواز تھی جو میرے قریب ہی کسی درخت کے خلو مین بیٹھا تھا۔ مین نے ادھر اودھر دیکھا کہ آواز کہان سے آئی بڑی بڑی دہشت انگیز آنکھین میرے چاند سے منور چہرہ پر جمی ہوئی تھین۔ وہ پھر کہہ رہا تھا" یہ وہ چاند ہے جو بہشت مین چمکتا تھا"

اسوقت کے تلاطم مین یہ کیا ہی عجیب خیال تھا۔" وہ چاند جو بہشت مین چمکتا تھا" جسکی طرف بیشمار مخلوقات کی نگاہین اٹھتی رہی ہین۔ معصومیت کے زمانہ سے لے کے متفکر شباب تک مادر کیون بالمحض اسلئے کہ اس کی غیر متغیر سکون بخش عظمت مین امن جاودانی کا وعدہ جلوہ گر ہے۔ طوفان کے شور کے باوجود

ایک اور آواز سنائی دی یہ ایک پہاڑی کوے کی تھی جو میرے قریب ہی ایک شاخ پر بیٹھا جھول سا رہا تھا۔ وہ میرے اور روشنی کے درمیان حائل ہو جاتا تھا اور اسکے کوئلے سے سیاہ پر اُڑنے کے لئے کھلتے ہوئے نظر آتے تھے۔

وہ بڑبڑایا۔ اے دھوکے میں پڑے ہوئے " بیوقوف! تیرے خیالی پلاؤ کی کوئی حد بھی ہے۔ تمام دن اندھیرے میں رہنے اور اپنا سارا وقت خیالی اُدھیڑ بن میں ضائع کرنیکا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ دیکھ! تیرا پیارا چاند غائب ہو گیا۔

جواب آیا گم نہیں ہوا۔ چھپ گیا ہے۔

میں اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ کیونکہ اسوقت خوفناک ہوا نے زیادہ شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ غیظ و غضب میں۔ اِدھر اُدھر غل مچاتی اور جھکے ہوئے درختوں کے رہے سہے پتوں کو گرا رہی تھی گویا اسے گرمی کی یادگار باقی رکھنے ہی سے نفرت تھی۔ بہت سے درختوں نے اپنے سر جھکا دیے اور باقی تکلیف سے چیخ اُٹھے۔

جیسے ہی ہوا نے صنوبر کی شاخوں کو طوفان کا بازیچہ بنانا شروع کیا وہ حقارت سے بولا۔ کیا تو کہیں دور سے بڑی خبر لائی ہے جو تو اپنے راستہ میں ایسی ابتری بکھیر رہی ہے؟ بدی کے قاصد! تجھے یہاں کس نے بھیجا ہے؟

بیل جو اپنے تکلیف دہ یاس کے باوجود گردن اونچی کئے کھڑا تھا چلایا۔ کیا چاند تجھے ساکن نہیں کر سکا؟ بید کا کمزور درخت کراہنے لگا ہمارا وقت آگیا ہے۔ مرے پتے چاروں طرف بکھر گئے ہیں ہماری زندگی ختم ہونیوالی ہے۔ گزشتہ تباہی و بربادی میں ہم ننگے دھڑنگے اور یکہ و تنہا کھڑے ہیں۔

سیاہ پتوں والا چنار جھنجلایا۔ زندگی ہی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے خوشنما نکھرے، آبدار شبنم اور لطیف ہوا سے پرورش پا کے اب ہم ظلم بے پروا کا شکار بن رہے ہیں۔ اور ہماری ساری خوبصورتی اور شان و شوکت چھین کر ہم سے کھینچی جا رہی ہے کاش میں زمین ہی سے نہ اُگا ہوتا!

بدفال غراب چلایا۔ اے میرے ارمانوں سے بھرے ہوئے دوست! چند مہینوں کی شان و شوکت سے تمہارا جی نہیں بھرا۔ میرا خیال ہے تمہاری تمنائیں بہت زیادہ ہیں۔ بیشک بیشک دلولے اور آرزوئیں بھلی ہی معلوم ہوا کرتی ہیں۔ اسمیں اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں زمانہ کے موافق زندگی بسر کرتا تھوڑی سی موسم بہار اس سے بھی کم گرمی اور پھر موت۔ اونہہ! لیجئے پھر دہی!

وڑاہی ہوا کا ایک زبردست جھونکا جنگل میں آیا جس نے بہت سے مضبوط ٹھنوں اور تنوں کو توڑ کے زمین پر ڈال دیا۔ زخمی ساکنان قدرت کی آہیں بلند ہونے لگیں۔

شاہ بلوط پوچھنے لگا۔ کیا اس مصیبت سے چھٹکارہ نہیں ہے؟ میں پیدا ہی کیوں ہوا تھا؟

غراب اپنی سخت اور موٹی آواز میں بولا۔ اسلئے کہ فنا زندگی کا قاعدہ ہے۔ اگر کوئی زندگی ختم نہ کیجاتی تو پھر فنا کا کیا کام تھا اور وہ کہاں جاتی؟ یہ نہایت عمدہ قاعدہ ہے۔

پرندہ شب چلایا۔ یہ قاعدہ نہیں بلکہ ایک استثنیٰ ہے۔

اور جیسے ہی وہ بولا بادلوں میں سے پھر وہ سکون جو کبھی ختم نہیں ہوتا بہنے لگا۔ چاند جو بہشت میں چمکتا تھا! اُوہ۔ ان پتوں سے خالی درختوں پر اُسنے کیا نقرئی پانی پھیر دیا۔ بارش کے قطرے ان کے ہوا میں بہتے وقت ایسے چمکتے گویا وہ درخت تاروں کی سی جگمگاہٹ کے لباس پہنے کھڑے ہیں۔

رات کا پرندہ چہکنے لگا۔ اے جنگل کے درختو! اپنے سر اوپر اُٹھاؤ۔ سختی عارضی ہے۔ سکون دیرپا ہے۔ ہر تباہ کرنے والی چیز فانی ہے لیکن انتظام جاودانی ہے۔ بیرحمی اپنی باگیں چھوڑ دے لیکن بہت تھوڑی دیر۔ اے آسمان میں پھرنے والے بخارات! تم نیلگوں آسمان کو تیرہ و تار کر دو کچھ حرج نہیں۔ اس طوفان سے پرے، ان بادلوں کی تیرگی سے اُدھر، غیر متغیر اور سکون بخش چاند چمکتا ہے جو بہشت میں نور پھیلا رہا تھا۔

غراب۔ بیہودے شب پرند! وہی خیال ہے۔ میرے کہن سال دوست۔ بچو اب کہ بیرحم ہوا پہلے سے زیادہ غضب ڈھاتی ہوئی آئی۔

الو ایک دفعہ پھر چلایا۔ کچھ پروا نہیں جھکڑ مزدور بند ہو جائیگا۔ مطلع جلد بادلوں سے صاف ہوگا سامنے وہ مدوختی کھیت کئے ہوئے ہے جو امن و سکون سے لبریز ہے۔

غراب حلق میں بولا۔ عقل سے بیگانہ! موت میں گھرے ہوئے ہو اور امید کے سہارے جیتے ہو۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی نہایت خوفناک دھماکا ہوا۔ شاہ بلوط زمین پر گر پڑا تھا۔ میں اس دھماکے سے چونک پڑا۔ میں اسطرح چلایا گویا کسی چھپے ہوئے دوست سے کہہ رہا ہوں۔ کیا وہ دن کبھی آئیگا، کیا وہ دن آہی جائیگا جب یہ کمبخت طوفان اور رنج ختم ہو جائیں گے؟ امن و سکون خیالی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اب تو موت اور تباہی پھیلی ہوئی ہے۔

"او بدنصیب ٹہنی! کیا تو پوچھتا ہے؟ کیا وحشی حیوان اور بے زبان مخلوق تیرے گھبرائی ہوئی باتون کے جواب دے؟ اوپر آسمان کیطرف دیکھ، نیچے زمین کی طرف نظر کر۔ اور زمین سے نیچے کے پانی پہ نگاہ ڈال۔ ایک ہی قاعدہ ہے۔ انتظام باہمی اتصال اور مسرت"

مین چیخ اٹھا۔ لیکن افسوس۔ کتنی دفعہ یہ قاعدہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔

"ہان! لیکن ابتری کوئی قاعدہ نہین ہے اور اس لئے یہ قائم نہین رہسکتی۔ بدانتظامی۔ موت۔ تباہی اپنی فطرت ہی سے عارضی ہین۔ باغیانہ طاقتین کچھ دیر کشمکش کرتی ہین اور ان اعلیٰ اصولون کو کبھی کبھی توڑ دیتی ہین۔ لیکن بالطبع وہ نہین رہسکتین۔ وہ خود کوئی قاعدہ نہین اور نہ اُن کا کوئی وجود وہ ایک نظام مین کچھ دیر خلل تو ڈالدیتی ہین نہین لیکن اسکی عمیق بنیادون کو گرا نہین سکتین۔ زندگی انتظام ہم آہنگی اور امن۔ ذرایع انجام کے عین مطابق۔ مدعا عالمگیر حسرت۔ یہ قاعدہ ہے یقین کر اود جی!"

جیسے ہی آواز بند ہوئی۔ آسمان سے پھر تمام فضا مین نور باری شروع ہوگئی۔ ہوا یا تو خاموش تھی یا کہین دور چلی گئی تھی اور تمام جنگل پر درخشان نور پھیلا ہوا تھا۔ ایک دفعہ پھر درخت کرنون سے جھلکنے لگے۔ اور میرے کان مین شور وشیون کی بجائے طرب ومسرت کے نغمے آنے لگے۔

نرم ونازک بہی بولا۔ مہربان چاند۔ ہم احمق اور جلد باز ہین۔ ہمنے تمام و عدون اور آسرون پر جو تو نے فیاضی سے بکھیرین شبہ کیا۔ رات کے طوفان اور تباہی پر نظر ڈالتے ہوے تو ہمین ایک دفعہ اور معاف کر!

شاہ بلوط نے کہا۔ بہن۔ تم سچ کہتی ہو وہ آسمانی طاقت جہان نہ ہوائین پہنچ سکتی ہین نہ طوفان کی رسائی ہے۔ ضرور ہماری بگڑی حالت پھر رحم کی نظر ڈالیگی۔ ہم زمین کے طوفانون مین زندگی بسر کرتے ہین۔ وہ ہمین معاف کرے گی اُسنے ہم سبکو بخشدیا ہے۔ اس نے اس گرمی کے لباس کے مقابلہ مین جو ہمین اتنا پسند ہے اب بہت چمکدار پوشاک ہمارے زیب تن کردی ہے۔

چنار بولنے لگا تو اسکے آنسو گرنے لگے۔ کیونکہ اسکی ٹہنیان خوشی سے تھرائین اور تارے چارون طرف گرتے معلوم ہونے لگے اُسنے کہا "امید اور امنگون کی پوشاک"

ببول کہنے لگا۔ مجھے اپنی مایوسی پر افسوس آتا ہے۔ مجھے پہلا زمانہ یاد کرنا چاہئے تھا۔ ہم ضرورت کیوقت بیکس نہین چھوڑدئے جاتے۔ سردیون کے جھکڑ چلتے ہین اور نہایت سختی سے چلتے ہین لیکن چمکدار چاند ہمیشہ وقت بیوقت ہمارے سرون پر امید کی کرنین اور راحت کے وعدے برساتا ہے پھر بھی ہم شبہ

کرتے ہین اور ڈرتے ہین۔ لیکن چاند اپنا لطف جاری رکھتا ہے۔ پھر بہار اور گرمی واپس آجاتے ہین اور ان کے ساتھ ہی زندگی اور خوشی اور ہمارے تمام خوشنما لباس بھی۔

آہ! ہم کیسے کمزور کانپتے ہوئی مخلوق ہین! "

اور اسی طرح اس عجیب رات کے باقی حصہ مین آرام کے کلے جنگل مین گونجتے رہے۔ آخر مین اس چھوٹی سی سنسان جھونپڑی مین جسے مین اپنا گھر کہتا تھا واپس آیا اور خوشی و رنج کے ملے جلے آنسو بہانے لگا۔ ماں باپ اچانک جاتے رہے تھے۔ اور مین محدود ذرائع کے ساتھ اس دنیا کی کشمکش مین اکیلا بے یار و مددگار رہگیا تھا۔ کیا مین اپنے سنسان چولھے کے آگے اسطرح نہ کھڑا تھا گویا کوئی خواب سے ابھی بیدار ہوا ہے؟ (یہ واقعی خواب ہی تھا) اور روئے ہوئے ہی کیطرح مایوسی مین چلا رہا تھا۔ گذرے ہوے دلون کے ویرانہ مین مین یکہ و تنہا عُریان کھڑا ہون" لیکن کھڑکی مین سے سرمدی چاند کی مبارک کرنین مجھ پر بھی پڑنے لگین۔ یہ وہ چاند تھا جو بہشت مین اپنی چمک دکھاتا تھا۔ وہ چاند جو بہشت کے واپس ملنے کی امید دلاتا ہے۔

اپنی زندگی کے مدوجزر مین کبھی کبھی اُس پُرانے جنگل کو جہان مین نے خواب دیکھا تھا عقل و امید کے سبق لینے چلا جایا کرتا تھا۔ وقت گذرتا چلا گیا۔ اور سردی کی برفباری شروع ہوگئی۔ درختون پر خاموش غیر مفہوم نیند غالب معلوم ہوتی تھی۔ اب بھی اپنے وقت پر چاند نکلتا اور برف تک کو روشنی اور امید کے خلعے پہنا دیتا پھر بہار نے ان جکڑ بندون کو توڑ ڈالا جن سے تمام فضا بند ھی ہوئی مردہ پڑی تھی۔ سبزہ اور دلفریبی عود کر آئے۔ جیسے ہی مین اُن جھوکون پر کان دھرتا تھا جو درختون مین سے گذرتے ہوئے ترنم نازک ارغنون کی صدا سے دلفریب پیدا کرتے تھے مین سوچتا" اگر مین پھر خواب دیکھون مجھے نہایت نفیس نغمہ ہائے عیش سنائی دین" لیکن ایسا پھر نہوا۔ پھر بھی مین اس نظارہ کے سکون مین کیفیت محسوس کرتا اور ان جھنڈون کے موجودہ سر سبز کنجون مین چاندکی کرنون کو مسرت درخشان کے ساتھ چمکنے اور پتون کے سایون مین تفرج نشاط مین رقص کرتے دیکھتا تھا۔

اور میرے لئے بھی ایک بہار آئی۔ اسیری سردی اور ٹھٹھرن بھی جاتی رہی۔ اب مین اپنے پیارے بچون اور انکی شیرین ادلاد کو ان جنگلون مین لے جاتا ہون۔ اور کبھی کبھی ہم فطرت اور اوسکے افسانون کی لمبی لمبی کہانیان کہتے ہین کہ جب طوفان آتے ہین درخت کسطرح نالہ و فریاد کرتے ہین اور کسطرح

عقلمند انکو غیر متوجہ کانون مین اپنا عمیق فلسفۂ نظم و نسق ڈالتا ہے جو ایک نہ ایک دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کس طرح صبر کا چاند دنیا پر امید و یقین کی کرنین ڈالنے کے کام سے نہین تھکتا۔ ابھی ہم باتین ہی کرتے ہوتے ہین کہ بچے خوش ہو کے تالیان بجاتے ہین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کبھی مایوس نہ ہونگے۔ کیونکہ دیکھو انکے سرون پر اچانک وہ چاند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مین پرتو فگن تھا!

محمد ظفر

# نظرے خوش گذرے

۱۳ر مارچ کو الناظر کے کاتب منشی عبدالولی صاحب نے کام چھوڑ دیا۔ فروری نمبر مین ہم نے انجمن خوشنویسان لکھنؤ کے رویہ پر مختصراً اظہار راے کیا تھا۔ مارچ کا سارا مہینہ تمام تر اسی بد وجہد کے نذر ہوا انجمن خوشنویسان لکھنؤ کی روش سے مجبور ہوکر راقم الحروف نو مالکان مطابع کی ایک انجمن قایم کرنا پڑی چنانچہ الحمد للہ کہ تھوڑے ہی دنون مین لکھنؤ کے تمام بڑے اور نامی مطابع کے ... یہان اتحاد عمل قائم ہو گیا ... سب نے متفق ہوکر انجمن خوشنویسان کے مرتبہ نقشہ کو نامنظور کر دیا۔ اسکے بعد مالکان مطابع نے منشی ... صدر انجمن مطابع لکھنؤ کے دولت خانہ پر ایک جلسہ کیا جسمین انجمن خوشنویسان کے صدر و معتمد اور بعض ممتاز اراکین کو بھی شرکت کی دعوت دی اور دیر تک اس بات کی کوشش کی ... باہم مصالحت سے کوئی تصفیہ ہو جائے۔ مگر خوشنویس صاحبان نے اسے منظور نہین کیا۔ جسکے بعد سوا اسکے کیا چارہ کار تھا کہ خوشنویس صاحبان اپنے گھر بیٹھین اور مالکان مطابع اپنے گھر۔ کچھ دنون تک یہی حالت رہی جس سے فریقین کو کافی حد تک نقصان اٹھانا پڑا۔ اس اثنا مین بعض کاتبون نے اور نیز بعض اہل مطابع نے باہمی طور پر تصفیہ کرکے اپنے تئین اگرچہ نقصان سے بچا لیا مگر فی الاصل اپنی جماعت کے نفع نقصان سے بے تعلقی کرکے خود اپنی پست حوصلگی اور تنگ نظری کا ثبوت دیا، اور اگر آئندہ کسی کو ان پر اعتماد نہو تو غالباً وہ شکایت کرنے مین حق بجانب نہونگے۔

کئی ہفتہ کی کشاکش کے بعد بالآخر جناب مولوی سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی درمیان مین پڑے اور انجمن خوشنویسان و انجمن مطابع نے ان کو حکم بنانا منظور کیا اور جناب ممدوح نے تقریباً پندرہ روز تک فریقین کے بیانات اور دلائل سنے اور متعدد قسم کی تجربے حاصل کرکے معاملہ کو پوری طرح سمجھا اور بالآخر یہ تصفیہ کر دیا کہ جتنے خوشنویس ملازم ہین ان کی تنخواہون

مین پچیس فیصدی اور جو اجرت پر کام کر رہے ہین ان کی اجرتون پر محرم ۱۳۳۷ھ سے ۳۷½ فیصدی اضافہ کیا جائے۔
انجمن مطابع نے اسی جلسہ مین جسمین کاتب صاحبان کو گفتگو کرنے کے لیے بلایا تھا یہ منظور کر لیا تھا کہ جو ملازم ہین ان کو ۲۰ فیصدی اور جو اجیر ہین ان کو پچیس فیصدی اضافہ دیا جائے۔

جناب مولوی سلامت اللہ صاحب کے تصفیہ کے رو سے اگرچہ اسمین مزید اضافہ کرنا پڑا تاہم مالکان مطابع نے اس تصفیہ کو بخوشی منظور کر لیا اور الحمدللہ کہ کاتبون کی جماعت نے بھی تمام طور پر اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ گو ان مین کے بعض اصحاب ابتک اپنی سابقہ ضد پر قائم ہین۔ اس باہمی نزاع کے دوران مین فریقین مین سے بعض اصحاب کی اخلاقی سوء اور غیر شریفانہ باتون نے سب سے زیادہ دکھ دیا اور افسوس ہے کہ جو خوشدلی اور لطف کارخانہ دار اور کارگیرون کے درمیان عرصہ سے چلا آتا تھا اسکا ایک بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا بہتر ہوا۔ اپریل کے تیسرے ہفتہ سے ہمارے کاتب صاحبان نے کام شروع کر دیا۔ اور اسوقت سے برابر الناظر کی کتابت جاری ہے۔ اور اب خدا خدا کر کے اس قابل ہوئے ہین کہ مارچ اپریل مئی و جون کے پرچے یکے بعد دیگرے شایع کئے جائین۔ ناظرین کرام کو اس عرصہ مین جو زحمت انتظار ہوئی اسکا ہمین پورا احساس ہے مگر صورت حال ایسی تھی کہ کچھ بنائے نہ بنی۔ امید ہے کہ ناظرین ہماری معذوریون پر لحاظ کر کے اس مجبورانہ تاخیر کو معاف فرمائینگے۔

---

تقریباً ڈیڑھ سال تک بادامی کاغذ پر چھاپنے کے بعد گذشتہ جولائی سے الناظر پھر سفید کاغذ پر شایع ہونے لگا تھا۔ اسوقت سفید کاغذ کا نرخ ۱۲؍ ریم سے گھٹ کر ۸؍ ریم ہو گیا تھا اور بظاہر توقع تھی کہ جنگ کے ختم ہو جانے کے باعث رفتہ رفتہ شرح نرخ اپنی سابقہ حالت پر آجائے گی۔ مگر نومبر سے نرخ جو بڑھنا شروع ہوا تو اب ۱۶؍ ریم کو بھی یہ کاغذ نہین ملتا۔ حالانکہ زمانہ جنگ مین کبھی ۱۲؍ ریم سے زائد دام نہین دینے پڑے۔ کاغذ کی گرانی عالمگیر ہے۔ انگلستان اور امریکہ مین بھی شور ماتم برپا ہے۔ اخبارات اپنے حجم گھٹانے اور قیمتون مین اضافہ کرنے پر مجبور ہوئے ہین اور بعضون نے اشاعت بند کر دی ہے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر ہم نے پھر بادامی کاغذ کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا ہے اس لیے کہ جب سفید کاغذ ملتا ہی نہو تو ہم اگر قیمت مین اضافہ بھی کر دین تو کیا نتیجہ؟ ناظرین کرام الناظر کے لباس کی اس تبدیلی کو عارضی سمجھکر معاف فرمائین جس وقت سفید کاغذ بازار مین مہیا ہونے لگے گا انشاءاللہ ملبوس خاکی تبدیل کر دیا جائیگا۔

---

**تاریخ تمدن** - سرہنری طامس بکل کی لاجواب کتاب ہسٹری آف سویلزیشن کا ترجمہ فلسفہ تاریخ کی یہ بہترین کتاب ہے جسمین تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیئے گئے ہیں جس طرح طبیعات وغیرہ علوم کے اصول مدون ہوئے ہین۔ دو جلد۔ قیمت غا

**تاریخ اخلاق یورپ** - انگلستان کے مشہور معروف علمبردار عقلیت الڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی لاجواب کتاب کا ترجمہ جسمین یونان و روما اور دیگر قدیم اقوام کے مذاہب فلسفہ اور ان کے اخلاقی ثمرات کی تاریخ پر تبصرہ کیا گیا ہے - جلد اول مے۔ جلد دوم عار

**مشاہیر یونان و رومہ** - حکیم پلوٹارک یونانی کی لاجواب کتاب پیرلل لائوز کا ترجمہ جسمین یونان و رومہ کے اولالعزم مدبرین اور نامور شہنشاہون کے سوانحی حالات اور انکے بیش بہا خیالات درج کر کے ازراہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا تقابل کیا گیا ہے۔ انگریزی مترجم کو اس کتاب کے ترجمہ کرنے مین نائٹ کا لقب دیا گیا جس سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیئے۔ مغرب کو قعر ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہونچانے مین اس لاجواب کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حب وطن ایثار کامل بےنفسی و جان نثاری اور اولالعزمی کی زندہ اور سچی تصویرین ان اوراق مین نظر آتی ہین۔ قیمت جلد اول عا جلد دوم عار

**تاریخ یونان قدیم** - اردو زبان مین یونان کی سب سے پہلی جامع و مکمل تاریخ قیمت عیصر

**رہنمایان ہند** - ہندوؤن کا اصلی مذہب کیا ہے اور اس مین کیا کیا تبدیلیان ہوئی ہین کرشن جی سدارتھ گوتم بدھ کی تعلیمات شنکر اچاریہ رامانج رامانند گورکھ ناتھ اور کبیر کی تلقینات اور بابا جی سورداس تلسی داس اور دیگر کے حالات قیمت عہر

**امرائے ہنود** - عہد مغلیہ کے ہندو امرا و وزرا اکابر و مشاہیر عہدہ داران و امرا کے حالات قیمت غا ر

**نپولین اعظم** - اس نامور فاتح اور شہنشاہ کی مکمل سوانحعمری پانچ جلدون مین قیمت عـلـعہ ر

**مسلمانان اندلس** - اسٹینلی لین پول کی مشہور تاریخ کا اردو ترجمہ قیمت عیصر

**البیرونی** - علامہ ابوریحان بیرونی مصنف کتاب الہند کی سوانحعمری اور ان کی تصانیف پر تبصرہ قیمت عیصر

**شاہ لکھنؤ** - عہد نصیرالدین حیدر بادشاہ مین لکھنؤ کی دورباری حالت قیمت عیصر

**فتح قسطنطنیہ** - یعنی اسلام کی ایک جلیل القدر اور مہتمم بالشان فتح کی تاریخ مولفہ حاجی بدرالدین احمد بی اے قیمت عیصر

**محاربات طرابلس** - از شیخ محمد شوکت علی بی اے یعنی مسٹر ای این بینٹ نامہ نگار زنجیار مانچسٹر گارڈین سابق ممبر پارلیمنٹ کی لاجواب کتاب ود دی ٹرکس ان ٹریپولی کا ترجمہ جسمین جنگ طرابلس کے چشم دید حالات ترکی افواج کی کیفیت خطہ اسلامیہ طرابلس کے

جغرافیائی ملکی قومی اور معاشرتی حالات بیانہ و مورخانہ شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہین اور اس وجہ سے کتاب جنگ کے بعد بھی ایک مستقل تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پڑھی جانے لائق ہے حجم ۵۰۰ صفحے مع ہم تشریحی نقشون کے قیمت عیصر

**علوم طبیعہ کی تاریخ** - علوم طبیعہ کی ان تمام دریافتون اور ایجادون کی تشریح جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لیکر انیسوین صدی تک وقتاً فوقتاً عمل مین آتی رہی ہین۔ مسائل کی تحقیقات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم و جدید حکما نے ان علمی دریافتون اور ایجادون مین کیا کیا حصہ لیا۔ مضامین کی وضاحت کے لیے صدہا تصویرین دی گئی ہین قیمت ہر دو جلد عیصر

**تاریخ مذہب** - اس مین مذہب کی ابتدا و ترقی کا حال اور نیز بڑے بڑے مذاہب مثلاً بابلی اور اسوریہ مصر اور چین اور دیگر ممالک و اقوام کے مذہب کی مختصر تاریخ درج ہے۔ قیمت ۸ ر

**تاریخ مصر** - مصریون کے قدیم رسم و رواج طرز معاشرت و علوم وغیرہ کے مفصل حالات قیمت ۸

**ہندوستان کی قدیم تہذیب** - یعنی سر رومیش چندر دت آنجہانی کی لاجواب کتاب کا اردو ترجمہ جسکی یہ تعریف کافی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے کورس مین داخل کر لی گئی۔ قابل مترجم منشی ولایت احمد مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ لائق دید ہے قیمت عا

**حالات گوکھلے** - آنریبل مسٹر گوکھلے کی جو عظمت اہل ہند کے دلون مین ہے اس کے لحاظ سے یہ افسوس کے قابل بات تھی کہ انکی کوئی سوانحعمری اردو زبان مین نہ تھی مسٹر مظہر حسین خان بی اے نے یہ کمی پوری کر دی ہے قیمت مہ

**ایوبی از مصنفین اردو کی مکمل تصانیف کی فہرست منگا کر دیکھو**

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

**کلیات محسن** - حضرت محسن کاکوروی کا نعتیہ دیوان قیمت عـــہ

**المیزان** - مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر پر محققانہ تبصرہ جسمین مرزا دبیر کی شاعری سے تفصیلی بحث کی ہی اور اُن کے محاسن شاعری اور فصاحت و بلاغت کا مشرح تذکرہ کیا ہی کتاب کی خوبی کا بہترین ثبوت یہ ہی کہ خود مولانا شبلی مرحوم نے مصنف کی بے تعصبی و قابلیت کا اعتراف کیا ہی۔ قیمت سے ر

**قومی مثنوی** از جناب حاجی مولوی احمد علی صاحب رئیس بہار شریف - یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی مبسوط نظم ہی جسمین مسلمانون کی حالت بیان کرکے اُن کے نقائص دور کرنے کی مناسب تدبیرین بیان کی گئی ہین - اور مصنف علام نے اپنے کمال شاعری سے اصلاح قوم کا کام نہایت خوبی سے لیا ہی - قیمت ۱۲ر

**مجموعۂ کلام شبلی** - مولانا شبلی کا اردو دیوان قیمت ۱۲ر

**شرح دیوان غالب** - از مولانا سید حیدر طباطبائی نظم لکھنوی - قیمت عـــہ

**صبح امید** - مولانا شبلی نعمانی کی قابل دید مثنوی قیمت ۴ر

**مثنوی امید و بیم** - پروفیسر مرزا امداد علی بی اے کی لاجواب نظم قیمت ۴ر

**واقعات کربلا** - میر انیس مرحوم کے بہترین مرثیون کے منتخب بندون سے مسلسل داستان تیار کی ہی اردو مین مرثیہ نظم کا بہترین نمونہ ہی عـــہ

**خیابان** - منشی انتصاف علی شہر کاکوروی کی نظمین ۱۴ر

**کشولا** - نواب احمد شفیع خان نیر فرید آبادی کا ناول ۲ جلد قیمت عـــہ

**تسخیر فرانس** - شکسپیر کے لاجواب ڈرامے ہنری دی ففتھ کا ترجمہ۔ قیمت ۸ر

**زود پشیمان** - مسٹر عبدالماجد بی اے کا قابل دید ڈراما قیمت ۸ر

**محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش** - مسٹر مشیر کا دلچسپ فسانہ قیمت ۳ر

**بیان خسرو** - حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری مصنفہ مولوی شبلی نعمانی قیمت ۱۰ر

**دیوان حالی** - مولانا حالی کا دیوان ۲۵ سال بعد دوبارہ چھاپا گیا ہی فوراً منگا لیجئے قیمت عـــہ

**عورتون کی انشا** - بیگم صاحبہ کا ہدیہ کی یہ لاجواب انشا شریف خواتین کا کہ جو ادب اردو کی بہترین سبق آموز ہی جس کی حامی اردو ٹکسٹ بک کمیٹی نے خاص کتب خانون کے لیئے پسند و منتخب کر کے کوئی شریف گھرانا اس کتاب سے خالی نہ رکھے

**شوکت آرا بیگم** - ایک پردہ نشین بی بی کی قابل دید تصنیف جسمین افسانہ کے پیرایہ مین خواتین کو تعلیم حاصل کرنے اور عمدہ اصول کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب ہی حجم ۶۷۵ صفحے قیمت ...

**سعیدہ کے خطوط** - ایک لڑکی کے خود اس کی زبانی - جذبات حسن و عشق مقتضیات فطرت انسانی کا ایک جدید اسلوب ...

**ازواج النبی صلعم** - حضور رسول ﷺ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی سوانح عمریا

**ازواج الانبیا** - حضور سرورِ کائنات کے سوا دیگر انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بی بیون کا مفصل تذکرہ قیمت عـــہ

جب کوئی اُردو کی کتاب خریدنا ہو تو

## مصنفین اُردو

کا ایک نسخہ منگا کر ہماری فہرست ضرور ملاحظہ کر لیجیے

| مولانا شبلی کے مضامین | | مولانا حالی کی نظمین | | ڈاکٹر اقبال کی نظمیں |
|---|---|---|---|---|
| زیب النسا بیگم | ار | شکوہ ہند | ۲ر | شکوہ |
| جہانگیر | ۲ر | بیوہ کی مناجات | ۲ر | جواب شکوہ |
| اسلامی حکومت | ۲ر | عرض حال | ار | فریاد امت |
| کتبخانہ اسکندریہ | ۸ر | چھوٹ اور سچ کا مناظرہ | ار | بلال |
| مسلمانون کی گذشتہ تعلیم | ۱۰ر | مناظرہ رحم و انصاف | ار | نالۂ یتیم |
| اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر | ۱۲ر | مناظرہ تعصب و انصاف | ار | شمع و شاعر |
| آغاز اسلام | ۸ر | حب وطن | ار | مکمل ترانہ |
| اسلامی مدارس | ۴ر | مسدس تہنیت خدمت | ار | اکبری و اقبال |

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**